نقوشِ عظمتِ رفتہ

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقوشِ عظمتِ رفتہ

محمد اسحاق بھٹی

ناشر

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

20S13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی ساندہ، لاہور
Ph 0301-4768918، 042-37143677
mishaqbhattiri2002@gmail.com

Marfat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: ـــــــ نقوش عظمت رفتہ
مصنف: ـــــــ محمد اسحاق بھٹی
ناشر: ـــــــ سعید احمد بھٹی
محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
حروف خوانی: ـــــــ قدیسہ سعید / حافظ محمد حسان سعید
کمپوزنگ: ـــــــ محمد لقمان سعید
صفحات: ـــــــ ۵۳۶
سن اشاعت: ـــــــ ۲۰۱۷

مطبع
ثوبان نعمان پرنٹنگ پریس، لاہور
0300-8661763

190078

سٹاکسٹ:

① محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
20S13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی سانده، لاہور
Ph 0301-4768918، 042-37143677
mishaqbhattiri2002@gmail.com

② مکتبہ اسلامیہ
لاہور G/F-26 ہادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-0997821-22-23-24، 042-37244973-37232369
فیصل آباد بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
0300-0997826-27-28، 041-2631204-2641204
0300-8661763 0321-8661763
www.facebook.com/maktabaislamia1
maktabaislamiainfo@gmail.com
www.maktabaislamia.com.pk

کتاب ملنے کا پتہ:

① کتاب سرائے: الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور 042-37239884, 042-37320318
② مکتبہ قدوسیہ: رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور 042-37351124, 042-37230585
③ المکتبۃ السلفیہ: شیش محل روڈ، لاہور 042-37237184, 042-37230271
④ علم وعرفان پبلیشرز: الحمد مارکیٹ، 40-اردو بازار، لاہور 042-37232336, 042-37352332

Marfat.com

فہرست مضامین

❖ حرفے چند (حافظ محمد حسان سعید) ---------- 5

❖ از طرف ناشر (طبع اول) (ابوبکر قدوسی) ---------- 7

❖ حرف آغاز (محمد اسحاق بھٹی) ---------- 9

❖ سید محمد داؤد غزنوی ---------- 11

❖ حافظ محمد گوندلوی ---------- 108

❖ مولانا محمد اسماعیل سلفی ---------- 134

❖ مولانا کرم الٰہی ---------- 207

❖ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ---------- 220

❖ مولانا عبدالقدوس میواتی ---------- 251

❖ مولانا عبدالخالق قدوسی ---------- 257

❖ مولانا عبیداللہ سندھی ---------- 286

❖ مولانا احمد علی لاہوری ---------- 306

❖ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ---------- 319

❖ خواجہ عبدالوحید ---------- 344

❖ خواجہ عبدالحی فاروقی ---------- 371

❖ سید محمد متین ہاشمی ---------- 381

❖ حمید نظامی ---------- 390

Marfat.com

❖ سید ابوالحسنات قادری -- 408
❖ کوثر نیازی -- 412
❖ قاضی حبیب الرحمٰن منصور پوری -- 436
❖ ذیل سنگھ گیانی -- 453
❖ ڈاکٹر محمد ایوب قادری -- 497
❖ سحر گل خاں -- 509
❖ مولوی شمس الدین -- 522
❖ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحبؒ کی تصنیفات -- 536

☆☆......☆☆......☆☆

Marfat.com

حرفِ چند

جب کوئی صاحب تصنیف اس دنیائے فانی سے رخصت ہوتا ہے تو اگر اس صاحب علم شخصیت کے ورثاء کو اس کے کام سے دلچسپی ہو تو ان کی ذمہ داریاں پہلے سے بہت بڑھ جاتی ہیں اس لیے کہ دوست، احباب اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ اس علمی شخصیت کے جو نادر مسودات اور اہم چیزیں اس کے اخلاف کے پاس موجود ہیں وہ ان کے پاس اس مرحوم مصنف کی امانت ہیں اور اس کو بہترین انداز سے شائع کرنا ان کے فرائض میں شامل ہے۔ لیکن اگر انھی ورثاء کو مصنف کے کام اور فکر سے دلچسپی نہ ہو تو یہ بات اس کے محبین کے لیے بڑی کرب ناک ہوتی ہے۔ اس لیے انھیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں مصنف کے اہم مسودات دیمک یا ردی کی نظر نہ ہو جائیں۔ ہمارے ہاں اکثر ایسا ہی دیکھنے میں آتا ہے، وہ چیزیں جو اہل علم کے نزدیک انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں اخلاف ان چیزوں کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دیتے ہیں۔

مورخ اسلام، شہسوار قلم، صاحب طرز ادیب مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کے انتقال کے بعد ممکن ہے بعض احباب اس خدشے میں مبتلا ہوں مگر جب ان کی وفات کے بعد والد گرامی سعید احمد بھٹی صاحب نے ان کی دو غیر مطبوعہ کتب محفل دانش منداں اور استادِ گرامی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کو ان کی سرپرستی میں قائم شدہ ادارے سے شائع کیا تو اندرون و بیرون ملک اہل علم کی کثیر تعداد نے اس کاوش کی حوصلہ افزائی فرمائی جس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

بعض قریبی دوستوں نے بالمشافہ ملاقات، خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ آپ جس شوق اور محبت سے بھٹی صاحب کی غیر مطبوعہ کتب کو شائع کر رہے ہیں اسی جذبے سے آپ بھٹی صاحب کی ان مطبوعہ کتب کو بھی دوبارہ شائع کریں جو عرصے سے مارکیٹ میں نایاب ہیں۔

ان احباب کے مشورے سے طے پایا کہ سب سے پہلے مولانا بھٹی صاحب کی شخصیات کے متعلق اولین کتاب نقوش عظمت رفتہ کو دوبارہ شائع کیا جائے۔ نقوش عظمت رفتہ میں مولانا بھٹی صاحب نے جن مذہبی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات کے سوانحی خاکے تحریر کیے ہیں وہ تمام حضرات اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ ان شخصیات کے سوانحی خاکوں میں اس دور کی سیاست، معاشرت اور رسم و رواج کو جس خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۹۶ء میں مکتبہ قدوسیہ نے بہترین انداز سے شائع

Marfat.com

کیا تھا لیکن اب یہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی۔

بڑے بھائی محمد لقمان سعید نے چند دنوں میں اس ضخیم کتاب کی کمپوزنگ کی۔ بڑی بہن قدیسہ سعید (اسسٹنٹ پروفیسر اردو۔ گورنمنٹ کالج فار وویمن، جڑاں والا، فیصل آباد) اور راقم نے جب چند ہفتوں میں اس کی پروف ریڈنگ مکمل کر لی تو ہمیں امید تھی کہ مئی کے آخری ہفتے یا جون کے پہلے ہفتے میں کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ لیکن ۱۱ مئی ۲۰۱۷ء کو والد گرامی کے اچانک انتقال سے یہ منصوبہ التواء کا شکار ہوا اور وہ خود کئی اشاعتی منصوبے لے کر زمین کی آغوش میں چلے گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

والد گرامی سعید احمد بھٹی صاحب ؒ کو اگر مولانا بھٹی صاحب کی شخصیت کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ان کا بچپن، جوانی اور کہولت کا زمانہ ان کے ساتھ گزرا تھا۔ اسی طرح بھٹی صاحب کی زندگی میں جو نشیب و فراز آئے اس سے بخوبی واقف تھے اور جن جن رسائل میں بھٹی صاحب کے مضامین شائع ہوئے تھے ان کے سنین، مہینے اور تواریخ تک یاد تھیں۔

مولانا بھٹی صاحب کی وفات کے بعد دوران سال مختلف یونیورسٹیز میں ان کی خدمات کے اعتراف میں ۵ مقالات تحریر کیے جا رہے ہیں۔ ان مقالہ نگار حضرات کو کسی بھی قسم کی کوئی علمی مدد درکار ہوتی تو وہ فوراً ان محقق حضرات کی رہنمائی فرماتے۔

والد گرامی کے انتقال کے بعد اندرون و بیرون ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے گھر آ کر، خطوط یا ٹیلی فون کے ذریعے تعزیت کی، بالخصوص مولانا بھٹی صاحب کے چھوٹے اور ہم نام داماد محمد اسحاق بھٹی صاحب کے جنھوں نے نہ صرف ہماری حوصلہ افزائی جاری رکھی بلکہ بعض اہم معاملات میں رہنمائی کی۔

کبرنی موت الکبراء (بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا کر دیا ہے) کے مصداق اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری ہمارے کندھوں پر ڈال دی ہے ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جن مقاصد کے لیے بزرگوں نے اس ادارے کو قائم کیا تھا اللہ تعالیٰ کی توفیق اور آپ دوستوں کی دعاؤں اور مشاورت سے اسے ہر صورت پورا کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

۱۱ ستمبر ۲۰۱۷ء

حافظ محمد حسان سعید
(ایم۔فل پنجاب یونیورسٹی)
0301-4768918, 042-37143677

☆......☆......☆

Marfat.com

از طرف ناشر (طبع اول)

محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب پڑھے لکھے حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔وہ مشہور صحافی،معروف مصنف اور ممتاز خاکہ نویس ہیں۔ہم نہایت مسرت کے ساتھ ان کے ماضی کی خوش گوار یادیں اور مختلف حضرات کے متعلق ان کے مشاہدات وتاثرات کتابی صورت میں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

اس مجموعے میں آپ کو اکثریت علمائے کرام کی نظر آئے گی،اس کی وجہ یہ ہے کہ بھٹی صاحب خود بھی صاحب بصیرت عالم دین ہیں اور ان کا زیادہ تر واسطہ بھی اسی طبقے سے رہا ہے۔ان علمائے کرام کا تعلق فقہی اعتبار سے مختلف مکاتب فکر سے ہے اور یہ سب حضرات اپنی اپنی جگہ منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور ایک زمانہ ان کی علمی صلاحیتوں کا معترف ہے۔

اس مجموعے میں قابل احترام قارئین کو دلچسپ لطائف بھی ملیں گے اور سبق آموز واقعات اور اخلاص سے بھرپور پندونصائح سے بھی ان کا دامن طلب پر ہوگا۔پندونصائح کے سلسلے میں خواجہ عبدالوحید کی وصیت بالخصوص بار بار پڑھنے اور عمل کرنے کی چیز ہے۔جی چاہتا ہے،اسے خوب صورت انداز میں لکھایا جائے اور شیشے میں فریم کرا کے گھر میں نمایاں جگہ پر رکھا جائے تاکہ ہر چھوٹا بڑا اسے پڑھے اور اس کے مندرجات سے فائدہ حاصل کرے۔پھر خواجہ صاحب کے لیے یہ صدقہ جاریہ ثابت ہو۔

بھٹی صاحب طویل مدت سے قلم وقرطاس کی وادیوں میں گامزن ہیں۔ابتدا میں وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام سے منسلک ہوئے اور پندرہ سولہ سال اس کے منصب ادارت پر فائز رہے۔اس وقت حضرت مولانا سید محمد داوٗد غزنویؒ مرکزی جمعیت کے سربراہ تھے۔مولانا محمد حنیف ندویؒ کے ساتھ بھی انھوں نے ایک عرصے تک صحافتی وتصنیفی خدمات سرانجام دیں۔

حضرت مولانا داوٗد غزنویؒ کا شمار برصغیر کے قافلہ آزادی کے سپہ سالاروں میں ہوتا ہے۔تقسیم ملک کے بعد انھوں نے اپنی سرگرمیاں وطن عزیز میں جماعت اہل حدیث کی شیرازہ بندی کے لیے وقف کر دی تھیں، جس میں اللہ نے انھیں کامیابی سے ہم کنار کیا۔

حضرت مولانا غزنویؒ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔متعدد اصحاب علم اور ارباب سیاست ان سے ملنے آتے تھے۔محترم بھٹی صاحب کو بھی ان لوگوں سے ملاقات کے مواقع میسر آئے بعد میں وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں چلے گئے۔وہاں بھی ان کی برصغیر پاک وہند کے بہت سے اہل علم اور اصحاب قلم سے شناسائی ہوئی۔

بھٹی صاحب نے قدرت کی فیاضیوں سے ذہن رسا اور حافظہ مضبوط پایا تھا۔وہ ان بزرگوں سے اپنی

Marfat.com

ملاقاتوں اور ان کی گفتگو کو اپنے نہاں خانہ ذہن میں محفوظ کرتے گئے۔ زندگی کے ان دونوں ادوار میں ان کی جن شخصیات سے ملاقاتیں ہوئیں، نقوش عظمت رفتہ میں ان کی تفصیلات دلکش اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔

اس سے قبل بھٹی صاحب اپنے ذہن میں محفوظ معلومات کبھی کبھار مختلف رسائل کے ذریعے قارئین تک پہنچاتے رہے۔ لیکن باقاعدہ کتابی صورت میں یہ پہلا مجموعہ ہے جو آپ حضرات کے زیر مطالعہ ہے۔ اس مجموعے میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کا خاکہ سب سے طویل ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بھٹی صاحب سالہا سال سید غزنویؒ کی خدمت میں رہے ہیں اور ان کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے شب و روز کے علمی و سیاسی معمولات ان پر عیاں تھے، ان کی سوچ کے بہت سے گوشوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے، اس لیے یہ خاکہ نسبتاً طویل ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس میں جو واقعات انھوں نے بیان کیے ہیں، ان میں سے بہت سے واقعات ان کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہوں گے۔

ان خاکوں میں سے چند وہ خاکے بھی ہیں جو اس سے قبل بعض رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن اب ان میں بہت سے اضافے کر دیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے ان خاکوں نے بالکل نیا رنگ اختیار کر لیا ہے۔

ان خاکوں میں بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور ان کی حیثیت ایک مستقل تاریخ کی ہے جس سے تاریخ کے طالب علم بہت سا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں زبان کی چاشنی بھی ہے اور ادبیت کی مٹھاس بھی۔ واقعات کی گہما گہمی بھی ہے اور لطائف کی دل آویزی بھی۔ طرز ادا کا بانک پن بھی ہے اور اسلوب بیان کی شگفتگی بھی۔ تحریر کی پختگی بھی ہے اور دور گزشتہ کی تصویر کشی بھی۔

بھٹی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جس شخصیت کے بارے میں لکھا ہے، اس کی زندگی کے تمام گوشوں کو منقح کر دیا ہے اور وہ شخصیت مجسم شکل میں قاری کے سامنے آجاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی لائق تذکرہ ہے کہ بھٹی صاحب ایک خاص فقہی مسلک کے حامل ہیں، جسے اہل حدیث مسلک سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن ان کی وسعت قلب ملاحظہ ہو کہ وہ ہر مسلک کے اہل علم کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور واضح الفاظ میں اس کی خوبیوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں، چناں چہ اس کتاب میں آپ دیکھیں گے کہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے ساتھ ساتھ اس میں حضرات احناف کی بھی معقول تعداد شامل ہے۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں، یہ وسعت قلب موجودہ دور کے کسی اور مسلک کے اہل علم کے حصے میں میں نہیں آئی۔

ہم بھٹی صاحب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں شخصی خاکوں کا یہ خوب صورت مجموعہ شائع کرنے کا موقع فراہم کیا۔ آئندہ ان شاء اللہ شخصیات سے متعلق ان کے دیگر مجموعے بھی اشاعت پذیر ہوں گے۔

۱۱۔ستمبر ۱۹۹۶ء

ابوبکر قدوسی

Marfat.com

حرف آغاز

ابتدائی دورِ زندگی ہی سے مجھے شخصیات سے دلچسپی رہی ہے، میں چاہتا تھا کہ جن حضرات سے کسی نہ کسی انداز میں میرا تعلق رہا ہے یا جن کو میں نے دیکھا ہے اور ان سے متاثر ہوا ہوں، ان سے متعلق خاکہ نویسی کی صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں، چناں چہ یہ فریضہ سرانجام دیا جا رہا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب کی تقطیع کے پندرہ سو سے زائد صفحات کمپوزنگ کے مرحلے سے گزر چکے ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی رکھی اور قلم و قرطاس سے رابطہ قائم رہا تو ان شاء اللہ بہت سی شخصیات کے سوانحی خاکے ضبطِ تحریر میں لائے جائیں گے۔ یہ پہلا مجموعہ شخصیات جو اکیس حضرات کے واقعات و کوائف پر محیط ہے نقوشِ عظمتِ رفتہ کے نام سے خوانندگانِ محترم کی نذر کیا جا رہا ہے، اس کے بعد کے مجموعے ان شاء اللہ دوسرے ناموں سے پیش کیے جائیں گے۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس شخصیت کے بارے میں لکھا جائے، اس کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو واضح کر دیا جائے، جن سے لکھنے والا بالواسطہ یا بلاواسطہ مطلع ہوا تاکہ اس کی شب و روز کی سرگرمیوں کے زیادہ سے زیادہ گوشے نکھر کر قارئین کے سامنے آسکیں اور ان کی مدد سے اس کی عادات و اطوار اور گفتار و کردار کا صاف طور پر مشاہدہ کیا جا سکے، چناں چہ شخصیات سے متعلق میں اسی انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہوں، اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں، اس کا بہتر فیصلہ قارئین کرام ہی کر سکتے ہیں۔

اس اندازِ نگارش کے بعض پہلوؤں سے حضرات کو اختلاف ہو سکتا ہے، مگر میں ان کی خدمت میں بہ درجہ غایت احترام کے ساتھ عرض کروں گا کہ وہ اپنے تمام اوصافِ بوقلموں کے باوجود انسان تھے اور لغزشِ فہم و فکر کا شکار ہو سکتے تھے اور متعدد مواقع پر دانستہ یا نادانستہ طور سے شکار ہوئے۔ اسے چھپانے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ تاریخ کی بات تاریخ کے حوالے کر دینی چاہیے تاکہ واقعہ بھی معرضِ بیان میں آجائے اور شخصیت کا بھی مکمل طور سے مشاہدہ کیا جا سکے۔ یاد رہے ہم احترامِ شخصیت کے تو ضرور قائل ہیں، لیکن شخصیت پرستی کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔

اگر انسان کا ہیولا اسی دنیا کے لغزش آلود آب و گل سے تیار ہوا ہے اور اس کے فہم و شعور نے اسی فضائے معصیت آمیز میں کروٹ لی ہے تو لازماً اس کا ذہن کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہو گا اور اس کے سوچ بچار کی تہوں میں یہاں کے نہجِ فکر کی آمیزش ہو گی۔ اور میرے خیال میں یہی انسان کی اصل خوبی ہے کہ وہ جہاں پیدا ہوا اور جہاں رہتا اور زندگی بسر کرتا ہے، اس کے تقاضوں کو خوب سمجھتا اور ان تقاضوں کی روشنی میں اپنے عمل و زندگی بسر کرتا ہے، اس کے تقاضوں کو خوب سمجھتا اور ان تقاضوں کی روشنی میں اپنے عمل و حرکت کی سمتیں

Marfat.com

متعین کرتا ہے اور انھی کو پیش نگاہ رکھ کر سفر حیات کی مختلف منزلوں پر قدم زن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان منزلوں میں وہ درست چال بھی چلے گا اور کسی موڑ پر ٹھوکر بھی کھائے گا۔

ہم صحابہ کرام کی زندگی کے نشیب وفراز کی وضاحت تو کرتے ہیں، آئمہ دین اور محدثین وفقہا کے واقعات کی چھان بین میں بھی نہایت مستعد واقع ہوئے ہیں اور رجال ورواتِ حدیث کی بھی علمی، عملی اور ذہنی وفکری کاوشوں کے ہر پہلو کو مرکز نگاہ بلکہ ہدف نقد وجرح ٹھہراتے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ اپنے ممدوح علما کے بارے میں سکوت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا ان سے غلطی کے ارتکاب کا امکان نہیں؟

میں اس اسلوب فکر کا نہ حامی ہوں، نہ حامل۔ میں جس شخص کے متعلق لکھتا ہوں، اس کے وہ تمام عادات واطوار اور کمالات واوصاف جن سے میں آگاہ ہوا، قارئین کے علم ومطالعہ میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر اس نے زندگی کے سفر کی الٹی سیدھی طویل منزلوں میں کہیں ٹھوکر کھائی ہے اور معاشرے یا جماعت یا افراد پر اس کے کسی نوعیت کے منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں تو اس کا تذکرہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ حقیقت حال لوگوں کے سامنے آئے اور وہ آئندہ اس کے غلط نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔

مجھے زندگی میں بہت سے علما واکابر کی خدمت میں حاضر ہونے، ان کے ارشادات سننے اور ان کی رفاقت اور رہنمائی میں کام کرنے کے مواقع میسر آئے ہیں، ان میں مختلف فقہی مسالک کے حاملین بھی ہیں، عام اہل علم اور اصحاب تحقیق بھی ہیں، سیاست دان بھی ہیں، شعر وانشا اور ادب وصحافت سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں اور غیر مسلم بھی ہیں۔ یہ تمام حضرات ایک لمبی قطار میں سامنے کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے اس وقت پہلی قسط کے طور پر اکیس اصحاب کے متعلق اپنی یادداشتیں اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیان واقعہ میں میری یادداشت نے میرے قلم کے ساتھ پورا تعاون کیا ہے، کسی مقام پر دونوں میں اختلاف رونما نہیں ہوا اور کسی بات کو حوالہ قرطاس کرنے میں کسی موقعے پر مجھے کسی نوع کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہونا پڑا۔ الحمد لله علی ذالك حمدا كثيرا

جس بزرگ میں جو اہم بات دیکھی یا جو قابل ذکر بات ان سے متعلق کسی سے سنی، اس کے حوالے کے ساتھ بغیر کسی تکلف کے خانہ ذہن سے نکال کر سطح کاغذ پر رکھ دی۔

امید ہے لائق احترام قارئین ان یادداشتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے میری فروگزاشتوں سے مطلع کریں گے۔

یادداشتوں کے آئندہ مجموعوں میں ان شاء اللہ بعض زندہ شخصیات سے بھی آپ کو متعارف کرایا جائے گا۔

وما توفيقي الا بالله ، عليه توكلت واليه انيب

۲۱۔ اگست ۱۹۹۶ء (۵۔ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ)

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، سانده، لاہور

Marfat.com

سید محمد داؤد غزنوی

۱۹۳۸ء کے شروع میں ضلع فیروز پور کی جماعت اہل حدیث کی ایک بہت بڑی کانفرنس مولانا محمد علی لکھوی کی کوشش سے فیروز پور شہر میں منعقد ہوئی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس کانفرنس کے صدر تھے جو بذریعہ موٹر کار لاہور سے فیروز پور گئے تھے۔ وہ پنڈال میں داخل ہوئے تو فضا نعروں سے گونج اٹھی اور لوگ عقیدت و مسرت کے بے پناہ جذبات کے ساتھ ان کی طرف دوڑے۔ مولانا نے عشا کی نماز کے بعد بہت بڑے اجتماع میں تحریری خطبہ صدارت پڑھا۔ حاضرین نہایت انہماک اور توجہ سے ان کے ارشادات سن رہے تھے۔ میری عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ یہ بات میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ انھوں نے اپنے خطبے میں شہر اور ضلع فیروز پور کی بعض ان شخصیتوں کا ذکر کیا تھا جو علمی اور سیاسی لحاظ سے خاص شہرت کی حامل تھیں اور ان میں سے بعض کا انتقال ہو چکا تھا۔

مولانا نے اپنے طویل خطبے میں مسئلہ فلسطین، اسلامی ممالک کی رفتار سیاست اور انگریز کی اس سے دلچسپی کی وجوہ، بین الاقوامی حالات، ملک کی تحریک حریت، اس کے سیاسی کوائف، برطانوی حکومت کے ظلم واستبداد کے واقعات، برصغیر میں علمائے کرام اور زعمائے اہل حدیث کی انگریز دشمن سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کی تھیں اور لوگ پوری طرح ان کے افکار عالیہ سے مستفید ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا داؤد غزنوی کو دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔

مولانا غزنوی کی زیارت کا دوسرا موقع فروری ۱۹۴۰ء میں ملا۔ مولانا ابوالکلام آزاد لاہور تشریف لائے۔ اخبارات میں اعلان ہوا کہ وہ موچی دروازے کے باہر جلسہ عام سے خطاب کریں گے۔ مجھے ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا بے حد شوق تھا۔ لاہور آیا اور جلسہ گاہ میں پہنچا تو بہت بڑا ہجوم تھا۔ مولانا ابھی جلسہ گاہ میں نہیں آئے تھے۔ مجمع دور تک پھیلا ہوا تھا اور لوگوں کا شور بپا تھا۔ میں سٹیج کے بالکل قریب تھا۔ سرخ و سفید رنگ کے ایک صحت مند شخص جو بڑے وجیہہ اور مرعوب کن شخصیت کے مالک تھے، اور نہایت صاف ستھرے کھدر کا لباس پہنے اور سفید کھدر کا عمامہ باندھے ہوئے تھے، سٹیج پر نمودار ہوئے...... کئی آوازیں بلند ہوئیں، ''مولانا ابوالکلام آزاد آگئے۔'' لیکن وہ مولانا داؤد غزنوی تھے۔ اس موقعے پر انھوں نے جو الفاظ کہے، وہ اب بھی مجھے یاد ہیں۔

Marfat.com

''حضرات! مجھے معلوم ہے آپ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سننے کے لیے بے تاب ہیں اور آپ کی یہ بے تابی اور جوش وخروش بالکل بجا ہے۔ چند منٹ میں مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ آپ خاموشی سے مولانا کی تقریر سنیں۔ اگر آپ خاموش نہ ہوئے تو مولانا کے افکار عالیہ سے مستفید نہیں ہوسکیں گے۔''

اتنے میں مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے، مولانا غزنوی نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں بزرگ ایک ساتھ برابر برابر کرسیوں پر تشریف فرما ہوئے۔ دیر تک نعرے گونجتے رہے۔ مولانا غزنوی نے کھڑے ہوکر دوبارہ لوگوں کو خاموش رہنے کی اپیل کی۔

۱۹۴۲ء کے مارچ میں جمعیت علماے ہند کا سالانہ اجلاس لاہور میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ مولانا سید داؤد غزنوی مجلس استقبالیہ کے ناظم تھے۔ انھوں نے اجلاس میں شرکت کے لیے کثیر تعداد میں علما و زعما کو دعوت نامے بھیجے تھے۔ ہمارے علاقے کے بھی بہت سے لوگوں کو دعوت شرکت دی گئی تھی۔ دعوت نامے پر مولانا کی دستخطی مہر ثبت تھی، جس میں ''محمد داؤد غزنوی'' کے الفاظ کندہ تھے۔ جلسے میں ایک عجیب واقعہ یا حادثہ پیش آیا...... مولانا سید حسین احمد مدنی نے تحریری خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے کہا کہ ملک میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے۔

ان الفاظ پر پنڈال کے مختلف حصوں سے ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ مولانا مدنی دھیمے انداز کے بزرگ تھے۔ انھوں نے نعرے لگانے والوں سے خاموش رہنے کی اپیل کی، مگر نعرے بازی کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا غزنوی سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ وہ کھڑے ہوئے، مائیک پر آئے اور مولانا مدنی سے اجازت لے کر مخالفانہ نعرے لگانے والوں سے کہا:

''حضرات! خاموش ہو جایے۔ حضرت مولانا کا خطبہ اطمینان سے سنیے۔ اگر اس میں آپ کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات ہے تو بعد میں بیان کریں، آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔''

لیکن جب نعرے لگانے والوں پر اس اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا تو مولانا داؤد غزنوی نے رعب وجلال کے ساتھ اعلان کیا۔

''میں کہتا ہوں آپ خاموش ہو جائیں۔ اگر خاموش نہیں ہوں گے تو خاموش کرا دیا جائے گا۔''

مولانا نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا: ''پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔''

وقت گزرنے لگا اور مولانا نے کہنا شروع کیا: ''اب چار منٹ باقی رہ گئے ہیں ...... تین منٹ باقی رہ گئے ہیں...... دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔''

Marfat.com

ہر منٹ گزرنے کے بعد مولانا یہ اعلان کرتے جاتے تھے۔ جب ایک منٹ باقی رہ گیا تو کہا: دیکھیے! اب صرف ایک منٹ باقی ہے۔

جب ایک منٹ بھی ہنگامے کی نذر ہو گیا تو رضا کاروں سے مخاطب ہوئے، "والنٹیر ز! انھیں خاموش کرادو۔" اکثریت احرار رضا کاروں کی تھی۔ انھوں نے اس تیزی اور مستعدی سے تعمیلِ حکم کی کہ دس منٹ کے اندر اندر جلسے میں بالکل امن تھا۔

دراصل ان لوگوں کو مسلم لیگ کے بعض کارکن لے کر آئے تھے اور انھیں پنڈال کے مختلف حصوں میں بٹھا دیا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ جب کوئی بات مسلم لیگ کے نقطہ نظر کے خلاف کہی جائے تو وہ نعرے لگانا شروع کر دیں تاکہ جلسے میں گڑبڑ کا سلسلہ جاری رہے۔ لیکن دوسری طرف احرار رضا کار تھے جو بڑے تیز اور مستعد تھے۔ جلسے کو سنبھالنا، اور کنٹرول کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ گڑبڑ کرنے والوں پر نگاہ رکھنا اور انھیں ناکام بنا دینا، ان کے نزدیک معمولی کام تھا۔

مولانا نے ایک مرتبہ پنجاب کے ایک مشہور مسلم لیگی کے بارے میں فرمایا کہ یہ بھی اس جلسے میں شامل تھے، بلکہ یہی خاص ہدایات دے کر لوگوں کو لائے تھے۔ رضا کاروں نے ان کو پیٹا تھا۔ یہ جب مجھے ملتے ہیں، یہ واقعہ یاد آجاتا ہے اور یہ خود جس انداز سے نعرے لگا رہے تھے، وہ نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور آزادیِ وطن کے مسئلے پر ان سے گفتگو ہونے لگی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا اور سیاسی جماعتیں میدان میں اتر آئی تھیں۔ ۱۹۴۵ء کے اکتوبر کا مہینہ تھا کہ جمعیت علمائے ہند نے (اپنے مرکزی دفتر واقع گلی قاسم جان دہلی میں) انتخاب کے سلسلے میں آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے اپنے ہم خیال مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کا اجلاس بلایا۔ اس اجلاس میں متعدد معروف شخصیتوں نے شرکت کی، جن میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولوی فضل الحق، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، خواجہ عبدالمجید (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)، مولانا سید میاں، مولا بخش سومرو، مولانا عبدالواحد (گوجراں والا) مولانا عبدالمجید سوہدروی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کے نام قابل ذکر ہیں۔ میں بھی اس میں شامل تھا...... اجلاس جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، مولانا داؤد غزنوی اس زمانے میں جمعیت علمائے ہند کے نائب صدر تھے۔

اجلاس شروع ہوا تو مولانا غزنوی نہیں پہنچے تھے۔ ان کا شدید انتظار ہو رہا تھا اور بار بار مولانا مدنی اور

Marfat.com

دیگر حضرات ایک دوسرے سے بے تابی کے عالم میں پوچھتے تھے کہ مولانا داؤد غزنوی نہیں آئے؟ دوسرے روز مولانا غزنوی تشریف لائے اور سب حضرات ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔ مولانا نے تاخیر سے پہنچنے پر معذرت کی۔ مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے نہایت احترام سے ان کو اپنے ساتھ مسندِ صدارت پر تشریف رکھنے کی درخواست کی۔ یہ سارا منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

تین دن اجلاس جاری رہا اور مولانا نے اس میں پوری دلچسپی لی۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیت علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ تھے، وہ بار بار مولانا غزنوی کے پاس آتے اور ضروری مشورے لیتے۔ نماز کا وقت ہوا تو مولانا مدنی نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، مگر انھوں نے مولانا مدنی ہی کی اقتدا میں نماز پڑھی۔

جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں ان دنوں ایک بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری قیام پذیر تھے۔ وہ اگرچہ جمعیت کے دفتر میں سکونت رکھتے تھے، مگر انھیں جمعیت سے شدید اختلاف تھا اور اس کا وہ برملا اظہار کرتے تھے۔ وہ اجلاس میں شریک نہیں ہوئے، موٹے بان کی بنی ہوئی بانس کی چارپائی بچھائے دروازے میں بیٹھے رہے۔ شرکائے اجلاس کے سامنے جمعیت سے اشتراک کے مضر پہلوؤں کی نشان دہی کرنا انھوں نے یوں سمجھیے کہ اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا۔ انھوں نے چار پانچ صفحات کی ایک تحریر مولانا غزنوی کو دی اور کہا یہ ایک ریزولیشن ہے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے وہ ریزولیشن لیا، اس کی چند سطریں پڑھیں اور کھڑے ہو کر فرمایا:

''حضرات! صوفی نذیر احمد صاحب ایک ریزولیشن پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کا عنوان ہے، دردِ سر......!''

مولانا نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے، مولانا مدنی بھی اپنی متانت وجلالت قدر کے باوجود ہنسی ضبط نہ کر سکے، صوفی صاحب بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے اور مولانا اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

اس سے کچھ عرصے بعد ملک میں عام انتخابات ہوئے۔ جمعیت علمائے ہند اور اس کی ہم نوا جماعتوں نے اپنے آدمی مسلم لیگ کے مقابلے میں کھڑے کیے، لیکن سب ہار گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے یہ لوگ ہارنے کے لیے ہی اکٹھے ہوئے تھے۔

مولانا محمد داؤد غزنوی اس زمانے میں پنجاب کانگرس کے صدر تھے اور پنجاب میں وہ واحد مسلمان تھے جو کانگریس کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے وسط میں وہ کانگرس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے اور اس سے کچھ عرصہ بعد پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف جو تحریک چلی تھی، اس میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

یہاں جمعیت علمائے ہند کے اجلاس دہلی کا ایک دلچسپ لطیفہ بھی سنتے جایے۔ شرکائے اجلاس میں ایک

Marfat.com

صاحب خواجہ عبدالمجید تھے جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ مسلکاً اہل حدیث تھے۔ ان کی شکل وشباہت اور وضع قطع مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتی جلتی تھی۔ قد البتہ مولانا سے کچھ چھوٹا تھا۔ کسی نے ان سے یہ بات کہی تو انھوں نے بتایا کہ متعدد مواقع پر لوگوں کو ان کے ابوالکلام ہونے کا شبہ پڑا ہے۔

خواجہ صاحب نے ایک دن چار بجے شرکاے اجلاس کے لیے چائے کا اہتمام کیا۔ ان کے ایک طرف مولانا مدنی اور دوسری طرف مولانا غزنوی تشریف فرما تھے۔ مولانا مدنی کو انھوں نے خود چائے بنا کر دی۔ مولانا ایک پیالی پی چکے تو خواجہ صاحب دوسری پیالی بنانے لگے۔

مولانا مدنی نے فرمایا: ''بس مجھے ایک ہی پیالی چائے پینا تھی۔''

خواجہ صاحب نے کہا: ''ایک پیالی اور پیجیے۔''

فرمایا: ''اب ضرورت نہیں رہی۔''...... یہ کہہ کر مولانا مدنی نے فرمایا: ''ایک پیالی اور پیجیے'' سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک مرتبہ صوبہ بہار کے ایک شہر میں جمعیت علماے ہند کا جلسہ ہوا...... وہاں کے دیہات سے میرے بہت سے شاگرد جلسے میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک گاؤں کے لوگ اصرار کر کے چند گھنٹوں کے لیے یکے پر بٹھا کر مجھے اپنے گاؤں لے گئے۔ تین چار بجے کا وقت تھا۔ ایک شخص نے اپنے گھر میں میرے لیے چائے کا اہتمام کیا، اور بھی بہت سے لوگ وہاں آگئے۔ اپنے ماحول کے مطابق میزبان کھانے کی چیزوں کا طشت بھر کر لایا اور چائے کے بڑے بڑے پیالے سامنے رکھ دیے گئے۔ میں نے چائے کا ایک پیالہ بڑی مشکل سے ختم کیا۔ اس نے کہا:

''حضرت اور پیجیے۔''

میں نے کہا: ''بس اب ضرورت نہیں رہی۔''

ایک صاحب نے نہایت عجز وانکسار سے کہا: ''حضرت پی لیجیے، موت ہی تو ہے۔''

مولانا مدنی نے یہ لطیفہ سنا کر فرمایا کہ یہ اس کے اخلاص کی بات تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ چائے ایک پیشاب سے نکل جائے گی۔

کانگرس سے مستعفی ہو کر مولانا داؤد غزنوی مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو اس حلقے میں بڑی خوشیاں منائی گئیں اور ان کا بے حد خیر مقدم کیا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ گڑھ مکتیشر (یوپی) میں ہندو مسلم فسادات ہوئے اور مسلمانوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان پہنچایا گیا تو اس کی تحقیقات کے لیے مسلم لیگ کی طرف سے خود قائداعظم محمد علی جناح نے مولانا داؤد غزنوی اور ملک فیروز خاں نون کو وہاں بھیجا۔ اس کی تفصیلی

Marfat.com

رپورٹ مولانا نے لکھی جو قائداعظم نے غور سے سنی اور اس کی روشنی میں مسلم لیگی رہنماؤں کو مناسب ہدایات دیں۔

عارضی حکومت (انٹیرم گورنمنٹ) کے زمانے میں پنجاب کی طرف سے مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے لیے پنجاب اسمبلی کے جن تین ممبروں کو نامزد کیا تھا، ان میں ایک مولانا داؤد غزنوی تھے، باقی دو ممبر راجا غضنفر علی خاں اور بیگم شاہ نواز تھے۔ مولانا مرکزی اسمبلی کے ہر اجلاس میں شامل ہوتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے دہلی ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور نئی دہلی میں ان کو سرکاری کوٹھی الاٹ کر دی گئی تھی، تقسیم ملک کے دور میں وہ دہلی سے لاہور آئے تھے۔

آزادیِ وطن کے بعد جو مسلمان ہندوستان کی سکونت ترک کر کے پاکستان آئے، وہ مختلف مقامات میں بکھر گئے تھے۔ مشرقی پنجاب کے بہت سے علاقوں میں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے لوگ اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ وہ وارد پاکستان ہوئے تو کوئی کہیں جا بسا اور کسی نے کہیں جا کر ٹھکانا بنا لیا۔ اس انتشار انگیز صورت حال سے متاثر ہو کر مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا محمد اسماعیل اور بعض دیگر حضرات نے مولانا سید داؤد غزنوی کے سامنے جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے لیے تجویز پیش کی۔ مولانا غزنوی نے اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور باہم مشورے سے ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) میں جماعت کے سرکردہ حضرات کا اجلاس بلایا، جس میں کم وبیش دو سو افراد نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تاسیس کی گئی۔ میں اس اجلاس میں شریک تھا۔ مولانا غزنوی کو متفقہ طور پر صدر منتخب کیا گیا اور پروفیسر عبدالقیوم کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔

۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کو ہمارے گاؤں بھیج کر مجھے لاہور بلایا گیا۔ ہم یہاں پہنچے تو وہ مجھے مولانا غزنوی کی خدمت میں لے گئے اور میرا ان سے تعارف کرایا۔ مجھے آفس سیکرٹری کے طور پر جمعیت کے دفتر میں فرائض بجالانا تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ان سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ بڑی وجاہت اور بارعب شخصیت کے مالک تھے، لیکن مجھے نہایت شفقت سے اپنے سامنے بٹھایا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف اس وقت دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں شیخ الحدیث کی مسند عالی پر فائز تھے، وہ بھی وہاں موجود تھے۔ مولانا غزنوی سوال کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا۔

لیکن سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے یہ عرض کر دوں کہ مولانا نے کبھی مجھے ''تم'' یا ''تو'' نہیں کہا۔ اردو میں مخاطب فرمایا تو ''آپ'' کہا اور پنجابی میں بات کی تو ''تسیں'' کہا۔ ۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء سے ان کی تاریخ وفات ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء تک یعنی پندرہ سال آٹھ دن، میں ان کی خدمت میں حاضر رہا۔ اتنے لمبے عرصے کی حاضری یا رفاقت میں ہمیشہ انھوں نے میرے لیے صیغہ خطاب ''آپ'' یا ''تسیں'' اختیار فرمایا۔

Marfat.com

لہٰذا میں آئندہ سطور میں، اپنے لیے ان کے وہی الفاظ استعمال کروں گا جو انھوں نے استعمال فرمائے۔ میں ''تم'' یا ''تو'' کے وہ الفاظ ان کی زبان پر نہیں لانا چاہتا، جن سے ان کی زبان شیریں بیان ہمیشہ احتراز کرتی رہی۔ البتہ اپنے صاحب زادوں...... جناب عمر فاروق غزنوی اور ابوبکر غزنوی ......کو وہ ''تم'' کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ان سے خطاب کی کوئی بات آئے گی، تو لفظ ''تم'' استعمال کروں گا اور اپنے لیے'' آپ'' کا لفظ لکھوں گا......تو آیئے اب سوال و جواب:

فرمایا: ''آزادی سے پہلے آپ کا تعلق پنجاب کے کس علاقے سے تھا؟''

عرض کیا: ''کوٹ کپورہ ریاست فرید کوٹ سے۔''

ارشاد ہوا: ''کوٹ کپورے میں انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے ہوتے تھے اور وہاں ہمارے کچھ مرید بھی تھے۔ ان جلسوں میں، میں اور میرے چچازاد بھائی حافظ محمد زکریا غزنوی شرکت کرتے رہے ہیں۔''

میں نہایت ادب سے عرض گزار ہوا کہ سنا ہے آپ ان جلسوں میں تشریف لے جاتے رہے ہیں، لیکن یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے۔

سوال ہوا: ''آپ کبھی کسی ادارے کے سیکرٹری رہے ہیں اور اس کا تھوڑا بہت تجربہ ہے؟''

جواب دیا: ''جی ہاں میں ایک سال ۱۹۴۶ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک انجمن اصلاح المسلمین کا اور دو سال ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کا جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔''

پرجا منڈل کے لفظ پر مولانا نے غور سے میری طرف دیکھا اور تعجب سے فرمایا: ''پرجا منڈل کے جنرل سیکرٹری؟''

عرض کیا: ''جی ہاں! پرجا منڈل پنجاب کی ریاستوں میں آزادی تحریر و تقریر کے لیے کوشاں تھی اور اس میں کامیاب بھی ہوگئی تھی۔''

مولانا اس جواب پر مسکرائے اور میں نے ان کی مسکراہٹ کو اپنی حوصلہ افزائی پر محمول کیا۔

ریاستی پرجا منڈل دراصل پنجاب کی ریاستوں میں کانگرس کی بدل تھی۔ مولانا نے اسی لیے اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ میں اس کا جنرل سیکرٹری رہا ہوں۔

فرمایا: ''آپ کو معلوم ہے پروفیسر عبدالقیوم صاحب مرکزی جمعیت کے ناظم اعلیٰ ہیں، جن کی ہدایات کے مطابق آپ کو کام کرنا ہے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ جا کر ان سے مل لیں اور کام کی نوعیت سمجھ لیں۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے جناب، میں ان سے کام کی نوعیت اور تفصیلات سمجھنے کی کوشش کروں گا۔''

مولانا نے اسی وقت نوے (۹۰) روپے میری تنخواہ مقرر کردی۔ میں اجازت لے کر کمرے سے باہر نکلنے لگا تو میرے کان میں یہ الفاظ پڑے جو انھوں نے مولانا عطاء اللہ صاحب سے فرمائے...... ''یہ معقول

Marfat.com

نوجوان ہے، اسے دفتر میں رکھ لینا چاہیے، محنت سے کام کرے گا۔''

''یہ معقول نوجوان ہے'' کے الفاظ میرے لیے بڑے مسرت انگیز تھے۔

دو تین منٹ کے بعد مولانا عطاء اللہ حنیف بھی باہر آگئے۔ مولانا غزنوی نے مجھے پھر بلایا، ایک کمرے کی طرف اشارہ کر کے جوان کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی کے کمرے سے ملحق تھا، فرمایا:

''یہ کمرہ آپ کے رہنے کے لیے ہے اور یہ ساتھ والے دو کمرے جن میں میز اور ''کرسیں'' پڑی ہیں، مرکزی جمعیت کے دفتر کے کمرے ہیں۔''

مولانا عطاء اللہ صاحب نے کہا: چلو اب تمھیں پروفیسر عبدالقیوم صاحب سے ملا لائیں۔ پروفیسر صاحب برانڈرتھ روڈ پر عظیم سٹریٹ میں مسجد مبارک کے قریب رہتے تھے۔

مولانا نے کسی سے سائیکل مانگا اور مجھ سے کہا: تم چلاؤ، میں پیچھے بیٹھتا ہوں۔ میرے لیے یہ امتحان کا وقت تھا۔ نہ میں لاہور کے راستوں سے واقف تھا اور نہ کبھی یہاں سائیکل چلایا تھا۔ اس زمانے میں آمدورفت کے لیے ایک ہی سڑک ہوتی تھی اور وہ بھی تنگ سی۔ کاروں، تانگوں اور سائیکلوں کا ایک سیلاب تھا جو لاہور کی سڑکوں پر بہتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر مولانا عطاء اللہ صاحب کو پیچھے بٹھایا اور چل پڑا۔ جو دعا مجھے آتی تھی میں نے سائیکل چلاتے چلاتے پڑھ ڈالی اور اللہ کے فضل سے ہم خیریت کے ساتھ پروفیسر صاحب کے گھر پہنچ گئے اور ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا: میں کالج سے فارغ ہو کر ایک بجے مرکزی جمعیت کے دفتر آؤں گا۔

پروفیسر صاحب حسب وعدہ ایک بجے تشریف لائے، تمام رجسٹر اور دفتر سے متعلق سب کاغذات میرے حوالے کیے، کام کی ضروری تفصیلات بتائیں اور کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

میں ان کے لیے بالکل نیا آدمی تھا، انھوں نے ایسے انداز میں مجھ سے باتیں کیں کہ میں آسانی سے ہر بات سمجھ سکوں اور انھیں اطمینان ہو جائے کہ مجھے کام اور اس کی نوعیت کا پتا چل گیا ہے۔

پروفیسر صاحب باقاعدگی سے روزانہ دفتر آتے تھے۔ آدھ پون گھنٹہ وہاں رہتے اور ہدایات دیتے۔

۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو پروفیسر عبدالقیوم سے پہلی دفعہ ہم کلام ہونے کا موقع ملا، اور پھر ۸۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کو ان کی وفات کے دن ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ اس طرح شمسی حساب سے ٹھیک چالیس برس نو مہینے ان سے تعلق رہا۔ غور کیا جائے تو انفرادی زندگی کی یہ بہت بڑی مدت ہے۔ اس طویل مدت میں مجھ پر ہمیشہ ان کی شفقتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں ملاقات ہوئی اور جب ہوئی دعائیں دیں۔ دعاؤں میں یاد رکھنا اس گنہگار پر ان کا وہ احسان عظیم ہے، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

Marfat.com

مولانا غزنوی اس مکان کی تیسری منزل میں رہتے تھے جہاں مرکزی جمعیت کا دفتر تھا۔ان کے اہل وعیال اب بھی وہیں سکونت پذیر ہیں۔اپنی قیام گاہ کے دروازے پر انھوں نے چقیں لگا رکھی تھیں۔اس کے بالکل سامنے کی دوسری منزل میں میرا سکونتی کمرہ تھا۔میرے اس کمرے میں جانے کے دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب مولانا نے آواز دی: ''مولوی محمد علی!''

میں نے آواز سنی، لیکن اس خیال سے باہر نہیں نکلا کہ یہاں کوئی مولوی محمد علی ہوں گے، جن کو آواز دی گئی ہے۔

دو منٹ بعد پھر یہی آواز میرے کانوں میں گونجی ...... ''مولوی محمد علی!!!''

میں نے اب بھی باہر نکلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تیسری مرتبہ پھر یہی آواز آئی تو میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔مولانا کھڑے تھے، فرمایا:

''آپ سوئے ہوئے تھے؟''

عرض کیا: ''جی نہیں، جاگ رہا تھا۔''

بولے: ''میری آواز کا جواب نہیں دیا!''

عرض کیا: ''آپ نے مولوی محمد علی کو آواز دی ہے، مجھے تو یاد نہیں فرمایا۔''

مسکراتے ہوئے فرمایا: ''معاف کیجیے گا، میں بھول گیا۔آپ کا نام تو مولوی اسحاق ہے۔''

مولانا عام طور پر مجھے ''مولوی اسحاق'' کہا کرتے تھے۔''مولوی اسحاق'' کا لفظ میں نے لکھ تو دیا ہے، قارئین کرام اسے پڑھ بھی لیں گے، لیکن افسوس ہے، ہزار کوشش کے باوجود وہ اسلوب گویائی، وہ گونج گرج اور وہ انداز تخاطب قلم کی زبان پر نہیں آسکتا جو مولانا کی زبان پر جلال اور لہجہ پر شکوہ کے ساتھ مخصوص تھا۔ان کی رعب دار آواز ''مولوی اسحاق......!'' اب بھی کانوں میں گونج رہی اور رس گھول رہی ہے۔

جس زمانے میں میرا ان سے تعلق ہوا، اس زمانے میں وہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ان دنوں ٹیکسیاں اور رکشے نہیں تھے۔مال روڈ پر تانگے چلتے تھے اور وہ ہمیشہ سالم تانگہ لیتے تھے۔پچھلی سیٹ پر خود بیٹھتے تھے اور آگے اس کو بٹھاتے تھے جو ان کے ساتھ ہوتا۔کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے اور گیلری کا پاس لے کر اجلاس دکھاتے۔ اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں لے جا کر پر تکلف چائے پلاتے۔سب ارکان اسمبلی اور وزرا ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔

آج کل جہاں واپڈا ہاؤس کا مغربی جانب کا دروازہ ہے، وہاں ایک ہوٹل تھا، جس کا نام تھا ''نیڈو ہوٹل''......اسمبلی کے اجلاس کے دنوں میں کبھی کبھی مولانا اس ہوٹل میں چائے کے لیے جاتے تھے۔انڈس ہوٹل کی جگہ الفنسٹن ہوٹل تھا، بعض دفعہ کچھ دوستوں کے ساتھ وہاں چلے جاتے۔ اسمبلی کے مغربی جانب درختوں کا ایک باغ نما جھنڈ سا تھا، اس میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جو اب بہت اچھی مسجد بنا لی گئی ہے اور

Marfat.com

درخت کاٹ دیے گئے ہیں، نماز کا وقت ہوتا تو مولانا اجلاس سے اٹھتے اور وہاں جا کر نماز ادا کرتے۔

اسمبلی کے رکن کو اس زمانے میں تین سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور تین سو روپے ماہانہ آمدنی پر انکم ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ بعض دفعہ مولانا مجھے اسمبلی سے چیک لانے کے لیے بھیجتے، تنخواہ میں سے تین روپے کاٹ کر دو سو ستانوے روپے کا چیک ملتا تھا۔ ان دنوں یہی ان کی آمدنی تھی، اور کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔

سادا مگر نہایت صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ چہرے کی ساخت، رنگ روپ اور قد وقامت سے یونانی شہزادے معلوم ہوتے تھے۔ جس طرف سے گزرتے لوگ خود بخود پیچھے ہٹتے اور راستہ دیتے جاتے تھے۔ اللہ نے ان کو دولت حسن سے بھی نوازا تھا اور دولت رعب سے بھی مالا مال کیا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مولانا صبح جاتے اور اسمبلی کے اجلاس سے فارغ ہو کر رات کو گیارہ بجے واپس گھر آتے۔ ایک دن فرمایا کہ کل تمام دن اجلاس میں مصروف رہا۔ بجٹ کی بعض اہم شقوں پر بحث ہو رہی تھی، نماز کے سوا اسمبلی ہال سے باہر نہیں نکلے۔ کھانا بھی نہیں کھا سکے۔ رات کو بارہ بجے گھر آ کر کھانا کھایا۔ پھر پنجابی میں کہا: ”سارا دن بھکھا بٹیر الڑدا رہیا۔“

اب آیئے اور گردن موڑ کر چالیس سال پیچھے کی طرف دیکھیے، ہم آپ کو مولانا سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں...... سرخ وسفید رنگ، باوقار و پر جلال چہرہ، کشادہ پیشانی فکر وتدبر کی لکیروں سے مزین، ستواں ناک، تیز آنکھیں ان کی ذہانت وفطانت کی غماز، سفید براق سی خوب صورت داڑھی، معتدل جسم، میانہ قد، گرجدار و بارعب آواز، گفتار وکردار میں جلال وجمال کا حسین امتزاج، متانت وسنجیدگی کا پیکر دلنواز، چال میں تمکنت، گفتگو میں اعتدال، رائے میں توازن، صاف ستھرے لباس میں ملبوس، وقت کے پابند، قاعدے وضابطے میں بندھے ہوئے، تکلفات سے پاک، تصنع سے نفور، دوستوں کے ہمدرد، ساتھیوں کے خیر خواہ، چھوٹوں پر دست شفقت رکھنے والے، علما کے قدر دان، بزرگان دین سے محبت اور تعلق خاطر میں بے مثل، علم وفضل میں یکتا، فکر ودانش میں بے نظیر، تحقیق وکاوش میں منفرد، فہم مسائل میں یگانہ اور ان کی تعبیر میں درجہ ممتاز پر فائز۔ وظائف واوراد کے خوگر، آزادی وطن کے قائد، رفتار سیاست کے نباض اور اس کے نشیب وفراز پر نگاہ عمیق رکھنے والے۔ عالمانہ وقار، صوفیانہ عادات، بزرگانہ اطوار، شاہانہ مزاج، بہادرانہ خصال، مجاہدانہ کردار، شجاعانہ یلغار۔ یہ تھے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ۔

مجھے بہت سے ارباب علم اور اصحاب کمال سے ملنے، ان سے باتیں کرنے اور تھوڑا یا زیادہ وقت ان کی محبت ورفاقت میں رہنے کے مواقع میسر آئے ہیں۔ لیکن میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ مولانا داؤد غزنوی متعدد معاملات میں بہت سے علما وزعما سے فائق تر تھے اور اپنی منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ وہ باجماعت نماز پڑھتے

Marfat.com

تھے، مگر خود امامت کرانے سے گریز کرتے تھے، نماز میں انتہائی خشوع وخضوع کی کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ ہر نماز کے بعد وظائف پڑھتے اور ہاتھ اٹھا کر لمبی دعا مانگتے تھے۔ نماز فجر، نماز مغرب اور نماز عشا کے بعد بالخصوص وظائف کا سلسلہ بہت طویل ہوتا تھا۔

ننگے سر نماز پڑھنا اور نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگنا ان کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ فعل تھا۔ رات کو اگرچہ کتنی ہی دیر سے سوتے، مگر نماز تہجد بالالتزام پڑھتے۔ وہ تخت اب بھی ان کے گھر میں موجود ہے، جس پر وہ تہجد ادا کرتے اور وظیفے پڑھتے تھے۔ لیکن اب وہ تخت نشین کہیں نظر نہیں آتا۔ تہجد کے بعد اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرتے تھے۔ فجر کی نماز کے لیے نیچے ہال میں تشریف لاتے وقت سیڑھیوں پر ان کے جوتوں کی کھٹکھاہٹ کی آواز آتی اور جب اترتے ہوئے طلبا کو آواز دیتے، ''لڑکو! اٹھ جاؤ'' تو سب طلبا آواز سنتے ہی چارپائیوں سے جلدی سے اٹھ جاتے۔

اہل علم کی بہت قدر کرتے تھے اور تمام مکاتب فقہ کے علما کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ خانوادۂ تصوف کے چشم وچراغ تھے، اس لیے بنیادی طور پر صحیح معنوں میں صوفی تھے۔ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے فرزند ارجمند اور حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کے پوتے تھے۔ عالی قدر باپ اور بلند مرتبت دادے کا زہد وتقویٰ اور فضل وکمال ان کی ذات میں سمٹ آیا تھا اور اس اعتبار سے وہ ان کے صحیح جانشین تھے۔

ان کے معاصرین میں جو علمائے عظام طریقت وسلوک سے رسم وراہ رکھتے تھے ان سے ان کو بالخصوص سے تعلق خاطر تھا۔ مثلاً مولانا عبدالقادر رائے پوری، مولانا مفتی محمد حسن امرتسری، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد علی لکھوی، صوفی عبداللہ (ماموں کانجن)، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا عبداللہ لائل پوری، میاں محمد باقر (جھوک دادو ضلع فیصل آباد) اور سید مولا بخش کوموی سے گہرے مراسم تھے۔ اب یہ تمام حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، رحمۃ اللہ علیہم۔ ان بزرگوں سے وہ خاص طور پر وظائف واوراد سے متعلق گفتگو کرتے تھے۔ بارہا مجھے ان کی اس قسم کی مجلسوں میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور میں اپنی تمام عملی کمزوریوں کے باوصف ان کی گفتگو سے متاثر ہوا، بلکہ بعض اوقات دل کے تاثر کی آنکھوں نے گواہی دی اور اس کو چھپانے کے لیے رومال سے مدد لینا پڑی۔

نہایت افسوس ہے کہ اب دعا ووظائف اور تصوف کی روایت جماعت اہل حدیث میں ختم ہو گئی ہے۔ بلکہ میں نے سنا ہے کہ بعض برخود غلط لوگ اسے بدعت قرار دیتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بات یہ ہے کہ ہمارے پرانے عالموں اور بزرگوں کی حالت ایسی تھی کہ انھیں ہر وقت اللہ کی ضرورت رہتی تھی، وہ اسی کے محتاج تھے، ہر شے اسی سے مانگتے اور ہر وقت مانگتے تھے، نماز کے بعد بھی اور دیگر اوقات

Marfat.com

میں بھی۔ ہاتھ اٹھا کر بھی اور بغیر ہاتھ اٹھائے بھی۔ وہ غریب تھے، نادار تھے اور اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے تھے۔ دور حاضر کے عالموں کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ زمینیں بھی، کاروبار بھی، کوٹھیاں بھی، موٹریں بھی اور بڑی بڑی ملازمتیں بھی۔ ان کے بیٹے سمندر پار کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے بھی ہیں اور کماتے بھی ہیں۔ رہی سہی کسر جہادوں نے پوری کر دی ہے۔ اب یہ کروڑوں میں کھیلتے اور اربوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ انھیں کیا ضرورت ہے اللہ سے ہاتھ اٹھا کر مانگنے اور اس کے احسان مند ہونے کی۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر سلام پھیرا اور ادھر یہ کوتل گھوڑے کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا تو رہا ایک طرف، گوناگوں مصروفیتوں کی بنا پر ان بچاروں کے لیے نماز پڑھنا مشکل ہے۔ یہ تو ان کی بہت بڑی قربانی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بے پناہ مصروفیات سے تھوڑا سا وقت نکال کر دو چار رکعت نماز پڑھ لیتے ہیں۔ اور نماز ہی میں ان کو کھرکنے اور جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرنے کو وقت ملتا ہے، اور یاد آتا ہے کہ ''کھرک فی الصلوٰۃ'' بھی ایک مسئلہ ہے، جس پر عمل ہونا چاہیے۔

پھر یہ بات بھی ان کے نزدیک محقق ہوگئی ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی روایات کے راوی ضعیف ہیں۔ اس تحقیق کے بارے میں اس فقیر پر تقصیر کی مؤدبانہ گزارش ہے کہ کیا وہ راوی ہم سے بھی ضعیف ہیں جو بات بات میں غلط بیانی کرتے، قدم قدم پر جھوٹ بولتے اور ہر معاملے میں دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ وظائف وادعیہ تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، دوسرے وہ جن کا کتب حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اور تیسرے وہ جو بزرگان دین سے منقول ہیں اور بعض امور ومعاملات میں مجرب ہیں۔ ہمارے بزرگ علما ان تینوں پر عامل رہے ہیں اور اب بھی اللہ کے نیک بندے، جن کو اللہ نے توفیق دی ہے، ان پر عامل ہیں۔

وظیفے کے عمل اور لفظ سے بعض دوست آخر گھبراتے کیوں ہیں؟ اگر ان کے بچوں کو سکول سے وظیفہ ملے تو بڑے خوش ہوتے ہیں اور گھر گھر بتاتے پھرتے ہیں کہ ان کے بچے ماشاء اللہ اتنے ہوشیار ہیں کہ وظیفہ لے رہے ہیں۔ لیکن اگر اللہ اور رسول کا بیان فرمودہ وظیفہ پڑھنے کو کہا جائے تو غلط ہو جائے۔ یہ عجیب منطق ہے کہ حکومت سے وظیفہ حاصل کرنا بالکل صحیح اور اللہ کے نام کا وظیفہ پڑھنا قطعی بدعت......!

سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی وظیفہ دل لگا کر اور متوجہ الی اللہ ہو کر پڑھا جائے تو بے عمل سے بے عمل کو بھی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قلب پر سکون واطمینان کی بارش ہو رہی ہے اور کیفیت عالم بالکل بدل گئی ہے۔

ہوا مسیح نفس گشت و بادنافہ کشا — درخت سبز شد ومرغ در خروش آمد
تنور لالہ چناں بر فروخت باد بہار — کہ غنچہ غرق عرق گشت وگل بہ خوش آمد

١٦٥٥٠٨

Marfat.com

میرے جیسا بے عمل مولانا کے سامنے تصوف کی کوئی بات کرتا تو خوش ہوتے۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں، کس ترنگ میں اس موضوع کا کوئی کلمہ بے خبری میں میرے منہ سے نکل گیا۔ سن کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا: ''مولوی اسحاق! آپ تو صوفی ہو گئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اپنی نشست سے اٹھے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مشہور کتاب التکشف جو تصوف سے متعلق ہے، ازراہ کرم میرا نام لکھ کر مجھے عنایت فرمائی اور اس کے مطالعے کی تاکید کی۔

ان کا کتب خانہ بہت بڑا تھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، شروح حدیث، اصول حدیث، ادبیات، تاریخ، فلسفہ، منطق وغیرہ کی کتابیں اس میں موجود تھیں۔ ہر کتاب کی خوب صورت و مضبوط جلد بندھواتے اور نہایت احتیاط سے بہترین الماریوں میں رکھتے۔ حدود مطالعہ اس قدر وسیع تھیں کہ ہر کتاب کے اہم مقامات پر ان کے ضروری نوٹس مرقوم اور نشان ثبت ہیں۔ وہ نیچے اپنے دفتر میں آ کر مصروف مطالعہ ہو جاتے۔ مسائل فقہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح ان کا زیادہ رجحان حنبلیت کی طرف تھا۔ لیکن وسعت نظر کا یہ عالم کہ ہر قسم کا ذخیرۂ فقہیات ان کے سامنے تھا اور اس موضوع پر اہل علم سے گفتگو کرتے تو بغیر کسی تکلف کے مختلف فقہی کتابوں کے زبانی حوالے دیتے اور ان کی عبارتوں کی عبادتیں پڑھتے جاتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات کی بڑی وجہ یہی اشتراک علم و مطالعہ تھا۔ فقہائے حنابلہ کے حالات میں مصر سے طبقات الحنابلہ (جو دو جلدوں پر مشتمل ہے) شائع ہوئی تو مولانا غزنوی ہندوستان میں پہلے شخص تھے، جنھوں نے مصر سے یہ کتاب منگوائی۔ یہ آزادی سے بہت عرصہ قبل کی بات ہے۔ اس زمانے میں ان کا کتب خانہ امرتسر میں تھا۔ مولانا آزاد امرتسر تشریف لے جاتے تو مسجد غزنویہ کا کتب خانہ دیکھتے۔ ایک مرتبہ اس کتب خانے میں انھوں نے طبقات الحنابلہ دیکھی تو مسرت انگیز تعجب کا اظہار کیا اور فرمایا: ''چند روز کے لیے میں یہ کتاب لے جانا چاہتا ہوں'' ...... مولانا غزنوی نے کتاب دے دی، لیکن پھر یہ کتاب واپس نہیں آئی...... مولانا غزنوی نے اپنے کتب خانے کے لیے اس کا ایک اور نسخہ منگوالیا جو اب تک ان کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

وہ بے حد نفاست پسند تھے۔ ان کے مطالعے کی میز خاصی بڑی تھی، جس پر اسی سائز کا شیشہ رکھا ہوا تھا۔ اس پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا دھبا بھی نظر آ جاتا تو جب تک اسے مٹا نہ دیتے، چین نہ آتا۔ میز پر کتابیں انتہائی سلیقے اور قرینے سے رکھتے۔ اوپر نیچے پڑی ہوئی کسی کتاب کا کوئی ادنیٰ سا گوشہ بھی ترتیب سے باہر ہوتا تو اسے اپنے ہاتھ سے ٹھیک کرتے۔ کسی کی میز پر بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے کاغذ یا مرتب کتابیں دیکھتے تو انھیں سخت ذہنی تکلیف ہوتی۔ بعض دفعہ اس کا اظہار بھی کر دیتے۔

Marfat.com

چائے دن میں دو یا تین بار پیتے تھے، لیکن پانی عام لوگوں سے کچھ زیادہ نوش فرماتے۔ شیشے کے جگ میں پانی منگواتے اور شیشے کے گلاس سے پیتے، لیکن میز پر ایک چھینٹا بھی گرنے نہ دیتے۔ اگر گر جاتا تو اسی وقت اپنے خادم محمد عمر کو بلا کر اچھے کپڑے سے صاف کراتے اور صفائی کے لیے خاص ہدایات دیتے۔

ایک دن میں ان کے سامنے بیٹھا تھا کہ مجھے پانی کا گلاس عنایت فرمایا۔ اتفاق سے مجھ سے پانی کا ایک چھینٹا میز پر گر گیا۔ میں نے اسے ہاتھ سے صاف کرنا شروع کر دیا...... انھیں میری یہ حرکت ناگوار گزری۔ فرمایا: ''آپ کیوں صاف کر رہے ہیں۔ محمد عمر صاف کر دے گا''...... فوراً محمد عمر کو بلایا اور میز کا وہ حصہ جہاں پانی کا چھینٹا گرا تھا، اچھی طرح صاف کرایا۔

فتوے وہ بڑی تحقیق سے لکھتے تھے، مسئلہ طلاق کے بارے میں مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے اگر کوئی شخص فتویٰ لینے آتا تو اسے داؤد غزنوی کے پاس جانے اور ان سے فتویٰ لینے کی ہدایت فرماتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں اہل حدیث کا نقطہ نظر احناف سے مختلف ہے۔ احناف کے نزدیک ایک مجلس کی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں اور طلاق واقع ہو جاتی ہے، جسے طلاق مغلظہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اہل حدیث کے نزدیک ایک مجلس میں بے شک کتنی ہی مرتبہ طلاق طلاق کا لفظ بولا جائے، اسے ایک ہی طلاق سمجھا جائے گا اور وہ طلاق رجعی ہوگی، جیسا کہ قرآن وحدیث میں مذکور ہے۔

فتوے کے سلسلے میں مولانا غزنوی کا معمول یہ تھا کہ کتاب وسنت سے جو حوالہ زیر بحث مسئلے کے متعلق دیتے، اس کی تائید میں ائمہ فقہ میں سے کسی امام کا قول ضرور نقل کرتے، دیگر علمائے غزنویہ بھی اسی پر عمل پیرا تھے۔ مولانا کے فتوے بہت محققانہ ہوتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کہا کرتے تھے کہ اگر مولانا غزنوی سیاسیات میں نہ جاتے اور صرف فتویٰ نویسی کرتے تو بہت بڑے مفتی ہوتے۔

سفر پر جاتے تو اپنے رفیق سفر کا پورا خیال رکھتے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے آدمی کے ساتھ چھوٹا آدمی سفر کرے تو اسے انتہائی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ بڑے آدمی کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں، چھوٹے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اسے وہ اس کا خادم سمجھتے ہیں۔ بڑا آدمی بھی بسا اوقات اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ لیکن مولانا میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ میں نے ان کے ساتھ بہت سفر کیے ہیں اور ہر سفر میں موج میں رہا ہوں۔ مئی ۱۹۴۹ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے ایک روز مجھ سے کہا: ''مولوی اسحاق! آپ میرے ساتھ ہمارے مریدوں کے ہاں جائیں گے؟''

عرض کیا: ''اگر آپ حکم فرمائیں گے تو تعمیل کرنے سے مجھے خوشی ہوگی۔''

فرمایا: ''تیار ہو جایے، تین جوڑے کپڑوں کے رکھیے۔ کل نو بجے کی ٹرین سے چلیں گے۔ پہلے منڈی واربرٹن

Marfat.com

جائیں گے، ایک رات وہاں رہیں گے۔ پھر فیروز وٹواں جائیں گے، چار دن کے بعد واپسی ہوگی۔''

مولانا ہمیشہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے اور ان کے ساتھ میرا یہ پہلا سفر تھا۔ ہم نو بجے کے لگ بھگ لاہور سے روانہ ہوئے اور گیارہ بجے کے قریب منڈی واربرٹن پہنچے۔ وہاں کی شیخ برادری کے لوگ مولانا کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ میں اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا آفس سیکرٹری تھا۔ ٹرین سے اترتے ہی مولانا نے میرے متعلق فرمایا: ''ہمارے سیکرٹری صاحب کہاں ہیں؟''

پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہا: ''آیئے مولوی اسحاق! آگے تشریف لے آیئے۔''

ان کے یہ الفاظ سن کر استقبال کرنے والے میری طرف لپکے اور بڑے احترام کے ساتھ مجھے آگے کیا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ قیام گاہ پر پہنچے تو غسل کے لیے پانی رکھا گیا۔ مولانا نے فرمایا: ''پہلے ہمارے سیکرٹری صاحب غسل کریں گے، میں بعد میں کروں گا۔'' کھانے کے لیے بیٹھے تو بار بار کہتے، یہ بوٹی لیجیے، یہ چاول کھایئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میزبانوں نے ہر موقعے پر میرا خیال رکھا۔

اب تو جگہ جگہ سڑکوں کے جال بچھ گئے ہیں، منڈی واربرٹن سے فیروز وٹواں تک بھی عرصہ ہوا، سڑک بن چکی ہے، اس زمانے میں یہ صورت حال نہ تھی۔ چار میل کا یہ کچا راستہ لوگ پیدل یا گھوڑوں پر طے کرتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن فیروز وٹواں کے لوگ گھوڑے لے کر آ گئے۔ گھوڑوں پر سوار ہونے لگے تو فرمایا: ''ہمارے سیکرٹری صاحب جوان ہیں، ان کو اچھے گھوڑے پر سوار کرائیں۔''...... گاؤں پہنچے تو وہاں بھی میرا خیال رکھا۔ میرے متعلق مولانا کی مشفقانہ باتوں کی بنا پر لوگ مجھ سے اس طرح سے پیش آئے کہ مجھے شرم محسوس ہونے لگی۔

فیروز وٹواں میں ہمارے اصل میزبان ملک احمد خاں نمبردار تھے جو وٹو برادری سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں کے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ وہ خود تو بہت سال ہوئے وفات پا گئے ہیں، لیکن ان کے خاندان کے لوگ مولانا کے خاندان سے انھی کی طرح عقیدت واحترام کے جذبات رکھتے ہیں۔

ملک احمد خاں بوڑھے آدمی تھے۔ دراز قامت اور وجیہہ۔ بہت متقی بزرگ تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کے والد محترم مولانا عبدالجبار غزنوی کے ارادت مند تھے چند لمحوں میں مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھا کہ آپ غزنوی خاندان کے حلقہ ارادت میں کیسے شامل ہوئے اور ان کی کون سی ادا آپ کو پسند آئی؟ اس کا انھوں نے جو جواب دیا، وہ انھی کے الفاظ میں عرض کرتا ہوں، فرق صرف یہ ہے کہ انھوں نے یہ باتیں پنجابی میں بیان کی تھیں، میں اردو میں ان کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

بولے:

میں اٹھارہ سال کی عمر کا تھا کہ گنٹھیا کے موذی مرض میں مبتلا ہو گیا۔ والد نے بہت علاج کرائے، مگر

Marfat.com

آرام نہ آیا۔ وہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے عقیدت مند تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی دعا کو اللہ شرف قبولیت سے نوازتا ہے اور بیمار کے لیے دعا کریں تو اللہ اسے صحت عطا فرماتا ہے۔

اس زمانے میں گھوڑے کے سوا ہمارے گاؤں سے امرتسر جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ شام کے وقت میرے والد نے گٹھڑی کی شکل میں مجھے گھوڑی پر رکھا اور امرتسر کو چل پڑے۔ ہم امرتسر مسجد غزنویہ میں پہنچے تو فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔ والد نے مجھے گھوڑی کی پیٹھ سے اٹھایا اور مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ گھوڑی باہر باندھی اور خود وضو کر کے جماعت میں شریک ہو گئے۔ جو بزرگ جماعت کرا رہے تھے، وہ اس قدر دردوسوز سے قرآن مجید پڑھتے تھے کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ نماز کے بعد اس بزرگ نے میری طرف دیکھا تو پوچھا یہ کون شخص ہے؟ والد نے کھڑے ہو کر تمام صورت حال بیان کی اور نہایت ادب سے دعا کے لیے درخواست کی۔ پاک باز بزرگ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جیسے جیسے وہ دعا مانگ رہے تھے، مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جوڑوں کی بندش کھل رہی ہے۔ تین دن اور تین راتیں ہم وہاں رہے۔ ہمارا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔ گھوڑی کے لیے چارے کا انتظام بھی وہی کرتے تھے۔ تین دن کے بعد میں اللہ کے فضل سے بالکل تندرست تھا۔ گھوڑی پر سوار ہو کر امرتسر سے اپنے گاؤں فیروز وٹواں آیا۔ دعا کرنے والے بزرگ مولانا داؤد غزنوی کے صاحبِ تقویٰ والد مولانا عبدالجبار غزنوی تھے، جنھیں لوگ امام صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد اللہ کے بے پایاں فضل اور امام صاحب کی دعا سے جسمانی حالت کے ساتھ ساتھ ہماری روحانی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ ہم ان کے مرید ہیں اور یہ ہمارے مرشد......!

مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی قبولیت دعا کے متعلق بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایک عجیب و غریب واقعہ مولانا داؤد غزنوی نے بھی سنایا اور ایک مدراسی بزرگ عزیز اللہ (گھڑی ساز) نے بھی بیان کیا۔

عزیز اللہ صاحب ۱۹۵۸ء میں اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لیے ہندوستان کے شہر مدراس سے کراچی آئے۔ کراچی سے عازم لاہور ہوئے۔ اس سفر کا مقصد مولانا داؤد غزنوی اور علماے اہل حدیث سے ملاقات تھا۔ وہ ہفت روزہ الاعتصام کے خریدار تھے اور میں اس وقت اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ وہ الاعتصام کے دفتر آئے اور اپنا نام اور پتا بتایا۔ میں ان کے نام سے واقف تھا۔ الاعتصام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ بھی میرے نام سے آشنا تھے۔ میں نے ان کو اعزاز سے بٹھایا اور مدراسی ہونے کی وجہ سے ان کی خدمت میں مچھلی پیش کی۔ مولانا غزنوی اس دن لاہور سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ میں نے مولانا کے ساتھ ان کی عقیدت کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ۱۹۱۰ء کے پس وپیش مدراس سے تین آدمی چمڑے کی تجارت کے سلسلے میں امرتسر آئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام اسماعیل تھا۔ اسماعیل فجر کی نماز روزانہ مسجد غزنویہ میں مولانا

Marfat.com

عبدالجبار غزنوی کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔ ایک روز انھوں نے ان سے پوچھا: ''آپ کون ہیں؟ کہاں کے رہنے والے ہیں اور یہاں کیا کام کرتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا: ''میرا نام اسماعیل ہے، مدراس کا رہنے والا ہوں اور یہاں چمڑے کی تجارت کی غرض سے آیا ہوں۔''

ان کی بات سن کر امام صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اگر دعا خلوص قلب سے کی جائے اور گڑگڑا کر اللہ کے حضور کسی چیز کی التجا کی جائے تو لازماً اپنا رنگ دکھاتی ہے اور خارج میں اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دعا کا نتیجہ بھی یہی نکلا اور اللہ نے اسے شرف قبول سے نوازا۔ عزیز اللہ اور اس کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے بتایا کہ اسماعیل کہا کرتے تھے کہ جب امام صاحب دعا مانگ رہے تھے، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دولت میری جھولی میں گر رہی ہے۔

وہ بزرگ ''کاکا اسماعیل'' تھے۔...... مدراس کی بولی میں ''کاکا'' سیٹھ کو کہا جاتا ہے۔

کاکا اسماعیل مسلکاً اہل حدیث تھے اور نہایت نیک آدمی تھے۔ صوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ میں انھوں نے کئی ایکڑ زمین خریدی، اسے آباد کیا اور اپنے والد محمد عمر کے نام سے اس کا نام ''عمر آباد'' رکھا۔ ''جامعہ دار السلام'' کے نام سے وہاں ایک بہت بڑا دارالعلوم قائم کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے مشہور اسلامی مدارس میں ہوتا ہے۔ مولانا داؤد غزنوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ آزادی سے پہلے جامعہ دارالسلام کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں انھیں باقاعدہ دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ وہ وہاں جاتے تو کاکا اسماعیل اور ان کے خاندان کے لوگ انتہائی احترام سے پیش آتے اور امام صاحب کی دعا کا واقعہ ضرور بیان کرتے۔

خود اپنا ایک واقعہ مولانا نے ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا...... انگریزی حکومت کے خلاف کانگرس کی ''ہندوستان خالی کرو'' (QUIT INDIA) تحریک جب ۸۔ اگست ۱۹۴۲ء کو شروع ہوئی تو لاہور سے مولانا غزنوی کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں کانگرس سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں سنٹرل جیل لاہور میں رکھا گیا تھا۔ مولانا ستمبر ۱۹۴۵ء تک تین سال اس جیل میں قید رہے اور یہ ان کی سیاسی زندگی کی آخری قید تھی۔ پہلی مرتبہ وہ تحریک خلافت (۱۹۱۹ء) میں قید ہوئے تھے۔ آزادی وطن کے لیے وہ ملک کی مختلف جیلوں میں دس سال کے لگ بھگ قید رہے...... سنٹرل جیل لاہور کو مسمار کر کے وہاں شادمان کالونی تعمیر کر دی گئی ہے۔

مولانا غزنوی نے بتایا کہ ۱۹۴۳ء کو جیل میں ان کی آنکھوں میں درد شروع ہوا جو آہستہ آہستہ سخت تکلیف دہ شکل اختیار کر گیا۔ جیل کے افسروں نے اچھے سے اچھے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں اور بڑے علاج کرائے، لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی علاج نہیں کراؤں گا، جو اللہ کو

Marfat.com

منظور ہے، ہو جائے گا۔ اس فیصلے پر ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ رات کو خواب میں گتے کا ایک بڑا سا بورڈ میرے سامنے آیا، جس پر صاف اور نمایاں الفاظ میں قرآن مجید کی ایک آیت مرقوم تھی۔ چند لمحے وہ بورڈ میرے سامنے رہا اور اس اثنا میں قرآن مجید کی وہ آیت میں نے یاد کر لی۔ اس کے فوراً بعد آنکھ کھلی تو وہ آیت میری زبان پر جاری تھی۔ میں نے اس خواب کی تعبیر یہ سمجھی کہ یہ آیت پڑھ کر پانی پر دم کرنا چاہیے اور پھر وہ پانی آنکھوں پر ڈالنا چاہیے۔ ان شاء اللہ اس سے افاقہ ہوگا۔ چناں چہ چند روز میں نے یہ عمل کیا اور آنکھوں کی تکلیف ختم ہوگئی۔ اس کے بعد بعض اور لوگوں کو بھی یہ عمل بتایا، ان کی تکلیف بھی اللہ نے رفع فرما دی۔ وہ آیت سورۂ کہف کی پہلی آیت تھی۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ (الکہف : ۱)

مولانا نے ۶۸ برس عمر پائی اور ان کی نظر آخر وقت تک بہت اچھی رہی۔ باریک الفاظ پڑھتے وقت، بعض دفعہ وہ عینک لگا تو لیتے تھے، لیکن اس کی انھیں زیادہ ضرورت نہ تھی۔

مولانا داؤد غزنوی کے والد مکرم مولانا عبدالجبار غزنوی کے سلسلے کے یہاں دو واقعے اور سنتے جایے جن کے راوی ہندوستان کے معروف عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ہیں۔ سید صاحب موصوف فرماتے ہیں:

''مولانا عبدالجبار کے متعلق میں نے عرصہ ہوا دو واقعات سنے تھے، جن کے راوی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی مرحوم ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ کہ جب ندوۃ العلماء کا امرتسر میں پہلا جلسہ ہوا تو مولانا سید عبدالجبارؒ بقید حیات تھے اور قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ یہ درس بہت سادہ اور بے تکلف ہوتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی ایک مرتبہ اس درس میں شریک ہوئے۔ واپس آکر انھوں نے شیروانی صاحب سے بیان کیا کہ مولانا عبدالجبار صاحبؒ اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اور جب نام پاک اللہ ان کی زبان سے نکلتا تھا، تو بے اختیار جی چاہتا تھا کہ سر ان کے قدموں پر رکھ دیا جائے۔''

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ

''ندوۃ العلماء کے جلسے میں شریک ہونے والے علماء اور باہر کے مہمانوں کی کسی جگہ دعوت تھی۔ ایک بہت بڑا طویل دالان تھا، جس میں کئی درجے تھے۔ ایک طرف کے بیٹھنے والے دوسری طرف کے بیٹھنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک درجے میں مولانا سید محمد علی مونگیری بانی و ناظم ندوۃ العلما شریک دسترخواں تھے۔ دوسری طرف ایک دوسرے درجے میں کچھ اور مہمان تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب مونگیری نے شیروانی صاحب سے پوچھا

Marfat.com

کہ جس طرف آپ بیٹھے ہوئے تھے، اس طرف اور کون کون تھا۔ انھوں نے چند معززین علماء کا نام لیا۔ مولانا محمد علی صاحب ہر ایک نام پر فرماتے جاتے تھے کہ کوئی اور بھی تھا؟ جب انھوں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی کا نام لیا تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں اسی وجہ سے میرا دل بے اختیار اس طرف کھنچ رہا تھا۔"

مولانا عبدالجبار غزنوی ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) کو غزنی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دو بھائیوں مولانا محمد اور مولانا احمد سے حاصل کی۔ اپنے والد محترم حضرت عبداللہ غزنوی سے بھی علمی اور روحانی فیض پایا۔ پھر دہلی تشریف لے گئے اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے کتب حدیث پڑھیں اور سند حاصل کی۔ زندگی بھر امرتسر میں مدرسہ غزنویہ میں طلبا کو علم حدیث پڑھاتے رہے۔ ۲۵۔ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ (۲۷۔ اگست ۱۹۱۳ء) کو جمعۃ الوداع کے دن امرتسر میں وفات پائی۔

اب پھر مولانا داؤد غزنوی کی طرف آئیے۔

مولانا داؤد غزنوی باہر تشریف لے جاتے یا گھر میں قیام فرما ہوتے، ان کا خادم محمد عمر تبّتی ان کے ساتھ ہوتا۔ اسے مولانا کا پرائیویٹ سیکرٹری کہنا چاہیے۔ مولانا اس پر بہت اعتماد کرتے اور اس کی دیانت وامانت کی قدر کرتے تھے۔ مولانا کے ہاں آمدورفت رکھنے والے سب لوگ محمد عمر کو جانتے تھے۔ چناں چہ جو شخص مولانا سے ملنے آتا، پہلے محمد عمر سے رابطہ پیدا کرتا اور وہی مولانا سے اس کی ملاقات کا ذریعہ بنتا۔ وہ کئی سال دہلی رہا تھا اور وہیں سے تقسیم ملک کے زمانے میں مولانا کے ساتھ لاہور آیا تھا۔

وہ قدرے بہرہ تھا، بسا اوقات مولانا کی بات سمجھ نہ پاتا تو زبان سے یہ الفاظ کہنے کے بجائے کہ میں سمجھا نہیں، دوبارہ سمجھایے، بھویں اچکا کر اور آنکھوں کو حرکت دے کر استفہامی اشارہ کرتا، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی، پھر بتایے کیا کہنا چاہتے ہیں...... ایسے موقعے پر وہاں کوئی اور شخص موجود ہوتا تو محمد عمر کی اس ادائے خاص پر مولانا ہنستے اور فرماتے: "اسے سمجھایے کہ مجلس کے آداب کا خیال رکھا کرے۔ یہ بارہ سال دلی میں رہا اور بھاڑ جھونکتا رہا۔"

محمد عمر کوئی سودا لے کر آتا تو اگرچہ مولانا کتنے ہی مصروف ہوتے اور کوئی بھی شخص ان کے پاس بیٹھا ہوتا اور کتنی ہی ضروری گفتگو کر رہے ہوتے، وہ بغیر کچھ دیکھے اور احساس کیے، سیدھا مولانا کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور کہتا:

"مولانا صاحب! آپ نے اتنا پیسہ دیا تھا۔ فلاں چیز اتنے کی آئی اور فلاں اتنے کی۔ اتنا پیسہ بچا، لو پکڑو"...... یا کہتا: "اتنا پیسہ میرا زائد خرچ ہوا، مجھے دے دو۔"

مولانا لاکھ کہتے کہ پھر حساب کریں گے، اب تم جاؤ، مگر وہ ایک نہ سنتا اور کہتا "پھر آپ بھول جائے گا۔ یہ

Marfat.com

لے لو۔'' مولانا کو ہر حال میں اس کی بات ماننا پڑتی۔ وہ کمرے سے باہر چلا جاتا تو اس کی بڑی تعریف کرتے۔
مولانا سے ملاقات کے سلسلے میں وہ بڑے بڑوں کی پروا نہ کرتا اور لوگ اس کے محتاج ہوتے۔ کوئی مولانا کے متعلق پوچھتا تو جواب دیتا: ''مولانا صاحب ابھی نہیں آیا''...... یا کہتا: ''ابھی آیا ہے، تھوڑی دیر ٹھہرو......'' ملاقاتی اس کو اہم شخصیت قرار دیتے اور مولانا سے اس کے بارے میں کچھ کہتے تو وہ مسکرانے لگتے۔
بعض اوقات مولانا اس کو چھیڑ دیتے۔ ''محمد عمر کوئی دلی کی بات سناؤ''...... وہ ''سنو مولانا صاحب!'' کہہ کر شروع ہو جاتا اور بات ختم ہونے کو نہ آتی...... مولانا فرماتے:
''اچھا محمد عمر! باقی آئندہ۔ اب تم کام کرو۔ یہ داستان امیر حمزہ ابھی ختم نہیں ہوگی۔''
محمد عمر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نیچے کے ایک کمرے میں رہتا تھا، وہ حقہ پینے کا عادی تھا۔ مولانا کسی کام کے لیے اس کو اوپر سے آواز دیتے۔ ''محمد عمر......!'' بعض دفعہ وہ کوئی جواب نہ دیتا، آرام سے بیٹھا حقہ پیتا رہتا۔ پھر فرماتے: ''حقہ پی رہا ہوگا......''
اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہتے: ''محمد عمر! حقہ پی کر اوپر آنا۔ ضروری کام ہے۔''
دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبا محمد عمر کی اس ادا اور مولانا کی اس سے اس قسم کی گفتگو سے محظوظ ہوتے۔ باہر سے آنے والے مہمان تعجب کا اظہار کرتے کہ ملازم اتنے بڑے آدمی سے کس قسم کا برتاؤ کر رہا ہے۔ میری موجودگی میں محمد عمر سے مولانا کوئی بات کہتے تو مجھے فرماتے: ''مولوی اسحاق! اسے سمجھایے، مجھے پریشان نہ کیا کرے، بات سمجھ لیا کرے۔'' پھر اس سے کہتے: ''بولے بدل میری بات سنو اور اسے سمجھو!''
اس سے زیادہ خفا ہوتے تو کہتے: ''چغد کہیں کے، کبھی کوئی بات سمجھ بھی لیا کرو۔''
محمد عمر ان دنوں پچاس کے پیٹے میں ہوگا۔ تبتیوں کی سی مختصر داڑھی تھی اور پٹے رکھے ہوئے تھے جو ہمیشہ الجھے رہتے تھے۔ مولانا اس کو صاف ستھرا رہنے کی تاکید کرتے۔ اس کو اچھے کپڑے بنا کر دیتے، اچھا جوتا خرید کر دیتے۔ ایک مرتبہ اپنی گھڑی اور شیروانی عنایت فرمائی۔
ایک دن نہایت عجیب واقعہ پیش آیا۔ مولانا نے محمد عمر کو کسی کام کے لیے کہا لیکن وہ ان کی بات سمجھ نہ پایا اور کام نہ ہو سکا۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مولانا سخت پریشان ہوئے اور جلال میں آگئے اور محمد عمر کو تھپڑ دے مارا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کمرے سے باہر نکل گیا اور ملازمت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا، مولانا نے اسی وقت دارالعلوم کے ایک استاد حافظ عبدالرشید کو بلایا۔ وہ منت سماجت کر کے محمد عمر کو مولانا کے پاس لائے۔ اب مولانا بھی رو رہے ہیں اور محمد عمر بھی رو رہا ہے۔ مولانا حافظ عبدالرشید کو سارا واقعہ سنایا۔ پھر محمد عمر کی طرف متوجہ ہوئے اور بہ انداز لجاجت کہا:

Marfat.com

''لو محمد عمر میں حاضر ہوں۔ میں نے تم کو تھپڑ مارا ہے۔ یا تو تم مجھے تھپڑ مارو اور اپنا بدلہ لے لو یا معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔'' مولانا رو رہے تھے اور بار بار یہ الفاظ کہہ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے محمد عمر کو منانے میں کامیاب ہوئے۔ مولوی عبدالعظیم انصاری اس وقت جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر تھے، وہ بھی اس مجلس میں موجود تھے۔

ایک واقعہ خود میرے ساتھ اپریل ۱۹۶۰ء میں پیش آیا، جو میرے لیے بے حد ندامت کا باعث اور مولانا غزنوی کی انتہائی عالی ظرفی کا مظہر تھا۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ الاعتصام میں شائع شدہ میرے ایک اداریے کے بارے میں مولانا نے فرمایا کہ آپ نے اس میں جو فلاں بات لکھی ہے، وہ صحیح نہیں ہے...... میں خدا جانے اپنی عادت کے خلاف کس گستاخانہ موڈ میں تھا کہ میں نے کہا جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ مولانا نے فرمایا: میں نے اسے غور سے پڑھا ہے، وہ صحیح نہیں۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا: بالکل صحیح ہے...... انھوں نے تیسری دفعہ قدرے نرمی سے کہا: مجھے تو وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے پہلے سے زیادہ سخت الفاظ میں جواب دیا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہی صحیح ہے، اور کوئی بات صحیح نہیں...... مولانا خاموش ہوگئے۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔ چند منٹ کے بعد ان کے کمرے سے باہر نکل گیا اور اوپر اپنے دفتر جا کر اس طرح کام میں مصروف ہوگیا جیسے کوئی بات ہوئی نہیں۔

دوسرے دن دس بجے کے قریب پھر ان کے کمرے میں گیا۔ اس وقت دو آدمی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک ان کے بڑے صاحب زادے مولوی عمر فاروق غزنوی جو اخبار پڑھ رہے تھے اور ایک مولانا محمد اسحاق رحمانی جو جامع مسجد اہل حدیث سرگودھا کے خطیب تھے اور مولانا سے کسی جماعتی سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا تو نہایت شفقت سے فرمایا: ''تشریف رکھیے۔''

میں بیٹھ گیا، بولے: ''کیا ارشاد ہے؟''

مجھے ایک مضمون کے حوالے کے لیے ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ میں نے وہ کتاب مانگی تو اپنی نشست سے اٹھے اور الماری سے کتاب نکال کر مجھے عنایت کی۔ پھر فرمایا: ''اس کتاب کی کس سلسلے میں ضرورت ہے؟''

میں نے مدعا بیان کیا تو دو تین کتابیں اور دے دیں اور فرمایا: ''ان کے فلاں فلاں مقامات دیکھ لیجیے، مسئلہ زیادہ واضح ہو جائے گا۔''

میں نے شکریہ ادا کیا اور کتابیں لے کر چلنے لگا تو فرمایا: ''ایڈیٹر صاحب! ہمارے پاس تو آپ بیٹھتے ہی نہیں۔ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر ہمارے پاس بھی بیٹھیے۔''

میں نیازمندی سے شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔ جس کام سے ان کی خدمت میں گیا تھا، اس سے متعلق چند

Marfat.com

باتیں بیان کرنے کے بعد تھوڑا سا توقف کیا اور پھر فرمایا:

''کل آپ نے ہماری داڑھی نہیں نوچی، اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

یہ الفاظ سن کر میرا برا حال ہوگیا۔ مارے شرم کے زمین میں گڑ گیا، اور ایسے معلوم ہوا کہ ایک دم خون خشک ہوگیا ہے...... اس وقت مولانا کے علاوہ ہم تین آدمی تھے اور تینوں خاموش......! مولانا بھی یہ الفاظ کہہ کر چپ ہوگئے۔ تین چار منٹ سناٹا رہا۔ میں نے سر جھکائے عرض کیا: ''اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے آپ کو ذہنی اذیت پہنچی ہے تو معذرت خواہ ہوں۔''

یہ بھی میری غلطی تھی کہ صاف لفظوں میں نہ معذرت چاہی، نہ معافی مانگی۔ اگر مگر کے گول مول لفظ استعمال کرتا رہا۔ ماحول کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ وہاں سے اٹھنا بھی مشکل تھا اور بیٹھے رہنا اس سے بھی زیادہ مشکل...... ایک ایک لمحہ سالوں پر بھاری تھا۔ آخر تین چار منٹ کے بعد مولانا نے فرمایا:

''اچھا آپ کام کیجیے۔''

اٹھا تو قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ ابھی دروازے تک گیا تھا کہ پیچھے سے پھر آواز آئی، ''ذرا بات سنیے۔''

نگاہیں نیچے کیے پیچھے کو ہٹا تو ارشاد فرمایا: ''اب میں ایک ضروری کام سے کہیں جارہا ہوں، تین بجے کے قریب آؤں گا اور عصر کی نماز یہیں پڑھوں گا۔ عصر کے بعد مجھے ضرور ملیے۔''

یہ ایک اور مصیبت سر پر آپڑی...... یہ وقت تو جیسے تیسے گزر ہی گیا تھا اب اس کی فکر درپیش تھی جو عصر کے بعد آنے والا تھا۔ لکھنا پڑھنا سب بھول چکا تھا اور جو کچھ سوچا تھا ذہن سے نکل گیا تھا۔ ایک مصیبت یہ تھی کہ دوسرے دن اخبار پریس بھیجنا تھا اور کاتب سر پر کھڑا تھا۔ میں نے باہر سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کاتب سے یہ کہہ کر کہ ''آج کچھ نہیں ہوسکتا، کل دیکھی جائے گی۔'' دفتر سے نکل گیا۔

میں سچ کہنے کا تو بے شک عادی ہوں اور جس بات کو اپنے نقطہ نظر سے صحیح سمجھتا ہوں اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہوں، لیکن بزرگوں کی بے ادبی ہرگز میرا شیوہ نہیں۔ اس لیے فارسی کے یہ الفاظ...... ''بے ادب محروم گشت از فضل رب'' ...... ذہن میں تیزی سے چکر لگا رہے تھے اور میں اس پر انتہائی پریشان تھا۔

عصر کے قریب واپس آیا تو کاتب نے پھر مضمون مانگنا شروع کر دیا۔ لیکن اپنی یہ حالت تھی کہ لکھنا تو رہا ایک طرف قلم ہاتھ میں پکڑنے کی سکت نہ تھی...... میں کمرے میں بیٹھ گیا، عصر کی اذان ہوئی اور میں نے سنی۔ پھر دارالعلوم کے ہال میں تکبیر کی آواز بھی میرے کانوں میں پڑی۔ امام کے رکوع وسجود میں جاتے اور اٹھتے وقت اللہ اکبر کی صدائیں بھی میرے پردۂ سماع سے ٹکراتی رہیں۔ لیکن میں نماز کے لیے نیچے نہیں آیا، اس لیے کہ معلوم نہیں مولانا کیا کہیں گے اور کتنی ڈانٹ پلائیں گے۔ میرا انتظار کر کے چلے جائیں تو نیچے اتروں اور

Marfat.com

نماز پڑھ کر گھر جاؤں۔

مولانا کے دفتر کا کمرہ نیچے کی منزل میں تھا اور میرا دوسری منزل میں۔ نماز عصر سے کافی دیر بعد آواز دی، ''مولوی اسحاق!''

میں نے آواز سنی، مگر جواب نہیں دیا۔

پھر آواز آئی، ''مولوی اسحاق!''

دوسری آواز پر میں اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اوپر سے مولانا کو سلام کیا۔

فرمایا: ''میں نے کہا تھا، عصر کے بعد مجھے ملنا۔''

عرض کیا: ''آپ نے نماز عصر کے بعد ملنے کا حکم دیا تھا، میں نے ابھی تک عصر کی نماز ہی نہیں پڑھی۔''

مولانا مسکرائے اور اندر چلے گئے۔ میں اٹھا، نیچے آیا، آہستہ آہستہ وضو کیا اور خلاف معمول نہایت آرام سے نماز پڑھی اور عادت کے برعکس انتہائی خشوع وخضوع سے دعا مانگی کہ یا اللہ! مجھ کم عقل پر جو مشکل گھڑی آن پڑی ہے، اس سے نجات دلا۔

اس اثنا میں مولانا ایک دفعہ باہر نکلے اور مجھے دعا مانگتا ہوا دیکھ کر کمرے میں چلے گئے۔ وہ بھی سوچتے ہوں گے کہ آج یہ کتنا نیک بنا بیٹھا ہے...... کافی دیر کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور نہایت ادب سے سلام کر کے بیٹھ گیا۔

فرمایا: ''فارغ ہوگئے؟''

آہستہ سے عرض کیا: ''جی!''

بولے: ''چلیے آج سیر کرنے چلیں۔''

محمد عمر سے تانگہ لانے کو کہا اور خود دارالعلوم کے بڑے دروازے پر کھڑے ہوگئے۔ میں بھی ذہن پر شرمندگی کی بوجھل گٹھڑی اٹھائے ساتھ کھڑا ہوں۔ تانگہ آیا، خود پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور مجھے اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں اور فرمایا: ''مولوی اسحاق! عرصہ ہوا کسی ہوٹل میں نہیں گئے، چلیے آج کسی ہوٹل میں جا کر کچھ کھائیں اور پھر چائے پئیں۔''

مجھے ندامت کی وجہ سے کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی، لیکن مولانا چہک رہے تھے۔ پہلے پاک ٹی ہاؤس گئے۔ وہاں جو لوگ بیٹھے تھے، وہ سلام کے لیے کھڑے ہوگئے اور مولانا کو ہوٹل میں دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ دو تین نے کہہ بھی دیا کہ ''مولانا! آپ کہاں؟''

فرمایا: ''اپنے ایڈیٹر صاحب کو سیر کے لیے لایا ہوں۔''

Marfat.com

ہوٹل سے دو دو شامی کباب کھائے اور چائے پی۔ بل ادا کر کے باہر نکلے تو بولے، چلیے آپ کو مٹھائی کھلائیں۔ وہاں سے کمرشل بلڈنگ سے ہوتے ہوئے نابھہ روڈ اور لٹن روڈ کے چوک میں مٹھائی والے کی دکان پر گئے۔ وہ امرتسریوں کی دکان تھی۔ انھوں نے اندر لے جا کر صاف ستھری جگہ پر بٹھایا اور مولانا کے آرڈر پر مٹھائی پیش کی۔ وہاں بھی حیرت وتعجب سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ ''آج آپ کدھر گھوم رہے ہیں؟'' ان کو بھی یہی جواب دیا کہ ''ایڈیٹر صاحب کو سیر کرا رہا ہوں۔''

اس کے بعد تانگہ لیا اور چھاؤنی جا پہنچے، وہاں ایک دو دوستوں سے ملے اور ان سے باتیں کیں۔ جہاں جہاں گئے، سب سے بڑھا چڑھا کر میرا تعارف کرایا۔ راستے میں باتیں بھی خوب سنائیں، شعر بھی سنائے اور پنجابی کہاوتیں بھی بیان کیں۔ مجھ سے بھی کچھ باتیں پوچھیں، نہایت خوش گوار موڈ میں تھے۔ مغرب کی نماز ہم نے چھاؤنی میں مولانا کے ایک دوست کے گھر میں پڑھی۔ تقریباً تین گھنٹے کے بعد واپس آئے۔ میں حساب کرتا رہا، کھانے پینے اور تانگے کے کرائے پر ان کے اڑتیس روپے خرچ ہوئے جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ واپس آ کر فرمایا: ''مولوی اسحاق! کبھی کبھی ہوٹلوں میں بھی جانا چاہیے، آپ تو جاتے رہتے ہیں۔ میں تو بہت عرصے کے بعد آج کسی ہوٹل میں گیا ہوں۔''

یہ سب کچھ مولانا نے اس لیے کیا کہ وہ مجھے بتانا چاہتے تھے کہ ان کے دل میں میرے متعلق کوئی بات نہیں ہے اور جو کچھ انھوں نے صبح کہا تھا، وہ اسی وقت ختم ہو گیا تھا، اب میرے بارے میں ان کا دل قطعی طور پر صاف ہے، مجھے ان کی طرف سے کسی قسم کی پریشانی میں نہیں رہنا چاہیے۔

یہ اس بڑے شخص کا کردار تھا، جس سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے گستاخانہ انداز اختیار کیا تھا۔ اب مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آتا اور کبھی نظر آئے گا بھی نہیں۔

مولانا کو وفات پائے تینتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن اس گستاخی پر میں اب بھی ان سے شرمندہ ہوں۔

اپریل ۱۹۵۴ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی دوسری سالانہ کانفرنس مولانا محمد علی قصوری (ایم۔اے کینٹب) کے زیر صدارت ملتان میں منعقد ہو رہی تھی۔ مولانا غزنوی نے مجھے حکم دیا کہ اس موقعے پر الاعتصام معمول سے ضخیم اور زیادہ تعداد میں چھاپا جائے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت سے مکتوبات تھے جو مولانا نے ان کے اور ان کے والد بزرگ وار مولانا عبدالقادر قصوری کے نام بھیجے تھے۔ ان میں ایک مکتوب جماعت اہل حدیث کی تنظیم سے متعلق تھا، میں نے وہ مکتوب اس نمبر میں شائع کر دیا۔ اس میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے ایک استفسار کے جواب میں مولانا آزاد نے لکھا تھا کہ اس جماعت کی تنظیم نہیں ہو سکتی۔ میرا ذہن اس طرف تو نہ گیا، صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے خط

Marfat.com

کی طرف گیا اور میں نے اسے چھاپ دیا۔

لاہور سے ملتان کے لیے روانہ ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ مولانا غزنوی میرے کمرے میں نیچے تشریف لائے۔

فرمایا: ''اخبار چھپ کر آ گیا......؟''

عرض کیا: ''آ گیا!''

فرمایا: ''دکھایے۔''

دیکھا تو اس میں مولانا آزاد کا خط تھا، پہلے تو خط دیکھ کر خوش ہوئے، لیکن جب اسے پڑھا تو غصے سے اخبار پھینک دیا۔ بولے:

''مولانا ابوالکلام کی سند لے کر کہ جماعت اہل حدیث کی تنظیم نہیں ہو سکتی، آپ جماعت کی تنظیم فرمانے چلے ہیں۔''

یہ الفاظ کہے اور تیزی سے حالت خفگی میں کمرے سے باہر نکل گئے۔ اب مجھے خیال آیا کہ اس موقعے پر یہ خط نہیں چھاپنا چاہیے تھا، خط چھاپ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں سخت افسوس میں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے کہ دس منٹ بعد مولانا پھر تشریف لائے۔

فرمایا: ''سامان باندھ لیا؟''

عرض کیا: ''جی ہاں! باندھ لیا۔''

فرمایا: ''پندرہ سو اخبار بوری میں ڈال لیجیے۔ جلسہ گاہ میں اس کا اعلان کریں گے۔''

اب کوئی بات ان کے دل میں نہ تھی، سب بھول چکے تھے۔ راستے میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ملتان گئے تو جلسے میں اخبار کی توسیع اشاعت کے لیے زوردار اعلان کیا اور کہا کہ اس میں مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط شائع ہوا ہے۔

یہ تمام خطوط جو مولانا ابوالکلام آزاد نے مختلف اوقات میں مولانا محی الدین احمد قصوری اور ان کے والد گرامی مولانا عبدالقادر قصوری کے نام ارسال فرمائے تھے، ستائیس تھے، مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کر کے جولائی ۱۹۵۹ء میں یہ خطوط تبرکات آزاد کے نام سے شائع کرا دیے تھے۔

ملتان کانفرنس کے سلسلے کا ایک اور واقعہ یاد آیا، وہ بھی سن لیجیے...... مذہبی جماعتوں کے تبلیغی جلسوں میں علمائے کرام اور شرکائے جلسہ کے کھانے کا انتظام عام طور سے مقامی انجمنیں کرتی ہیں اور اس کا کسی سے کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔ لیکن مرکزی جمعیت اہل حدیث کے جلسوں کے سامعین و مقررین سے کھانے کے تھوڑے سے پیسے وصول کیے جاتے تھے۔ ظاہر ہے علما و مقررین ایسے مواقع پر پیسے دینے کے عادی نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک یہ عجیب سی بات ہے کہ پہلے خطوط لکھ کر بلاؤ، پھر ان سے تقریریں کراؤ، روٹی پانی کا وقت آئے تو

Marfat.com

اس کے پیسے وصول کرنا شروع کر دو۔

ملتان میں مولانا کو جس مکان میں ٹھہرایا گیا تھا، میرے قیام کا انتظام بھی وہیں تھا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو بہت سے علمائے کرام مولانا کے پاس بیٹھے تھے۔ کھانے کا انتظام کسی اور جگہ تھا، اور پیسے دے کر کھانے کا ٹکٹ لینا پڑتا تھا، لیکن علما کو اس کا علم نہیں تھا کہ کھانا قیمتاً ملے گا اور اس کے لیے ٹکٹ خریدنا پڑے گا۔

مولانا نے آہستہ سے مجھے کہا کہ میں ان علما کے سامنے آپ سے پوچھوں گا کہ کھانے کا ٹکٹ کہاں سے ملتا ہے اور آپ نے لے لیا ہے یا نہیں تا کہ انھیں صورت حال کا علم ہو جائے۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ''مولوی اسحاق! کھانا تیار ہے یا نہیں اور آپ نے ٹکٹ لے لیا ہے یا ابھی نہیں لیا؟'' میں نے عرض کیا: ''کھانا تھوڑی دیر کو تیار ہو جائے گا اور میں ٹکٹ لے آؤں گا۔''

فرمایا: ''کتنے کا ٹکٹ ملے گا؟'' اس سوال کے فوراً بعد مجھے پیسے دیے اور فرمایا: ''میرا ٹکٹ بھی لیتے آنا۔'' علمائے کرام کے لیے یہ نئی بات تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سب کو کھانے کے ٹکٹ خریدنے پڑے۔

مولانا کی بہت سی باتیں ذہن میں گھومنے لگی ہیں۔ حیران ہوں کہ کون سی بات لکھوں اور کون سی چھوڑوں۔

ایک مرتبہ (غالباً جون ۱۹۵۵ء میں) مولانا کو فیصل آباد سے مولانا عبید اللہ احرار نے ٹیلی فون کیا کہ یہاں ملک خضر حیات خاں ٹوانہ (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب) کی کئی مربعے زرعی زمینی ہے، جس میں اچھا خاصا آم کا باغ بھی ہے۔ وہ زمین فروخت ہو رہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دو مربعے زمین جامعہ سلفیہ کے لیے خرید لی جائے۔ خضر حیات کے کارندے سے ہماری بات ہوئی ہے، اگر آپ خضر حیات سے مل لیں تو شاید قیمت میں کچھ رعایت ہو جائے۔

مولانا نے ٹیلی فون پر خضر حیات سے رابطہ پیدا کیا اور ملاقات کے لیے وقت طے ہو گیا۔ وہ لاہور چھاؤنی رہتے تھے۔ میں اور مولانا ان کی کوٹھی پر پہنچے، وہ گیٹ پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ علاقائی لباس شلوار اور ململ کا کرتا پہنے اور سر پر طرے دار پگڑی سجائے ہوئے......! نہایت تپاک سے ملے۔ شربت پیش کیا اور باتیں ہونے لگیں۔ زمین کا سودا تو نہ ہوا، لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا کا ان کے دل میں انتہائی احترام تھا...... پورے ایک گھنٹے کی نشست میں ملکی سیاست کے متعلق کوئی بات نہیں ہوئی، اشارے کنائے میں بھی اس کے کسی پہلو کا ذکر نہیں ہوا۔

تقسیم ملک سے قبل پنجاب کی سیاسی فضا میں پربودھ چندر کا نام خاصا ابھرا ہوا تھا۔ ان کا تعلق کانگرس سے تھا۔ میکلوڈ روڈ پر جس بلڈنگ میں ہفت روزہ چٹان کا دفتر اور پریس ہے، یہ پربودھ چندر کی بلڈنگ تھی۔

Marfat.com

اس میں ان کا ہوٹل بھی تھا، جس کا نام ویرا ہوٹل تھا۔شورش کاشمیری مرحوم کے وہ گہرے دوست تھے۔مولانا جس زمانے میں پنجاب کانگرس کے صدر تھے، پربودھ چندران کے پرسنل سیکرٹری تھے اور پنجاب کانگرس کے سیکرٹری اس وقت پرتاب سنگھ کیروں تھے جو آزادی وطن سے پندرہ سولہ سال بعد قتل ہو گئے تھے۔

تقسیم ملک کے بعد پربودھ چندر مشرقی پنجاب کی وزارت میں بھی شامل رہے اور کچھ عرصہ مشرقی پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ غالباً ۱۹۶۱ء میں وہ لاہور آئے تو شورش مرحوم کے ساتھ مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور انتہائی نرم زبان اور تکریم کے ساتھ مولانا سے باتیں کیں۔

مولانا کی علمی اور خاندانی شہرت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بیرون ملک کے جو اہل علم لاہور آتے، وہ ان سے ملنے کی کوشش کرتے۔خود مولانا بھی ان کی قیام گاہ پر جانے کی سعی فرماتے۔۱۹۵۸ء کو لاہور میں اسلامک کلوکیم (اسلامی مجلس مذاکرہ) کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر بہت سے مدعوین کے پاس خود مولانا بھی گئے اور متعدد حضرات مولانا کی خدمت میں بھی آئے، جن میں علامہ محمد اسد (جرمن) بھی شامل تھے۔ وہ ہمارے ایک مرحوم دوست میجر محمد حسین بابری کے ساتھ مولانا کے مکان پر تشریف لائے تھے۔ بابری صاحب کے علامہ اسد سے پرانے مراسم تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے بابری صاحب کو ملاقات کے لیے سوئٹزرلینڈ بھی بلایا تھا۔ اسد صاحب مولانا سے ملاقات کے لیے آئے تو ان کی امریکن بیوی (جن کا اسلامی نام غالباً حمیدہ تھا) ان کے ساتھ تھیں۔ وہ ساڑھی میں ملبوس تھیں، اسد صاحب مجھ سے متعارف تھے اور میں اس وقت الاعتصام کا ایڈیٹر تھا۔ پہلے وہ میرے دفتر آئے۔ بیگم کو میرے کمرے میں بٹھایا۔ چوں کہ وہ پردہ نہیں کرتی تھیں، اس لیے مولانا کے احترام میں ان کے پاس لے کر نہیں گئے۔

اسد صاحب فقہیات میں حنبلی تھے۔ لمبے تڑنگے خوب صورت آدمی، بعض مسائل میں دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے۔کہا کرتے تھے کہ سگریٹ سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن روزے کی حالت میں وہ خود سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ محلی ابن حزم بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اردو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ بول بھی لیتے تھے، عربی اور فارسی بھی جانتے تھے۔

اپنے دارالعلوم کے بارے میں ایک دفعہ مولانا نے ایک دلچسپ لطیفہ سنایا...... اے ایچ قریشی محکمہ اوقاف کے چیف ایڈمنسٹریٹر تھے۔ دارالعلوم کی بلڈنگ محکمہ اوقاف کی ملکیت ہے۔ مولانا اس سلسلے میں ایک دن قریشی صاحب سے ملنے گئے اور ان کو بتایا کہ ہمارے دارالعلوم میں لاہور سے باہر کے طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کئی اساتذہ ان کو تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تعلیم دینے پر متعین ہیں۔ ہم دارالعلوم کی طرف سے طلبا کو کتابیں، چارپائیاں، کھانا، صابن، رہائش وغیرہ مفت مہیا کرتے ہیں۔

Marfat.com

قریشی صاحب نے کہا: ''اچھا مولانا آپ کے یتیم خانے میں اور کیا انتظام ہے؟''

مولانا نے کہا: ''ہم دارالعلوم کی طرف سے ان کی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں۔'' ضروریات کی تفصیل دوبارہ بیان کی۔

قریشی صاحب نے پھر کہا: ''اپنے یتیم خانے میں آپ اور کیا سہولتیں دیتے ہیں؟''

مولانا نے کہا: ''قریشی صاحب! آپ نے میری بات سنی نہیں۔ میں عرض کر رہا ہوں، ہمارا دارالعلوم ہے، جس میں ہم مختلف مقامات سے آئے ہوئے طلبا کو قرآن وحدیث وغیرہ علوم پڑھاتے ہیں اور ان کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔''

قریشی صاحب نے جواب دیا: ''مولانا! آپ اس کی جو علامتیں بیان کر رہے ہیں وہ تو یتیم خانے کی ہیں اور نام اس کو دارالعلوم کا دیتے ہیں۔''

مولانا نے قریشی صاحب کے دفتر سے آتے ہی مجھے یہ لطیفہ سنایا اور فرمایا میں نے بڑی مشکل سے ان کو یقین دلایا کہ یہ یتیم خانہ نہیں، دارالعلوم ہے۔

مولانا جس موضوع سے متعلق بات کرتے، بعض دفعہ اس کی اس انداز سے تشریح فرماتے کہ اصل چیز آنکھوں کے سامنے آجاتی...... گرمیوں کا موسم تھا۔ میں مولانا کے پاس بیٹھا تھا کہ دارالعلوم کے چند طلبا آئے۔ مولانا نے فرمایا: ''کہیے مولوی صاحبان کس طرح تشریف آوری ہوئی؟''

ان کے نمائندے نے آہستگی سے جواب دیا: دو ہفتوں کی چھٹیوں کی درخواست ہے۔

فرمایا: ''کیوں؟''

کہا: ''گرمی بہت پڑ رہی ہے، ہم اپنے اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں۔''

فرمایا: ''یہاں گرمیوں سے بچاؤ کے تمام انتظامات موجود ہیں۔ ٹھنڈا پانی ہے، نہانے کا معقول انتظام ہے، بجلی کے پنکھے ہیں، وسیع عمارت ہے، اس سے زیادہ آپ کو اور کیا چاہیے؟''

طلبا نے کہا: ''دیہات کی فضا آج کل بہت اچھی ہوتی ہے۔ کھلی جگہ ہے، سایہ دار درخت ہیں اور باغات ہیں۔''

مولانا نے ان میں سے ایک طالب علم سے پوچھا: ''تمھارا باغ ہے؟''

کہا: ''نہیں۔''

دوسرے سے پوچھا: ''تمھارا باغ ہے؟''

بولا: ''نہیں۔''

Marfat.com

تیسرے سے پوچھا: ''تمھارا باغ ہے؟''

جواب دیا: ''نہیں۔''

فرمایا: ''تو تمھیں لوگوں کے باغوں سے کیا تعلق؟''

پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

فرمایا: ''مولوی اسحاق! آپ دیہات کی زندگی سے واقف ہیں۔ لوگ کھیتوں میں جا کر کیکر کے درخت کے نیچے چارپائی ڈال لیتے ہیں۔ کیکر کے چھوٹے چھوٹے پتوں سے دھوپ جھانکتی رہتی ہے۔ پھر جیسے جیسے سایہ بدلتا رہتا ہے، لوگ اپنی چارپائیاں کھینچتے جاتے ہیں۔ دس منٹ بھی آرام سے ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔''

یہ کہہ کر طلبا کی طرف رخ کیا اور کہا: ''جاؤ آرام کرو، پڑھو، کوئی چھٹی نہیں۔ پڑھنے کے لیے آئے ہو یا چھٹیوں کے لیے؟''

شیش محل روڈ پر ایک شخص محمد یوسف رہتے ہیں۔ ۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ ایک دن مولانا نے مجھ سے کہا: ''یوسف کے لیے اخبار میں کسی قسم کی ملازمت کا انتظام کر دیں۔'' اس زمانے میں یوسف نوجوان تھے اور دارالعلوم میں باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ مولانا کے کہنے سے ان کو اخبار میں رکھ لیا گیا۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ سائیکل پر جاؤ اور جلدی سے گنپت روڈ کی فلاں دکان سے فلاں چیز لاؤ...... وہ دن پریس میں اخبار بھیجنے کا تھا اور میں سخت مصروف تھا...... اخبار کا دفتر دوسری منزل میں تھا۔ یوسف صاحب نیچے اترے اور گنپت روڈ جانے کے بجائے ظہر کی نماز کے لیے وضو کیا اور اذان کہنا شروع کر دی...... میں نے اوپر بیٹھے یوسف کی آواز سنی تو سخت غصہ آیا۔ جلدی سے نیچے اترا، یوسف نے آدھی اذان کہی ہوگی کہ میں نے اس کو پیچھے سے گردن سے پکڑا اور اسی طرح پیچھے کو کھینچتا ہوا دور تک لے گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کانوں میں تھے، لیکن آواز بند ہو چکی تھی۔

گرمیوں کے دن تھے اور مولانا نیچے اپنے دفتر کے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ اذان کا سلسلہ درمیان سے ٹوٹ گیا تو وہ گھبرا کر باہر نکلے کہ معلوم نہیں موذن کو کیا ہو گیا۔ جب دیکھا کہ میں یوسف کو الٹی طرف سے کھینچتا ہوا لیے جا رہا ہوں تو مسکراتے ہوئے فرمایا: ''کیا بات ہوئی؟''

پنجابی میں عرض کی، ''میں کام کی بھسوڑی میں پھنسا ہوا ہوں اور یوسف کا انتظار کر رہا ہوں، لیکن یوسف صاحب اذان فرما رہے ہیں۔'' بھسوڑی کا لفظ سن کر مولانا ہنسے...... میں نے کہا: ''یوسف کے ذمے اذان کہنا نہیں، دفتر کا کام کرنا ہے''...... مولانا مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔

اب یوسف بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کی بڑی بڑی سفید داڑھی پورے چہرے پر پھیلی ہوئی ہے۔ میں شیش محل روڈ کی طرف جاؤں اور یوسف سے ملاقات ہو جائے تو عام طور پر یہ واقعہ بیان کرتا ہوں۔ یوسف سن کر خوب ہنستا ہے۔

Marfat.com

مولانا بہت سے اوصاف وخصوصیات کے مالک تھے، ان میں ایک بڑی صفت اور خصوصیت یہ تھی کہ مختلف طریقوں سے وہ دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے اور اس کو خود اعتمادی کا درس دیتے تھے۔ اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں، جن کا تعلق خود میری ذات سے ہے۔

مجھے لاہور آئے دو مہینے کے قریب ہوئے تھے کہ ایک دن چار بجے کے قریب وہ میرے کمرے میں تشریف لائے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور سخت سرد ہوا چل رہی تھی۔ ان دنوں اوورکوٹ پہننے کا رواج تھا۔ مولانا شیروانی کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سردیوں میں وہ پتلون نما گرم پاجامہ زیب تن کرتے تھے۔ اس موقعے پر بھی انھوں نے اسی طرز کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔

ارشاد ہوا: ''ایک نہایت ضروری کام کے لیے آپ کو تکلیف دینا چاہتا ہوں۔''

عرض کیا: ''حکم فرمایے، مجھے تعمیل حکم سے مسرت ہوگی۔''

بولے: ''موچی دروازے فلاں شخص کے پاس جایے اور اسے میرا یہ پیغام دیجیے۔'' پیغام واقعی بڑا اہم تھا۔

عرض کیا: ''اس کے لیے میرے خیال میں کسی اور شخص کو بھیجنا مناسب رہے گا۔''

فرمایا: ''آپ سے زیادہ کون شخص مناسب ہوگا۔ آپ نہ صرف مناسب ہیں بلکہ انسب ہیں۔ مجھے یقین ہے آپ جائیں گے تو کام کر کے آئیں گے۔''

عرض کیا: ''دعا فرمایے، اللہ کامیاب کرے۔''

فرمایا: ''بس دعا ہی دعا ہے، آپ اللہ کا نام لے کر چلے جایے۔''

میں چلنے لگا تو فرمایا: ''سخت سردی پڑ رہی ہے۔ یہ کوٹ پہن لیں۔'' جلدی سے اوورکوٹ اتار کر میرے حوالے کیا بلکہ خود پہنایا۔

عرض کیا: ''اس کی ضرورت نہیں''......

بولے: ''مجھے معلوم ہے آپ نوجوان ہیں، لیکن اسے پہن لیجیے۔'' ساتھ ہی انکار کے باوجود دو روپے تانگے کا کرایہ عنایت کیا۔ حالانکہ اس زمانے میں شیش محل روڈ سے سالم تانگے کے آٹھ آنے اور ایک سواری کا دو آنے کرایہ تھا۔ پیدل چلنے والا دس بارہ منٹ میں موچی دروازے پہنچ جاتا تھا۔

میں نے تانگے والے کو دو آنے دیے اور موچی دروازے جا کر متعلقہ آدمی سے ملا، اس کو مولانا کا پیغام دیا، چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور کام ہوگیا۔ واپسی پر پھر دو آنے خرچ کیے اور ٹھیک چالیس منٹ میں واپس آگیا۔

مولانا نیچے اپنے دفتر میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کام کی تکمیل کی خوش خبری سنائی تو نہایت خوش ہوئے۔ فرمایا: ''یہ آپ ہی کے کرنے کا کام تھا، اور کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا''...... یہ ان کی میرے لیے حوصلہ

Marfat.com

افزائی اور اظہار اعتماد تھا۔ اس میں یہ درس بھی مضمر تھا کہ خود میں بھی اپنے آپ پر اعتماد کروں۔

دو روپے میں سے صرف چار آنے خرچ ہوئے تھے، پونے دو روپے ان کی خدمت میں پیش کیے تو نہیں لیے۔ فرمایا: ''یہ اپنے پاس ہی رکھیں۔''

اس وقت ۶۴ پیسے کا روپیہ اور چار پیسے کا آنہ تھا اور اس کی کیا قدر و قیمت تھی......؟ سنیے!

میرے دو وقت کے کھانے کا انتظام طلبا کے لنگر میں کیا گیا تھا جس کا اہتمام محمد عمر تبتی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ نہایت دیانت دار شخص تھا۔ ہفتے میں دو دن سبزی، دو دن دال، دو دن گائے کا گوشت اور ایک دن بکرے کا گوشت پکتا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ مہینے کے بعد اخراجات کا حساب کر لیا جائے گا۔ جو پیسے مجھے دینا پڑیں گے۔ محمد عمر کو دے دیا کروں گا...... چنانچہ مہینہ ختم ہونے کے بعد حساب کیا گیا تو صرف چھ روپے مجھے دینا پڑے تھے۔ پانچ مہینے اس مشترکہ کھانے میں شریک رہا اور چھ روپے مہینے کے حساب سے ادا کرتا رہا۔

یہ تھا ۱۹۴۸ء اور ۱۹۴۹ء میں کھانے پینے کی عام چیزوں کا بھاؤ......اب چھ روپے میں چائے کی پیالی نہیں ملتی۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ یہ بہت ہی نازک اور اہم واقعہ ہے......۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ جمعیت اہل حدیث کا خزانہ بالکل خالی تھا۔ لفظ ''خزانہ'' تو یونہی زبان قلم سے نکل گیا ورنہ عملاً تو اس زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں تھا...... مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی طرف سے جو علی الترتیب جمعیت اہل حدیث کے صدر اور ناظم اعلیٰ تھے، حکم ہوا کہ میں صوفی عبداللہ صاحب کے پاس اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) جاؤں اور ان سے جمعیت کے لیے پانچ سو روپے قرض لاؤں۔

صوفی صاحب عابد و زاہد بزرگ تھے۔ طویل عرصے تک سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے وابستہ رہے تھے۔ اصلاً وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) کے رہنے والے تھے اور اعوان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ اوڈاں والا (تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد) میں انھوں نے ایک دینی مدرسہ قائم کر لیا تھا۔ اب یہ بہت بڑی درس گاہ دارالعلوم تعلیم الاسلام کے نام سے ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) میں قائم ہے۔ صوفی صاحب کی دعا کو اللہ شرف قبولیت سے نوازتا تھا۔ میرے مشفق و مہربان تھے۔ ۲۸۔ اپریل ۱۹۷۵ء (۳۔ ربیع الاول ۱۳۹۵ھ) کو فوت ہوئے۔ دارالعلوم کے احاطے میں مدفون ہیں۔

بہر حال دونوں بزرگوں نے ارشاد فرمایا کہ میں صوفی صاحب کے پاس جاؤں اور جمعیت کے لیے پانچ سو روپے بصورت قرض لاؤں۔ اس زمانے میں پانچ سو روپے کا اطلاق بہت بڑی رقم پر ہوتا تھا اور اتنی بڑی رقم قرض کے طور پر کسی کو دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

میں نے معذرت کی کہ اتنا بڑا کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ کسی اور صاحب کو بھیجیے جو صوفی صاحب

Marfat.com

سے تعلق رکھتے ہوں۔ نہ وہ مجھے جانتے ہیں اور نہ مجھے اتنی بڑی رقم دیں گے۔

مولانا اسماعیل صاحب کے صوفی صاحب سے بے تکلفانہ مراسم تھے۔ انھوں نے فرمایا: ''تم جاؤ، اگر صوفی کچھ دے گا تو لے آنا، ورنہ تمھیں تو نہیں رکھ لے گا۔'' ساتھ ہی پنجابی کی کہاوت بیان کر دی کہ میاں تعویذ نہیں دے گا تو تعویذ مانگنے والے کو تو پکڑ کر نہیں بٹھا لے گا۔

مولانا غزنوی نے فرمایا: ''صوفی صاحب ان شاء اللہ آپ کو ضرور پیسے دیں گے، آپ جایے، کامیاب لوٹیں گے اور ہم آپ کے لیے دعا کریں گے۔''

عرض کیا: ''آپ صوفی صاحب کے نام رقعہ لکھ دیجیے۔''

فرمایا: ''آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ اخبار الاعتصام کے ایڈیٹر ہیں اور جماعت کے سب لوگ آپ سے واقف ہیں۔'' ساتھ ہی کہا: ''آپ کا صوفی صاحب سے تعارف کرانا اور رقعہ لکھ کر دینا آپ کی توہین ہے۔'' (اس وقت الاعتصام کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے اور میں ان کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دیتا تھا)

پانچ سو روپے قرض لینے کے لیے میرا صوفی صاحب کے پاس جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا، لیکن ان بزرگانِ عالی مقام کا حکم تھا، اس لیے مجبوراً جانا پڑا۔ دس روپے مجھے کرائے کے لیے دیے گئے۔ رات کو اوڈاں والے پہنچ گیا جو ریلوے اسٹیشن ماموں کانجن سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں اپنے مخلص دوست مولانا عبدالقادر ندوی سے ملا اور آمد کا مقصد بیان کیا۔ صبح نو بجے کے قریب ہم دونوں صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سردیوں کا موسم تھا، صوفی صاحب دھوپ میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ندوی صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا تو وہ کھڑے ہو کر بغل گیر ہوئے اور میرا ماتھا چوما۔ ہمیں انھوں نے اسی چارپائی پر بٹھا لیا جس پر وہ خود بیٹھے تھے۔ ان کے حسبِ ارشاد ندوی صاحب پائینتی میں بیٹھ گئے اور میں سرہانے کی طرف بیٹھا۔ وہ ہم دونوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔

ندوی صاحب نے ان سے میرے متعلق کہا کہ ان کو بزرگوں نے بھیجا ہے اور وہ آپ سے پانچ سو روپے مانگ رہے ہیں۔ نہ انھوں نے بزرگوں کا نام لیا اور نہ یہ کہا کہ پانچ سو روپے قرض مانگتے ہیں۔ صوفی صاحب نے بھی وضاحت کا مطالبہ نہیں کیا۔ ان سے فرمایا: ''پرسوں میں نے آپ کو جو ڈھائی سو روپیہ دیا تھا، وہ ان کو دے دو۔ باقی ڈھائی سو تین چار روز میں فلاں آدمی کے ہاتھ بھجوا دیں گے''...... پھر فوراً کہا: ''ہاں! میرے پاس بھی ڈھائی سو روپیہ موجود ہے۔'' اس طرح انھوں نے پانچ سو کی رقم پوری کر دی۔

صوفی صاحب نے سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے چادر کی اوٹ سے میرے کوٹ کی

Marfat.com

جیب میں کوئی شے ڈالی، جس کا ندوی صاحب کو پتا چل گیا۔

ہم گھر آ کر کھانا کھانے لگے تو وہ ''شے'' دیکھی جو صوفی صاحب نے رازداری سے میرے کوٹ کی جیب میں ڈالی تھی...... وہ دس دس روپے کے دو نوٹ تھے، جو پانچ سو کی رقم کے علاوہ خاص طور سے مجھے عطا کیے گئے تھے۔

اب پانچ سو بیس روپے میری جیب میں تھے۔ اس دور میں یہ ایک خطیر رقم تھی اور اسے جیب میں ڈال کر مارے خوشی کے میرا زمین پر پاؤں نہیں لگتا تھا۔ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے لاہور پہنچوں اور یہ رقم مولانا کی خدمت میں پیش کروں۔

مولانا عبدالقادر ندوی سے کہا: ''اب مجھے اجازت دیجیے۔'' وہ اس وقت بھی کاروبار کرتے تھے، اب بھی ماشاء اللہ کاروبار کرتے ہیں اور اس میں کامیاب ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے کاروبار کے سلسلے میں ماموں کانجن آنا تھا اور اس وقت ان کا کاروبار ماموں کانجن ہی میں تھا۔ بولے: ''اتنی جلدی کیا پڑی ہے، مجھے بھی تو وہیں جانا ہے۔ اکٹھے چلیں گے۔'' چنانچہ ہم سائیکل پر ماموں کانجن پہنچے اور میں وہاں سے بذریعہ ٹرین رات کو لاہور آ گیا۔ مولانا سے ملا اور پانچ سو کی رقم ان کی خدمت میں پیش کی۔ پھر دس روپے کے وہ نوٹ پیش کیے اور جس انداز سے صوفی صاحب نے عنایت فرمائے تھے، وہ انداز بھی بیان کیا۔ مولانا نے جاتے وقت دس روپے کرائے کے لیے دیے تھے، ان میں سے سات روپے خرچ ہوئے تھے تین بچ گئے تھے، وہ بھی ان کے سامنے رکھ دیے۔

مولانا نے پانچ سو رکھ لیا اور فرمایا: ''میں نے کہا تھا کہ آپ کامیاب آئیں گے۔ اپنے آپ پر اعتماد کرنا چاہیے، اللہ مدد کرتا ہے۔'' اس رقم کی وصولی کی اطلاع انھوں نے اسی وقت گوجراں والے مولانا محمد اسماعیل صاحب کو پہنچا دی۔ دوسرے دن صوفی صاحب کو بھی خط لکھ دیا۔

بیس روپے کے متعلق مجھے فرمایا کہ یہ روپے صوفی صاحب نے خاص طور سے آپ کو دیے ہیں۔ یہ بابرکت روپے ہیں، انھیں سنبھال کر رکھیے اور خرچ نہ کیجیے۔ چناں چہ کئی سال وہ میرے بکس میں پڑے رہے اور جب حکومت کی طرف سے پرانے نوٹوں کی تبدیلی کا اعلان ہوا تو میں نے ان کے بدلے میں دوسرے نوٹ لیے اور پھر وہ خرچ ہو گئے۔

ان کے عطا فرمودہ دس روپے میں سے جو تین روپے بچے تھے، وہ بھی مولانا نے نہیں لیے۔

پانچ سو روپے کا یہ واقعہ معلوم نہیں میرے دوست مولانا عبدالقادر ندوی کو یاد ہے یا نہیں، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے اور ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے کل کی بات ہے۔

میں اوراد و وظائف کو بھی صحیح سمجھتا ہوں، تصوف و سلوک کو بھی مبنی برصحت قرار دیتا ہوں، بزرگوں کی دعاؤں اور ان کی قبولیت کا بھی قائل ہوں...... اور جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں، ان کے لیے دعا گو ہوں کہ

Marfat.com

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون.

۱۹۶۰ء کے مئی کا مہینہ تھا کہ ہمارے ایک عزیز جھنگ سے تشریف لائے۔ ان کے بیٹے کسی ہنگامے کی زد میں آکر شدید زخمی ہوگئے تھے اور وہ بیٹے کو میو ہسپتال میں داخل کرانا چاہتے تھے۔ میو ہسپتال کے کرتا دھرتا اس زمانے میں ڈاکٹر ریاض قدیر تھے اور مریض کا علاج انھی سے کرانا مقصود تھا، لیکن فوری طور پر داخلے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں انھیں مولانا کے پاس لے گیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیں تو مریض کو داخل کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگرچہ مجھے اچھی طرح سے جانتے تھے، لیکن مولانا کا وہ بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا نے فرمایا: ''مولوی اسحاق! آپ کیوں اپنے آپ پر اعتماد نہیں کرتے؟ کیوں اس وہم میں مبتلا ہیں کہ کوئی آپ کی بات نہیں مانے گا؟ جایئے ڈاکٹر صاحب سے بات کیجیے، وہ مریض کو ضرور داخل کرلیں گے۔'' پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: ''ہم دعا کریں گے۔'' چناں چہ میں گیا، ڈاکٹر صاحب سے ملا اور مریض کو داخل کر لیا گیا۔ میں نے ان کے سامنے مولانا کا نام نہیں لیا۔ انھوں نے خود ہی پوچھا کہ مولانا کا کیا حال ہے؟

اس مریض کا نام عبداللہ تھا۔ اس وقت تو وہ تندرست ہوگیا تھا، لیکن اب ۳۵ سال کے بعد ۲۹ اور ۳۰۔ نومبر ۱۹۹۵ء کی درمیانی شب کو ۵۵ برس کی عمر میں وفات پا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

بعض اوقات مولانا بعض علما کے بارے میں چند لفظوں میں دلچسپ تبصرہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا غلام مرشد کا ذکر ہوا تو کہا: مولوی غلام مرشد بڑے ذہین اور صاحب مطالعہ عالم ہیں، لیکن بعض مسائل کی تعبیر میں سوچ کچھ ٹیڑھی ہے۔

۱۹۵۹ء (۱۳۷۸ھ) میں عیدالاضحیٰ کا خطبہ دیتے ہوئے مولانا غلام مرشد نے کہا تھا کہ پاکستان کے ارباب اقتدار کو قربانی کے جانوروں کی ایک تعداد مقرر کر دینی چاہیے اور حکم جاری کر دینا چاہیے کہ اس سے زیادہ جانور ذبح نہ کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ فقہائے کرام کا ارشاد ہے کہ اگر قربانی کے جانوروں کی قیمت کسی قومی فنڈ میں ادا کر دی جائے تو اس رقم کو مذہبی اعتبار سے قربانی تصور کیا جائے گا۔

شرعی اعتبار سے مولانا غلام مرشد کی یہ بات صحیح نہ تھی۔ اس کی بہت سے لوگوں نے مخالفت کی۔ مولانا داؤد غزنوی نے بھی اس کے متعلق ہفت روزہ الاعتصام میں مضمون لکھا اور فقہ کی کتابوں سے ثابت کیا کہ مولانا غلام مرشد کا نقطہ نظر درست نہیں۔ اس سلسلے میں مولانا غلام مرشد سے مولانا نے ٹیلی فون پر بھی کئی مرتبہ بات کی۔ بعض معاملات میں اختلاف کے باوجود دونوں کے تعلقات دوستانہ نوعیت کے تھے۔

وہ ایوب خاں کے مارشل لا کا زمانہ تھا اور اس بحث کا آغاز اس دور کی حکومت نے کرایا تھا۔ وہ دیکھنا

Marfat.com

چاہتی تھی کہ اس قسم کے مسائل میں لوگوں کا ردعمل کیا ہے۔ میں اس وقت الاعتصام کا ایڈیٹر تھا۔ ایک دن اس دور کے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھ سے کہا: ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا: ''ارشاد فرمایئے۔''

بولے: ''قربانی کے مسئلے پر جو بحث چل رہی ہے۔ مہربانی کر کے آپ اسے بند کر دیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ آئندہ برس اس پر کچھ نہ لکھا جائے۔ انھوں نے کہا کہ روزناموں کو ہم نے اس کے متعلق کچھ چھاپنے سے روک دیا ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے تھے، وہ کہہ دیا، اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔''

یہ بات میں نے مولانا سے عرض کی تو فرمایا: ''ہم نے مسئلے کی وضاحت کر دی ہے...... اب اگر آپ بحث ختم کرنا چاہتے ہیں تو کر دیجیے۔''

احناف غائبانہ نماز جنازہ کے قائل نہیں ہیں، لیکن سردار عبدالرب نشتر فوت ہوئے تو لاہور میں (موچی دروازے کے باہر) ان کے غائبانہ جنازے کا اعلان کیا گیا، جنازے میں مولانا داؤد غزنوی بھی شامل تھے اور مولانا غلام مرشد بھی۔ (یاد پڑتا ہے کہ جنازہ مولانا غلام مرشد نے پڑھایا تھا) میں نے مولانا غلام مرشد سے عرض کیا: ''آپ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ جائز نہیں، آپ یہ ناجائز کام کیوں کرتے ہیں۔''

مولانا داؤد غزنوی نے فوراً جواب دیا: ''جنازہ دو قسم کا ہے، سیاسی اور مذہبی......! مذہبی جنازہ تو ان کے نزدیک جائز نہیں، لیکن سیاسی جنازہ نہ صرف جائز ہے، بلکہ ضروری ہے...... اور یہ جنازہ سیاسی ہے۔''

مولانا داؤد غزنوی کے کتب خانے میں فقہیات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ ایک دن مجھ سے کہا کہ اس ذخیرے میں بعض کتب فتاویٰ کی کمی ہے۔ آیئے ادارہ اسلامیات سے ان کتابوں کا پتا کرتے ہیں۔ ہم وہاں گئے تو مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے فرزند گرامی جناب ذکی صاحب مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت احترام سے پیش آئے۔ مولانا سے پوچھا:

آپ کے پاس امداد الفتاویٰ ہے؟

کہا: حضرت! مُبَوّب چاہیے یا غیر مُبَوّب؟

میم پر پیش، ب پر زبر اور واؤ مشدد...... یہ لفظ میں نے پہلی دفعہ سنا تھا۔ اس درجے ثقیل اور بھاری بھرکم لفظ سن کر ایک دم دماغ چکرا گیا۔ پھر فوراً سمجھ گیا کہ اس کا مطلب ''تبویب'' ہے۔

مولانا نے جواب دیا: مبوب دیجیے۔

یہ خالص عالمانہ لفظ ہے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے الفاظ ہیں، جو بعض اوقات قوت سماع پر سخت گراں گزرتے ہیں، لیکن طبقہ علما میں عام چلتے ہیں۔

Marfat.com

ایوبی مارشل لا کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ ایک دن ایک صاحب میرے کمرے میں آئے۔ انھوں نے اپنا نام غالباً غلام نبی شاہ بتایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ علاقہ نواب صاحب کے گاؤں علی رضا آباد سے آئے ہیں، وہاں شیعہ سنی کشیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ مولانا عبدالستار نیازی سے ملے تو انھوں نے مولانا داؤد غزنوی سے ملنے اور ان سے سارا واقعہ بیان کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ آپ مجھے ان سے ملا دیں۔ چناں چہ میں نے ان کا مولانا سے رابطہ کرا دیا۔ مولانا نے ان کی بات سنی تو معاملے کی نزاکت کے پیش نظر چند سرکردہ حضرات کی میٹنگ بلائی، میٹنگ ہو رہی تھی کہ کمشنر لاہور کا ٹیلی فون آ گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں اطلاع پہنچی ہے، آپ کے ہاں اس نوعیت کی کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔ مولانا نے جواب دیا: جی ہاں ہو رہی ہے۔ اس کے بعد مولانا نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر فریقین کے درمیان صلح کرا دی۔

اس وقت یہ معاملہ بڑا اہم تھا اور اس کے خطرناک نتائج نکل سکتے تھے، لیکن مولانا نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا کہ کہیں کوئی خطرناک موڑ پیش نہیں آیا اور حالات بالکل سیدھا رخ اختیار کر گئے۔

مولانا علما کے بے حد قدردان تھے۔ ہر مسلک کے عالم کا احترام کرتے تھے، وہ بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا عبدالعظیم انصاری (سابق ناظم دفتر جمعیت اہل حدیث) کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ مولانا کے ساتھ تانگے پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے۔ مولانا نے اچانک تانگے والے سے کہنا شروع کیا، تانگہ روکو، تانگہ روکو...... تانگہ رکا تو مولانا جلدی سے نیچے اترے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے ایک طرف کو بڑھے، دیکھا تو ادھر شیعہ عالم مفتی کفایت حسین تانگے سے اتر کر اسی طرح ہاتھ پھیلائے مولانا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دونوں بزرگوں نے مصافحہ کیا اور کچھ دیر کھڑے آپس میں باتیں کرتے رہے۔

ایک دفعہ میں اور مولانا تانگے پر شیش محل روڈ سے لوہاری دروازے کی طرف جا رہے تھے کہ دوسری طرف سے ایک شخص نے تانگے پر بیٹھے ہوئے مولانا کو سلام کیا۔ مولانا نے فوراً مجھے کہا: اس شخص کو دیکھیے جس نے سلام کیا ہے۔ یہ مولوی انیس ہیں جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد ہیں اور یہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے شیخ الہند کو گرفتار کرایا تھا اور پھر انگریزوں نے انھیں جزیرۂ مالٹا میں نظر بند کر دیا تھا۔

مولانا غزنوی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ کمزور کے سامنے انتہائی نرم اور متکبر کے مقابلے میں انتہائی سخت تھے۔

ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں، شیخ حسام الدین، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا داؤد غزنوی کو انگریزی حکومت نے ایک ہی وقت میں گرفتار کر کے ایک ہی جیل میں بند کر دیا۔ چند دن کے بعد کسی اور جیل میں لے جایا گیا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ان سب کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ دو ہفتے بعد وہاں سے امرتسر جیل میں لے گئے۔ امرتسر سے روہتک (موجودہ صوبہ ہریانہ) کی جیل میں لے

Marfat.com

جانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ مولانا غزنوی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ امرتسر جیل سے کسی دوسری جیل میں منتقل نہیں ہونا چاہیے اور یہاں سے نکلنے سے انکار کر دینا چاہیے۔

ان لوگوں پر عدالت پر مقدمے چل رہے تھے۔ امرتسر کی عدالت میں بھی ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ہم پولیس کے ساتھ عدالت میں بھی نہیں جائیں گے۔ مولانا کی اس تجویز کی سب ساتھیوں نے تائید کی۔

تیسرے دن خود مولانا کو عدالت میں حاضر ہونا تھا۔ پولیس انھیں عدالت میں لے جانے کے لیے آئی تو فیصلے کے مطابق مولانا نے جانے سے انکار کر دیا۔ پولیس کے کارندوں نے بازوؤں سے پکڑ کر چلنے کو کہا تو زمین پر بیٹھ گئے۔ اٹھانے لگے تو لیٹ گئے۔ بالآخر سات آٹھ پولیس والوں نے کندھوں پر اٹھایا اور گاڑی میں بٹھا کر عدالت میں لے گئے۔ وہاں پہنچے تو گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا۔ وہ اٹھا کر کمرۂ عدالت میں لے گئے۔ عدالت کے کمرے سے باہر جانے سے پھر انکار کر دیا۔ اسی طرح وہاں سے اٹھا کر گاڑی میں بٹھائے گئے۔ جیل جا کر گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا۔ اب چھ سات آدمیوں نے گاڑی سے اتار کر کندھوں پر اٹھایا اور جیل کی کوٹھڑی میں لے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے یہ منظر دیکھا تو فی البدیہہ یہ چند شعر موزوں ہو گئے۔

دی مولوی داؤد کو چڑھی جو پولیس نے — احباب نے پوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لد کے چلے دوش حکومت پہ حضور آج — حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے
فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دیں ہوں — اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے
اس واسطے مرکب کے عوض فرط ادب سے — پیش اپنے تئیں آپ حکومت نے کیا ہے
ہے فخر یہ مجھ کو کہ مری ران کے نیچے — خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

مجلس احرار کے مشہور رہنما اور معروف مقرر قاضی احسان احمد شجاع آبادی مرحوم نے مولانا غزنوی کی وفات کے بعد یہ واقعہ سنایا کہ جب ہندوستان میں ہندو مسلم چپقلش بہت زیادہ بڑھ گئی تو بعض سنجیدہ ذہن کے لوگوں نے جنوری ۱۹۲۸ء کو الہ آباد (یوپی) میں اتحاد کانفرنس کے نام سے ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں مسلمان، سکھ اور ہندو بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ مسلمان سیاست دانوں میں سے مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی اور خود قاضی صاحب جلسے میں شامل تھے۔ سکھوں نے وہاں اعلان کیا کہ اگر انھیں پنجاب میں مناسب حقوق نہ دیے گئے تو وہ پورے صوبے میں خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ مختلف حضرات کی تقریروں کے بعد مولانا داؤد غزنوی کو تقریر کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''میں خیالی خون کی ندیوں میں تیرتا ہوا صلح کے ساحل کی امید میں الہ آباد پہنچا ہوں، اگر منصفانہ صلح کی کوئی تجویز سامنے آئی تو ہم ان شاء اللہ اسے قبول کریں گے۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہو سکا تو خون ہماری تاریخ میں کوئی نئی چیز نہیں، جس

Marfat.com

سے ہم واقف نہ ہوں۔“

اس کے بعد کلکتہ میں بھی اس قسم کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا نے تقریر کی۔ تقریر ختم ہوئی تو مولانا ظفر علی خان نے مولانا کو داد دی اور اسی وقت یہ شعر کہے۔

قائم ہے ان سے ملت بیضا کی آبرو
اسلام کا وقار ہیں داؤد غزنوی
رجعت پسند کہنے لگے ان کو دیکھ کر
آیا ہے سومنات میں محمود غزنوی
کلکتہ میں اک اور بھی ہیں ان کے ہم لقب
یہ ہست غزنوی ہیں، وہ بود غزنوی

کلکتہ میں ”ان کے ہم لقب“ سے مراد سر عبدالحلیم غزنوی تھے، جو انگریزی حکومت کے حامی اور تحریکات آزادی کے مخالف تھے۔

مولانا نے حصول آزادی کی تمام تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ملک کی صف اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوا، اور قید و بند کی بے پناہ صعوبتیں جھیلیں۔ وہ ہر اس جماعت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل پڑتے تھے جو انگریزی حکومت کی مخالفت کا نعرہ بلند کرتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد انھوں نے سیاسیات میں زیادہ حصہ نہیں لیا۔ ابتدا میں کچھ عرصہ مسلم لیگ سے تعلق رہا۔ ہمدردیاں نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ اور میاں عبدالباری وغیرہ سے تھیں۔ اس دور میں مسلم لیگ کے باہمی اختلافات ختم کرانے کے سلسلے میں نواب زادہ لیاقت علی خاں سے کئی دفعہ ملاقات کی۔ جلد ہی جناح عوامی لیگ کا قیام عمل میں آ گیا، جس کے مرکزی قائدین سید حسین شہید سہروردی، مولانا داؤد غزنوی، نواب ممدوٹ، میاں عبدالباری وغیرہ تھے۔ ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کا الیکشن چونیاں (ضلع قصور) سے اسی جماعت کی طرف سے لڑا اور کامیاب رہے۔

یہاں یہ سیاسی لطیفہ قابل ذکر ہے کہ جماعت اسلامی کے ماہرین سیاست نے اس زمانے میں ایک پنچایت سسٹم قائم کیا تھا۔ علاقے کے چند آدمی جسے ”پنچایت“ کہا جاتا تھا، کسی جگہ جمع ہو کر جس شخص کو اسمبلی کے لیے اپنا نمائندہ نامزد کر دیتے، وہ ان کے نزدیک ”صالح نمائندہ“ کہلاتا تھا۔ وہ اپنے لیے خود کسی سے ووٹ نہیں مانگ سکتا تھا اور نہ اسے ”امیدوار“ کہا جا سکتا تھا۔ ایسا کرنا ان کی اس دور کی شرع کے خلاف تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کے مقابلے کے لیے جماعت اسلامی کی مقرر کردہ پنچایت نے ایک بزرگ محمد خاں کو پکڑا اور مولانا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اور انھیں ”صالح نمائندہ“ کہا جانے لگا۔ محمد خاں جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے اور میواتی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد چونیاں کے علاقے میں میواتی خاصی تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ میں کئی دفعہ انتخاب کے دوران مولانا کے ساتھ اس علاقے میں گیا۔ مولانا ازراہ مزاح کہا کرتے تھے کہ

Marfat.com

جماعت اسلامی کے نزدیک میں صالح نمائندہ نہیں ہوں۔

میواتیوں کی بہت بڑی اکثریت مولانا کے ساتھ تھی۔ وہ لوگ اپنے تعلق دار میواتیوں کے پاس گاؤں گاؤں جاتے، انھیں مولانا کو ووٹ دینے پر آمادہ کرتے اور برملا کہتے تھے کہ اگر مولانا غزنوی ''صالح نمائندہ'' نہیں ہیں تو کسی پر بھی اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

مولانا، جناح عوامی لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ مسلم لیگ بھی ان کے مقابلے میں میدان میں اتر چکی تھی۔ وہ ''جھرلو'' کا زمانہ تھا۔ لیکن مولانا نے سب حریفوں کو شکست دی اور کئی ہزار ووٹوں کی اکثریت سے جیتے۔

انتخابات اور سیاسی جماعتوں کے بارے میں مولانا کا یہ نقطہ نظر ہرگز نہ تھا جو موجودہ اہل حدیث حضرات کی تنظیموں اور بعض دیگر مذہبی و اسلامی قسم کی جماعتوں کا ہے۔ وہ کسی سیاسی جماعت کو بے دین، کافر، غدار یا دائرہ اسلام سے خارج نہ سمجھتے تھے، اور مولانا غزنوی ہی پر کیا موقوف، کوئی بھی منجھا ہوا اور بڑا سیاست دان کسی کے بارے میں اس قسم کے الفاظ زبان سے نہیں نکالتا۔

وہ کہا کرتے تھے کہ جماعت اہل حدیث کا کوئی شخص کسی بھی سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب لڑے، اس کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر جماعت کا کوئی آدمی نہ ہو تو اپنی صواب دید کے مطابق کسی اور بہتر امیدوار کی مدد کی جائے۔

دیوبندی، بریلوی اور شیعہ اہل علم مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا بھی ان سے تکریم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے علمائے کرام کی مسلسل کوششوں سے قرارداد مقاصد پاس ہوئی۔ مولانا عثمانی سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ان حضرات کی لگاتار مساعی سے ۳۱ علمائے کرام نے ۲۲ نکات مرتب کیے۔

مولانا نے عام ملکی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور ملک میں اسلامی نظام کی تنفیذ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ چونکہ وہ علمی اور خاندانی اعتبار سے بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے، اس لیے اس جدوجہد میں تمام مکاتب فکر کے علما نے ان کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ مجلس احرار، جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کے زعما سے بھی ان کے پرخلوص تعلقات تھے۔ انھوں نے بھی اکثر مواقع پر امور خیر میں ان کی مدد کی۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں تحریک تحفظ ختم نبوت شروع ہوئی، جس میں تمام دینی و مذہبی جماعتوں کے علما و زعما نے حصہ لیا۔ ان جماعتوں کے متحدہ محاذ نے تحریک کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے مجلس عمل قائم کی تھی، جس کا ناظم اعلیٰ مولانا غزنوی کو بنایا گیا تھا۔ جب حکومت نے اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا تو تحقیقات کے لیے ایک عدالت مقرر کی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل تھی۔ سب جماعتوں کے الگ الگ وکیل تھے جو تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کرتے تھے۔ مولانا غزنوی نے مجلس عمل

Marfat.com

کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے جناب حسین شہید سہروردی کو وکیل مقرر کیا۔ مولانا ان کو مسئلے کے ضروری نکات سمجھاتے اور تیاری کراتے تھے، لیکن مسئلہ زیر بحث میں جگہ جگہ کچھ ایسی فنی پیچیدگیاں تھیں اور اس کی نوعیت وضاحت میں ایسے علمی واصطلاحی الجھاؤ تھے کہ سہروردی صاحب وکالت سے معذرت چاہنے پر مجبور ہو گئے اور وکالت ونمائندگی کا سارا بوجھ مولانا پر آن پڑا۔ ایک دن مولانا تحقیقاتی عدالت میں بیان دے رہے تھے اور ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ بہت سے وکلا بھی موجود تھے۔ جسٹس منیر نے سوال کیا:

''کیا آپ کے دادا مولانا سید عبداللہ غزنوی مرحوم کو والیِ افغانستان نے اس لیے ملک بدر کر دیا تھا کہ وہ اہل حدیث تھے اور احناف انھیں برداشت نہیں کرتے تھے؟''

مولانا نے جواب دیا:

''نہیں! یہ بات نہیں ہے، ان کو اس لیے ملک سے نکالا گیا تھا کہ وہ اپنے دور کے بہت بڑے ولی اللہ تھے اور ان کا حلقہ ارادت اس قدر وسعت اختیار کر گیا تھا کہ حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ حکومت پر قابض ہو جائیں گے۔''

منیر صاحب نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ لوگوں پر ظاہر کریں کہ احناف اور اہل حدیث کے درمیان فقہی اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہے، لیکن مولانا ان کے دام میں نہیں آئے۔ اب منیر صاحب نے پینترا بدلا اور انھیں ایک اور سوال کے جال میں پھنسانا چاہا۔

''کیا آپ یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً اللہ کہنے والے کو مشرک قرار دیتے ہیں؟''

فرمایا: ''اس کا انحصار کہنے والے کی نیت پر ہے۔ ہر اس شخص کو جو یہ الفاظ زبان سے نکالتا ہے، مشرک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ابھی آپ نے بھی یہ الفاظ زبان سے نکالے ہیں، مگر آپ کو مشرک نہیں کہا جائے گا۔''

مولانا اس دام سے بھی بچ کر نکل گئے تو جسٹس منیر نے ایک اور سوال کیا۔

''آپ عبدالوہاب کو اپنا مذہبی رہنما مانتے ہیں؟''

جواب دیا: ''عبدالوہاب نام کا کوئی شخص ہمارا مذہبی رہنما نہیں ہے۔''

منیر صاحب نے کہا: ''عبدالوہاب آپ کا مذہبی رہنما ہے۔''

فرمایا: ''قطعاً نہیں۔''

منیر صاحب نے اپنی بات پر زیادہ اصرار کیا تو مولانا نے سختی سے انکار کیا کہ نہیں ہے۔ جب دو تین دفعہ دونوں کے درمیان ''ہے'' اور ''نہیں ہے'' کی تکرار ہوئی تو منیر صاحب بوکھلا گئے اور میز پر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر وہ کاغذات تلاش کرنے لگے جن پر انھوں نے سوالات درج کیے تھے۔ ان کی گھبراہٹ زیادہ ہوئی تو مولانا نے کہا:

Marfat.com

''غالباً آپ کی مراد محمد بن عبدالوہاب سے ہے۔''

بولے: ''جی ہاں! میری مراد یہی ہے۔''

مولانا نے فرمایا: ''وہ عبدالوہاب نہیں، محمد بن عبدالوہاب ہیں۔''

منیر صاحب نے کہا: ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

فرمایا: ''واہ! باپ اور بیٹے کا فرق آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔''

اس کے بعد منیر صاحب کو تو اس سلسلے میں سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، لیکن جسٹس کیانی صاحب جواب تک خاموش بیٹھے سب کچھ سن رہے تھے، مخاطب ہوئے اور کہا: ''مولانا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو وکالت کا لائسنس دے دیتا۔ میں آپ کی بحث اور آپ کے دلائل سے بہت متاثر اور مستفید ہوتا ہوں۔''

مولانا علمائے دین کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی عالم کا ناقدانہ یا مخالفانہ انداز میں ذکر کرتا تو انھیں بڑی تکلیف ہوتی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار تھے اور جامعہ سلفیہ کی انتظامیہ کمیٹی کی میٹنگ ان کے کمرے میں ہو رہی تھی۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی اس میں شامل تھے۔ ایک شخص نے جو دراصل گوجراں والا سے تعلق رکھتے ہیں اور فیصل آباد میں کاروبار کرتے ہیں، حضرت حافظ محمد گوندلوی مرحوم ومغفور کا ذکر توہین آمیز الفاظ میں کیا اور کہا کہ وہ ہمارے ملازم ہیں، لیکن ہماری بات نہیں مانتے۔ مولانا کو یہ الفاظ سن کر سخت غصہ آیا۔ فرمایا نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ حضرت حافظ صاحب کے متعلق ملازم کا لفظ استعمال کرتے ہیں......؟ آپ ان کے علم وفضل سے واقف نہیں؟ پھر مولانا اسماعیل صاحب سے مخاطب ہوئے۔ کہا: آپ نے ان کو جامعہ سلفیہ کمیٹی کا رکن مقرر کیا ہے جنھیں یہ معلوم نہیں کہ علماء کے لیے کس قسم کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مجھے ان کے الفاظ اور لہجے سے شدید صدمہ ہوا ہے...... مولانا اسماعیل صاحب کو ان کی طرف سے مولانا غزنوی سے معذرت کرنا پڑی۔ اس کے بعد مولانا غزنوی نے میٹنگ کی کارروائی روک دی اور فرمایا: باقی باتیں کسی دوسرے موقعے پر ہوں گی۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا مجھ پر اعتماد کرتے اور میری گزارش کو شرف قبولیت بخشتے تھے۔ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور (تحصیل جڑاں والا) میں انجمن اصلاح المسلمین کا جلسہ ہوا، میں نے مولانا سے شرکت فرمانے کے لیے عرض کیا تو مولانا وہاں تشریف لے گئے۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ اپنی تقریر میں میرے متعلق ایسے الفاظ استعمال فرمائے جن سے میری حوصلہ افزائی ہوئی اور فرمایا کہ میں مولوی اسحاق کے کہنے سے یہاں آیا ہوں۔

ایک مرتبہ کسی جماعتی کام کے سلسلے میں لائل پور گئے، میں مولانا کے ساتھ تھا۔ وہاں جمعہ پڑھانے کا

Marfat.com

پروگرام تھا، راستے میں مجھ سے فرمایا کہ خطبہ جمعہ میں کیا کہا جائے۔ میں نے وہاں کے حالات کے مطابق بعض باتیں عرض کیں۔ جمعے میں شہر اور ضلع فیصل آباد کے بے شمار لوگ موجود تھے، جو مولانا کی تشریف آوری اور ان کی تقریر کی وجہ سے گئے تھے۔ مولانا نے خطبہ جمعہ میں اکثر وہی باتیں بیان فرمائیں جو میں نے عرض کی تھیں۔ میرا نام لے کر فرمایا کہ میں نے راستے میں مولوی اسحاق سے مشورہ کیا تھا اور انھوں نے مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا۔

متعدد مواقع پر انھوں نے جماعت سے متعلق بعض اہم ذمے داریاں میرے سپرد کیں اور اللہ نے مجھے کامیابی سے نوازا اور وہی کچھ ہوا جو وہ چاہتے تھے۔

ایک دفعہ لائل پور کی جماعت اہل حدیث کے معاملات میں نہایت تشویش ناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ مولانا نے مجھے وہاں بھیجا اور اللہ کے فضل سے مسئلہ حل ہوگیا۔

بعض اوقات اس فقیر کو وہ نہایت الجھے ہوئے مسائل کے سلسلے میں بطور ''سفیر'' مختلف مقامات میں بھیجتے تھے۔ مولانا عبیداللہ احرار لائل پور کی جماعت کی ایک بڑی شخصیت تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ فیروز پور سے نقل مکانی کر کے لائل پور چلے گئے تھے اور مولانا سے ان کے پرانے خاندانی عقیدت مندانہ مراسم تھے۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو لائل پور میں جامعہ سلفیہ معرض قیام میں آیا تو لائل پور کے جن حضرات نے اس کی تعمیر و ترقی کے لیے دن رات محنت کی ان میں ایک مولانا عبیداللہ احرار تھے، ان کے علاوہ دیگر حضرات میں سے مولانا عبدالواحد، مولانا محمد اسحاق چیمہ اور مولانا محمد یعقوب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں کسی وجہ سے مولانا عبیداللہ احرار نے مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ سے استعفا دے دیا تھا۔ مولانا غزنوی کو اس سے نہایت ذہنی کوفت ہوئی۔ انھوں نے فوری طور پر مولانا عبیداللہ احرار کو خط لکھا، جس میں بعض معاملات سے متعلق ان کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے دن پھر خط لکھا اور یہ خط مجھے دے کر ان کی خدمت میں بھیجا تاکہ میں صحیح صورت حال سے ان کو مطلع کروں اور ان کے بارے میں مولانا کے احساسات و جذبات ان سے بیان کروں۔ یہ خط میرے پاس موجود ہے جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے تاکہ یہ خط بھی محفوظ ہو جائے اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ ان کے دل میں اپنے رفقائے کار کی کس درجے قدر و منزلت تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اخی فی اللہ ولوجہ اللہ مولانا عبیداللہ احرار سلمہ وعافاہ ووفقہ لما یحبہ ویرضاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ کے استعفا پر مشتمل خط کا جواب کل مختصراً لکھ دیا تھا۔ کل طبیعت کچھ خراب تھی، آج بحمد اللہ بہتر ہے، اس لیے دوبارہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ اس سے آپ میری پریشانی اور اضطراب

Marfat.com

کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ مجھ سے سن لیجیے کہ جب تک میں صدر یا امیر جماعت ہوں، آپ مجھ کو چھوڑ کر نظام سے الگ نہیں ہو سکتے۔ میرے نزدیک ''عبیداللہ'' ایک شخص کا نام نہیں، وہ اپنی ذات میں ادارہ ہے، اس کا جماعتی نظام سے الگ ہو جانا ایک بہت بڑے ادارے سے ہماری محرومی ہے، اور جب تک میں زندہ ہوں، یہ کیسے برداشت کر سکتا ہوں کہ ایک مخلص، ہمدرد، جان نثار، وفا شعار، مدبر، تجربہ کار، جو امتحانات وشدائد ومصائب کی کٹھالیوں میں سے نکل کر ہمیشہ خالص سونے کی طرح چمکتا ہوا نظر آیا ہو، وہ ہم سے الگ ہو جائے۔

مولانا اسماعیل صاحب کی گفتگو جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ ہرگز استعفا کے لیے اساس نہیں بن سکتی۔ مولانا صاحب موصوف کے خیالات وجذبات واحساسات کا جہاں تک مجھے علم ہے، وہ آپ کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ لائل پور شہر میں جماعت کا وقار، جماعت کا نظام اور جماعت کے لیے دفاع کا کام آپ جس طرح سرانجام دے رہے ہیں، وہ بے مثال ہے اور جامعہ سلفیہ میں کوئی عہدہ نہ رکھتے ہوئے جس حوصلے، صبر اور استقامت سے آپ کام کر رہے ہیں اور الجھے ہوئے معاملات کو جس حسن تدبیر سے سلجھاتے ہیں، اس کی پورے لائل پور ہی نہیں بلکہ پورے صوبے میں کوئی صلاحیت نہیں رکھتا، مولانا موصوف نے بارہا یہ خیال ظاہر کیا ہے۔ لہٰذا خدا کے لیے مولانا صاحب کی مذاق کی گفتگو کو سنجیدگی پر محمول نہ کیجیے۔

میاں عبدالمجید صاحب کی گفتگو میں نے نہیں سنی۔ مگر وہ ایسے نیک نفس اور شریف الطبع ہیں کہ کسی سے بھی معاندانہ جذبات نہیں رکھتے۔ آپ کی طبیعت پر کچھ اور تاثرات ہیں، خدا کے لیے ان کو اکابر جماعت کے تعلقات پر اثر انداز نہ ہونے دیجیے۔

مولوی محمد یعقوب صاحب سے کس نے کہا اور کیا کہا اور اس کا انداز گفتگو کیا تھا، یہ سب مہمل اور مشکوک باتیں ہیں۔ ایسے قدیم تعلقات اور ایسی جماعتی ذمہ داریاں ان ہوائی باتوں سے نہیں ٹوٹ سکتیں، اس لیے آپ ٹھنڈے دل سے میری گزارشات پر غور فرمائیں اور اپنا استعفا واپس لیں۔

مولوی اسحاق صاحب ایڈیٹر الاعتصام کو اسی مقصد کے لیے یہ عریضہ دے کر آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں کہ یہ میری طرف سے آپ کو یہ خط پہنچائیں اور میرے جذبات واحساسات کی ترجمانی کریں۔ والسلام

محمد داؤد غزنوی

۱۳۔۹۔۶۲

یہاں مولانا کا ایک اور خط ملاحظہ کیجیے جو ان کے اخبار ہفت روزہ توحید (امرتسر) کے لیٹر پیڈ پر ۱۳۔جنوری ۱۹۳۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط ان کے ایک عقیدت مند دوست چوہدری سردار خاں چینیہ (CHINIA) کے نام ہے۔

Marfat.com

یہاں یہ بھی بتا دیں کہ اخبار توحید مولانا نے یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو امرتسر سے جاری کیا تھا۔ یہ اپنے دور کا بہترین ہفت روزہ تھا جو صرف دو سال جاری رہا۔ اس کا آخری شمارہ یکم مئی ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا تھا۔ پھر مولانا کی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال بعد جولائی ۱۹۶۵ء میں ہفت روزہ تـوحیـد بڑی شان کے ساتھ لاہور سے جاری کیا گیا تھا۔ مولانا کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی اس کے نگران اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ لیکن اب یہ چار یا پانچ مہینے ہی جاری رہ سکا۔ میں اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گیا اور اس سے کچھ عرصہ بعد یہ اخبار بند کر دیا گیا۔

چوہدری سردار خاں موضع پلاسور (تحصیل ترنتارن ضلع امرتسر) کے رہنے والے تھے اور وہاں کے راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آزادی وطن سے قبل وہ تقریباً چالیس سال انڈونیشیا میں رہے تھے۔ سماٹرا اور ملایا میں ان کا کاروبار تھا۔ وہاں سے وہ مولانا کو کسی نہ کسی سلسلے میں خط لکھتے رہتے تھے اور مولانا باقاعدہ ان کے خطوط کا جواب دیتے تھے۔ چوہدری صاحب کے مولانا سے مراسم کا یہ عالم تھا کہ دو ایک مرتبہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس بھی انھیں لے گئے اور بڑے اچھے الفاظ میں مولانا سے ان کا تعارف کرایا۔

دوسری عالم گیر جنگ عظیم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے زمانے میں وہ انڈونیشیا سے اپنے آبائی گاؤں (پلاسور) آ گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے اہل وعیال سمیت چک ۲۵ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ وہیں ان کو زرعی زمین الاٹ ہوئی تھی۔ لاہور میں مولانا کے پاس ان کی آمدورفت کا سلسلہ یہاں آنے کے بعد بھی جاری رہا۔ انھوں نے ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو چک ۲۵ گ ب (تحصیل جڑاں والا) میں وفات پائی۔

سماٹرا میں چوہدری سردار خاں مرحوم کے پاس مولانا داؤد غزنوی کے بعض عزیز بھی اقامت گزیں تھے جو وہاں کاروبار کرتے تھے۔ وہ تھے محمد ابراہیم صاحب، عبدالرحمٰن صاحب اور صوفی عبدالحنان صاحب۔ چوہدری صاحب سے مولانا ان کے حالات اور کاروبار کے متعلق دریافت کرتے رہتے تھے۔

چوہدری صاحب مرحوم کے صاحب زادوں میں ایک چوہدری عبداللہ ہیں جو جڑاں والا میں رہتے ہیں اور میرے مہربان ہیں۔ ایک کا نام چوہدری عبدالرحمٰن ہے جو میرے مکان کے قریب ہی سانده (لاہور) میں مقیم ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔

چوہدری عبدالرحمٰن نے مجھے مولانا داؤد غزنوی کے دو مکتوبات گرامی عنایت کیے جو ان کے والد مرحوم چوہدری سردار خاں کے نام مولانا نے تحریر فرمائے تھے اور ایک فتویٰ اور اس کا جواب عطا کیا جو چوہدری سردار خاں نے کسی مسئلے کے بارے میں مولانا سے دریافت کیا تھا اور مولانا نے اس کا جواب دیا تھا۔

Marfat.com

فتوے پر ۲۱۔ اگست ۱۹۳۴ء کی تاریخ مرقوم ہے۔ دو خطوں میں سے ایک ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۳ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ خط ایک طرف سے آدھا پھٹا ہوا ہے۔ دوسرا خط ۱۳۔ جنوری ۱۹۳۴ء کا تحریر فرمودہ ہے، جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ خط مولانا نے چینیاں والی مسجد لاہور سے لکھا ہے، اس میں ایک شخص عبداللطیف کا ذکر کیا گیا ہے، یہ چوہدری سردار خاں کے بیٹے تھے جو وفات پا گئے ہیں۔

ایک خط جس پر ۲۰۔ مارچ ۱۹۳۳ء کی تاریخ درج ہے اور ایک طرف سے آدھا پھٹا ہے، اس میں جو پورے الفاظ پڑھے جا سکتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

''آپ مہربانی فرما کر اپنے حالات اور بھائی ابراہیم صاحب، عبدالرحمٰن صاحب اور عبدالحنان صاحب کے حالات ضرور تحریر فرماتے رہیں۔ یہ لوگ بہت کم خط لکھتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خط لکھتے ہی نہیں، والسلام۔

محمد داؤد غزنوی

لاہور، چینیاں والی مسجد

اس سے نیچے یہ الفاظ ہیں۔

''دوسرا خط صوفی عبدالحنان صاحب کو جہاں کہیں ہوں، مہربانی فرما کر جس قدر جلد ممکن ہو، پہونچا دیں، مشکور ہوں گا۔ داؤد غزنوی۔''

''پہنچا دیں'' کو مولانا نے ''پہونچا دیں'' لکھا ہے۔

اب ذیل میں ۱۳۔ جنوری ۱۹۳۴ء کا خط پڑھیے جو بالکل صاف ہے اور پورا پڑھا جاتا ہے۔

چینیاں والی مسجد، لاہور

۱۳۔ جنوری ۱۹۳۴ء

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

محبِّ مخلص برادر مکرم جناب سردار خاں صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک عرصے کے بعد آپ کا خط ملا، آپ کے حالات معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا محافظ وناصر اور مربی ہو اور سفر میں اور حضر میں، ہر حالت میں اپنی نظرِ عنایت آپ پر رکھے اور اپنے مرضیات کی توفیق بخشے اور اس درخت کی طرح بنائے جس کے سایہ اور پھل سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ آمین۔

عزیز عبداللطیف کا سلام اس کے اپنے قلم سے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں برکت کرے اور اس کو والدین کی آنکھوں کے لیے ٹھنڈک کا ذریعہ بنائے، اس کا وجود اپنے خاندان کے لیے باعث

Marfat.com

عزت ہو، اور اللہ تعالیٰ اس کو اسلام کی خدمت کی سعادت بخشے۔

آپ کے لفافے میں مرسلہ پندرہ روپے وصول ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور آپ کے مال اور کاروبار میں برکت عطا فرمائے۔ اخبار آزاد لاہور سے روزانہ نکلتا ہے اور میں نے آپ کے نام جاری کرا دیا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ اٹھارہ روپے ہے۔ یہ اخبار ہندوستان میں سب سے بہتر اخبار ہے، اس کا مطالعہ آپ کے لیے ہر حال میں ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔

مولوی محمد ابراہیم صاحب اور صوفی صاحب کے متعلق کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں اور نہ ان کا کوئی خط آیا ہے، بلکہ اگر ممکن ہو تو آپ پتا کر کے ہمیں اطلاع دیں۔ آپ اپنے حالات سے وقتاً فوقتاً ضرور مطلع فرماتے رہا کریں۔ عزیز عبداللطیف اور سب دوستوں کو سلام مسنون عرض کر دیں۔ والسلام

محمد داؤد غزنوی

یہاں مولانا کا ایک اور مختصر سا مکتوب گرامی ملاحظہ فرمایئے۔ یہ مکتوب انھوں نے مولانا عبدالعظیم انصاری کے بارے میں تحریر فرمایا تھا۔ مولانا جب مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے، اس زمانے میں انصاری صاحب کئی سال جمعیت کے ناظم دفتر رہے۔ ۱۹۵۶ء میں وہ قصور کے میونسپل کمشنر تھے۔ انھوں نے حبیب بنک سے چھپن روپے لینا تھے، جن کی اس زمانے میں بڑی اہمیت تھی، لیکن وہ روپے کسی بڑی شخصیت کی تصدیق پر مل سکتے تھے۔ چناں چہ مولانا نے مندرجہ ذیل الفاظ میں تصدیق کی اور روپے مل گئے۔

''حامل عریضہ مولوی عبدالعظیم صاحب کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ آپ میونسپل کمشنر قصور ہیں۔ بلا تامل انھیں رقم مبلغ چھپن روپے دی جاسکتی ہے۔

داؤد غزنوی

۵۶-۱۰-۲۰

مولانا پختہ خط تھے اور بہترین سفید کاغذ پر لکھتے تھے۔ سطریں سیدھی ہوتی تھیں۔ جس طرح کا خط ۱۹۳۳ء کا ہے، بالکل اسی طرح کا اس سے تیس سال بعد ۱۹۶۲ء کا ہے۔ میرے پاس ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کئی چیزیں موجود ہیں، صاف ستھرا اور خوب صورت اسلوب کتابت ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میلے کچیلے اور خراب کاغذ پر میں لکھ ہی نہیں سکتا۔ پارکر کا قلم ہر وقت ان کی قمیص یا شیروانی کی جیب میں رہتا تھا، اور وہ اسی سے لکھتے تھے۔

۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا تو وطن عزیز کی سیاسی فضاؤں میں خوف و ہراس کی گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ مارشل لا کے بعد پہلی عید آئی تو مولانا غزنوی نے منٹو پارک کے میدان میں عید کا خطبہ دیتے ہوئے مارشل لا کی شدید مخالفت کی اور فوجی آمریت کو کڑے الفاظ میں نشانہ تنقید بنایا۔ مولانا

Marfat.com

نے کہا کہ ایوب خاں سیاست اور سیاست دانوں پر تنقید کرتے ہیں، لیکن خود سیاست کر رہے ہیں۔ جو شخص برسر اقتدار آئے گا، وہ فوجی ہو یا کوئی اور، سیاست سے ہرگز الگ نہیں ہو سکتا۔ اگر انھیں واقعی سیاست سے نفرت ہے تو حکومت چھوڑ دیں اور اقتدار سے دست بردار ہو جائیں۔

منٹو پارک میں مولانا عیدین کی نماز پڑھایا کرتے تھے۔ لاہور کی جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے لوگ یہیں نماز ادا کرتے تھے۔ بادشاہی مسجد کے بعد لاہور میں سب سے زیادہ لوگ یہاں آتے تھے۔

فروری ۱۹۶۰ء میں ایوب خاں نے دستور بنانے کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل سوال نامہ مرتب کیا گیا تھا جو اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا اور ملک کی مشہور شخصیتوں کو سرکاری طور پر بھیجا بھی گیا تھا۔ حکومت کا مقصد یہ تھا کہ اس کا مناسب جواب دیا جائے تا کہ آئندہ دستور اس کی روشنی میں ترتیب دیا جائے۔

اس معاملے میں مولانا غزنوی نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے علما سے رابطہ پیدا کیا اور جامعہ اشرفیہ میں (جو اس زمانے میں نیلا گنبد لاہور میں قائم تھا) تمام مسالک فقہ کے علما کا اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں انیس علمائے کرام شریک ہوئے اور ۵، ۶۔ مئی ۱۹۶۰ء کو دو دن گفتگو ہوتی رہی۔ جواب کا مسودہ مولانا غزنوی اور مولانا مودودی نے مرتب کیا تھا۔ ان دنوں کسی کے پاس گاڑی نہ تھی، علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم کے پاس ایک گاڑی تھی۔ وہ کبھی مولانا غزنوی کو اپنی گاڑی سے مولانا مودودی کے مکان پر اچھرے لے جاتے اور کبھی مولانا مودودی کو مولانا غزنوی کی اقامت گاہ پر شیش محل روڈ لے آتے تھے۔ میں ان اجلاسوں میں شامل تھا۔ جوابی دستاویز میں کامل جمہوریت کے نفاذ اور پارلیمانی نظام حکومت کی واضح اور صریح لفظوں میں سفارش کی گئی تھی۔

کچھ عرصے کے بعد صدر ایوب نے اپنا ایک خاص نوع کا آئین ترتیب دیا جس کی تفصیلات کا سب کو علم ہے۔ وہ ۱۹۔ مارچ ۱۹۶۲ء کو لاہور آئے، لاہور کے کمشنر اس وقت غالباً حامد رضا تھے۔ انھوں نے مولانا غزنوی کو رات کے ایک بجے ٹیلی فون کیا اور کہا کہ کل صبح آٹھ بجے صدر ایوب آپ سے اور آپ کے رفقا سے گورنر ہاؤس میں ملاقات کے خواہاں ہیں۔ مولانا نے سات بجے کے قریب مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا تو مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا مہدی زمان خاں (رئیس کھلا بٹ جو قریب کی رشتے داری میں صدر ایوب کے ہم زلف تھے اور اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر تھے) میاں عبدالمجید مالواڈہ (سابق ناظم مالیات مرکزی جمعیت اہل حدیث) اور مولانا غزنوی کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی وہاں موجود تھے۔ مولانا ہمیں ساتھ لے کر گورنر ہاؤس گئے۔ ملک امیر محمد خاں ان دنوں مغربی پاکستان کے گورنر

Marfat.com

تھے۔ پہلے ان سے ملاقات ہوئی اور مولانا نے ان سے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا اور پنجابی میں کہا کہ آزادی سے قبل پنجاب اسمبلی میں ملک صاحب سے ہماری بڑی بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ یونینسٹ پارٹی میں تھے اور میں کانگرس میں۔ دونوں سیاسیات میں ایک دوسرے کے حریف اور مدمقابل تھے۔ ملک صاحب مولانا کی باتوں پر مسکراتے رہے۔ پھر پنجابی میں کہا: مولانا! اوہ بھی عجیب زمانہ سی۔ لڑائی بھی، تے یاری بھی!

اس کے بعد صدر ایوب سے ملے۔ ان سے بھی مولانا نے سب کا تعارف کرایا۔ اس سے کچھ عرصہ قبل ٹنڈو آدم (سندھ) کے ایک دارالعلوم میں ایوب خاں کی مولانا سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایوب خان نے اس ملاقات کا حوالہ دیا اور مولانا سے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ پھر اصلی مقصد کی طرف آئے اور کہا، آپ کو اس لیے تشریف آوری کی تکلیف دی گئی ہے کہ ہم نے جو آئین دیا ہے، وہ آپ نے پڑھا ہوگا۔ آپ سے یہ دریافت کرنا مقصود ہے کہ اس آئین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

مولانا نے جواب میں تفصیل سے اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کی اور آخر میں صاف لفظوں میں فرمایا:

اس کے متعلق میری اور میرے رفقا کی رائے یہ ہے کہ یہ آئین نہ اسلامی ہے، نہ جمہوری۔

یہ جواب صدر ایوب کی توقع کے خلاف تھا۔ انھوں نے تعجب سے مولانا کی طرف دیکھا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا اور اسلامی مدارس کے نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کے بارے میں بات شروع کر دی۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ عربی مدارس کے اصحاب انتظام کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ ان مدارس کے طلبا کو جدید علوم وفنون سے بھی بہرہ مند کیا جائے۔

سعودی عرب کی حکومت کے غزنوی خاندان کے اکابر سے اس وقت سے مراسم تھے، جب موجودہ حکمران سلطان فہد کے دادا عبدالرحمٰن اور والد سلطان عبدالعزیز کویت میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا داؤد غزنوی کے چچا مولانا عبدالواحد غزنوی اور مولانا عبدالرحیم غزنوی تجارت کے لیے امرتسر سے کویت گئے تو ان باپ بیٹے سے ان کی ملاقات ہوئی جو رفتہ رفتہ مستحکم تعلقات میں بدل گئی۔ حجاز فتح ہونے کے بعد بھی یہ مراسم قائم رہے۔ ۱۹۲۶ء میں علمائے ہند کا جو وفد سلطان عبدالعزیز سے بعض معاملات میں گفتگو کے لیے حجاز گیا تھا، مولانا داؤد غزنوی اس میں شامل تھے اور سلطان ان سے بہت اعزاز سے پیش آئے تھے۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں سلطان عبدالعزیز کے بڑے بیٹے سلطان سعود بن عبدالعزیز پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تو مولانا داؤد غزنوی اپنے بعض رفقا کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے کراچی پہنچے اور ہوائی اڈے پر ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ لاہور آئے تو بھی مولانا کی ان سے ملاقات ہوئی اور وہ مولانا سے کافی دیر مصروف گفتگو رہے۔

Marfat.com

اس وقت لاہور کارپوریشن کے میئر سید ہادی علی شاہ تھے۔ سلطان کو لاہور کے شہریوں کی طرف سے شالیمار باغ میں عصرانہ دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں میئر کارپوریشن نے مولانا سے کئی دفعہ رابطہ قائم کیا تھا۔

مئی ۱۹۶۲ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز نے اپنے سفیر متعینہ پاکستان کی وساطت سے مولانا کو اطلاع دی کہ انھوں نے مدینہ یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے انھیں یونیورسٹی کی مشاورتی کونسل کا رکن نامزد کیا ہے۔ شاہ نے یہ پیغام بھی بھجوایا کہ ۲۰۔ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ (۲۵۔ مئی ۱۹۶۲ء) کو مدینہ یونیورسٹی کا افتتاح ہو رہا ہے، ان کی خواہش ہے کہ وہ ایسے وقت تشریف لائیں جب حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کرسکیں۔ مولانا نے شاہ سعود کی دعوت قبول فرمائی اور وہ ۷۔ مئی کو لاہور سے کراچی روانہ ہوئے اور ۹۔ مئی کو کراچی سے عازم حجاز ہوئے۔ ۱۵۔ جون ۱۹۶۲ء کو واپس لاہور تشریف لائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مولانا غزنوی کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ایک دن دو اڑھائی بجے کے قریب ہم بذریعہ ٹرین لاہور سے ملتان روانہ ہوئے۔ میں نے لاہور سے نکلتے ہی مولانا آزاد کے بارے میں ان سے بعض باتیں پوچھنا شروع کردیں۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ جب میں نے کانگرس سے استعفا دیا اور مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا، اس وقت میں دہلی میں تھا۔ اخبارات میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی اور بی بی سی (لندن) نے بھی اسے نشر کیا۔ تیسرے دن میں مولانا آزاد سے ملنے گیا تو مجھے عام ملاقاتیوں کے کمرے میں ملے اور خیروعافیت پوچھنے کے بعد خاموش ہوگئے، کوئی خاص بات نہیں کی۔ مجھے اس کا بہت احساس ہوا۔ چند منٹ کے بعد میں نے کہا: میں اجازت چاہتا ہوں۔ فرمایا: ''اچھا''...... میں واپس آگیا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ یہ شخص تو بڑے کھلے دل کا ہے۔ کوئی کسی جماعت میں جائے، کسی میں نہ جائے، اسے کبھی کوئی ملال نہیں ہوا، مجھ سے یہ رویہ کیوں اختیار کیا گیا ہے۔

دوسرے دن میں نے ایک مفصل خط لکھ کر ملازم کے ہاتھ ان کی خدمت میں بھیجا، جس میں کانگرس سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہونے کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ قدم اٹھانے سے پہلے میں نے استخارہ کیا تھا...... آخر میں یہ پوچھا تھا کہ کیا میں کسی وقت حاضر خدمت ہوسکتا ہوں؟

مولانا نے اسی ملازم کے ہاتھ جوابی خط بھیجا کہ کل فلاں وقت آجایئے، تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

مجھے اس جواب سے بڑی مسرت ہوئی اور دوسرے دن وقت مقررہ پر مولانا کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ پہلے کی طرح نہایت تپاک سے ملے۔ حسب معمول اپنے خاص کمرے میں لے گئے اور پوچھا، ''آپ نے کیا استخارہ کیا تھا؟'' میں نے بتایا تو خوش ہوئے اور استخارے کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ جو استخارہ حدیث سے مروی ہے، اس کا ذکر بھی کیا اور جو استخارے مختلف بزرگوں سے منقول اور کتابوں میں مرقوم ہیں، ان کے بارے میں بھی

Marfat.com

تفصیلات بیان کیں، میں نے بھی اس موضوع سے متعلق بہت باتیں بتائیں۔

مولانا غزنوی جب یہ ساری بات بیان کر چکے تو میں نے عرض کیا: ''استخارے کے بارے میں مولانا آزاد نے آپ سے جو کچھ فرمایا ممکن ہے، اس کا تعلق طنز و مزاح سے ہو۔''

بولے: ''نہیں مولوی اسحاق! مولانا اس سلسلے میں بہت محتاط تھے، وہ امور شرعیہ میں طنز نہیں کرتے تھے۔''

انھوں نے بتایا کہ مولانا آزاد نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ مجھ سے مشورہ کر لیتے تو میں آپ کو کانگرس چھوڑنے اور مسلم لیگ میں جانے کا ایسا راستہ بتاتا کہ آپ کا مقصد بھی پورا ہو جاتا اور کوئی شخص اعتراض بھی نہ کر سکتا۔

مولانا آزاد کی یہ بات بتانے کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے کہا کہ مجھے خیال یہ تھا کہ اگر میں نے مولانا کو اپنے سیاسی ذہن کی تبدیلی کے بارے میں کچھ بتا دیا تو وہ اصرار کریں گے کہ میں کانگرس سے نہ نکلوں۔

گفتگو کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ کانگرس کو چھوڑ کر میں نے سب سے بڑی قربانی یہ دی ہے کہ مولانا آزاد کی رفاقت ختم ہوگئی، جس کا مجھے بہت احساس ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ اگر کانگرس کو نہ چھوڑتے اور ہندوستان میں رہتے تو آپ کو کسی اسلامی ملک کا سفیر مقرر کر دیا جاتا۔ ممکن ہے مصر یا سعودی عرب کی سفارت آپ کے سپرد ہوتی۔

فرمایا: ''حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ میں کانگرس میں نہیں رہ سکتا تھا۔''

بہر حال یہ دور گزشتہ کی بات تھی جو گزر چکی اور اب یادوں کا حصہ بن گئی۔

مولانا غزنوی ۱۹۵۶ء کو دہلی گئے اور مولانا آزاد سے ملے...... اس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ مولانا آزاد بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ میں ۱۹۵۶ء میں دہلی جا کر ان سے ملا تو بہت خوش ہوئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں، مولانا غزنوی نہایت نفاست پسند تھے اور دوسرے کو بھی صاف ستھرا دیکھنا چاہتے تھے۔ جب وہ مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تو سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیتے۔ میں نے ایک دن عرض کیا۔

حضرت! ہم لوگ ظاہر کی صفائی تو تھوڑی بہت رکھ سکتے، باطن کا کیا کریں؟

فرمایا: ''ظاہر صاف ستھرا ہو تو اللہ تعالیٰ باطن کی صفائی کی بھی بہتر صورت پیدا کر دیتا ہے۔''

مولانا کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی مرحوم کا کمرہ میرے کمرے سے ملحق تھا۔ وہ عام طور پر اندر بیٹھے پڑھتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں وہ سگریٹ بہت پیتے تھے۔ (بعد میں ان کی دنیا بدل گئی تھی) وہ سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے کمرے میں پھینکتے رہتے تھے۔ چھ چھ سات سات دن کمرے میں جھاڑو کی

Marfat.com

نوبت نہ آتی تھی۔ چھت اور دیواروں پر جالے تنے رہتے تھے۔ مولانا کو بغیر دیکھے اس کا علم تھا۔ جس دن انھوں نے ابوبکر صاحب کے کمرے میں کسی سلسلے میں جانا ہوتا تو اوپر سے آواز دیتے۔

''ابوبکر! میں دس منٹ تک تمھارے پاس آرہا ہوں۔''

ابوبکر مرحوم کو مصیبت پڑ جاتی۔ گھبرائے ہوئے میرے پاس آتے۔ اسحاق صاحب! میرے بابا میرے کمرے میں آرہے ہیں۔ خدا کے لیے کمرہ صاف کرنے میں میری مدد کریں۔ چنانچہ ہم دونوں کمرے کی صفائی میں مصروف ہو جاتے۔ جلدی جلدی سگریٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر باہر گلی میں پھینکتے۔ میز کرسیاں صاف کرتے، کتابوں کی گرد جھاڑتے اور چھت پر لٹکتے ہوئے جالے اتارتے۔ مولانا اندر داخل ہوتے ہی پہلے تمام کمرے کا جائزہ لیتے، پھر کرسی پر تشریف رکھتے۔

مولوی عمر فاروق غزنوی مولانا کے بڑے صاحب زادے تھے۔ نیک اور وظائف وغیرہ کے پابند، میرے مخلص دوست تھے۔ ان کی اپنی خریدی ہوئی شیخوپورہ روڈ پر آٹھ نو مربعے زرعی زمین تھی۔ وہاں ان کا باقاعدہ ڈیرہ تھا، جسے ''شاہ داڈیرہ'' کہا جاتا تھا۔ ٹیوب ویل، ٹریکٹر وغیرہ سب کچھ تھا۔ والد یا بھائی کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ زمینوں پر اپنے ڈیرے میں رہتے تھے، پانچ چھ روز کے بعد گھر آتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو عام طور پر نیچے مولانا کے دفتر میں آکر اخبار پڑھتے اور اگر کوئی ضروری بات کرنا ہوتی تو کرتے۔ ایک دن میں مولانا کے پاس گیا تو مولوی عمر فاروق بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مولانا نے مجھ سے کہا:

مولوی اسحاق! (مولوی عمر فاروق کی طرف اشارہ کرکے) آپ ہیں مولانا عمر فاروق غزنوی...... آٹھ نو مربعے آپ کی زرعی زمین ہے۔ اچھی خاصی رقم بینک میں جمع ہے۔ ٹیوب ویل، ٹریکٹر سب اللہ نے دیا ہے۔ آپ ایک ہفتے کے بعد کپڑے بدلتے ہیں اور دو سال کے بعد ٹوپی خریدتے ہیں۔

میں بھی ہنس پڑا، مولوی عمر فاروق بھی ہنس پڑے اور بولے۔

''نہیں ابا جی! ہفتے کے بعد تو نہیں، چار دن کے بعد کپڑے بدلتا ہوں۔''

مولانا مسکرائے اور فرمایا: ''دوسرے دن بدلنے کی ہمت نہیں پڑتی؟''

مولانا خالصتاً سلفی المسلک تھے۔ کتاب وسنت پر سختی سے عامل...... اس میں کسی قسم کی مداہنت کے قائل نہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی نہایت نرم مزاج اور بردبار...... دوسرے کی چھوٹی موٹی عملی کمزوریوں کو برداشت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں کسی کو طعن وتشنیع کا نشانہ نہیں بناتے تھے۔ میں پندرہ سال ان کی خدمت میں رہا، اس طویل مدت میں میری ظاہری حالت کے متعلق صرف ایک دن یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

''مولوی اسحاق! اگر آپ داڑھی بڑھالیں تو ہم آپ کو اپنی مسجد چینیاں والی کا خطیب مقرر کرلیں۔''

Marfat.com

اسے تبلیغ سمجھ لیجیے، طنز کہہ لیجیے، مذاق سے تعبیر کر لیجیے، جو مرضی اس کا نام رکھ لیجیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کبھی کچھ نہیں کہا۔

مولانا کا معمول یہ تھا کہ سردیوں میں ناشتہ کر کے نو بجے کے قریب نیچے اپنے دفتر آجاتے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے اوپر جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر نیچے تشریف لے آتے۔ عام طور سے مغرب کی اور بعض اوقات عشا کی نماز کے بعد اوپر جاتے۔ صحت ٹھیک ہوتی تو تمام نمازیں بالالتزام باجماعت پڑھتے۔

گرمیوں میں آٹھ بجے کے لگ بھگ نیچے آجاتے۔ پھر بارہ بجے کے قریب کھانے کے لیے اوپر جاتے۔ کھانے کے بعد پھر نیچے کمرے میں آجاتے (جو ان کا دفتر بھی تھا) وہیں قیلولہ کرتے۔ گرمیوں کے موسم میں دوپہر اور شام کے بعد کا ان کا گھریلو لباس ململ کا کرتا اور سٹیپل کا تہمند تھا۔ غسل خانے جانے کی ضرورت ہوتی تو اور تہمند باندھتے اور نماز کے لیے اور...... ! گرمیوں میں ان کے جسم پر پت کے دانے نمودار ہو جاتے تھے اور ان کی وجہ سے جسم پر خارش سی ہونے لگتی تھی۔ کمر پر خارش ہوتی تو وہاں تک ہاتھ نہیں پہنچتا تھا، اس لیے میز پر پیمانہ (فٹ) رکھتے تھے اور اسی سے خارش کرتے۔

مولانا انتہائی خوددار تھے۔ بظاہر آمدنی کا کوئی خاص ذریعہ نہ تھا اور اس کا کسی سے اظہار نہ کرتے تھے۔ اس کا احساس مجھے ایک ہی ہفتے میں یکے بعد دیگرے پیش آنے والے دو واقعات سے ہوا۔ ایک دن ہم انارکلی سے باہر اور لوہاری دروازے کی طرف کھڑے تھے اور شیش محل روڈ جانا چاہتے تھے۔ مولانا نے اپنی عادت اور معمول کے خلاف سالم تانگہ نہیں لیا بلکہ عام سواریوں کے ساتھ تانگے میں بیٹھے اور بیٹھتے ہی مجھے کہا، چلیے آج اسی پر چلتے ہیں۔ شیش محل روڈ پر آئے تو دو آنے سواری کے حساب سے دو سواریوں کے چار آنے تانگے والے کو دیے۔

چوتھے یا پانچویں دن میں نے دیکھا کہ درزی کو بلا کر ٹھنڈی پرانی شیروانی اسے دی اور کہا کہ یہ یہاں یہاں سے پھٹ گئی ہے، اسے الٹا دو۔ پھر مجھ سے فرمایا: ”مولوی اسحاق! پرانی چیزیں اگر ٹھیک ہو سکیں تو انھیں ٹھیک کرا لینا چاہیے۔ نواں نو دن، پرانا سو دن۔“

یہ دونوں واقعے مجھے عجیب سے لگے اور میں نے مولانا حنیف ندوی کو بتائے۔ انھوں نے کہا: ”مولانا مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر ہیں اور اسی کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ مرکزی جمعیت کی طرف سے کم سے کم تین سو روپے ہر مہینے ان کی خدمت میں پیش کیے جائیں۔“

میں نے عرض کیا: ”بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے کسی نہ کسی طرح خود مولانا کی منظوری لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ چنانچہ دوسرے دن مولانا ندوی آگئے۔ ہم دونوں نے مولانا غزنوی سے اشارتاً بات کی تو فرمایا: ”ہرگز نہیں۔ میں ایک پیسہ بھی مرکزی جمعیت کے خزانے سے نہیں لوں گا۔ آپ نے میرے بارے میں

Marfat.com

سوچا اور مجھ سے بات کی، اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن یہ بات یہیں رہنے دیجیے، کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیے۔"

ہم نے عرض کیا کہ تمام جماعتوں کے فنڈ سے اس کے سربراہوں کی خدمت کی جاتی ہے، اس لیے کہ وہ جماعت کو وقت دیتے اور اس کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کی خدمت بھی جماعت کو اپنی استطاعت کے مطابق کرنی چاہیے۔

فرمایا: "کوئی جماعت کسی کی خدمت کرتی ہو یا نہ کرتی ہو، مجھے اس سے بحث نہیں۔ میں کسی صورت میں اپنی جماعت سے کچھ نہیں لوں گا۔ کسی نہ کسی طرح وقت گزر رہا ہے اور گزرتا رہے گا۔"

مولانا غزنوی شاہانہ مزاج مگر درویشانہ اطوار کے مالک تھے۔ ان کا کہیں ذاتی مکان یا پلاٹ نہ تھا۔ وہ اوقاف کے مکان میں رہتے تھے اور اس کا ماہانہ کرایہ ادا کرتے تھے۔ کوئی بینک بیلنس نہ تھا۔

ایک دن میں نے پوچھا: "آپ نے مکان کا کلیم داخل کیا تھا؟"

فرمایا: "میرا کہیں مکان ہی نہ تھا۔ آزادی وطن سے بہت پہلے اپنی ضرورتوں کی بنا پر امرتسر والا ذاتی مکان بیچ ڈالا تھا اور خود لاہور میں چینیاں والی مسجد کے چھوٹے سے مکان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ میں جھوٹا کلیم کیوں داخل کرتا اور اس کے لیے کلیم کمشنر کی عدالت میں کیوں جھوٹے گواہ پیش کرتا۔"

اوقاف کے اس مکان میں جہاں وہ رہتے تھے، ان کے بچے اب بھی وہیں ہیں اور اس کی اوپر کی منزل میں سکونت پذیر ہیں۔ اس کی پہلی اور دوسری منزل میں ان کا آبائی دارالعلوم ہے جو آزادی سے قبل امرتسر میں تھا۔

مولانا کی چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں سطح ذہن پر ابھرنے لگی ہیں۔ دارالعلوم کے پھاٹک کے ساتھ شیش محل روڈ پر محمد ادریس کی چائے اور پان کی دکان تھی، مولانا چائے اور پان محمد عمر سے ادریس کی دکان سے منگواتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ میں بیٹھا ہوں، مولانا نے میرے لیے بھی چائے اور پان منگوایا اور اپنے لیے بھی۔

یہ دکان دفتر الاعتصام کے بالکل نیچے تھے، میں اوپر سے آواز دے کر اسی دکان سے چائے منگوایا کرتا تھا۔

دکان اب بھی ہے، لیکن ادریس دکان پر نہیں بیٹھتا، اس کا بیٹا بیٹھتا ہے، ادریس اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اس کی کمر جھک گئی ہے۔ میں کبھی اس طرف جاؤں اور ادریس سے ملاقات ہو جائے تو پرانی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگتی ہیں۔ ادریس نہایت محبت سے ملتا ہے اور قدیم دور کے واقعات یاد کر کے خوش بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی کرتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پنجاب میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا، جس میں سڑکیں ٹوٹ گئی تھیں اور صوبے کا بہت بڑا حصہ زیر آب آ گیا تھا، فصلیں تباہ ہو گئی تھیں اور بے شمار گاؤں منہدم ہو گئے تھے۔ لاہور شہر کے کتنے ہی علاقے اور محلے پانی کی زد میں آ گئے تھے، بلال گنج اور موہنی روڈ کی طرف سے پانی کی خوف ناک لہریں شیش محل روڈ

Marfat.com

پر دار العلوم تقویۃ الاسلام کے پھاٹک تک پہنچ گئی تھیں۔ مولانا کی اپیل پر مرکزی جمعیت اہل حدیث نے سیلاب زدہ لوگوں کی مدد کے لیے اس زمانے میں مختلف مقامات پر اٹھائیس امدادی کیمپ لگائے تھے۔ ایک کیمپ قلعے اور بادشاہی مسجد کے درمیان حضوری باغ میں اور ایک جی ٹی روڈ پر بادامی باغ ریلوے سٹیشن کے سامنے لگایا گیا تھا۔ لاہور کے بعض دیگر مقامات پر بھی امدادی کام شروع کیا گیا تھا۔ ملک حسن علی جامعی شرق پوری کی تجویز واعانت سے دو کیمپ شرق پور میں لگائے گئے تھے۔

ان دنوں پاکستان کے وزیر اعظم چوہدری محمد علی اور پنجاب کے گورنر مشتاق احمد گورمانی تھے۔ ایک دن وہ دونوں لاہور کے سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے حضوری باغ آئے تو جمعیت کے امدادی کیمپ کے کارکنوں سے ملے، اتفاق سے میں اس وقت وہیں تھا، انھوں نے مولانا کا حال پوچھا اور سلام کہا۔

انہی دنوں ایک جیپ کے ذریعے ہم تین چار آدمی مولانا کے ساتھ شرق پور گئے اور وہاں کے سرکردہ لوگوں سے ملے۔ شاہدرہ موڑ سے شرق پور تک تمام سڑک پانی سے بھری ہوئی تھی۔ ہماری جیپ پانی کو چیرتی ہوئی شرق پور پہنچی اور اسی حالت میں ہم شام کو واپس لاہور آئے۔ واپسی پر مغرب کی نماز شرق پور سے پانچ چھ میل ادھر ایک گاؤں منڈیاں والی میں پڑھی۔

ملک کے بہت سے بڑے بڑے عالموں اور مشہور سیاسی لیڈروں کی آمد ورفت کا سلسلہ مولانا کے ہاں جاری رہتا تھا۔ دو مرتبہ چوہدری محمد علی اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں ان کے پاس آئے۔ حسین شہید سہروردی صاحب جب پاکستان کے وزیر اعظم تھے، ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے کے قریب ان کے مکان پر آئے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کے دورے سے آرہے ہیں۔ نواب افتخار حسین آف ممدوٹ، سردار عبد المجید دستی اور بعض صوبائی وزیر تو اکثر آتے تھے۔ ایک مرتبہ شام کے بعد ڈاکٹر خاں صاحب بھی آئے تھے جب وہ مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے۔ علی احمد تالپور تو کئی مرتبہ ملاقات کو آئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب تالپور صاحب مغربی پاکستان کی وزارت میں شامل تھے۔ یہ حضرات کچھ دیر مولانا کے پاس بیٹھتے اور کسی نہ کسی موضوع پر ان سے باتیں کرتے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ان کے پاس کوئی وزیر یا منصب دار آئے تو کسی نہ کسی طریقے سے اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں، لیکن مولانا اس کا کسی سے ذکر نہیں کرتے تھے، نہ انھیں کوئی احساس ہوتا تھا کہ کوئی آیا ہے یا نہیں آیا ہے۔ البتہ اگر کوئی بزرگ یا محقق قسم کا شخص آتا تو اس کا کسی نہ کسی انداز سے تذکرہ فرماتے۔

ایک دن میں نے مولانا سے کہا کہ ہماری جماعت کو جماعتی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے ارباب اقتدار اور اصحاب سیاست جو مولانا کے پاس آتے ہیں تو یہ جماعت

Marfat.com

اہل حدیث کو سیاسی اعتبار سے بہت بڑی جماعت سمجھتے ہوں گے، لیکن مولانا خاموش رہے، میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند روز بعد کوئی اور سیاست دان آیا تو اس کے جانے کے بعد میں نے مولانا سے پھر کہا کہ ہماری جماعت کو جماعتی حیثیت سے سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔ مولانا پھر خاموش رہے۔ تین چار دن کے بعد میں نے پھر یہی بات کہی۔ مولانا نے فرمایا: ''مولوی اسحاق! میں تو آپ کو عقل مند سمجھتا تھا۔ یہ آپ نے کیا بات کی...... سیاست دان آپ کی جماعت کو سیاسی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں دیں گے۔ یہ لوگ جماعت کو استعمال تو کریں گے اور اس سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے آپ کے علما سے رابطہ بھی رکھیں گے، لیکن کوئی سیاسی جماعت اس طرح کا اتحاد آپ سے نہیں کریں گی کہ کسی حلقے میں آپ کو انتخاب لڑنے کا موقع ملے۔ کیوں کہ آپ حلقہ انتخاب میں وہابی مشہور ہوں گے اور وہابیوں سے کوئی سیاسی جماعت کسی قسم کا اتحاد کرے گی بھی تو اس کا کوئی سرکردہ اور بڑا آدمی آپ کے امیدوار کے حلقہ انتخاب میں جا کر کھلے دل سے اس کی مدد نہیں کرے گا۔''

مولانا نے فرمایا: ''کوئی حلقہ ایسا نہیں جہاں جماعت کی اتنی اکثریت ہو کہ اس کے ٹکٹ پر کوئی شخص کامیاب ہو سکے۔ جس جماعت کا کوئی حلقہ انتخاب نہ ہو، اور اس کے ارکان مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے ہوں، سیاسی جماعتیں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ جماعت اہل حدیث کا کسی سیاسی جماعت سے بطور جماعت اتحاد کرنا باعث نقصان ہوگا۔ البتہ اتحاد کی جماعتیں آپ سے فائدہ اٹھائیں گی اور ان کے امیدوار آپ کے علما سے اپنے حق میں تقریریں کرائیں گے، جلوس نکلوائیں گے اور جماعت سے ووٹ لیں گے۔ اس قسم کی بے وقوفی جماعت کو کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہاں! جو اہل حدیث نمائندہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہا ہو، اس کی مدد ضرور کرنی چاہیے، اگرچہ وہ کسی جماعت کی طرف سے ہو۔''

مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ جماعت اہل حدیث پر ہی موقوف نہیں، کسی مذہبی جماعت کو لوگ ووٹ نہیں دیتے، صرف سیاسی جماعت کو ووٹ دیتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے ارکان سے وہ جائز و ناجائز کام بھی کرا لیتے ہیں، مذہبی جماعتوں کے ارکان سے اس قسم کے کاموں کے لیے کہنا مشکل ہوتا ہے۔

مولانا کی یہ بات میرے دل میں ایسی بیٹھی کہ اس کے بعد میں نے جماعت اہل حدیث کے لیے بحیثیت جماعت، سیاست میں حصہ لینے کی بات نہ کبھی مولانا سے کی اور نہ کسی اور سے۔ مولانا کی یہ بات اس وقت بھی صحیح ہے اور آئندہ بھی صحیح ثابت ہوگی۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سیاست میں اتہام طرازی، کذب بیانی، دغا بازی، دھوکا دہی، اکھاڑ پچھاڑ، غلط تنقید، نعرے بازی اور جلوس بازی سب چلتا ہے جو لوگ یہ کام جتنا زیادہ کریں گے اتنے ہی بڑے سیاست دان تصور کیے جائیں گے، لیکن جماعت اہل حدیث کا یہ مزاج نہیں، یہ خالص تبلیغی اور وقار و عظمت کے

Marfat.com

دائرے میں رہ کر کلمہ حق کہنے والی اور کتاب وسنت کی نشرواشاعت کرنے والی جماعت ہے۔ اس کی ہیئت ترکیبی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے ارکان اپنے اسلاف کے پاکیزہ کردار کو ہر آن پیش نگاہ رکھیں۔ سیاست کرنا ضروری ہو تو کوئی اور سامان کریں، جماعت کو اس میں ملوث کر کے اس کے وقار اور اس کی صاف ستھری آیات کو مجروح نہ کریں۔

مولانا کے پاس بے شمار لوگ مختلف علاقوں اور دور دراز دیہات سے اپنے ذاتی کاموں کے لیے آتے تھے۔ کسی کو کسی محکمے کے سیکرٹری سے، کسی کو کمشنر اور ڈپٹی کمشنر سے، کسی کو ملازمت کے سلسلے میں کسی وزیر یا بڑے آدمی سے سفارش درکار ہوتی تھی۔ مولانا سب کا کام کرانے کی کوشش کرتے۔ اگر ٹیلی فون کے ذریعے ممکن ہوتا تو ٹیلی فون کر دیتے۔ اگر رقعے کی ضرورت ہوتی تو رقعہ لکھ دیتے اور اگر خود جانا ضروری سمجھتے تو خود تشریف لے جاتے۔ کمزور، غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے کام کے لیے سب سے زیادہ کوشش کرتے اور جس محکمے کے اہل کار سے اس کام کا تعلق ہوتا، اسے اللہ سے ڈراتے اور زوردار لہجے میں فرماتے کہ امیر اور مالدار لوگ تو کئی ذرائع سے کام کرا سکتے ہیں، غریبوں اور کمزوروں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ ان کا کام ضرور کریں۔ یہ لوگ آپ کو دعا دیں گے۔

کسی کام سے آنے والا شخص دنیوی لحاظ سے چھوٹی حیثیت کا ہوتا یا بڑی حیثیت کا، متعلقہ محکمے کے اہل کاروں سے اس کا تعارف بہت اچھی طرح کراتے اور اس کی بڑائی کا اظہار فرماتے۔

ایک دن عجیب لطیفہ ہوا، ایک صاحب میرے پاس آئے، اپنا مقصد بیان کیا تو میں انھیں مولانا کے پاس لے گیا، کام کی نوعیت بتائی اور متعلقہ افسر کا نام بتایا، مولانا نے فرمایا: ''میں تو انھیں جانتا ہی نہیں، سفارش کیسے کروں؟'' کام بالکل جائز تھا اور مولانا کو کام کی تفصیل سن کر واقعۃً ان پر ترس بھی آیا، لیکن فرمایا کہ جس افسر سے اس کام کا تعلق ہے، اس سے میری واقفیت نہیں ہے۔ بات مولانا کی بھی صحیح تھی۔ میں نے عرض کیا، حضرت! یہ ضروری تو نہیں کہ جس شخص کو آپ نہیں جانتے، وہ بھی آپ کو نہیں جانتا۔ آپ کسی کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہو، آپ کو تو سب جانتے ہیں۔

بولے: ''مولوی اسحاق! ہمیں کون جانتا ہے، یہ آپ کا حسن ظن ہے کہ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ یہ کہہ کر ٹیلیفون ڈائریکٹری سے ان کا نام تلاش کیا اور ان کو ٹیلی فون کیا۔ اتفاق سے وہی صاحب ٹیلی فون پر بیٹھے تھے۔

مولانا نے فرمایا: ''داؤد غزنوی بول رہا ہوں۔''

انھوں نے جواب دیا: ''محمود غزنوی؟''

فرمایا: ''داؤد غزنوی! داؤد غزنوی!''

Marfat.com

پھر وہی جواب آیا: ''محمود غزنوی؟''

زور سے بولے: ''بھائی داؤد غزنوی...... آپ نے حضرت سلیمان کا نام کبھی سنا یا کہیں پڑھا ہے؟ ان کے باپ کا نام کیا تھا؟ داؤد تھا، میرا نام وہی ہے۔''

جب وہ سمجھ گئے تو پھر فرمایا: ''داؤد غزنوی۔''

ان کو کام کی تفصیل بتائی اور کہا کہ یہ کام ضرور کرنا چاہیے، اللہ آپ کو جزا دے گا جس کا کام تھا اس کا تعارف بھی خوب کرایا...... متعلقہ افسر نے کہا: ''ان کو اپنا رقعہ دے کر بھیج دیجیے، کام ہو جائے گا۔ مولانا نے رقعہ لکھ دیا اور کام ہو گیا''...... مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''آپ تو کہتے تھے کہ سب لوگ مجھے جانتے ہیں، ہمیں کون جانتا ہے، بس اللہ کی مہربانی ہے کہ لوگوں کا کام ہو جاتا ہے۔''

بعض حضرات صرف ایک وتر پڑھتے ہیں، مولانا اس کے قائل نہیں تھے، فرمایا کرتے تھے، ایک رکعت کی کوئی نماز نہیں ہے۔

وہ نماز کی جمع تقدیم کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جس نماز کا وقت نہیں ہوا، وہ کیوں پڑھی جائے۔

ایک مرتبہ مولانا داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل صاحب، مولانا عطاء اللہ حنیف اور ان سطور کا راقم جماعتی تنظیم کے سلسلے میں ضلع قصور کے ایک قصبے ''کھڈیاں خاص'' گئے۔ جمعے کا دن تھا، جمعہ ہم نے وہیں پڑھا۔ شام کو قصور پہنچے، مسجد اہل حدیث میں گئے تو مغرب کی جماعت ہو چکی تھی اور نماز پڑھ کر لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ہم چار آدمی تھے، مولانا اسماعیل صاحب نے جماعت کرائی۔ نماز پڑھ کر مولانا غزنوی تو وظیفے میں مشغول ہو گئے اور مولانا اسماعیل صاحب نے عشا کی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ پہلے دو فرض پڑھے اور پھر ایک وتر پڑھا۔

مولانا غزنوی وظیفے اور دعا سے فارغ ہوئے تو مولانا اسماعیل صاحب سے پوچھا:

''یہ آپ نے کیا پڑھا ہے؟''

جواب دیا: ''عشا کی نماز......!''

فرمایا: ''عشا کا وقت ہو گیا......؟''

بولے: ''میں مسافر ہوں۔''

پھر پوچھا: ''ایک رکعت کیا پڑھی ہے؟''

کہا: ''وتر''......

فرمایا: ''جس نماز کا وقت نہیں ہوا، وہ نماز کیوں پڑھی جائے؟'' ساتھ ہی فرمایا: ''ایک رکعت تو کوئی نماز نہیں ہوتی۔''

Marfat.com

مولانا اسماعیل صاحب ان کی سب باتوں کا جواب دے سکتے تھے، لیکن تقاضائے ادب سے خاموش رہے، کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ تھا ان بزرگان عالی قدر کے نزدیک ایک دوسرے کا احترام کہ اختلاف کو نہایت فراخ دلی سے برداشت کرتے اور خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کی بات سنتے تھے۔

اب یہ دور ہے کہ اس قسم کی بات آپ کسی سے کریں تو وہ فوراً کمر کس کر میدان میں آجاتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں، کرلو میرے ساتھ مناظرہ۔ میں ثابت کروں گا کہ میں سچا ہوں اور تم جھوٹے ہو۔ نہ دل میں بڑے کی عزت نہ ذہن میں چھوٹے پر شفقت کا جذبہ......!

اس سے اندازہ کیجیے کہ گزشتہ عہد کے علما کی تربیت کیسی ہوئی تھی اور اب کیسی ہو رہی ہے۔ وہ ماحول کتنا قابل رشک تھا اور یہ ماحول کس درجہ تکلیف دہ ہے۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ مولانا صبح نیچے کی منزل میں اپنے دفتر آجاتے، پھر دوپہر کو کھانے کے وقت اوپر جاتے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آجاتے اور مغرب کی نماز کے بعد تک دفتر میں تشریف فرما رہتے۔ لیکن وفات سے تقریباً دو سال قبل دل کی تکلیف زیادہ ہوگئی تھی، اس لیے بعض دفعہ یہ پابندی قائم نہ رہ سکتی۔ ملاقات کے لیے ہر قسم کے لوگ الگ الگ مقصد لے کر آتے تھے، مولانا ہر ایک سے ملتے، کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ بارہا ایسا ہوا کہ اوپر گئے ہیں، اسی وقت کوئی ملنے والا آگیا۔ اطلاع پہنچی اور نیچے آگئے۔ ان کو تین منزلیں اوپر جانا پڑتا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر چڑھتے اور اسی دھیمی رفتار سے نیچے آتے۔ اکثر فرماتے: ''یہ سیڑھییں میرے لیے ایک عذاب ہے۔''

وہ اردو میں بصورت جمع سیڑھیاں، کرسیاں، چارپائیاں، رضائیاں نہیں کہتے تھے۔ مثلاً چار کرسیاں، آٹھ سیڑھیاں، دو چارپائیاں، چھ رضائیاں وغیرہ بلکہ ''سیڑھییں، کرسیں، چارپاییں اور رضاییں'' کہا کرتے تھے۔ فرماتے: ''اندازہ کیجیے کتنی سیڑھییں اوپر چڑھتا ہوں اور پھر کتنی سیڑھییں اتر کے نیچے آتا ہوں......'' بعض دفعہ کہتے: ''جی چاہتا ہے کہ سیڑھیوں کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے نیچے ہی دو تین کمرے تعمیر کر لیے جائیں، مگر تعمیر کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں۔ میں کسی ملنے والے کو ملنے سے انکار نہیں کرسکتا، اس لیے نیچے آنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن یہ سیڑھییں بڑی تکلیف کا باعث ہیں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گی۔''

مولانا غزنوی تحریکات آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں ملک کی مختلف جیلوں میں محبوس رہے۔ کچھ عرصہ الٰہ آباد جیل میں بھی بسر ہوا۔ یہ پنڈت جواہر لال نہرو کا شہر تھا اور یہ خاندان مولانا کا اس قدر احترام کرتا تھا کہ جیل میں ان کا ناشتہ اور دو وقت کا کھانا جواہر لال کے گھر سے بھیجا جاتا تھا۔ اس کا اہتمام خود جواہر لال نہرو کی

Marfat.com

بہن وجے لکشمی پنڈت کرتی تھیں۔

ترک موالات اور عدم تعاون کے زمانے کی قید کا کچھ عرصہ روہتک جیل میں گزرا۔ روہتک اس وقت پنجاب کا ایک ضلع تھا۔ اب صوبہ ہریانہ کا ضلع ہے۔ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے اخبار اہل حدیث (امرتسر) میں خبر لگائی گئی ہے کہ مولانا محمد داؤد غزنوی ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو تین بجے شام اپنی معیاد قید ختم کرنے کے بعد روہتک جیل سے امرتسر پہنچے۔ خلافت کمیٹی کے ارکان نے ریلوے اسٹیشن پر ان کا خیر مقدم کیا اور جلوس نکالا۔ آپ نہایت کمزور اور لاغر معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا کی جیل کے ابتدائی دنوں میں، پنجاب کی جیلوں میں اے یا بی کلاسیں نہیں ہوتی تھیں۔ سیاسی اور اخلاقی قیدیوں سے جیلوں میں ایک ہی قسم کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قیدیوں کو جوار، باجرے، چنے اور جو کے ملے جلے آٹے کی روٹی دی جاتی تھی۔ مولانا اور ان کے ساتھیوں نے اس پر احتجاج کیا تو سیاسی قیدیوں کو سپیشل کلاس دی گئی اور گندم کے آٹے کی روٹی دینے کا حکم ہوا۔ اخلاقی قیدیوں کے کھانے کے بارے میں انھوں نے احتجاج کیا تو انھیں بھی گندم کے آٹے کی روٹی ملنے لگی۔ یہ واقعہ مجھ سے خود مولانا نے بیان کیا تھا۔ فرماتے تھے: ''اب کیا جیلیں ہیں، جیلیں تو ہمارے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔''

اس زمانے میں جیلوں میں جانا اور وہاں زندگی بسر کرنا انتہائی مشکل تھا، لیکن آزادی خواہ لوگ اس راہ کی تمام مشکلات انتہائی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ یہ جہاں جاتے اخلاقی قیدی ان کا بے حد احترام کرتے، ان کی وجہ سے انھیں بھی کچھ سہولتیں میسر آجاتی تھیں۔

اوپر الہ آباد اور پنڈت جواہر لال نہرو کا نام آیا ہے۔ اس سے مجھے جواہر لال کے والد پنڈت موتی لال نہرو کے متعلق ایک واقعہ یاد آیا جو مولانا نے ایک مرتبہ بیان کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ موتی لال نہرو کھانے پینے کے سلسلے میں ہندوانہ چھوت چھات اور کلچر کے قائل نہ تھے۔ ایک مرتبہ کانگرس کے اجلاس میں کھانے کا وقت ہوا تو دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی سی کانسی کی چھنیاں رکھ دی گئیں۔ کسی میں اچار، کسی میں دال، کسی میں سبزی...... موتی لال نہرو نے یہ چھنیاں دسترخوان سے اٹھوا دیں۔ کہا بڑے برتن لاؤ۔ پھر اپنی جیب سے پیسے دیے اور زردہ پلاؤ وغیرہ لانے کا آرڈر دیا اور کہا...... کھانا مسلمان کا، باورچی خانہ ہندو کا اور طریقہ انگریز کا!

وفات سے چند سال پہلے جب مولانا کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا، بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ اس سے قبل بڑے تیز رفتار تھے، عام لوگ ان کے ساتھ نہیں چل سکتے تھے، وہ پیچھے رہ جاتے تھے اور مولانا آگے نکل جاتے تھے، لیکن اس تیزی میں بڑا وقار تھا، بڑی تمکنت تھی۔ اس طرح نہیں چلتے تھے جیسے مسافت پر حملہ آور ہو رہے ہوں اور اسے نگلنے کے لیے کوشاں ہوں۔ تیزی میں بھی کامل سکون کارفرما تھا۔

Marfat.com

اپنے عم محترم حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء میں وہ مستقل طور پر لاہور آئے اور چینیاں والی مسجد کے منصب خطابت پر متمکن ہوئے۔ قیام کا انتظام بھی وہیں مسجد کے مکان میں ہوا۔ یہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا۔

چینیاں والی مسجد رنگ محل کے قریب ہے اور پرانے اور اصلی شہر کے وسط میں ہے۔ وہاں سے دریائے راوی کا پرانا پل کم وبیش تین میل ہوگا۔ مولانا سیر کے لیے روزانہ مسجد سے راوی کے پل پر جاتے اور وہاں جا کر ورزش کرتے۔ آمد ورفت کا یہ چھ میل کا سفر تھا جو وہ روزانہ کرتے تھے۔

لاہور کے پرانے رہنے والے لوگ بتاتے ہیں کہ آزادی سے پہلے باشندگان لاہور کی بہت بڑی اور مشہور سیرگاہ دریائے راوی تھا۔ کثیر تعداد میں مسلمان، ہندو اور سکھ وہاں جاتے اور دریا کی سیر سے لطف اندوز ہوتے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو قائم ہوئی تھی، اس کے قیام سے تقریباً ساڑھے پندرہ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ اس اثنا میں انھوں نے مرکزی جمعیت کے صدر اور امیر کی حیثیت سے کئی دفعہ مجلس عاملہ بنائی۔ ان کی نوازش اور مجھ پر اعتماد تھا کہ ہر دفعہ مجھ سے مشورہ فرمایا اور میرے کہنے سے بعض حضرات کو رکن مجلس عاملہ نامزد فرمایا۔ ایک مرتبہ میرے کہنے سے ایک صاحب کو رکن بنایا، لیکن چند معاملات میں ان سے رائے لی گئی تو ان کی باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ ان کی رکنیت کے بارے میں مجھے مولانا کو مشورہ نہیں دینا چاہیے تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے کہہ ہی دیا کہ یہ صاحب آپ کی سفارش پر رکن بنائے گئے ہیں۔

حدیث رسول ﷺ کے بارے میں ان کے احساسات نہایت نازک تھے۔ اگر وہ درس حدیث میں کسی طالب علم کو ننگے سر بیٹھا دیکھ لیتے یا محسوس کرتے کہ اس کی توجہ پوری طرح حدیث کو سمجھنے کی طرف نہیں ہے تو انھیں نہایت تکلیف ہوتی اور اسے ڈانٹتے۔ موطا امام مالک سے انھیں انتہائی لگاؤ تھا۔ کچھ عرصہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں طلبا کو اس کا درس بھی دیتے رہے۔ بڑی محنت اور لگن سے موطا کا درس دیتے تھے اور اس کے اہم مسائل طلبا کو قلم بند کراتے تھے۔

مولانا سے متعلق چھوٹے بڑے کتنے ہی واقعات قطار باندھ کر سامنے آکھڑے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں قارئین کے ان کے بارے میں کیا تاثرات ہوں۔ وہ انھیں کوئی اہمیت دیتے ہیں یا نہیں دیتے۔ لیکن میں چوں کہ طویل عرصے تک ان کی خدمت میں رہا ہوں، انھیں دیکھا ہے، ان کی باتیں سنی ہیں، ان کی نماز کی، دعا کی، وظائف کی، تقریر کی، لوگوں سے میل جول کی اور ان سے گفتگو کرتے وقت کی کیفیات نظروں کے سامنے ہیں، اس لیے میں ان واقعات کو نہایت اہمیت دیتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا یا میری موجودگی میں بیتا اور رونما ہوا، وہ سب درج کردوں تاکہ ان کی ذات گرامی اپنے تمام معمولات اور افکار

Marfat.com

وخیالات کے سب گوشوں کے ساتھ قارئین کے سامنے آجائے۔

اسی قسم کے واقعات کا نام تاریخ یا سوانح یا تذکرہ ہے۔ ان واقعات میں جو گزشتہ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں اور آئندہ بیان ہوں گے، مندرجہ ذیل واقعات کو بھی شامل کر لیجیے۔

۱۔ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی دنیائے اسلام کے بہت بڑے عالم تھے۔ تقسیم ملک سے قبل کئی سال وہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے تھے، برصغیر پاک وہند میں ان کے شاگردوں اور ملنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا۔

۱۹۵۰ء میں وہ لاہور تشریف لائے اور اپنے بھائی پروفیسر محمد مراکشی کے مکان میں قیام فرما ہوئے جو تھانہ پرانی انارکلی کے قریب تھا۔ میں نے اسی مکان میں مولانا محمد حنیف ندوی کی موجودگی میں اسلامی ممالک کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ان سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو ہفت روزہ الاعتصام کی دو اشاعتوں میں چھپا تھا۔

ایک دن مولانا محمد داؤد غزنوی نے ہلالی صاحب کے اعزاز میں عصرانے کا اہتمام کیا۔ عصر کی نماز ہلالی صاحب نے مولانا کی قیام گاہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں پڑھی۔ نماز میں مولانا غزنوی اور ہلالی صاحب ساتھ ساتھ تھے۔ امام صاحب دو رکعتیں پڑھ کر تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہوئے تو ہلالی صاحب نہیں اٹھے، سلام پھیر کر بیٹھ گئے۔ نماز ختم ہوئی تو مولانا نے حسب معمول وظیفہ پڑھا اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ پھر ہلالی صاحب سے سوال کیا:

''آپ نے دو رکعتوں کے بعد سلام کیوں پھیر دیا؟''

جواب دیا: ''میں مسافر ہوں۔''

فرمایا: ''آپ کو امام کی اقتدا کرنی چاہیے تھی۔''

بولے: ''میں آپ کے امام کی اقتدا کروں یا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد پر عمل کروں، جن کا فرمان ہے کہ مسافر نماز قصر کرے۔''

یہ ایک دلچسپ علمی لطیفہ اور واقعہ ہے۔ مولانا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ ہلالی صاحب کو ان کے فرمان کا کوئی جواب نہیں دیا۔

۲۔ مولانا کے والد گرامی حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارادت مندوں میں ایک بزرگ میاں نورالدین بھوجیانی تھے جو حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے سسر تھے اور آزادی وطن کے بعد گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں آبسے تھے۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو نماز دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں پڑھتے...... مولانا نماز میں شرکت فرماتے اور میاں صاحب مرحوم بھی موجود

Marfat.com

ہوتے تو مولانا امامت کے لیے انہی سے کہتے۔ میاں صاحب زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے، لیکن متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بڑے سوز اور درد سے قرآن مجید پڑھتے تھے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھنے سے سرور حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ ایک دن عجیب لطیفہ ہوا۔ اذان ہوگئی تھی، لیکن ابھی جماعت کا وقت نہیں ہوا تھا۔ نمازیوں میں ایک صاحب محمد حسین تھے، جو حجام تھے، اور ان کی دکان دارالعلوم کے صدر دروازے کے سامنے تھی۔ وہ باجماعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے لیے آئے تو کہا، جماعت کراؤ۔ ابھی دو تین نمازی آئے تھے کہ جماعت کھڑی ہوگئی۔ تیسری یا چوتھی رکعت میں مولانا بھی آگئے۔ مولانا بالکل وقت پر آئے تھے۔ مولانا نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

''وقت سے پہلے جماعت کیوں کرائی؟''

محمد یحییٰ نے (جواب انجینئرنگ یونیورسٹی میں پروفیسر محمد یحییٰ ہیں) کہا کہ چار پانچ آدمی آگئے تھے، اس لیے جماعت کرالی گئی۔ (دارالعلوم کے طالب علم ان دنوں چھٹی پر تھے)

مولانا نے فرمایا: ''کون آدمی تھے؟''

جواب دیا: ''ایک محمد حسین تھے۔''

فرمایا: ''یہ تو نائی ہے، تم آدمی بتاؤ کون تھے۔'' (مولانا کا اشارہ اس کہاوت کی طرف تھا کہ تم آدمی ہو یا نائی)

یحییٰ صاحب نے کہا: ''ایک میں تھا۔'' (وہ اس وقت کالج میں پڑھتے تھے)

بولے: ''تم طالب علم ہو۔''

اس طرح مولانا نے مسکراتے ہوئے سب کا تیاپانچا کر دیا۔

۴۔ ایک دن مجھے فرمایا ہم جماعت اہل حدیث کو منظم کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن یہ منظم نہیں ہوگی۔ ہمیشہ دو حصوں میں بٹی رہے گی۔ فرمایا: یہ ڈڈوؤں کی پنسیری ہے۔ دو ڈڈو (مینڈک) ترازو کے پلڑے میں ڈالو، چار نکل جائیں گے۔ چار ڈالو، چھ اچھل کر باہر آجائیں گے۔ کبھی سب کے سب ڈڈو پلڑے میں نہیں آئیں گے۔

مولانا کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ ان کی زندگی میں یہ جماعت صرف دو یا تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اب ماشاء اللہ اس میں بہت برکت پیدا ہوگئی ہے اور سات آٹھ حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ابھی تقسیم کی مزید امید بھی ہے اور گنجائش بھی۔ جیسے جیسے اس کے افراد بڑھتے جائیں گے، تقسیم کے عمل میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اللھم زدفزد...... پرانے لوگ کہا کرتے ہیں کہ جتنی زیادہ اولاد ہوگی، اتنے ہی زیادہ گھر ہوں گے اور لوگوں

Marfat.com

پر ان کی کثرت تعداد اور کثرت بیوت کا رعب پڑے گا۔ اسی طرح جماعت اہل حدیث کے جتنے دھڑے ہوں گے، اتنے ہی لوگ اس سے مرعوب ہوں گے۔ اس لیے دعا کرنی چاہیے کہ اللہ اس میں مزید دھڑے بازی کے اسباب پیدا فرمائے۔

انسان اپنا دور ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے، لیکن اس کی بعض باتیں ایسا اثر چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ باتیں اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سطح ذہن پر ابھرتی ہیں، جب اس کی مثالیں معدوم ہوتی جا رہی ہوں اور پرانے نقش مٹ رہے ہوں۔

۵۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) سے بذریعہ ٹیلی فون مولانا کے گھر میری ایک عزیزہ کی وفات کی اطلاع پہنچی۔...... ٹیلی فون مولانا نے سنا۔ ٹیلی فون کرنے والے سے میرے ساتھ رشتے کی نوعیت پوچھی۔ اس کا نام دریافت کیا، متوفیہ کا نام پوچھا۔ جنازے کا وقت معلوم کیا اور پھر اس سے اظہار افسوس کیا۔ اسی وقت نیچے اترے۔ دفتر کے قاصد محمد یوسف کے مکان پر گئے۔ اسے جگایا اور میرے گھر بھیجا۔ پیر کا دن تھا، جو اخبار (الاعتصام) کی ترتیب کے سلسلے میں شدید مصروفیات کا دن تھا۔ محمد یوسف کو مولانا نے میرے بارے میں تاکید کی کہ صبح دفتر آنے کی ضرورت نہیں، جلد سے جلد جڑاں والے پہنچیں۔ اخبار کا فکر نہ کریں، سب کام ہو جائے گا...... نیز کہا کہ وہاں سے آج ہی واپس نہ آ جائیں۔ موت کا معاملہ ہے، دو چار دن ٹھہر کر آئیں۔

اس قسم کا جذبہ انسانیت رکھنے والے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

۶۔ اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنانے کو جی چاہتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے، میں اپنے گاؤں گیا۔ وہاں سے چلنے لگا تو ہمارے ایک بزرگ وفات پا گئے۔ مجھے رکنا پڑا۔ لاہور ٹیلی فون کیا۔ مولانا سے بات ہوئی تو حزن وملال کا اظہار کیا اور اسی وقت آدمی بھیج کر میرے گھر اطلاع کرائی تاکہ گھر میں میرا انتظار نہ کیا جائے اور اہل خانہ پریشان نہ ہوں...... مجھے فرمایا کہ آپ یہاں رہیں اور دو تین روز کے بعد واپس آئیں۔

۷۔ مولانا کو اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد سلیمان غزنوی سے بہت پیار تھا۔ وہ بھی مولانا سے بڑی محبت کا برتاؤ کرتے اور انتہائی توقیر سے پیش آتے تھے۔ انارکلی میں بخشی مارکیٹ کے قریب ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ مولانا اکثر شام سے کچھ پہلے ان کی دکان پر چلے جاتے اور کافی دیر وہاں بیٹھتے۔ اس وقت انارکلی میں تانگے کی اجازت تھی۔ مولانا تانگے پر جاتے تھے۔ کبھی تانگہ انارکلی سے باہر چھوڑ دیتے اور پیدل ہو جاتے، وہاں مولانا سے ملنے والے بعض لوگ آ جاتے، جن سے دینی، مذہبی، سیاسی ہر قسم کی باتیں ہوتیں، کبھی کبھی ہلکے پھلکے لطیفے بھی ہو جاتے۔

Marfat.com

۸۔ بعض اوقات عصر کے بعد حضرت مفتی محمد حسن امرتسری کے پاس تشریف لے جاتے۔ ان دنوں جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد کی ایک بلڈنگ میں قائم تھا، مغرب کی نماز نیلا گنبد کی مسجد میں پڑھتے، وہاں بھی کتنے ہی لوگوں سے ملاقات ہو جاتی۔

۹۔ بعض حضرات جس انداز سے قرآن مجید پڑھتے اور مخارج حروف کی صحت سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، مولانا کو اس سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ انھوں نے لاہور کی چینیاں والی مسجد میں قرآن کی قرات وتجوید کا مدرسہ قائم کیا جو اس شہر میں اس سلسلے کا پہلا مدرسہ تھا۔ ابتدا میں قاری فضل کریم (مرحوم ومغفور) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو اس فن کے تمام گوشوں سے آگاہ تھے۔ اس مدرسے میں بہت سے طلبا نے داخلہ لیا۔ مسجد چینیاں والی کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے تجوید کے ہر طالب علم کو بیس روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا تھا۔ تدریس کے لیے متعدد ماہر فن اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں، جن میں قاری فضل کریم صاحب کے علاوہ قاری اظہار احمد تھانوی اور قاری محمد صدیق کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قرات کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں مولانا خود تشریف لے جاتے اور اس پاکیزہ محفل میں شرکت فرماتے۔ قاری صاحب قرآن کی تلاوت کرتے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی اور بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ مجھے بھی مولانا کے ساتھ کئی دفعہ ان مجالس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوتی۔ انتہائی روح پرور اور دل نواز مجلس ہوتی تھی، اس لیے کہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا، ولذکر اللہ اکبر۔

مولانا پروقار اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ جدھر سے گزرتے، ان کو دیکھ کر واقف اور ناواقف کے قدم رک جاتے اور آنکھیں ان کے چہرے پر گڑ جاتیں۔ واقف جھک کر سلام کرتے اور ناواقف تعجب سے پوچھتے کہ یہ کون بزرگ ہیں؟

۱۰۔ جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے سلسلے میں ایک مرتبہ بذریعہ ٹرین لاہور سے ملتان کے لیے روانہ ہوئے۔ ساہیوال کے ارکان جماعت کو ٹیلی فون کر کے پروگرام کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے، جن میں جماعت کے ایک بزرگ رکن چوہدری عبدالقادر بھی تھے۔ مولانا اپنے ڈبے سے اتر کر پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ ملتان ڈویژن کے کمشنر بھی پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ وہ سرکاری دورے پر ساہیوال آئے تھے اور اسی گاڑی سے انھیں ملتان جانا تھا۔ مولانا پلیٹ فارم پر آئے تو کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور ان کے ساتھیوں نے ان کو دیکھ کر آپس میں کوئی بات کی۔ پھر ڈپٹی کمشنر نے چوہدری عبدالقادر (مرحوم) سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ مولانا محمد داؤد

Marfat.com

غزنوی ہیں...... مولانا کا نام سن کر وہ دونوں مولانا کے پاس آئے اور انھیں سلام کیا اور دعا کی درخواست کی۔ پھر دونوں ادب سے سر جھکائے پیچھے ہٹ گئے۔

۱۱۔ کبھی کبھی مولانا اپنی زندگی کے گزشتہ دور کی باتیں سنایا کرتے تھے۔ ایک دن بتایا کہ تحریک عدم تعاون کے زمانے میں وہ اور مولانا ظفر علی خاں ضلع سیالکوٹ کے دورے پر گئے۔ اثنائے سفر میں علی پور سیداں پہنچے تو انھوں نے مولانا ظفر علی خاں سے کہا کہ یہاں آئے ہیں تو پیر سید جماعت علی شاہ صاحب سے ملتے چلیں، لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ان کے پاس جانے اور ملاقات کرنے سے انکار کر دیا، اس لیے کہ سیاسی معاملات میں وہ پیر صاحب کے سخت مخالف تھے، انھیں خیال تھا کہ پیر صاحب کو انھیں دیکھ کر تکلیف ہوگی۔ مولانا غزنوی نے ان سے کہا کہ سیاسیات میں مخالف اور موافقت کا سلسلہ تو جاری رہتا ہی ہے، اس کی وجہ سے میل جول بند نہیں کر دینا چاہیے...... بہر حال یہ دونوں پیر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ ان کو پیغام بھجوایا تو انھوں نے فوراً اندر بلا لیا۔ نہایت تپاک سے ملے اور مولانا کے لیے مسند خالی کر دی اور اس پر بیٹھنے کے لیے اصرار کیا۔ فرمایا: آپ معزز مہمان ہیں، نیک کام کر رہے ہیں اور عالم دین ہیں۔ پیر صاحب کے اصرار پر مولانا ان کی مسند پر تشریف فرما ہوئے۔ پیر صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کو بھی مولانا کے برابر مسند پر بٹھایا۔ چند منٹ یہ حضرات مسند پر بیٹھے، پھر مسند خالی کر دی، لیکن ان کی موجودگی میں پیر صاحب مسند پر نہیں بیٹھے۔ ان کو پانی پلایا، کھانا کھلایا اور نہایت تکریم کا سلوک فرمایا۔

یہ ہے شدید مسلکی اور سیاسی اختلافات کے باوجود پرانے لوگوں کے باہمی مراسم کی ایک جھلک......!

اس کے برعکس موجودہ لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی سے ایک معاملے میں اختلاف ہے تو تمام معاملات میں اختلاف ہے۔ بول چال بند، لڑائی جھگڑا جاری، ایک دوسرے پر الزامات کا سلسلہ زوروں پر، نہ کسی کا لحاظ، نہ کسی سے کوئی رعایت، نہ بات چیت میں احتیاط، نہ گفتگو میں شرافت......! اسے سیاست نہیں کہا جا سکتا، یہ عورتوں کے الاہنے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع ہے۔

۱۲۔ ایک دن مولانا نے اپنی طالب علمی کا واقعہ بیان فرمایا کہ وہ تعلیم کے لیے گھر میں بتائے بغیر دہلی چلے گئے۔ کوئی پیسہ جیب میں نہ تھا۔ کئی دن کھانے پینے کی سخت تکلیف رہی۔ چنے کھا کر گزارہ کرتے رہے، پھر والد صاحب کو خط لکھا تو انھوں نے کچھ پیسے بھجوائے۔

مولانا نے بتایا کہ اس وقت بجلی کا زیادہ انتظام نہیں تھا۔ وہ رات کو گلی میں آجاتے اور کھمبے کے بلب کی روشنی میں مطالعہ کرتے۔

بلاشبہ پختہ علم انہی لوگوں کا ہے، جنھوں نے اس کے حصول میں تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اب آرام طلب علما

Marfat.com

وطلبا کا علم بھی آرام طلب اور نرم مزاج ہے۔ کسی موضوع میں جان اور پختگی نہیں، ڈھیلے عالم اور ڈھیلا علم......!

۱۳۔ ۱۹۵۶ء کی سردیوں کی بات ہے کہ بریلوی حضرات نے رات کی تاریکی میں جڑاں والا کی جامع مسجد اہل حدیث پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں کی انجمن کے ارکان نے مولانا کو اطلاع دی اور مجھے بھی پیغام پہنچایا کہ میں مولانا سے عرض کروں کہ پنجاب پولیس کے آئی جی سے کہا جائے کہ وہ لائل پور کے ایس پی سے کہیں کہ وہ مخالف فریق کو اس حرکت سے باز رہنے کا حکم دیں۔ مولانا نے آئی جی کو ٹیلی فون کر کے ملاقات کا وقت لیا۔ صبح آٹھ بجے ہم دونوں سیکرٹریٹ میں آئی جی سے ملے۔ آئی جی کا تعلق یوپی کے علاقے سے تھا۔ نہایت احترام سے پیش آئے اور انتہائی مہذبانہ طریقے سے بات کی۔ وہ مولانا کو پہلے سے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔ ملاقات کا موقع اب پہلی دفعہ ملا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ آزادی سے قبل ان کے بزرگ مولانا سے متعارف تھے اور ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے عورتوں کے پردے کے بارے میں چند مسائل مولانا سے پوچھے اور کہا کہ تقسیم ملک سے قبل ہماری مستورات ڈولیوں میں گھر سے باہر نکلتی تھیں۔ اب بے پردہ دندناتی پھرتی ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں سے پردے کی پابندی کا بدلا لے رہی ہیں۔

اس کے بعد مولانا جڑاں والا گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ بریلوی حضرات نے مولانا کو دیکھا تو ان میں سے بعض نے کہا کہ جن لوگوں کا رہنما یہ شخص ہے، ہم ان کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

مولانا نے ہنگامی طور سے ایجنڈا جاری کر کے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس فیصل آباد میں منعقد کیا اور پھر وہاں کے ڈی سی اور ایس پی سے ملے، اور بھی بعض سرکردہ لوگوں کو بلایا اور اس کے خاطر خواہ نتائج مرتب ہوئے۔

مسجد پر قبضے کے دن جڑاں والے کے جس ایس ایچ او نے پولیس کی معیت میں کچھ کارروائی کی تھی، اتفاقاً دوسرے دن اس کا تبادلہ اوکاڑے کر دیا گیا تھا۔ وہ بڑا مستعد اور تیز ایس ایچ او تھا۔ مولانا مسجد کے سلسلے میں اس سے ملنا اور معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مولانا کی موجودگی میں فوری طور پر اسے جڑاں والے بلایا گیا تو لطیفہ یہ ہوا کہ وہ کئی منٹ مولانا کے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ آخر مولانا نے اس سے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے چند باتیں کیں تو اس کی جھجک دور ہوئی اور اس نے مولانا کے سوالات کے جواب دینا شروع کیے۔

بالکل یہی کیفیت وہاں کے ڈی سی کی تھی۔ وہ کم عمر تھا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک وزیر سے مولانا نے کہا آپ نے لائل پور کے اہم اور بڑے ضلعے میں کیسا ڈی سی متعین رکھا ہے جو بات کرنا نہیں جانتا، اور یوں بھی بچہ سا ہے۔

Marfat.com

وزیر صاحب نے کہا: جناب وہ سی۔ ایس۔ پی ہے۔

فرمایا: کیا سی۔ ایس۔ پی ہے، میری کسی بات کا اطمینان بخش جواب نہیں دے سکا، اتنے بڑے ضلعے کے معاملات کو وہ کیوں کر سلجھاتا ہوگا۔

وزیر نے جواب دیا: آپ سے تو بعض اوقات بڑے بڑے لوگ ہم کلام نہیں ہو سکتے، وہ تو ایک ضلعے کا کم عمر ڈی سی ہے۔

۱۴۔ صحابہ کرام کے بارے میں ان کے احساسات بہت نازک تھے۔ ان کے مشاجرات کے متعلق نہ خود کوئی بات کرتے تھے اور نہ کسی کی بات برداشت کر سکتے تھے۔ وہ مسجد چینیاں والی کے خطیب تھے، لیکن ایک مرتبہ بیماری کی وجہ سے انھوں نے مولانا حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری کو عارضی طور پر خطیب مقرر کر دیا تھا۔ محرم کے مہینے میں حافظ صاحب نے ایک جمعے کے خطبے میں کچھ ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے زاویہ فکر سے ہم آہنگ نہ تھیں۔ وہ خطبے ہی میں بول پڑے......

حافظ صاحب بس کیجیے، آج اتنی باتیں کافی ہیں۔ پھر حاضرین سے مخاطب ہوئے۔ حضرات! آئندہ جمعہ میں پڑھاؤں گا۔ چناں چہ اگلے چار جمعے انھوں نے پڑھائے۔

۱۵۔ فقہی مسلک سے متعلق ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اپنی بات مثبت انداز میں کی جائے، کسی کی مخالفت نہ کی جائے۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف مواقع پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں تمام مسالک فقہ کے سرکردہ حضرات کے کئی اجلاس بلائے اور اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے مشترک مسائل میں متحد ہونے کی درخواست کی...... ربیع الاول کے دنوں میں سیرت کانفرنس کے انعقاد کی تجویز بھی پیش کی کہ تمام مسالک فقہ کے علمائے کرام متحدہ طور پر سیرت کے موضوع پر تقریریں کیا کریں۔ مقصد محض باہمی اختلافات کو ختم کرنا یا ان میں ممکن حد تک کمی کرنا تھا۔ چناں چہ لاہور میں سیرت کانفرنس کا انعقاد ہوا، جس میں شیعہ، دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مقررین نے اس اہم موضوع پر تقریریں کیں۔

۱۶۔ اس فقیر پر مولانا بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں ۱۹۴۹ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا۔ مئی کے آخری ہفتے میں اس کی پہلی کانفرنس لاہور میں ہوئی۔ کانفرنس کے چار پانچ روز بعد میں بیمار ہوگیا اور بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ دارالعلوم کے ہال میں میرے لیے چارپائی بچھا دی گئی تھی۔ مولانا دن میں کئی دفعہ تشریف لاتے اور میرا حال دریافت فرماتے۔ دو تین طالب علموں کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ وہ میرے پاس رہیں۔ روزانہ شام کو گلاب کے پھولوں کے دو یا تین ہار لاتے اور مجھے عنایت فرماتے۔ انتہائی میٹھے اور پرشفقت الفاظ میں مخاطب ہوتے اور مجھے تسلی دیتے۔ نماز کے بعد خود

Marfat.com

بھی دعا کرتے اور دوسروں سے بھی کراتے۔ جمعے کا خطبہ وہ چینیاں والی مسجد میں ارشاد فرماتے تھے، خطبے میں بھی دعائے صحت کا اعلان کرتے۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ میں بیمار رہا، اس اثنا میں ان کا یہی معمول رہا۔ کچھ صحت ہوئی تو میں گاؤں چلا گیا تھا، کم وبیش ایک مہینہ گاؤں رہا۔

۱۷۔ ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ میں اور مولانا جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں ملتان گئے۔ اپریل کا مہینہ تھا اور گرمی اپنا جلوہ دکھانے لگی تھی۔ تین چار دن ہمیں وہاں رہنا پڑا۔ واپسی پر مولانا نے مجھے فرمایا کہ آپ یا تو ایک ٹھنڈی شیروانی بنوالیں یا واسکٹ سلوالیں۔ چناں چہ واپس آ کر میں نے ٹھنڈی شیروانی سلوائی۔ مولانا نے دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ اس زمانے میں میرے اس پر چوبیس روپے خرچ ہوئے تھے۔ چودہ روپے کا کپڑا، اور دس روپے سلائی......!

اس وقت سردیوں اور گرمیوں میں شیروانی کا رواج بھی تھا، لیکن میں زیادہ دن رواج کے مطابق چل نہ سکا اور یہ ٹھنڈی شیروانی ایک دوست کو ''بخش دی'' البتہ گرم شیروانی بہت سال پہنتا رہا۔

۱۸۔ مولانا انتہائی صابر وضابط تھے۔ ایک مرتبہ عید سے ایک دن پہلے مجھے حکم ہوا کہ کل میں ان کے یہاں آؤں، اکٹھے عید کی نماز پڑھنے جائیں گے۔ مولانا منٹو پارک میں عیدین کی نماز پڑھاتے اور بادشاہی مسجد کے بعد سب سے زیادہ مجمع یہیں ہوتا تھا۔ میں حاضر ہوا تو ہم دونوں تانگے پر منٹو پارک گئے۔ بظاہر وہ نہایت ہشاش بشاش تھے۔ چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہ تھے۔ نماز پڑھائی اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ چار پانچ روز کے بعد کوئی بات ہوئی تو پتا چلا کہ اس دن صبح کسی گھریلو معاملے میں انھیں سخت اذیت پہنچی تھی، لیکن انھوں نے اسے دل میں چھپائے رکھا اور بے حد صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔

۱۹۔ بعض دفعہ بات کرتے ہوئے دلچسپ لطیفہ ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کی ٹانگ میں کچھ درد سا اٹھا، جو کئی دن جاری رہا۔ اتفاق سے اس اثنا میں حکیم عبدالمجید عتیقی مرحوم تشریف لے آئے جو بہت اچھے طبیب تھے اور نابینا تھے۔ مولانا نے ان سے بات کی اور درد کی کیفیت بتائی۔ انھوں نے علامات سنیں تو کہا یہ عرق النساء ہے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا مرض کا نام تو بہت اچھا ہے، لیکن اس سے تکلیف معلوم نہیں کیوں ہوتی ہے۔

عرق النساء ایک بیماری ہے جو وجع مفاصل کی ایک قسم ہے۔ ران سے شروع ہوتی ہے اور گھٹنے یا قدم تک پہنچتی ہے۔

۲۰۔ مولانا ۱۹۴۵ء میں پنجاب کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت آل انڈیا کانگرس کے صدر مولانا

Marfat.com

ابوالکلام آزاد تھے۔ اس پر سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ کانگرس دو مولاناؤں کے قبضے میں ہے۔ ملکی سطح پر مولانا ابوالکلام آزاد کے قبضے میں اور صوبائی سطح پر ملک کے ایک بڑے صوبے پنجاب میں مولانا داؤد غزنوی کے قبضے میں......!

اس کے ساتھ ہی انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان پر کسی زمانے میں محمود غزنوی نے یکے بعد دیگرے سترہ حملے کیے تھے اور اس ملک کے غیر مسلموں کو سخت اذیتوں میں مبتلا کیا تھا۔ اب پنجاب کے غیر مسلموں کو داؤد غزنوی پریشان کر رہے ہیں۔ محمود غزنوی کا تعلق بھی افغانستان سے تھا اور داؤد غزنوی کے آباواجداد بھی کچھ عرصہ پہلے اسی ملک سے پنجاب میں آکر آباد ہوئے تھے۔

۲۱۔ مولانا کی مجلس انتہائی پروقار ہوتی تھی۔ نہایت احتیاط سے بات کرتے اور انتہائی توجہ سے دوسرے کی سنتے تھے۔ گفتگو میں نہ کسی کو حد اعتدال سے باہر نکلنے دیتے اور نہ بات چیت میں بے تکلف ہونے کا موقع دیتے۔ فیصل آباد کی طرف سے جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے دو رکن (مولانا عبیداللہ احرار اور مولانا محمد اسحاق چیمہ) مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ لیکن میرے بے تکلف دوست تھے۔ ایک دن ہم تینوں مولانا کی خدمت میں حاضر تھے کہ مولانا عبیداللہ احرار مجھ سے اس انداز میں مخاطب ہوئے، جس میں بے تکلفی کی جھلک پائی جاتی تھی۔

مولانا نے فرمایا: اس مجلس میں آپ لوگ احتیاط برتیں اگر بے تکلفی کی کوئی بات ہے تو باہر جا کر کریں۔

اسی طرح مولانا محمد صدیق کے بھی مجھ سے اور ان دونوں حضرات سے بے تکلفانہ مراسم تھے اور عام بات چیت میں اس کا اظہار ہوتا رہتا تھا۔

مولانا نے ایک دن علیحدگی میں فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ حضرات بعض اوقات گفتگو میں زیادہ ہی بے تکلفی پر اتر آتے ہیں۔ یہ بات آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آپ کو وقار سے رہنا اور احتیاط سے بات کرنا چاہیے۔

یہ سب حضرات اپنی اپنی باری سے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

۲۲۔ ایک دن مولانا کے ساتھ میں تانگے پر بیٹھا تھا، کوچوان کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا۔ سفید لمبی داڑھی، سر پر پگڑی کی قسم کا سفید کپڑا، سانولا سا رنگ اور ماتھے پر محراب۔ وہ آہستہ آواز سے جو کسی وقت قدرے اونچی ہو جاتی تھی اور سنی جاتی تھی، مسلسل پڑھے جا رہا تھا۔ یا حی یا قیوم برحمتك استغیث یہ ایک دعا ہے، جس کا نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو پڑھنے کے لیے حکم دیا تھا۔ مقروض اور تنگ دست یہ دعا کثرت سے پڑھے تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ وہ قرض سے سبک دوش ہو جاتا ہے اور تنگ دستی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

Marfat.com

مولانا نے کوچوان سے کہا: آپ یہ دعا پڑھ رہے ہیں، اس کے الفاظ تو یہی ہیں، لیکن اگر اس میں لا الہ الا انت ملالیں اور یا حی یا قیوم لا الہ الا انت برحمتك استغیث پڑھیں تو اس میں اللہ کی توحید کا اقرار ہو جاتا ہے۔

(ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے: اے ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والے! تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تیری رحمت کے ساتھ تجھ سے فریاد کرتا ہوں)

پھر اس سے پوچھا: آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

اس نے جواب دیا: ضلع حصار کا رہنے والا ہوں اور مولوی نور محمد سوتری کے قریبی رشتے داروں میں سے ہوں۔

مولانا نور محمد سوتری ضلع حصار سے تعلق رکھتے تھے جو اس وقت صوبہ پنجاب کا ضلع تھا، اب صوبہ ہریانہ میں واقع ہے۔ مشہور عالم دین اور مبلغ تھے۔ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے اور نور تخلص کرتے تھے۔ شہباز شریعت، آب حیات، چراغ شریعت، خورشید شریعت، مفاد شریعت، خطبات عیدین ان کی تصنیفات ہیں۔ شہباز شریعت نے بہت شہرت پائی۔ یہ پنجابی نظم میں ہے۔ اس کے حواشی فارسی میں حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء) نے لکھے تھے۔ مولانا نور محمد سوتری ۱۱۹۶ھ (۱۷۸۲ء) کورانیاں ضلع حصار میں پیدا اور ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۲ء) کو فوت ہوئے۔ وہ طبیعت کے سخت تھے۔ اور بڑے بڑے لوگوں کی تکفیر کر جاتے تھے۔ ان کا اس قسم کا ایک شعر بھی ہے۔ ”رومی جامی کافر سارے..........“

مولانا نور محمد سوتری کے تعارف کی بات تو چلتے چلتے درمیان میں آگئی، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا غزنوی نے فرمایا کہ مولوی نور محمد سوتری بلاشبہ بہت بڑے مبلغ اور عالم تھے، لیکن بعض اکابر کو کافر و زندیق قرار دیتے تھے۔ اکابر علما کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے سے علم کا وقار مجروح ہوتا اور برکت ختم ہو جاتی ہے۔

۲۳۔ بعض علمی معاملات میں مولانا اپنے قریب کے جن علما سے متاثر تھے یا جن کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، ان میں مولانا عطاء اللہ حنیف کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔ اسناد حدیث اور رجال حدیث کے موضوع پر مولانا بالعموم انہی سے رجوع کرتے اور ان کی رائے کو لائق اعتنا گردانتے تھے۔

قدیم بزرگان دین میں سے امام غزالی کے بارے میں ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا بھی یہ خاص موضوع تھا، چناں چہ اس موضوع پر مولانا ندوی کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، وہ ہیں تعلیمات غزالی، افکار غزالی، سرگزشت غزالی، تہافۃ الفلاسفہ کا اردو ترجمہ اور قدیم یونانی فلسفہ جو غزالی کی مقاصد الفلاسفہ کا ترجمہ ہے۔

مولانا داؤد غزنوی اور مولانا حنیف ندوی کی غزالی کے متعلق گفتگو شروع ہو جاتی تو وقت کی رفتار کا کوئی

Marfat.com

پتا نہ چلتا، دیر تک گفتگو جاری رہتی۔

۲۴۔ مولانا حافظ محمد حسین روپڑی کی وسعت مطالعہ اور درسیات سے متعلق ان کے عبور کا انھوں نے کئی دفعہ تذکرہ فرمایا۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم ایک سال دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں خدمت تدریس پر مامور رہے تھے اور مولانا ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

۲۵۔ مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی پر مولانا بڑی شفقت فرماتے تھے۔ وہ کم و بیش چالیس سال سے مولانا کے دارالعلوم میں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں اور اب شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا نے ان سے دور گزشتہ کی بعض باتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا عبدالقادر قصوری نے اپنی ایک پوتی کی شادی کے موقعے پر متعدد علمائے کرام کو دعوت شرکت دی تھی، جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے۔ نکاح کا وقت ہوا تو سب نے ان سے (یعنی مولانا غزنوی سے) کہا کہ نکاح خوانی کا فریضہ وہ انجام دیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ نکاح پڑھنے سے پہلے انھوں نے دولہا سے کلمہ پڑھایا...... نکاح ہو چکا تو بعض علما نے ان سے کہا کہ آپ نے دولہا سے کلمہ پڑھایا ہے، کیا آپ کو اس کے اسلام میں شک تھا؟

مولانا نے جواب دیا: یہ الحاد اور بے دینی کا دور ہے، میں ان سے کلمہ شریف پڑھوا کر ایک مجلس کے روبرو اور اللہ کے حضور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ یہ مسلمان ہے اور میں نے ایک مسلمان لڑکے کا نکاح مسلمان لڑکی سے پڑھایا ہے۔

حافظ عبدالرشید نے بتایا کہ مولانا نے ان کی موجودگی میں چار یا پانچ نکاح پڑھائے۔ نکاح سے قبل وہ دولہا کو کلمہ اول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دو مرتبہ کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ سب کلمے پڑھانے چاہئیں، مولانا نے فرمایا ثبوت اسلام کے لیے ایک ہی کلمہ کافی ہے۔

۲۶۔ حافظ محمد ایوب (پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور) نے ایک مرتبہ بتایا کہ جس زمانے میں وہ مسجد چینیاں والی میں قرآن مجید حفظ کرتے تھے، ایک دن مولانا وہاں تشریف لائے اور عصر کی نماز پڑھی۔ ان کے چچازاد بھائی مولانا اسماعیل غزنوی کی وفات اس سے چند روز پیشتر ہوئی تھی۔ کچھ لوگ مولانا کے پاس تعزیت کے لیے آئے تو مولانا نے مولانا اسماعیل غزنوی مرحوم کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کی۔ تمام حاضرین مجلس نے ان کے ساتھ ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔

۲۷۔ گرمیوں میں دوپہر کے کھانے کے بعد مولانا عام طور پر خربوزہ کھایا کرتے تھے۔ خربوزے کی پہچان بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے ڈھیر میں سے کم ہی لوگوں کو پتا چل سکتا ہے کہ کون سا خربوزہ میٹھا ہے۔

Marfat.com

مولانا کو اس کی بڑی پہچان تھی اور ان کا خریدا ہوا خربوزہ اکثر میٹھا ہوتا تھا۔ مجھے اس کی پہچان نہیں ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت مولانا نے مجھے فرمایا: ''مولوی اسحاق! میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح دیکھ کر تین چار خربوزے لایئے۔'' مولانا کی نزاکت احساس کا مجھے علم تھا اور پھر کسی چیز کی خرید میں مجھے جو ''مہارت'' حاصل ہے، اس سے بھی خوب آگاہ تھا اور آگاہ ہوں، اس لیے پریشان سا ہوا۔ بہرحال دکان پر گیا اور ان کے فرمان کے مطابق خربوزے لایا۔ شام کو ان سے ملاقات ہوئی تو بڑے خوش تھے۔ فرمایا: ''مولوی اسحاق! آج آپ کے خریدے ہوئے خربوزے کھا کر لطف آ گیا، نہایت میٹھے اور لذیذ تھے۔ میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں'' ...... جی چاہا کہ عرض کروں، حضور اللہ نے میری عزت رکھنا تھی کہ اچھے خربوزے آ گئے، ورنہ میں تو خرید وفروخت کے سلسلے میں بالکل نااہل ہوں۔ بس یہ آپ کی دعا کا نتیجہ تھا۔

اس کے بعد دوپہر کے وقت میں نے مولانا کو ملنے کا موقع نہیں دیا کہ کہیں پھر خربوزے لینے کے لیے نہ بھیج دیں۔ اس دن تو حسن اتفاق سے اچھے خربوزے آ گئے، آئندہ یہ نہیں ہوگا اور سارا کیا دھرا ختم ہو جائے گا۔

۲۸۔ مسائل فقہ میں وہ عدل وقسط کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ایک دن فرمایا: ''مولوی اسحاق! ایک مسئلہ بتایئے۔''

عرض کیا: ''جناب! میں مسئلہ بتاؤں؟''

فرمایا: ''آپ کے لیے مسئلہ بتانا گناہ کی بات ہے؟''

ساتھ ہی ارشاد فرمایا: ''مسئلہ یہ ہے کہ عورت سجدہ کس طرح کرے؟ پچھلا حصہ سجدہ میں مردوں کی طرح اونچا کرے یا نیچے رکھے؟''

نیازمندانہ انداز سے عرض کیا: ''عورت کو پردے میں نماز پڑھنی چاہیے۔ گھر کے صحن کے بجائے اندر کمرے میں جا کر فریضہ نماز ادا کرے۔ یعنی اسے مکمل پردے میں رہنا چاہیے۔ حالت سجدہ میں پچھلا حصہ اونچا کرنا پردے کے منافی معلوم ہوتا ہے، اس لیے جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے، عورت اپنا پیٹ رانوں کے ساتھ ملائے، اگر ایسا کیا جائے گا تو پچھلا حصہ نیچے رہے گا اور یہی اس فقیر کے خیال میں اصل مسئلہ ہے۔''

فرمایا: ''بالکل صحیح ہے۔ پچھلا حصہ اوپر نہیں اٹھانا چاہیے۔ مردوں کی طرح ایسا کرتے ہوئے عورت اچھی نہیں لگتی۔''

۲۹۔ ہمارے حلقہ احباب میں ایک صاحب بڑے نیک لیکن بہت سست ہیں۔ جہاں گئے جا کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کو مسئلے مسائل سنانے لگے اور بات ذہن سے نکال دی کہ اور بھی کوئی کام کرنے کا ہے۔ مولانا سے بھی کچھ عرصہ ان کا واسطہ رہا، لیکن ان کے طرز عمل سے سخت پریشان ہوئے۔ ایک دن فرمایا: مولوی اسحاق! آپ نے دَلِدَّر کا لفظ سنا ہے اور اس کے مفہوم اور محل استعمال کا پتا ہے؟

Marfat.com

میں مسکرایا تو فرمایا: یہ صاحب وہی ہیں۔ ہر اعتبار سے دلدر......!

۳۰۔ پنجابی کہاوتیں مولانا کو بہت یاد تھیں۔ ایک صاحب دبلے پتلے اور لاغر اندام تھے۔ منہ بھی چھوٹا سا تھا، لیکن کھانے پینے میں بہت مشہور تھے۔ ایک دن ان کے اس وصف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: منہ چوہی، ڈھڈ کھوہی۔ (یعنی منہ چوہی کے منہ جیسا اور پیٹ کنوئیں جیسا)

۳۱۔ مولانا شاعر نہیں تھے، لیکن ادب و شعر کا پختہ اور صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے اور گفتگو میں برمحل پڑھتے تھے۔ اردو شعرا میں سے غالب، ذوق، میر، سودا، درد، انشا، شیفتہ، ظفر اور مومن وغیرہ کے علاوہ اقبال، ظفر علی خاں، محمد علی جوہر، جوش، جگر اور حفیظ کے اشعار ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ فارسی شعرا میں سے حافظ، سعدی، عرفی، فیضی، رومی، غنی کاشمیری، گرامی کا کلام انھیں یاد تھا۔ نعتیہ کلام سے بھی انھیں بہت دلچسپی تھی۔ ان کی ایک بیاض میں ان کے منتخب اشعار درج ہیں۔ یہ بیاض قید کے زمانے کی ہے، جس پر ”۱۸۔ مئی ۱۹۳۲ء نیوسنٹرل جیل ملتان“ لکھا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۳۷ برس تھی۔

بعض اشعار انقلابی نوعیت کے ہیں جن میں بیڑیوں اور زنجیروں کا تذکرہ، قید خانوں کی تنہائی اور پھانسیوں کا ذکر ہے۔ کچھ عارفانہ کلام ہے۔ بعض بڑے شوخ اور تیکھے شعر ہیں۔

میر تقی میر کے بہت سے شعر بیاض میں درج ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

....

تلوار کے تلے ہی کیا عہد انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

....

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

....

مجھ دوانے کی مت بلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

....

Marfat.com

اس کے ایفائے عہد تک نہ جئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

ناصر حسن پوری کا ایک شعر پڑھیے:

مظلوم کی فریاد پہ طیش آتا ہے ان کو
کہتے ہیں زباں کاٹ کے حال اپنا سنا اور

ظفر علی خاں کے شعر ملاحظہ ہوں

ہے جن کے دل میں آزادی کی دھن ان نوجوانوں کو
وطن کے عشق کی پاداش میں سولی پر لٹکانا

....

بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی لاش اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا

اس قسم کے شعر بھی بیاض سے ملتے ہیں۔

خال مشکیں بھی ہے اور زلف سیہ فام بھی ہے
مرغ دل کیوں نہ پھنسے دانہ بھی ہے دام بھی ہے

نظام رام پوری کے چند شعر پڑھیے جو مولانا کی بیاض میں مندرج ہیں۔

دینا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام
منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

....

مری ٹوٹی ہوئی توبہ کے ٹکڑے
کوئی لا دے در پیر مغاں سے
کہ ان کو جوڑ کر پھر توڑ ڈالوں
میں اک جام شراب ارغواں سے

اصغر گونڈی کے تین شعر

یا تو خرد کو، ہوش کو، مستی و بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اس کے حریم ناز میں

Marfat.com

موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں
شورش عندلیب نے روح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خواب ناز میں

بہادر شاہ ظفر کا ایک شعر جس میں واقعہ کی صحیح عکاسی ہوئی ہے۔ اسے الہامی شعر کہنا چاہیے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اب فارسی کے چند منتخب اشعار پڑھیے۔ حافظ کا شعر ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار باربیا

فیضی کا شعر ملاحظہ ہو۔

فیضی گماں مبرکہ غم دل نگفتہ ماند
اسرار عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ایم

سرمد کے دو شعر۔

سرمد غم عشق بوالہوس را نہ دہند
سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار
ایں دولت سرمد ہم کس را نہ دہند

گرامی کا ایک شعر۔

عصیاں ما و رحمت پروردگار ما
ایں رانہایتے است، نہ آں را نہایتے

فیضی کے دو شعر۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ
در دیدہ ام خلیدہ و دردل نشستہ
آرام کردۂ بنہاں خانہ دلم
خلقے دریں گماں کہ بہ محفل نشستہ

Marfat.com

آخر میں نظیری کا ایک شعر پڑھیے۔

عبادت سحری را مکن نظیری کم
کہ ہرچہ کرد دعا ہائے صبحگاہی کرد

غرض اردو اور فارسی کے بہت سے اشعار ان کی مختلف ڈائریوں اور بیاضوں میں درج ہیں، جن سے ان کے ذوق ادب وشعر کا پتا چلتا ہے۔

۳۲۔ مولانا کو وظائف سے خاص لگاؤ تھا اور وہ مختلف اوقات میں وظائف پڑھتے تھے۔ ان کی ایک ڈائری میں بہت سے وظائف مرقوم ہیں۔ اکثر بزرگوں سے اس موضوع پر ان کی گفتگو رہتی تھی، جس بزرگ نے جو وظیفہ بتایا، ان کے حوالے سے ڈائری میں تحریر فرما لیا۔

۳۳۔ علم طب سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور ملک کے مشہور اطبا سے ان کے مراسم تھے۔ متعدد اطبا کے مجرب اور بیان کردہ طبی نسخے ان کی ایک ڈائری میں لکھے ہوئے تھے۔

۳۴۔ ایک مرتبہ مولانا نے اپنے عم محترم حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی کے بارے میں بتایا کہ وہ لفظ ''اللہ'' بولتے تو سننے والے شدت تاثر سے کانپ اٹھتے۔ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ کسی نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے شکایت کر دی کہ مولانا عبدالواحد صاحب سرحد پار کے مجاہدین کی مالی امداد کرتے ہیں۔ اس افسر نے سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک انسپکٹر کو جن کا نام شیخ عبدالعزیز تھا، ہدایت کی کہ وہ اس کی تحقیق کریں کہ مولانا ممدوح واقعی مجاہدین کی امداد کرتے ہیں۔

شیخ عبدالعزیز معاملے کی تحقیق کے لیے چینیاں والی مسجد میں مولانا عبدالواحد صاحب کی خدمت میں گئے (اس وقت وہ اس مسجد کے خطیب تھے) لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ کہیں گئے تھے۔ دوسرے یا تیسرے دن وہ پھر گئے۔ اس دن بھی مولانا گھر میں موجود نہ تھے۔ اب انھوں نے ان کے گھر اپنا پتا دیا اور کہا کہ جب وہ آئیں، مجھے ضرور ملیں۔ مولانا ان کے گھر گئے تو شیخ صاحب موجود تھے۔ وہ نہایت احترام سے پیش آئے اور مجاہدین کی امداد کے متعلق سوال کیا۔ مولانا نے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

شیخ صاحب! اللہ سے ڈر جاؤ۔

یہ لفظ شیخ صاحب کی بیوی کے کان میں پڑے تو فوراً دروازہ کھٹکھٹا کر ان کو اندر بلایا اور کہا خدا کے لیے اس شخص سے کوئی بات نہ پوچھو۔ یہ فرشتہ ہے جسے انسانی شکل میں اللہ نے دنیا میں بھیجا ہے۔ اس سے اپنے لیے بہتری کی دعا کراؤ۔ تحقیق کا سلسلہ بند کر دو، ایسا نہ ہو کہ یہ پریشان ہو جائے اور ہم پر کوئی آفت آ پڑے۔

۳۵۔ مشہور صحافی مرحوم میاں محمد شفیع (م ش) مولانا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''حضرت مولانا سید

Marfat.com

محمد داؤد غزنوی انتہائی خوب صورت، رعنا اور متوازن انسان تھے۔ مجھے یاد رہے کہ جب وہ پنجاب کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تو ھندوستان ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ لاہور (مسٹر انند سروپ) نے مولانا کے حسن و جمال پر نصف کالم کے قریب ڈسپیچ لکھا تھا۔"

۳۶۔ یہاں ایک اور واقعہ سنتے جایے۔ جون ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ ۲۰ اور ۲۱۔ جولائی کو اس تحریک کے سلسلے میں انگریزی حکومت نے مسلمانوں پر گولی چلائی اور بے شمار مسلمان شہید کر دیے گئے۔ یہ تحریک جو مولانا ظفر علی خاں نے چلائی تھی اس وقت صحیح تھی یا غلط تھی یا کسی کے اشارے سے چلائی تھی اور کیوں چلائی گئی تھی؟ یہ ایک الگ بحث ہے، تاہم مسلمانوں کا ایک مضبوط اور موثر گروہ اس تحریک کا حامی نہ تھا۔ اس تحریک سے پہلے مختلف عدالتوں میں مسجد شہید گنج کا کیس گیا تھا اور ہر عدالت میں فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہوا تھا۔ یہ طویل قصہ ہے جس کے بیان کا یہ محل نہیں......

یہاں صرف ایک بات عرض کرنا مقصود ہے، جس کا تعلق مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی ذات گرامی سے ہے۔ مولانا اس وقت مجلس احرار سے منسلک تھے اور اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ انھوں نے بعض مسلمان رہنماؤں کی معیت میں ۴۔ جولائی ۱۹۳۵ء کو مسجد شہید گنج کے بارے میں سکھ رہنماؤں سے گفتگو کی تھی۔ اس کا ذکر انھوں نے اس زمانے کی مجلس احرار کے اخبار روزنامہ مجاھد (لاہور) کی یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں اپنی ڈائری کی صورت میں کیا ہے۔ یہ اس دور کی ایک تاریخی اور اہم دستاویز ہے جو ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔ اس میں کئی شخصیتوں کے نام آتے ہیں اور ان سے متعلق بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ یہ ایک طویل مگر دلچسپ تحریر ہے جو قارئین کرام کے لیے یہاں درج کی جا رہی ہے۔ ملاحظہ فرمایے۔

یکم جولائی ۱۹۳۵ء کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ چھوڑ کر سکھ صاحبان سے مسجد کے لیے باہم گفتگو کی جائے۔ اس غرض سے مولانا ظفر علی خاں نے مولانا داؤد غزنوی کو اپنے دفتر بلایا۔ یہاں دونوں رہنماؤں کے درمیان جو گفتگو ہوئی اور جس طرح معاملہ آگے چلا، مولانا داؤد غزنوی نے اسے اپنی ڈائری میں نقل کر لیا تھا۔ تحریر فرماتے ہیں:

"۴۔ جولائی کو صبح دس بجے میں حسب الحکم مولانا ظفر علی خاں دفتر زمیندار میں حاضر ہوا۔"

مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا: "میں حالات و قرائن سے یہی اندازہ لگاتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اس تحریک کو جاری رکھا تو مسجد مسلمانوں کو ضرور مل جائے گی۔"

میں نے عرض کیا کہ آپ آئینی طور پر مسجد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے یا ضرورت پڑی تو سول

Marfat.com

نافرمانی بھی کریں گے؟

مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ ہم آئینی طور پر مسجد حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ آپ نے اس مسجد کے تمام قانونی پہلوؤں پر غور کر لیا ہے؟ مسجد کے حصول کے لیے آج سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے جس قدر مقدمات دائر کیے گئے، ان کے فیصلوں کو دیکھ لیا ہے؟

مولانا ظفر علی خاں نے کہا کچھ تو مجھے معلوم ہیں، لیکن پورے طور پر صحیح حالات دریافت کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے جو مسجد کے متعلق دستاویزات اور تاریخی مواد اکٹھا کر کے پیش کرے گی۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ جس صورت میں کئی عدالتوں کے فیصلے اس مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف ہیں اور پونے دو سو سال سے سکھوں کا اس پر قبضہ ہے، آئینی ایجی ٹیشن سے آپ اسے کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟

اس کے جواب میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ ہم اسمبلی کے ذریعے، پنجاب کونسل کے ذریعے اور تمام ہندوستان میں جلسوں کے ذریعے گورنمنٹ کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اس مسجد کو سکھوں سے لے کر مسلمانوں کے سپرد کر دے یا کم از کم یہ کہ محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر دے۔

اس پر میں نے عرض کیا کہ انگریزی عدالتیں کسی فریق کے حق میں فیصلہ دے دیں تو ان عدالتوں کے فیصلے کا احترام قائم رکھنا گورنمنٹ کا فرض ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ گورنمنٹ آپ کے جلسوں سے متاثر ہو کر کئی عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کر کے بلکہ ان کے فیصلوں کے صریح خلاف سکھوں سے متنازعہ فیہ مسجد چھین کر مسلمانوں کے حوالے کر دے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ مجھے ایک بہت بڑے مسلمان افسر نے کہا ہے کہ آپ ایجی ٹیشن جاری رکھیں۔ حکومت یہ مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دے گی۔

اس پر پھر مجھے عرض کرنا پڑا کہ مولانا صاحب میں تو ایک منٹ کے لیے بھی اس افسر اعلیٰ کی بات پر یقین نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ عدالتوں کے فیصلوں کے برخلاف حکومت کوئی اقدام کر سکے، اور نہ حکومت یہ جرات کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے سکھوں سے جنگ خرید لے۔ مجھے تو اس افسر اعلیٰ کی گفتگو آپ سے سن کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں اور سکھوں کو لڑانا چاہتی ہے۔ آپ کو بہت ہی حزم احتیاط سے کام کرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ آپ نادانستہ طور پر حکومت کے اس مذموم ارادے کی تکمیل کے لیے آلہ کار بن جائیں۔

اس کے بعد میں نے اس پر مزید گفتگو لا حاصل سمجھتے ہوئے، مولانا موصوف کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ سکھوں سے مل کر کسی طرح معاملہ طے کر لیا جائے۔

Marfat.com

۴۔جولائی دو بجے کے قریب مولانا ظفر علی خاں صاحب اور سید حبیب صاحب مجھے میرے مکان سے اپنے ہمراہ لے کر گوردوارہ متصل سمادھ مہاراجا رنجیت سنگھ میں پہنچے۔گودوارے میں ماسٹر تارا سنگھ، سردار منگل سنگھ، گیانی گورمکھ سنگھ سیکرٹری گوردوارہ پربندھک کمیٹی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔مولانا ظفر علی خاں صاحب نے مسلم وفد کی قیادت کرتے ہوئے سکھ حضرات سے مسجد شہید گنج کی حوالگی کے مطالبے کو نہایت مناسب الفاظ میں پیش کیا اور مسجد کے متعلق مسلمانوں کے احساسات اور جذبات ان کے سامنے پیش کیے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ تو ہمیں معلوم نہیں ہے کہ یہ مسجد ہے یا کیا، لیکن اس حالت میں جب کہ مسلمانوں کے لٹھ بند جتھے بازاروں میں پھر رہے ہیں اور سکھ قوم کو دھمکی دے رہے ہیں، مسجد کی حوالگی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس حالت میں مسجد کی حوالگی کے متعلق گفتگو کرنا سکھ قوم اپنی توہین سمجھتی ہے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ آپ شاید ہندو اخبارات کے غلط بیانات سے متاثر ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے سکھ قوم کو کوئی دھمکی نہیں دی گئی بلکہ ہم تو برادرانہ طور سے آپ سے درخواست کرنے آئے ہیں۔

اس پر ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ نہیں، زمیندار، سیاست، انقلاب اخبارات بھی ہم دیکھ رہے ہیں......اور ان اخبارات کی طرف اشارہ کیا جو اس وقت ان کے سامنے موجود تھے۔

اس کے جواب میں مولانا ظفر علی خاں صاحب نے فرمایا کہ اگر مسلمان سکھ قوم سے اس کے لیے معافی مانگ لیں اور میں اپنی ٹوپی آپ کے قدموں میں رکھ دوں تو پھر کیا آپ ان اخبارات کی باتوں کو نظر انداز کر کے مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دیں گے؟

ماسٹر تارا سنگھ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایسے نامناسب لہجے میں جو گفتگوے مصالحت میں کہیں، کوئی معقول آدمی اختیار نہیں کرتا، کہا کہ مولانا صاحب! میں آپ کو اس گفتگو میں سنسیر نہیں سمجھتا، کیوں کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں جن مندروں پر قبضہ کر کے وہاں مسجدیں تعمیر کر لی ہیں اور مندروں کے نشانات بھی باقی رکھے ہیں، کیا آپ لوگ وہ مندر ہندوؤں کو واپس کر دینے کے لیے تیار ہیں؟

مولانا ظفر علی خاں صاحب نے، جو وفد کی طرف سے گفتگو کر رہے تھے، فرمایا کہ اس وقت ہم کسی ہندو مسلم تنازئے کے لیے نہیں آئے ہیں، ہم سکھ نمائندوں سے گفتگو کر رہے ہیں، کیا ہم نے سکھوں کے کسی گوردوارے پر قبضہ کیا ہے؟

اس کے جواب میں ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ ہندوؤں کے راج کے بعد پھر مسلم راج آجاتا تو دیکھتے کہ آپ سکھ گوردواروں پر قبضہ کرتے یا نہ کرتے۔ ماسٹر جی نے کہا کہ پرانی تاریخ کے ورق الٹانے سے کچھ

Marfat.com

حاصل نہیں ہوگا، ہر قوم نے اپنے عہد حکومت میں اس قسم کی حرکات کی ہیں۔

آخر میں ماسٹر تارا سنگھ نے مسجد شہید گنج کے متعلق یہ بیان کیا کہ ہماری تاریخی روایات ہمیں بتاتی ہیں، وہ صحیح ہوں یا غلط، کہ اس جگہ ہماری قوم کے بہت سے بہادر شہید کیے گئے ہیں۔ ہم روز جو ارداسہ کرتے ہیں، ان میں نصف شہدا کی تعداد وہ ہے، جن کا تعلق اس شہید گنج سے ہے۔ اس لیے سکھ قوم کا ایک فرد بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا، جو شہید گنج واپس کرنے کا خیال بھی دل میں لاتا ہو۔

ماسٹر تارا سنگھ کی یہ گفتگو سن کر ارکان وفد کو بہت افسوس ہوا اور انھوں نے محسوس کیا کہ اس جواب کے بعد مزید گفتگو لاحاصل ہے۔ اس وقت میں نے ماسٹر تارا سنگھ جی سے کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ لاہور کی موجودہ صورت حال کو آپ پسند نہ کرتے ہوں گے۔ یہ ایک طرف سکھ جتھے مضافات سے شہر آرہے ہیں اور سکھ قوم مسجد منہدم کرنے پر مصر ہے اور دوسری طرف مسلمان انہدام مسجد کے فیصلے سے بے حد متاثر ہیں اور وہ مذہبی جذبات کے ماتحت مضطربانہ کیفیت کے ساتھ پھر رہے ہیں، دونوں قوموں کے تعلقات کشیدہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے اس ملک میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنی ہے، کیا آپ غور نہیں کرتے کہ اگر اس اختلاف نے زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تو پنجاب کے دیہات میں جہاں سکھ اور مسلمان مشترکہ مفاد کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں، کیسی تکلیف دہ صورت حال پیدا ہو جائے گی اور اس کے نتائج کس قدر ہولناک ہوں گے؟ کیا ہم ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کے ساتھ کسی قسم کی رواداری برت کر معاملات سلجھانے سے بالکل قاصر ہوگئے ہیں؟ میں آپ سے ملک کے نام پر اپیل کرتا ہوں کہ اس معاملے کو رواداری کے جذبے کے تحت سلجھایے، بے شک کئی عدالتوں نے آپ کے حق میں فیصلہ دے رکھا ہے اور ڈیڑھ سو برس سے یہ مسجد آپ کے قبضے میں ہے، لیکن اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ یہ مسجد ہے اور مسجد کے متعلق مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور احساسات اب تو آپ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آپ اگر انہدام مسجد کے ارادے سے باز آجائیں اور منہدم شدہ حصے کی مرمت کر دیں اور آئندہ مسجد کی حرمت کے خلاف کوئی عمل نہ کریں اور مزار حضرت کا کو شاہ کے لیے پانچ فٹ کا راستہ دے دیں تو مسلمانوں کے زخمی دل مندمل ہو سکتے ہیں۔

میری یہ تجویز مصالحت سننے کے بعد ماسٹر تارا سنگھ جی نے اپنے سابقہ انداز گفتگو کے یکسر خلاف نہایت خندہ پیشانی سے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ ہاں اس تجویز پر ہم غور کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر اس شرط پر کہ اس فیصلے پر اس قصے کو ختم کر دیا جائے اور آئندہ کوئی سوال اس کے قبضے وغیرہ کا نہ اٹھایا جائے۔ یہ نہ ہو کل کوئی اور انجمن اٹھ کھڑی ہو اور از سر نو اس قضیے کو شروع کر دے۔

مولانا سید حبیب نے فرمایا کہ یہ انجمن نمائندہ انجمن ہے، اس فیصلے کے بعد اگر کسی نے مخالفت کی تو یہ

Marfat.com

ہماری مخالفت ہوگی، آپ کی مخالفت نہ ہوگی۔ اس کے بعد پھر ماسٹر تارا سنگھ جی نے میری تجویز کے متعلق اپنی جماعت کی طرف سے آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ حضرات کے نزدیک (متنازعہ فیہ مقام) مسجد ہونے کی حیثیت سے متبرک مقام ہے اور ہمارے نزدیک یہ شہید گنج ہونے کے لحاظ سے متبرک مقام ہے، اس لیے دونوں قوموں کے احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جگہ کے آداب اور احترام کے خلاف ہم کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ مہنتوں کے قبضے میں جب مسجد تھی تو اس کی چھت پر ٹٹی بنی ہوئی تھی، لیکن جب ہمارے قبضے میں آئی ہے، ہم نے ٹٹی اٹھوادی۔ صرف اس خیال سے کہ اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ مسجد کے گرانے کا سوال عرصے سے ہمارے پیش نظر تھا، لیکن اس تذبذب میں تھے کہ یہ کام مسلمانوں کی دل آزاری کا باعث تو نہ ہوگا۔ روزنامہ زمیندار نے آج سے دس سال پہلے یہ لکھا تھا کہ موجودہ حالت سے تو بدرجہا بہتر ہے کہ مسجد گرادی جائے تا کہ ہر روز مسلمانوں کے دلوں پر چرکے نہ لگیں۔ اس لیے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے آخر کار یہی فیصلہ کیا گیا تھا کہ مسجد گرادی جائے۔ ہمیں قطعاً امید نہ تھی کہ ایسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

مولانا ظفر علی خاں نے اس سے انکار نہیں کیا کہ زمیندار میں آج سے دس سال قبل ایسا نہیں لکھا گیا، لیکن یہ ضرور فرمایا کہ اس وقت معلوم نہیں کیا حالات تھے اور کس سپرٹ میں لکھا گیا تھا۔

اس موقعے پر مولانا سید حبیب نے یہ ضرور فرمایا کہ کہا جاتا ہے کہ سیاست نے بھی اس سے پہلے ایسا ہی لکھا ہے، لیکن میں چیلنج کرتا ہوں کہ سیاست نے ایسا مشورہ کبھی نہیں دیا۔

اس موقعے پر پھر میں نے مداخلت کی اور ان سے عرض کیا کہ گزشتہ قصوں کو اب آپ حضرات بھول جایئے اور میں نے جو تجویز مصالحت پیش کی ہے اس پر غور کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کیجیے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے نہایت مآل اندیشانہ طور پر ماسٹر تارا سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اچھا اس قدر (یعنی میری تجویز کے مطابق منہدم شدہ حصہ مسجد کی مرمت اور آئندہ کے لیے آداب واحترام کا عہد اور مزار کے لیے پانچ فٹ کا راستہ) تو آپ تسلیم کر لیں، لیکن باقی امور کے لیے میں اپنا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ مفاہمت کے بعد عدالت کے ذریعے چارہ جوئی کر کے مسجد واگزار کرنے کا حق ہمیں حاصل ہوگا۔

ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، اگر عدالت کے ذریعے آپ مسجد واگزار کرا سکتے ہیں تو بے شک عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایئے، ہمیں کوئی رنج نہ ہوگا۔ زمین کے، مکان کے مقدمات میں بھائی بھائی کے درمیان جھگڑے ہوتے ہیں۔ عدالت جس کا حق سمجھے اسے دلا دے، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ کچھ تو آپ مفاہمت کے ذریعے حاصل کر لیں اور کچھ عدالت کے ذریعے۔ آپ بے شک اپنا پورا حق عدالت کے ذریعے حاصل کیجیے۔

Marfat.com

اس موقعے پر میاں امیرالدین صاحب میونسپل کمشنر بھی تشریف لے آئے تھے۔ وہ بھی ارکان وفد میں سے تھے، لیکن قدرے دیر سے پہنچے۔ میاں صاحب موصوف نے میری تجویز کی تائید کی اور کہا کہ اس سے مسلمان مطمئن ہو جائیں گے...... لیکن مولانا ظفرعلی خاں صاحب نے فرمایا کہ نہیں، اصل مطالبہ مسجد شہید گنج کی واگزاری کا ہے اور جب تک مسجد واگزار نہیں ہوتی، مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے۔

اس غرض سے کہ میں مولانا ظفرعلی خاں صاحب کی خدمت میں تنہائی میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کچھ عرض کر سکوں، میں نے سکھ رہنماؤں سے کہا کہ آپ ہمیں موقع دیں کہ ہم تنہائی میں آپس میں کچھ گفتگو کر سکیں، چنانچہ وہ سب اس کمرے سے اٹھ کر گوردوارے کے اندر چلے گئے۔ اس وقت میں نے بڑے ادب سے مولانا ظفرعلی خاں کی خدمت میں عرض کیا کہ اللہ کے لیے آپ اس تجویز مصالحت سے اتفاق کریں اور ضد نہ کریں۔ میں پھر آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ایجی ٹیشن سے مسجد نہیں ملے گی اور مسلمان قوم کو بحیثیت قوم ذلیل ہونا پڑے گا۔

میاں امیرالدین صاحب نے پھر میری تائید کی، لیکن مولانا صاحب نے کہا کہ مسجد کی واگزاری کے بغیر اور کوئی مطالبہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز پر ہم مصالحت کر سکتے ہیں۔

میں نے اس وقت محسوس کیا کہ مولانا ظفرعلی خان نے جو یہ فرمایا تھا کہ ایک مسلمان اعلیٰ افسر نے مجھ سے کہا ہے کہ تم ایجی ٹیشن جاری رکھو، حکومت تمھیں مسجد لے دے گی، یہ اسی کا اثر ہے کہ مولانا تجویز مصالحت قبول نہیں کرتے، اس لیے میں نے جو کچھ دفتر زمیندار میں ان سے عرض کیا تھا، پھر دوبارہ عرض کیا اور بڑے ادب سے عرض کیا کہ آپ اس بات کو بالکل ذہن سے نکال دیں، آپ جس مسلمان افسر کو خیرخواہ سمجھتے ہیں، حقیقت میں وہ آپ کے ساتھ اور مسلم قوم کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔

اس موقعے پر مولانا سید حبیب صاحب نے فرمایا کہ میں نے یہ سنا ہے کہ کسی ذمہ دار شخصیت نے سکھوں سے یہ کہا ہے کہ تم حق بجانب ہو، قانون تمھاری حمایت پر ہے۔ عدالت کے فیصلے تمھاری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ تم اگر مسجد گرانا چاہو تو تمھیں حق حاصل ہے اور مسلمانوں کی شورش کی وجہ سے اگر خطرات محسوس کرتے ہو تو تم بالکل بےفکر رہو، حکومت فوج اور پولیس کے ذریعے تمھاری حفاظت کرے گی۔

مولانا سید حبیب کے اس بیان کے بعد میں نے پھر مولانا ظفرعلی خاں صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور عرض کیا کہ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کوئی دشمن شخص ہے، جو سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک خون ریز جنگ کرانا چاہتا ہے۔ اللہ کے لیے آپ مان جایے، اس میں آپ کی فتح ہے۔ آپ اس تحریک کے قائد ہیں، آپ کے ہاتھوں اگر تجویز مصالحت پایہ تکمیل تک پہنچ جائے تو آپ ایک کامیاب

Marfat.com

قائد کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے جائیں گے......لیکن افسوس کہ مولانا صاحب نے میری التجاؤں کو یکسر ناقابل التفات سمجھ کر ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ مسجد کی حوالگی اور واگزاری کے بغیر اور کسی چیز پر مصالحت نہیں ہو سکتی۔

مولانا صاحب کے جواب کے بعد بالآخر سکھ رہنماؤں کو بلا لیا گیا اور ان کے سامنے پھر مسجد کی حوالگی اور واگزاری کا مطالبہ کیا گیا۔ سکھ رہنماؤں نے کہا اب آپ جو چاہتے ہیں وہ لکھ کر گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کے پاس بھیج دیں۔ ہم اس وقت ازخود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، اس لیے کمیٹی جو فیصلہ کرے گی، اس سے آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

اس جواب کے بعد مسلم وفد واپس آ گیا۔

اسی روز ۴۔ جولائی کو ۶ بجے کے قریب برکت علی محمڈن ہال میں انجمن تحفظ مسجد شہید گنج کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس میں مسلم وفد نے اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی، چناں چہ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے سکھ رہنماؤں سے ملاقات کا نتیجہ پیش کیا۔ میں نے اس اجلاس میں تمام واقعات جو ذکر کر چکا ہوں، بالاختصار بیان کیے اور اپنی تجویز مصالحت کے حق میں جو دلائل مولانا ظفر علی خاں کے سامنے بیان کیے تھے، اس اجلاس میں بھی بیان کیے اور وہی اپیل جو میں نے وہاں مولانا ظفر علی خاں سے کی تھی وہ تمام ارکان انجمن تحفظ مسجد شہید گنج سے کی۔ اس وقت پھر میاں امیر الدین صاحب میونسپل کمشنر نے میری تائید کی، لیکن مولانا سید حبیب صاحب نے بالکل آداب مجلس کے خلاف اٹھ کر ان کے کان میں کچھ کہا۔ بس اس کے بعد میں دیکھتا ہوں کہ میاں صاحب موصوف اپنی تائید واپس لے رہے ہیں۔ غرض انجمن تحفظ مسجد شہید گنج کے قریباً تمام ارکان نے مولانا ظفر علی خاں صاحب اور سید حبیب صاحب کی تقریروں کے بعد میری تجویز مصالحت کو مسترد کر دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ مسجد کی واگزاری ہمارا زیادہ سے زیادہ مطالبہ اور یہی ہمارا کم از کم مطالبہ ہے، اور قرار پایا کہ یہی فیصلہ گوردوارہ پر بندھک کمیٹی کو لکھ کر بھیج دیا جائے۔''

ڈائری مولانا سید محمد داؤد غزنوی

مطبوعہ روزنامہ مجاھد یکم اکتوبر ۱۹۳۵ء

مسجد شہید گنج کے سلسلے کی یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو یہاں درج کر دی گئی ہے۔

۳۷۔ اس وقت مجلّہ علم و آگہی کراچی کا تحریکات ملی نمبر پیش نگاہ ہے جو ۸۳۔۱۹۸۲ء کا شمارہ ہے۔ اس میں ''تحریک خلافت اور ترک موالات'' کے موضوع پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری اور ڈاکٹر انصار زاہد کے دو طویل مضامین مندرج ہیں۔ ''خلافت کانفرنسیں اور دیگر اہم واقعات'' کے عنوان سے بتایا گیا ہے کہ ۲۳، ۲۴۔ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں بصدارت مولوی فضل الحق آل انڈیا خلافت کانفرنس

Marfat.com

کا اجلاس ہوا، جس میں یوپی، اودھ، دہلی، راجپوتانہ، پنجاب اور سندھ کے نمائندوں نے شرکت کی۔
اس سے اگلے مہینے دسمبر (۱۹۱۹ء) میں امرتسر میں دوسری خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ امرتسر میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ خلافت کمیٹی پنجاب نے کیا تھا، جس کے سیکرٹری مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ مولانا نے اس میں شرکت کے لیے مشہور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو دعوت نامہ بھیجا تھا۔ اس زمانے کی برصغیر کی سیاست کا یہ نہایت اہم دور تھا۔
مولانا غزنوی کا یہ دعوتی خط ہم درج کر رہے ہیں تا کہ تاریخ سیاست کی یہ سطور ان صفحات میں محفوظ ہو جائیں۔ ان دنوں کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی امرتسر میں ہوتے تھے۔ اجلاس میں شرکت کے لیے مولانا داؤد غزنوی نے جو مکتوب گرامی مولانا عبدالباری فرنگی محلی (لکھنوی) کو ارسال فرمایا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

مکرمی جناب مولانا صاحب!

السلام علیکم! جناب کو بذریعہ اخبارات معلوم ہوا ہو گا کہ آل انڈیا خلاف کمیٹی کا دوسرا سالانہ اجلاس امرتسر میں مورخہ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بوقت ۸ بجے شب کانگرس پنڈال میں ہونا قرار پایا ہے۔ اس اجلاس میں خطبہ صدارت پڑھا جائے گا اور اہم تجاویز پر غور وفکر کرنے کے بعد انھیں پاس کیا جائے گا۔ سبجیکٹ کمیٹی ۲۹۔ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ۲ بجے مسلم لیگ کے خطبہ صدارت کے ختم ہونے کے بعد ہوگی۔
جناب سے امید ہے کہ اس خالص مذہبی مجلس میں شرکت فرما کر اپنے مفید مشوروں سے قوم کو اس مسئلے میں راہ راست بتلائیں گے۔

محمد داؤد غزنوی
سیکریٹری خلافت کمیٹی

اس اجلاس میں برصغیر پاک و ہند کے سینکڑوں علمائے کرام نے شرکت کی تھی اور اس قسم کے بہت سے فیصلے کیے گئے تھے، جن کا تعلق بہ یک وقت مذہب سے بھی تھا اور اسلام سے بھی۔

۳۸۔ مولانا دین محمد وفائی صوبہ سندھ کے ممتاز عالم ومصنف، ادیب ومورخ اور صحافی تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے، سیاسیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے اور نیشنلزم کے حامی تھے۔ وہ منگل کے روز ۲۷۔ رمضان المبارک ۱۳۱۱ھ (۳۔ اپریل ۱۸۹۴ء) کو گوٹھ گھٹی عرف نبی آباد تعلقہ گڑھی یاسین (ضلع سکھر سندھ) میں پیدا ہوئے۔ اور منگل کی شب ۲۲۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۹ھ (۱۱۔ اپریل ۱۹۵۰ء) کو وفات پائی۔ انھوں نے ۱۹۴۲ء میں ۳۰۔ مارچ سے ۱۸۔ اپریل تک مختلف مقامات کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ لاہور اور امرتسر بھی تشریف لائے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل غزنوی سے

Marfat.com

ملاقات کی اس کا تذکرہ انھوں نے جن الفاظ میں کیا ہے، ہم اسے یہاں نقل کر رہے ہیں۔

معروف مصنف ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپریل ۱۹۹۲ء میں مولانا دین محمد وفائی کے نام سے ان کے حالات میں ایک کتاب تصنیف کی ہے، یہ اقتباس اسی کتاب سے یہاں درج کیا جا رہا ہے، اس سے مولانا داؤد اور ان کے عم زاد مولانا اسماعیل غزنوی کا جس خوب صورت انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یہ قارئین کے علم میں آجائے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سیر وسیاحت سے فراغت حاصل کر کے مولانا محمد داؤد غزنوی ابن امام عبدالجبار غزنوی (امام اہل حدیث) سے شرف ملاقات حاصل ہوا، مولانا صاحب لاہور کی چینیاں والی مسجد میں پیش امام اور انجمن اہل حدیث لاہور کے صدر اور سیاست سے قریبی رابطہ رکھنے والے ایک مشہور لیڈر ہیں۔ مولانا صاحب نہایت خلوص سے پیش آئے اور دوسرے دن اپنے دستر خوان پر کھانے کا ارشاد فرمایا اور اس کے بعد امرتسر روانگی کا فیصلہ ہوا۔ ۱۵۔ اپریل کو مولانا داؤد غزنوی صاحب کی معیت میں ۴ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوئے اور شام کو وہاں پہنچے۔''

اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں۔

''نماز مغرب کے بعد مولوی محمد اسماعیل غزنوی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ ۱۶۔ تاریخ کو امرت سر میں ٹھیرنا پڑا، مولوی محمد اسماعیل امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے ہیں۔ بنگلہ عالی شان طریقے سے سجایا گیا ہے اور فرش پر نہایت عمدہ قالین بچھائے گئے ہیں۔ عمارتوں کی تعمیر کا کام سال بھر چلتا رہتا ہے نوکروں کی بہت بڑی کھیپ موجود ہے۔ مولانا اسماعیل، مولانا داؤد غزنوی کے چچازاد بھائی ہیں۔ آپس میں بہت محبت ہے اور پیار سے رہتے ہیں۔ مجھے جو نایاب کتابیں اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔ وہ عزیزی حسام الدین کی طرح جنوں کی حد تک ہے۔ اسماعیل صاحب کے بنگلے کی میں نے الماری کھولی تو تمام پرانی کتابوں سے بھری ہوئی تھی مولوی صاحب نے فرمایا جو بھی کتاب آپ کو پسند آئے، لے لیں۔ اگرچہ کتابیں تو کافی لینے کے قابل تھیں، مگر میں نے چند کتابوں پر اکتفا کیا۔

۱۔ ابجد العلوم: از نواب صدیق حسن خاں، ایک بے نظیر و نایاب کتاب ہے، جس کے ۱۹۸۲ صفحے ہیں۔

۲۔ ازالتہ الخفا: از شاہ ولی اللہ دہلوی، قدیم چھاپے کا نسخہ جو آج کل نایاب ہے۔

۳۔ هداية السائل الى ادلته المسائل: از نواب صدیق حسن خاں، یہ بھی نایاب کتاب ہے۔

۴۔ المعضا شرح الموطا: از مولوی وحید الزمان محدث، یہ شرح مکہ مکرمہ میں لکھی گئی تھی اور اس وقت ناپید ہے۔

۵۔ فتاوی امام عبدالجبار غزنوی: اس وقت تک چھپی نہیں۔

Marfat.com

۶۔ ظفر اللاضی بما یحب فی القضاء علی القاضی ۔

۷۔ ذخر الممتی من آداب لمفتی ۔

۸۔ طلب الادب ۔

آخر الذکر تینوں رسالے ایک جلد میں نواب صدیق حسن خاں کے عربی میں ہیں۔

''ان کے علاوہ مولوی صاحب نے ایک کتاب آداب الشرعیہ للمقدسی بھی از خود عنایت فرمائی یہ کتاب مصر میں شائع ہوئی ہے، جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبے اور ہر شاخ پر عجیب انداز میں بحث کی گئی ہے۔''

اس سے آگے لکھتے ہیں:

''غزنوی خاندان کا شہر میں مدرسہ سلفیہ کے نام سے ایک مدرسہ ہے جس میں مہتمم مولانا محمد داؤد اور سرپرست مولانا اسماعیل ہیں۔ ۱۶۔اپریل کی شام کو لائبریری دیکھی۔ اس لائبریری میں غزنوی خاندان کی تین نسلوں کا علمی ذخیرہ جمع ہے۔ مولانا محمد داؤد صاحب کا لاہور والا ذاتی کتب خانہ بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ نایاب اور نادر کتابوں سے بھرا ہوا ہے۔ کتاب الانساب (سمعانی) جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اس کی عکسی نقل اس کتب خانے میں موجود ہے۔ مولانا داؤد صاحب گوکہ مولوی اسماعیل کی طرح دولت مند نہیں، لیکن وہ بھی امیرانہ طرز کی رہائش رکھتے ہیں، بہت اثر والے عالم اور لیڈر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کر دے۔''

۳۹۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ مولانا غزنوی مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل جماعتوں کے عہدے دار رہے۔

.........پنجاب خلافت کمیٹی کے ناظم اعلیٰ۔

.........مجلس احرار ہند کے ناظم اعلیٰ۔

.........جمعیت علمائے ہند کے نائب صدر۔

.........کانگرس کمیٹی پنجاب کے صدر۔

.........خضر وزارت کے خلاف مسلم لیگ کی تحریک کے ڈکٹیٹر۔

.........۱۹۵۳ء کی خلاف مرزائیت تحریک کے سلسلے میں قائم کردہ مجلس عمل کے ناظم اعلیٰ۔

.........مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر (اور امیر)

مولانا جولائی ۱۸۹۵ء کے آخری ہفتے یا اگست ۱۸۹۵ء کے پہلے ہفتے میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی اور مولانا عبدالاول غزنوی سے حاصل کی۔

Marfat.com

اردو حساب وغیرہ کے لیے مولانا گل محمد کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا۔ پھر عازم دہلی ہوئے اور وہاں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور بعض دیگر اساتذہ سے اکتساب علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ اپنے والد مکرم کی جگہ مدرسہ غزنویہ امرتسر میں مسند تدریس پر متمکن رہے۔ بعدازاں تحریک خلافت کے زمانے میں سیاسیات میں آگئے اور آزادی وطن کے لیے مختلف اوقات میں دس سال کے لگ بھگ ملک کی مختلف جیلوں میں قید رہے۔

اب جی کڑا کر کے چند باتیں مولانا کی گھریلو زندگی کے بارے میں سنیے۔

ان کی پہلی بیوی ۱۹۳۸ء میں یا اس کے پس وپیش وفات پا گئی تھیں۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے دہلی کے ایک معزز گھرانے میں دوسری شادی کی۔ اس وقت پہلی بیوی سے ایک بیٹی اور دو بیٹے...... سید عمر فاروق غزنوی اور سید ابوبکر غزنوی...... موجود تھے۔ بیٹی ایک سیشن جج کی اہلیہ تھیں جو خانوادۂ غزنویہ ہی کے فرد تھے۔ ان کا زیادہ تر زمانہ ملازمت کوئٹہ اور کراچی میں گزرا۔ سید عمر فاروق غزنوی کی ضلع شیخوپورہ میں آٹھ یا نو مربعے ذاتی زرعی زمین تھی اور ٹیوب ویل، ٹریکٹر وغیرہ سب کچھ تھا۔ سید ابوبکر غزنوی انجینئرنگ یونیورسٹی (لاہور) میں شعبہ اسلامیات کے صدر تھے۔ یہ دونوں بیٹے مولانا سے علیحدہ تھے۔ بیٹی پہلے لاہور تھیں، پھر شوہر کے پاس کراچی چلی گئی تھیں اور بیٹے اسی مکان میں سکونت پذیر تھے، مگر اپنے اہل وعیال کے ساتھ الگ الگ رہتے تھے۔

مولانا کی وفات سے کچھ مدت بعد پہلے بڑی بیٹی کا انتقال ہوا۔ سید ابوبکر غزنوی کو اللہ نے بڑے اعزازات سے نوازا اور وہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے۔ وہ اسی منصب پر فائز تھے کہ انھوں نے ۱۶۔ اپریل ۱۹۷۶ء کو ایک حادثے سے لندن میں وفات پائی۔ چار دن بعد ۲۰۔ اپریل کو ان کی نعش لاہور پہنچی اور انھیں میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اس سے دو سال دو مہینے بعد ۲۲۔ جون ۱۹۷۸ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے سید عمر فاروق غزنوی نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس طرح یہ تینوں بہن بھائی یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پہلی بیوی سے مولانا کی تینوں اولادیں اللہ کے فضل سے نہایت آسودہ حال تھیں اور زندگی کی تمام راحتیں اور آسائشیں انھیں حاصل تھیں، اللہ ان کی قبریں نور سے بھرے۔ آمین۔

دوسری بیوی سے مولانا کی وفات کے وقت چار بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ ان میں سے تین دس سے سولہ برس کی عمر کے تھے اور تین ان سے کم سن۔ اپنی والدہ مکرمہ سمیت یہ گھرانا سات افراد پر مشتمل تھا۔ مولانا بلند وبالا شخصیت کے باوجود اور ہر حلقے میں اپنے بے پناہ اثر ورسوخ کے باوصف غربت کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن

Marfat.com

وضعداری اور رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مالی اعتبار سے یہ خالی ہاتھ ہیں۔

اب یہاں ان کی بیماری اور جنازے کے بارے میں چند باتیں سن لیجیے۔

وہ ۱۹۶۱ء سے دل کے دمے میں مبتلا تھے۔ کچھ عرصہ قبل طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو گلاب دیوی ہسپتال میں داخل ہوگئے۔ وہاں ان کے معالج ڈاکٹر بلیغ الرحمٰن تھے جو پٹیالہ کے رہنے والے تھے اور خاندانی طور سے علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ کے معتقدین میں سے تھے۔ انھوں نے نہایت توجہ سے مولانا کا علاج کیا۔ افاقہ ہوا تو گھر آگئے۔ بیماری کا عام لوگوں کو پتہ چل گیا تھا۔ چناں چہ بہت سے حضرات عیادت کے لیے آتے، جن میں ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی ڈاکٹر بھی ہوتے اور یونانی اطبا بھی۔ وہ انھیں دیکھتے اور مشورے دیتے۔ حکیم محمد حسین قرشی بھی کئی دفعہ آئے۔ مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں میں اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ حضرات تشریف لاتے اور چند منٹ بیٹھتے۔ ایک یا دو دفعہ پیر آف دیول بھی آئے۔

پیر کے روز ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو صبح پونے نو بجے میکلوڈ روڈ گنج (ضلع بہاول نگر) سے مولانا کی ایک عزیزہ کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بات کرنے کے لیے ابھی رسیور اٹھایا ہی تھا کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور بستر پر گر گئے۔ فوراً دو ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ لیکن ان کے آنے سے پہلے ہی وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملے تھے۔

اس کے بعد اخبارات کے ضمیمے شائع ہوئے اور ریڈیو میں ان کی وفات کی خبر کے ساتھ ان کے حالات زندگی بیان ہونے لگے۔ پھر جیسے جیسے لوگوں کو پتا چلتا گیا، ان کے مکان پر پہنچتے گئے۔ غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد ان کی میت اوپر سے اتار کر نیچے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے ہال میں رکھ دی گئی اور لوگ ان کا آخری دیدار کرنے لگے۔

اس سے ٹھیک سوا پچیس گھنٹے بعد ۱۷۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو منگل کے روز صبح دس بجے ان کا جنازہ اٹھانے سے پہلے چارپائی کے ساتھ دونوں طرف لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ میت کو کندھا دے سکیں یا کم از کم ہاتھ ہی لگا سکیں۔ ان کا چہرہ مبارک کھلا رکھا گیا تھا۔ جنازہ بہت بڑے ہجوم کے ساتھ بھاٹی دروازے کی طرف گیا، پھر انارکلی اور پرانی انارکلی سے گزرتے ہوئے یونیورسٹی گراؤنڈ لے جایا گیا۔ ان کے پرانے ساتھی اور جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے نماز جنازہ پڑھائی، جس میں تمام مذہبی، سیاسی اور سماجی تنظیموں کے اکابر و اعیان شامل تھے۔ پاکستان کی مرکزی حکومت کے بھی متعدد سابق اور موجود وزرا شریک جنازہ تھے۔ وہ ون یونٹ کا زمانہ تھا، مغربی پاکستان کی حکومت کے اکثر وزرا اور ارکان اسمبلی جنازے میں موجود تھے۔ مولانا کی وفات کے افسوس میں لاہور کے تمام کاروباری ادارے اس دن بند رہے اور مختلف تنظیموں نے تعزیتی قراردادیں منظور کیں۔

Marfat.com

ان کے انتقال کی خبر تمام اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ صفحہ اول پر شائع ہوئی، خبر میں ان کے ضروری حالات زندگی بھی درج تھے۔ جنازے کے دن صبح پانچ بجے سے پہلے ہی اخبار فروش اخبارات لے کر آگئے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اخبار خریدے۔ کئی مرتبہ اخبار ختم ہوئے اور اخبار فروشوں کو اخبارات کے دفاتر سے بار بار اخبار لانا پڑے۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دیں کہ اخبارات نے ۱۹۶۳ء کو اس اعتبار سے ''سال سیاہ'' قرار دیا تھا کہ اس سال پاکستان آٹھ اہم دینی، سیاسی اور سماجی شخصیتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ ان شخصیتوں کی ترتیب وفات اس طرح ہے۔

۱۔	محمد علی بوگرہ (سابق وزیر اعظم پاکستان)	فروری ۱۹۶۳ء
۲۔	راجا غضنفر علی خاں (سابق مرکزی وزیر پاکستان)	مئی ۱۹۶۳ء
۳۔	مولوی تمیز الدین خاں (سابق سپیکر قومی اسمبلی)	ستمبر ۱۹۶۳ء
۴۔	علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی (خاکسار لیڈر)	ستمبر ۱۹۶۳ء
۵۔	مولوی غلام محی الدین قصوری (صدر انجمن حمایت اسلام)	ستمبر ۱۹۶۳ء
۶۔	اکرام اللہ (سابق ہائی کمشنر برطانیہ)	اکتوبر ۱۹۶۳ء
۷۔	حسین شہید سہروردی (سابق وزیر اعظم پاکستان)	دسمبر ۱۹۶۳ء
۸۔	مولانا سید محمد داؤد غزنوی	۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء

مولانا کو میانی صاحب کے قبرستان میں ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد سلیمان غزنوی مرحوم کے پہلو میں دفن کیا گیا، جنھوں نے مولانا سے تین سال قبل ۲۹۔ دسمبر ۱۹۶۰ء کو وفات پائی تھی۔

تدفین کے بعد واپس آکر جماعت کے چند سرکردہ ارکان دارالعلوم کی دوسری منزل میں مرکزی جمعیت کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں:

مولانا محمد اسماعیل سلفی (اس وقت کی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ)، میاں عبدالمجید مالواڈہ (ناظم مالیات)، مولانا غزنوی کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی، حاجی محمد اسحاق حنیف (جمعیت اہل حدیث کے ناظم نشرواشاعت) دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے موجودہ مہتمم اور مولانا غزنوی کے حقیقی بھتیجے سید عثمان غزنوی اور ان سطو کا راقم عاجز۔

سید ابوبکر غزنوی سے دریافت کیا گیا کہ مولانا کے بیوی بچوں کے جو سات افراد ہیں، ماہانہ اخراجات کیا ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ مولانا مئی ۱۹۶۲ء میں جب شاہ سعود کی دعوت پر مدینہ یونیورسٹی کے افتتاح اور حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے، مجھے ان کے دو مہینے کے اخراجات کے لیے چھ سو روپے دے گئے تھے

Marfat.com

اور فرمایا تھا کہ مہینے کے تین سو روپے ان کو دے دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چھوٹے بڑے سات افراد کا خرچ تین سو روپے ماہانہ ہے۔

سید ابوبکر غزنوی کے اس فرمان کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ مرکزی جمعیت کی طرف سے ان سات افراد کے اخراجات کے لیے تین سو روپے ہر مہینے دیے جائیں گے...... یہ فیصلہ تو ہو گیا مگر اس پر عمل نہیں ہو سکا۔

پھر کیا ہوا......؟ سنیے!

ایک دن راوی روڈ (لاہور) کی ایک ہوزری کے مالک نے اخبار میں اشتہار شائع کرایا کہ انھیں پیکنگ کے لیے چند خواتین کی ضرورت ہے جو روزانہ چھ گھنٹے کام کریں گی اور انھیں پانچ روپے اجرت دی جائے گی۔ وقت مقررہ پر کچھ عورتیں پہنچیں اور قطار میں کھڑی ہو گئیں۔ مالک کرسی پر بیٹھا سب کے نام اور پتے پوچھتا اور رجسٹر میں لکھتا گیا اور انھیں کام کی نوعیت سمجھاتا گیا۔ چھٹے یا ساتویں نمبر پر ایک برقع پوش خاتون کھڑی تھیں۔ اس کی باری آئی تو ہوزری کے مالک نے اس کا نام اور پتا پوچھا: اس نے بتایا:

''بیوہ مولانا داؤد غزنوی، ۴ شیش محل روڈ، لاہور۔''

مالک نے یہ الفاظ سنے تو حیرت و تعجب سے اس کی طرف دیکھا، پھر ایک دم کرسی سے اٹھا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور نگاہیں نیچی کر کے خاتون کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے التجا کی:

''بی بی آپ کرسی پر تشریف رکھیے۔''

خاتون نے جواب دیا: ''میں مزدوری کرنے آئی ہوں، کرسی پر بیٹھنے نہیں آئی۔ اگر کرسی پر بیٹھنے پر میرا اور میرے بچوں کا پیٹ بھر سکتا تو کرسیاں میرے گھر میں بہت ہیں، انہی پر بیٹھی رہتی، یہاں کیوں آتی؟''

مالک کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس نے التجا کے لہجے میں کہا:

''مہربانی فرما کر آپ یہاں تشریف نہ لایا کریں، آپ کے آنے سے مجھے شرمندگی ہوگی۔ میں دس روپے روزانہ آپ کے گھر بھجوا دیا کروں گا۔''

خاتون نے کہا: ''میرے چھوٹے چھوٹے چھ بچے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ سے کما کر انھیں روکھی سوکھی روٹی کھلانا چاہتی ہوں۔ آپ سے دس روپے فی سبیل اللہ نہیں لینا چاہتی، پھر دس روپے روزانہ آپ دیتے بھی کب تک رہیں گے۔''

وہ کچھ دن ہوزری میں کام کرتی رہیں۔ محلے کے بعض لوگوں کو بھی اس کا علم ہو گیا۔ ایک دن ایک شخص نے مولانا کے ایک انتہائی قریبی عزیز سے کہا کہ اللہ نے آپ کو سب کچھ دیا ہے، ان کا بھی خیال رکھیں۔ یہ محنت مزدوری کرتی ہیں اور ہم شرم سار ہوتے ہیں۔

Marfat.com

انھوں نے جواب دیا: ''تم کون ہوتے ہو، ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے۔ میں تمھاری ٹانگیں چیر دوں گا۔''

چھ سات روز کے بعد مولانا کے ان انتہائی عزیز نے مولانا کی بیوی سے جواب بیوہ ہوگئی تھیں، طنز آمیز غصے سے کہا: ''اس مزدوری سے بہتر یہ ہے کہ آپ دارالعلوم کے دروازے پر بیٹھ کر پکوڑے بنانا شروع کر دیں، اس سے زیادہ آمدنی ہوگی۔''

یہ الفاظ سن کر ستم رسیدہ خاتون رو پڑیں اور خاموش ہوگئیں۔ اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔

چند روز گزرے تھے کہ پتا چلا لاہور کے علاقہ سنت نگر میں لڑکیوں کے ہائی سکول میں ایک ایسی عورت کی خدمات درکار ہیں جو لڑکیوں کو کشیدہ کاری سکھا سکے۔ چار سو پچیس روپے اسے ماہانہ تنخواہ دی جائے گی۔ اس نیک بخت اور مصیبت زدہ خاتون نے وہاں درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ کچھ عرصہ وہ اس سکول میں ملازمت کرتی رہیں۔

مولانا کی اہلیہ کی والدہ اور بہن بھائی کراچی رہتے تھے۔ چھوٹے بھائی کراچی میں ملازمت کرتے تھے، وہ کراچی کی ملازمت چھوڑ کر لاہور آ گئے اور یہاں ملازمت کرنے لگے۔ وہ بیوہ بہن کے پاس رہتے تھے اور جو کچھ کماتے بہن کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ بڑے بھائی بھی کراچی سے اپنی استطاعت کے مطابق مدد کرتے رہے۔ یہ تمام لوگ یکے بعد دیگرے وفات پا گئے ہیں۔

مولانا کی ایک ملازمہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد اگرچہ حالات یکا یک بدل گئے تھے، لیکن وہ ملازمہ (جو ان کی وفات کے بعد ملازمہ نہیں رہی تھی) جب تک زندہ رہی، ان کے بیوی بچوں کی خدمت کرتی رہی۔

ان کا وفادار اور چہیتا تبتی ملازم محمد عمر اسی کمرے میں رہا، جس میں مولانا کی زندگی میں رہتا تھا۔ اب اس کا کام رونا دھونا رہ گیا تھا۔ وہ اوپر جا کر مولانا کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا۔ پہلے وہ ''مولانا صاحب!'' کہہ کر آواز دیتا تھا۔ اب ان کے چھ سالہ بچے یحییٰ کو بھرائی ہوئی آواز سے پکارتا ''......یحییٰ......!''

مولانا گرمیوں میں براؤن چپل یا براؤن مکیشن اور سردیوں میں کبھی مکیشن اور کبھی براؤن بوٹ پہنا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ایک شیروانی، چند قمیصیں اور چپل اور بوٹ وغیرہ محمد عمر کو دے دیے گئے تھے۔ وہ انھیں پہن کر اور دیکھ کر کبھی خوش ہوتا تھا اور کبھی رونے لگتا تھا۔ مولانا کی وفات سے تقریباً اٹھارہ برس بعد محمد عمر کا جنازہ اسی کمرے سے نکلا، جو اس کو مولانا نے دیا تھا۔

مولانا کی بیوہ نے جو بلاشبہ عالی ہمت خاتون ہیں، کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ مصائب و آلام کا نہایت جرات سے مقابلہ کرتی اور آگے قدم بڑھاتی رہیں۔ وہ یہ بھول گئیں کہ وہ ایک بڑے اور نامور شوہر کی بیوی

Marfat.com

تھیں۔ اس خاتون نے انقلاب وتغیر کی مخالفانہ لہروں کا پامردی سے سامنا کیا اور بچوں کو تعلیم دلائی۔ بچے ماں کے بہت فرماں بردار ثابت ہوئے۔ جن لوگوں کے ان کے باپ سے مراسم تھے، ان کا اعزاز واکرام بھی انھوں نے اپنے آپ پر ضروری قرار دے لیا۔

اس خاتون کو کب، کیوں اور کس کس کے ہاتھوں کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا؟ اس پر اور اس کے بچوں پر لحہ بہ لحہ کس طرح عرصہ حیات تنگ کیا جاتا رہا؟ ان سوالات کے جواب نہ پوچھنا اور نہ دینا ہی بہتر ہے۔ سب باتیں بتادی جائیں گی تو میرے دل میں کیا رہے گا؟ کچھ باتیں اپنے سینے میں بھی رہنی چاہئیں اور ساتھ ہی کھلے دل سے یہ اعتراف بھی کر لینا چاہیے کہ

افسوس! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مولانا کی دوسری بیوی سے چھ اولادیں تھیں۔ چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بڑے بیٹے کا نام یحییٰ اور چھوٹے کا نام غزالی ہے۔ یحییٰ اور چاروں بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے اور یہ سب ماشاء اللہ اصحاب اولاد ہیں۔ یحییٰ کی شادی جماعت اہل حدیث کے مشہور رہنما مولانا سید حبیب الرحمٰن شاہ بخاری کی صاحب زادی سے ہوئی ہے۔ غزالی کی شادی ۲۵۔ جون ۱۹۹۶ء تک جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، نہیں ہوئی، ممکن ہے ان کی اشاعت تک ہو جائے۔ یحییٰ سول ایوی ایشن میں اچھے منصب پر فائز ہیں اور غزالی کاروبار کرتے ہیں۔ دونوں ملنسار اور بلند اخلاق نوجوان ہیں۔ اللہ انھیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ آمین

بیٹیوں کی شادی کہاں ہوئی؟ چند الفاظ میں یہ بھی سنتے جایے۔

مولانا جس زمانے میں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے، اوکاڑہ کی میاں فیملی کے ایک شخص میاں عبدالحق بھی اس وقت اسمبلی کے رکن تھے۔ مولانا کا سیاسی تعلق کانگرس سے اور میاں عبدالحق کا مسلم لیگ سے تھا۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد مولانا جناح عوامی لیگ میں شامل ہوگئے تھے۔ میں نے میاں صاحب کو دیکھا ہے، سیاسیات میں اختلافات کے باوجود دونوں کے باہم بہت اچھے مراسم تھے۔ وہ مولانا کے ہاں آیا کرتے تھے۔ اس وقت رشتے ناطے کا کوئی تصور نہ تھا، لیکن مولانا کی وفات کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ ان کے دو بھتیجوں سے مولانا کی دو بڑی بیٹیوں کی شادی ہوئی۔ تیسری بیٹی کی شادی حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے بڑے صاحب زادے مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے بیٹے کرنل رضاء الرحمٰن سے اور چوتھی کی پشاور میں غزنوی خاندان میں ہوئی۔ چاروں بیٹیاں ماشاء اللہ اپنے گھروں میں خوش ہیں۔

یحییٰ اور غزالی کے متعلق ایک بات یاد آئی، جی چاہتا ہے آپ کو بھی سنادی جائے...... یہ دونوں بچپن ہی

Marfat.com

میں سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے...... ایک دن میں اور مولانا کے بھتیجے سید عثمان غزنوی صاحب مولانا کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یحییٰ اور غزالی بھی وہاں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں بہت چھوٹے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ بچوں کی طرح نہ ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہیں، نہ کوئی بات کرتے ہیں۔ عثمان غزنوی صاحب سے مولانا بہت پیار کا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ میں کتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں، یہ دونوں بچے نہایت خاموشی اور سنجیدگی سے بیٹھے ہیں۔ آپ ان کی کس طرح تربیت کرتے ہیں۔ ہمارے بچے تو ایک منٹ خاموش نہیں رہ سکتے اور نہ کہیں جم کر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ نسخہ تربیت جو آپ استعمال کرتے ہیں، ہمیں بھی بتایئے۔

مولانا مسکرائے اور فرمایا کہ کبھی کبھی یہ میرے پاس یہاں آجاتے ہیں، میں اپنے کام مصروف ہوتا ہوں اور یہ دونوں اسی طرح خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ نہ اپنی جگہ سے ہلتے ہیں، نہ کوئی شرارت کرتے ہیں۔

اللہ نے ان کو باپ کی زندگی ہی میں آشنائے متانت کر دیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد تو بساط ہی الٹ گئی اور حالات بالکل بدل گئے۔ پہلے اگر شوخی کا تھوڑا بہت عنصر پایا بھی جاتا تھا تو اب وہ بھی ختم ہوا۔ بقول غالب

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

مولانا کی وفات پر عرب و ہند اور پاکستان کے لاتعداد علما و زعما نے تعزیتی خطوط لکھے۔ بعض حضرات نے مولانا کے بیٹوں کے نام، بعض نے ان کی اہلیہ کے نام، بعض نے میرے نام اور بعض نے ان کے پرانے رفقا اور دوستوں کے نام۔ یہ تمام خطوط حزن و ملال کے ساتھ ساتھ مولانا کے اوصاف و کمالات کے آئینہ دار ہیں، لیکن یہاں میں اس وسیع ذخیرے میں سے صرف دو خط درج کروں گا۔ یہ دونوں خط ہندوؤں کے ہیں، جنھیں ہم میں سے اکثر حضرات بلا استثنا متعصب اور تنگ نظر قرار دینے کے عادی ہیں۔

ایک خط لالہ بھیم سین سچر کا ہے جو اصلاً گوجراں والا کے رہنے والے تھے اور متحدہ پنجاب کے مشہور کانگرسی رہنما تھے۔ آزادی سے قبل کانگرس اور یونینسٹ پارٹی کی مخلوط وزارت میں وزیر جیل خانہ جات تھے۔ آزادی کے بعد مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوئے۔ پھر ہندوستان کے صوبہ اڑیسہ کے گورنر مقرر کیے گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش) کے گورنر بنائے گئے۔ مولانا غزنوی کی وفات کے وقت دہلی میں مقیم تھے۔

دوسرا خط اس دور کے ایک سوشلسٹ نوجوان ودیا ساگر ایم اے کا ہے جو لاہور کے رہنے والے تھے اور آزادی کے بعد آگرہ چلے گئے تھے۔ وہاں ایک کالج میں اکنامکس کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ یہ دونوں خط اردو میں ہیں جو شورش کاشمیری مرحوم کے نام آئے تھے۔ انھوں نے ۱۳۔ جنوری ۱۹۶۴ء میں چٹان میں شائع کر کے مجھے بھجوا دیے تھے، میں نے یہ دونوں خطوط مولانا کی وفات کے ایک مہینے کے بعد ۱۷۔ جنوری ۱۹۶۴ء کے

Marfat.com

الاعتصام میں شائع کیے...... ملاحظہ ہو، پہلے بھیم سین سچر کا خط۔

نیو دہلی

۶۳-۱۲-۲۷

پیارے شورش، سلامت رہو!

آپ کا چٹان مورخہ ۲۳۔ دسمبر کل ملا۔ سرورق پر نظر پڑی تو اپنے پرانے ساتھی اور پیارے دوست کی یاد کچھ ڈرتے ہوئے دل میں تازہ ہوئی۔ اوپر سرخی پر نظر پڑی تو جس چیز کا خطرہ محسوس ہوا تھا، وہی سامنے آ گئی۔ بہت رنج ہوا۔ یہ پڑھ کر کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے۔

کتنے شان دار اور پیار بھرے انسان تھے۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کے چہرے کی رونق میں فرق نہیں آتا تھا۔ آزادی کی تحریک میں آپ کا حصہ کتنا قابل قدر تھا، خدا مغفرت کرے۔

شاید آپ کو علم ہو کہ جیل میں جب ہم دونوں اکٹھے تھے تو میں ان سے قرآن مجید پڑھا کرتا تھا۔ مولانا داؤد کے چل بسنے سے ایک اور ساتھی، ان وقتوں کے، جن کی فقط اب یاد باقی رہ گئی ہے، کم ہو گئے۔

دھیرے دھیرے موجودہ نسل ختم ہو رہی ہے اور الجھنیں ویسی کی ویسی قائم ہیں بلکہ کچھ بڑھ رہی ہیں۔

خدا اپنا فضل کریں اور دونوں بھائی، بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنا سیکھیں۔

براہ نوازش میری دلی ہمدردی مولانا مرحوم کے لواحقین کی خدمت میں عرض کر دیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان میں سے کس کو اور کس پتے پر لکھوں۔ خدا مرحوم کو شانتی بخشیں۔ سب دوستوں کو سلام۔

آپ کا بھائی

بھیم سین

اب ودیا ساگر ایم اے کا تعزیتی خط پڑھیے۔

آگرہ

۲۹۔ دسمبر ۱۹۶۳ء

شورش بھائی!

آداب عرض۔ دکھ ہوا کہ مولانا داؤد غزنوی بھی چل بسے۔ کتنے خوب صورت انسان تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم لاہور سنٹرل جیل میں اکٹھے تھے تو ان کے قریب رہ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں۔ پھر آپ کو وہ دن بھی یاد ہوں گے، جب آپ انھیں قرآن مجید سنایا کرتے تھے اور میں ان سے قرآن پاک پڑھا کرتا تھا۔ کتنا بانکپن تھا ان میں۔ ان کا بارعب چہرہ، سرخ و سپید رنگ، روشن آنکھیں، لہجے میں مٹھاس، بات

Marfat.com

چیت میں نفاست، لباس میں حسن، دستر خوان کی پاکیزگی، نمازوں میں انہماک، روزے کے دنوں میں عبادت اور آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر دعائیں۔ پھر ان کی سچی اور بے ریا دیش بھگتی آج تک یاد ہے اور ان کی موت نے تو یہ تصویریں اور بھی چمکا دی ہیں۔

وہ کانگرس سے الگ ہو گئے اور مسلم لیگ میں چلے گئے۔ یہ ان کا سیاسی فیصلہ تھا، لیکن ان کا پیار کبھی نہیں مرا۔ میں ان سے اس زمانے میں بھی ملتا رہا۔ ایک مہربان انسان ہی کی طرح ملتے تھے۔

وہ اسلام کی سچی تصویر تھے۔ ان سے مل کر احساس ہوتا تھا کہ شرافت کا مجسمہ ہیں۔ آپ کی تیز گفتاری پر وہ کس پیار سے ٹوکا کرتے تھے۔ پھر انھیں آپ سے کتنی محبت تھی۔ یہ شبہ ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ ''مولوی'' ہیں۔ وہ اپنے لباس اور پوشاک، خوراک اور غذا، وضع قطع، شکل وصورت سے شاہی خاندان کے فرد معلوم ہوتے تھے۔

ہم سوشلسٹ ان سے خدا کے وجود پر جھگڑتے اور رب کو کہاں مانتے تھے۔ اور وہ کس مزے سے خدا کے وجود پر دلیلیں دیتے اور جب ہمیں اپنے طور پر قائل سمجھتے تو ڈراتے تھے۔ یہ انہی کا فیض تھا کہ میں نے خدا کو ماننا شروع کیا، ورنہ میں تو بہک گیا تھا۔

ان کا دل سامراج دشمنی سے پر تھا۔ ہمارے ساتھ جو لیڈر قید تھے، ان میں بڑے بڑے گاندھی بھگت بھی تھے اور دیش سیوک بھی۔ لیکن مجھے مولانا کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ وہ خود ہی پیرو اور خود ہی رہنما تھے۔ وہ کسی کی بھگتی کے تحت کانگرس میں نہیں آئے تھے، بلکہ ان مسلمان عالموں کے جانشین تھے جن کی گھٹی میں انگریزوں سے بغاوت کا جذبہ بھرا پڑا تھا۔

چٹان میں جب پڑھا کہ وہ انتقال کر گئے ہیں تو باور کریں، مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ کتنی ہی یادیں تازہ ہوتی گئیں۔ میں انھیں آج بھی اپنا استاد ہی سمجھتا ہوں۔ علامہ اقبال کی ارمغان حجاز انہی سے پڑھی تھی۔ سوال فارسی کا تھا، وہ مجھے آتی نہ تھی۔ مجھے کس شوق سے پڑھا گئے تھے۔

آپ ان کے پریوار تک میری ہمدردی پہنچا دیں۔ ان کے بڑے بیٹے یا بیٹیوں کا ایڈریس لکھیں، تاکہ اپنے جذبات ان تک پہنچا سکوں۔

اس عہد کے تقریباً سبھی لوگ ختم ہو رہے ہیں۔ موت واقعی کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب کوئی بزرگ یا دوست چلا جاتا ہے تو پھر واپس نہیں آتا۔ میں نے مولانا کو آزادی کے بعد نہیں دیکھا، وہ کس طرح رہے؟ معلوم نہیں۔ چٹان ہی میں کبھی کبھار ان کے حالات پڑھ لیتا تھا۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے بلکہ نظارہ بھی، جب جیل ہی میں، انھوں نے عید کی نماز پڑھائی، خطبہ دیا اور ہم بھی نماز میں شامل ہو گئے تھے۔ میرے سوال کرنے پر اذان کے معنی بتائے، پھر عید کی دعوت دی اور ہمارے

Marfat.com

دولت مند لیڈروں سے بازی لے گئے۔ دل ان کا فیاض تھا، ہاتھ کھلا۔ ہائے وقت اور موت نے کیسے کیسے بلند انسان ہم سے چھین لیے ہیں۔

دل بھر آیا ہے اور میں نے یہ خط اسی لیے آپ کو لکھا ہے، ورنہ ہمارے پاس انھیں یاد کرنے کے لیے آنسوؤں کے سوا کیا ہے؟

مولانا داؤد غزنوی زندہ باد۔

تمھارا بھائی

ودیا ساگر ایم اے

یہ تھی مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے واقعات و حالات کی ایک جھلک...... ان کی نیکی، مستقل مزاجی، قرآن و حدیث سے بے پناہ محبت، تقویٰ شعاری، سخاوت و جودت، اسلام سے بے پناہ تعلق اور آزادیِ وطن کے لیے ایثار و قربانی کی شہادت غیر مسلم بھی دیتے ہیں۔

ان خطوط کے علاوہ دہلی سے جمعیت علمائے ہند اور آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے دفاتر سے بھی تعزیتی تار اور خطوط موصول ہوئے۔ مولانا سے متعلق اور بھی بہت سے واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن فی الحال انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی اور قلم و قرطاس سے رابطہ رہا تو ان شاء اللہ باقی باتیں کبھی پھر عرض کی جائیں گی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ بہت عرصے سے مولانا کی یہ خواہش تھی کہ ان کے جدامجد حضرت مولانا سید عبداللہ غزنوی کے حالات ضبط تحریر میں لائے جائیں۔ وفات سے چار پانچ سال قبل بالخصوص اس خواہش میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح سید سلیمان ندوی نے سیرت شبلی کے نام سے علامہ شبلی کے حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں، اسی طرح مولانا عبداللہ غزنوی کے حالات معرض کتابت میں آنے چاہئیں۔ اس کے لیے وہ مواد بھی جمع کر رہے تھے۔ میں اس وقت لوہاری دروازے کے اندر لوہاری منڈی کے قریب رہتا تھا۔ میرے مکان کے سامنے ایک شخص احسان الحق صدیقی کی کتابوں کی دکان تھی، وہ پرانی اور قلمی کتابوں کے تاجر تھے۔ ایک مرتبہ ان کے پاس کہیں سے قلمی کتابوں کی لاٹ آئی تو انھوں نے مجھے بتایا کہ اس میں ایک کتاب ملفوظات ملا حبیب اللہ قندھاری ہے۔ ملا حبیب اللہ قندھاری کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ وہ مولانا عبداللہ غزنوی کے مرشد تھے۔ میں نے وہ کتاب دیکھی تو اس کی اطلاع مولانا داؤد غزنوی کو دی۔ دوسرے دن کتاب ان کو دکھا بھی دی۔ فرمایا کتاب خرید لو۔ چناں چہ کتاب خرید لی گئی۔

میں نے مولانا سے عرض کیا کہ مولانا عبداللہ غزنوی کی سوانح عمری کے لیے مولانا غلام رسول مہر سے

Marfat.com

بات کرنی چاہیے۔ مولانا نے میری گزارش منظور فرمائی اور کہا کہ میں مہر صاحب کے پاس جاؤں اور ان سے بات کروں۔ چناں چہ میں نے مہر صاحب سے بات کی۔ وہ اس خدمت کے لیے آمادہ ہو گئے اور کہا کہ میں خود کسی دن مولانا کے پاس آؤں گا اور ان سے بات کروں گا۔ لیکن اس اثنا میں مولانا کے صاحب زادے سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے مولانا سے کہا کہ وہ خود مولانا عبداللہ غزنوی کی سوانح عمری لکھیں گے۔ انھوں نے ملفوظات ملا حبیب اللہ قندھاری اور اس قسم کی بعض دوسری کتابیں جو سیرت سید عبداللہ غزنوی کا ماخذ بن سکتی تھیں، مولانا سے لے لیں۔ مولانا نے ان سے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے۔ یہ کام مہر صاحب جیسا تجربہ کار مورخ ہی کر سکتا ہے، مگر وہ نہیں مانے...... نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب لکھی نہ جا سکی۔

اب اس فقیر کا ارادہ ہے کہ اس اہم کام کی تکمیل کے لیے کوشاں ہونا چاہیے اور ایسی کتاب مرتب کرنی چاہیے جو حضرت مولانا عبداللہ غزنوی سے لے اس خاندان کے تمام اہل علم کے حالات پر مشتمل ہو۔ نیز اس دور کے علمی و سیاسی کوائف اور ان کے معاصرین و تلامذہ کا تذکرہ بھی اس میں آ جائے۔

وباللہ التوفیق وعلیہ التکلان

☆☆......☆☆......☆☆

Marfat.com

حافظ محمد گوندلوی

۱۹۳۵ء میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ہمارے ہاں (کوٹ کپورہ میں) قیام فرما تھے۔ وہ عام طور پر طلبا کو اپنے اساتذہ گرامی قدر میں سے کسی استاذ کا کوئی نہ کوئی واقعہ سناتے رہتے تھے۔ ایک دن حضرت العلام حافظ محمد گوندلویؒ کے تقویٰ وتدین کا ذکر چھڑ گیا اور کچھ اس قسم کی بات ارشاد فرمائی جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کی روحانیت کا یہ عالم ہے کہ گنہگار آدمی سے انھیں بدبو آنے لگتی ہے اور اس مجلس میں بیٹھنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، جس میں کوئی ایسا شخص بیٹھا ہو، جس کا دامن عمل معصیت آمیز ہو۔

یہ بات مولانا نے بیان فرمائی اور ہم نے سن لی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت حافظ صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ مولانا اس زمانے میں ایک شخص جلال الدین کے مکان میں رہتے تھے۔ اس مکان کا اچھا خاصا صحن تھا۔ حافظ صاحب صحن میں چارپائی پر تشریف فرما تھے، جس پر سفید چادر بچھائی گئی تھی اور ٹیک لگانے کے لیے تکیہ رکھ دیا گیا تھا۔ اردگرد چند لوگ بیٹھے ان کے ارشادات سن رہے تھے...... میں بھی وہاں بیٹھا تھا، لیکن حضرت حافظ صاحب سے کچھ فاصلے پر......!

میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، لیکن گناہ، عمر کے تناسب سے کہیں زیادہ تھے۔ دل میں خیال آ رہا تھا کہ میں چوں کہ بہت گنہگار ہوں، اس لیے حضرت حافظ صاحب کو یقیناً مجھ سے بدبو آ رہی ہوگی۔ مارے شرم کے سر جھکا ہوا تھا اور نگاہ نیچی تھی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ جونہی سر اوپر کیا اور حافظ صاحب کی نظر مجھ پر پڑی، بدبوئے معصیت سے ان کا برا حال ہو جائے گا اور وہ فوراً ناک پر رومال رکھ لیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ نہ نگاہ اوپر اٹھاؤ اور نہ حضرت کو تکلیف میں مبتلا کرو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ہماری عقل نے یہ فیصلہ کیا کہ سر جھکانے اور نظر نیچی کرنے سے بدبو ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت حافظ صاحب کی یہ پہلی زیارت تھی جو میں نے ڈرتے ڈرتے کی۔ اس زیارت کے دوران یہ خدشہ بھی کئی دفعہ پیدا ہوا کہ جب ان کا ناک میرے گناہوں کی بدبو سے بھر گیا تو وہ تنگ آ کر مجھے مجلس سے باہر نکال دیں گے، لیکن پھر خیال آتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا، وہ بدبو کی تکلیف برداشت کر لیں گے، لیکن مجلس سے نہیں نکالیں گے، بہرحال آدھ پون گھنٹے کی مجلس میں ذہن اسی طرح کے خیالات کی آماج گاہ بنا رہا۔

اب سوچتا ہوں کہ اس عمر کی یہ سوچ غلط نہ تھی، بلکہ اچھی سوچ تھی۔ اس کا مطلب اپنے گناہوں کا

Marfat.com

اعتراف اور احساس تھا۔ اگر کسی کو گناہ کا احساس ہو اور وہ اپنے خطا کار اور مرتکب معصیت ہونے کا اعتراف کرلے تو یقیناً ذہن میں نیکی کا جذبہ ابھرے گا اور اعمال خیر کی طرف قدم زن ہونے کی راہیں کھلیں گی۔ چھوٹی عمر میں احساس گناہ کا دل میں کروٹ لینا اور شعور کے دروازے پر دستک دینا، گناہ سے کنارہ کش ہونے اور گناہ کش رہنے کی علامت ہے، اگرچہ میں سوئے اتفاق سے گناہ سے کنارہ کش نہیں رہ سکا تاہم سوچ تو بہر حال حوصلہ افزا تھی۔

تو آیئے اب حضرت حافظ صاحبؒ کے حالات سے متعلق چند باتیں معرض بیان میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گوجراں والا شہر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر اس کے جنوب میں ایک قصبہ ''گوندلاں والا'' ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کا قطعی علم تو نہیں تاہم اس کے نام سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس کا بانی جاٹوں کی ''گوندل'' برادری سے تعلق رکھتا ہوگا اور یہ قصبہ جو ابتدا میں چند گھرانوں یا چند افراد پر مشتمل ہوگا، اسی برادری کی نسبت سے ''گوندلاں والا'' کے نام سے موسوم ہوگیا۔ بلاد وامصار اور قصبات و دیہات کی بالعموم وجہ تسمیہ کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے۔

۱۸۹۷ء (۱۳۱۵ھ) کو حضرت حافظ محمد صاحب اس قصبے میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولوی فضل الدین تھا۔ والد نے بیٹے کا نام محمد اعظم رکھا اور والدہ نے صرف محمد پر اکتفا کیا اور پھر اسی نام سے مشہور ہوئے۔

مولوی فضل الدین نے گوجراں والا کے مولانا علاء الدین اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے اخذ فیض کیا تھا۔ بیٹے کو بھی وہ اسی راہ پر لگانے کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ بیٹا قرآن بھی حفظ کرے اور علم دین سے بھی بہرہ مند ہو۔ چناں چہ جب وہ پانچویں سال کو پہنچے تو گاؤں کے ایک حافظ قرآن کے سپرد کر دیے گئے اور ان سے قرآن مجید حفظ کرنے لگے۔ جتنی آیات روزانہ یاد کرتے تھے، والد ان سے باقاعدہ سنتے تھے۔ اس طرح انھوں نے کئی سپارے یاد کر لیے، لیکن اس اثنا میں یہ المیہ پیش آیا کہ جب وہ زندگی کے نویں سال میں داخل ہوئے تو والد پینتیس سال کی عمر میں طاعون کی بیماری سے وفات پاگئے۔ اس وقت ہونہار بیٹے نے قرآن مجید کا زیادہ تر حصہ حفظ کرلیا تھا، باقی حصہ بعد میں حفظ کیا۔

والد کی وفات کے بعد گھر کے حالات بالکل بدل گئے اور آمدنی کے ذرائع جو پہلے ہی محدود تھے، اور سکڑ گئے، لیکن والدہ نہایت نیک خاتون تھیں اور دل میں یہ عزم رکھتی تھیں کہ بیٹے کو ہر حال میں علوم دین پڑھائیں گی، سعادت مند بیٹا بھی کم سنی کے باوجود ذہن میں حصول علم کا داعیہ راسخہ لیے ہوئے تھا۔ اس وقت گوجراں والا کی جامع مسجد اہل حدیث (چوک نیائیں) میں مولانا علاؤالدین امامت وخطابت اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اسی بنا پر اس مسجد کو مولوی علاؤالدین کی مسجد کہا جاتا تھا۔ بہت عرصے تک یہ مسجد اسی نام

Marfat.com

سے موسوم رہی۔ مولوی صاحب ممدوح مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ والا) کے شاگرد و مرید تھے اور بڑے صاحب تقویٰ بزرگ تھے، حضرت حافظ صاحب کو والدہ نے ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ انھوں نے وہاں عربی ادب اور صرف ونحو کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

وہ نہایت ذہین اور تیز طبع طالب علم تھے اور انتہائی شوق اور توجہ سے حصول علم کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اب والدہ نے ان کی تعلیم کے لیے ایک اور سعی کی۔ گوندلاں والا میں ایک بزرگ عبداللہ ٹھیکیدار سکونت پذیر تھے جو کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے، وہ حافظ صاحب کے والد گرامی مولوی فضل الدین کے عقیدت مند تھے۔ نیک بخت خاتون نے ان سے کہا کہ وہ بچے کو کسی اچھی سی دینی درس گاہ میں داخل کرا دیں۔ اس وقت امرتسر کے مدرسہ غزنویہ سلفیہ کی بڑی شہرت تھی اور دیگر اساتذہ کے علاوہ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنویؒ بھی وہاں درس دیتے تھے اور بہت سے شائقین علم ان سے استفادہ کر چکے تھے اور کر رہے تھے۔ چناں چہ عبداللہ ٹھیکیدار مرحوم انھیں امرتسر لے گئے اور اس مدرسے میں داخل کرا دیا۔ اس مدرسے میں انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم وفنون کی تکمیل فرمائی اور مندرجہ ذیل اساتذہ سے مستفید ہوئے۔

۱۔ مولانا عبدالجبار غزنوی

۲۔ مولانا عبدالاول غزنوی

۳۔ مولانا عبدالغفور غزنوی

۴۔ مولانا محمد حسین ہزاروی

۵۔ مولانا عبدالرزاق پشاوری

ان حضرات سے درس نظامی کی مروجہ کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا۔

پھر دہلی کا عزم کیا اور وہاں کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور کالج کے نصاب کے مطابق چار سال میں علم طب کی تکمیل فرمائی۔ یہاں ان کے استاد حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم تھے جنھوں نے طبی دنیا میں بے حد شہرت پائی اور مسیح الملک کے لقب سے پکارے گئے۔ جس سال حضرت حافظ صاحب نے طبیہ کالج کا نصاب مکمل کیا، اس سال کے جلسہ تقسیم اسناد میں گاندھی جی کو بلایا گیا تھا، انھی نے فارغ ہونے والے طلبا کو، جن میں حضرت حافظ صاحب بھی شامل تھے، سندیں تقسیم کی تھیں۔

طبیہ کالج (دہلی) کے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحان بھی پاس کیے۔ علاوہ ازیں دہلی میں علوم عربیہ ودینیہ کے جن جید اساتذہ سے وہ مستفید ہوئے، وہ

Marfat.com

ہیں مولانا احمد اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن پنجابی اور مولانا محمد اسحاق منطقی۔

جی تو چاہتا ہے کہ یہاں حضرت حافظ صاحب کے اساتذۂ گرامی کا تعارف بھی کرا دیا جائے لیکن یہ خدمت ان شاء اللہ کسی دوسرے موقعے پر انجام دی جائے گی، اس وقت یہی کافی ہے جو عرض کر رہا ہوں۔

اللہ نے حضرت حافظ صاحب کو ذہانت وفطانت کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا، اس سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور علم وادراک کے ہر گوشے سے متمتع ہوئے۔ ذکرالٰہی اور معرفت وتقویٰ کی نعمت عظمیٰ سے بھی انھیں بارگاہ الٰہی سے حصہ وافر عطا ہوا تھا۔ وہ تہجد گزار اور شب زندہ دار تھے۔ وظائف واوراد سے ان کی زبان مبارک ہر وقت تر وتازہ رہتی تھی۔ کم گو اور خاموش طبع تھے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔

ایک وجہ ان کے عہد طفولیت کا گھریلو ماحول تھا۔ انھوں نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ماں باپ کو اوراد وظائف میں مشغول پایا تھا۔ اس سے وہ متاثر ہوئے اور جیسے جیسے سفر حیات کے مختلف موڑ کاٹتے گئے اس ذوق میں اضافہ ہوتا گیا۔

دوسری وجہ خود ان کا ذاتی رجحان تھا جو مددگار ثابت ہوا، اور ذہنی وفکری پاکیزگی تھی جو انھیں امور خیر کی عملی وادیوں میں لے گئی۔

تیسری وجہ ان کے اساتذہ گرامی تھے۔ ابتدا میں ان کو حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) کے مرید وتلمیذ مولانا علاؤ الدین کی صحبت وشاگردی کا موقع میسر آیا، جس سے ان کے قلب ودماغ میں حسنات وخیرات کے جذبے نے راہ پائی۔ پھر امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی اور دیگر عالی مرتبت اساتذہ کے حضور زانوے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، جس سے قیام اللیل، تہجد اور تقوے کے داعیے ابھرے اور ان میں استحکام ودوام پیدا ہوا۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے درس وتدریس اور ان کی مجلس وصحبت نے بھی طبیعت کو بہت متاثر کیا۔ اس طرح جہاں وہ مختلف علوم وفنون میں درجہ کمال کو پہنچے، وہاں عرفان وتقوے کی دولت سے بھی مالا مال ہوئے۔

درس نظامی اور علم طب وغیرہ کی تحصیل کے بعد ۱۹۲۴ء کے پس وپیش حضرت حافظ صاحب اپنے وطن گوندلاں والا واپس تشریف لائے اور وہاں تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔ جس مدرسے میں انھوں نے یہ سلسلہ شروع کیا تھا، وہ مدرسہ عبداللہ ٹھیکیدار نے قائم کیا تھا، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور جو ان کے والد مولوی فضل دین کے عقیدت مند تھے۔

گوندلاں والا میں جن حضرات نے ان سے حصول علم کیا، ان کی تعداد تو ظاہر ہے، اچھی خاصی ہوگی، لیکن ان میں سے تین حضرات نے علمی وتدریسی حلقوں میں بڑی شہرت پائی اور وہ تین حضرات یہ ہیں:

Marfat.com

۱۔ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی: معروف مدرس اور ممتاز عالم دین، مختلف مدارس میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔ ۷۔مئی ۱۹۸۷ء (۸۔رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ) کو وفات پائی۔

۲۔ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: میدان علم وتحقیق کے میدان میں نہایت مشہور بزرگ ۲ اور ۳۔اکتوبر ۱۹۸۷ء کی درمیانی شب کو انتقال فرمایا۔

۳۔ مولانا حافظ محمد اسحاق: دراصل موضع حسین خاں والا (ضلع قصور) کے رہنے والے ہیں۔ متعدد مقامات کی مسانددرس پر متمکن رہے۔ آج کل جامعہ قدس (لاہور) میں فریضہ تدریس انجام دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے نوازے۔

حضرت حافظ محمد صاحب کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی مولانا فقیر اللہ مدراسی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ وہ خاتون حافظ عبداللہ شاہ پوری کی ہمشیرہ اور مشہور صحافی مصنف آباد شاہ پوری کی پھوپھی تھیں۔ آباد صاحب کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے۔

حافظ عبداللہ صاحب مرحوم عالی کردار اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات گوجراں والا میں ہوئی تھی۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں ہفت روزہ الاعتصام گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا اور میں اس سے منسلک تھا۔ وہ دفتر تشریف لائے اور مجھے ان کو نیازمندانہ سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد الاعتصام گوجراں والا سے لاہور منتقل ہوگیا تو یہاں بھی ان سے ملاقات کے مواقع میسر آتے رہے۔ اس وقت ان کے فرزند ارجمند جناب آباد شاہ پوری لاہور میں مقیم تھے۔ وہ بیٹے سے ملاقات کے لیے تشریف لاتے تو شیش محل روڈ پر دفتر الاعتصام میں بھی جاتے۔ مرحوم قدیم بزرگوں کی خوب صورت نشانی تھے۔ انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن آکر اندازہ ہوتا تھا کہ پرانے لوگ ہمدردی اور خلوص کا دل نواز پیکر تھے۔ افسوس ہے نئی نسل کو ان ہمہ اوصاف موصوف افراد سے زیادہ تعلق وتعارف نہیں ہے۔

اس عالی قدر خاندان کی نیک بخت خاتون سے حضرت حافظ صاحب گوندلوی کی چار اولادیں ہوئیں۔ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں۔ بیٹے کا نام عبداللہ تھا اور وہ حافظ قرآن تھے۔ نیک اور سنجیدہ طبیعت کے مالک......!

دوسری شادی ضلع گوجراں والا کے ایک گاؤں مرالیوالا میں ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ یہ گاؤں گوجراں والا سے چھ سات میل کے فاصلے پر گوجراں والا شیخوپورہ روڈ پر واقع ہے۔ اس شادی میں حضرت حافظ صاحب کے دو شاگرد بھی شامل تھے، وہ تھے مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی۔ یہ تمام حضرات یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں اور اب ان کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔ رحمهم الله تعالىٰ.

دہلی کے جن مدارس کو خاص طور سے شہرت حاصل ہوئی، ان میں ایک ''مدرسہ رحمانیہ'' تھا۔ اس مدرسے

Marfat.com

میں بہت سے مشہور اصحاب علم نے تدریسی خدمات سرانجام دیں اور بے شمار علما وطلبا نے ان سے استفادہ کیا اور پھر آگے چل کر تصنیف وتدریس کے شعبوں میں بڑا نام پایا۔ مدرسہ رحمانیہ کے ارباب انتظام نے ۱۹۲۷ء میں حضرت حافظ صاحب سے وہاں تشریف لے جانے کی درخواست کی اور اصرار کیا کہ وہ وہاں کے طلبا کو مستفید فرمائیں۔ چناں چہ انھوں نے مدرسہ رحمانیہ کا عزم فرمایا اور کچھ عرصہ وہاں قیام فرما رہے۔ اس وقت ان سے جن حضرات نے کسب فیض کیا، ان میں حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی اور مولانا نذیر احمد رحمانی کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔

مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ یوپی) سے تعلق رکھتے تھے اور اس خانوادۂ عالی مرتبت کے فرد فرید تھے، جس نے برصغیر میں علم حدیث کو بالخصوص مرکز التفات ٹھہرایا اور اس موضوع کے بہت سے گوشوں کو نکھارا اور منقح فرمایا۔ مولانا عبیداللہ رحمانی نے ۴۔ جنوری ۱۹۹۴ء (۲۱۔ رجب ۱۴۱۴ھ) کو وفات پائی۔

مولانا نذیر احمد رحمانی بھی اپنے عصر کے جلیل القدر عالم اور مدرس تھے۔ تصنیفی خدمات بھی انجام دیں۔ مدرسہ رحمانیہ دہلی اور جامعہ سلفیہ بنارس کی تدریسی مسانید پر فائز رہے۔ انھوں نے ۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ء (۲۸۔ محرم ۱۳۸۵ھ) کو یک شنبہ کے دن اپنے آبائی وطن املو (ضلع اعظم گڑھ) میں سفر آخرت اختیار کیا۔ ان کے معدے میں کینسر ہو گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں حضرت حافظ صاحب مرحوم کی خدمات دارالسلام عمر آباد (مدراس) کے اصحاب حل وعقد نے حاصل کر لیں۔ وہاں متعدد طلبا نے ان کے حضور زانوے شاگردی تہ کیا اور دولت علم سے بہرہ ور ہوئے۔

مدراس کی آب وہوا حضرت حافظ صاحب کو راس نہیں آئی، اس لیے بہ امر مجبوری انھیں وہاں سے وطن واپس آنا پڑا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ وہ واپس تشریف لے آئے تھے۔ غالباً تین سال وہاں قیام رہا۔ وہ گوندلاں والا سے مدراس گئے تھے۔ اس وقت گوندلاں والا میں جو حضرات ان کے حلقہ درس میں شامل تھے، ان میں مولانا حافظ محمد اسحاق (حسین خانوالہ، حال شیخ الحدیث جامعہ قدس، لاہور) کا اسم گرامی بھی آتا ہے، وہ ان کے ساتھ مدراس گئے تھے۔

اب ان کی خدمات مدرسہ محمدیہ (گوجراں والا) نے حاصل کر لی تھیں۔ یہ مدرسہ مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی نے ۱۹۲۱ء میں اس وقت جاری کیا تھا، جب وہ (حصول علم کے بعد) گوجراں والا کی جامع مسجد اہل حدیث میں بہ طور خطیب تشریف لائے تھے۔

میں ۱۹۴۰ء میں گوجراں والا میں حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس سے قبل فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے اکتساب علم کرتا تھا، جس کا ذکر اس مضمون میں تفصیل سے کیا

Marfat.com

گیا ہے جو میں نے مرحوم کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ وہ مضمون الاعتصام کے مولانا عطاء اللہ حنیف نمبر میں شائع ہوگا۔ زیر مطالعہ کتاب میں بھی مولانا ممدوح سے متعلق میری چند گزارشات مندرج ہیں۔

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، حضرت حافظ صاحب کی اولین زیارت کا شرف ۱۹۳۵ء میں حاصل ہوا تھا، جب کہ میں اس لیے ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا کہ انھیں مجھ سے بدبو نہ آئے۔ اب پانچ سال کے بعد میں ان کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ خیال اب بھی آیا کہ شاید میرے گناہوں کی وجہ سے ان کو مجھ سے بدبو آئے، کیوں کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی تھی، اسی نسبت سے روز بروز بلکہ لحہ بہ لحہ میں اچھا خاصا گنہگار ہوتا جاتا تھا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا کہ اتنے لوگوں میں جو ان کے قریب بیٹھے ہیں، تنہا میں ہی بدبودار نہیں ہوں، ان میں بھی کچھ لوگ بدبودار ہوں گے، انھیں کیسے پتا چلے گا کہ کس سے بدبو آرہی ہے۔ یہ ایک ایسا پہلو تھا جو مجھے حوصلہ دیتا اور ان سے قریب ہونے میں مددگار ثابت ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کو غور سے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی چلا گیا۔ اس وقت وہ ۴۳، ۴۴ سال کے ہوں گے۔ پورا قد، متوازن جسم، سرخی مائل گندمی رنگ، قدرے چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، ناک ذرا سی ابھری ہوئی، منہ پر مدھم سے چیچک کے داغ، چہرے پر پھیلی ہوئی سیاہ داڑھی میں کچھ سفید بال، شلوار قمیص اور شیروانی میں ملبوس۔ سردیوں میں بعض دفعہ اوورکوٹ بھی پہنتے تھے۔ یہ سردیوں کا موسم تھا اور گلے میں مفلر لپیٹا ہوا تھا، کلے پر مشہدی عمامہ، لبوں پر مسکراہٹ، نہایت باوقار شخصیت کے مالک۔ سرخ کھال کی جوتی پہنتے تھے جو خاص طور سے اس علاقے میں بنائی اور پہنی جاتی تھی۔ اس کے پنجے کچھ چھوٹے تھے۔ سادہ مگر صاف ستھرا لباس۔

اس وقت ان کی مستقل رہائش گوندلاں والا میں تھی۔ صبح وقت مقررہ پر گوجراں والا پہنچ جاتے۔ سائیکل پر آتے تھے۔ ان کی تشریف آوری سے پہلے طلبا اپنی اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے۔ جونہی وہ دروازے میں داخل ہوتے، دو کشمیری طلبا میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھتا اور ان کا سائیکل پکڑ کر مناسب جگہ پر رکھ دیتا۔ ان طلبا میں سے ایک کا نام سرور شاہ اور دوسرے کا فضل شاہ تھا، یعنی دونوں شاہ تھے۔ حافظ صاحب کپڑے سے پاؤں جھاڑتے اور دو رکعت پڑھ کر مسند پر آجاتے۔ بالعموم باوضو رہتے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے تک مسند درس پر تشریف فرما رہتے۔ دوران درس نہ اپنی جگہ سے اٹھتے اور نہ کسی سے کوئی بات کرتے۔ اگر کوئی شخص کسی کام سے ان کی خدمت میں آتا تو خاموشی سے بیٹھ جاتا۔ وہ نہ اس سے مخاطب ہوتے، نہ اسے بات کی جرات ہوتی۔ درس سے فارغ ہوکر اس سے ہم کلام ہوتے اور خیروعافیت پوچھتے۔

میں نے گوجراں والا جا کر ان سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، تفسیر بیضاوی اور تفسیر جلالین شروع کی تھیں۔ اصول حدیث، لغت و معانی، فلسفے اور منطق کی بعض کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ جو طلبا

Marfat.com

میرے ہم درس تھے، ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے:

مولانا محی الدین لکھوی، مولانا محمد افضل (بورے والا) میاں محمد باقر مرحوم کے بڑے بیٹے حافظ محمد زکریا مرحوم، مولانا خالد گھر جاکھی، حافظ عبداللہ (جو حضرت حافظ صاحب کے قریبی رشتے دار تھے اور غالباً ضلع گوجراں والا کے قصبے لدھے والا وڑائچ کے رہنے والے تھے) سرور شاہ کشمیری اور فضل شاہ کشمیری۔

حضرت استاذ کا اسلوب درس حدیث اپنے اندر انفرادیت بھی رکھتا تھا اور بے حد جاذبیت بھی۔ وہ انتہائی وقار اور تمکنت کے مالک تھے اور اسی وقار اور تمکنت سے مسند تدریس پر بیٹھتے اور طلبا کو پڑھاتے تھے۔ بخاری شریف میں ایک مہینے سے زیادہ عرصہ حجیت حدیث، اتباع حدیث، صحیح بخاری کی شرائط صحت حدیث، امام بخاری کے مقام و مرتبہ کی تعیین اور دیگر محدثین سے ان کے امتیاز وغیرہ امور کی وضاحت میں صرف ہو جاتا۔ وہ بڑی روانی اور صفائی سے درس دیتے تھے۔ ان کے ارشادات انتہائی احتیاط اور توجہ سے سننے کی ضرورت تھی۔ آسان زبان اور عام فہم انداز میں ان کے لیے بات کرنا بہت مشکل تھا، وہ مشکل کلام تھے۔ خالص علمی انداز میں تقریر فرماتے تھے۔ بعض دفعہ بعض طلبا ان کی بات بالکل نہیں سمجھ پاتے تھے، بس بیٹھے سنتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ارشاد الحق اثری نے مولانا ابوالبرکات احمد کے حوالے سے حضرت حافظ صاحب کا عجیب لطیفہ سنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا:

''اسلام کا کیا مطلب ہے؟''

فرمایا: ''انقیاد ظاہری و باطنی کا نام اسلام ہے۔''

وہ شخص کہتا ہے کہ اسلام کو تو میں تھوڑا بہت سمجھتا ہی تھا، لیکن اس کا مطلب بالکل نہیں سمجھ پایا۔

یہ تھا حافظ صاحب کا اسلوب کلام اور انداز تفہیم۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا نہج کلام بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ بھی حافظ صاحب کی طرح نہایت مشکل پسند اور دقیق الکلام تھے۔ میں مولانا سے کہا کرتا تھا کہ کچھ تو آپ موضوع کلام مشکل منتخب کرتے ہیں کچھ اس کی وضاحت میں مشکلات کی زنجیریں ڈالتے جاتے ہیں۔

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ دیوانہ بنا دیتے ہیں

جس طرح حافظ صاحب کے متن سے اس کی شرح مشکل ہوتی تھی، یہی معاملہ مولانا حنیف ندوی کا تھا۔ میں اس ضمن میں ان سے کچھ عرض کرتا تو مسکراتے ہوئے فرماتے: مولوی اسحاق یہ انداز علمی ہے۔ میں بھی اسی لہجے میں جواب دیتا کہ یہ انداز مغلقی ہے۔ آپ سے سنی ہوئی بات ہم کسی دوسرے کو نہیں سمجھا سکتے۔ خود سمجھیں تو دوسروں کو سمجھائیں۔ اس طرح حکم پیغمبر فلیبلغ الشاھد الغائب پر عمل نہیں ہوسکتا، جس کے

Marfat.com

گناہ ثواب کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔

بعض اوقات مولانا محمد اسماعیل صاحب کی غیر موجودگی میں حضرت حافظ صاحب خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔لیکن بڑی مشکل سے ان کی پانچ فی صد باتیں لوگوں کی سمجھ میں آتی ہوں گی۔

بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کوئی لڑکا عبارت پڑھنا شروع کر دیتا،لیکن اگر وہ اٹک اٹک کر پڑھتا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا تو اسے یہ نہیں کہتے تھے کہ تم نہ پڑھو، بلکہ فرماتے کوئی تیز پڑھنے والا پڑھے۔ چند طالب علم تیز بھی پڑھتے تھے اور اللہ کے فضل سے بالکل صحیح بھی، ان میں مولانا محی الدین لکھوی، مولوی محمد افضل، حافظ محمد زکریا اور ان سطور کا راقم عاجز شامل تھے۔ بحمد اللہ ہمارا اسلوب قرات حضرت استاذ کے مزاج گرامی کے عین مطابق تھا اور ہمیں یہ شرف حاصل ہے کہ وہ ہم پر بہت خوش تھے۔اس کا وہ زبان سے اظہار نہیں فرماتے تھے،لیکن ان کے چہرے کی بشاشت اور آنکھوں کی چمک سے اس کی وضاحت ہو جاتی تھی۔بعض اوقات بے زبانی بھی زبان کا کام دیتی ہے۔

اگر کسی طالب علم کو کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو اس کے پوچھنے پر بتاتے۔ پھر بھی اس کو اطمینان نہ ہوتا تو تھوڑا سا انداز بدل کر دوبارہ سمجھاتے۔اگر اب بھی سمجھنے سے قاصر رہتا تو فرماتے چلو آگے پڑھو۔ایسے موقع پر ”چلو آگے پڑھو“ کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اسے یہ بات سمجھ نہیں آئے گی اور یہ اس قابل نہیں ہے کہ مزید سمجھانے میں وقت ضائع کیا جائے...... ساڑھے بارہ بجے کے بعد کبھی کبھی وہ تھوڑا سا لیٹ جاتے۔

بعض اوقات دوران درس نہایت سادہ زبان اور خالص مقامی بولی میں بات کرتے اور وہی الفاظ استعمال کرتے جو وہاں کے عوام کرتے ہیں، مثلاً روٹی کے ٹکڑے کو کہتے ”ٹکر“ گوجراں والا کی گھریلو زبان میں نوالے کو ”گراں“ کہا جاتا ہے۔اگر کوئی اس قسم کی بات اثنائے درس میں آجاتی تو فرماتے ”گراں“......

ظہر کی نماز عام طور پر وہی پڑھاتے۔کھانا گھر سے کھا کر آتے تھے۔ میں دو سال ان کی خدمت میں رہا، مجھے یاد نہیں کہ اس اثنا میں ان کو گوجراں والا میں کوئی چیز کھاتے یا پیتے دیکھا ہو۔

تفسیر، حدیث، فقہ، عربی، ادبیات، فلسفہ، منطق، معانی وبیان اور صرف ونحو وغیرہ علوم متداولہ ومروجہ میں ان کو یکساں عبور حاصل تھا۔یعنی منقولات ومعقولات دونوں اصناف علم پر ان کی گہری نظر تھی۔کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو پتا چلتا کہ اس کے تمام پہلوؤں پر ان کی پوری گرفت ہے۔ ذہانت وفطانت اور وسعت علم میں اس صدی کا کوئی معروف عالم ان کا حریف نہ تھا۔

مسئلے کی وضاحت کرتے وقت کبھی ان کے کلام میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔کوئی شرعی مسئلہ پوچھیے، کسی علمی معاملے کی عقدہ کشائی کے لیے ان کے باب تحقیق پر دستک دیجیے، فوراً جواب ملتا اور مسئلہ منقح ہو جاتا۔ دو

Marfat.com

سال یہ فقیر ان کے حلقہ درس میں حاضر رہا، اس اثنا میں صرف ایک دفعہ ایسا ہوا کہ صحیح بخاری کے درس میں کسی مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے کوئی بات کہی اور پھر اسی لمحے فرمایا: نہیں اصل معاملہ یوں ہے۔ یعنی کسی سلسلے میں ذرا سی سبقت لسانی ہوئی، پھر فوراً احساس نے کروٹ لی اور زبان نے پلٹا کھایا اور اصل معاملے کی طرف مراجعت فرما ہوئے۔ اقلیم علم کے تمام گوشوں پر ان کی حکمرانی تھی اور زبان کو حرکت دیتے تو اندازہ ہوتا تھا کہ شروح ورجال کی بڑی بڑی کتابیں جنھیں ''امہات الکتب'' کہنا چاہیے، ان کو زبانی یاد ہیں۔ تعلیم دن میں دو وقت ہوتی تھی۔ نماز ظہر سے کچھ دیر پہلے تک اور پھر ظہر کے بعد عصر تک۔

گوجراں والے کے جس مدرسے کا ذکر ہو رہا ہے، اس کا نام مدرسہ محمدیہ تھا اور یہ مدرسہ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ۱۹۲۱ء میں جاری کیا تھا، جب کہ وہ مدرس وخطیب کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے تھے۔ جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، اس وقت اس کے قیام پر بیس برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور اس اثنا میں سینکڑوں حضرات اس سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

جہاں یہ مدرسہ قائم تھا، اس محلے کا نام ''نیائیں'' تھا۔ وہاں صبح صبح ''ہاتو'' روٹیاں اور سالن فروخت کرنے کے لیے آجاتے تھے۔ آنے کی دو روٹیاں اور شلغم کا سالن مفت۔ شلغم کو گوجراں والے کے لوگ ''ساگ'' کہتے تھے۔ میں اور میرے دوست مولوی محمد افضل (بورے والا) صبح کے وقت کبھی دو دو روٹیاں اور ساگ لے آتے اور کبھی حلوہ پکا لیتے۔ حلوے پر دو آنے خرچ ہوتے تھے اور ہمارے لیے یہ کافی ہوتا تھا، لیکن یہ سلسلہ ہر روز نہیں چلتا تھا۔

حلوہ پکانے میں افضل صاحب بڑے ماہر تھے، چند منٹ میں حلوہ باورچی خانے میں تیار کر لیتے تھے۔

بہرحال اس طرح دن گزرتے گئے اور ہم اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق حضرت حافظ صاحب اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سے استفادہ کرتے رہے۔

حضرت حافظ صاحب سے میں نے جو کتابیں پڑھیں، ان میں سے چند کتابوں کا ذکر گزشتہ سطور میں کر دیا گیا ہے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سے جن کتابوں کا درس لیا، اس کی مناسب تفصیل ان گزارشات میں ملاحظہ فرمایے جو حضرت مولانا مرحوم کے بارے میں ضبط تحریر میں لائی گئی ہیں۔ یہاں جی چاہتا ہے کہ اس وقت کے چند ہم درس طالب علم دوستوں کا ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ حافظ محمد زکریا مرحوم: یہ ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ۔ب کے رہنے والے تھے۔ یہ گاؤں منڈی تاندلیاں والا سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ طور برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد گرامی کا نام میاں محمد باقر تھا جو نہایت متقی بزرگ تھے اور

Marfat.com

اچھے خاصے زمیندار۔ انھوں نے اپنے گاؤں میں بھی ایک مدرسہ جاری کر رکھا تھا جو اب بھی جاری ہے۔ وہ بہت سے نادار لوگوں کی کفالت کرتے اور ان کو مالی امداد دیتے تھے۔

۲۔ مولانا محی الدین لکھوی: میں نے خود مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) میں جہاں یہ اقامت گزیں تھے، دیکھا ہے کہ ان کے گھر مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ روزانہ کم از کم بیس پچیس مہمانوں کا دو وقت کا کھانا پکتا تھا۔ اچھی خاصی زمین جائیداد کے مالک تھے۔ پاکستان میں بھی ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے۔ مولانا معین الدین لکھوی سابق ایم این اے کے بڑے بھائی ہیں۔ خود بھی قیام پاکستان کے بعد ایم پی اے رہے ہیں۔ دیپال پور (ضلع اوکاڑہ) کے قریب ایک گاؤں میں مقیم ہیں۔ گوجراں والا کے مدرسہ محمدیہ میں صرف دو مہینے رہے۔ عیدالاضحیٰ کی چھٹیوں پر گھر گئے، پھر واپس گوجراں والا نہیں آئے۔ اس عاجز پر اس گھرانے کے بہت احسانات ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جا سکتا۔ مولانا محی الدین سے بھی میرے پرانے مراسم ہیں اور ان کے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی لکھوی بھی میرے انتہائی مشفق تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی بھی میرے دوست اور مہربان ہیں۔

۳۔ نیاز اللہ خاں: ہمارے جانے سے دو سال پہلے فارغ ہو چکے تھے، لیکن وہیں رہ کر مزید استفادہ کر رہے تھے۔ ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے اور وہاں کی راجپوت برادری کے سرگرم رکن ہیں۔ کبھی کبھی ان سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہے۔

۴۔ محمد افضل: ضلع فیروز پور کی ریاست ممدوٹ کے ایک گاؤں (چک مولوی والا) کے رہنے والے تھے۔ مولوی عبدالعزیز سابق چیف جسٹس ریاست فرید کوٹ کے بھانجے تھے۔ ان کے تایا میاں محمد حسین فیروز پور میں سرکاری ملازم تھے۔ والد کا اسم گرامی عبدالقادر تھا۔ وہ ایک سرکاری سکول میں مدرس تھے۔ ارائیں برادری کے صاحب ثروت خاندان سے متعلق تھا۔ تکمیل تعلیم کے بعد ایک ہائی سکول میں ٹیچر مقرر ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد بورے والا (ضلع وہاڑی) میں آ بسے تھے۔ آج کل وہیں ہیں، وہاں ایک سکول جاری کیا ہے۔ میرے مخلص دوست ہیں۔ ان سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

۵۔ مولانا خالد گھرجاکھی: اس وقت بھولی بھالی سی شکل وصورت کے نوجوان تھے۔ اب بابا بن گئے ہیں۔ جماعت اہل حدیث کے معروف واعظ ومناظر مولانا نور حسین گھرجاکھی کے صاحب زادے۔ گھرجاکھ کے رہنے والے جو اس زمانے میں گوجراں والا کے قریب ایک بستی تھی۔ اب شہر کا ایک محلہ ہے۔ کھاتے پیتے گھر کے فرد...... ان کے بڑے بھائی راسخ عرفانی مرحوم اردو کے بہت اچھے شاعر تھے، جن کے شعروشاعری کے آٹھ دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ خود خالد گھرجاکھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

Marfat.com

جماعت اہل حدیث کے معاملات میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ گھر جاکھ ہی میں اقامت گزیں ہیں۔ مجھ سے خالد گھر جاکھی کے ہمیشہ پرخلوص مراسم رہے۔ کہیں نہ کہیں ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے رکھے۔ ان کے بڑے بھائی میرے بزرگ دوست تھے، لاہور تشریف لاتے تو مجھ سے ملنے کی کوشش کرتے۔

۶۔ حافظ عبداللہ: یہ استاد محترم حضرت حافظ محمد صاحب کے قریبی عزیز تھے۔ غالباً لدھے والا وڑائچ کے رہنے والے تھے جو گوجراں والا سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دبلے پتلے، نیک اور خاموش طبع نوجوان تھے۔ ۱۹۴۱ء کے بعد ان سے ملاقات تو صرف دو دفعہ ہوئی، لیکن ان کی نیکی کا اثر ذہن پر ہمیشہ رہا۔ اس زمانے میں مروجہ نصاب کی انتہائی کتابیں پڑھتے تھے۔

۷۔ محمد ابراہیم: یہ دراصل افضل صاحب کے ''مرید'' تھے۔ اونچے قد کے نوجوان تھے اور ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔ ہمارے کھانے کا معاملہ ان کے سپرد تھا۔ کسی کو زکام ہوگیا یا کوئی اور تکلیف ہوگئی تو یہ فوراً کوئی نہ کوئی دوا تجویز کر دیتے۔ اس لیے افضل صاحب نے ان کو ایک دو مرتبہ ڈاکٹر کہا اور پھر سب طلبا انھیں ڈاکٹر کہنے لگے۔ غالباً ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) سے تعلق تھا۔ ۱۹۴۱ء کے بعد ان سے ملاقات کا موقع نہیں ملا، یہ ہمارے ہم درس نہیں تھے، ہم مکتب تھے، ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے احباب تھے، لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ان میں سے اکثر کے ساتھ میل جول کا سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔

بہر حال وہ ایک دور تھا جو گزر گیا۔ میری عمر اس وقت سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ یہ میرا مروجہ درس نظامی کا آخری سال تھا۔

استاذ مکرم حضرت حافظ صاحبؒ کئی سال گوجراں والا کے مدرسہ محمدیہ کی مسند تدریس پر متمکن رہے اور اس اثنا میں بے شمار علما وطلبا نے ان سے کسب فیض کیا۔ یہ فقیر بھی ان کے حلقہ درس میں شریک رہا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ان سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، تفسیر بیضاوی، تفسیر جامع البیان، سراجی، شرح عقائد اور فلسفہ ومنطق وغیرہ علوم متداولہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ میں نے ان کی زبان مبارک سے کسی شاگرد اور طالب علم کو صیغہ واحد سے مخاطب ہوتے ہوئے نہیں سنا۔ ہمیشہ صیغہ جمع استعمال فرماتے۔

اب حالات یکا یک پلٹا کھاتے ہیں اور ان کی ذات گرامی اچانک ایک انتہائی اذیت ناک انقلاب کی زد میں آجاتی ہے۔ اس کی جس روداد کا مجھے علم ہوا ہے، وہ چند الفاظ میں یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۹۴۲ء کی بات ہے کہ گوندلاں والا میں ایک شخص عبداللہ ٹھیکیدار کا بھتیجا عبدالعزیز سانپ کے ڈسنے

Marfat.com

سے وفات پا گیا۔ حضرت حافظ صاحب کو اس کا جنازہ پڑھانے کے لیے عرض کیا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا کہ وہ بے نماز تھا۔ حافظ صاحب اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ عبداللہ ٹھیکیدار کا ایک اور بھتیجا عبداللطیف تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ گوندلاں والا اور اس کے قرب وجوار میں عبداللطیف کافی اثر ورسوخ رکھتا تھا۔ اس نے مسجد کے دروازے پر کھڑا ہو کر حافظ صاحب کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس وقت حافظ صاحب کے بعض عقیدت مند وہاں موجود تھے اور وہ تھے برکت کشمیری، اسماعیل، عبدالاحد اور احمد الدین۔ انھوں نے عبداللطیف کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں رکا اور معاملہ بڑھ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللطیف اور اس کا ایک دوست جو سید تھا قتل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آ گئی۔ حافظ صاحب اور برکت کشمیری تو کہیں چلے گئے، لیکن دوسرے لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو پتا چلا تو انھوں نے حافظ صاحب کی ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کی کوشش کی۔ بہرحال حافظ صاحب، عبدالاحد، اسماعیل اور برکت کشمیری پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا۔

حضرت حافظ صاحب کئی مہینے جیل میں رہے۔ ان کے وکیل میاں عبدالعزیز مالواڈہ تھے۔ آخر سیشن کورٹ میں بری ہو گئے۔ عبدالاحد اور اسماعیل کو موت کی سزا ہوئی اور انھیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ملزموں نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ حافظ صاحب کا قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے، قتل کا ارتکاب خود انھوں نے کیا ہے۔ برکت بھی قتل کا ملزم تھا، عدالت نے اسے بھی پھانسی کی سزا سنائی تھی، لیکن وہ مفرور تھا، اس لیے پھانسی سے بچ گیا تھا۔

مقدمہ قتل سے بری ہونے کے بعد حضرت حافظ صاحب گوندلاں والا سے گوجراں والے آ گئے تھے اور وہیں آبادی حاکم رائے میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ گوندلاں والے نہیں گئے۔

چلتے چلتے برکت کے بارے میں بھی چند باتیں سنتے جایئے جو مجھے بعض لوگوں سے معلوم ہوئی ہیں...... وہ یہاں سے بھاگ کر سعودی عرب چلا گیا تھا اور وہاں محنت مزدوری کرنے لگا تھا...... ایک دفعہ حج کے دنوں میں اس نے دیکھا کہ عبداللطیف کی والدہ حج کے لیے آئی ہیں، وہ ان کا رشتے دار تھا۔ دوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور نہایت عاجزانہ لہجے میں معافی کی درخواست کی۔ وہ بیٹے کے قاتل کو دیکھتے ہی غش کھا کر زمین پر گری اور مر گئی۔

یہ بات مجھے ایک دوست نے بتائی تھی، معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

اب آگے چلیے...... سنا تھا کہ برکت نے محنت مزدوری کر کے چھبیس سو روپے کمائے تھے۔ اس کے قیام سعودی عرب کے دور میں جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار، فیصل آباد) کے امام مولانا عبدالواحد صاحب حج بیت اللہ کے لیے گئے تو برکت کی ان سے ملاقات ہوئی۔ برکت نے یہ رقم ان کے حوالے کی اور کہا کہ وہ اسے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمت میں پیش کر دیں اور ان سے کہہ دیں کہ اپنی صواب

Marfat.com

دید کے مطابق وہ جہاں چاہیں خرچ کر دیں۔ چناں چہ مولانا عبدالواحد نے یہ امانت مولانا عطاء اللہ صاحب کو دے دی۔ اپریل ۱۹۵۵ء کو فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے یہ رقم جامعہ کے فنڈ میں جمع کرادی۔ اس طرح یہ برکت کا صدقہ جاری ہوا، جس کا اسے ہمیشہ ثواب ملتا رہے گا۔ اس زمانے میں چھبیس سو روپے کی رقم بہت بڑی رقم تھی۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد برکت پاکستان آ گیا تھا۔ میں اور مولانا عطاء اللہ صاحب مرحوم ومغفور ایک مرتبہ کسی جماعتی سلسلے میں فیصل آباد گئے تو جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار) میں وہ مولانا سے ملا اور دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

میں اسے نہیں جانتا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو مولانا نے بتایا کہ یہ برکت ہے اور فیصل آباد کے کسی گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ اپنے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتاتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ پولیس کو پتا چل گیا تو پکڑا جائے گا۔

اس کے بعد کیا ہوا......؟ پتا چلا تھا کہ اس نے صوبہ سرحد میں ہری پور (ہزارہ) کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں کسی بیوہ عورت سے نکاح بھی کر لیا تھا...... کچھ عرصے کے بعد اس نے بیوی کے سامنے اپنا راز اگل دیا اور اسے بتا دیا کہ اتنے سال قبل اس نے قتل کا ارتکاب کیا تھا۔ اب وہ مفرور ہے...... اس پر کچھ مدت گزری تھی کہ کسی معاملے میں دونوں میاں بیوی جھگڑ پڑے...... بیوی نے غصے میں آ کر پولیس کو اطلاع دے دی اور وہ پکڑا گیا عدالت نے اسے دس سال کی سزا سنائی۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جہلم کے سیشن جج اس وقت مشہور ناشر و تاجر شیخ محمد اشرف مرحوم کے بھائی شیخ محمد شفیع تھے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم ومغفور نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اور برکت بری ہو گیا۔

اس کی وفات پر طویل مدت گزر چکی ہے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اس مقدمے میں حضرت حافظ صاحب کی بہت مدد کی تھی اور میاں عبدالعزیز صاحب کو انہی نے وکیل مقرر کیا تھا۔ میاں صاحب نے یہ مقدمہ بغیر فیس کے لڑا تھا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت حافظ صاحب کی خدمات صوفی عبداللہ مرحوم نے اوڈاں والا چک نمبر ۴۹۳ کے لیے حاصل کر لی تھیں۔ صوفی صاحب مرحوم جماعت اہل حدیث کے معروف بزرگ تھے، جنھوں نے ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں اوڈاں والا میں مدرسہ جاری کیا تھا۔ اچھا خاصا مدرسہ تھا جو کئی سال پیشتر ماموں کانجن منتقل ہو گیا تھا۔ تاہم اس کا ایک حصہ اوڈاں والا میں بھی قائم تھا۔

اس مدرسے کا نام دارالعلوم تعلیم الاسلام ہے۔ اس میں متعدد اساتذہ نے خدمات تدریس انجام دیں اور بے شمار علما و طلبا نے اس میں علم حاصل کیا اور کر رہے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب بھی اس میں دو سال قیام فرما

Marfat.com

رہے اور اس اثنا میں اہل علم کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا۔

اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) سے وہ گوجراں والا تشریف لے آئے اور وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے ''ٹاہلی والی مسجد'' کہا جاتا ہے، سلسلہ درس شروع فرمایا۔ وہاں وہ منتہی طلبا کو مختلف فنون کی بعض انتہائی کتابیں پڑھاتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں یہ فقیر الاعتصام کے اجرا کے بعد گوجراں والے گیا۔ اس وقت حضرت حافظ صاحب وہاں طبابت کرتے تھے اور ان کا مطب جامع مسجد اہل حدیث کے بڑے دروازے کے بالمقابل تھا۔ میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی بھی تشریف لے جاتے تھے۔ میں ان سے الاعتصام کے لیے مضامین کی درخواست بھی کرتا تھا۔ وہ کبھی کبھی کسی موضوع پر مضمون عنایت کر دیتے تھے۔ گفتگو میں ان کے چہرے پر مسکراہٹ طاری رہتی تھی۔ ہنسی اور قہقہے سے ان کا پر شکوہ وقار اور پر جلال متانت کبھی آشنا نہیں ہوئے۔ میں ان کے بالکل قریب بیٹھ کر معروضات پیش کرتا تھا۔ وہ نہایت توجہ سے سماعت فرماتے تھے۔ مجھے احساس ہوتا تھا کہ اب انھیں مجھ سے بدبو نہیں آتی تھی، حالاں کہ اب گناہ بہت بڑھ گئے تھے۔

۱۹۵۰ء کے پس وپیش گوجراں والا میں حاجی محمد ابراہیم انصاری مرحوم کی کوشش سے جامعہ اسلامیہ کے نام سے ایک دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ حاجی صاحب مرحوم کی درخواست پر حضرت حافظ صاحب وہاں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ اس دارالعلوم میں دوسرے استاذ گرامی حضرت کے لائق شاگرد مولانا البرکات احمد تھے۔ یہاں ۱۹۵۶ء تک چھ سال حضرت کی مسند تدریس آراستہ رہی۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں مرکزی جمعیت اہل حدیث نے جامعہ سلفیہ قائم کیا۔ فیصلہ ہوا کہ وہاں کی مسند شیخ الحدیث پر حضرت حافظ صاحب کو متمکن کیا جائے، چناں چہ اکابر جمعیت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عطاء اللہ حنیف نے جامعہ اسلامیہ (گوجراں والا) کے منتظم حاجی محمد ابراہیم سے گفتگو کی اور کہا کہ وہ حضرت حافظ صاحب کی خدمات جامعہ سلفیہ کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چناں چہ حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ غالباً ۱۹۶۲ء تک جامعہ سلفیہ میں ان کا سلسلہ فیض جاری رہا۔ پھر واپس گوجراں والا آ گئے تھے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ''حضرت العلام'' کا لفظ حضرت کے لیے سب سے پہلے اس فقیر نے الاعتصام میں لکھا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ حضرت حافظ صاحب سے کسی صاحب نے تحریری سوال کیا تھا کہ قربانی کی کھالیں جماعت اسلامی کے گشتی شفا خانے کو دی جائیں یا غربا و مساکین کو؟

اس وقت اخبار الاعتصام گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا۔ حافظ صاحب نے اسی کے ذریعے جواب

Marfat.com

دیا کہ یہ غربا و مساکین کا حق ہے، انھی کو ملنا چاہیے۔ اس پر اخبار کوثر میں ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے جذباتی سے انداز میں اعتراض کیا۔ میں نے الاعتصام میں حضرت کا دفاع کرتے ہوئے ان کے لیے ''حضرت العلام'' لکھا۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ اس سے قبل یہ لفظ ان کے لیے کسی نے نہیں لکھا تھا۔

۱۹۵۶ء میں مدینہ منورہ میں سرکاری سطح پر مدینہ یونیورسٹی (الجامعہ الاسلامیہ) قائم ہوئی تو اس کے شیخ الحدیث عالم اسلام کے معروف عالم ناصر الدین البانی کو بنایا گیا تھا۔ جب وہ واپس شام چلے گئے تو جامعہ کے وائس چانسلر شیخ عبدالعزیز بن باز نے حضرت صاحب کی خدمت میں جامعہ کے ایک محترم استاذ کو بھیجا اور جامعہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ چناں چہ حضرت نے دعوت منظور فرمائی اور کچھ عرصے کے لیے یہاں تشریف لے گئے۔

حافظ صاحب کے ایک شاگرد حافظ فتح محمد عرف فتحی بیان کرتے ہیں کہ مدینہ یونیورسٹی میں قیام کے دوران ایک دفعہ کسی اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کے دوران جامعہ کے ایک اور استاد محمد امین شنقیطی نے، جو کہ تفسیر اضواء البیان کے مولف ہیں اور یہ تفسیر بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے حافظ صاحب سے چند روایات دریافت فرمائیں، حافظ صاحب نے بڑے وثوق سے فرمایا کہ یہ روایات جامع ترمذی میں آتی ہیں۔ شیخ شنقیطی نے انکار کیا اور کہا کہ یہ روایات ترمذی شریف میں موجود نہیں، دیگر شرکائے مجلس نے ان کی تائید کی، جس پر حافظ صاحب نے اپنے موقف پر اصرار فرمایا اور ساری روایات ایک ایک کر کے ترمذی شریف سے دکھا دیں۔ اس پر شیخ امین شنقیطی پکار اٹھے۔ ''ما رایت اعلم علیٰ وجه الارض من هذا الشيخ'' کہ میں نے روئے زمین پر آج تک ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔

وہاں کے علما و طلبا نے ان کے علم و فضل سے خوب استفادہ کیا۔ ان کا زیادہ عرصہ وہاں رہنا مشکل تھا، لہٰذا کچھ مدت کے بعد واپس گوجراں والا تشریف لے آئے۔

مدینہ منورہ سے واپس آ کر بھی انھوں نے سلسلہ تدریس جاری رکھا اور طلبا ان سے برابر استفادہ کرتے رہے۔

آزادی سے قبل کا دور ہندوستان میں انتہائی سرگرم سیاست کا دور تھا۔ پنجاب میں جو علاقے اور شہر کسی زمانے میں سیاست کا مرکز رہے اور جہاں بہت سے سیاست دان پیدا ہوئے، ان میں ضلع اور شہر گوجراں والا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علاقے کے علمائے کرام نے بھی سیاست میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ گوجراں والا شہر ہی میں حضرت حافظ صاحب سے خاص تعلق رکھنے والے اکابر علما میں سے مولانا محمد اسماعیل صاحب، قاضی عبدالرحیم صاحب، مولانا عبدالواحد اور مولانا محمد چراغ صاحب اس میں بڑے تیز رو تھے۔ یہ بزرگان عالی مقام سیاست ملکی کے اس محاذ سے وابستہ تھے جو مسلم لیگ کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہ تھا۔ ان حضرات نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور آزادی وطن کے لیے جیلوں میں گئے اور سزائیں کاٹیں، لیکن حضرت

Marfat.com

حافظ صاحب کبھی عملی سیاست کے میدان میں نہیں اترے اور نہ یہ ان کا موضوع تھا۔ البتہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں وہ سیاسیات میں مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات کو مبنی برصحت قرار دیتے تھے۔ دوران درس میں وہ سیاسی نوعیت کی کوئی بات نہیں کرتے تھے، لیکن اگر درس سے قبل یا بعد کوئی طالب علم اس موضوع کے کسی پہلو سے متعلق کوئی بات کرتا تو اسی قسم کا جواب ارشاد فرماتے جو حضرت مولانا آزاد کے زاویہ فکر کا موید ہوتا، لیکن جواب نہایت مختصر الفاظ میں دیتے۔ اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

ایک دن حضرت کی تشریف آوری سے پہلے ایک صاحب اخبار پڑھ رہے تھے۔ اس میں ایک تصویر تھی، جس میں دکھایا گیا تھا کہ مولانا آزاد سے چند خواتین کوئی بات دریافت کر رہی ہیں۔ افضل صاحب جن کا گزشتہ سطور میں تعارف کرایا گیا ہے، خاندانی اور ذاتی طور سے مسلم لیگ کے حامی تھے۔ انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے کچھ اس مفہوم کے الفاظ کہے کہ مولانا آزاد عورتوں میں بیٹھے ہیں۔ یہ نامناسب بات ہے۔

حضرت نے فرمایا: ''اس میں مولانا کا کیا قصور ہے؟ وہ عورتوں کو گھروں سے بلا کر تو نہیں لائے۔ وہ نہ آئیں اور ان سے بات نہ کریں۔''

اسی طرح کسی نے جمعیت علمائے ہند کی سیاست پر کچھ تنقید کی تو فرمایا: ''ان کی سیاست کو کیا ہوا ہے۔ ملکی حالات کے مطابق ان کی سرگرمیاں جاری ہیں۔''

زعمائے احرار کے بارے میں ایک دو مرتبہ انھوں نے اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا۔ وہ کھل کر اور واضح طور سے سیاسی معاملات کا ذکر نہیں فرماتے تھے، بس اسی نوع کی باتیں کرتے تھے اور ان کے لہجے اور طرز کلام سے ان کے سیاسی افکار کی نشان دہی ہو جاتی تھی۔

بعض حضرات نے قیام پاکستان سے کئی سال بعد انھیں گوجراں والا شہر کی مسلم لیگ کا صدر بنا دیا، اور یہ وہ زمانہ تھا جب خود مسلم لیگ کے بہت سے مشہور ارکان جنھوں نے اس کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا تھا، اس سے علیحدہ ہو چکے تھے اور انھوں نے اپنی الگ سیاسی جماعتیں قائم کر لی تھیں۔ مثلاً حسین شہید سہروردی، نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ، اور میاں عبدالباری وغیرہ حضرات نے جناح عوامی لیگ بنالی تھی۔ اس سے کچھ عرصے بعد چوہدری محمد علی (سابق وزیراعظم پاکستان) اور مولوی فرید احمد وغیرہ بزرگوں نے نظام اسلام پارٹی کا ڈھانچا کھڑا کر لیا تھا۔ اس پارٹی میں پنجاب کے متعدد معروف لوگ شامل ہو گئے تھے، جن میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ کے خاندان کے حضرات کے نام بھی آتے ہیں۔

بہرحال بعض الناس کی کوشش سے حافظ صاحب کو مقامی مسلم لیگ کا صدر بنا لیا گیا۔ حافظ صاحب کو کسی ادارے یا جماعت کے انتظامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ شہر کی مسلم لیگ کے مردہ گھوڑے کے منہ میں

Marfat.com

لگام کیوں کر ڈال سکتے تھے۔ چند روز صدر رہے اور پھر معاملہ ختم......!

مولانا آزاد کا ذکر حضرت حافظ صاحب بڑے پیار سے کرتے تھے اور ان کے بعض فقہی نوعیت کے رجحانات کی طرف بھی دلچسپ انداز میں اشارہ فرما جاتے تھے۔ ایک دن فرمایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اہل حدیث تھے اور غیر مقلد تھے لیکن اس کے باوجود بسا اوقات نماز میں رفع الیدین نہیں کرتے تھے۔

حافظ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ اہل حدیثیت آمین اور رفع الیدین وغیرہ چند مسائل کا نام ہی نہیں ہے۔ یہ مسلک اور بھی بہت سے امور کا متقاضی ہے، ان پر بھی عمل کرنا چاہیے۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کی پہلی میٹنگ میں بھی شامل تھے اور اس کی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے۔ چند میٹنگوں میں شرکت بھی فرمائی۔ اس سے تقریباً بیس سال بعد (۲۰۔فروری ۱۹۶۸ء کو) مولانا محمد اسماعیل صاحب نے وفات پائی تو ان کی جگہ حضرت حافظ صاحب کو جمعیت کے امیر مقرر کر لیا گیا تھا، لیکن یہ بھی ان کے لیے کوئی اعزاز کی بات نہ تھی۔ نظم ونسق کے معاملات سے انھیں کوئی علاقہ نہ تھا، اس لیے ان کو اس قسم کے مناصب پر فائز کرنے کی تحریک کرنے والے دوست ان پر زیادتی کرتے تھے۔

حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ان کے نہایت عقیدت مند پرانے شاگرد تھے۔ وہ اس بات کے حامی نہیں تھے کہ حضرت کو جمعیت کا امیر بنایا جائے۔ مارچ ۱۹۶۸ء کو برکت علی ہال (لاہور) میں انتخاب امیر کے لیے مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تھا۔ اس میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، حکیم ہدایت اللہ (نائب امیر جمعیت لاہور شہر) مولانا محمد رمضان (ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث لاہور) اور اس فقیر نے حضرت کو امیر بنانے کی مخالفت کی تھی اور بھی متعدد ارکان شوریٰ نے اس ضمن میں ہمارا ساتھ دیا تھا۔ جو حضرات ان کو ہر حال میں امیر بنانا چاہتے تھے، ان میں ہمارے مرحوم دوست حاجی محمد اسحاق حنیف کا نام خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔ وہی حامی ارکان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس کی تفصیل میں اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں جو الاعتصام کے حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف نمبر کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے، جس کی کتابت ہو چکی ہے...... یہ معلوم نہیں کہ اس نمبر کی طباعت کی نوبت کب آئے گی۔

حضرت حافظ صاحب مصنف بھی تھے۔ ان کا ذہن علم کا گنجینہ اور بوقلموں معلومات کا سفینہ تھا جو مسلسل قلم کو خوراک بہم پہنچاتا اور پھر اس کی مدد سے تیزی کے ساتھ سطح قرطاس پر تیرتا رہتا تھا۔ ان کو عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا اور ان زبانوں کے تمام علوم پر ان کی گرفت تھی۔ چناں چہ اردو میں بھی بہت لکھا اور عربی میں بھی۔ البتہ فارسی میں کچھ تحریر نہیں فرمایا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان کی پہلی کتاب التحقیق الراسخ ہے۔ یہ ایک اچھا خاصا اردو مسودہ

Marfat.com

تھا جو رفع الیدین کے اثبات میں رقم فرمایا تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ اس وقت وہ اپنے آبائی مسکن گوندلاں والا میں تشریف فرما تھے اور مولانا عطاء اللہ صاحب ان کے حلقہ درس میں شامل تھے۔ وہاں مولانا نے ان کی اجازت سے مسودہ مرتب فرمایا اور اسے کتاب کی شکل دی۔ اس کا نام بھی مولانا ہی کا تجویز فرمودہ ہے۔ دو مرتبہ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور دونوں مرتبہ مولانا کی کوشش سے چھپی ہے۔

عربی اور اردو میں انھوں نے بیس اکیس کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جن میں زیادہ چھپ چکی ہیں اور چند قلمی صورت میں پڑی ہیں...... یہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اثبات التوحید بابطال التثلیث

۲۔ ردمولود

۳۔ صلوٰۃ مسنونہ

۴۔ الاصلاح (تین حصے)

۵۔ تنقید المسائل

۶۔ خیر الکلام فی وجوب فاتحہ خلف الامام

۷۔ اھداء ثواب

۸۔ ختم نبوت

۱۹۔ معیار نبوت

۱۰۔ دوام حدیث

۱۱۔ اسلام کی پھلی کتاب

۱۲۔ اسلام کی دوسری کتاب

۱۳۔ مسئلہ ایمان (عربی)

۱۴۔ بغیۃ الفحول (عربی)

۱۵۔ تحفۃ الاخوان (عربی)

۱۶۔ زبدۃ البیان فی تنقیح حقیقۃ الایمان زیادتہ والنقصان (عربی)

۱۷۔ شرح مشکوۃ (تاکتاب العلم)

۱۸۔ البدور والبازغہ (عربی)

۱۹۔ التحقیق الراسخ

Marfat.com

۲۰۔ ایک اسلام

ان کی یہ تصانیف بے شک اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل اور بہت سے علمی مسائل پر مشتمل ہیں۔ لیکن اگر وہ صحاح ستہ کی کسی کتاب کی شرح یا حاشیہ لکھنے کی طرف عنان توجہ مبذول فرماتے تو متعدد مقامات کے بے شمار نکات اہل علم کے مطالعے میں آتے اور یہ ان کی عظیم خدمت حدیث قرار پاتی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بے پناہ قوت حفظ سے نوازا تھا۔ اس کے لیے ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ پادری عبدالحق عیسائیوں کے مشہور مبلغ ومناظر تھے۔ منطق اور فلسفہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس کی چھوٹی بڑی تمام اصطلاحیں انھیں ازبر تھیں، جنھیں وہ بے تکلفی سے مناظرے میں استعمال کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد آگرہ چلے گئے تھے، وہیں فوت ہوئے۔ ایک مرتبہ توحید وتثلیث کے مسئلے پر حضرت حافظ صاحب سے ان کی بحث ہوئی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد حافظ صاحب کی ملاقات علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم سے ہوئی۔ دوران ملاقات میں گفتگو کرتے ہوئے حافظ صاحب نے اپنے انداز سے اس بحث کا تذکرہ فرمایا اور اس کے چند پہلوؤں کی وضاحت کی۔ سید صاحب نے ان کو مشورہ دیا کہ اس بحث کو آسان زبان میں قلم بند کر کے رسالے کی صورت میں شائع کر دینا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے اسے لکھ کر کتابت کے لیے کاتب کو دے دیا۔ چار پانچ روز کے بعد کاتب سے بات ہوئی تو پتا چلا کہ مسودہ گم ہو گیا ہے۔

حضرت نے یہ بات سنی اور حسب عادت مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ کسی قسم کے ملال کا اظہار نہیں کیا۔ اب اسے دوبارہ لکھا اور کاتب کو دے دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ پہلا مسودہ بھی کاتب کو مل گیا۔ دونوں مسودوں کا مقابلہ کیا گیا تو بالکل ایک سے تھے، کہیں کوئی فرق نہ تھا۔

وہ انتہائی اخاذ ذہن کے مالک تھے اور حفظ واتقان میں عدیم المثال......! انداز تفہیم اور پیرایہ کلام خالص علم کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ مسند درس پر جب علمی وفقہی نکات بیان فرماتے تھے تو وہی طلبا ان سے استفادہ کر سکتے تھے، جو علوم وفنون کی متنوع وادیوں سے کچھ آشنا ہوتے تھے۔ ہر شخص کا ان کی بات کی تہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ میں نے خود ان کے درس حدیث وفقہ میں دیکھا ہے کہ وہ تقریر کر رہے ہیں اور بعض طلبا بیٹھے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

وہ علم وادراک کے اعلیٰ فرازوں پر متمکن تھے، نیچے کی سطح پر اتر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کم فہم لوگوں کے لیے اپنا اسلوب مجروح نہیں کرنا چاہیے۔ بیس آدمیوں میں سے دو آدمی اگر بات کا مطلب پا گئے تو سمجھ لیجیے کہ محنت ٹھکانے لگی۔

ان کی تحریر کے بارے میں مولانا محمد حنیف ندوی کہا کرتے تھے کہ چھپنے سے پہلے اس کا مسودہ مولانا

Marfat.com

عطاء اللہ صاحب کو دکھانا ضروری ہے، وہ اپنے عظیم استاذ کے افکار اور طرز ادا سے خوب آگاہ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ ان کی کتاب التحقیق الراسخ کی مثال دیا کرتے تھے کہ اس کا مسودہ انھوں نے مرتب کیا اور وہ نہایت عمدہ شکل میں قارئین کے سامنے آگئی۔

حضرت حافظ صاحب کے شاگردوں کی تعداد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ خود انھیں بھی عرض کیا جاتا تو ان کا شمار نہ کر پاتے۔ وہ جہاں گئے، علم وفضل کے موتی بکھیرتے گئے اور لوگ اپنی ذہنی وفکری استعداد کے مطابق انھیں چنتے اور مشعل راہ بناتے گئے، مجموعی اعتبار سے ان سے مستفید ہونے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ان حضرات میں مدرس بھی ہیں، مقرر بھی ہیں، واعظ بھی ہیں اور مصنف بھی ہیں۔ اپنے اپنے دائرے میں ان کے ہر شاگرد نے خدمات انجام دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ ان کے جو شاگرد وفات پا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جو زندہ ہیں اور اپنی ہمت واستعداد کے مطابق مصروف عمل ہیں، اللہ انھیں مزید عمل وحرکت کی توفیق عطا فرمائے۔

میرے خیال میں اگر اللہ کا کوئی بندہ ہمت کر کے ان کے شاگردوں کی فہرست مرتب کر دے اور تھوڑا بہت ان کی خدمات کا تذکرہ ہو جائے تو یہ اس کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

ایک فہرست آزادی ملک سے قبل کی اور ایک آزادی ملک کے بعد کے شاگردوں کی مرتب ہونی چاہیے۔

حضرت سید میاں نذیر حسین دہلویؒ کے شاگردوں کی فہرست ان کی سوانح عمری الحیات بعد الممات میں دی گئی ہے۔ زیادہ نہیں تو کم سے کم اسی قسم کی فہرست حضرت حافظ صاحب کے شاگردوں کی بھی مرتب ہونی چاہیے۔

ان کے تلامذہ میں سے جو حضرات میرے ذہن میں آئے ہیں، ان کے اسمائے گرامی ذیل میں درج کر رہا ہوں، ان میں سے بعض حضرات قبل از آزادی کے شاگرد ہیں اور بعض بعد آزادی کے۔ اپنی معلومات کے مطابق دونوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے قبل از آزادی کے شاگرد۔

۱۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی: گوندلاں والا میں استفادہ کیا۔ ۲، ۳۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء کی درمیانی شب کو لاہور میں وفات پائی۔

۲۔ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی: گوندلاں والا میں استفادہ کیا۔ ۷۔ مئی ۱۹۸۷ء کو موضع کمیانہ شریف، تحصیل سمندری، ضلع فیصل آباد میں فوت ہوئے۔

۳۔ مولانا حکیم محمد ابراہیم: گوندلاں والا کے رہنے والے تھے۔ وہیں آزادی سے پہلے مستفید ہوئے اور وہیں وفات پائی۔

۴۔ مولوی محمد الیاس ندوی: ان کا تعلق بھی گوندلاں والا سے تھا، وہیں تعلیم حاصل کی اور وہیں سفر آخرت اختیار کیا۔

Marfat.com

۵۔ حافظ محمد بھٹوی: گوندلاں والا میں حضرت کے حلقہ درس میں شریک ہوئے، مرید کے میں وفات پائی۔

۶۔ مولانا عبدالسلام کشمیری: گوندلاں والا میں حصول علم کیا۔

۷۔ مولانا حافظ محمد اسحاق حسین خان والا (ضلع قصور): جامعہ قدس، لاہور میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ گوندلاں والا اور مدراس میں استفادہ کیا۔

۸۔ مولانا نذیر احمد رحمانی: مدرسہ رحمانیہ دہلی میں استفادہ کیا۔ وفات ۳۰۔مئی ۱۹۶۵ء کو ہوئی۔

۹۔ مولانا عبیداللہ رحمانی: مدرسہ رحمانیہ دہلی کے شاگرد۔ وفات ۴۔جنوری ۱۹۹۴ء۔

۱۰۔ مولانا عبدالغفار حسن: باقاعدہ شاگرد نہیں، مختلف اوقات میں استفادہ کیا، آج کل اسلام آباد میں قیام پذیر ہیں۔

۱۱۔ مولانا عبدالرزاق پشاوری:..........

۱۲۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ: مدرسہ تعلیم الاسلام، اوڈاں والا ضلع فیصل آباد۔ وفات مارچ ۱۹۹۳ء کو فیصل آباد میں پائی۔

۱۳۔ مولانا محمد یعقوب ملہوی: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا کے شاگرد۔ وہیں وفات پائی۔

۱۴۔ مولانا حافظ عبدالغفور جہلمی: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا۔ ۱۶۔اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جہلم میں فوت ہوئے۔

۱۵۔ حافظ محمد زکریا: جھوک دادو تحصیل سمندری فیصل آباد کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۹ء کو فوت ہوئے۔

۱۶۔ مولانا محمد عبداللہ: جامعہ محمدیہ، گوجراں والا۔

۱۷۔ مولانا معین الدین لکھوی: جامعہ محمدیہ، اوکاڑہ۔

۱۸۔ مولانا نیاز اللہ خاں: تقسیم ملک سے قبل ضلع ہوشیار پور مشرقی پنجاب سے تعلق تھا۔ اب ضلع فیصل آباد میں اقامت گزیں ہیں۔

۱۹۔ مولانا محمد افضل: بورے والا، ضلع وہاڑی۔ آزادی سے قبل چک مولوی والا۔ ضلع فیروز پور میں مقیم تھے۔

۲۰۔ مولانا خالد گھرجاکھی: گھرجاکھ گوجراں والا۔

۲۱۔ سرور شاہ: علاقہ کشمیر سے تعلق تھا۔

۲۲۔ فضل شاہ: خطہ کشمیر کے کسی مقام کے رہنے والے تھے۔

۲۳۔ حافظ عبداللہ: لدھے والا، گوجراں والا۔

۲۴۔ راقم عاجز محمد اسحاق بھٹی: تقسیم ملک سے پہلے کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) سے تعلق تھا۔ اب لاہور میں مقیم ہوں۔

۲۵۔ مولانا محمد صادق خلیل: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا کے شاگرد۔ فیصل آباد میں سکونت ہے۔

۲۶۔ مولانا محمد یحییٰ عزیز میرمحمدی: حافظ صاحب کے پرانے تلامذہ میں سے ہیں۔ جماعتی سیاست میں الجھ چکے ہیں۔

۲۷۔ مولانا محمد یحییٰ شرق پوری: حافظ صاحب کے بڑے لائق تلامذہ میں سے ہیں۔ شرق پور میں مقیم ہیں۔ انھیں

Marfat.com

اور مولانا یحییٰ میر محمدی کو حافظ صاحب پیار سے تحسین کہا کرتے تھے۔ جماعتی سیاست سے کوسوں دور ہیں۔

۲۸۔ حافظ فتح محمد فتحی: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا کے شاگرد۔ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے۔

۲۹۔ مولانا محمد صدیق اعظمی (بدھوآنہ ضلع جھنگ): ۱۹۴۶ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا میں استفادہ کیا اور پھر بعد از آزادی، گوجراں والا میں مستفید ہوئے۔

۳۰۔ مولانا محی الدین لکھوی: دیپال پور۔ ضلع اوکاڑہ۔

۳۱۔ مولانا عبدالرحمان لکھوی: حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند کبیر۔ ممتاز مدرس و معلم۔

۳۲۔ مولانا شمس الحق ملتانی: اصل وطن ملتان ہے، وہیں اقامت گزیں ہیں۔

۳۳۔ مولوی صلاح الدین (المعروف مولوی ترکی): دراصل روسی ترکستان کے رہنے والے تھے۔ انقلاب روس کے بعد چلتے پھرتے گوجراں والا آگئے تھے، وہیں حضرت حافظ صاحب سے اکتساب علم کیا۔ اور وہیں رحلت فرمائی۔

۳۴۔ مولانا محمد عبدہ: معروف مصنف، مترجم اور مدرس۔ فاضل شخصیت آج کل فیصل آباد میں قیام پذیر ہے۔

۳۵۔ مولانا محمد اسحاق رحمانی گوہڑوی: گوہڑ (ضلع قصور)۔

۳۶۔ مولوی عبیداللہ بڈھیمالوی: چک نمبر ۳۶ گ ب ضلع فیصل آباد۔

۳۷۔ مولانا عبدالقادر ندوی: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا میں استفادہ کیا۔ وہیں کے رہنے والے ہیں۔

۳۸۔ پیر محمد یعقوب: مدرسہ تعلیم الاسلام اوڈاں والا میں استفادہ کیا۔ آج کل جامعہ اثریہ جہلم میں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔

اب آزادیٔ وطن سے بعد کے چند تلامذہ کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ نہ حضرت کے آزادیٔ وطن سے پہلے کی فہرست مکمل ہے، نہ بعد کی اور کوئی شخص اسے مکمل کر بھی نہیں سکتا۔ بس جن حضرات کے بارے میں معلوم ہے کہ انھوں نے ان سے استفادہ کیا تھا۔ ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ یقیناً بہت سے وہ حضرات بھی ان کے حلقہ درس میں شامل رہے ہوں گے، جنھیں میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، لیکن یہ معلوم نہیں کہ انھوں نے حضرت سے استفادہ بھی کیا تھا۔ ان تمام حضرات سے معذرت کے ساتھ چند حضرات کے نام درج کرتا ہوں، جن کے متعلق مجھے تھوڑا بہت علم ہے کہ انھیں آزادی کے بعد حضرت کے دائرہ شاگردی میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۱۔ پروفیسر احمد حریری: جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں استفادہ کیا۔ (وفات پاچکے ہیں)

۲۔ مولانا عبداللہ لائل پوری: گوجراں والا میں کچھ عرصہ مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا۔ (وفات پاچکے ہیں)

Marfat.com

۳۔ مولانا ابوالبرکات احمد: گوجراں والا میں شرف تلمذ حاصل کیا۔ (وفات پاگئے ہیں)

۴۔ سید ابوبکر غزنوی: جامعہ سلفیہ میں استفادہ کیا۔ (وفات پاگئے ہیں)

۵۔ مولانا عبدالخالق قدوسی: جامعہ سلفیہ میں استفادہ کیا۔۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو بم دھماکے میں جام شہادت نوش کیا۔

۶۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر: جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور جامعہ اسلامیہ گوجراں والا، میں مستفید ہوئے۔ ۲۳۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو بم دھماکے میں جام شہادت نوش کیا۔

۷۔ مولانا ارشاد الحق اثری: اللہ نے انھیں تصنیف وتالیف کا زیور بھی عطا فرمایا ہے۔ اور درس وتدریس کا بھی۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ کے بعد ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد کے نگران ہیں۔

۸۔ مولانا محمد علی جانباز: گوجراں والا اور جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں کسب علم کیا۔ جامعہ ابراہیمیہ سیالکوٹ میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۹۔ مولانا سیف الرحمان الفلاح: گوجراں والا میں مستفید ہوئے۔ آج کل اوکاڑہ میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۰۔ مولانا عبیداللہ عفیف: مشہور مدرس وعالم۔ جامعہ قدس لاہور میں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔

۱۱۔ مولانا محمد ادریس فاروقی: مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کے پوتے۔ جامعہ سلفیہ میں اکتساب فیض کیا۔

۱۲۔ مولانا حافظ عبدالمنان نور پوری: گوجراں والا کے دوران تدریس کے شاگرد۔ جامعہ محمدیہ گوجراں والا میں شیخ الحدیث ہیں۔

۱۳۔ مولانا عبدالسلام بھٹوی: مرکز الدعوہ مرید کے میں مدرس ہیں اور مولانا حافظ محمد بھٹوی کے صاحب زادے ہیں۔

۱۴۔ ڈاکٹر فضل الٰہی: گوجراں والا میں استفادہ کیا، علامہ احسان الٰہی ظہیر کے بھائی ہیں، ریاض یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

۱۵۔ محمد فاضل: حضرت حافظ صاحب کے داماد بھی تھے اور شاگرد بھی، وفات پاگئے ہیں۔

۱۶۔ قاضی مقبول احمد: جامعہ اسلامیہ گوجراں والا میں استفادہ کیا۔ لاہور میں ریلوے اسٹیشن کے پاس گورنمنٹ ٹیکنیکل کالج میں پروفیسر ہیں۔

۱۷۔ مولانا عبدالصمد رؤف: اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) میں تحصیل علم کیا۔ اوڈاں والا کے رہنے والے ہیں اور وہیں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ ان چند ناموں کو ''فہرست'' سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، لیکن افسوس ہے اس سے زیادہ کا مجھے علم نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ جن حضرات کو جن شاگردوں کا پتا ہے وہ تھوڑے بہت تعارف کے ساتھ کسی جماعتی

Marfat.com

اخبار میں ان کا ذکر کر دیں۔ یہ ایک علمی خدمت ہوگی۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا حافظ صاحب کی پہلی شادی مولانا فقیر اللہ مدراسی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ اس نیک بخت خاتون سے ان کا ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ان میں ایک بیٹی کی شادی محمد فاضل سے ہوئی تھی جو حافظ صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ محمد فاضل کے ایک بیٹے کرنل ڈاکٹر وحید الزمان طارق ہیں جو بڑے لائق اور صاحب فراست نوجوان ہیں۔ ذہانت وقابلیت میں کسی حد تک اپنے قابل احترام نانا (حضرت حافظ صاحب) کا خوب صورت عکس۔ پاکستان کے بڑے سائنس دانوں میں ان کا شمار ہوتا ہے اور بین الاقوامی سطح پر اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ طب کے سپیشلسٹ ہیں اور فارسی میں پی ایچ ڈی۔ وحید الزماں نے حضرت حافظ صاحب سے خوب استفادہ کیا۔ فارسی میں حضرت حافظ صاحب کو خط لکھا اور حضرت حافظ صاحب نے بھی فارسی میں جواب دیا اور بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ حافظ صاحب کی ایک بیٹی اسما نے ان سے سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی پڑھی۔ آج کل لاہور کے علاقہ وسن پورہ میں بچیوں کو دینی تعلیم دے رہی ہیں۔ دوسری بیوی سے حافظ صاحب کے دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ ان میں سے دو بیٹیاں تو بچپن میں ہی فوت ہوگئیں۔ بڑی بیٹی محمودہ احسان، علامہ احسان الٰہی ظہیر کے عقد میں آئیں۔ فارسی میں ایم اے کیا اور علوم دینیہ میں حافظ صاحب سے استفادہ کیا۔ حافظ صاحب کی دوسری بیٹی حبیبہ غفار ہیں جو کہ گوجراں والا کے گورنمنٹ کالج میں پرنسپل ہیں۔ انھوں نے فن وراثت میں حافظ صاحب سے استفادہ کیا۔ حافظ صاحب کے ایک بیٹے محمود اعظم تھے، جو فوت ہو چکے ہیں، طب اور تعویذات وغیرہ کو بطور پیشہ اپنائے ہوئے تھے، اور اپنے کام میں ماہر تھے۔ دوسرے بیٹے مسعود اعظم آج کل گوجراں والا میں قیام پذیر ہیں۔

حضرت حافظ صاحب نے وفات سے ایک سال قبل تک مسلسل بخاری شریف کا درس دیا۔ اس طرح کم وبیش ۷۰ سال بخاری شریف پڑھائی۔ آخری چند سال کمزوری اور علالت کی وجہ سے اپنے مکان پر ہی طلبا کو درس بخاری دیتے رہے۔

حضرت حافظ صاحب روحانی طور پر بڑی بلند اقامت شخصیت تھے۔ ان کی عبادت کی کیفیت ان کے ایک شاگرد مولانا عبدالخالق قدوسی اپنے مقالے ''امام محمد گوندلوی اور جامعہ سلفیہ'' میں بیان کرتے ہیں۔

''حضرت امام گوندلویؒ کو اللہ تعالیٰ نے ذوق عبادت کی دولت سے خوب خوب نوازا تھا۔ آپ کی روحانی کیفیت بڑی بلند تھی، نماز کا وقت قریب آتا تو آپ بے چین ہو جاتے، ہمیشہ اذان سے کچھ پہلے مصلے پر جا کر بیٹھ جاتے۔ تکبیر اولیٰ کے کبھی فوت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا، جماعت ہمیشہ خود کراتے، جماعت سے فارغ ہو کر کافی دیر تک ورد ووظائف میں مشغول رہتے۔

Marfat.com

آپ جماعت کے بعد نمازیوں کے ساتھ مل کر دعا کرنے سے عموماً پرہیز کرتے تھے۔ البتہ دعوات مسنونہ کے بعد آپ کبھی کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے جس میں بعض نمازی جو اس وقت تک موجود ہوتے شریک ہو جاتے، آپ ان کو روکتے نہیں تھے۔''

''تہجد کے آپ شروع سے ہی پابند تھے جس میں باقاعدہ قرآن پاک کے کئی پارے روزانہ تلاوت فرماتے اور آپ کا یہ معمول آخر تک رہا۔ رمضان کے مہینے میں یہ مقدار اور بھی بڑھا دیتے۔ حضرت کی وفات سے کچھ دن بعد موضع کھوکھر کی گوجراں والا کے ایک بزرگ اسماعیل صاحب نے مجھے بتایا کہ تقریباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے میں اپنے سسرال گوندلاں والا گیا، رمضان کا مہینہ تھا، میں تراویح کے لیے حضرت حافظ صاحب کی مسجد میں چلا گیا، آپ نے اس دن آٹھ رکعت میں دس پارے قرآن پاک پڑھا۔ میں نے حیران ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ آج کیا بات ہے حافظ صاحب نے اتنا قرآن پڑھا ہے تو لوگوں نے بتایا کہ یہ حضرت کا ہمیشہ کا معمول ہے۔ آپ رمضان میں ہمیشہ دس قرآن پاک ختم کرتے ہیں اور لوگ پورے ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں۔''

حضرت حافظ صاحب اس صدی کے وہ بزرگ تھے جو زہد وعبادت میں بھی منفرد حیثیت کے مالک تھے اور علم وعرفان میں بھی کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ وہ نہایت غیور اور انتہائی باحمیت عالم دین تھے۔ کبھی کسی سرمایہ دار کے دروازے پر نہیں گئے، کسی کے سامنے کبھی اپنی کوئی ضرورت بیان نہیں کی، کسی لمحے بھی کسی کی جیب کے بوجھ سے مرعوب نہیں ہوئے، کبھی کسی کی دور دراز مسافت تک پھیلی ہوئی مٹی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، کسی کے کارخانے یا فیکٹری کو کوئی اہمیت نہیں دی...... اس مرد درویش نے ہمیشہ وقار کی زندگی بسر کی اور انتہائی تکریم کے ساتھ اس دنیائے ناپائید سے رخصت ہوئے۔ اللہ نے ان کے دل کو بھی منور کیا تھا اور ذہن وفکر کو بھی بے پناہ تابانی سے نوازا تھا۔ انھوں نے تمام عمر اللہ کے دین کی خدمت کی اور اس کے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے ارشادات کی تبلیغ کرتے رہے۔

اس دنیوی زندگی کے آخری چار ساڑھے چار مہینے انھوں نے سخت بیماری کی حالت میں گزارے، لیکن اس حالت میں بھی ہر لحہ ان کی زبان مبارک اذکار الٰہی میں مشغول رہی۔ کسی کے شکوہ وشکایت سے ان کے لب کبھی آلودہ نہیں ہوئے۔

انھوں نے کم وبیش نوے (۹۰) برس عمر پا کر ۴۔ جون ۱۹۸۵ء (۱۴۔ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ) کو تین بجے سہ پہر اس جہان فانی کو خیر باد کہا اور عالم جاودانی کی راہ لی۔ دوسرے دن ۵۔ جون کو صبح ۹ بجے ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور گوجراں والا کی سرزمین نے ان کے جسد خاکی کو بہ درجہ غایت مسرت کے ساتھ اپنی آغوش میں لے لیا۔

اللهم اكرم نزله ووسع مدخله وادخله جنة الفردوس.

Marfat.com

مولانا محمد اسماعیل سلفی

۱۹۳۵ء میں انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ اجلاس میں جو علمائے کرام ہمارے ہاں تشریف لے گئے تھے، ان میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی (گوجراں والا) بھی شامل تھے۔ وہ پہلی دفعہ وہاں گئے تھے۔ اس وقت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہیں تھے اور انہی کی دعوت پر وہ اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ اس اجلاس کی تین باتیں مجھے یاد ہیں، جن کا تعلق مولانا اسماعیل صاحب کی ذات گرامی سے ہے اور وہ باتیں یہ ہیں:

۱۔ نماز عشا کے بعد ان کی تقریر ہوئی تھی۔ بہت بڑا مجمع تھا، مولانا عطاء اللہ حنیف نے ان کو تقریر کے لیے موضوع دیا تھا، ''مسلمانوں کا ماضی اور حال''...... خطبہ مسنونہ کے بعد انھوں نے تقریر شروع کی تو فرمایا: ''مولوی عطاء اللہ نے مجھے موضوع دیا ہے، ''مسلمانوں کا ماضی اور حال'' اس کے ساتھ وہ مستقبل بھی لگا دیتے تا کہ تینوں زمانے اکٹھے ہو جاتے۔'' پھر فرمایا: ''مستقبل کا اندازہ ماضی اور حال کی روشنی ہی میں لگایا جا سکتا ہے۔ جو شخص مسلمانوں کا ماضی اور حال بیان کرے گا، اس کے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ ماضی اور حال کی بنیادوں پر ہی مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔''

۲۔ ہمارے ہاں بجلی نہیں تھی، جلسے میں بیٹری پر لاؤڈ سپیکر چلایا جاتا تھا۔ مولانا کی تقریر کے دوران لاؤڈ سپیکر بند ہو گیا۔ انھوں نے کہا: یہ کیا ہوا؟ مائیک آواز کیچ نہیں کر رہا ہے۔

۳۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ سلسلہ تقریر ابھی جاری رہنا چاہیے تھا۔ اس قسم کی زوردار اور موثر تقریر اور کوئی نہیں ہوگی۔ یہ اسی نوعیت کی واحد تقریر تھی۔ اللہ نے اس شخص کو علم بھی دیا ہے اور بات کہنے کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے۔

۱۹۳۵ء کی تحریک مسجد شہید گنج کے زمانے میں یہ فقہی سوال پیدا ہوا تھا کہ مسجد جہاں تعمیر ہو جائے وہ جگہ ہمیشہ مسجد کے حکم میں رہتی ہے۔ اس موضوع سے متعلق حکومت نے مختلف علمائے دین کی رائے معلوم کرانے کے لیے ہائی کورٹ کے جج میاں دین محمد کو مقرر کیا تھا، جو گوجراں والا کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد اسماعیل کا بیان بھی لیا تھا اور ان کی رائے معلوم کی تھی۔ یہ خبر اس دور کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی، لیکن مولانا نے کیا بیان دیا اور کیا رائے ظاہر کی تھی، اس کا مجھے علم نہیں۔ ہائی کورٹ کے پرانے ریکارڈ سے یہ رائے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس موضوع کی نئی باتیں سامنے آئیں۔

Marfat.com

اس سے پانچ سال بعد ۱۹۴۰ء میں ان کی دوبارہ زیارت ہوئی۔ ۱۹۳۷ء کو میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ مرکز الاسلام گیا، ایک سال وہاں رہا۔ اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں مولانا ممدوح فیروز پور تشریف لے گئے تو وہاں جا کر ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گیا۔ دو سال سے زائد عرصہ وہاں گزرا۔ پھر ۱۹۴۰ء میں مولانا نے مجھے گوجراں والا جانے کا حکم دیا اور میں نے وہاں جا کر حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے دائرہ شاگردی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس طرح ۱۹۳۵ء کے بعد ۱۹۴۰ء میں ان کے دیدار سے سعادت اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اب میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہو گئی تھی اور علم و علما سے کچھ تعلق پیدا ہو گیا تھا اور چھوٹی عمر ہی میں، میں نے مروجہ نصاب کی متعدد فنی کتابیں پڑھ لی تھیں۔

عربی و دینی مدارس کا تعلیمی سال ماہ رمضان کے پندرہ دن بعد ۱۵۔شوال کو شروع ہوتا ہے اور رمضان سے پندرہ دن قبل ۱۵۔شعبان کو ختم ہو جاتا ہے۔ سال میں دو مہینے کی تعطیلات ہوتی ہیں۔ نصاب تعلیم تقریباً آٹھ سال میں اختتام کو پہنچتا ہے۔ سال ختم ہونے کے بعد ضروری نہیں ہوتا کہ طالب علم آئندہ سال اسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرے، وہ اپنی صواب دید اور پسند کے مطابق جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔ پھر یہ اصول بھی ان مدارس میں کارفرما نہیں کہ جس مدرسے سے وہ جانا چاہتا ہے، اس کے مہتمم یا صدر مدرس سے اپنی تعلیمی قابلیت یا چال چلن کا سرٹیفکیٹ حاصل کرے۔ جہاں چاہے اور جب چاہے چلا جائے اور دوسرے مدرسے میں جا کر داخل ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ جس مدرسے سے وہ جانا چاہتا ہے، اس کے صدر مدرس کا رقعہ اس مدرسے کے کسی استاد یا صدر مدرس کے نام لے لیا جاتا ہے یا خود کوئی مدرس کہہ دیتا ہے کہ اب تم فلاں مدرسے میں چلے جاؤ، میں اس کے مدرس کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔

پھر نصاب بھی تمام مدارس کا ایک سا نہیں ہے۔ چند کتابوں کو چھوڑ کر مختلف مدارس میں مختلف کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن اس بے نظمی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان مدارس میں اگر جی لگا کر تعلیم حاصل کی جائے اور محنت اور توجہ سے کتابیں پڑھی جائیں اور پھر جدید علوم سے بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لی جائے تو سرکاری درس گاہوں کے تعلیم یافتہ لوگ قابلیت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

بہرحال مولانا عطاء اللہ صاحب نے مجھے مولانا محمد اسماعیل صاحب کے نام خط دیا اور میں نے گوجراں والے جا کر وہ خط ان کی خدمت میں پیش کیا اور انھوں نے مجھے اپنے مدرسے میں داخل کر لیا۔ ان کے مدرسے کا نام مدرسہ محمدیہ تھا۔ میں فیروز پور سے اپنے دوست محمد افضل صاحب کے ساتھ گوجراں والے گیا تھا جو ایک سال سے وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا حلیہ اور لباس یہ تھا۔ لمبی داڑھی، سیاہ اور سفید بالوں کا مجموعہ، تیکھے نقوش، گندمی رنگ، آنکھوں پر نظر کی عینک اور ایک دانت پر سونے کا

Marfat.com

خول، سفید کھدر کی بغیر کالر کے قمیص اور کھدر کی شلوار، کلے پر مشہدی پگڑی۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سے میں نے تفسیر بیضاوی، حماسہ، متنبی، ھدایہ، میر قطبی وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ مولانا مرحوم کو عربی ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور انتہائی ذوق وشوق سے ادب کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ بعض اوقات دوران درس ہلکے پھلکے لطیفے بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ مسجدوں میں سبعہ معلقہ، متنبّی اور مقامات حریری وغیرہ کتابیں تو بڑے التزام سے پڑھائی جاتی ہیں، مگر ہیر وارث شاہ یا اس قسم کی دوسری کتابیں کوئی شخص مسجد میں لے آئے تو برا مانا جاتا ہے، حالاں کہ وہ بھی ادب کی کتابیں ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ایک عربی ادب ہے اور دوسرا پنجابی ادب۔ پھر ہیر وارث شاہ میں بعض باتیں اس قدر کھل کر نہیں بیان کی گئیں جس طرح عربی ادب کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں۔ فرمایا: تمھیں پنجابی ادب کی کتابوں سے کون روکتا ہے، شوق سے لاؤ اور شوق سے پڑھو۔

مولانا اسماعیل صاحب کے خاندان میں کئی پشتوں سے حصول علم کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ کتابت اور طبابت سے بالخصوص اس خاندان کے افراد کو دلچسپی تھی۔ منقول ہے کہ مغل دور میں یہ خاندان ضلع گوجراں والا کے مشہور قصبے ''سوہدرہ'' میں اقامت گزیں تھا۔ اس عہد میں ان کے بعض افراد اچھے خاصے سرکاری مناصب پر فائز تھے۔ بعد ازاں حالات نے ایسی کروٹ لی کہ یہ لوگ سوہدرہ سے اٹھ کر موضع کولوتارڈ چلے گئے۔ پھر کچھ ایسے حوادث سے دوچار ہوئے کہ لوتارڈ سے بھی نقل مکانی کرنا پڑی۔ اب انھوں نے حضرت کیلیاں والا کا رخ کیا، لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ نہ رہ سکے، وہاں سے کوچ کر کے ایک گاؤں رتہ تخی چلے گئے۔ رتہ تخی بھی جم کر نہ رہ سکے اور وزیر آباد کے قریب موضع ''ڈھونیکے'' آ گئے۔ وہاں کے لوگوں نے ان کی بڑی قدر کی اور نہایت احترام کا برتاؤ کیا۔ اچھی خاصی زمین عطا کی اور انتہائی تکریم سے پیش آئے۔

مولانا کے پردادے کا نام محکم دین تھا۔ محکم دین کا ایک ہی بیٹا تھا، جس کا نام عبداللہ تھا۔ عبداللہ جوانی میں فوت ہوگیا تھا، تاہم اس نے اپنے پیچھے چھ اولادیں چھوڑیں، چار بیٹے اور دو بیٹیاں۔ بیٹوں کے نام تھے، عبدالعزیز، محمد ابراہیم، احمد دین اور محمد عالم......! ان میں عبدالعزیز اور محمد عالم لاولد فوت ہوئے، لیکن محمد ابراہیم اور احمد دین کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا۔ محمد ابراہیم کے بیٹے ہمارے ممدوح حضرت مولانا محمد اسماعیل تھے جو باپ کی اکلوتی اولاد تھے......! احمد دین کے آٹھ بیٹے بیٹیاں تھے، جن میں ایک ہمارے نہایت مشفق ومہربان دوست حکیم عبدالمجید تھے، جن کے بارے میں اپنی معلومات کے مطابق چند گزارشات ان شاء اللہ علیحدہ عنوان کے تحت پیش کی جائیں گی۔

مولانا اسماعیل صاحب کے والد گرامی مولوی محمد ابراہیم نہایت متدین، عبادت گزار اور صاحب تقویٰ

Marfat.com

بزرگ تھے۔ کتابت میں مہارت رکھتے تھے۔ نواب وحید الزمان کے ترجمہ قرآن کی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حلقے میں بڑی شہرت ہے، اس کے عربی متن اور اردو ترجمے کی کتابت مولوی ابراہیم نے کی تھی...... حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی مشہور تصنیف تحفة الاحوذی جو جامع ترمذی کی شرح ہے اور چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کا مقدمہ بھی کئی سو صفحات پر محیط ہے۔ اس کی کتابت مع متن ترمذی کے مولوی ابراہیم مرحوم نے کی تھی۔ تحفة الاحوذی ہندوستان، پاکستان اور بیروت وغیرہ ملکوں میں کئی دفعہ چھپ چکی ہے اور وہ مولوی ابراہیم صاحب کی کتابت کا عکس ہے۔

میں نے ۱۹۴۰ء میں ان کو دیکھا۔ دبلے پتلے، سادہ مزاج اور سادہ لباس، جامع مسجد اہل حدیث میں تشریف لاتے تو بڑے پوتے محمد جو اس وقت ایف۔اے یا بی۔اے کے طالب علم تھے، بالعموم ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی صحیح بخاری یا حدیث کی کوئی کتاب پڑھاتے تو مولوی ابراہیم صاحب حلقہ درس میں آکر بیٹھ جاتے اور بڑے انہماک اور توجہ سے ان کی تقریر سنتے...... مولانا محمد اسماعیل صاحب ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کتابیں پڑھاتے تھے، ان کا سماع بھی وہ کرتے۔ مولانا کا مکان آبادی حاکم رائے میں چاہ شاہاں کے قریب تھا، مکان سے متصل ایک خوب صورت مسجد تھی، اس نواح کے لوگ اسی مسجد میں نماز پڑھتے تھے، مولوی محمد ابراہیم مرحوم اس مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

شادی کے کئی سال بعد تک مولوی ابراہیم صاحب کے کوئی بچہ نہیں ہوا۔ اس وجہ سے وہ بہت مغموم رہتے تھے۔ اس وقت وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادیؒ کا سلسلہ درس جاری تھا۔ مولوی صاحب اپنے گاؤں ڈھونیکے سے وہاں چلے جاتے اور زیادہ تر وقت حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں گزارتے۔ ایک دفعہ انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے اس کا ذکر کیا اور عرض گزار ہوئے کہ وہ دعا فرمائیں اللہ انھیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ چنانچہ انھوں نے دعا کی وہ قبولت کا وقت تھا۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام خود حضرت حافظ صاحب نے اسماعیل رکھا۔ مولوی صاحب سے وعدہ لیا کہ وہ اپنے اس بچے کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیں گے۔ یہ ۱۸۹۷ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔

بچے کی تعلیم کا آغاز گھر ہی میں ہوا۔ نیک بخت والد نے بیٹے کی بہترین تربیت کی اور ابتدائی تعلیم خود ہی دی۔ قرآن مجید پڑھایا، اردو، عربی اور فارسی کی بعض کتابیں پڑھائیں۔ بیٹے کو فن کتابت بھی سکھایا۔ عمر کی چند منزلیں طے کیں تو وزیر آباد میں حضرت حافظ صاحب کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ حافظ صاحب کی دعا اور کوشش سے چھوٹی عمر ہی میں یہ لائق شاگرد بہت سی علمی راہوں سے باخبر ہو گئے تھے۔

وزیر آباد ہی میں پہلی مرتبہ انھوں نے حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادیؒ (وفات اپریل ۱۹۱۹ء) کو

Marfat.com

دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں: ''میں نے مرحوم کو پہلی دفعہ وزیرآباد میں دیکھا۔ جمعے کے دن مولانا فضل الٰہی صاحبؒ کے ہاں کھانا تناول فرما کر مسجد اہل حدیث میں آئے۔ مرحوم حضرت الاستاد الامام مولانا الشیخ حافظ عبدالمنان صاحب نے میز خالی فرما دیا۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ سال ہوگی۔ وعظ میں عجیب رقت تھی۔ غالباً وعظ اخلاص فی العمل کے موضوع پر تھا۔ میں صغرسنی کے باوجود انتہائی رقت محسوس کر رہا تھا اور پورے مجمعے پر یہ کیفیت طاری تھی...... اس کے بعد مولانا کئی دفعہ تشریف لائے، زیارت ہوتی رہی، لیکن بچپن کی وجہ سے استفادے کی جرات نہ ہو سکی۔''

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علمائے کرام کی مجالس میں بیٹھنے اور ان کے پراثر مواعظ سننے کا شوق ان کو ابتدائے عمر ہی سے تھا۔

حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کی خدمت میں وزیرآباد وہ کتنا عرصہ رہے؟ اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ یہ البتہ واقعہ ہے کہ ۱۹۱۴ء میں وہ مزید تعلیم کے لیے دہلی چلے گئے تھے۔ جیسا کہ خود ان کے ایک مضمون سے پتا چلتا ہے جو انھوں نے مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے متعلق ان کی وفات کے بعد الاعتصام میں تحریر فرمایا تھا۔ دہلی ہی میں مولانا غزنوی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ پورا مضمون آئندہ صفحات میں درج کیا جا رہا ہے جو بہت سی معلومات پر مشتمل ہے۔

امرتسر مدرسہ غزنویہ میں بھی کچھ عرصہ زیر تعلیم رہے۔ اگست ۱۹۱۳ء میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنویؒ کا انتقال ہوا۔ یہ ان کے انتقال سے بعد کی بات ہے۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ بعد تک مولانا داؤد غزنوی اس مدرسے میں طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔

امرتسر میں انھوں نے مولانا مفتی محمد حسن مرحوم سے بھی استفادہ کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ معروف عالم اور بہت اچھے مدرس تھے۔ کافی عرصے تک وہ امرتسر میں پڑھاتے رہے۔ بہت سے علما و طلبا کو ان کے حلقہ شاگردی میں شرکت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

حضرت مولانا حافظ محمد ابراہیم سیالکوٹی سے بھی مولانا اسماعیل صاحب مستفید ہوئے اور کافی مدت ان کی خدمت میں رہے۔

۱۹۲۱ء میں گوجراں والا تشریف لائے اور اس شہر میں تدریس و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند لفظوں میں یہاں گوجراں والا کی تاریخ اور اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں چند باتیں عرض کر دی جائیں۔

کم و بیش تین سو سال پیشتر ''خان'' نامی ایک زمیندار نے جو جاٹ برادری کی ساہنی گوت سے تعلق رکھتا

Marfat.com

تھا، ایک گاؤں کی شکل میں اس کی بنیاد رکھی۔ یہ گاؤں اس وقت چند گھروں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد گوجر برادری کے زمیندار یہاں آئے جو ساہنی جاٹوں سے زیادہ تعداد میں تھے۔ اب یہ گاؤں گوجروں کی وجہ سے ''گوجراں والا'' کے نام سے موسوم ہوا۔ مغل حکومت کے آخری دور تک یہ ایک چھوٹا سا گاؤں رہا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے دادا چڑھت سنگھ کے زمانے میں اس نے قصبے کی صورت اختیار کر لی، پھر پنجاب انگریزی حکومت کے قبضے میں آیا تو اسے ضلع بنا دیا گیا اور ریلوے اسٹیشن بھی قائم ہو گیا۔ اس طرح اسے شہر کی حیثیت حاصل ہو گئی...... بہت جلد یہ اچھا خاصا صنعتی شہر ہو گیا۔ یہ ہے چند الفاظ میں اس کی ابتدائی تاریخ۔

ضلع اور شہر گوجراں والا میں توحید وسنت اور مسلک اہل حدیث کی اشاعت کا آغاز یہاں چار پانچ بزرگوں کی کوشش سے ہوا، وہ تھے مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) ان کے شاگرد مولوی علاء الدین، مولانا عبداللہ غزنوی، حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور جناب میر حیدر وزیر آبادی۔

مولوی علاء الدین دراصل ضلع ملتان کے ایک گاؤں اوچ بھٹیاں کے رہنے والے تھے۔ وہ ۱۸۷۴ء (۱۲۹۰ھ) کے پس وپیش گوجراں والا آئے اور اپنے بعض احباب کے ساتھ ایک کھلی جگہ میں نماز پڑھنے لگے، لیکن لوگوں نے وہابی کہہ کر ان کی مخالفت شروع کر دی۔ وہ لوگ پولیس کو بھی اپنی مدد پر لے آئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے کہیں نماز پڑھانا شروع کی اور ان کو نماز پڑھانے سے روک دیا گیا۔

مولوی علاء الدین کے ساتھ صرف دس بارہ آدمی تھے اور وہ کہیں مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ کام بظاہر ان کے بس سے باہر تھا۔ ایک تو وہ تعداد میں کم تھے، دوسرے مالی اعتبار سے کمزور تھے، تیسری بات یہ تھی کہ انھیں ہر جگہ وہابی کہہ کر بدنام کیا جاتا تھا۔ مسجد کے لیے جگہ خریدنا، اس کی تعمیر کرنا اور پھر اسے قبضے میں رکھنا نہایت اہم کام تھا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جگہ بھی خریدیں گے اور مسجد بھی بنا کر رہیں گے۔ انھوں نے کچھ رقم جمع کی اور ایک شخص سائیں رنگ علی سے درخواست کی کہ آپ کے پاس اچھی خاصی زمین ہے، اس میں سے تھوڑی سی جگہ ہمیں مسجد کے لیے دے دیں۔ سائیں رنگ علی یہ سن کر خوش ہوئے اور جو زمین وہ خریدنا چاہتے تھے، اس پر نشان لگا دیا۔ اس کے بعد مسجد کی تعمیر شروع ہو گئی، لیکن لوگ پھر مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور پروپیگنڈا کرنے لگے کہ یہ مسلمانوں کی مسجد نہیں ہو گی بلکہ وہابیوں کی مسجد ہو گی۔ اس میں نماز پڑھنا جائز نہیں ہو گا، اس لیے اسے گرا دیا جائے گا۔ چنانچہ جب مسجد کی ایک دیوار تعمیر ہو گئی تو مخالف لوگ اس کو گرانے کے لیے آ گئے۔ سائیں رنگ علی اس صورت حال سے پریشان ہو گئے اور زمین دینے سے انکار کر دیا۔

اس زمین کے حصے دار میر حیدر تھے، مسجد بنانے والے ان کی خدمت میں گئے کہ وہ سائیں رنگ علی کو سمجھائیں کہ جو جگہ وہ مسجد کو دے چکے ہیں، اس پر قائم رہیں۔ چناں چہ میر حیدر نے سائیں رنگ علی سے کہا

Marfat.com

کہ اگر اس مسجد میں نماز پڑھنی جائز نہیں تو اس میں تمھارا کیا بگڑتا ہے، زمین تو یہیں رہے گی۔ اسے تو کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔ ہمیں یہ فائدہ ہوگا کہ اس میں دو کمرے تعمیر ہو جائیں گے۔ مسجد رہی تو لوگ نماز پڑھیں گے اور ہمیں ثواب ہوگا، ورنہ مکان ہمیں مفت میں مل جائے گا اور ہم اپنی ضرورت کے لیے اسے استعمال کریں گے۔ یہ بات سن کر سائیں صاحب خاموش ہو گئے اور مسجد بنالی گئی۔

اس کارِ خیر میں جن حضرات نے حصہ لیا، ان میں ایک شخص شیخ جھنڈو تھے جن کا شمار گوجراں والا کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ دوسرے حاجی پیر محمد تھے، وہ بھی اس شہر کے رئیس آدمی تھے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنھوں نے گوجراں والا میں توحید و سنت کی اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا اور اس مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔

مسجد کی تعمیر کے بعد بھی مخالفین خاموش نہیں ہوئے۔ انھوں نے اس پر مسجد ضرار کا فتویٰ صادر کیا اور لوگوں کو اسے منہدم کرنے پر اکسایا، لیکن شہر سے باہر کے علما نے اس فتوے کو غلط قرار دیا اور مسجد کی تعمیر کو مبنی برحق ٹھہرایا تو ان لوگوں کی کسی قدر زبان بند ہوئی۔

مسجد کی تعمیر کے بعد کیا صورت حال پیدا ہوئی؟

ذرا اس کے متعلق بھی سنتے جایے۔ وہاں ایک پرانا کنواں تھا، جس سے نمازی وضو وغیرہ کرتے تھے۔ مخالفین نے تکیہ والوں سے کہہ کر وہاں سے پانی لینا اور وضو کرنا بند کرا دیا۔ اب میر حیدر نے کچھ روپیہ خود دیا اور کچھ دوسرے لوگوں سے فراہم کیا اور مسجد کے اندر کنواں لگوا دیا تاکہ ہر وقت کی یہ مصیبت ختم ہو جائے۔

یہ وہی مسجد ہے جو گوجراں والا کے چوک نیائیں میں واقع ہے اور جماعت اہل حدیث کی بہت بڑی مسجد ہے۔ جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں اس زمانے میں اس مسجد کو مولوی علاء الدین کی مسجد کہا جاتا تھا، اس لیے کہ اس کی امامت و خطابت کے فرائض مولانا علاء الدین سرانجام دیتے تھے۔ اس کے بعد اسے مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد کہا جانے لگا، کیونکہ اس میں خطابت و تدریس کا سلسلہ ان کے سپرد تھا۔

دیگر حضرات کے علاوہ ابتدا میں گوجراں والا کے محلّہ حاجی پورہ کی کشمیری برادری کے حضرات نے مسلک اہل حدیث اختیار کیا اور وہ وہابی مشہور ہوئے۔ اس دور میں ان کا یہ بہت بڑا اقدام تھا۔

مسجد کی تعمیر کے بعد کچھ لوگوں کے ذہن میں متبعین کتاب و سنت کو نظم و نسق کی لڑی میں پرونے کا خیال پیدا ہوا۔ وہاں امرتسر کے ایک شخص منشی قائم الدین نقشہ نویس محکمہ نہر کے دفتر میں کام کرتے تھے جو اشاعت کتاب و سنت میں بڑے تیز تھے۔ انھوں نے اور جناب غلام محمد ڈار نے کوشش کر کے ۱۹۱۲ء میں انجمن اہل حدیث گوجراں والا کی بنیاد رکھی۔ غلام محمد ڈار اپنے عہد کی متحرک شخصیت تھے اور نہایت محنتی اور مستعد۔ ۱۹۱۲ء میں ان حضرات کی کوشش سے انجمن اہل حدیث گوجراں والا بنی، لیکن زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔

Marfat.com

اس کے بعد حالات نے ایک عجیب موڑ کاٹا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۱۵ء میں اس عہد کے ایک مشہور عیسائی مبلغ پادری جوالا سنگھ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے گوجراں والے گئے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں اسلام اور مسلمانوں پر زبردست حملے کیے اور کہا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضات کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ کئی دن وہاں رہے اور مسلمانوں کو خوب نشانہ تنقید بنایا۔ وہاں کوئی ایسا عالم دین نہ تھا جو ان کا مقابلہ کرسکتا۔ یہ صورت حال شہر کے مسلمانوں کے لیے نہایت پریشان کن تھی۔ اب جناب غلام محمد ڈار اور منشی قائم الدین نقشہ نویس نے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کو یہاں لایا جائے اور پادری صاحب سے مناظرہ کیا جائے۔ چنانچہ منشی قائم الدین کے والد مکرم حکیم خیرالدین صاحب کو امرتسر بھیجا گیا۔ ان کی کوشش سے مولانا ثناء اللہ امرتسری گوجراں والے تشریف لائے اور پادری جوالا سنگھ سے مناظرہ کیا۔ اللہ نے مولانا کو فتح سے نوازا جس سے شہر اور ضلع گوجراں والا کے مسلمان انتہائی متاثر ہوئے اور مسلک اہل حدیث کے متعلق ان کے دلوں میں بغض وعناد کے جو جراثیم پائے جاتے تھے، وہ نہ صرف ختم ہوگئے بلکہ ان کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوگئی کہ اسلام کے اصل خادم یہی لوگ ہیں۔ ''خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد'' والا معاملہ ہوا۔ مناظرے کے فوراً بعد محلہ حاجی پورہ کے لوگوں سے مشورہ کر کے طے پایا کہ انجمن اہل حدیث ازسرنو قائم کی جائے، چنانچہ ۱۵۔اپریل ۱۹۱۵ء کو مولانا امرتسری کی موجودگی میں دوبارہ انجمن اہل حدیث کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے سیکرٹری جناب غلام محمد ڈار کو منتخب کیا گیا۔ دوسرے عہدے دار بھی اسی وقت منتخب کر لیے گئے۔ اب بہت حد تک اہل حدیث کے متعلق لوگوں کے دل صاف ہوگئے تھے۔

اس وقت جامع مسجد اہل حدیث بہت چھوٹی تھی اور انجمن کے ارکان بھی زیادہ نہیں تھے۔ مسجد کے خطیب وامام مولانا علاء الدین مرحوم تھے جو حضرت مولانا غلام رسول کے شاگرد اور عقیدت مند تھے۔

۱۹۲۱ء کو اس شہر میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے مسجد کی خطابت کے ساتھ ایک اہم کام یہ کیا کہ مدرسہ عربیہ محمدیہ جاری کر دیا، جس کا تمام تر انتظام وہاں کی انجمن اہل حدیث کے سپرد تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، میں ۱۹۴۰ء میں حضرت مولانا محمد اسماعیل کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ یہ رمضان المبارک سے پندرہ سولہ دن بعد کی بات ہے۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اور مولانا دھوپ میں بیٹھے تھے۔ داخلے کے بارے میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کا مکتوب گرامی میرے پاس تھا۔ وہ مکتوب ان کی خدمت میں پیش کیا تو پڑھ کر فرمایا:

''مولوی عطاء اللہ کا کیا حال ہے، فیروز پور میں وہ مطمئن ہیں؟''

عرض کیا: ''جی ہاں! مطمئن ہیں۔''

Marfat.com

اس کے بعد آواز دی: ''مولوی ترکی......!''

آواز سنتے ہی پچیس چھبیس سال کے ایک صاحب آئے۔ چھوٹا قد، پچکی سی ناک، گورا سرخی مائل رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ اس حلیہ کا شخص ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ یہ مولوی ترکی تھے جو دراصل روسی ترکستان کے باشندے تھے اور انقلاب روس کے زمانے میں اپنے خاندان کے ساتھ ترک وطن کر کے ہندوستان آ گئے تھے۔ اس وقت ان کی عمر چند سال کی تھی۔ ادھر ادھر گھومتے گھماتے گوجراں والے آ گئے۔ ان کا نام صلاح الدین تھا اور انھیں کچھ یاد نہ تھا کہ ان کے خاندان کے افراد میں سے کون کہاں ہے۔ وہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کی مسجد میں آئے اور یہاں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا ان پر بہت شفقت فرماتے تھے اور انھوں نے کچھ درسی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ہر دینی و مذہبی مدرسے کے طلبا کا ایک امیر ہوتا ہے، مولانا اسماعیل صاحب کے مدرسے کے طلبا کے امیر مولوی ترکی تھے۔

مولوی ترکی سے مولانا نے فرمایا یہ نیا طالب علم آیا ہے، اسے بتاؤ کہ یہ اپنا سامان کہاں رکھے۔

بہرحال مجھے اس مدرسے میں داخل کر لیا گیا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب اس زمانے میں خط و کتابت وغیرہ میں اپنا نام اس طرح لکھتے تھے: محمد اسماعیل کان اللہ لہ مدرس گجرانوالہ۔ وہ ''گوجراں والا'' کو بالعموم ''گجرانوالہ'' تحریر فرمایا کرتے تھے۔ بعض اوقات ''محمد اسماعیل خطیب'' رقم فرماتے تھے۔ ان کی کنیت ابوالخیر تھی، لیکن نام کے ساتھ بہت ہی کم ''ابوالخیر'' کے الفاظ لکھتے تھے۔ ''سلفی'' کا لاحقہ انھوں نے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے قیام سے کچھ عرصہ بعد کیا۔ ان کے لیٹر پیڈ پر واذکر فی الکتاب اسماعیل کے الفاظ مرقوم ہیں۔ ''اسماعیل'' واوین میں ہے۔

یہ بھی عجیب معاملہ ہے کہ مولانا محمد حنیف ندوی کی تجویز سے اس درس گاہ کا نام جامعہ سلفیہ رکھا گیا تھا۔ مولانا نے یہ تجویز پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ جس طرح ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اپنے نام کے ساتھ ندوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے فارغ التحصیل جامعی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل علیگ لکھتے ہیں، اسی طرح جامعہ سلفیہ کے فارغ التحصیل اپنے آپ کو سلفی لکھیں گے، لیکن اس کے کسی فارغ التحصیل نے اپنے آپ کو سلفی کہلانا پسند نہیں فرمایا، صرف حضرت مولانا اسماعیل صاحب اس کے قیام کے کئی سال بعد کبھی کبھار اپنے نام کے ساتھ سلفی کا لفظ لکھ لیتے تھے۔ اس طرح بعض حضرات انھیں سلفی کہنے لگے۔ البتہ مرکزی جمعیت کے دفتر کے ایک نوجوان ملازم عبدالغفور صاحب اپنے نام کے ساتھ سلفی کا اضافہ کرتے تھے اور وہ سلفی صاحب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔

مولانا اسماعیل صاحب کے مدرسے میں داخل ہونے کے بعد پہلی عیدالاضحیٰ کی تعطیلات ہوئیں تو مجھے

Marfat.com

فرمایا: چھٹیوں میں تم گھر جاؤ گے؟" عرض کیا: "جی ہاں جاؤں گا"۔ فرمایا: "مجھے مل کر جانا۔ میں نے مولوی عطاء اللہ سے ایک کتاب منگوائی تھی، وہ لیتے جانا۔"

دوسرے دن مجھے وہ کتاب بھی دی اور ایک خط بھی ان کے نام دیا، جس میں لکھا تھا: "کتاب میں نے پڑھ لی ہے، بدست اسحاق بھجوا رہا ہوں۔"

بے شمار لوگ انھیں خطوط بھیجتے تھے اور خط کا جواب وہ ضرور دیتے تھے۔

پورے پنجاب (بلکہ ہندوستان) میں میرا خیال ہے دو ہی خطیب تھے، جنھوں نے آغاز قرآن سے آخر تک تسلسل کے ساتھ خطبات جمعہ میں قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کا التزام کیا۔ وہ تھے گوجراں والا میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب اور لاہور کی مسجد مبارک میں ان کے شاگرد رشید مولانا محمد حنیف ندوی......! مولانا اسماعیل صاحب نے ۱۹۲۱ء میں یہ سلسلہ شروع کیا تھا جو ان کی وفات (فروری ۱۹۶۸ء) تک جاری رہا۔ اس طرح سے انھوں نے غالباً جمعہ میں دو قرآن مجید ختم کر کے تیسرے کے کچھ حصے کی تفسیر بھی بیان فرما دی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ۱۹۳۰ء سے آغاز کر کے ۱۹۴۹ء کے وسط تک اٹھارہ انیس سال یہ بابرکت سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثنا میں (بقول میاں عبدالمجید صاحب کے) وہ ایک قرآن مجید ختم کر کے دوسرے کی آخری سورتوں تک پہنچ گئے تھے۔

مولانا اسماعیل صاحب اور مولانا حنیف ندوی کے علاوہ باقی خطیب ہر جمعے میں کسی سورت کی ایک یا ایک سے زائد آیات تلاوت کر کے ان کی روشنی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ صرف رمضان المبارک میں روزے سے متعلق آیات تلاوت کر کے روزے کے اہم مسائل بیان فرماتے یا روزے کے فلسفے اور حکمت سے بحث کرتے تھے۔ باقی گیارہ مہینے وہی سلسلہ جاری رہتا۔

ملکی سیاسیات میں یہ دونوں استاد شاگرد کانگرس کے نقطہ نظر کے حامی تھے، لیکن ان میں سے کسی نے کبھی خطبے میں سیاست کا نام نہیں لیا۔ اگر کبھی کسی وقتی مسئلے سے متعلق کچھ کہنا ضروری ہوتا تو مولانا محمد اسماعیل صاحب خطبہ ثانی میں کچھ اشارے فرما دیتے تھے، لیکن مولانا حنیف ندوی یہ بھی نہیں کرتے تھے۔

کسی عالم دین یا ملک کی اہم شخصیت کے بارے میں مولانا اسماعیل صاحب کچھ ارشاد فرمانا لازمی خیال فرماتے تو اس کا اعلان خطبہ ثانی میں فرماتے تھے، مثلاً ۱۹۴۱ء میں حضرت مولانا محمد صاحب دہلوی جونا گڑھی نے وفات پائی تو اس کا اعلان مولانا نے خطبہ ثانی میں فرمایا تھا اور مولانا جونا گڑھی کی خدمات کا تذکرہ کیا تھا۔ غالباً یہ مارچ کا مہینہ تھا۔

کسی سیاسی جلسے میں تقریر فرماتے تو نہایت واضح الفاظ میں کھل کر سیاسی زبان میں بات کرتے تھے۔

Marfat.com

اسی طرح کا ایک جلسہ جامع مسجد اہل حدیث کے چوک میں ہوا تھا۔ سردیوں کا مہینہ تھا، مولانا محمد چراغ صاحب جلسے کے صدر تھے، ان کا تعلق بھی کانگرس سے تھا۔ اونچی مسجد کے سامنے اس کی سیڑھیوں کے قریب سٹیج تھا۔ مولانا محمد چراغ اس زمانے میں بڑی بڑی موچھیں رکھتے تھے اور سر پر قراقلی قسم کی ٹوپی تھی۔ انھوں نے نظر کی عینک لگا رکھی تھی اور بجلی کی روشنی عینک کے شیشوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مولانا کا چہرہ شیر کے چہرے کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا، مقررین میں حضرت استاذ مکرم مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی شامل تھے۔ یہ بھی ۱۹۴۱ء کی بات ہے۔ گوجرانوالہ کے سیاسی جلسے میں مولانا کا شریک ہونا اور تقریر کرنا لازمی امر تھا...... لیکن مولانا حنیف ندوی اس ذہن وفکر کے حامل ہونے کے باوجود کسی سیاسی جلسے میں تقریر نہیں کرتے تھے۔ (یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا محمد چراغ بعد میں جماعت اسلامی سے منسلک ہوگئے تھے)۔

میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء کے آغاز تک حضرت الاستاد المحترم کی خدمت میں رہا۔ وہ پون بجے خطبہ شروع فرماتے تھے، میں بالالتزام پہلی صف میں بیٹھتا اور نہایت توجہ سے ان کے ارشادات سنتا اور ان سے مستفید ہوتا۔ وہ پنجابی میں تقریر کرتے تھے اور تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ یکساں ان سے استفادہ کرتے تھے۔

مولانا کے اسلوب تقریر اور طرز بیان سے تاثر پذیری کے بارے میں جناب اسماعیل ضیا کی ایک روایت ملاحظہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ سن وسال کا تو انھیں علم نہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ خود ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ خدا جانے کسی مردحق کی طرف سے اشارہ ہوا اور پھر کس کس کی کوشش سے بیل منڈھے چڑھی کہ گوجرانوالہ کے اہل سنت یعنی اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی حضرات اس بات پر متفق ہوگئے کہ شہر میں نماز جمعہ ایک ہی جگہ پڑھی جائے اور ہر مسلک کا خطیب باری باری جمعہ پڑھائے۔

بریلوی مکتب فکر کے خطیب مولانا بشیر حسین اور مولانا صابر حسین تھے۔

اہل حدیث جماعت میں مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا حافظ محمد صاحب گوندلوی علمی اعتبار سے بڑی شہرت کے مالک تھے۔

دیوبندی حضرات کی دو مسجدیں تھیں۔ ایک شیراں والا باغ کے قریب جہاں مولانا عبدالواحد خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے اور دوسری قبرستان کے قریب مسجد ارائیاں تھی، جس کے خطیب مولانا محمد چراغ تھے۔

حافظ محمد صاحب اور مولانا محمد چراغ بے شک جید علمائے دین تھے، لیکن ان کا خطابی رنگ اتنا تیکھا اور موثر نہ تھا۔ ان دونوں حضرات میں سے مولانا محمد چراغ نے اپنے خطبے کی باری مولانا عبدالواحد کو اور حضرت حافظ محمد صاحب نے مولانا محمد اسماعیل کو دے دی۔ البتہ دونوں بریلوی خطیب اپنی اپنی باری لینے پر مصر رہے۔ اب چار خطیب تھے ایک اہل حدیث، ایک دیوبندی اور دو بریلوی۔

Marfat.com

شہر کے اہل سنت کا پہلا اجتماعی جمعہ مولانا محمد اسماعیل صاحب نے پڑھایا اور ان کا خطبہ دیوبندی حضرات کے علاوہ بریلوی مسلک کے علما وعوام نے بھی سنا اور نماز بھی ان کی اقتدا میں پڑھی۔

مولانا نے تین یا چار اجتماعی خطبے دیے تھے کہ بریلوی حضرات نے حیلے بہانوں سے راہ فرار اختیار کرنا شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فطرت سلیم رکھنے والے دانش مند بریلوی عوام مولانا کے دلائل اور خطابت سے متاثر ہونے لگے تھے اور اپنے علما کی سطحیت ان پر آشکارا ہونے لگی تھی۔ جمعے کا یہ اجتماعی سلسلہ تو قائم نہ رہ سکا۔ البتہ اس کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے اور نتائج نہایت اچھے نکلے۔ بعض دیوبندی حضرات نے تو مستقل طور پر نماز جمعہ مولانا کے پیچھے جامع مسجد اہل حدیث میں پڑھنا شروع کر دی اور اہل حدیث کے متعلق جو تھوڑی بہت شکایت کسی وجہ سے پیدا ہوگئی تھی، ختم ہوگئی۔ بریلوی گروہ کے بھی سلیم الطبع لوگ ذہن کو تعصب سے پاک کر کے منطق اور دلیل پر مبنی بات سننے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک عرصے سے دلوں میں جو بغض وتعصب پایا جاتا تھا، اگر اس کا بالکل خاتمہ نہیں ہوا تو اس میں کسی حد تک کمی ضرور واقع ہوگئی۔

یہ مولانا کی تقریروں اور متوازن ومدلل خطبوں کا نتیجہ تھا۔

ہندوستان میں وہ مختلف مذاہب کا زمانہ تھا اور ''میرا مذہب مجھے کیوں پیارا ہے'' قسم کے عنوانات سے متعلق ایک ہی سٹیج پر ایک ہی وقت میں ہندو، مسلم اور ایک عیسائی وغیرہ مقرر تقریریں کرتے تھے۔ چوک نیائیں میں حافظ آباد کو جانے والی سڑک پر بائیں جانب کی ایک کوٹھی میں آریہ سماج کا ایک خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کا سربراہ پڑھا لکھا شخص تھا۔ عام ہندوؤں کی طرح وہ پیچھے کو دھوتی باندھتا اور سر پر پیلے سے رنگ کی پگڑی رکھتا تھا۔ دو تین مہینے کے بعد وہ اپنی کوٹھی میں اسی قسم کا جلسہ کراتا تھا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو بھی اس جلسے میں تقریر کے لیے دعوت دی جاتی تھی اور وہ تقریر فرماتے تھے۔ مجھے کئی دفعہ وہاں مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔

گوجراں والا کے دوستوں سے گزارش ہے کہ یہ وہی کوٹھی ہے، جس میں بہت سالوں سے اے ڈی (اللہ دتہ) ہائی سکول قائم ہے۔ ہمارے بہت سے تعلیمی ادارے اسی قسم کی عمارتوں میں قائم ہیں۔ ہندوؤں کے یہاں سے جانے کے بعد ہم نے ان کو اللہ کے فضل سے مسلمان بنا لیا ہے۔ متعدد سڑکوں، قصبوں اور شہروں کو بھی ہم نے اسلام کا لبادہ اوڑھا دیا ہے۔

گوجراں والا میں اس وقت کھوکھر، ارائیں اور کشمیری برادریوں کی اکثریت تھی۔ مولانا کا ان پر بڑا اثر تھا۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے کہ انھوں نے بچے کا نام رکھنا ہوتا تو مولانا سے پوچھتے۔ مولانا حنیف ندوی نے ازراہ مزاح ایک دن ان سے کہا کہ کسی کی بھینس نے کٹا دیا ہو تو اس کا نام بھی آپ سے پوچھ کر رکھا جاتا ہے۔

Marfat.com

اس زمانے کی انجمن اہل حدیث کے چند ارکان کے نام مجھے یاد ہیں: حاجی اللہ دتہ صدر، غلام محمد ڈار سیکرٹری، حاجی محمد علی خزانچی۔ دیگر ارکان کے نام یہ تھے۔ مہر محمد وزیر، محمد حسین ڈار (صابن والے) عبداللہ اہل حدیث، خود مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ ان کے علاوہ بھی چند حضرات کا انجمن کے معزز ارکان میں شمار ہوتا تھا، لیکن ان کے نام مجھے یاد نہیں رہے...... یہ آج سے چھپن ستاون برس پہلے کے واقعات ہیں۔ اس طویل مدت میں بہت سی باتیں ذہن سے نکل گئی ہیں۔

گوجراں والا لسی اور دودھ کا شہر تھا۔ عام طور پر لوگوں نے گھروں میں بھینسیں رکھی تھیں۔ مولانا کے گھر بھی بھینس تھی۔ وہ خود ہی اس کے لیے چارے کا انتظام کرتے اور خود ہی دودھ دوہتے تھے۔

گوجراں والا ہی میں پہلی دفعہ ملک نصر اللہ خاں عزیز کو دیکھا، اس سے پہلے وہ سہ روزہ اخبار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء کی سردیوں کے دن تھے۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم مسجد میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب مسجد کی دوسری منزل میں دھوپ میں بیٹھے پڑھا رہے تھے۔ ایک صاحب آئے اور السلام علیکم کہہ کر اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگے، کسی نے بتایا کہ یہ نصر اللہ خاں عزیز ہیں۔ اس وقت وہ اپنے نام کے ساتھ ملک کا لفظ نہیں لکھتے تھے۔ بعض طلبا کو بالکل علم نہ تھا کہ نصر اللہ خاں عزیز کون ہیں اور اخبار مدینہ کیا ہے۔ مجھے چوں کہ اس کا علم تھا اور اس سے کئی سال پہلے کوٹ کپورہ اور پھر فیروز پور میں اخبار مدینہ پڑھتا رہا تھا، اس لیے مجھے ان سے دلچسپی تھی اور میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ وہ کچھ دیر مولانا کے پاس اوپر بیٹھے، اور ان سے مل کر واپس تشریف لائے تو میں نے بڑی عقیدت کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا۔

اسی زمانے میں گوجراں والا میں مولانا عبید اللہ انور سے ملاقات ہوئی۔ انھیں مولانا عبدالمجید سوہدروی لے کر آئے تھے۔ انھوں نے ان کو حصول علم کے لیے مولانا محمد اسماعیل صاحب کے سپرد کیا۔ عمر میں مجھ سے وہ بڑے ہوں گے۔ اس وقت وہ ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے، لیکن میرے دل میں ان کا بہت احترام تھا، اس لیے کہ وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کے فرزند ارجمند تھے، جن کی بعض اصلاحی نوعیت کی کتابیں میں پڑھ چکا تھا۔

گوجراں والا اس وقت چھوٹا سا شہر تھا۔ ماڈل ٹاؤن، سیٹلائٹ ٹاؤن وغیرہ آبادیاں وہاں نہ تھیں۔ یہ آبادیاں قیام پاکستان کے بعد قائم ہوئی ہیں۔ عام طور سے لوگ پیدل چلتے تھے، کاریں پورے شہر میں چند ایک ہوں گی۔ سائیکل اور تانگے بھی زیادہ نہ تھے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مدرسے کے سالانہ امتحانات کے لیے لاہور سے مولانا محمد حنیف ندوی کو بلایا جاتا تھا، وہ بھی دراصل گوجراں والا سے تعلق رکھتے تھے اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے شاگرد

Marfat.com

تھے۔ خاص قسم کی وضع قطع اور لباس کی بنا پر وہ دوسروں سے ممتاز تھے۔ میرا امتحان ہوا تو وہ بعض سوالوں کے جوابات سے بہت خوش ہوئے اور مجھے صحیح بخاری کے پرچے میں سو سے ۸۵ نمبر ملے تھے۔

مولانا اسماعیل صاحب کا زیادہ وقت مطالعہ کتب میں صرف ہوتا تھا۔ وہ سفر میں ہوتے یا حضر میں، ایک آدھ کتاب ان کے پاس ضرور ہوتی تھی اور وہ مصروف مطالعہ رہتے تھے۔

اللہ نے ان کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا، وہ تہجد گزار اور قائم اللیل تھے۔ صبح سب سے پہلے مسجد میں آتے۔ سردیوں میں فجر کی نماز کے بعد درس قرآن دیتے اور گرمیوں میں نماز مغرب کے بعد......! بعض اوقات وہ سفر پر جاتے اور رات کو بے شک کتنی دیر سے آتے، لیکن مسجد میں عام معمول کے مطابق نماز فجر سے قبل تشریف لے آتے۔

قرآن مجید پر بڑا استحضار تھا، برمحل قرآن کی آیات ان کی زبان سے ادا ہوتی تھیں۔ نماز میں نہایت درد اور سوز سے قرآن مجید پڑھتے۔

گفتگو اور تقریر میں وہ ''تفعل'' کا صیغہ بالعموم استعمال فرماتے تھے، مثلاً تجمل، تصنع، تصرف، تنبہ وغیرہ۔ ایک دفعہ خطبہ جمعہ میں تفوق کا لفظ ارشاد فرمایا۔ اس سے قبل ہم نے فوقیت تو پڑھا اور سنا تھا لیکن تفوق پہلی دفعہ انہی کی زبان سے سنا۔

ایک دن متنبی پڑھا رہے تھے کہ فرمایا جب اس نے تنبہ کا دعویٰ کیا۔ پھر فوراً بولے جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

متنبی کا نام احمد اور والد کا نام حسین تھا۔ کنیت ابوالطیب تھی۔ کوفے کے محلّہ کندہ میں پیدا ہوا تھا، اس لیے اسے احمد بن حسین کندی کہا جاتا تھا۔ بلند پایہ شاعر اور فصیح اللسان ادیب تھا۔ کسی زمانے میں اس نے نبوت کا دعویٰ کر لیا تھا، پھر تائب ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی متنبی کے عرف میں معروف ہوا اور اس کی کتاب بھی متنبی کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ کتاب درس نظامی میں شامل ہے اور طلبا کو پڑھائی جاتی ہے۔

مولانا نے جہاں تدریسی و تعلیمی اور خطابتی و مسلکی خدمات سرانجام دیں، وہاں سیاسیات میں بھی نمایاں طور سے حصہ لیا۔ ملک کی آزادی کے لیے قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں اور انگریزی حکومت کے معتوب رہے۔ آزادیِ وطن کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا، کئی دفعہ گوجراں والا کی میونسپل حدود بھی نظر بند ہوئے۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں کافی عرصہ سنٹرل جیل (لاہور) میں مقید رہے۔

ہمارے دور طالب علمی میں ان کے پاس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ ترجمان القرآن آتا تھا۔ اس میں مولانا مودودی کا سلسلہ مضامین ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش'' کے عنوان سے شائع ہو رہا تھا،

Marfat.com

جس میں برصغیر کی ان تمام سیاسی جماعتوں کی شدید مخالفت کی جارہی تھی جو آزادی ملک کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ ان مضامین کے مندرجات سراسر انگریزی حکومت کی حمایت میں جاتے تھے۔ میں نے ایک دن مولانا اسماعیل صاحب سے یہ بات عرض کی تو فرمایا جہاں اس ملک کے اور بہت سے لوگ انگریزوں کی حمایت کررہے ہیں، ان میں کلامی نوعیت کی ایک حمایت یہ بھی سہی۔

میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۲ء کے ابتدا تک ان کی خدمت میں رہا۔ میں سولہ سترہ سال کی عمر میں درس نظامی کے مروجہ نصاب سے فارغ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دریائے ستلج کے ہیڈ سلیمان کی میں کلرکی کرتا رہا۔ کچھ مدت ایک سلسلے میں آگرہ اور یوپی کے بعض علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا۔ پھر مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور میں) بطور معلم خدمات انجام دینے لگا۔ اس اثنا میں ریاست فرید کوٹ کی سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور کچھ عرصہ اس ضمن میں فرید کوٹ جیل میں رہا۔ فیروز پور میں جیل میں بھی جانا پڑا۔ اس زمانے میں فیروز پور کے سیشن جج ایس اے رحمان مرحوم تھے۔ ہماری ضمانت انہی نے لی تھی۔ لیکن تمام بھاگ دوڑ اور آوارہ گردی کے باوجود حضرت استاذ محترم مولانا محمد اسماعیل صاحب سے رابطہ قائم رہا۔ ان کی خدمت عالی میں حاضری بھی دی اور خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا رہا کہ وہ اس فقیر پر شفقت فرماتے اور میرے حالات سے واقفیت حاصل کرتے رہتے ہیں۔

ملک تقسیم ہوا تو میرے قدیم وطن کے چند لوگ گوجراں والے چلے گئے تھے، ان میں سے بعض افراد ہمارے موجودہ گاؤں میں ملاقات کے لیے گئے تو انھوں نے بتایا کہ مولانا نے میرے متعلق ان سے کئی دفعہ دریافت کیا ہے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد میں گوجراں والے گیا اور حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ نہایت شفقت سے پیش آئے اور مشرقی پنجاب کے مسلمان جن حالات سے دوچار ہوئے تھے اس کے متعلق بہت سی باتیں دریافت فرمائیں۔

۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث قائم ہوئی تو اس میں یہ فقیر حاضر تھا۔ اس موقعے پر بھی میں نے سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس سے دو تین مہینے بعد (اکتوبر ۱۹۴۸ء میں) خود انہی نے حضرت الاستاد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے پوچھا کہ اسحاق کہاں ہے؟ اسے آفس سیکرٹری کے طور پر یہاں لے آیے، چنانچہ مولانا ممدوح ہمارے گاؤں گئے اور مجھے لاہور آنے کا حکم دیا اور میں لاہور آ گیا۔

اگست ۱۹۴۹ء میں گوجراں والا سے ہفت روزہ الاعتصام جاری ہوا، جس کے ناشر مولانا عطاء اللہ حنیف اور ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔ اس کے اخراجات کی ذمہ دار گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث تھی۔ فروری ۱۹۵۰ء میں مجھے حکم دیا گیا کہ میں معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے گوجراں والے چلا جاؤں۔ میں

Marfat.com

نے حکم کی تعمیل کی، کہنے کو تو میں معاون ایڈیٹر تھا، لیکن کلرک، مینجر حتی کہ خاکروب تک کے فرائض میرے ذمے تھے۔ وہاں جانے کے بعد کئی دن صبح وشام ایسا ہوتا رہا کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب مجھے کھانے کے لیے اپنے ساتھ گھر لے جاتے اور میں ان کے ساتھ کھانا کھاتا۔ پھر میں نے اپنا انتظام کر لیا تو یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اس زمانے میں گوجراں والا کے زیادہ تر لوگ صبح کو کھانا کھاتے اور پھر مغرب کے بعد کھاتے تھے۔ ناشتے یا دوپہر کے کھانے کا سلسلہ عام طور سے وہاں نہیں تھا۔

گوجراں والا جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا اسماعیل صاحب ان دنوں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ تھے اور حکومت نے انھیں گوجراں والا میں نظر بند کر رکھا تھا، اس لیے وہ جمعیت کے دفتر (لاہور) تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ میں ناظم دفتر تھا، فیصلہ کیا گیا تھا کہ عارضی طور پر دفتر گوجراں والا میں منتقل کر دیا جائے، جب مولانا کی مدت نظر بندی ختم ہو جائے گی تو دفتر پھر لاہور منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کا پندرہ بیس سیر کا دفتر ہم نے بوری میں بند کر کے سر پر اٹھایا اور باہر چوک میں آکر اسے گوجراں والا جانے والی بس کی چھت پر پھینکا اور ڈیڑھ گھنٹے میں گوجراں والے پہنچ گئے۔ بس کے اڈے سے جمعیت کے اس دفتر کو پھر سر پر رکھا اور الاعتصام کے دفتر میں جا اتارا۔ یہ تو زیادہ سے زیادہ بیس سیر کا دفتر ہو گا، اس زمانے میں ہم دو من کا دفتر بھی آسانی سے سر پر اٹھا سکتے تھے۔

وہاں پہنچے تو حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا محمد حنیف ندوی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے نہایت ''اعزاز'' کے ساتھ ہمارا ''استقبال'' کیا اور دفتر سے بھری ہوئی بوری ہمارے سر سے اتروائی۔ کچھ کھلانے پلانے اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد فرمایا کہ کل صبح کی نماز کے بعد کاتب صاحب کے گھر جاؤ اور اخبار کے مضامین کی پروف ریڈنگ کرو......! اس کے بعد مولانا اسماعیل صاحب نے ایک لڑکے کو آواز دی اور فرمایا کہ کل صبح ان کو کاتب کے پاس لے جانا۔ یہ اخبار کی پروف ریڈنگ کریں گے۔

میں سوچنے لگا کہ ریڈنگ کے معنی ہیں پڑھنا اور پروف کہتے ہیں دلیل، ثبوت اور گواہی کو......! یہ اخبار کے مضامین کی پروف ریڈنگ کا کیا مطلب ہوا......؟ مضامین کو گواہی، دلیل اور ثبوت کے لیے پڑھنا، یہ کیا بات بنی......؟ ساری رات ہم اس چکر میں رہے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے...... دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ معاون ایڈیٹر صاحب پروف ریڈنگ کے لفظی معنی سے باخبر اور عمل سے بے خبر تھے۔

صبح کو ہم اپنے گائیڈ کے ساتھ پریشانی کے عالم میں کاتب صاحب کے گھر پہنچے۔ مجھے یاد پڑتا ہے ان کا گھر گھنٹہ گھر کے آس پاس کسی گلی میں تھا اور ان کا نام قاضی شمس الدین یا شمس الحق قسم کا تھا۔ دروازے پر دستک دی تو آواز آئی، آجاؤ...... یہ ۱۹۵۰ء کے ماہ فروری کی ۱۰ یا ۱۱ تاریخ تھی اور الاعتصام کے جس شمارے کی

Marfat.com

پروف ریڈنگ کرنا تھی وہ ۷ا۔فروری کا تھا۔ کاتب صاحب کے سامنے لوہے کی انگیٹھی کوئلے سے بھر کر رکھی ہوئی تھی......ایک یا دو دن پہلے انھیں پتا چل گیا تھا کہ ایک شخص معاون ایڈیٹر کے طور پر لاہور سے آرہا ہے اور اس شمارے کی پروف ریڈنگ وہی کرے گا۔ چناں چہ انھوں نے ہم سے پوچھا: پروف ریڈنگ آپ کریں گے؟

عرض کیا: ''جی ہاں! میں ہی کروں گا۔''

یہ صرف ظاہر کی ''ہاں'' تھی۔ اندر سے ہل چکا تھا اور خوف طاری تھا کہ پتا نہیں پروف ریڈنگ کیا بلا ہے۔ اس زمانے میں لتھو کی کتابت اور لتھو کی طباعت چلتی تھی۔ کاتب صاحب نے پیلے رنگ کے کاغذ پر لکھے ہوئے ۴/۳۰×۲۰ سائز کے چار پانچ صفحے مجھے دیے، ان کا مسودہ بھی دیا اور کچی پنسل بھی عنایت فرمائی۔ بولے: ان صفحات کی پروف ریڈنگ کرو۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا: اس میں کوئی غلطی ہوئی تو کہاں لگاؤں؟

انھوں نے بتایا کہ صفحے کے اس طرف لگادو۔

اب میں ساری بات سمجھ گیا تھا اور رات سے جو پرابلم درپیش تھا، وہ ختم ہو چکا تھا اور یہ نکتہ حل ہوگیا تھا کہ پروف ریڈنگ عملاً کیا شے ہے۔

سب سے پہلے میں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے مضمون کی پروف ریڈنگ کی۔ اس مضمون کا عنوان تھا، ''داڑھی کتنی بڑی ہو؟ ایک مقالہ علمیہ''......عنوان سن کر گھبرانا نہیں چاہیے، مضمون واقعی بہت عمدہ تھا۔ یہ اس کی دوسری قسط تھی۔ پہلی قسط ۱۰۔فروری کے شمارے میں ایڈیٹر کے طویل نوٹ کے ساتھ چھپ چکی تھی۔

میں ۳۰۔مئی ۱۹۶۵ء تک تقریباً پندرہ سال الاعتصام سے وابستہ رہا، دو سال معاون ایڈیٹر کی حیثیت سے اور تیرہ سال ایڈیٹر کی حیثیت سے۔ مضامین کی اشاعت کا معاملہ ہمیشہ میرے سپرد رہا۔ اس اثنا میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب مرکزی جمعیت کے ناظم اعلیٰ بھی رہے اور امیر بھی۔ ان کے بے شمار اعلانات اور مضامین اخبار میں چھپے۔ میں نے اپنی ادارتی زندگی میں ان جیسا فراخ حوصلہ مضمون نگار اور کھلے ظرف کا مقالہ نویس نہیں دیکھا۔ انھوں نے مضمون عنایت فرماتے وقت کبھی بصورت حکم نہیں کہا کہ یہ مضمون چھاپ دو، بلکہ ہمیشہ یہ فرمایا کہ میں نے فلاں موضوع پر لکھا ہے، اگر قابل اشاعت ہو تو کسی شمارے میں چھاپ دینا۔ البتہ دوسروں کے مضامین کے بارے میں ضرور فرمایا کہ چھاپ دو یا واپس کر دو۔

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ میں نے ان کا (یا کسی اور بزرگ کا) کوئی مضمون اچھی طرح پڑھے بغیر نہیں شائع کیا۔ مضمون نگار پر اعتماد کر کے بغیر پڑھے مضمون کاتب کو دے دینا نہ اس وقت میری عادت تھی نہ اب ہے۔ ہمیشہ اچھی طرح پڑھ کر اور ضرورت ہو تو کانٹ چھانٹ کر کے مضمون کتابت کے لیے دیتا ہوں۔ حضرت استاذ

Marfat.com

محترم مولانا اسماعیل صاحب کے مضامین میں بھی جہاں کانٹ چھانٹ کی ضرورت سمجھی، کی۔ لیکن اس عالم عالی مقام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم نے میرے مضمون میں تبدیلی یا ترمیم کیوں کی؟ وہی الفاظ کیوں نہیں چھاپے جو میں نے لکھے تھے؟ بحیثیت منصب کے وہ میرے حاکم تھے، میں ان کے ماتحت تھا۔ وہ میرے استاد تھے، میں ان کا شاگرد تھا، مگر انھوں نے مضامین کے سلسلے میں کبھی حکم یا امر کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا، حالانکہ وہ یہ صیغہ استعمال فرمانے میں حق بجانب تھے۔

ان کے بعض مضامین میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی کو بھی دکھا دیتا تھا کہ اس میں جو انداز تحریر اختیار کیا گیا ہے اسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ مولانا غزنوی بالعموم مسکراتے ہوئے کہتے: ''مولانا اسماعیل صاحب کے مضامین آپریشن کر کے شائع کرنے چاہئیں۔''

یہ تو خیر ایک بڑے شخص کا ایک بڑے شخص کے بارے میں فرمان تھا یا ایک دوست کی ایک دوست کے متعلق ایک بات تھی۔ میں یہ الفاظ اپنی طرف سے کہنے کا اہل نہیں۔ میں صرف یہی عرض کروں گا کہ ان کے مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہو جائے یا اس میں کانٹ چھانٹ کی جائے، انھوں نے نہ کبھی اس فقیر سے اس کے متعلق کچھ فرمایا اور نہ کسی سے شکوہ کیا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ فرمایا تو یہ کہ فلاں الفاظ تم نے نکال دیے، چلو ٹھیک کیا۔ بسا اوقات مولانا کے مضامین کسی وجہ سے کچھ دیر کے بھی رہتے تھے......

کم وبیش دو سال قبل کی بات ہے کہ ایک دن گوجراں والا کے جناب ضیاء اللہ کھوکھر میرے گھر تشریف لائے۔ اس سے چند روز پہلے میں اپنے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ حضرت مولانا کا ایک غیر مطبوعہ خاصا طویل مضمون مجھے دست یاب ہوا جو انھوں نے الاعتصام میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا، مگر شائع نہ ہو سکا تھا، پھر میں الاعتصام سے الگ ہوا تو غلطی سے کاغذات میں میرے گھر آ گیا۔ اس کا ذکر میں نے ضیاء اللہ کھوکھر صاحب سے کیا، انھوں نے مضمون دیکھنے کی خواہش کی۔ میں نے مضمون دکھایا تو انھوں نے کہا کہ یہ مضمون انھیں دے دیا جائے۔ حضرت استاذ محترم کا میرے پاس یہ ایک تبرک تھا، لیکن میں کھوکھر صاحب کو انکار نہ کر سکا اور ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا غیر مطبوعہ مضمون انھیں دے دیا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ مضمون مولانا نے عنایت فرمایا، لیکن چھپ نہ سکا اور کئی مہینے میرے پاس پڑا رہا۔ انھوں نے نہ مضمون کی واپسی کا مطالبہ کیا اور نہ اس کی اشاعت کے لیے فرمایا۔

بعض خالص علمی نوعیت کے مضامین میں وہ مقامی لوگوں کا تذکرہ کر دیتے تھے، جس کا کوئی علمی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ رویت ہلال کے موضوع پر نہایت عمدہ مضمون تحریر فرمایا، لیکن چند سطروں میں بعض ان افراد کا تذکرہ بھی فرما دیا، جنھوں نے چاند دیکھنے کی کوشش کی تھی اور مقامی علما کی مجلس میں اس کا ذکر کیا گیا

Marfat.com

تھا۔ میں نے وہ سب باتیں حذف کردیں۔ میری اس نوع کی حرکتوں کو انھوں نے کبھی لائق اعتراض نہیں گردانا۔

وہ بالعموم کسی جلسے کے پوسٹر کی پشت پر مضمون لکھا کرتے تھے۔ دونوں طرف سے صاف کاغذ پر کم ہی تحریر فرماتے تھے۔ اس کے برعکس مولانا داؤد غزنوی نہایت صاف ستھرے سفید کاغذ پر لکھتے تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اسماعیل صاحب جس قسم کے کاغذ پر مضمون لکھتے ہیں، اس قسم کے کاغذ پر میں نہیں لکھ سکتا۔ ایسے کاغذ پر میرا قلم چلتا ہی نہیں۔ بعض دفعہ بے تکلفی سے وہ خود مولانا سے بھی کہہ دیتے تھے کہ آپ اس قسم کے کاغذ پر کیوں کر لکھتے ہیں۔ میں تو لکھنا چاہوں بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے...... ان کی یہ عادت مبارکہ تھی کہ مولانا غزنوی کے سامنے نہ اپنی کسی بات پر اصرار کرتے تھے اور نہ ان کی کسی بات پر عمل کرنے سے انکار فرماتے تھے۔ اپنی رائے ضرور دیتے تھے، اگر مانی گئی تو ٹھیک، نہیں مانی گئی تو کوئی گلہ نہیں۔ ان کے جذبات اور فرمان کا پورا احترام کرتے تھے۔ مولانا غزنوی بھی ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ صدارت اور نظامت کا ایسا شاندار جوڑ کم ہی دیکھنے میں آئے گا۔

بعض جماعتی معاملات میں دونوں کے درمیان اختلاف بھی ہو جاتا تھا اور یہ اختلاف ذہنی کوفت کی حدوں کو بھی چھونے لگتا تھا، لیکن اس میں بھی خوب صورتی کا عنصر کارفرما رہتا تھا، علمی وقار کے تقاضے برقرار رہتے تھے اور ان اقدار کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا جو اہل علم کا مایہ صد افتخار ہیں۔ میں اس قسم کے بعض اختلافات کی نشان دہی کرسکتا ہوں، مگر اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں نے مرحوم و مغفور حضرت مولانا اسماعیل صاحب کی بے شمار تقریریں بھی نہایت انہماک و توجہ سے سنی ہیں اور تحریریں بھی انتہائی غور سے پڑھی ہیں۔ میرے الاعتصام کے پندرہ سالہ دور ادارت میں ان کی چھوٹی بڑی جو تحریر اس اخبار میں شائع ہوئی، اس کا ایک ایک لفظ میں نے پڑھا، بلکہ ان کی ہر تحریر دو مرتبہ پڑھی، ایک مرتبہ کاتب کو دینے سے پہلے اور دوسری مرتبہ کتابت کے بعد پروف ریڈنگ کے وقت......!

لکھنے والے حضرات تحریر اور مقالہ نگاری میں حتی الامکان احتیاط سے کام لیتے ہیں، نہایت سوچ سمجھ کر لکھتے اور ایک ایک سطر بلکہ ایک لفظ بار بار پڑھتے ہیں اور اس پہلو کو بالخصوص مرکز التفات ٹھہراتے ہیں کہ کسی پر ناروا تنقید نہ ہو جائے، کسی پر غلط طور سے کوئی الزام نہ عائد ہو جائے، کسی کے بارے میں کوئی قابل اعتراض لفظ قلم سے نہ نکل جائے۔ تقریر میں البتہ بسا اوقات مقرر کی زبان سے ایسی بات نکل جاتی ہے جو قابل گرفت ہوسکتی ہے۔ اس میں احتیاط کے باوجود زبان دائرۂ احتیاط سے تجاوز کر جاتی ہے، لیکن استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا معاملہ بعض دفعہ اس سے الٹ ہو جاتا تھا، وہ تقریر میں انتہائی محتاط تھے، احتیاط کے باوجود زبان دائرۂ احتیاط سے تجاوز کر جاتی ہے، لیکن استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا معاملہ بعض

Marfat.com

دفعہ اس سے الٹ ہو جاتا تھا، وہ تقریر میں انتہائی محتاط تھے، احتیاط کی ترازو میں تول تول کر جچے تلے الفاظ زبان سے ادا فرماتے تھے، مجال کہیں جھول پیدا ہو جائے۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے اس کے تمام گوشوں کی بہ درجہ غایت حسن وخوبی سے وضاحت فرماتے۔ موضوع کی مناسبت سے سکہ بند الفاظ خود بخود ان کی زبان پر آجاتے تھے۔ مگر تحریر میں یہ معاملہ بعض اوقات باقی نہ رہتا تھا۔ اس میں ایسی باتیں بھی آجاتی تھیں جو ان کے مرتبہ علمی سے مطابقت نہیں کرتی تھیں، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا ان میں یہ خوبی تھی (جو اکثر مقالہ نگار علما میں نہیں پائی جاتی) کہ اس طرف ان کو توجہ دلاؤ تو فوراً ایسے الفاظ قلم زد کر دیتے یا خود فرما دیتے کہ تم اپنی پالیسی کے مطابق جو حک واضافہ کرنا مناسب سمجھتے ہو کر لو۔ ان کو پوچھے بغیر بھی کانٹ چھانٹ کی جاتی تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ پھر ان کی تحریروں سے یہ بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لکھ کر نظر ثانی نہیں فرماتے تھے۔ چناں چہ کے، میں، سے وغیرہ بہت سے الفاظ ان کے قلم کی گرفت میں نہیں آتے تھے۔ نظر ثانی نہ کرنے کے باعث بعض جملے بھی بعض دفعہ ادھورے رہ جاتے تھے، جن کی تکمیل کرنا ایڈیٹر کا فرض ہے اور میں اس فرض پر عمل کرتا تھا۔

وہ معلومات کا وسیع ذخیرہ رکھتے تھے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات اور علم کلام وغیرہ سے متعلق ان کے مطالعے میں بڑا پھیلاؤ تھا اور قلم میں بھی زور اور اثر تھا۔ عربی، اردو اور فارسی پر انھیں عبور حاصل تھا، اس لیے روانی اور تیزی سے لکھتے تھے۔ جب کسی موضوع پر مضمون طلب کیا، انھوں نے عنایت فرما دیا۔

امروز اس زمانے میں بہت بڑا اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر جناب ظہیر بابر اور حمید جہلمی صاحب نے کئی دفعہ امروز کے بعض نمبروں کے لیے مجھ سے کہا کہ میں مولانا سے مضمون لکھوا کر انھیں دوں، چناں چہ میں نے ان کی خدمت میں گزارش کی اور انھوں نے مضمون مرحمت فرما دیا اور پھر وہ مضمون امروز میں چھپا۔

میں فروری ۱۹۵۰ء میں الاعتصام سے وابستہ ہو کر گوجراں والا گیا تو دس سال قبل (۱۹۴۰ء) کی روایت کے مطابق مولانا کا خطبہ جمعہ باقاعدگی کے ساتھ سنتا رہا۔ اس سے الفاظ بھی ملتے تھے، جملوں کے دروبست کا پتا بھی چلتا تھا، ایک خاص انداز کلام سے آگاہی بھی ہوتی تھی اور معلومات بھی حاصل ہوتی تھیں۔

اس وقت مولانا مسعود عالم ندوی گوجراں والا میں مقیم تھے۔ انھوں نے وہاں ''دارالعروبہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جو مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد کے قریب ہی تھا۔ وہ عام طور پر روزانہ دو یا تین نمازیں اسی مسجد میں پڑھتے تھے۔ خطبہ جمعہ میں وہ خاص اہتمام سے آتے اور پہلی یا دوسری صف میں بیٹھ کر بڑی توجہ سے خطبہ سنتے تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ مولانا پنجابی میں تقریر کرتے ہیں، اور آپ اتنی دلچسپی سے ان کی تقریر سنتے ہیں، آپ کے کچھ پلے پڑتا ہے؟

بولے: ''پنجابی ان کی تقریر میں کہاں ہوتی ہے، یا وہ عربی الفاظ بولتے ہیں یا فارسی...... پنجابی کے الفاظ

Marfat.com

صرف ''اسیں'' اور ''تسیں'' ہوتے ہیں، وہ میں جانتا ہی ہوں۔ اسیں کے معنی ہم اور تسیں کے معنی آپ یا تم......!''

علمائے دین کے حلقے میں ان کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ان اکتیس علما کے اجلاس میں شامل تھے، جنھوں نے ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴۔ جنوری (۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵۔ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ) کو کراچی میں اسلامی آئین سے متعلق بائیس نکات کا مسودہ تیار کر کے حکومت پاکستان کو دیا تھا۔ یہ اجلاس سید سلیمان ندوی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔

مولانا انتہائی دریانت دار بزرگ تھے۔ پیسے کے معاملے میں بعض علمائے دین کی شہرت کچھ دوسری قسم کی ہے، لیکن مولانا اسماعیل مرحوم میں اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیات ودیعت فرمائی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ روپے پیسے کے سلسلے میں ان کا دامن اعتراض سے ہمیشہ پاک رہا۔ جو تھوڑی بہت رقم جس ادارے کے لیے ان کے پاس کہیں سے آئی، انھوں نے فوراً متعلقہ ادارے کو پہنچا دی۔

ان کا چندہ مانگنے کا ڈھنگ بھی عجیب تھا۔ وہ سخت ضرورت کے وقت کسی ادارے کے لیے لوگوں سے چندے کی اپیل کرتے تھے اور انتہائی مجبور ہو کر جمعے میں اعلان فرماتے تھے۔ وہ جب یہ کہتے کہ میں چندہ مانگنے کا عادی نہیں، نہ مجھے یہ معلوم ہے کہ چندہ کس انداز میں اور کن الفاظ میں مانگا جاتا ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فلاں ادارے کے لیے کچھ روپے کی ضرورت ہے۔ آپ اس میں جو حصہ ڈال سکتے ہیں، ڈال لیے۔ اس قسم کے الفاظ سے ایک معقول رقم فوراً جمع ہو جاتی۔

انھوں نے گوجراں والا میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ اس شہر کو انھوں نے اپنا مستقل مسکن قرار دے لیا تھا۔ وہ محدود تنخواہ پر یہاں درس وخطابت کی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بہت سے مقامات سے اچھی خاصی تنخواہ پر انھیں بلایا گیا، مگر وہ نہیں گئے۔ ۱۹۵۶ء میں مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو وہاں سے بہت بڑے مشاہرے پر انھیں دعوت دی گئی، لیکن انھوں نے گوجراں والا نہیں چھوڑا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض علمائے کرام اپنے آپ کو نیلام کی منڈی میں لے آئے ہیں۔ ان کی بولی لگاؤ، جس کی بولی زیادہ ہوگی، اس کے ساتھ چلے جائیں گے اور جس مقام پر رہ رہے ہیں، پیسے کے لالچ میں اسے بلا تامل چھوڑ دیں گے۔

مولانا محمد حنیف ندوی ان کے شاگرد تھے اور وہ بھی گوجراں والا کے رہنے والے تھے۔ عام طور سے مجلس میں اور نجی محفلوں میں اردو بولتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کے زمانہ صدارت میں جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ مجلس میں اپنی رائے بڑے دھڑلے سے زوردار الفاظ میں پیش کرتے تھے۔ ان کی رائے اگر مولانا اسماعیل صاحب کی رائے سے مختلف ہوتی تو فرماتے، ''مولوی حنیف سانوں اردو بول کے ڈرالیند اے۔''

مولانا محمد حنیف ندوی کے بارے میں یہاں ایک بات اور سنتے جایے۔ وہ اخبار الاعتصام کے ایڈیٹر تھے اور ایک سو روپیہ ان کی تنخواہ تھی، جس میں سے سولہ روپے وہ مکان کا کرایہ دیتے تھے۔ اس مکان میں بجلی

Marfat.com

نہیں تھی۔ اگرچہ وہ بہت سستا زمانہ تھا، مگر سو روپے میں گزارا کرنا بڑا مشکل تھا...... اخبار کی آمدنی اور خرچ کا حساب قاضی عبدالرحیم صاحب کے پاس تھا جو نہایت صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ تنخواہیں وہی دیتے تھے...... ایک دفعہ مولانا حنیف ندوی نے ان سے اپنی بعض ضرورتیں بیان کیں اور سو روپیہ قرض مانگا، فرمایا: ''یہ سو روپیہ ان کی تنخواہ سے پچیس روپے ماہانہ کے حساب سے چار مہینے میں وصول کیا جائے۔'' قاضی صاحب نے ان کو قرض دے دیا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، ہر ملازم اپنے ادارے سے قرض لے سکتا ہے اور بوقت ضرورت لیتا ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب کو اس کا پتا چلا تو وہ قاضی صاحب پر خفا ہوئے۔ فرمایا: ''انھیں کیوں قرض دیا گیا۔ اگر اس اثنا میں وہ مر گئے تو قرض کیسے وصول ہوگا۔'' قاضی صاحب نے ان کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانے۔ حکم ہوا کہ انھیں اس مہینے کی تنخواہ نہ دی جائے اور قرض وصول کر لیا جائے۔ قاضی صاحب نے مجبور ہو کر تنخواہ روک دی اور قرض وصول کر لیا۔

مولانا حنیف صاحب نہایت پریشان ہوئے۔ اس کا علم ان کے ایک دوست صوفی نذیر حسین مرحوم کو ہوا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے میری معرفت مولانا ندوی کو سو روپے بھیجے۔

صوفی نذیر حسین صاحب تقسیم ملک سے پہلے امرتسر رہتے تھے، تقسیم کے بعد امرتسر سے گوجراں والا چلے گئے تھے۔ وہ کشمیری برادری کے ان حضرات سے تعلق رکھتے تھے، جنھیں ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔

ہم اپنے قیام گوجراں والا کے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک کے زمانے کی یادداشتوں کو ٹٹولنے کی کوشش میں ہیں۔ اس وقت وہاں کی انجمن اہل حدیث کے ارکان میں سے مندرجہ ذیل حضرات میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ اس فقیر کے علاوہ جماعتی حیثیت سے تحریری صورت میں آج تک نہ ان کا کسی نے نام لیا ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ کوئی لے گا۔ اس لیے کہ یہ جماعت اہل حدیث کے اصحاب علم کی خصوصیت ہے کہ جو مر گیا، بس مر گیا، اس کا نام لینے اور تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں اتنی مصروفیات ہیں کہ اللہ رسول کا نام لینا مشکل ہو رہا ہے، ان امتیوں کا نام کون لے......! تو آیئے تھوڑے سے تعارف کے ساتھ اس دور کی انجمن کے ارکان کے اسمائے گرامی سے گوجراں والا کی موجودہ انجمن اہل حدیث کے ارکان کو متعارف کرانے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ گوجراں والا کی انجمن کے ارکان یہ مضمون پڑھیں گے بھی؟ اس کا جواب میرے خیال میں نفی میں ملے گا۔ تاہم ہمارا کام اپنا فرض ادا کرنا ہے، ان کو پڑھانا ہمارے فرائض میں شامل نہیں۔

۱۔ حاجی اللہ دتہ: گوجراں والا کے رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہاں کا اے ڈی ہائی سکول انھی کے نام سے ہے۔ یہ انجمن کے صدر تھے۔ تادم واپسیں اس منصب پر فائز رہے۔

۲۔ غلام محمد ڈار: ۱۵۔ اپریل 1915ء کو گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث قائم ہوئی تھی۔ انھیں اس وقت اس

Marfat.com

کے سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔ بڑے دھیمے مزاج کے بزرگ تھے۔ زندگی کے آخری دم تک انجمن کے سیکرٹری رہے۔ عجائب گھر لاہور کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کے والد محترم تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب کو ان پر بہت اعتماد تھا۔

۳۔ حاجی محمد علی: طویل قامت بزرگ تھے۔ پیکر خلوص اور صاحب تقویٰ...... انجمن کے خزانچی تھے اور اس منصب کا کامل احترام کرتے تھے۔ مجال کوئی پیسہ بے جا خرچ ہو جائے۔ زندگی بھر یہ ذمے داری ان کے سپرد رہی۔ ہمارے دوست جناب اسماعیل ضیا (سابق ایم پی اے) کے والد مکرم تھے اور میرے مہربان......!

۴۔ سیٹھ نظام الدین: پرانے خلافتی اور کانگرسی، سماجی اور جماعتی خدمات میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کے صاحب زادوں اور پوتوں اور نواسوں نے بھی اپنے انداز میں خدمات انجام دیں اور انجام دے رہے ہیں۔

۵۔ خواجہ عبدالعزیز: بہت عرصے تک اے جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ خواجہ محمد یوسف اور خواجہ محمد قاسم کے والد تھے۔ مجھ پر شفقت فرماتے تھے۔

۶۔ مہر محمد شفیع: انجمن کے پرانے رکن مہر محمد وزیر کے صاحب زادے تھے۔ مولانا اسماعیل صاحب کے لائق اعتماد دوستوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ہمارے دوست میاں محمد افضل کے بڑے بھائی تھے۔

۷۔ عبداللہ اہل حدیث: بڑے جی دار اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ اس مسلک کے لیے انھوں نے بے حد تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کسی زمانے کے بعد وہاں جناب غلام محمد ڈار، بابو نصیر الدین اور کبھی کبھی مولانا اسماعیل صاحب بھی آجاتے تھے۔ پھر شام تک محفل جمتی تھی۔ میں اور مولانا حنیف ندوی صاحب بھی عام طور سے اس میں شریک ہوتے تھے۔

۸۔ حاجی عبدالکریم: ان کا مکان مولانا کی مسجد کے قریب تھا اور گوجراں والا کی صاحب حیثیت شخصیت تھے۔

۹۔ بابو نصیر الدین: ضلع گوجراں والا کے کواپریٹو بنک کے جنرل منیجر تھے۔ بہت قریب کی رشتے داری میں مولانا حنیف ندوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انجمن کے نائب ناظم تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اسسٹنٹ لائبریرین خالد جاوید کے والد تھے۔ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک دن تنہائی میں کہا کہ میں شام کا کھانا ان کے ساتھ کھایا کروں، میں نے معذرت کی، لیکن معذرت قبول نہیں ہوئی اور اصرار کیا کہ ان کی بات مانی جائے۔ چناں چہ دس بارہ دن میں نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔

۱۰۔ منشی محمد یوسف: پرانی سبزی منڈی میں ان کی آڑھت کی دکان تھی۔ جالندھر سے پناہ گزیں کی حیثیت سے گوجراں والا آکر آباد ہوئے تھے۔ ارائیں برادری سے تعلق تھا۔ شریف الطبع اور کم گو......! ہماری ایک دوسرے کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ انجمن اور اخبار کی آمدنی اور خرچ کا حساب عام طور پر یہی

Marfat.com

لکھتے تھے۔ ان کا خط (ہینڈ رائیٹنگ) بہت اچھا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ منشی محمد یوسف کے علاوہ وہاں کی انجمن اہل حدیث کا کوئی رکن مہاجر یا پناہ گزین نہ تھا۔ تمام ارکان مقامی حضرات تھے، حالاں کہ امرتسر گورداس پور اور فیروز پور وغیرہ کے اضلاع سے بے شمار لوگ وہاں جا بسے تھے۔ مالی اعتبار سے بھی وہ اچھی خاصی حیثیت کے مالک تھے۔ تعلیم، تدین اور جماعتی تعلق وانسلاک کی بنا پر بھی ان کا ایک مقام تھا۔

ان حضرات کے علاوہ اور لوگ بھی ہوں گے، لیکن مجھے ان کا علم نہیں۔ یہ سب لوگ یکے بعد دیگرے سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں۔ رحمهم الله تعالیٰ۔

گوجراں والا سے مجھے پیار ہے اور وہاں کے طریق گفتگو سے بھی محبت ہے۔ میں نے اس شہر میں تعلیم بھی حاصل کی اور قلم پکڑنے کا طریقہ بھی وہیں سیکھا۔ وہاں اِدھر کو ''ایتل'' اور اُدھر کو ''اوتل'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً کسی سے کہنا ہو اِدھر آؤ تو کہا جاتا ہے ''ایتل آؤ''۔ اگر یہ کہنا مقصود ہو اور اُدھر جاؤ تو کہا جاتا ہے ''اوتل جاؤ''۔

گوجراں والا کو بہت سے لوگ ''گویراں آلہ'' کہتے ہیں۔ وہ پہلوانوں کا شہر ہے۔ ''زور'' کرنے کو وہاں ''یور'' کرنا کہا جاتا ہے۔ روٹی کے لقمے کو ''گراں'' بولتے ہیں۔

''تین'' کے لیے ''ترے'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

گوجراں والے کے ایک دوست نے بتایا کہ ایک شخص ریل پر بغیر ٹکٹ کراچی جا رہا تھا۔ حیدر آباد پہنچا تو ٹی ٹی نے پکڑ لیا۔ پوچھا: کتنے سٹیشن بغیر ٹکٹ سفر کیا ہے؟ جواب دیا: ''ترے سٹیشن''۔ ٹی ٹی نے کہا: نکالو گوجراں والا سے یہاں تک کا کرایہ! اس نے کہا: کیوں؟

جواب دیا: تمھاری ''ترے'' بتا رہی ہے کہ تم گوجراں والے سے آ رہے ہو۔

یہ فقیر شاگرد کی حیثیت سے بھی حضرت مولانا کی خدمت میں رہا اور جمعیت کے ناظم دفتر اور اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ان کے قریب ترین رہنے کا موقع ملا۔ اس لیے میں ان کی جماعتی اور اجتماعی زندگی کے متعدد پہلوؤں سے آگاہ ہوں۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک دو ڈھائی سال یہ عاجز الاعتصام کے سلسلے میں گوجراں والے رہا۔ ان دنوں مشرقی پنجاب سے آنے والے لٹے پٹے بہت سے مسلمان مغربی پنجاب اور پاکستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں آ بسے تھے۔ گوجراں والا میں بھی لاتعداد پناہ گزین آباد ہو گئے تھے اور انھوں نے دکانیں اور مکان الاٹ کرا لیے تھے، بعض پناہ گزینوں کی مالی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی...... جمعے کے خطبہ ثانی میں مولانا نے کئی دفعہ اس کا ذکر کیا اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ الاٹ منٹ کے سلسلے میں تمام توجہ پناہ گزینوں ہی کی

Marfat.com

طرف نہ رکھے، مقامی لوگوں کے حقوق کا بھی خیال کرے۔ انھوں نے بھی تحریک پاکستان میں حصہ لیا ہے......

عورتوں کے پردے کے مسئلے سے متعلق مولانا بڑے سخت تھے۔ وہ کالے برقعے کو بھی صحیح نہ قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک سفید برقعہ پہننا ضروری تھا۔ یہ آج سے پینتالیس چھیالیس برس پہلے (۱۹۵۱ء) کی بات ہے۔ خود مولانا کی وفات پر بھی اٹھائیس برس کی مدت بیت گئی ہے۔

اب سوچتا ہوں کہ اس اثنا میں پردے کا معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ کالا برقعہ بھی گھروں سے غائب ہوگیا۔ عورتیں پرنسپل ہیں، پروفیسر ہیں، بینکوں میں ملازمت کرتی ہیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں خدمات انجام دیتی ہیں، انجینئر ہیں، ڈاکٹر ہیں، وہ کہاں پردہ کرتی ہیں اور کس طرح پردہ کرسکتی ہیں۔ بڑے بڑے متدین گھروں میں ہم نے دیکھا ہے کہ پردے کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ پرانی قدریں بالکل بدل گئی ہیں۔ علمائے کرام کی بیٹیاں پردہ کرتی تھیں، لیکن ان کی پوتیوں اور نواسیوں نے فنی تعلیم حاصل کر کے اس سے نجات حاصل کرلی ہے۔ اب اگر کسی صورت میں مولانا کو ہمارے گھروں کی موجودہ حالت کا علم ہو جائے تو ان پر کیا گزرے۔

جامعہ سلفیہ کے قیام کے بعد حضرت مولانا اسماعیل صاحب نے جامعہ کی خدمت کو اپنا فرض قرار دے لیا تھا۔ اس کے قیام کے چند سال بعد اپنی نسبت بھی انھوں نے اسی طرف کرلی تھی اور وہ اپنے آپ کو سلفی لکھنے لگے تھے، جب کہ اس کے قیام سے پہلے وہ اپنے نام کے ساتھ سلفی کا لفظ نہیں تحریر فرماتے تھے۔ جماعت کے سرمایہ دار ارکان سے ان کا تعلق اگرچہ پہلے ہی سے تھا مگر جامعہ کے قیام کے بعد اور زیادہ ہوگیا، میاں فضل حق مرحوم کو جامعہ کا صدر بنانے کی بڑی وجہ یہی تھی۔ انھوں نے کسی سرمایہ دار سے کبھی کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا، لیکن جماعت اور جامعہ کے لیے ضرور اس گروہ سے قرب پیدا کیا۔ یہ ان کی مجبوری تھی۔

مولانا اسماعیل صاحب دولت مند ارکان جماعت کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے، لیکن اس سے انھیں ذاتی مفاد ہرگز مطلوب نہیں ہوتا تھا بلکہ جماعتی مفاد ان کے مدنظر رہتا تھا۔

وہ دفتری معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ہر جمعرات کو گوجراں والا سے لاہور تشریف لاتے تھے۔ اس دن وہ دفتر کے عملے سے ملاقات کرتے، انھیں ضروری ہدایات دیتے اور مولانا غزنوی سے جماعتی سلسلے میں گفتگو فرماتے۔ مولانا غزنوی کو ان کی آمد کا پتا چل جاتا تو تمام مصروفیات ترک کر دیتے اور دیر تک ان سے گفتگو فرماتے۔

مولانا کا انداز کلام نہایت دلچسپ تھا۔ روپڑی علمائے کرام کا موقف یہ تھا کہ جماعت کے سربراہ کو صدر کی بجائے امیر کہنا چاہیے۔ اگر امیر کہا جائے گا تو مرکزی جمعیت سے مصالحت ہوسکتی ہے۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ مولانا اسماعیل صاحب ذہناً اس پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے نزدیک امیر کے بجائے ''صدر'' پسندیدہ لفظ تھا۔ ایک دن فرمایا: یہ حضرت الامیر معلوم نہیں کیا لفظ ہے۔ کوئی ہماری بات مانتا نہیں اور ہم امیر صاحب

Marfat.com

ہیں۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: بچے سے پانی کا گلاس مانگا جائے تو پانی دینے کے بجائے دوسری طرف منہ کر لیتا ہے، جیسے اس نے بات سنی ہی نہیں، لیکن ہم امیر ہیں۔ کوئی جھگڑا، کوئی نزاع، ہم حل نہیں کر سکتے۔ کسی کا اختلاف ختم کرانے کی ہم میں سکت نہیں، لیکن امارت پر ہمارا قبضہ ضرور رہنا چاہیے۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا: صلح لفظ امارت اختیار کرنے کے بعد بھی نہیں ہو گی۔ اور واقعی صلح نہیں ہوئی۔ پھر یہ ہوا کہ جس ''حضرت الامیر'' کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ لفظ انھوں نے خود بھی استعمال فرمایا، اوران پر بھی استعمال ہوا۔

ایک دن ایک جنازے میں شامل ہوئے۔ اس وقت ان کی طبیعت ناساز تھی اور کافی کمزور دکھائی دیتے تھے۔ کسی نے کہا: آپ خود بیمار ہیں، جنازے میں نہ آتے۔ فرمایا: اسی لیے تو آیا ہوں کہ خود بیمار ہوں۔ پنجابی میں کہا: ''ایہ نیوندرا بھاجی اے'' میں کسی کے جنازے میں شامل ہوں گا تو لوگ میرے جنازے میں شامل ہوں گے۔ یہ الفاظ کچھ ایسے انداز میں کہے کہ بعض لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

بعض دفعہ بات اس ڈھب سے لطیفے کے سانچے میں ڈھل کر ان کی زبان سے نکلتی کہ لطف آ جاتا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو...... اہل حدیث حضرات کو کچھ عرصے سے ننگے سر نماز پڑھنے کی ایسی عادت پڑی ہے کہ اب انھوں نے اسے شرعی مسئلہ بنا لیا ہے۔ دیگر اکابر علمائے اہل حدیث کی طرح حضرت مولانا اسماعیل صاحب کے نزدیک یہ سخت ناگوار حرکت تھی۔ ایک دن مولانا اپنی مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک مولوی صاحب آئے۔ انھوں نے کلے پر پگڑی باندھ رکھی تھی۔ پگڑی سر سے اتار کر نیچے رکھی اور نماز پڑھنے لگے۔ نماز پڑھ چکے تو مولانا نے فرمایا: یہ آپ نے کیا کیا؟ پگڑی اتار کر نماز پڑھنا کون سا مسئلہ ہے؟

بولے: میں نے ٹھیک کیا ہے۔ آپ میرے ساتھ مناظرہ کر لیں۔ پنجابی میں بات ہو رہی تھی۔ مولانا نے فرمایا: مجھے آپ سے مناظرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو ایک شریفانہ بات کی ہے۔ میرے ولوں لک دی وی لاہدے......!

مولانا اسماعیل صاحب پر کوئی اعتراض کیا جاتا تو ایسے دلچسپ انداز میں جواب دیتے کہ خود اعتراض کرنے والا بھی محظوظ ہوتا۔ دس محرم کو تعزیے کا جلوس مولانا کی مسجد کے سامنے سے گزرتا ہوا وہاں رک جاتا تھا اور کافی دیر ماتم ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ رات کے نو بجے سے بعد کا وقت تھا کہ یہی معاملہ ہوا۔ اس اثنا میں کسی طرف سے دو روڑے جلوس میں پھینکے گئے۔ مولانا کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ دوسرے دن ڈی سی کو بات اس طرح پہنچائی گئی کہ روڑے مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد سے آئے تھے۔ ڈی سی نے شہر کے علمائے کرام کو بلا لیا جن میں مولانا بھی شامل تھے۔ ڈی سی نے مولانا سے روڑوں کے بارے میں پوچھا تو جواب دیا: روڑوں کا تو مجھے علم نہیں کہ کس طرف سے آئے۔ میں اس قسم کی حرکت کرنے والوں اور کسی مسلک کے لوگوں کو تکلیف پہنچانے

Marfat.com

والوں کا سخت مخالف ہوں، لیکن ان حضرات کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ مسجد کے سامنے آکر وہ اتنی دیر کیوں رکتے ہیں؟ یہ اس طرح وہاں آکر ماتم کرتے ہیں کہ جیسے حضرت حسینؓ کو ہم نے شہید کیا ہے اور اسی جگہ کیا ہے؟

یہ الفاظ سن کر ڈی سی بھی مسکرانے لگا اور خود شیعہ حضرات کے چہروں پر بھی مسکراہٹ چھا گئی......اور پھر بات ختم ہوگئی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ بہت بڑے شیعہ عالم اور مجتہد مفتی جعفر حسین گوجراں والا کے رہنے والے تھے اور ان کا مکان مولانا کی مسجد کے قریب تھا، بچپن میں وہ اسی مسجد میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے اور وہاں کے جلیل القدر عالم اور انجمن اہل حدیث کے معزز رکن قاضی عبدالرحیم کے وہ شاگرد تھے۔ ان سے اور دوسرے شیعہ اہل علم سے مولانا کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

مولانا کا زمانہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کا زمانہ تھا اور تمام مذاہب کے اصحاب علم آپس میں مباحثے اور مناظرے کرتے رہتے تھے۔ مولانا بھی ابتدائی علمی زندگی میں مناظروں سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس میدان میں اتر بھی پڑے تھے، لیکن جلد ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا تھا۔ انھوں نے اس ضمن میں ایک دفعہ فرمایا کہ کامیاب مناظر وہ ہے جسے حریف کے اعتراض کا جواب فوراً سوجھ جائے۔ لیکن کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انھیں فوری طور پر جواب نہیں سوجھا، اس لیے انھوں نے اس سے جلد ہی تعلق منقطع کر لیا۔

حضرت مولانا سے متعلق اپنی یادداشتوں کا ہم طویل سفر طے کر چکے ہیں، لیکن اس سفر میں کچھ سنجیدگی کا غلبہ رہا ہے۔ ان کی بھاری بھرکم شخصیت کے سامنے لطیفے کا عنصر دبا دبا سا رہا۔ اب یہاں انہی کا سہارا لے کر دو لطیفے بیان کیے جاتے ہیں، سماعت فرمایے۔

مولانا علی محمد صمصام جماعت اہل حدیث کے مشہور واعظ اور شاعر تھے۔ آواز بڑی تیکھی اور دلکش تھی۔ جب ان کے پنجابی اشعار میٹھی اور رسیلی آواز کے ساتھ ان کی زبان سے ادا ہوتے اور فضا میں بکھر کر لوگوں کے پردہ سماعت سے ٹکراتے تو بڑے بڑوں کے قدم رک جاتے۔ ایک دن وہ اور مولانا اسماعیل صاحب کہیں جا رہے تھے کہ ٹرین کے انتظار میں ایک ریلوے اسٹیشن پر رکنا پڑا۔

مولانا علی محمد صمصام نے لطیفہ سنایا کہ ایک مراثی نے سن رکھا تھا کہ رمضان المبارک کی ستائیسویں رات کو جو دعا مانگی جائے اللہ قبول فرماتا ہے۔ چناں چہ عشا کے بعد اس نے ہاتھ میں لوہے کا بڑا سا ڈنڈا پکڑا اور کھڑے ہو کر دعا مانگنا شروع کی یا اللہ اسے سونے کا بنا دے...... یا اللہ اسے سونے کا بنا دے...... صبح تک دعا مانگتا رہا، لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ اکتا کر ڈنڈا زمین پر پھینکتے ہوئے کہا، اسے اگر سونے کا نہیں بنانا تو میرا کوٹھا ہی ڈھا دے......کوٹھا دھڑام سے زمین پر آ گرا......!

Marfat.com

بولا: انھاں کماں نوں بڑا شیر ایں۔

اس کے جواب میں مولانا نے لطیفہ سنایا کہ ایک پٹھان نے گھر میں گدھا بھی رکھا تھا اور گائے بھی......! گدھا اسے بہت پریشان کرتا تھا، کبھی بھاگ کر کھیتوں میں چلا جاتا اور لوگوں کی فصل کھا جاتا۔ کبھی گھر سے گیہوں اور چنے کھا جاتا۔ کبھی کسی کو دولتی مارتا...... پٹھان اس کی ان حرکتوں سے تنگ آ گیا اور اللہ سے دعا کی یا اللہ! میں اس سے بہت تنگ آ گیا ہوں، یہ مر جائے......

گدھا تو نہ مرا البتہ گائے مرگئی۔

پٹھان نے غصے میں اللہ سے کہا:

صد سال خدائی کردی، گاؤ خر رانہ شناسی۔

اسی قسم کا ایک لطیفہ جاٹ کی طرف منسوب ہے۔ کہتے ہیں جاٹ سفر پر پیدل جا رہا تھا۔ چلتے چلتے تھک گیا تو دعا کی یا اللہ! مجھے سواری کے لیے گھوڑی عطا فرما...... تھوڑی دور آگے گیا تو تھانیدار گھوڑی لیے بیٹھا تھا اور گھوڑی کا چھوٹا سا بچہ تھا جو چل نہیں سکتا تھا۔ تھانیدار نے جاٹ سے کہا: گھوڑی کے بچے کو کندھوں پر اٹھاؤ...... جاٹ نے بچہ اٹھا لیا اور اللہ سے کہا:

ربا! میں تیرے کولوں خود سوار ہون واسطے گھوڑی منگی سی، توں الٹا میرے اتے سوار کر دتی۔

ایک دن دو بجے کے قریب عزیز انصاری صاحب مولانا کے پاس آئے اور اپنی عادت کے مطابق ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ میں بھی موجود تھا۔ مولانا نے فرمایا: بیٹھے باتیں بنا رہے ہو، تم دونوں کاموں کی جاؤ اور وہاں الاعتصام کے خریدار بناؤ۔ ہم اسی وقت چل پڑے۔ گوجراں والا سے کاموں کی کا کرایہ غالباً اس وقت چار آنے تھا۔ ہم وہاں دو آدمیوں سے ملے، چوہدری نذیر احمد سے اور شیخ بشیر احمد سے...... گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش سے ہم نے پندرہ سالانہ خریدار بنائے۔ الاعتصام کی سالانہ قیمت اس وقت چھ روپے تھی۔ اس کے علاوہ شیخ بشیر احمد نے کہا کہ دس پرچے مجھے ہر ہفتے بھیج دیا کریں۔ میں فروخت کر کے مہینے کے بعد ان کی قیمت خود گوجراں والا جا کر دفتر میں جمع کرا دیا کروں گا۔

اس زمانے میں میری طرح عزیز انصاری صاحب بھی چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے میدان صاف کرا دیا تھا۔

ہم واپس آئے تو مولانا نے فرمایا: تم دونوں گھسیاں داڑھیاں والے گئے تھے، کچھ کر بھی آئے ہو؟

عزیز انصاری نے کہا: جناب! آپ نے ہمیں نہ کچھ کھلایا نہ پلایا اور نہ شاباش دی۔ ہم دونوں وہ کام کر کے آئے ہیں جو بڑی سے بڑی داڑھی والے چار آدمی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پندرہ نقد روپے کے سالانہ خریدار

Marfat.com

بنائے ہیں اور دس کی ایجنسی قائم کی ہے۔ بتایے یہ بہت بڑی کامیابی نہیں؟

مولانا نے ہمیں بوتلیں پلائیں اور بڑے خوش ہوئے۔

چوہدری نذیر احمد تو عرصہ ہوا فوت ہو چکے ہیں اور شیخ بشیر احمد سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ بہت عرصے بعد ۲۵۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو ان سے مولانا حبیب الرحمان یزدانی کے جنازے میں کاموں کی میں ملاقات ہوئی اور چند منٹ باتیں کر کے پرانی یادیں تازہ کیں۔

ایک دفعہ مولانا کی جمعے کی تقریر سے معاملہ کافی سنگین ہو گیا تھا۔ گوجراں والا کے اس وقت کے سیشن جج کا پورا نام تو یاد نہیں رہا، البتہ اتنی بات یاد ہے کہ اسے ترمذی کہا جاتا تھا۔ اس نے مولانا کو عدالت میں طلب کیا اور ناشائستہ انداز میں مخاطب ہوا۔ وہاں کی جماعت کے لیے یہ سخت توہین کی بات تھی۔ چند سرکردہ ارکان لاہور آئے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ اس وقت ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ایم آر کیانی تھے۔ مولانا غزنوی نے ان کو ٹیلی فون کیا اور ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ وہ ان سے سیشن جج کے رویے کی شکایت کرنا چاہتے تھے۔ کیانی صاحب مولانا غزنوی کا بہت احترام کرتے تھے۔ مولانا کے ساتھ گوجراں والا کے جو حضرات کیانی صاحب سے ملے ان میں ہمارے دوست اسماعیل ضیا بھی شامل تھے۔ مولانا غزنوی صاحب کو دیکھ کر کیانی صاحب استقبال کے لیے اٹھے اور بولے: کیڑی کے گھر نارائن آ گیا۔

ان سے واقعہ بیان کیا گیا تو اپنے انداز سے انھوں نے کہا کہ گوجراں والے کا سیشن جج تو فارسی جانتا ہے، اس نے توہین آمیز الفاظ کیسے کہہ دیے۔

مطلب ان کا یہ تھا کہ فارسی میٹھی زبان ہے اور پیار کے لہجے میں بولی جاتی اور محبت کا درس دیتی ہے، فارسی جاننے والے سے توہین آمیز الفاظ زبان سے نکالنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

شام کو مولانا محمد حنیف ندوی بھی شیش محل روڈ پر آ گئے۔ مولانا داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل صاحب، مولانا حنیف ندوی اور ان سطور کا راقم بیٹھے تھے اور یہی مسئلہ موضوع گفتگو تھا۔ مولانا داؤد غزنوی نے مولانا اسماعیل صاحب سے کہا کہ سیشن جج جس انداز سے مخاطب ہوا تھا، آپ کو جواب میں وہی انداز اختیار کرنا چاہیے تھا، مولانا حنیف ندوی نے بھی اسی قسم کی بات کی۔

مولانا اسماعیل صاحب نے فرمایا: اگر میں کچھ کہتا تو توہین عدالت ہو جاتی۔

اس پر مولانا غزنوی اور مولانا ندوی نے کہا: پھر کیا ہوتا؟ توہین عدالت سے آپ کو وہ عمر قید کی سزا دے دیتا۔ اسے معلوم ہو جاتا کہ کسی شریف اور عالم شخص سے کس زبان میں بات کرنی چاہیے۔ بدتمیزانہ زبان میں بات کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

Marfat.com

اس سے دوسرے دن کیانی صاحب سے مولانا کی بات ہوئی تو انھوں نے مولانا سے کہا کہ آپ نے فرمایا تھا، مولانا اسماعیل صاحب آپ کی جماعت کے سیکرٹری ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس جماعت کے صدر آپ ہیں، اس کے سیکرٹری نے ایک سیشن جج کی توہین آمیز گفتگو کیوں برداشت کرلی۔

اسی دن یا دوسرے دن مولانا اسماعیل صاحب، میاں محمود علی قصوری مرحوم کے پاس گئے کہ ہائی کورٹ سے قبل از گرفتاری ضمانت کرالی جائے۔ اسماعیل ضیا بھی اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ میاں صاحب کسی کیس کے سلسلے میں پشاور جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ یہاں قیام فرمایئے، میں واپس آؤں گا تو پرسوں ضمانت ہو جائے گی۔

میاں صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ سیاسی آدمی ہیں، ڈرتے کیوں ہیں، جیل چلے جائیں گے تو کیا ہوگا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: اب جیل جانے کی ہمت نہیں رہی۔

اب ہم حضرت مولانا محمد اسماعیل کے دور نظامت کی آخری سرحدوں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کے آگے ان کے عہد امارت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا داؤد غزنوی کی زندگی میں وہ جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے۔ ان کی وفات کے ایک مہینے بعد منصب امارت پر متمکن ہوئے......

مولانا غزنوی نے ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات پر ۲۷۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کے الاعتصام میں ''اخاء اربعین سنہ...... حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے دیرینہ تعلقات'' کے دہرے عنوان سے ان کا ایک معلومات افزا مگر دردناک مضمون شائع ہوا۔ یہ ایک تاریخی مضمون ہے، جس میں مولانا غزنوی کے بارے میں اور خود فاضل مضمون نگار کے بارے میں اور تنظیم جماعت کے بارے میں بہت سی چیزوں کی وضاحت ہو جاتی ہے، اس لیے اسے حرف بحرف ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات خود حضرت مضمون نگار کے قائم کردہ ہیں۔ ملاحظہ فرمایے۔

''مغفور حضرت مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی سے میری پہلی ملاقات کوچہ بلی ماراں، دہلی میں ہوئی، جہاں استاذ الاساتذہ، مجاہد وقت، سید الاتقیا حضرت مولانا عبداللہ صاحب غازی پوریؒ قرآن عزیز کا درس دیتے تھے۔ حضرت مولانا غزنوی نے اسی دن حضرت حافظ صاحب مغفور سے ہدایہ اخیرین کا پہلا سبق پڑھا تھا۔ اس وقت نہ مولانا مجھے جانتے تھے، نہ میں مولانا سے واقف تھا...... یہ واقعہ ۱۹۱۴ء کا ہے جب کہ پہلا محاربہ عظمیٰ ملک پر محیط تھا۔ میں ان دنوں مدرسہ امینیہ دہلی میں حضرت مولانا قاسم علی صاحب مرحوم سے کنز الدقائق پڑھتا تھا۔ اس کے بعد دہلی میں مولانا غزنوی سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔

''مولانا تعلیم سے فارغ ہو کر امرتسر آگئے۔ کچھ عرصہ مدرسہ غزنویہ میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۱۹ء کے

Marfat.com

مارشل لا کے بعد مولانا سیاسیات میں کود پڑے۔ انگریزی حکومت کے استبداد کا مقابلہ بڑی جرات سے کیا۔ حضرت الامام مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ اس سے قبل انتقال فرما چکے تھے۔ مولانا سے ان دنوں وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہی۔ امرتسر میں اس زمانے میں مولانا کی سیاسی اور علمی تقاریر کا بہت چرچا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو مولانا ہی اس میدان میں لائے تھے جو بعد میں اپنے وقت کے بہترین مقرر ہوئے۔

میں ۱۹۲۱ء میں فارغ ہو کر گوجراں والا آیا۔ حضرت مولانا علاؤ الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد مسجد اہل حدیث میں خطابت اور مدرسہ محمدیہ میں تدریس میرے سپرد ہوئی۔ اس وقت تحریک خلافت آخری مراحل میں تھی۔ ترکی نے الغاے خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ مغربی طاقتوں نے ترکی حکومت کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ مسلمان ان ایام میں انتہائی مضطرب تھے۔ انگریز کے ساتھ الجھنے کے لیے مسلمان قیادت مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ انہی دنوں لاہور میں جمعیت علمائے ہند کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمائی۔ میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا کی کوٹھی میں مولانا آزاد نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد لوگوں نے اسلام کی سربلندی اور استحکام وطن کے لیے بہت بڑی تعداد میں ان کی بیعت کی۔ اس بیعت میں مولانا داؤد غزنوی بھی شامل تھے۔ میں نے اور میری طرح کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ اس اجلاس کے انتظامات میں حضرت فقید مرحوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی زندہ تھے۔ وہ مولانا آزاد کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ مولانا آزاد بڑے تپاک سے ملے۔ مولانا عبدالواحد صاحب نے بہت دعائیں دیں۔ اس وقت مولانا داؤد غزنوی مجمع میں موجود تھے۔ مولانا آزاد سے گہرے اور خصوصی مراسم کا یہ بھی ایک موقع تھا۔

میرے ذاتی مراسم

اس اجلاس میں فقید مغفور سے مراسم میں بہت اضافہ ہوا۔ مکتب فکر کی وحدت اور سیاسی خیالات میں یکسانی مزید مراسم کا موجب بنی۔ تقریباً انہی ایام میں مولانا نے امرتسر سے اخبار تــوحــیــد جاری کیا۔ اس اخبار میں مذہب اور سیاست کا بڑا معتدل امتزاج تھا۔ یہ اخبار سیاسی اور جماعتی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ مرحوم کے قلم میں بہت زور تھا۔ ہم ایسے دینی اور نیم سیاسی ذہن رکھنے والے اسے بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ انہی ایام میں ملتان شہر میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ کانفرنس کا سیاسیات سے قطعی تعلق نہ تھا بلکہ انگریزی حکومت کی وفاداری اس کی پہلی شرط تھی۔ مولانا غزنوی نے اس شرط سے اختلاف فرمایا۔ ہم ایسے کئی سرپھرے اس تجویز میں مولانا کے موید تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لفظ رہنے دیا جائے۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ اس کے بعد فقید مرحوم نے اس پر

Marfat.com

توحید میں مسلسل مضامین لکھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس کے آئین سے یہ دفعہ حذف کر دی گئی۔

۱۹۲۱ء کے بعد سے مولانا غزنوی مرحوم کے ساتھ سیاسی اور دینی تعلق قائم رہا۔ اس اثنا میں سید محمد شریف مرحوم گھڑیالوی کو امیر منتخب کر کے ایک نئی جماعت کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب قصوری، مولانا محمد صاحب سورتی، مولانا اسماعیل صاحب غزنوی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی سب شامل تھے۔ جماعت کچھ عرصہ بہت کامیاب رہی، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد مولانا غزنوی اور ہم سب لوگ اس سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہ جماعت کیوں ناکام ہوئی؟ یہ بڑی دلخراش داستان ہے۔ اب اس کے اسباب و دواعی پر بحث کرنا چنداں مفید معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی جماعت کے اکثر دوست ان اسباب کو جانتے ہیں، اس لیے یہ تذکرہ بے سود ہے اور اضاعت وقت کا باعث......!

اس وقت اخبار توحید بند ہو چکا تھا اور مولانا غزنوی وطنی سیاسیات کے لیے وقف ہو چکے تھے۔ کانگریس اس وقت ملک کی مضبوط ترین سیاسی جماعت تھی۔ احرار بھی معرض وجود میں آ چکی تھی۔ مولانا مرحوم نے ان دونوں محاذوں پر کام کیا۔ بالآخر مولانا غزنوی احرار سے الگ ہو کر کانگرس میں چلے گئے۔ میرے ان تمام مراحل میں مولانا مرحوم سے بدستور مراسم رہے۔

۱۹۴۵ء میں میں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی اور درس و تدریس کی راہ مستقل طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ۱۹۴۶ء میں جب مولانا غزنوی پنجاب کانگرس کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا آزاد انتخابات کی تکمیل کے بعد خود پنجاب تشریف لائے تو مولانا مرحوم نے مجھے بھی پراونشل کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا رکن نامزد کر لیا۔ اس سے بہت پہلے مولانا مرحوم امرتسر چھوڑ کر مستقل طور پر لاہور آ گئے تھے۔ چینیاں والی مسجد لاہور میں اقامت اختیار فرمائی تھی۔ میں بھی اکثر لاہور آتا۔ چینیاں والی مسجد، لاہور میں جماعت اہل حدیث کا مرکزی مقام تھا۔ ملاقات اور تبادلہ خیالات کا اکثر موقع ملتا، پھر تعلقات بڑھتے گئے۔ احرار کے انتخابات کے سلسلے میں مولانا غزنوی گوجرانوالا تشریف لائے تو تمام نمازیں عموماً جامع اہل حدیث میں ادا فرماتے رہے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس وقت مولانا دھاریوال کے لیبر حلقے کی طرف سے صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے۔ مولانا واحد شخص تھے جو مسلمان امیدواروں سے کانگرس ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مرحوم نے دہلی میں دوسری شادی کی جس سے اس وقت مرحوم کے چھ یتیم بچے ہیں۔

مولانا دہلی سے بذریعہ ہوائی جہاز اس وقت لاہور پہنچے جب ۱۹۴۷ء کے فسادات جوبن پر تھے۔ مولانا لیگ میں چلے گئے۔ میں سیاسیات سے دست کش ہو گیا۔ اس وقت بھی اخوت اور برادرانہ مراسم بدستور قائم رہے۔ مولانا نہایت وسیع الظرف اور خوش اخلاق تھے۔ اختلاف کا دوستانہ مراسم پر قطعی کوئی اثر نہیں پڑنے

Marfat.com

دیتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بعض دفعہ سیاسی نظریات میں اختلاف پیدا ہوا، لیکن اس کے باوجود مولانا شفقت فرماتے رہے۔

حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ عموماً ہندو بھاگ رہے تھے، لیکن مسلمان اس قدر مضطرب نہ تھے۔ مسلمان عموماً ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ انہی ایام میں حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسر سے لاہور آئے اور اس لٹے ہوئے قافلے نے چینیاں والی مسجد میں قیام کیا۔ اس وقت حضرت مولانا غزنویؒ نے مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم کی ہر ممکن مدارات فرمائی۔ یہیں سے ہم لوگ مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کو گوجرانوالا لائے۔ گوجرانوالا سے وہ سرگودھا چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں حضرت مولانا ثناء اللہ کا سرگودھا میں انتقال ہوا۔

ملک میں بڑی پریشانی اور سراسیمگی تھی۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے اہل حدیث حضرات کے متعلق کوئی علم نہیں تھا کہ کون کہاں ہے۔ بڑی بے ترتیبی سے لوگ آرہے تھے اور ٹھہر رہے تھے۔ حکومت بھی کوئی پلان نہیں بنا سکتی تھی کہ مہاجرین کو کیسے آباد کرے، اس لیے مولانا ثناء اللہ صاحب تنہا مرکز تھے۔ مولانا مغفور کے انتقال کے بعد رہا سہا نظام بھی ٹوٹ گیا اور ہر طرف پریشانی کا دور دورہ ہو گیا۔

میں ۱۹۴۸ء میں مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جماعت کی تنظیم کے متعلق گزارش کی۔ اس وقت مولانا حافظ عبداللہ صاحب روپڑی امرتسری بھی اس طرف تشریف لا چکے تھے۔ لیکن حافظ صاحب مالی پریشانی میں مبتلا تھے۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے بہت سے افراد فسادات کی نذر ہو چکے تھے۔ جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نام سے جماعت کا نظم قائم ہوا اور پہلے ناظم پروفیسر عبدالقیوم صاحب ایم۔اے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ مولانا اس وقت سے ۱۹۶۳ء تک جماعت کے صدر اور امیر رہے۔ ما زال تلك دابه حتى لقى الله تعالى۔

تنظیم جماعت کے لیے دورے

پہلا جلسہ عام مولانا کے دولت کدہ پر حضرت مولانا محمد ابراہیمؒ صاحب سیالکوٹی کی صدارت میں ہوا۔ مستقل صدر جمعیت مولانا غزنوی رہے۔ مولانا نے تنظیم کے لیے مسلسل دورے کیے۔ پشاور سے کراچی تک شاید کوئی شہر بھی نہ چھوڑا ہو۔ حضرت حافظ عبداللہ صاحب کو دعوت نامے بھیجے گئے مگر حافظ صاحب شاید پریشانیوں کی وجہ سے ان تنظیمی مجالس میں شامل نہ ہو سکے۔ مولانا کے تجربے اور توجہ سے قریباً پانچ صد جمعیتوں نے مرکز سے الحاق کیا۔ ہزاروں روپیہ تبلیغ و تعلیم و تدریس کی راہ میں صرف ہوا۔ یہ سب مولانا مرحوم کی مساعی

Marfat.com

کا نتیجہ تھا۔ اس وقت مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم کا تدبر، تحمل، دور اندیشی، اخلاق انتہائی قابل تعریف تھے۔ بے حد مخلصانہ مراسم تھے۔ بڑے احترام سے پیش آتے۔ مجالس کی صدارت اور مشکل جماعتی مسائل کے حل میں حضرت مرحوم کا تجربہ بہت ہی کار آمد ثابت ہوا اور یہ سب واجبات اس وقت بھی پورے ہوتے رہے جب کہ آپ کافی علیل تھے۔ دل کی تکلیف مرحوم کو اس وقت ہوئی تھی جب آپ آئین کے سلسلے میں ۳۱ علما کی دعوت میں کراچی تشریف لے جارہے تھے۔ یہی مرض بالآخر ۲۹۔ رجب ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۶۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان کے انتقال کا موجب ہوا۔ اب مرحوم ہم سب کو سوگوار چھوڑ کر اپنے رب سے جاملے ہیں۔

ما كان قيس هلكه هلك واحد

ولكنه بنيان قوم تهدما

مرحوم کا حسن اخلاق، طبعی ذوق نفاست، علمی گہرائی، تدبر، حسن گفتار، تقریر میں تسلسل، زور بیان، معاملہ فہمی، شرعی مسائل میں جچی تلی رائے، ہر چیز اپنی نظیر آپ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ذوق عبادت وتصوف انتہائی قابل رشک تھا۔ سحری میں اکثر روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ صبح کی نماز اور مغرب کی نماز کے بعد یکسوئی سے

حسبنا الله ونعم الوكيل.

ہزار مرتبہ پڑھتے۔ درود شریف کئی سو بار پڑھتے۔ نماز بے حد طمانیت سے ادا فرماتے۔ مرض کے ایام میں گزشتہ چند ماہ سے چینیاں والی مسجد نہیں جاسکتے تھے، اس لیے شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام ہی میں جمعے کا انتظام فرمالیا تھا۔ ضعف ونقاہت کے باوجود جمعے کی نماز میں شریک ہوتے۔ اساتذہ، طلبا اور مدرسے کے انتظامات کا بذات خود جائزہ لیتے۔ تقویٰ اور انابت الی اللہ کے لحاظ سے اپنے اسلاف کی تمام خصوصیات کے حامل تھے۔ آہ کتنا پاکیزہ انسان تھا جو ہم سے جدا ہوگیا......

اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے اور ان کے اعزہ اور لڑکوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ ایسے ارباب فکرودانش کی پیدائش کے متعلق مالکان قضا وقدر کچھ زیادہ فیاض معلوم نہیں ہوتے۔

دور ہا باید کہ صاحب دلے پیدا شود بایزد اندر خراساں یا اویس اندر قرن

میں قریباً پندرہ سال تک مرحوم کے ساتھ بطور ناظم کام کرتا رہا۔ مرحوم کا وجود میرے لیے بے حد موجب سکون تھا۔ حضرت مرحوم کی جدائی سے طبیعت میں بے حد گرانی محسوس کرتا ہوں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ صبر کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

الحزین المکروب

محمد اسماعیل، گوجراں والا‘‘

Marfat.com

مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے ایک مہینہ تین دن بعد ۱۹۔ جنوری ۱۹۶۴ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر (شیش محل روڈ) میں مرکزی جمعیت کی مجلس شوریٰ کا اجلاس زیر صدارت مولانا محمد اسحاق رحمانی ہوا۔ تمام ارکان شوریٰ حاضر تھے۔ تلاوت قرآن مجید وہاڑی کے قاری عبداللطیف مرحوم نے کی۔ عام طور سے شوریٰ کے اجلاس میں تلاوت قرآن وہی کیا کرتے تھے۔ تلاوت کے بعد مولانا محمد اسماعیل صاحب نے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش فرمائی۔ اس وقت مولانا کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تمام فضا پرغم کی سیاہ چادر تنی ہوئی تھی۔ قرارداد تعزیت باتفاق منظور ہوئی۔

اس کے بعد مولانا محمد اسحاق چیمہ (لائل پور) نے مرکزی جمعیت کی امارت کے لیے حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا نام پیش کیا اور انھیں کامل اتفاق سے امیر منتخب کرلیا گیا۔ اب مولانا محمد اسحاق رحمانی نے جو اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، کرسی صدارت خالی کر دی اور نئے امیر حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ اگلی کارروائی حضرت مولانا کی صدارت میں ہوئی۔

مولانا عبیداللہ احرار (لائل پور) نے مولانا اسماعیل صاحب کی جگہ جمعیت کے ناظم اعلیٰ کے لیے مولانا داؤد غزنوی کے صاحب زادے پروفیسر سید ابوبکر غزنوی کا نام پیش کیا، جو بالاتفاق منظور ہوا۔

اس سے قبل جمعیت کے نائب صدر ایک ہی تھے اور وہ تھے مولانا محی الدین لکھوی۔ اب حاجی محمد اسحاق حنیف نے دوسرے نائب صدر کے لیے حضرت مولانا ثناء اللہ کے پوتے مولانا رضاء اللہ ثنائی کا نام پیش کیا۔ وہ بھی بالاتفاق منظور کرلیا گیا۔ آئین میں دو نائب صدروں کی گنجائش تھی۔ اجلاس چار بجے تک جاری رہا۔ اس میں چند قراردادیں منظور ہوئیں اور منتخب امیر اور ناظم اعلیٰ نے تقریریں کیں۔

یوں تو جماعت اہل حدیث کی تاریخ ہمیشہ حوادث سے دوچار ہوتی اور مختلف اذیت ناک مراحل سے گزرتی رہی ہے، لیکن مولانا داؤد غزنوی کے انتقال کے بعد یہ جن سانحات کا شکار ہوئی، وہ انتہائی الم انگیز ہیں۔ ممکن ہے آئندہ کسی کو جماعتی تنظیم کے موضوع پر لکھنے کی ضرورت پڑے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں چند اشارے کردوں۔ اس کی تفصیل ان شاءاللہ کبھی پھر عرض کروں گا۔ یہ تفصیل کا محل نہیں۔

مولانا غزنوی کی وفات کے بعد ذہنی اور زبانی طور پر سب متفق تھے کہ مرکزی جمعیت کے امیر اور سربراہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو منتخب کیا جائے۔ ان کے علاوہ اس وقت جماعت میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اس عظیم ذمے داری کو بطریق احسن نباہنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ تنظیم جماعت کے سلسلے میں انھوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی تھی اور اس ضمن میں ان کی تگ و تاز کا دائرہ مغربی پاکستان کے بلاد وقصبات سے بھی آگے نکل کر دیہات تک پھیلا ہوا تھا۔ لوگ ان کی انتہائی قدر کرتے تھے اور ہر شخص کے دل میں ان کے لیے جذبات احترام موج زن تھے۔ گفتار میں، کردار میں اور عمل وحرکت میں کوئی ان کا حریف نہ تھا...... لیکن ان کی جگہ ناظم

Marfat.com

اعلیٰ کسے منتخب کیا جائے؟ اس میں دو رائیں تھیں...... مجلس شوریٰ کے لائل پوری ارکان جن میں مولانا محمد اسحاق چیمہ، مولانا عبیداللہ احرار، مولانا محمد صدیق اور مولانا محمد یعقوب وغیرہ شامل تھے، سید ابوبکر غزنوی کو ناظم اعلیٰ بنانا چاہتے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا، میں ضلع لائل پور سے مجلس شوریٰ کا رکن منتخب ہوا تھا اور سید ابوبکر صاحب کے لیے نظامت علیا کی تحریک میں نے ہی شروع کی تھی۔ سب سے پہلے ابوبکر صاحب سے اس موضوع پر بات کی، وہ کچھ ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ پھر مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محی الدین احمد قصوری، حکیم ہدایت اللہ بٹالوی اور مولانا محمد رمضان سے بات ہوئی۔ انھوں نے ابوبکر صاحب کو امداد کا یقین دلایا۔ مولانا محمد اسحاق چیمہ اور مولانا عبیداللہ احرار کو لاہور بلایا گیا اور ابوبکر صاحب سے ملاقات کے بعد معاملہ طے پا گیا۔ دوسرے مقامات کے بعض ارکان شوریٰ سے بھی گفتگو ہوئی۔

مجلس شوریٰ کے متعدد مضبوط اور موثر ارکان کی رائے سید ابوبکر غزنوی صاحب کے حق میں نہ تھی لیکن وہ کھل کر ان کی مخالفت بھی نہ کرتے تھے اور ان کے متبادل کے طور پر کسی کا نام بھی پیش نہ کرتے تھے۔ خود حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی ذہناً انہی حضرات کے حامی تھے۔ وہ کسی کا نام تو نہیں لیتے تھے، لیکن چاہتے یہ تھے کہ حاجی محمد اسحاق حنیف کو ناظم اعلیٰ بنایا جائے۔ ان کے علاوہ بعض اور حضرات کا بھی یہی خیال تھا۔ ہم لوگوں کو جو ابوبکر صاحب کے حامی تھے ''لائل پوری ٹولا'' کہا جانے لگا۔ یہ لفظ سب سے پہلے ہنسی مذاق میں استاذ مکرم حضرت مولانا اسماعیل صاحب نے استعمال کیا، پھر ارکان شوریٰ میں چل نکلا اور کچھ عرصہ جماعت کے ایک حلقے میں چلتا رہا۔ جب ابوبکر صاحب کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں ان کے ''لائل پوری رفقا'' کا لفظ استعمال ہوتا رہا۔

اس انتخاب کے بعد جماعتی حالات تیزی سے بدلنے اور بگڑنے لگے۔ اتفاق کی جگہ اختلاف نے اور اتحاد کی جگہ انتشار نے لے لی۔ ابوبکر صاحب بلاشبہ بہت پڑھے لکھے تھے، ایک بڑے خاندان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ رکن تھے۔ حافظہ مضبوط تھا اور ذہن رسا پایا تھا۔ اچھی اور موثر تقریر کرتے تھے۔ وظائف واوراد سے بھی رابطہ قائم کر لیا تھا، لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کا ذہنی سانچا اپنے آباواجداد سے بہت مختلف تھا، ان کے آباواجداد خادم ہو کر رہتے تھے، یہ مخدوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ وہ جماعتی مزاج کو خوب سمجھتے تھے، یہ اس سے بے خبر تھے۔ وہ اہل علم کا اور اپنے سے بڑوں کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن ان میں یہ جذبہ نہ تھا۔ یہ احترام کرانے کو اہمیت دیتے تھے۔

ان کے بڑے بھائی مولوی عمر فاروق صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے ان کی اس قسم کی باتوں کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ مولانا اسماعیل صاحب کی تشریف آوری کی اطلاع ہمارے والد کو پہنچتی تو بے شک وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے مگر مولانا کو اوپر آنے کی زحمت نہ دیتے، خود آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے

Marfat.com

آتے۔ اس کے برعکس انھوں نے بتایا کہ ایک دن مولانا اسماعیل صاحب تشریف لائے اور ابوبکر کو اطلاع بھجوائی تو وہ ان سے ملنے نیچے نہیں آئے، پلنگ پر بیٹھے رہے، مولانا کو اوپر بلایا۔

بقول مولوی عمر فاروق غزنوی کے اس قسم کا معاملہ کئی دفعہ ہوا کہ مولانا تشریف لائے اور انھیں اوپر بلایا گیا...... بڑے بھائی کی حیثیت سے انھوں نے نرم الفاظ میں بھی اور سخت الفاظ میں بھی ابوبکر صاحب کو اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ ہمارے والدان کا اس درجے احترام کرتے تھے کہ ان سے ملنے خود نیچے آتے تھے، آپ کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ مولانا غزنوی کے کمرے میں (جہاں ان کی وفات کے بعد کبھی کبھی سید ابوبکر صاحب نے بیٹھنا شروع کر دیا تھا) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی صدارت میں کابینہ کی میٹنگ ہو رہی تھی، ناظم نشرواشاعت کی حیثیت سے حاجی محمد اسحاق حنیف بھی کابینہ کے رکن تھے، لیکن سید ابوبکر غزنوی صاحب جس لہجے میں ان سے مخاطب ہوئے، وہ نہایت تکلیف دہ تھا۔ جو الفاظ انھوں نے کہے میں انھیں لکھ نہیں سکتا۔ یہ الفاظ سن کر بعض ارکان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور انتہائی حزن وملال کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس سے کچھ دن بعد کی بات ہے کہ میں حسب معمول نو بجے کے لگ بھگ دفتر آیا تو ابوبکر صاحب جمعیت کے دفتر کے دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے کہا:

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی

میں نے دیکھا تو دروازہ کھلا تھا اور کمرہ خالی...... اگلا مصرع فوراً بصورت سوال عرض کیا:

یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خون ریز ہے ساقی؟

اس کے بعد میں اپنے کمرے یعنی دفتر الاعتصام کی طرف گھوما تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی ایک چابی میرے پاس تھی۔ کمرا کھولا تو سب چیزیں اپنی اپنی جگہ اسی طرح پڑی تھیں، جس طرح شام کو چھوڑ کر گیا تھا۔

جمعیت کا دفتر کہاں گیا؟ اس کا کچھ پتا نہ تھا۔ کسی زمانے میں یہ دفتر زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سیر تھا، آدھی بوری میں سما جاتا تھا۔ میں آسانی سے سر پر اٹھا کر کبھی لاہور سے گوجراں والے جاتا تھا اور کبھی گوجراں والے سے لاہور لے آتا تھا۔ دفتر کی بوری کو جوانی کے جوش میں گیند کی طرح اچھالتا پھرتا تھا لیکن اب یہ دفتر عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ ایک ٹرک کا بوجھ ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، اسے دو چار آدمی تو اٹھا نہیں سکتے تھے۔ یا تو اسے پانچ چھ تانگوں میں لادا ہو گا یا ٹرک میں ڈالا گیا ہو گا...... اس وقت ناظم دفتر ہمارے دوست مولانا عبدالعظیم انصاری اور اکاؤنٹنٹ مولوی محمد صدیق تھے۔ چپراسی محمد یوسف تھا۔ میرا خیال ہے کہ ایک صاحب اور بھی تھے جو دفتر میں کام کرتے تھے۔ یہ سب لوگ غائب تھے۔ مولوی محمد صدیق عرصہ ہوا وفات پا چکے ہیں۔ انصاری صاحب قصور میں ہیں اور یوسف صاحب لاہور میں۔ ان سے ملاقات تو ضرور

Marfat.com

ہوتی ہے لیکن کسی سے کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ یہی دونوں اس راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں کہ جمعیت کے دفتر کو اس طرح غائب کر دینے میں کن کن بزرگان عالی مقام کا ہاتھ تھا۔ وہ بھی تمام حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب، مولانا عطاء اللہ حنیف، شیخ محمد اشرف، میاں عبدالمجید، حاجی محمد اسحاق حنیف، حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری، ان میں سے کوئی بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں۔

۱۹۶۶ء کی جنوری کے پہلے ہفتے میں سید ابوبکر غزنوی صاحب کو بھی نظامت علیا سے فارغ کر دیا گیا اور اس سلسلے میں مندرجہ ذیل اعلان ۱۴۔ جنوری ۱۹۶۶ء کے الاعتصام میں شائع ہوا۔

ناظم اعلیٰ جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کو معطل کر دیا گیا۔

''امیر جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب نے جمعیت کے ناظم اعلیٰ جناب پروفیسر ابوبکر غزنوی کو نظامت کے عہدے سے معطل کر دیا ہے۔ امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث نے پروفیسر موصوف کے نام چٹھی میں تحریر کیا ہے کہ آپ کو جمعیت کے ناظم اعلیٰ ہوئے قریباً دو سال ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں نہ صرف جماعتی معاملات میں آپ کا عدم تعاون بدستور ہے بلکہ اب آپ نے ایسے عناصر کے ساتھ سرگرمیاں جاری کر دی ہیں، جنھوں نے جمعیت کے خلاف ایک متوازی نظام بنا رکھا ہے اور جن کو سابق حضرت الامیر مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے تخریبی کاروائیوں کی بنا پر جماعت سے خارج کر دیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اصلاح احوال کے ممکن اقدامات اور مخلصانہ مساعی کی ناکامی کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے دستور کی دفعہ ۵/۷/۴ صفحہ ۴۰ کی رو سے آپ کو ناظم اعلیٰ کے عہدے سے معطل کیا جاتا ہے۔''

یہ جمعیت اہل حدیث کے امیر محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا اعلان تھا۔ اس کے بعد ۲۰۔ فروری ۱۹۶۶ء کو مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں سید ابوبکر غزنوی کی معطلی کے فیصلے کی توثیق کر دی گئی۔ اس کا اعلان ۲۵۔ فروری کے الاعتصام میں مندرجہ تحت الفاظ میں کیا گیا۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی کی معطلی کی توثیق کر دی گئی۔

''مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ کا اجلاس حسب پروگرام ۲۰۔ فروری ۱۹۶۶ء کو بروز اتوار دس بجے صبح مرکزی دفتر واقع حدیث منزل ۷۔ ایبک روڈ لاہور میں ہوا۔ مجلس عاملہ نے امیر جمعیت کے اس فیصلے کی متفقہ طور پر توثیق کی جس میں انھوں نے پروفیسر ابوبکر غزنوی کو ناظم اعلیٰ کے عہدے سے معطل کیا تھا، صرف دو اصحاب نے اختلاف رائے کیا تھا۔''

جب یہ اعلان شائع ہوا، اس وقت میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو چکا تھا اور مجھے کسی کی تعطلی یا تقرری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ دو اصحاب جنھوں نے اس سے اختلاف رائے کیا تھا،

Marfat.com

لائل پور کے مولانا عبیداللہ احرار اور مولانا محمد اسحاق چیمہ ہوں گے۔

اب میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے چند خطوط درج کرنا چاہتا ہوں۔ افسوس ہے ان کے بعض خطوط مجھے اپنے کاغذات سے مل نہیں سکے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ''گوجراں والا'' کو حضرت مولانا مرحوم ''گجرانوالہ'' تحریر فرمایا کرتے تھے۔ تمام مکتوبات میں انھوں نے اسی طرح رقم فرمایا ہے، البتہ ان کے لیٹر پیڈ پر ''گوجرانوالہ'' طبع ہوا ہے۔

خط رواروی میں کسی وقتی معاملے سے متعلق لکھا جاتا ہے، اس سے خط لکھنے والے کے اسلوب تحریر کا پتا چلتا ہے۔ علاوہ ازیں پرانے خطوط سے بعض واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنے والے کے مکتوب الیہ سے کس قسم کے مراسم ہیں۔ خط بہت سی چیزوں کو نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک مستقل تاریخ کی ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت مولانا مرحوم و مغفور عام بات چیت سے مجھے ہمیشہ ''توں'' کہا کرتے تھے۔ یہ اس فقیر پر ان کی شفقت کی انتہا تھی۔ بڑے کا چھوٹے کے لیے جو پیار پنجابی کے صیغہ واحد ''توں'' میں مضمر ہے۔'' وہ میرے نزدیک اردو کے ''آپ'' یا پنجابی کے ''تسیں'' میں نہیں ہے۔

مولانا اگر کوئی کام میرے سپرد کرتے تو اس کے متعلق دریافت کا انداز کچھ اس قسم کا ہوتا تھا۔ ''اسحاق! میں تینوں فلاناں کم کہیا سی کیتا اے کہ نہیں؟''

اگر جواب نفی میں ہوتا تو فرماتے۔

''یار توں ست آدمی ایں، ایہہ کم بڑا ضروری سی، توں کیتا ای نہیں۔''...... لیکن مکتوبات میں اس سے بالکل مختلف انداز تخاطب اختیار فرمایا گیا ہے...... مکرم...... محترم...... برادرم...... برادر عزیز...... وغیرہ۔

افسوس ہے ان کے بعض خطوط محفوظ نہیں رہ سکے، جو محفوظ ہیں وہ تعداد میں تیرہ ہیں اور ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ دو چار خطوط میں ایسی عبارتیں مرقوم ہیں، جن میں بعض افراد کے بارے میں ان کے قلم میں تختی سی آ گئی ہے...... وہ عبارتیں حذف کر دی گئی ہیں۔

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۹۔ جولائی ۱۹۶۰ء

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان
شیش محل روڈ لاہور

Marfat.com

مکرمی مولوی محمد اسحاق صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

عرصہ ہوا آپ نے خیال ظاہر کیا تھا کہ سر ڈھانپ کر نماز ادا کرنے کے متعلق مولوی عبداللہ مظفر گڑھی کا مضمون شائع ہو سکے گا، میں نے آپ کے وعدے کی بنا پر مضمون بھیج دیا، اب اس کے خطوط آ رہے ہیں، میرے خیال میں مناسب ترمیم کے بعد مضمون شائع ہو جانا چاہیے۔

اگر شائع نہ کرنے کا فیصلہ ہو تو اسے اطلاع کر دیں تاکہ وہ بے چارہ منتظر نہ رہے۔ میں نے جو ابتدائی سطور دیکھی ہیں، وہ غیر ضروری ہیں، انھیں شائع کرنا ضروری نہیں۔ اگر ناپسند ہوں تو چھوڑ دیں۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۶۔نومبر ۱۹۶۰

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تاج کمپنی کا اشتہار سودی ہے۔ اس کا پراسپیکٹس منگا کر صفحہ ۸ دیکھیں۔ اخبار کا خسارہ ان چیزوں سے پورا نہیں ہوگا۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۷۔نومبر ۱۹۶۰ء

واذکر فی الکتاب ''اسماعیل''

چاہ شاہاں، گجرانوالہ

Marfat.com

مکرم مولانا محمد اسحاق صاحب مدیر الاعتصام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی، کراچی سے واپسی کے بعد حضرت صدر محترم اور باقی رفقا کا بھی خیال تھا کہ کراچی میں بعض احباب کو الاعتصام اعزازی طور پر بھیجا جائے اور اس کی قیمت دفتر ادا کرے۔ معلوم نہیں اس کے مطابق عمل ہوا ہے یا نہیں۔ اگر جناب کو معلوم ہو تو مطلع فرمائیں، ورنہ صدر محترم اور ناظم نشرواشاعت سے اس کا تذکرہ فرمائیں، اگر وہ اس تجویز کو پسند فرمائیں تو کراچی میں آئندہ کام کے لیے یہ مناسب قدم ہوگا۔ اگر مدرسہ سعودیہ میں الاعتصام نہ جاتا ہو تو چھ ماہ کے لیے پرچہ اعزازی طور پر مدرسہ سعودیہ میں بھی بھیج دیا جائے۔

اخبار میں اشتہارات کے متعلق محمود صاحب کا کام قابل تعریف ہے۔ معلوم نہیں یہ اشتہارات محض اعزازی ہیں یا ان سے اخبار کو کچھ فائدہ بھی ہے۔ آپ کو اس کے متعلق اگر علم ہو تو مجھے مطلع فرمائیں۔ ناظم تعلیمات سے میں نے دریافت کیا تھا، ان کو اس کے متعلق صحیح علم نہ تھا، لیکن اس کے متعلق محکمہ ٹیکس بھی دریافت کرسکتا ہے۔ اس کے حسابات درست ہونے چاہئیں۔ محمود صاحب کو کمیشن بھی ملنی چاہیے۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

مولوی عبداللہ صاحب مظفر گڑھی کے مضمون ننگے سر نماز کے متعلق آپ نے اشاعت کا وعدہ کیا تھا، اسے شائع کر دیا جائے، وہ بار بار مجھے لکھ رہے ہیں، اگر اشاعت کا خیال نہ ہو تو انھیں مضمون واپس بھیج دیجیے، ممکن ہے وہ ذاتی طور پر اسے شائع کرانا چاہتے ہوں۔ ان کے کئی خطوط آچکے ہیں۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

مکتوب گرامی میں حضرت مولانا نے محمود صاحب کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ معروف اہل حدیث عالم و مصنف مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کے بیٹے تھے، کچھ عرصہ الاعتصام میں بطور منیجر کام کرتے رہے۔ بڑے مستعد اور محنتی شخص تھے۔ تقریباً تین سال قبل انھوں نے کراچی میں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ناظم تعلیمات سے مولانا محی الدین احمد قصوری مراد ہیں۔

(۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Marfat.com

گجرانوالہ

۸۔ مارچ ۱۹۶۱ء

مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پہلے بھی کئی دفعہ لکھا ہے۔ مولوی عبداللہ صاحب ڈیرہ غازی خاں کا مضمون میں نے آپ کو بھیجا تھا، اسے شائع نہیں کرنا تو فوراً واپس بھیج دیں۔ وہ کئی خط لکھ چکے ہیں، ایسے مضمون واپس بھیجنا اخلاقاً ضروری ہے۔ مضمون بھیج کر مجھے اطلاع دیں کہ ان کو مضمون بھیج دیا ہے۔

میں تاحال الاعتصام کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا، فرصت ہی نہیں تھی۔ کل لائل پور رجسٹری کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ مولوی فضل حق اپنے کیس کے سلسلے میں مشغول ہیں۔ پرسوں اگر وقت ملا تو لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ڈیکلریشن ملا یا نہیں؟

۲۴۔ فروری کے الاعتصام میں تعویزات حب کا ایک اشتہار شائع ہوا ہے جو قابل اعتراض ہے۔ دوسرا حجاز میں قرآن مجید کے متعلق...... جو کچھ لکھا گیا، درست نہیں اور وہاں قرآن مجید کی ضرورت...... یہ مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری نے توجہ دلائی ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔ اشتہار میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

مدرس گجرانوالہ

جہاں نقطے لگائے ہیں، وہاں لفظ پڑھا نہیں گیا۔

مولوی فضل حق سے میاں فضل حق مراد ہیں۔

(۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

یکم مئی ۱۹۶۱ء

مکرم ومحترم!　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل ایک مضمون یوسف کو دے آیا تھا، مل گیا ہوگا...... الاعتصام مدرسہ محمدیہ کے طلبا کے نام ارسال کر دیں، اس کی قیمت میں ان شاء اللہ لیتا آؤں گا۔ اگر منیجر آ جائے تو وہ لے جائے۔

اخبار کچھ دنوں سے بہت خراب چھپتا ہے، کیا پہلا کاتب بدل دیا گیا ہے؟

Marfat.com

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

مدرسہ محمدیہ سے مراد خود مولانا کا مدرسہ ہے۔ یعنی مدرسہ محمدیہ گوجراں والا۔

(۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۶۔ ستمبر ۱۹۶۱ء

الجامعۃ السّلفیہ۔ لائل پور

پاکستان میں اسلامی علوم کی مرکزی درس گاہ

مکرم مولانا اسحاق صاحب مدیر الاعتصام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۵۔ ستمبر ۱۹۶۱ء کے الاعتصام میں نوکھر کے مدرسے کے متعلق آپ نے ایک مضمون شائع فرمایا ہے، اس سے پہلے اس مدرسے کے متعلق ناظم صاحب کی طرف سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ دونوں کا لب ولہجہ نامناسب ہے، ایسے مضامین من وعن شائع کرنے سے قبل سوچنا چاہیے کہ اس کا عوام پر کیا اثر پڑے گا۔ یا تو ایسے تلخ مضامین کی اشاعت نہ ہو یا اسے مناسب طور پر نرم کر دیا جائے۔ آئندہ اگر نوکھر یا اس مدرسے کے متعلق یا ان دو مضامین کے متعلق کوئی تحریر آئے تو اسے میری اطلاع کے بغیر شائع نہ فرمائیں۔

یہ مضمون مولوی فضل حق صاحب کے نام پر کسی دوسرے شخص نے دے دیا ہے۔ اب یہ نزاع ضلعی جماعت نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے، اس لیے اس کے متعلق مزید کوئی چیز شائع نہ کی جائے۔

رپورٹ کی تکمیل جلدی ہونی چاہیے۔ کل جمعرات کو میں حاضر ہوا، آپ نہ مل سکے۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

رپورٹ سے حضرت مولانا کی مراد ہے جمعیت اہل حدیث کی خدمات، تنظیمی دورے، جلسے، تقریریں، جامعہ سلفیہ کی تعلیمی کیفیت، الاعتصام کے سلسلے کے ضروری کوائف اور دفتری معاملات کی تفصیلات۔ اس قسم کی رپورٹیں تیار کرنے کے بارے میں بالعموم مجھے ارشاد فرمایا جاتا تھا اور میں لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتا

Marfat.com

تھا۔ وہ رپورٹیں انہی کی طرف سے لکھی جاتی تھیں اور وہ مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بحیثیت ناظم اعلیٰ پڑھ کر سناتے تھے۔
ضلع گوجرانوالا میں ایک مقام کا نام ''نوکھر'' ہے۔ وہاں کچھ جھگڑا سا تھا۔ مولانا کا اشارہ اسی طرف ہے۔

(٦)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

١٢۔ دسمبر ١٩٦١ء

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سنا ہے جناب کے کسی دوست عبدالرشید نامی کے پاس شاہ شہیدؒ کے قلمی خطوط ہیں اور وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً یہ وہی خطوط ہیں جو حیات طیبہ وغیرہ میں چھپ چکے ہیں۔ شاہ صاحب کے نام کی وجہ سے میرا خریدنے کا خیال ہے۔ آپ ان سے مل کر دریافت فرمائیں، وہ کہاں تک دینا چاہتے ہیں۔

یہ بھی دیکھ لیں کہ کاتب کون ہے، کس سن کے لکھے ہوئے ہیں، اگر ممکن ہو تو دیکھ لیں کوئی غیر مطبوعہ خط بھی ہے؟

اس سلسلے میں مولوی عطاء اللہ صاحب سے بھی مشورہ کر لیں۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

(٨)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واذکر فی الکتاب ''اسماعیل''

چاہ شاہاں، گجرانوالہ

٢٦۔ دسمبر ١٩٦١ء

محترم ومکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج بخیر۔

مکتوب ملا، شاہ صاحب کے مکاتیب عموماً سوانح احمدی میں چھپ چکے ہیں۔ یہ مکاتیب بھی شاہ صاحب کے قلم سے تو نہیں ہوں گے۔ بہر حال نقل ہوگی۔ یہ بھی معلوم نہیں کس کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ اس لیے میں اتنے گراں خریدنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میرا خیال ایک سو کے پس وپیش تھا۔ اگر وہ اس کے لیے

Marfat.com

آمادہ نہ ہوں تو انھیں فروخت کرنے کی اجازت ہے۔ جواب میں دیر ہوئی۔ میں خود مخطوطہ دیکھنا چاہتا تھا، مگر وقت نہیں مل سکا، معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

(۹)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۸۔ مئی ۱۹۶۲ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

''تحریک اہل حدیث کا مد و جزر'' کا مسودہ اگر موجود ہو تو بھیج دیں۔ اس مضمون پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

آپ ہندوستان کی جماعتی خبروں کو التزام سے شائع کریں۔ کانفرنس اہل حدیث ہوگئی، آپ نے اس پر ایک حرف نہیں لکھا۔ ہر کام کے لیے مطالعہ ضروری ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

گجرانوالہ

(۱۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ

۱۲۔ جولائی ۱۹۶۲ء

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل برقی پنکھوں کی تفصیل میں متفرق چار پنکھے لکھوائے تھے۔ یہ تین کر دیں اور ایک پنکھا میاں عبدالستار کے نام لکھ دیں۔ مکرر اطلاع کی ضرورت نہ ہو۔

مولانا فضل احمد صاحب غزنوی کی مصنفات قیمتی ایک ہزار روپیہ انھوں نے فروخت کے لیے دی ہیں۔ وہ جب پہنچ جائیں ان کے متعلق اشتہار دے دیں۔

Marfat.com

والسلام
محمد اسماعیل
گجرانوالہ

(۱۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گجرانوالہ
۷۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء

مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مولوی اسحاق برق نے حویلیاں سے آپ کے پاس کتاب فلاح عالم بھیجی ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ اگر اس میں کوئی مفید بات ہو تو انھیں حویلیاں کے پتے پر لکھ دیں۔ میری یاد دہانی کا بھی تذکرہ کر دیں۔

دو اعلان پہلے آپ کو مل چکے ہوں گے۔ ایک اعلان یہ بھی فرما دیں کہ گجرانوالہ کی جماعت اہل حدیث کی طرف سے بنگال سیلاب فنڈ کے لیے قریباً چھ سو سے زائد رقم جمع ہو چکی ہے جو عنقریب دفتر کو ارسال کر دی جائے گی۔

آپ نے بنگال کے لیے ایک دفعہ لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ ایسے اعلانات متعدد دفعہ ہونے چاہئیں۔ گجرانوالہ سے ممکن ہے سات سو ہو جائے۔ اتنی رقم اتنی دور بھیجتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو گی، اس کے لیے متعدد دفعہ لوگوں کو توجہ دلانا چاہیے۔

والسلام
محمد اسماعیل
گجرانوالہ

(۱۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واذکر فی الکتاب "اسماعیل"
چاہا شاہاں۔ گجرانوالہ
۱۹۔ ستمبر ۱۹۶۴ء

Marfat.com

محترم ومکرم مولانا اسحاق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔

آپ دو دفعہ یہاں تشریف لائے۔ جاتی دفعہ آپ نے وعدہ فرمایا کہ خود یا بذریعہ مولانا عطاء اللہ صاحب حاجی اسحاق سے معاملہ طے کرلوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسئلہ طے نہ ہوا۔ اس کے بعد میں ۵۔ ستمبر۱۹۶۴ء کو لاہور گیا، آپ نہ مل سکے۔ پروفیسر ابوبکر صاحب سے فون پر ملاقات ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ مولوی اسحاق صاحب کو دفتر بھیج دیں۔ انھوں نے فرمایا میں پیغام دے دوں گا۔ میں نے عرض کیا، اگر وہ دفتر نہ جائیں تو انھیں میرے پاس گجرانوالہ بھیج دیں۔ میں ۶، ۷۔ ستمبر کو دو دن جناب کا منتظر رہا، آپ نہ آئے۔ معلوم نہیں آپ کو پیغام ملا یا نہیں۔ اب یہ عریضہ جناب کے نام رجسٹری کر رہا ہوں، یا تو جناب عریضہ دیکھتے ہی مصری شاہ مجید فلور ملز میں دفتر تشریف لے جائیں اور کام شروع کر دیں، آپ کی شرائط ومطالبات حسب امکان پورے ہو جائیں گے۔

اگر مزید تامل ہو تو ۲۲۔ ستمبر منگل کو گجرانوالہ تشریف لے آئیں، میں اتوار کو احمد پور شرقیہ جا رہا ہوں، سوموار کو امید ہے واپسی ہوگی، میں منگل کو آپ کا منتظر رہوں گا۔

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

(۱۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فون ۲۲۶۶

مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان،

مجیدیہ فلور ملز، رحیم روڈ، مصری شاہ، لاہور

عزیزم مولوی محمد اسحاق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔

آپ کوئی پیغام بھیجے، خطوط لکھے، نہ آپ ملے، نہ ہی گجرانوالہ تشریف لائے۔ ۲۔۹۔۶۴ کو آپ کے نام رجسٹرڈ خط لکھا، معلوم نہیں آپ کو ملا یا نہیں، منگل کا دن آپ کے انتظار میں گزرا۔ یہ تعویق اور انتظار آپ کی خدمات کی وجہ سے ہے۔ آپ نے اخبار اور جماعت کی جس تندہی سے خدمت کی ہے، اس سے میں متاثر

Marfat.com

ہوں، ورنہ آپ کی اس بے اعتنائی کے بعد مجھے کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔

یہ عریضہ مکتبہ سلفیہ کی معرفت لکھ رہا ہوں۔ میں صبح جمعرات کو لاہور آ رہا ہوں، جناب مجھے دس گیارہ بجے کے درمیان میاں عبدالمجید صاحب کی کوٹھی پر ملیں یا میاں صاحب کے فون پر اطلاع دیں کہ میں جناب کو کہاں ملوں؟

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

گجرانوالہ

اس مکتوب گرامی پر تاریخ مرقوم نہیں ہے، تاہم یہ اکتوبر ۱۹۶۴ء کی ابتدائی تاریخوں کا تحریر فرمودہ ہے۔

حضرت مولانا کے دونوں آخری مکتوبات (نمبر ۱۲ اور ۱۳) میری غیر حاضری میں آئے۔ ان دنوں میں لاہور سے باہر تھا۔ تاہم لاہور واپس آ کر حضرت مولانا کے خط پڑھے تو ان کے حکم سے الاعتصام کے نئے دفتر مجیدیہ فلور ملز (مصری شاہ) میں حاضر ہو گیا اور کام شروع کر دیا۔

۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ء کو میں الاعتصام کی ادارت سے مستعفی ہو گیا۔

اس دن میرے کمرے سے ملحق کمرے میں حضرت مولانا کے زیر صدارت جمعیت کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مولانا تشریف لائے اور میٹنگ کے کمرے میں جانے کے لیے میرے کمرے کے سامنے سے گزرے تو میری طرف دیکھا اور میں نے اٹھ کر نہایت احترام کے ساتھ سر جھکا کر انھیں سلام کیا۔ پھر میں نے دروازہ بند کر دیا اور مندرجہ ذیل الفاظ میں استعفا لکھ کر چپراسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں پہنچا دیا۔ اس وقت مجلس عاملہ کی میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔

بخدمت جناب حضرت امیر صاحب مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ میں گزشتہ پندرہ سال سے الاعتصام کی ادارت سے وابستہ ہوں۔ میں نے اس عرصے میں کوشش کی ہے کہ اخبار میں مندرجہ ذیل خصوصیات کو اجاگر کروں۔

۱۔ اسے ادبی اور معیاری اسلوب اظہار سے بہرہ مند کروں۔

۲۔ اس کی دینی سطح کو مناظرات سے اونچا رکھوں۔

۳۔ اہل حدیث کے تصورات اور دعوت کو اس انداز سے پیش کروں کہ ملک کا پڑھا لکھا طبقہ اس سے متاثر ہو۔

۴۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ صحافت وقلم کی توقیر واحترام کو مجروح نہ ہونے دوں۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں ان چاروں مقاصد میں کامیاب رہا۔ اس کا اعتراف وقتاً فوقتاً نہ صرف

Marfat.com

جماعت کے ذی علم افراد نے کیا، بلکہ ملک اور بیرون ملک کے علمی رسائل و جرائد نے بھی کیا۔ اور جب تک مجھے آزادی سے کام کرنے کا موقع میسر رہا، ''الاعتصام'' کے حلقہ اشاعت میں اتنی وسعت پیدا ہوئی کہ جماعت کی پوری تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

یہ ہے میری خدمات کا سمٹا ہوا اور مختصر تعارف۔

میں آج ۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ء کو یہ استعفا پیش کر رہا ہوں، میری مودبانہ گزارش ہے کہ استعفا آج ہی منظور فرما لیا جائے، ۴۔ جون ۱۹۶۵ء کا اخبار چھپ چکا ہے جو میں نے مرتب کیا ہے اور بحیثیت مدیر اس کی پیشانی پر میرا نام لکھا ہوا ہے۔ اب ۱۱۔ جون ۱۹۶۵ء کے شمارے کی لوح پر بحیثیت مدیر کے میرا نام نہ لکھا جائے۔

میں الاعتصام کی ادارت سے مستعفی ہوتا ہوں مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا قلم مسلک اہل حدیث کی خدمت کے لیے ہمیشہ متحرک رہے گا۔

آپ کا ادنیٰ خادم

محمد اسحاق

۳۰۔ مئی ۱۹۶۵ء

حضرت مولانا نے میرا استعفا مجلس عاملہ میں پیش کیا اور از رہ کرم اسی وقت منظور فرما لیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ الاعتصام کی ایڈیٹری سے مستعفی ہونے کے بعد میری گزر اوقات کی کیا صورت تھی؟

جواب یہ ہے کہ میں روزنامہ امروز میں جمعے اور اتوار کو (ہفتے میں دو مضمون) لکھتا تھا۔ الاعتصام سے مجھے دو سو روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور اس زمانے میں یہ معقول تنخواہ تھی، لیکن امروز کے مضامین سے مجھے اس سے دوگنا آمدنی ہو جاتی تھی۔ امروز کا اس زمانے میں جمعے کے دن ۴/۳۰×۲۰ کے آٹھ صفحات پر مشتمل اسلامی ایڈیشن شائع ہوتا تھا۔ مجھے تین سو روپے ماہانہ پر اس کی ادارت کی پیش کش ہوئی، لیکن میں نے یہ کہہ کر معذرت کر دی کہ مسلک اہل حدیث ہی کی خدمت کروں گا۔ سید ابوبکر غزنوی صاحب سے مشورے کے بعد طے ہوا کہ ہفت روزہ توحید جاری کیا جائے۔ میں اس کا ایڈیٹر ہوں گا، ابوبکر صاحب اخراجات کے ذمے دار ہوں گے اور ڈیکلریشن عمر فاروق صاحب غزنوی کے نام سے حاصل کیا جائے گا۔ میری تنخواہ وہی دو سو روپے ہوگی۔ دراصل مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے امرتسر سے ہفت روزہ اخبار توحید جاری کیا تھا، جس کا پہلا شمارہ یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا تھا اور آخری شمارہ یکم مئی ۱۹۲۹ء کو چھپا تھا۔ اس طرح یہ اخبار صرف دو سال ایک مہینہ جاری رہ سکا تھا۔ ہم نے اس کے دوبارہ جاری کرنے کا عزم کیا۔

میں ڈی سی آفس گیا اور چار فارم لے آیا۔ دوسرے دن میں اور مولوی عمر فاروق صاحب فارم جمع

Marfat.com

کرانے کے لیے ابھی دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ سے باہر نکلے ہی تھے کہ انھوں نے کہا:

آیئے واپس چلیں۔کل فارم جمع کرائیں گے۔

میں نے کہا: آج کیا ہے؟ جو کام ہوسکتا ہے، ہو جانا چاہیے۔

بولے: آج رہنے دو......آج منگل ہے،کل چلیں گے۔

میں نے کہا: منگل کو کیا ہوتا ہے؟

جواب دیا: منگل کا دن ٹھیک نہیں ہوتا،کل بدھ کا دن ٹھیک رہے گا۔

میں نے کہا: اگر آپ کے دل میں یہ وہم ہے تو ٹھیک بدھ کا دن بھی نہیں رہے گا۔

مولوی عمر فاروق کا عجیب وغریب معاملہ تھا، ان کو وظائف بھی بہت یاد تھے اور وہ باقاعدہ وظائف پڑھتے بھی تھے،لیکن ان میں یہ باتیں بھی تھیں کہ گھر سے باہر نکلے ہیں، اگر سب سے پہلے خاکروب پر نظر پڑ گئی تو یہ ان کے نزدیک اچھا شگون ہے۔ اگر امیر آدمی پر پڑی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔ اس قسم کی باتوں پر ان سے ہنسی مذاق رہتا تھا۔

بہرحال میں نے چند روز میں ڈیکلریشن حاصل کرلیا اور ایک مہینے کے اندر توحید میدان صحافت میں آگیا۔ ۲۰×۳۰/۴ کے بیس صفحات کا پرچہ نہایت شان سے چھپا۔ گیٹ اپ، کاغذ، مضامین، ہر اعتبار سے دیدہ زیب اور دل کش......!

لیکن کچھ عرصے بعد میں اخبار توحید سے الگ ہوگیا اور پھر ۲۱۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارہ ثقافت میں چلا گیا۔

اب میرے سفرِ حیات کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ختم ہوئی تو میں بیوی کو اپنے گاؤں (چک نمبر ۵۳ گ۔ب منصور پور) چھوڑ آیا جو جڑاں والا سے تین میل آگے فیصل آباد روڈ پر واقع ہے۔ اس وقت میں لوہاری دروازے کے اندر کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ چھوٹا بھائی سعید احمد میرے پاس تھا۔ ۲۰۔اکتوبر ۱۹۶۵ء کی شام کو ایک دوست کے ہاں میں کرشن نگر گیا۔ جاتے ہوئے سعید سے کہا کہ کچھ دیر ٹھہر کر آؤں گا، اگر کوئی صاحب آئیں تو انھیں چائے وغیرہ پلانا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد واپس آیا تو پتا چلا کہ تین صاحبان آئے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی، رئیس احمد جعفری اور (گوجراں والا کے) اسماعیل ضیا۔ انھوں نے کھڑے کھڑے میرے متعلق پوچھا اور اصرار کے باوجود چائے نہیں پی۔ رئیس صاحب نے پیغام دیا کہ کل سے وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملازم ہوگئے ہیں، صبح نو بجے مجھے گھر آکر ملیں۔

Marfat.com

میں نے پیغام سن کر سعید سے کہا کہ تمھیں بات سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملازم کیسے ہوگیا۔ نہ میں نے درخواست دی اور نہ کسی سے اس موضوع پر بات کی۔

رئیس صاحب میکلوڈ روڈ پر وکٹوریہ ہوٹل کے پیچھے ٹیگور پارک میں رہتے تھے اور چھیاسی روپے مکان کا کرایہ تھا۔ جب کہ میں تیس روپے کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ مولانا حنیف ندوی ٹمپل روڈ چوک بھونڈ پورہ میں سکونت پذیر تھے، ان کے مکان کا کرایہ چالیس روپے تھا۔

بہرکیف میں صبح نو بجے رئیس صاحب کے مکان پر پہنچا۔ سب سے پہلے ان کی اہلیہ آفتاب بیگم سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ کل رئیس صاحب آپ کو ملازمت کی خوش خبری دینے گئے تھے، آپ گھر پر نہیں تھے۔ اتنے میں رئیس صاحب آگئے۔ وہ عام طور پر مجھے ''میری جان'' کہا کرتے تھے۔ بولے میری جان کل میں اور حنیف صاحب اور اسماعیل ضیا آپ کے گھر گئے تھے اور آپ نہیں تھے۔ آج سے آپ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملازم ہوگئے ہیں، اب میرے ساتھ چائے پیجیے اور پھر دفتر پہنچیے، میں تھوڑی دیر تک آرہا ہوں۔

میں کلب روڈ پر دفتر گیا، تھوڑی دیر بعد رئیس صاحب بھی آگئے۔ اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر ایم ایم شریف تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت احترام سے پیش آئے اور کہا اسحاق صاحب ہم فی الحال آپ کو تین سو روپے ماہانہ دے سکیں گے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میرے لیے علاقہ غیر نہ تھا۔ مولانا حنیف ندوی ۱۵۔مئی ۱۹۵۱ء سے وہاں کام کر رہے تھے، شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی ۱۵۔جون ۱۹۵۱ء سے خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی نومبر ۱۹۵۴ء سے ادارے سے وابستہ تھے۔ ان سب حضرات کے ساتھ میرے مراسم تھے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا تو ایم ایم شریف صاحب کے کہنے سے محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق کی معروف عربی کتاب الفہرست کا ترجمہ شروع کر دیا گیا۔ افسوس کہ شریف صاحب ۱۱۔دسمبر ۱۹۶۵ء کو اچانک وفات پاگئے اور ترجمہ جو حواشی سمیت مطبوعہ شکل میں ایک ہزار صفحات میں پھیلا ہوا ہے، وہ دیکھ نہ سکے۔

ان کی وفات کے بعد جولائی ۱۹۶۶ء میں ایس ایم اکرام صاحب ڈائریکٹر بن کر آئے۔ انھوں نے مجھے ترقی دے کر تنخواہ پونے چار سو روپے کر دی اور پراویڈنٹ فنڈ بھی جاری کر دیا۔ اس سے کچھ عرصے بعد ادارے سے ماہانہ مجلّے المعارف کا ایڈیٹر بھی مجھے بنا دیا گیا۔ اس کا معاوضہ الگ ملنے لگا۔ اکرام صاحب کے زمانے (۱۹۶۹ء) میں الفہرست کا اردو ترجمہ چھپا۔ پھر برصغیر پاك وھند میں علم فقہ شائع ہوئی۔

بعد ازاں فقہاے ھند کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ کتاب دس جلدوں پر مشتمل ہے اور پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے ہزاروں فقہاے برصغیر کے حالات وسوانح کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے اس فقیر کو اس خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی۔

اس کے بعد برِ صغیر میں اسلام کے اولین نقوش تصنیف کی۔ اس میں ان صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا تذکرہ کیا گیا ہے جو مختلف اوقات میں برصغیر پاک و ہند میں تشریف لائے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات و سوانح میں ارمغان حنیف کے نام سے کتاب چھپی جو چار سو صفحات پر محیط ہے۔

علاوہ ازیں بے شمار مضامین و مقالات لکھے اور چھپے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں انیس بیس مقالے شائع ہوئے، جن میں قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کے چار مقالے بھی شامل ہیں۔ روز نامہ امروز میں بنات اسلام کے عنوان سے ایک سلسلے کا آغاز کیا۔ ہر اتوار کو اسلامی تاریخ کی کسی ایک بڑی خاتون پر مضمون چھپتا تھا۔ یہ سلسلہ تقریباً تین سال جاری رہا اور بہت سی قابل احترام خواتین کے حالات قلم بند کیے۔

ریڈیو پاکستان سے تقریروں کے لیے دعوت آئی۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۶۵ء کو پہلی تقریر ریڈیو سے نشر ہوئی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا اور تقریر سحری پروگرام سے متعلق تھی۔ اس کے بعد بے شمار تقریریں مختلف موضوعات پر نشر ہوئیں۔ ایک ایک دن میں تین تین تقریریں بھی ہوئیں۔ ٹیلی ویژن میں بھی بہت سے پروگرام کیے۔

ریڈیو پاکستان میں ایک پروگرام ''زندہ تابندہ'' کے نام سے شروع ہوا تھا، اس میں تقریروں کے لیے دعوت آئی تو چالیس کے قریب بڑی بڑی شخصیتوں پر میں نے لکھا اور ریڈیو سے نشر ہوا۔ ان حضرات عالی مقام میں میرے استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی شامل تھے۔

پھر قصوری خاندان کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی قصوری، میاں محمود علی قصوری اور مولانا عبداللہ قصوری وغیرہ کے کوائف زندگی بیان کیے گئے ہیں۔

میں نے کچھ عرصہ پیشتر سرسری سا حساب لگایا تھا، جو کتاب اس وقت خوانندگان محترم کے زیر مطالعہ ہے، اس سائز میں اگر میری تمام تحریریں شائع کی جائیں تو تقریباً تیس ہزار صفحات بنتے ہیں۔

میں نے استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کی خدمت میں الاعتصام کی ادارت سے استعفا پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> ''میں الاعتصام کی ادارت سے مستعفی ہوتا ہوں، لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا قلم مسلک اہل حدیث کی خدمت کے لیے ہمیشہ متحرک رہے گا۔''

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے حضرت استاذ سے جو تحریری وعدہ کیا تھا، اس کے ایفا کی صورتیں پیدا

Marfat.com

ہوئیں اور اس معصیت کیش کا قلم مسلک اہل حدیث کی خدمت کے لیے ہمیشہ متحرک رہا۔

الحمد للہ میں نے ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں کبھی ایسا پروگرام نہیں کیا جس کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ گوشہ بھی میرے مسلک کے خلاف جاتا ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ مجھے کوئی پروگرام دیا گیا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کا فلاں حصہ میرے مسلک سے مطابقت نہیں رکھتا تو میں نے صاف لفظوں میں وہ پروگرام کرنے سے انکار کر دیا۔ اس گنہگار پر اللہ کا یہ بے پایاں احسان ہے کہ اس نے کبھی اپنے نقطہ نظر سے انحراف نہیں کیا، اور کبھی سچائی پر مالی مفاد کو ترجیح دینے کا تصور سطح ذہن پر نہیں ابھرا۔ اپنے علم و مطالعہ کی رو سے جس بات کو صحیح سمجھا، اسے بلا جھجک بیان کیا۔

میں غریب خاندان کا غریب فرد ہوں، لیکن میں نے غربت کو کبھی حقیر شے نہیں سمجھا۔ زندگی کے ہر قدم پر اس کی حفاظت کی ہے اور لوگوں کی امارت کے مقابلے میں ہمیشہ اس کو نمایاں رکھا ہے اور اپنے لیے قابل فخر گردانا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے مسلک کو بھی سفر حیات کے ہر موڑ پر محفوظ رکھنے کی سعی کی ہے۔ اب کہ قافلہ عمر منزل سبعین کو پہنچ گیا ہے، اپنے عقیدہ و مسلک میں اور بھی پختہ ہو گیا ہوں۔

مجھے افسوس ہے، میری تمام کتابیں میرے استاذ محترم کی وفات کے بعد چھپیں، ان کے مطالعے میں میری کوئی کتاب نہ آسکی۔

میرے متعلق ان کو بعض ان مہربانوں نے جو کوئی علمی کام کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے، بھڑکایا۔ اب ان میں سے کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں۔ میں نے ان سب کو معاف کیا۔ میں بے حد گنہگار ہوں، معلوم نہیں میری دعا کا کوئی حصہ درجہ قبولیت کو پہنچتا ہے یا نہیں، لیکن بارگاہ الٰہی میں اپنے ان مرحوم کرم فرماؤں اور اساتذہ عظام کے لیے ہمیشہ عجز و عاجزی سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم.

میری ''خدمت'' جماعت اہل حدیث کا ایک لطیفہ اور سنیے!

کئی سال کی بات ہے، میں نے لاہور کے ایک ماہنامے میں بعض شخصیتوں کے بارے میں اپنی یاداشتیں (بصورت خاکہ) لکھنا شروع کیں۔ ان میں بعض غیر مسلم شخصیتیں بھی تھیں اور بعض غیر اہل حدیث بھی......! ان میں کسی انداز میں اہل حدیث کا تذکرہ بھی آجاتا تھا۔ ایک دن پنجاب کے محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر ملاقات کے لیے میرے دفتر آئے، وہ میرے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد بولے: میں بہت سے اخبارات و رسائل پڑھتا ہوں، لیکن تمھارے جیسا جماعت اہل حدیث کا مبلغ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ تم غیر مسلموں پر مضمون لکھو تو اس میں بھی اہل حدیث کا ذکر ضرور لے آتے ہو۔

Marfat.com

یہ تو خیر ہنسی مذاق کی بات تھی جو انھوں نے کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تین چیزوں کو نہیں بھول سکتا۔

اول: اہل حدیث کو کہ یہ میرا مسلک ہے اور اسی مسلک کے عاملین وحاملین کے حضور میں نے زانوے شاگردی تہہ کیا اور انہی حضرات میں زندگی بسر کی۔ اس کی کسی تنظیم سے وابستگی اختیار کروں یا نہ کروں، لیکن اس گروہ سے الگ نہیں ہوسکتا۔ البتہ میرا بات کرنے کا ڈھنگ ہمیشہ الگ رہا ہے۔

میرے نزدیک اہل حدیثیت اس ذوق، اس تہذیب، اس ثقافت، اس اعتدال، اس توازن، اس وسط، اس میانہ روی، اس حسن اسلوب، اس رواداری، اس شائستگی، اس طریق عمل اور اسلوب زیست کا نام ہے، جس کی تعلیم ہمیں صاحب حدیث (ﷺ) نے دی ہے اور جس پر کاربند رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ہر مسئلے پر لڑنے جھگڑنے اور کھسن مکی ہونے کا نام ہرگز اہل حدیثیت نہیں ہے۔

دوم: اخبار الاعتصام کو بھی نہیں بھول سکتا کہ میں نے اس سے اپنی تحریری زندگی کا آغاز کیا۔ اس کی توسیع اشاعت کے لیے بے حد محنت کی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں نہ سڑکوں کا یہ سلسلہ تھا جو اب ہے اور نہ موٹروں لاریوں کی یہ کثرت تھی جو اس دور میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ میں نے شدید گرمیوں میں دس دس بارہ بارہ کوس پیدل سفر کیا۔ (اس زمانے میں مسافت کی پیمائش کے لیے میل سے زیادہ کوس کا لفظ بولا جاتا تھا) بھوک پیاس کی شدتیں برداشت کیں۔ میں نے اس اخبار کے لیے جان لڑا دی۔ جوانی کا بہترین زمانہ اس کی نذر کر دیا۔ دن کو بھی اسی کا کام اور رات کو بھی یہی دھندا...... یہی وجہ ہے کہ جب اس کی ادارت سے مجھے مجبوراً الگ ہونا پڑا تو انتہائی ذہنی کوفت ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے اس کا کبھی ایک خریدار بھی نہیں بنایا تھا، وہ اس کے مالک و منتظم تھے اور جس نے دن رات محنت کی، وہ بے بس اور مجبور تھا۔

میں اس اخبار سے الگ ہو گیا، لیکن اس کی محبت میرے دل سے نہیں نکلی۔ اس کے صفحات پر میرے بعد آمریت کی تائید ہوئی، جو اہل حدیث کے نقطہ نظر کے سراسر خلاف تھی۔ جمہوریت کی مخالفت کی گئی جس کے تمام اہل حدیث علما (مولانا داؤد غزنوی، مولانا اسماعیل سلفی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عطاء اللہ صاحب اور مولانا حنیف ندوی وغیرہ) ہمیشہ حامی رہے، پھر یہ اذیت ناک وقت بھی آیا کہ اس کے اولین ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کو نشانہ تنقید بنایا گیا اور ان لوگوں نے بنایا جو مولانا کی تحریر کو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے، مگر اس کے باوجود مجھے اس اخبار سے تعلق رہا۔ اس لیے کہ میری اولین تحریری درس گاہ یہی اخبار تھا۔ اب بھی اس کے بعض پہلوؤں سے اختلاف کے باوجود، اس سے محبت ہے۔ اس کے ادارۂ تحریر میں میرا نام لکھ دیا گیا ہے، لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب نام نہیں لکھا تھا، اس وقت بھی اس سے تعلق تھا، لکھا گیا ہے، جب بھی تعلق ہے۔ نام لکھنے سے عزت میں

Marfat.com

اضافہ نہیں ہوتا اور نہ لکھنے سے کمی واقع نہیں ہوتی۔ میرے لیے نام لکھنا، نہ لکھنا دونوں برابر ہیں۔
سوم: گوجراں والا سے بھی مجھے قلبی لگاؤ ہے۔ وہاں نہ کوئی میرا رشتے دار ہے اور نہ کسی سے کاروبار کی کوئی سانجھ ہے۔ لیکن اس شہر سے اس لیے لگاؤ ہے کہ وہاں میں نے تعلیم حاصل کی، وہاں کے بہت سے لوگوں کا نمک کھایا اور وہیں میں نے قلم پکڑنا سیکھا۔ اب میں جو تھوڑا بہت الٹا سیدھا لکھ لیتا ہوں تو اس کی ابتدا اسی شہر سے اور اسی شہر کے صاحب علم (مولانا محمد حنیف ندوی) کی رہنمائی میں ہوئی۔ وہاں میرے بہت سے دوست ہیں، جن کا بے تکلفی کے باوجود میں احترام کرتا ہوں۔

گوجراں والا مردم خیز شہر اور مردم آفرین ضلع ہے، جس کی طرف میں آغاز مضمون میں اشارہ کر آیا ہوں۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب خالص جمہوری ذہن کے عالم دین تھے اور اسی نقطہ نظر کو صحیح قرار دیتے تھے۔ مرکزی جمعیت کے آئین میں بھی جمہوریت کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے۔ انتخاب، ووٹنگ، اکثریت کی روشنی میں فیصلے وغیرہ سب جمہوریت کے ذیل میں آتے ہیں۔ تعجب ہے، جماعت کے بعض حضرات انتخابات میں حصہ لیتے ہیں، ووٹ دیتے ہیں اور ووٹ مانگتے ہیں، جماعتی فیصلوں میں اکثریت کی رائے کو سامنے رکھتے ہیں، لیکن جمہوریت کے مخالف ہیں۔ جمہوریت کی مخالفت کا منطقی نتیجہ آمریت کی حمایت ہے، جس کی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا کوئی شخص تائید نہیں کر سکتا۔ اس ملک کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ آمریت اور مارشل لا کے دور میں پہنچا ہے۔

۲۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو پاکستان کا صدارتی انتخاب ہوا، جس میں محترمہ فاطمہ جناح نے صدر ایوب کا مقابلہ کیا تھا۔ فاطمہ جناح کی حمایت میں ملک کی تمام سیاسی جماعتیں متحد تھیں اور وہ تھیں کونسل مسلم لیگ، جمعیت علمائے اسلام، عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی اور پاکستان جمہوری پارٹی وغیرہ۔ ووٹر بنیادی جمہوریتوں کے ۸۰ ہزار ارکان تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان (جس کے امیر اس وقت مولانا محمد اسماعیل تھے) سیاسی جماعت نہ تھی، نہ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات میں بحیثیت جماعت کے اس نے کوئی حصہ لیا تھا...... ان دنوں مولانا حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی نے اعلان کیا تھا کہ وہ جماعت اہل حدیث کے ارکان کا اجلاس منعقد کر کے فیصلہ کریں گے کہ ملک کی صدارت کے دونوں امیدواروں میں سے کس کی حمایت کی جائے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اس ضمن میں ''صدارتی انتخاب اور جمعیت اہل حدیث'' کے عنوان سے جمعیت کی انتخابی پالیسی کی وضاحت فرمائی، جس میں انھوں نے صاف الفاظ میں جمہوریت کی تائید کی...... انھوں نے فاطمہ جناح کا نام لے کر ان کی تائید نہیں فرمائی اور نہ ایوب کا نام لے کر ان کی مخالفت کی ہے۔ لیکن ان کے اشاروں سے بات واضح ہو جاتی ہے...... حضرت مولانا کا وہ بیان جو انھوں نے آج سے بتیس برس قبل دیا تھا، ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ یہ بیان ۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے

Marfat.com

الاعتصام کے صفحہ اول پر چھپا تھا۔ میں اس وقت اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ بیان ملاحظہ فرمایئے۔

''مولانا حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی کی طرف سے پچھلے دنوں ملکی اخبارات میں ایک اعلان شائع ہوا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ

چند دنوں تک لاہور یا لائل پور میں جماعت اہل حدیث کے عام کارکنوں اور ملک کے انتخابی ادارے میں منتخب ہونے والے ارکان پر مشتمل ایک اجتماع بلایا جا رہا ہے، جس میں اس امر کا فیصلہ کیا جائے گا کہ جماعت کے کارکن صدارتی انتخاب میں کس کی حمایت کریں اور اہل حدیث بی ڈی ارکان کس امیدوار کو ووٹ دیں۔

اخبارات میں یہ اعلان پڑھنے کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نظام سے وابستہ احباب، ضلعی اور شہری جمعیتوں کے عہدے دار اور جمعیت سے تعلق رکھنے والے بنیادی جمہوریتوں کے ارکان مرکزی دفتر سے استفسار کر رہے ہیں کہ حافظ صاحب روپڑی کے اس اعلان کی حقیقت کیا ہے؟ کیا انھوں نے اس اہم سیاسی مسئلے پر غور وفکر کے لیے مجوزہ اجتماع طلب کرنے کے متعلق مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے قائدین سے کوئی رسمی یا غیر رسمی مشورہ کیا؟ اور اس سلسلے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی پالیسی کیا ہے؟

ان تمام احباب کی آگاہی کے لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ حافظ صاحب موصوف نے اس اجتماع کے سلسلے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے قائدین اور صدر دفتر سے کوئی رابطہ قائم نہیں فرمایا۔ انھوں نے یہ اعلان اس ادارے کے ناظم کی حیثیت سے کیا ہے جو انھوں نے اور ان کے چند احباب نے مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان سے علیحدگی کے بعد آج سے چند ماہ پیشتر قائم فرمایا تھا اور جس کا مقصد صرف تبلیغی اجتماعات کو منظم کرنے پر محدود تھا۔ یاد رہے اس ادارے کے امیر واجب الاحترام مولانا حافظ محمد گوندلوی تھے جو مدینہ یونیورسٹی کے استاذ کی حیثیت سے حجاز تشریف لے گئے اور تاحال کسی نئے امیر کا انتخاب یا قائم مقام امیر کا کوئی اعلان نہیں ہوا۔

ان حالات میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا اس اجتماع سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے خیال میں اس وقت اس قسم کا اجتماع کسی خاص فرد کے لیے تو شاید مفید ہو، لیکن جماعت کے لیے نقصان کا موجب ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس اجتماع کو بلانے والوں نے اس اعلان سے کسی دور اندیشی کا ثبوت نہیں دیا، اور اس امر کا شدید خطرہ ہے کہ اس اجتماع اور اس کے کسی جذباتی فیصلے سے جماعت کو کسی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

جماعت اور بیرونی جماعت کے تمام احباب کے لیے مزید وضاحت کی جاتی ہے کہ مرکزی جمعیت

Marfat.com

اہل حدیث ایک مذہبی اور دینی جماعت ہے اور اس نے سیاسی معاملات میں ہمیشہ اپنی دینی حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے اور اسی حیثیت سے رہنمائی کے فرائض سرانجام دیے ہیں...... مرکزی جمعیت نے اپنے اسی موقف کے احترام میں پچھلے دنوں بنیادی جمہورتیوں کے انتخاب میں اپنے کارکنوں کو دو متحارب گروہوں میں سے کسی ایک کی مکمل حمایت کرنے کے بجائے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے جماعت کو مشورہ دیا کہ دین پسند، دیانت دار اور معاملہ فہم افراد کو ووٹ دیں اور کسی سیاسی ہنگامے میں فریق بننے سے احتراز کریں۔

بنیادی جمہورتیوں کے انتخاب میں جو اہل حدیث کامیاب ہوئے ہیں، انھیں موجودہ صدارتی انتخاب میں کسی ایک پارٹی کے ساتھ دینے پر مجبور کرنا بوجوہ غیر مناسب ہے۔ ہمارے خیال میں دونوں طرف خیر و شر کے پہلو کم وبیش موجود ہیں اور موازنہ کرنے کے لیے آل پاکستان سطح پر ارباب علم وفہم کا نمائندہ اجتماع ناگزیر تھا، لیکن بحالات موجودہ یہ اجتماع نہ صرف غیر ممکن ہے، بلکہ غیر مفید بھی ہے۔ اس کا مناسب وقت گزر چکا ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جماعت کے جو رفقا ان انتخاب میں کامیاب ہوئے ہیں، وہ نہ تو جماعتی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں اور نہ جماعت نے من حیث الجماعت ان کی کامیابی میں کوئی نمایاں کردار سرانجام دیا ہے، بلکہ یہ حضرات ذاتی اثر ورسوخ سے یا اپنے احباب کی جدوجہد اور اہل حلقہ کی تائید وحمایت سے اس ذمے دارانہ منصب پر فائز ہوئے ہیں۔ انتخاب میں کامیابی کے بعد جماعت کی مداخلت غیر مستحسن اقدام ہوگا۔

ان حالات میں انتخابی ادارے کے اہل حدیث ارکان کا فرض یہی ہے کہ وہ کسی ترغیب وتحریص میں نہ آئیں، نہ خوف وہراس کا شکار ہوں، نہ ذات برادری کا مفاد سامنے رکھیں اور نہ خدمات اور سطحیت کا مظاہرہ کریں، بلکہ دینی تقاضوں، ملکی مفاد اور جمہوریت کی نشوونما کو پیش نگاہ رکھیں۔''

یہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کا اعلان تھا۔

اسی شمارے (۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۴ء) میں ''صدارتی انتخاب میں جمعیت اہل حدیث کی پالیسی'' کے عنوان سے میں نے مولانا کی موجودگی میں مندرجہ ذیل اداریہ لکھا۔ اداریہ چوں کہ پالیسی میٹر سے متعلق تھا، اس لیے مولانا کو دکھایا اور مولانا نے اس کو صحیح قرار دیا تو اسے اخبار میں شائع کیا گیا۔ مولانا کا بیان اور اداریہ دونوں ایک ہی شمارے میں چھپے۔ اداریہ ملاحظہ ہو۔

''صدارتی انتخاب کی تاریخ ۲۔ جنوری ۱۹۶۵ء مقرر ہوئی ہے جو تیز رفتاری سے آرہی ہے۔

یہ دور ملک وقوم کے لیے انتہائی اہم ہے۔ دونوں دھڑے مضبوطی اور جرات سے سرگرم عمل ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناح اور ان کے حامی پوری طاقت سے میدان میں اتر آئے ہیں اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں اور ان کے معاون بھی وسیع پیمانے پر ملک کے طول وعرض کا دورہ کررہے ہیں اور فضا کو اپنے حق میں سازگار بنانے

Marfat.com

کے لیے مصروف عمل و حرکت ہیں۔

اس وقت کامیابی کی کنجی ملک کے ۸۰ ہزار بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اکثریت نے جس کے حق میں فیصلہ دے دیا وہ کامیابی سے ہم کنار اور ملک کی مسند صدارت پر فائز ہو جائے گا۔

بنیادی جمہوریتوں میں اہل حدیث حضرات بہت بڑی تعداد میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انھیں بھی بحیثیت رکن بہر حال کسی ایک امیدوار صدارت کو ووٹ دینا ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد اسماعیل صاحب امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کا وضاحتی اعلان الاعتصام کی اسی اشاعت کے صفحہ اول پر درج کیا جا رہا ہے۔ موجودہ حالات میں یہ بیان نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ارکان کی پوری رہنمائی کی گئی ہے۔

بات اصل میں یہ ہے (جیسا کہ امیر جماعت کے اعلان سے واضح ہے) جمعیت اہل حدیث کا اصلی مطمح نظر دین کی تبلیغ، کتاب و سنت کی نشر و اشاعت اور ملک میں کامل جمہوریت کا نشو و ارتقا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کون امیدوار اور جماعتیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں اور کن سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ان بنیادی امور کا خیال رکھیں گی۔

ہم مسلمان ہیں، ہمارا اوڑھنا بچھونا صرف اسلام ہے۔ ہم اسلام ہی کی حدود میں مقید رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری ہمیشہ یہی خواہش رہی ہے اور یہی رہے گی، ان شاء اللہ۔

ہم عائلی قوانین کے بعض گوشوں کے (جو موجودہ حکومت نے نافذ کیے ہیں) شدید مخالف ہیں اور انھیں کتاب و سنت کے منافی قرار دیتے ہیں، کیوں کہ ان میں قرآن و حدیث کے صریح نصوص کی مخالفت کی گئی ہے اور دین میں تحریف کے دروازے کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح ملک کے آئین کی بعض شقیں بھی اس جمہوری روح کے خلاف ہیں جو اسلام پیش کرتا ہے۔ آرڈی ننسوں کے ذریعے حکومت کا کاروبار چلانا اور لوگوں کی آواز بند کر دینے کی سعی کرنا، فطرت انسانی، اصول جمہوریت اور اس حریت و آزادی سے متصادم ہے جو اسلام انسان کو عطا کرتا ہے۔

امیر جمعیت کے بیان میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ یہی چیزیں پیش کی گئی ہیں اور بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اس امیدوار صدارت کو ووٹ دیں جو ان امور کو پیش نگاہ رکھے۔ ان کے یہ الفاظ بیان کی اصلی روح ہیں۔

ان حالات میں انتخابی ادارے کے اہل حدیث ارکان کا فرض ہے کہ وہ کسی ترغیب و تحریص میں نہ آئیں، نہ خوف و ہراس کا شکار ہوں، نہ ذات برادری کا مفاد سامنے رکھیں اور نہ جذبات و سطحیت کا مظاہرہ کریں بلکہ دینی تقاضوں، ملکی مفاد اور جمہوریت کی نشو و نما کو پیش نگاہ رکھیں۔"

جمعیت اہل حدیث کسی خاص امیدوار کی حامی یا مخالف نہیں ہے۔ وہ چند اصولوں اور معیاروں کو سامنے

Marfat.com

رکھتی ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کے اہل حدیث ارکان کو کسی کی حمایت یا مخالفت پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ تمام تر معاملے کو ان کی صواب دید پر چھوڑتی ہے۔ جمعیت ان سے صرف یہ چاہتی ہے کہ وہ اس امیدوار صدارت کو ووٹ دیں جس سے یہ امید ہو کہ وہ

☆ اس ملک میں اسلامی آئین نافذ کرے گا۔

☆ دینی تقاضوں کو پیش نظر رکھے گا۔

☆ پاکستان میں خوف وہراس اور دہشت نہیں پھیلائے گا۔

☆ بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کے ضمیر کو نہیں خریدے گا۔ ان کے راستے میں روپے پیسے کی ترغیب وتحریص کے جال نہیں بچھائے گا۔

☆ ذات برادری کے مفاد کو ترجیح نہیں دے گا۔

☆ کنبہ پروری نہیں کرے گا اور ملک کی دولت کو سمیٹنے کے لیے ساعی نہیں ہوگا۔

جو گروہ اسلام میں تحریف کے دروازے کھولنے کے لیے بے تاب، جمہوریت کے قدموں میں زنجیریں ڈالنے کے لیے مضطرب، دینی تقاضوں کو نظر انداز کر کے خود ہی سب کچھ بننے کے لیے بے قرار اور عوام کی آواز کو دبا کر ملک پر مسلط رہنے کے لیے کوشاں ہو، جمعیت اہل حدیث ہرگز اس کی حمایت نہیں کر سکتی۔

اسلامی جمہوریت کے نقطہ نظر سے سیاسی معاملات میں اختلاف رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور خلافت راشدہ سے لے کر اب تک ہر دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ جو گروہ اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو، بنیادی جمہوریتوں کے اہل حدیث ارکان کو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔''

یہ اداریہ ۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۴ء کے ''الاعتصام'' میں چھپا تھا۔

یہاں صدارتی انتخاب کے سلسلے کا ایک واقعہ سنتے جایئے جو اسماعیل ضیا صاحب نے بیان کیا۔ وہ اس وقت نیشنل عوامی پارٹی سے منسلک تھے اور فاطمہ جناح کے حامی......!

ان کا بیان ہے کہ اس زمانے میں وہ گوجراں والا کی طرف سے متحدہ حزب اختلاف (C.O.P) کی تنظیمی کمیٹی کے رکن تھے اور بی ڈی ممبر بھی تھے۔ ایک دن یہ لوگ اپنی کمیٹی میں گوجراں والا کے مختلف ووٹروں سے رابطہ پیدا کرنے کے مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے ان سے کہا کہ چوہدری محمد ابراہیم گجر جو سول لائنز میں رہتے ہیں اور بی ڈی ممبر ہیں، مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ان سے ملیں اور ووٹ کے لیے بات کریں۔ چنانچہ ضیا صاحب نے حضرت مولانا محمد اسماعیل مرحوم کے ذریعے ان سے بات کرنے کا پروگرام بنایا۔

Marfat.com

یہاں یہ یاد رہے کہ اسماعیل ضیا صاحب کے والد حاجی محمد علی مرحوم گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث کے خازن تھے۔ ان کی وفات کے بعد اسماعیل ضیا صاحب کو خازن بنایا گیا تھا۔

بہرحال ضیا صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور سخت سردی پڑ رہی تھی۔ مولانا کا معمول تھا کہ ظہر کی نماز صحن مسجد میں ادا کرتے اور وہاں بیٹھ کر سورج کی حرارت سے لطف اندوز ہوتے۔ نماز کے بعد وہیں کچھ دیر کے لیے اخبارات و جرائد کا مطالعہ فرماتے۔ ضیا صاحب گئے تو دیکھ کر تبسم فرمایا اور کہا:

''آج کدھر بھل پیاں ایں؟''

پھر ان کے کوٹ پر مس فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین پر نظر پڑی تو بولے:

''خیر نہیں لگدی، دنے ای لالٹین لئی پھرنا ایں۔''

ضیا صاحب نے جواب دیا:

''ایس لالٹین وچ تیل پوان لئی تہاڈے کول آیا آں۔''

یہ الفاظ کہہ کر چوہدری محمد ابراہیم گجر کے بارے میں پوچھا کہ آپ انھیں ضرور جانتے ہوں گے بلکہ وہ آپ سے عقیدت رکھتے ہوں گے۔

فرمایا: ''مطلب دی گل کر......!''

انھوں نے کہا: ''آپ انھیں حکم دیں تو وہ اپنا ووٹ مس فاطمہ جناح کے حق میں ضرور استعمال کریں گے۔''

ارشاد ہوا: ''میں تو سیاست سے ریٹائر ہو چکا ہوں۔''

ضیا صاحب نے کہا: ''آپ اپنی تقریروں میں اور خطبہ جمعہ میں جب سیاست پر تبصرہ کرتے ہیں تو ریٹائرمنٹ کیسی؟''

بولے: ''بس اسی حد تک رہنے دو۔''

اب ضیا صاحب نے پینترا بدلا اور کہا: ''تو پھر مجھے حکم دیجیے کہ میں اپنا ووٹ ایوب خاں کو دوں۔''

فرمایا: ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔''

عرض کیا: ''تو پھر چوہدری ابراہیم سے کہیے کہ وہ مس فاطمہ جناح کو ووٹ دیں۔''

اس کے بعد وہ ان کے ساتھ چوہدری صاحب ممدوح کے پاس جانے کو تیار ہو گئے۔

فاطمہ جناح کا انتخابی نشان لالٹین تھا اور یہ اسماعیل ضیا صاحب کے کوٹ پر لگا ہوا تھا۔

فرمایا: ''اسے اتار کر جیب میں ڈال لو۔''

چوہدری ابراہیم صاحب کے گھر پہنچے تو ان سے کہا:

Marfat.com

''چوہدری! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ ایوب خاں کے مقابلے میں مس فاطمہ جناح کو ووٹ دینے میں کوئی گناہ نہیں۔''

ضیا صاحب نے عرض کیا: ''واضح الفاظ میں حکم دیں۔''

فرمایا: ''میں نے اس کے ذہن سے عورت کو ووٹ دینے کا خوف دور کر دیا ہے، بس یہی کافی ہے۔''

اس وقت بھی بعض لوگوں نے عورت کو ووٹ نہ دینے اور اسے سربراہ مملکت نہ بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی۔ مولانا کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ عورت کو ووٹ دینے سے انسان گنہگار نہیں ہو جاتا۔

جیسے جیسے سلسلہ نگارش آگے بڑھ رہا ہے حضرت استاذ کے بارے میں بہت سی باتیں ذہن میں گھومنے لگی ہیں۔ ۱۹۴۱ء کی بات ہے، ایک دن ہم ان کے حلقہ درس میں شامل تھے کہ انھوں نے کسی اہم مسئلے سے متعلق وضاحت فرمائی۔ ایک صاحب نے کہا حضرت! جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، فلاں امام عالی مقام نے تو اس کے برعکس لکھا ہے۔

مولانا نے نہایت جچے تلے الفاظ میں دوبارہ اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور انتہائی مودبانہ انداز میں ان عظیم المرتبت امام سے اظہار اختلاف فرمایا۔ آخر میں ارشاد ہوا، نحن رجال وھم رجال ہم بھی انسان ہیں، وہ بھی انسان تھے۔ ہم بھی غلطی کرتے ہیں، ان سے بھی غلطی کا امکان تھا۔

نحن رجال وھم رجال کے الفاظ میں نے پہلی مرتبہ حضرت مولانا کی زبان مبارک سے سنے تھے اور اسی وقت سے یاد ہیں۔

ان کا پہلا مضمون میں نے تقسیم ملک سے چند سال پیشتر حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم و مغفور کے اخبار اھل حدیث (امرتسر) میں پڑھا تھا۔ اس زمانے میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف کو جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے کسی مسئلے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے اختلاف کا اظہار فرمایا تو جواب میں حکیم صاحب ممدوح نے مولانا مودودی کا دفاع کیا۔ پھر حکیم صاحب کے جواب میں حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے مضمون تحریر فرمایا جو اھل حدیث کی کئی قسطوں میں چھپا۔ اس سے قبل اس عاجز نے حضرت کی تقریریں تو بہت سنی تھیں، لیکن ان کی تحریر پہلی دفعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرا خیال ہے متعدد عنوانات پر مولانا کے مضامین اھل حدیث میں چھپے ہوں گے، وہ تلاش کر کے چھاپ دینے چاہئیں۔ اھل حدیث کے تمام فائل گوجراں والا میں محترم دوست ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اگر میرا تعلق گوجراں والا سے ہوتا تو میں یہ خدمت سرانجام دینے میں بالکل تساہل نہ کرتا۔

Marfat.com

اخبار اھل حدیث کے فائل دیکھ کر حضرت مولانا کے مضامین تلاش کرتا، ہر مضمون کا پس منظر بھی بیان کرتا اور وضاحت طلب مقامات کی وضاحت بھی کرتا۔

الاعتصام اور دیگر جرائد ورسائل میں بھی ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں، جن کی حیثیت دورگزشتہ کی تاریخ کی ہے، وہ بھی جمع کر کے چھاپ دینے چاہئیں۔

مولانا کا انداز کلام نہایت دلچسپ تھا۔ ایک دن انھوں نے الاعتصام میں شائع کرنے کے لیے کسی صاحب کا مضمون مجھے دیا۔ میں نے مضمون پڑھا اور روک لیا، اس لیے کہ اس میں بعض الفاظ کے ہجے غلط لکھے گئے تھے۔ ایک مہینے کے بعد فرمایا:

''فلاں شخص کا مضمون تمھیں دیا تھا، اسے چھاپ دیتے۔''

عرض کیا: ''مضمون نگار کو تو الفاظ کے ہجوں کا پتا نہیں، اس نے غلط ہجے لکھے ہیں۔''

فرمایا: ''کون سے ہجے غلط لکھے ہیں؟''

عرض کیا: ''مثلاً ''تعویذ'' کو ذال کے بجائے ''تعویز'' زا سے لکھا ہے۔ جو شخص صحیح ہجے نہیں لکھ سکتا، اس کا مضمون کس طرح چھاپا جائے۔''

مسکراتے ہوئے فرمایا: ''عملاً وہ یہ دھندا کرتا ہی نہیں ہوگا، اسے کیا معلوم، یہ لفظ کیا ہے اور کس طرح لکھا جاتا ہے۔''

صحیح ہجے نہ لکھنے کی یہ دلچسپ توجیہ سن کر میں نے مضمون درست کر کے اگلے ہفتے شائع کر دیا۔

بعض اوقات مولانا سوال کا جواب عجیب انداز میں دیتے تھے۔ اسماعیل ضیا صاحب نے بتایا کہ ایک دن کسی کام سے وہ میاں عبدالستار کی ستارہ فیکٹری میں گئے۔ وہاں مولانا مرحوم بھی تشریف فرما تھے۔ دفتر کی دیوار پر حدیث لکھی تھی۔

"الراشی والمرتشی کلا ھما فی النار ."

ضیاء صاحب نے حدیث کی روشنی میں مولانا سے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص اپنا جائز حق بھی بغیر رشوت کے حاصل نہ کر سکے تو اس کے لیے کیا ارشاد ہے؟

مولانا نے اپنے خاص انداز میں فرمایا: ''توں اگے سارے کم میرے کولوں پچھ کے کرنا ایں۔''

اس پر مجلس میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور بات ختم ہوگئی۔

لباس کے معاملے میں وہ سادگی پسند تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ تہمند باندھا ہوا ہے، اور کلے پر مشہدی عمامہ ہے۔ کبھی شلوار اور شیروانی پہنے ہوئے ہیں اور سر پر کھجور کے تیلوں کی ٹوپی اور پاؤں میں کھال کی

Marfat.com

جوتی ہے۔ مونڈھوں پر لمبا سا رومال ضرور رکھتے تھے۔ ایک دفعہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں وہ تہمند باندھے ہوئے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف نے بھی تہمند باندھ رکھا تھا، اور وہ اس وقت مولانا داؤد غزنوی کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے شیخ الحدیث تھے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری اور مولانا محمد حنیف ندوی بھی اجلاس میں شامل تھے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری نے ازراہ مزاح مولانا غزنوی سے کہا:

جناب صدر! اپنے ناظم اعلیٰ کو دفتری لباس اور دفتری آداب سے آگاہ فرمایے۔

مولانا حنیف ندوی نے فرمایا:

''جناب صدر! میں بھی ایک گزارش کرنا چاہتا ہوں۔''

مولانا نے کہا: ''فرمایے۔''

کہا: ''اپنے شیخ الحدیث سے صحیح بخاری کا کتاب اللباس پڑھنے کی درخواست کیجیے۔''

یہ بات تو مزاح کی تھی، لیکن مولانا داؤد غزنوی لباس کے بارے میں بڑے نازک مزاج اور نفاست پسند تھے۔ انھوں نے سنجیدگی سے مولانا اسماعیل صاحب اور عطاء اللہ صاحب کی طرف دیکھا اور فرمایا: ''مولانا عطاء اللہ صاحب کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جمعیت کے ناظم اعلیٰ مولانا اسماعیل صاحب کو صدر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ وہ آئندہ تہمند باندھ کر دفتر نہ آیا کریں، شلوار اور شیروانی پہن کر اور عمامہ باندھ کر دفتر تشریف لایا کریں۔''

میٹنگ ہال سے باہر نکلے تو مولانا اسماعیل صاحب نے مسکراتے ہوئے مولانا محی الدین قصوری سے پنجابی میں کہا: ''میں تے مولوی عطاء اللہ دو درویش تہاڈے چ پھسے آں، تسیں سانوں کیوں تنگ کردے او۔''

اللہ اللہ! کتنے اونچے تھے وہ لوگ...... اس فقیر کو یہ سعادت حاصل ہے کہ اسے ان کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کے ارشادات سننے کے مواقع میسر آئے۔

مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی سنتے جایے کہ اس زمانے میں اس کے ارکان اکیس یا بائیس ہوتے تھے۔ غیر رکن اجلاس میں ہرگز نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اسی طرح مجلس شوریٰ کے اجلاس میں بھی غیر رکن نہیں شامل ہو سکتا تھا۔

لیکن اس کے بعد ہم نے بارہا دیکھا کہ مجلس عاملہ کی میٹنگ ہو رہی ہے تو اس پر مجلس شوریٰ کا شبہ پڑتا ہے اور مجلس شوریٰ کا اجلاس، جلسہ عام کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ جس کا جی چاہے میٹنگ میں آئے اور جب جی چاہے، جائے، کوئی کسی کو روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔

Marfat.com

مولانا داؤد غزنوی جیسا مضبوط، معاملہ فہم، منتظم اور مجلس کو کنٹرول کرنے اور ارکان کو ایک خاص حد میں رکھنے والا رہنما جماعت اہل حدیث کو نہیں ملا اور نظر بہ بظاہر مل بھی نہیں سکے گا۔ ان کی موجودگی میں کسی کو ایجنڈے کے دائرے سے باہر نکلنے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ انھوں نے بڑی بڑی سیاسی جماعتیں دیکھی تھیں اور ان میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ وہ پنجاب کانگرس کے صدر رہے جو اس صوبے کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ پنجاب اس وقت بڑے بڑے انتیس ضلعوں پر مشتمل تھا اور اٹک کی لہروں سے لے کر دلی کی دیواروں تک پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب کانگرس میں ہندو، سکھ اور مسلمان سیاسی رہنما بہت بڑی تعداد میں شامل تھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، مولانا کی ان سب پر گرفت تھی۔

مولانا داؤد غزنوی کا تذکرہ یہاں ضمناً آ گیا ہے، ورنہ ان سے متعلق تفصیلات اس مضمون میں بیان کی گئی ہیں جو ان کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

دیگر سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا اسماعیل صاحب کا سلسلہ تحریر و نگارش بھی جاری رہتا تھا اور اس طرح وہ صاحب تصانیف عالم تھے۔ ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں، جن میں تراجم بھی شامل ہیں۔

۱۔ مشکوۃ مترجم: انھوں نے مشکوۃ شریف کا اردو ترجمہ شروع کیا تھا، لیکن مکمل نہیں ہو سکا، صرف حصہ اول تک پہنچا تھا۔ یہ ترجمہ ادارہ احیاء السنہ اردو بازار، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ اس ادارے کے مالک مولانا خالد گھرجاکھی ہیں اور اس کے منتظم ان کے صاحب زادہ جناب محمود صاحب ہیں۔

۲۔ فتاویٰ: یہ حضرت مولانا کے وہ فتوے ہیں جو مختلف اوقات میں بعض فقہی مسائل سے متعلق ہفت روزہ الاعتصام کے بعض شماروں میں چھپے۔ فتاوے کا یہ مجموعہ اسلامک پبلیکیشنز (شیش محل روڈ لاہور) کے مالک و منتظم مولانا منیر احمد صاحب نے شائع کیا ہے۔

۳۔ سبعہ معلقہ: عربی ادب کی مشہور کتاب ہے جو درس نظامی میں شامل ہے۔ مولانا نے ہر شعر کی پہلے عربی میں شرح فرمائی ہے، پھر اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ عربی ادب کے سلسلے کی یہ اہم خدمت ہے جو حضرت مولانا نے سرانجام دی۔ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۴۔ تحریك آزادی فکر اور شاہ ولی الله کی مساعی جمیله: یہ مولانا کے ان مضامین کا علمی مجموعہ ہے جو تحریک ولی اللہی سے متعلق ہفت روزہ الاعتصام میں شائع ہوئے۔ یہ تمام علمی مضامین میرے اور مولانا محمد حنیف ندوی کے زمانہ ادارت میں چھپے تھے۔ اس کا ناشر بھی مکتبہ سلفیہ (شیش محل روڈ لاہور) ہے۔

۵۔ حجیت حدیث: یہ بھی حضرت مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ہمارے دور ادارت میں

Marfat.com

الاعتصام میں چھپے۔ اپنے موضوع کے یہ نہایت اہم مضامین تھے۔ ان کی اشاعت کا اہتمام اسلامک پبلیکیشنز شیش محل روڈ لاہور نے کیا۔

۶۔ اسلامی حکومت کا خاکہ: یہ بھی ان کے مختلف مضامین ہیں جنھیں کتابی شکل دی گئی۔

۷۔ رسول اکرم ﷺ کی نماز: اپنے موضوع کی یہ بھی اہم کتاب ہے اور ان مضامین و مندرجات پر محیط جو الاعتصام میں چھپتے رہے۔ اسے نعمانی کتب خانہ، اردو بازار لاہور نے شائع کیا۔

۸۔ خطبات سلفیہ: یہ مولانا کے خطبات جمعہ کا مجموعہ ہے جو نعمانی کتب خانہ (اردو بازار لاہور) کی سعی وکوشش سے کتابی شکل میں معرض اشاعت میں آیا۔ خواجہ محمد قاسم اور چوہدری عبدالواحد گوندل نے مختلف اوقات میں مرتب کر کے یہ خطبات الاعتصام میں شائع کرائے تھے۔ اس پر مقدمہ مولانا کے فرزند ارجمند پروفیسر محمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ ہم بجا طور پر توقع رکھتے تھے کہ پروفیسر صاحب مقدمے میں حضرت مولانا کے حالات بیان فرمائیں گے، لیکن غالباً ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ جس طرح دیگر علمائے اہل حدیث کے اخلاف نے اپنے آباواجداد کے حالات بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا، اسی طرح پروفیسر محمد صاحب کا ذہن بھی اس طرف منتقل نہیں ہوا۔

خطبات سلفیہ کی اشاعت ایک بہترین خدمت ہے جو ہمارے مرحوم دوست مولوی بشیر احمد نعمانی نے اپنے نعمانی کتب خانہ کی طرف سے انجام دی۔ مولانا بہت بڑے مقرر وخطیب تھے۔ ان خطبات کو مرتب اور شائع کرنے والے حضرات لائق تعریف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔ میرے خیال میں اس کا نام خطبات سلفیہ کے بجائے خطبات مولانا اسماعیل ہونا چاہیے تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ خواجہ محمد قاسم مولانا کے خطبات جمعہ مرتب کر کے سہ روزہ منہاج کو بھی بھجواتے رہے ہیں۔ یہ سہ روزہ اخبار میں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر جنوری ۱۹۵۸ء میں لاہور سے جاری کیا تھا جو اپریل ۱۹۵۹ء تک جاری رہا تھا۔ اس کے متعدد شماروں میں حضرت مولانا کے خطبات جمعہ شائع ہوئے جو ہمارے عزیز دوست خواجہ صاحب ممدوح نے ترتیب دیے تھے۔

مولانا کے دیگر مضامین بھی مختلف اخبارات سے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے ان سے کئی مضمون امروز کے لیے لکھوائے تھے جو امروز میں شائع ہوئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، روزنامہ کوہستان (لاہور) میں بھی ان کے چند مضامین چھپے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کوہستان نیا نیا لاہور سے جاری ہوا تھا اور اس کے لیے نسیم حجازی مرحوم اور حافظ محمد زکریا صاحب راولپنڈی سے یہاں آئے تھے۔ مجھ سے اور مولانا حنیف ندوی سے اس سلسلے میں ان کی کئی ملاقاتیں دہلی مسلم ہوٹل میں ہوئی تھیں اور میں نے

Marfat.com

حافظ صاحب موصوف کو ان کے طلب کرنے پر الاعتصام کے خریداروں کے پتے بھی دیے تھے اور ان پتوں پر انھوں نے کوہستان بھیجا تھا۔

تقسیم ملک سے قبل ماہنامہ اسلامی زندگی میں مولانا کے بعض علمی مضامین چھپے تھے۔ یہ رسالہ مولانا محمد حنیف ندوی ترتیب دیتے تھے۔

اپریل ۱۹۲۷ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے امرتسر سے ہفت روزہ توحید کا اجرا کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ دو سال جاری رہا، مئی ۱۹۲۹ء میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس میں ہندوستان کی بہت سی اہم شخصیتوں کے افکار عالیہ شائع ہوئے تھے، ہوسکتا ہے مولانا اسماعیل صاحب کے مضامین بھی اس میں چھپے ہوں۔

اخبار اہل حدیث امرتسر میں بھی وہ لکھتے رہے ہیں۔ الاعتصام میں بھی ان کے بے شمار مضامین چھپے۔ بے شک مذکورہ بالا اخبارات و جرائد میں شائع شدہ ان کے تمام مضامین نہیں مل سکیں گے، لیکن جن کے دست یاب ہونے کا امکان ہے، ان کے لیے تو کوشش کرنی چاہیے اور پھر ایڈٹ کر کے انھیں کتابی شکل میں چھاپ دینا چاہیے۔ یہ علم و تحقیق کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

اخبار توحید (امرتسر) کے فائل ہمارے ایک دوست کے پاس لاہور میں موجود ہیں۔

حضرت مولانا بہت سی خصوصیات کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم کی دولت بے پایاں سے بھی نوازا تھا اور نعمت عمل بھی عطا فرمائی تھی۔ گوجراں والا میں انھوں نے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ وہ ۱۹۲۱ء میں وہاں آئے تھے۔ پھر اسی شہر کو انھوں نے اپنا مسکن قرار دے لیا اور توحید و سنت کی تبلیغ میں مشغول ہو گئے۔ ۴۷ برس بعد یہی شہر ان کا مدفن ہوا۔

ان کا ایک ایک لمحہ خدمت دین میں بسر ہوتا تھا۔ انھوں نے گوجراں والا میں تکلیفیں بھی اٹھائیں اور اطمینان قلب بھی پایا۔ جو شمع انھوں نے پہلے دن اس شہر میں آ کر جلائی تھی، اس کی روشنی روز بروز بڑھتی گئی۔ تاریکی کے بادل چھٹ گئے۔

وہ ایک خاص فقہی مسلک کے حامل تھے، لیکن ان کے تعلقات کی حدیں وسیع تھیں اور سب سے ملتے اور تمام مسالک فقہ کے لوگوں سے مراسم رکھتے تھے۔

۱۹۶۷ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، لیکن علاج سے اللہ تعالیٰ نے صحت عطا فرما دی تھی۔ اس سے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ ۲۰۔ فروری ۱۹۶۸ء کو وہ چائے نوش فرمانے لگے کہ پیالی ہاتھ سے گر گئی اور وہ آناً فاناً اس دنیائے دوں سے منہ موڑ کر عالم آخرت کو روانہ ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

Marfat.com

انھوں نے اپنے پیچھے عقیدت مندوں اور متبعین کتاب وسنت کا بہت بڑا حلقہ چھوڑا۔ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی ان کے جنازے میں شرکت کے لیے اکٹھے لاہور سے روانہ ہوئے تھے۔ بہت بڑا جنازہ تھا اور دور ونزدیک سے بے شمار لوگ ان کو آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

ہم عاجز وعاصی بندے اللہ کے حضور ان کے لیے دعا گو ہیں کہ

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه.

حضرت مرحوم کی اولاد نرینہ تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے پروفیسر محمد، ان سے چھوٹے حکیم محمود اور سب سے چھوٹے محمد داؤد......!

پروفیسر محمد کو میں نے پہلی دفعہ ۱۹۴۰ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایف۔اے یا بی۔اے کے طالب علم تھے۔ اپنے جد امجد مولوی محمد ابراہیم مرحوم کے ساتھ مسجد میں آیا کرتے تھے اور زیادہ تر انہی کے ساتھ رہتے تھے۔ شکل شباہت ان سے ملتی جلتی تھی۔ شلوار ٹخنوں سے اونچی رکھتے تھے۔ کالج کا بظاہر ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ میرے خیال میں عربی کی بعض کتابیں بھی وہ اپنے قابل احترام دادا سے پڑھتے تھے۔ دادا نے اپنے اس لائق پوتے کی بہترین تربیت کی۔ مجھے یاد پڑتا ہے نظر کی عینک وہ اس وقت بھی لگاتے تھے، لیکن (میرے خیال میں) ان کے دادا عینک نہیں لگاتے تھے۔ البتہ مولانا عینک لگاتے تھے۔

محترم المقام جناب پروفیسر محمد صاحب نے ایم اے کب کیا؟ یہ معلوم نہیں، البتہ کچھ ایسی بات ذہن میں آرہی ہے کہ بطور لیکچرار ان کی پہلی تقرری میانوالی کے کالج میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس کالج کے پرنسپل غالباً مولوی ظفر اقبال مرحوم تھے۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ اس باب میں انھوں نے مولوی ظفر اقبال کے نام خط لکھا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر محمد کا تبادلہ لاہور سنٹرل ٹریننگ کالج میں ہوگیا تھا، جسے اب گورنمنٹ ایجوکیشنل کالج کہا جاتا ہے۔ اسی کالج سے وہ ریٹائر ہوئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے لاہور میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے انھوں نے حدیث کی بعض کتابیں پڑھی تھیں۔

پروفیسر محمد صاحب کے لاہور تبادلے کے بارے میں مجھے پروفیسر سلیم فارانی (مرحوم) نے بتایا تھا۔ وہ ملتان کے رہنے والے تھے اور حکیم خدا بخش فارانی مرحوم کے بیٹے تھے جو فارسی کے اچھے شاعر تھے اور ہفت روزہ الاعتصام کے ابتدائی دنوں میں ان کی فارسی نظمیں اس اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔

پروفیسر سلیم فارانی کئی سال سنٹرل ٹریننگ کالج میں پڑھاتے رہے۔ خوش مزاج اور خوش لباس آدمی تھے، آواز مقررانہ تھی۔ میرے ساتھ ان کے بہت اچھے مراسم تھے، کبھی کبھی میرے پاس آیا کرتے تھے۔ محکمہ اوقاف میں بھی کافی عرصہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ان کی صدارت میں مختلف عنوانات پر بعض علمی مجالس

Marfat.com

میں مجھے چند مقالے پڑھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا تو یہاں بھی وہ مولانا محمد حنیف ندوی اور اس فقیر کو ملنے کے لیے کئی دفعہ تشریف لائے۔ اللہ مغفرت فرمائے بڑے باخبر اور ذہین آدمی تھے۔ نستعلیق انداز اور خوب صورت الفاظ میں بات کرتے تھے۔

بات پروفیسر محمد صاحب کی ہو رہی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم ہے کہ ان کی شادی شیخ الحدیث حضرت مولانا نیک محمدؒ کی صاحب زادی سے ہوئی تھی، لیکن آل محمد اور ان کی تعداد و مشاغل کا علم نہیں۔

تفسیر قرآن سے متعلق ایک مدت سے پروفیسر صاحب موصوف کے مضامین بالالتزام الاعتصام میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے بعض نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔

پروفیسر محمد سے چھوٹے حکیم محمود تھے۔ طبیہ کالج سے طبابت کا چار سالہ نصاب مکمل کر کے گوجراں والا میں اپنے آبائی مکان کے قریب حافظ آباد روڈ پر ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ انھوں نے مطب کھول لیا تھا۔ ان کی طبابت نے گوجراں والا شہر اور اس کے قرب وجوار میں کافی شہرت پائی۔ اس کی بڑی وجہ ان کے والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب تھے۔ مولانا کا اثر و رسوخ بہت کام آیا۔ بیٹے کے فن طبابت کے وہ بہت مداح تھے اور یہ بات لوگوں کو متاثر کرتی تھی۔ حکیم صاحب جماعتی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ دینی تعلیم کی بھی تکمیل کر لی تھی۔ لاہور میں طبیہ کالج کے زمانہ طالب علمی میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب سے دینیات کی کتابیں بھی پڑھا کرتے تھے۔

ان سے آخری ملاقات لاہور میں ایک میٹنگ میں ہوئی جو ہمارے دوست چوہدری محمد صادق ایڈووکیٹ نے اپنے دفتر (فین روڈ) میں بلائی تھی۔ وہیں ہم نے اکٹھے دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اس وقت بیماری کی وجہ سے ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور جسم پر کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ اس سے تھوڑے دن بعد وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

میاں عبدالمعید، حافظ احمد شاکر، مولوی محمد سلیمان انصاری اور ان سطور کا راقم ان کے جنازے میں شرکت کے لیے اکٹھے لاہور سے گوجراں والا گئے۔ اس دن بارش ہو رہی تھی، اس لیے جنازہ مسجد مکرم میں پڑھا گیا تھا۔ بہت خوب صورت اور وسیع مسجد ہے، وہ اس میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جنازے میں گوجراں والا اور مختلف مقامات کے بے شمار لوگ شامل تھے۔ پروفیسر محمد سے اظہار افسوس کیا، لیکن وہ چھوٹے بھائی کی وفات پر نہایت مغموم تھے۔ معلوم نہیں مجھے پہچان سکے تھے یا نہیں۔

وہیں جنازے کے بعد حکیم محمود مرحوم کے ماموں زاد بھائیوں (ڈاکٹر محمد یوسف فاروق اور جناب عبدالمنان) سے ملاقات ہوئی، ان سے بھی مرحوم کی تعزیت کی۔ یہ مولانا اسماعیل صاحب کے عم محترم میاں احمد الدین

Marfat.com

کے پوتے اور حکیم عبدالمجید صاحب کے بیٹے ہیں۔ حکیم عبدالمجید مرحوم ہمارے کرم فرما اور بزرگ دوست تھے۔
حکیم محمود کی شادی مرحوم حاجی نظام الدین صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی تھی جو دراصل فیروز پور کے رہنے والے تھے اور تقسیم ملک کے بعد گوجراں والا میں آ بسے تھے۔ ۱۹۳۸ء سے وہ میرے مہربان تھے۔ میں ان کے صرف ایک بیٹے بشیر احمد ایڈووکیٹ کو جانتا ہوں...... حکیم محمود کی اولاد میں سے کسی سے میری واقفیت نہیں۔
مسجد مکرم جس زمین پر تعمیر ہوئی ہے، اس کے حصول میں ہمارے دوست اسماعیل ضیا صاحب کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ اس وقت وہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور اس زمین پر گوجراں والا کی ایک مشہور شخصیت نے قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی، بلکہ قبضہ بھی کر لیا تھا، دیوار کے لیے اینٹیں آ گئی تھیں اور نل وغیرہ لگا لیا تھا، لیکن ضیا صاحب نے بھاگ دوڑ کی اور مسجد کے لیے جگہ الاٹ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔
اس وقت پاکستان میں سعودی حکومت کے سفیر ریاض الخطیب تھے۔ مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے انھیں بلایا گیا تھا۔ ان کی خدمت میں عربی میں استقبالیہ کلمات پیش کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ضیا صاحب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میں نے ان کے حسب منشا مرحوم شاہ محمد جعفر پھلواروی سے کچھ باتیں عربی میں لکھوا دی تھیں۔ سفیر صاحب کی خدمت میں یہ استقبالیہ کلمات ہمارے دوست مولانا عطاء اللہ ثاقب مرحوم نے پڑھے تھے۔
مولانا محمد اسماعیل صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد داؤد تھے۔ وہ اکہرے بدن اور نکلتے ہوئے قد کے خوب صورت جوان تھے۔ گورا رنگ، تیکھے نقوش، چمک دار آنکھیں اور صاف ستھرے لباس میں ملبوس۔ تعلیم میٹرک تک تھی۔ پہلے حافظ آباد میں باٹا کی دکان پر کام کرتے تھے۔ پھر گوجراں والے آ گئے تھے اور پتھر والے بازار میں کاروبار کرنے لگے تھے۔ میں ۱۹۵۰ء میں الاعتصام سے منسلک ہو کر گوجراں والے گیا تو ان سے ملاقات ہوئی اور پھر جلد ہی یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی۔ خوش طبیعت اور شگفتہ مزاج دوست تھے۔
جب تک میں الاعتصام کے سلسلے میں گوجراں والے رہا، ان سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۵۲ء میں یہ اخبار لاہور آیا تو میں بھی لاہور آ گیا۔ اس کے بعد وہ لاہور آتے تو سات چکر کاٹ کر بھی مجھ سے ملنے آتے۔ میں بھی گوجراں والے جاتا تو ان سے ملنے کی کوشش کرتا۔ میرے ان سے تعلقات کا حضرت مولانا کو علم تھا۔
ایک دفعہ عجیب معاملہ ہوا۔ میں ۱۹۵۹ء میں چینیاں والی مسجد کے قریب کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور نصف رات بیت چکی تھی کہ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی باہر گلی میں کھڑا ہے اور مجھے آوازیں دے رہا ہے۔ ساتھ ہی کنڈی کھٹکھٹائی جا رہی ہے۔ میں نے رضائی سے سر نکال کر غور سے سنا تو شبہ پڑا کہ حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب کی آواز ہے۔ جلدی سے باہر آیا اور دروازہ کھولا تو دیکھا کہ مولانا عطاء اللہ صاحب اور پروفیسر محمد کھڑے ہیں۔ انھیں دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اور اندر تشریف لانے کی درخواست کی۔

Marfat.com

فرمایا: ”کل سے داؤد کا پتا نہیں چل رہا کہ کہاں گئے، تمھارے پاس تو نہیں آئے؟“

عرض کیا: ”کل دفتر میرے پاس آئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ کوئی خاص بات نہیں کی۔“

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میرے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے، اس کا حضرت مولانا کو بھی علم تھا۔

نہایت افسوس ہے داؤد عین جوانی میں وفات پا گئے۔ ان کو کوئی ایسی تکلیف لاحق ہو گئی تھی کہ لات کاٹ دی گئی تھی۔ میں نے ان کی وفات کے بعد حکیم محمود صاحب سے ان کے بال بچوں کے بارے میں دو چار دفعہ پوچھا تو پتا چلا کہ الحمد للہ وہ بہتر حال میں ہیں۔

مولانا کے یہ چھوٹے بیٹے تھے جو سب سے پہلے فوت ہوئے، ان کے بعد ان سے بڑے حکیم محمود کا انتقال ہوا۔ رحمهم الله تعالىٰ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پروفیسر محمد صاحب کو جو سب سے بڑے ہیں، خیر و عافیت سے نوازے اور عمر دراز عطا فرمائے۔

حضرت مولانا کا سینتالیس اڑتالیس سال خطابت و تدریس کے شعبوں سے رابطہ رہا۔ اس طویل مدت میں بے شمار لوگ ان کے حلقہ شاگردی میں آئے اور ان سے مستفید ہوئے۔ ان میں سے کسی نے منبر و محراب سے تعلق قائم کیا ہوگا، کسی نے درس و تدریس کی راہ اختیار کی ہوگی اور کسی نے تصنیف و تالیف کو میدان عمل بنایا ہوگا، وہ اپنے کام میں مستعد اور تیز گام بھی ہوں گے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے شاگردوں کی طویل فہرست میں سب سے نمایاں اور ابھرا ہوا نام مولانا محمد حنیف ندوی کا ہے۔ وہ اسی وقت ان کے دامن تلمذ سے وابستہ ہو گئے تھے، جب انھوں نے گوجراں والا کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ ۱۹۲۱ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت مولانا حنیف ندوی کی عمر تیرہ سال تھی اور انھوں نے سرکاری سکول میں چوتھی جماعت کا امتحان دیا تھا، جسے اس زمانے میں پرائمری کہا جاتا تھا۔ ان کے والد نور الدین نے جو نہایت نیک آدمی تھے، بیٹے کو مولانا اسماعیل صاحب کے سپرد کر دیا تھا۔

انھوں نے ان سے درس نظامی کی تکمیل کی اور پھر انھی کے مشورے اور سفارش سے لکھنؤ کی راہ لی اور دار العلوم ندوۃ العلما میں داخل ہوئے۔ وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تین سال میں تفسیر قرآن میں درجہ تخصص کیا۔ پھر ان کو اللہ نے توفیق دی تو سراج البیان کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اسلامی فلسفے کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں، قرآن کے بارے میں مطالعہ قرآن لکھی اور لسان القرآن کے نام سے حروف تہجی کی ترتیب سے قرآن کا توضیحی لکھنا شروع کیا، جس کی دو جلدیں (حرف دال تک) آٹھ سو صفحات میں پھیل گئیں، لیکن افسوس ہے، کام مکمل نہ ہو سکا اور وہ ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

Marfat.com

ان کے بعد اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے اصرار سے اپنی کم بضاعتی کے باوجود اس فقیر نے کام شروع کیا تو صرف دو حرف (ذال اور را) کا مسودہ تین سو صفحات تک پہنچ گیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے لسان القرآن کی پہلی جلد کے مقدمے کے آخر میں یہ بتایا ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلے میں وہ پہلے پہل کس سے متاثر ہوئے اور کون کون سی تفسیریں ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے استاذ محترم حضرت مولانا اسماعیل کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ فرمایا۔ چند سطروں میں انھوں نے مولانا کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ کئی صفحات پر بھاری ہے اور جو انداز اختیار کیا ہے، وہ سب سے نرالا اور اچھوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

''ناشکری ہوگی، اس مرحلے پر اگر ہم اپنی ان محسن شخصیتوں اور کتابوں کا ذکر نہ کریں، جن کی وجہ سے قلب وذہن میں قرآن کے بارے میں جلا پیدا ہوئی اور نگہبان ثابت ہوئے۔ اس سلسلے میں اپنے معلم ومربی حضرت مولانا اسماعیل صاحب سلفی کا نام نامی اس لائق ہے کہ ہم بکمال افتخار ان کی عظمت علمی کا اعتراف کریں۔ ان کی توجہات خاص کا فیض تھا کہ ہمارے دل میں پہلے پہل قرآن سے محبت وشغف اور اس کے فہم وادراک کی کرنیں پھوٹیں۔ ان کرنوں کو جن حضرات کی علمی مساعی نے فانوس ومشعل کی صورت میں ڈھالا، وہ ہیں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین الفراہی اور پروفیسر عبدالواجد کان پوری۔''

مولانا محمد حنیف ندوی، حضرت مولانا کا تذکرہ انتہائی تکریم کے الفاظ میں کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کئی مرتبہ بیان کیا کہ مولانا نے ان کی تعلیم وتربیت میں بڑی محنت کی اور بدرجہ غایت توجہ سے ان کو مروجہ نصاب کی کتابیں پڑھائیں۔

مولانا کی وفات پر سب سے پہلے اس فقیر نے لکھا۔ ایک مضمون امروز میں چھپا اور ایک کوہستان میں۔ نوائے وقت میں لکھنے کے لیے بھی ایک صاحب میرے پاس آئے تھے۔ وہ چند سوالات لکھ کر لائے تھے، جن کے میں نے جواب دیے۔

انھی دنوں ریڈیو پاکستان (لاہور) کے ایک سینئر پروڈیوسر کی دعوت پر میں نے ریڈیو میں ان پر تقریر کی اور ریڈیو کے مزاج کے مطابق چند اہم واقعات بیان کیے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ریڈیو کے پروگرام زندہ تابندہ میں ان کے حالات بیان کیے۔ میں نے اس پروگرام میں بہت سے علمائے مرحومین پر اظہار خیال کیا تھا، لیکن کسی کے ورثا نے اس کی اطلاع نہیں دی۔ البتہ دو بزرگوں نے بتایا کہ انھوں نے تقریریں سنی تھیں، ایک مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے اور دوسرے میاں محمود علی قصوری نے۔ حالاں کہ ان دونوں

Marfat.com

سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے فرمایا کہ وہ اپنے محلے (شیش محل روڈ) کے ایک ہوٹل میں چائے پی رہے تھے کہ وہاں ریڈیو سے میری تقریر کا اعلان ہوا اور انھوں نے تقریر سنی۔ اس طرح وہ تین یا چار دن مختلف علما کے بارے میں اس فقیر کی باتیں اس ہوٹل میں ریڈیو سے سنتے رہے۔

میاں محمود علی قصوری نے اتفاقاً ریڈیو کھولا تو اعلان ہوا کہ مولانا عبدالقادر قصوری کے بارے میں تقریر ہونے والی ہے۔ اس سے دوسرے دن ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری اور تیسرے دن مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کے متعلق کچھ باتیں بیان کی گئی تھیں۔ اس طرح انھوں نے تین دن اپنے والد گرامی اور برادران محترم کے بارے میں تقریریں سنیں اور ٹیلی فون پر شکریے کے ساتھ مجھے اس کی اطلاع دی۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب کی وفات کے بعد مرحوم عبدالغفار اثر نے ان کے سوانح حیات ضبط کتابت میں لانے کا اعلان کیا تھا اور بذریعہ اخبار الاعتصام لوگوں سے ان کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعض افراد کو خطوط بھی لکھے تھے، مجھے بھی خط لکھا تھا اور چند سوالات کے جواب طلب کیے تھے، معلوم نہیں کام کچھ آگے بڑھا تھا یا نہیں۔

اصل میں یہ کام حضرت مولانا کے بڑے صاحب زادے پروفیسر محمد صاحب کے کرنے کا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی عملاً اسی روایت پر قائم رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں جو باقی اکابر علمائے اہل حدیث کی اولاد نے کر رکھا ہے کہ اپنے آباؤاجداد کے حالات ضبط تحریر میں لانا اور لوگوں کو ان سے باخبر کرنا امور خیر میں شامل نہیں۔ ان کے نزدیک مستحسن فعل یہ ہے کہ جس طرح بعض اطبا اپنے طبی نسخے کسی کو نہیں بتاتے، سینے ہی میں رکھتے ہیں، اسے ان کی اصطلاح میں صدری نسخہ کہا جاتا ہے، اسی طرح اپنے اکابر علما کے حالات کسی کو نہ بتائے جائیں، دل میں چھپا کر رکھے جائیں، انھیں صدری معلومات سے تعبیر کیا جائے گا۔

اب جی چاہتا ہے کہ لائق اکرام قارئین کو ایک خواب سنا دیا جائے جو بالکل صحیح ثابت ہوا...... ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے خلاف جو ہنگامے شروع ہوئے تھے، وہ مسجدوں میں بھی پہنچ گئے تھے۔ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ میں چوک نیائیں کی جانب کے چھوٹے دروازے سے مولانا کی مسجد میں داخل ہوا۔ صحن میں کھڑے ہو کر اندر منبر و محراب کی طرف دیکھا تو بہت سے ملنگ قسم کے لوگ وہاں بیٹھے ہیں، جنھوں نے مختلف رنگوں کے بڑے بڑے منکوں کی تسبیحیں (یا مالائیں) گلوں میں ڈال رکھی ہیں، بازوؤں میں لوہے کے کڑے اور ہاتھوں میں بڑے بڑے چمٹے ہیں، جنھیں وہ بیٹھے ہوئے اچھل اچھل کر زور زور سے بجا رہے ہیں...... ساتھ ہی یارسول اللہ...... یاعلی...... یاغوث اعظم...... یاعلی مشکل کشا کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔

Marfat.com

میں نہایت تحیر انگیز تعجب سے یہ منظر دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد میں یہ کیا ہو رہا ہے...... اتنے میں بڑے دروازے کی طرف سے مولانا مسجد میں داخل ہوئے۔ کندھوں پر رومال ہے۔ بائیں ہاتھ میں جوتی ہے۔ مجھے دیکھا اور میرے دائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ نہایت غصے سے خاموش کھڑے میری طرح سامنے منبر و محراب کی طرف دیکھ رہے ہیں...... اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔

دوسرے دن حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں خواب سنایا تو فرمایا آج کل مسجدوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہی مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد میں ہو رہا ہوگا۔

بعد میں گوجراں والا کے دوستوں کی زبانی پتا چلا کہ ان ہنگاموں کے دنوں میں وہ لوگ خاص طور سے مولانا کی مسجد میں آتے تھے جو ان کے مخالف مذہبی گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مولوی اسماعیل کی مسجد میں یہ سلسلہ ضرور جاری رکھنا ہے۔

حضرت مولانا سے متعلق یہ وہ کوائف و معلومات ہیں جن کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے اور ان میں بعض وہ معاملات ہیں جو خود میرے ساتھ بیتے ہیں۔ ممکن ہے میری ان گزارشات کے بعض گوشوں سے کسی کو اختلاف ہو۔ بات یہ ہے کہ اختلاف ہر شخص سے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ اختلاف ہی سے حقائق کا اصلی چہرہ سامنے آتا ہے اور واقعات نکھرتے ہیں۔ لکھنے پڑھنے والوں کو اس سے گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں......

☆☆......☆☆......☆☆

Marfat.com

مولانا کرم الٰہی

۱۹۳۹ء میں مولانا عطاء اللہ حنیف فیروز پور کی جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں درس وخطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے اور میں ان کے حلقہ شاگردی میں شامل تھا۔ مجھے ابتدا ہی سے کتب تاریخ اور شخصیات سے متعلق مضامین ومقالات سے دلچسپی تھی۔ ایک دن کوئی چار بجے کے لگ بھگ مسجد کے برآمدے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ کتاب افغانستان کی تاریخ وحالات کے بارے میں تھی اور اس کے مصنف کا نام عزیز ہندی تھا۔ کتاب کا نام انقلاب افغانستان قسم کا تھا۔ میں کتاب کے مطالعے میں مگن تھا کہ کانوں میں آواز گونجی السلام علیکم......!

نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک بزرگ سامنے کھڑے تھے۔ میں ان کے احترام میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور نہایت ادب کے ساتھ انھیں سلام عرض کیا۔

انھوں نے پنجابی میں فرمایا: برخوردار بیٹھ جاؤ......تم پڑھ رہے تھے، میں نے کتاب سے ہٹا کر تمھاری توجہ اپنی طرف کر لی۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

یہ الفاظ کہتے ہوئے وہ خود بھی بیٹھ گئے۔

میں نے کتاب بند تو نہیں کی البتہ الٹا کر رکھ دی۔

بولے: مولوی عطاء اللہ کہاں ہیں؟

عرض کیا: معلوم نہیں۔

اب ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

میں نے ان کو غور سے دیکھا۔ میانہ قد، کچھ بھاری سا جسم، تمام چہرے پر پھیلی ہوئی لمبی داڑھی، اچھی طرح کتری ہوئی مونچھیں، صاف ستھرا مگر سادہ لباس، سر پر عمامہ، کھلی پیشانی پر سجدوں کے نشان مرتسم، لبوں پر تبسم، اور زبان میں مٹھاس، چمکتی ہوئی آنکھوں میں جذبات ترحم پنہاں، گفتگو میں انکسار کی آمیزش۔

انھوں نے کتاب ہاتھ میں پکڑی اور ادھر ادھر سے اس کے چند صفحات پر نگاہ ڈالی۔

پھر بولے: یہ کتاب کہاں سے خریدی ہے؟

عرض کیا: یہاں کتابیں بیچنے والا ایک شخص آیا تھا، اس سے لی ہے۔

Marfat.com

فرمایا: کتنے کی؟

چار یا پانچ آنے اس کی قیمت تھی جو میں نے بتا دی۔

پھر ارشاد ہوا: تم نے یہ کتاب پڑھ لی ہے یا ابھی اس کے کچھ صفحات باقی ہیں؟

عرض کیا: بس دو تین صفحات باقی ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے، انھوں نے فرمایا تھا کہ میرے ایک بیٹے (غالباً ان کا نام عبدالقادر لیا تھا) لاہور ایک کالج میں پڑھتے ہیں۔ وہ آج کل گاؤں آئے ہوئے ہیں۔ میں یہ کتاب مطالعے کے لیے انھیں دینا چاہتا ہوں۔

پھر فرمایا: تم اس کی قیمت مجھ سے لے لو اور کتاب مجھے دے دو۔

لیکن میں نے اس کی قیمت ان سے نہیں لی۔ عرض کیا آپ یہ کتاب میری طرف سے قبول فرمائیں اور میرے لیے دعا کریں۔

اتنے میں مولانا عطاء اللہ صاحب تشریف لے آئے تو ان کو کتاب دکھا کر فرمایا کہ آپ کے شاگرد نے مجھے یہ کتاب مفت میں دے دی ہے۔ اللہ اسے علم و عمل کی نعمت سے نوازے۔

میرے لیے ان کی طرف سے یہ بہت بڑی دعا تھی۔

یہ بزرگ تھے مولوی کرم الٰہی...... ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں قادر والا کے رہنے والے...... نہایت متقی اور پرہیزگار عالم دین۔ شیریں گفتار اور نرم رفتار۔ لوگوں کے ہمدرد، اہل علم کے قدردان۔ چھوٹوں کے مشفق اور بڑوں کے لیے سراپا انکسار۔ ان کا تعلق ارائیں برادری سے تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تحصیل زیرہ کی مسلمان آبادی میں ارائیوں کی اکثریت تھی۔ دوسری برادریوں کی بہ نسبت تعلیم یافتہ بھی زیادہ تر یہی لوگ تھے۔

تحصیل زیرہ میں کمبو برادری کے لوگ بھی آباد تھے، وہ بھی پڑھے لکھے اور دنیوی اعتبار سے اصحاب حیثیت لوگ تھے۔ میرے خیال میں کمبو برادری اور ارائیں برادری کی باہم رشتے داریاں بھی تھیں۔

یہ ایک ضمنی سی بات تھی۔ آئندہ سطور میں ہم اپنی گزارشات مولانا کرم الٰہی کی ذات گرامی تک محدود رکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مولانا کرم الٰہی صاحب کو سب لوگ ''مولوی صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے۔ آئندہ سطور میں انھیں ''مولوی صاحب'' ہی لکھا جائے گا اور ان گزارشات میں جہاں مولوی صاحب کا لفظ مرقوم ہو، اس سے انہی کی ذات گرامی مراد ہوگی۔

مولوی صاحب ۱۸۸۰ء کے پس و پیش پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میاں محمد الیاس تھا جو بیٹے کے عہد طفولیت ہی میں وفات پا گئے تھے۔ والدہ کی تعلیم ناظرہ قرآن مجید تک تھی اور وہ نیک اور پرہیزگار خاتون تھیں۔

Marfat.com

۱۸۸۵ء میں ان کے حصول علم کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں موجودہ دور کی طرح ہر گاؤں میں سکول نہیں تھے۔ چار چار پانچ پانچ کوس کے فاصلے پر کسی مرکزی مقام اور اچھی خاصی آبادی کے قصبے میں سرکار کی طرف سے پرائمری سکول کھولا جاتا تھا۔ مڈل سکول کا دس دس کوس تک سراغ نہیں ملتا تھا۔ ہائی سکول ضلعی مقامات یا کم سے کم تحصیل ہیڈ کوارٹر میں نظر آتے تھے۔ قادر والا گاؤں سے چار پانچ کوس کی مسافت پر ایک قصبے فتح گڑھ پنج نور میں پرائمری سکول تھا۔ انھیں اس سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ آمدورفت کا آٹھ دس کوس کا سفر روزانہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد تحصیل ہیڈ کوارٹر (زیرہ) کے مڈل سکول کا رخ کیا۔ زیرہ وہاں سے دس گیارہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ ۱۸۹۲ء میں مڈل پاس کیا۔ اس وقت تیرہ چودہ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔

پڑھنے لکھنے میں بڑے تیز اور ہوشیار تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مڈل پاس کرنے کے بعد وظیفے کے حق دار قرار پائے اور انگریزی سکول میں داخل ہوگئے، لیکن ان دنوں بعض علمائے کرام انگریزی پڑھنا شرعاً جائز نہیں سمجھتے تھے، اس لیے مولوی صاحب نے ۱۸۹۳ء میں انگریزی سکول کی تعلیم ترک کر دی اور لاہور آ کر اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ۱۸۹۷ء تک زیر تعلیم رہے۔ اس اثنا میں ایف۔ او۔ ایل اور بی۔ او۔ ایل کیا اور صوبہ پنجاب میں بہتر پوزیشن حاصل کی۔

بعد ازاں ملازمت اختیار کر لی۔ ملازمت کے دوران ہی میں ۱۹۲۳ء میں اورینٹل کالج سے او۔ ٹی کیا۔

دینی تعلیم سکول اور کالج کے بعض علما سے حاصل کی۔ تمام اساتذہ ان سے خوش تھے اور بڑے چھوٹے سب حضرات ان کی شرافت اور دین داری کی قدر کرتے تھے۔

اس وقت پنجاب میں علمائے غزنویہ کی بڑی شہرت تھی۔ بالخصوص مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد مکرم حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی کے زہد و اتقا کا بے حد چرچا تھا اور مختلف مقامات کے بہت سے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ اورینٹل کالج کے زمانہ طالب علمی میں مولوی کرم الٰہی کو ان کے تقویٰ اور تدین کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں تو وہ ان کی خدمت میں امرتسر پہنچے اور پھر ہمیشہ کے لیے ان کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوگئے۔ وہ اکثر امرتسر جاتے اور امام صاحب سے اکتساب فیض کرتے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی کو اس کا علم تھا، چناں چہ ۲۷۔ اگست ۱۹۱۳ء کو امام صاحب فوت ہوئے تو مولانا محمد داؤد غزنوی نے بذریعہ تار ان کو وفات سے مطلع کیا اور نماز جنازہ میں شرکت کی دعوت دی۔

امام صاحب کے بعد مولوی صاحب کے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی سے بہت قریبی روابط ہوگئے تھے۔ اورینٹل کالج میں ٹریننگ کے دوران وہ فجر کی نماز بالالتزام چینیاں والی مسجد میں مولانا عبدالواحد

Marfat.com

غزنوی کی اقتدا میں پڑھتے تھے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ گورنمنٹ ہائی سکول فیروز پور میں عربی مدرس مقرر ہوئے۔ یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ان کا تبادلہ کیمبل پور میں کر دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں کیمبل پور سے لدھیانہ تبدیل ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء تک وہاں رہے۔ وہاں سے گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر بھیج دیے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں جالندھر ہی سے ریٹائر ہوئے۔ قرآن و حدیث سے ان کو والہانہ تعلق تھا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ عشق تھا۔ لوگوں کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھانے کی کوشش کرتے۔ ایک ایک لفظ کے الگ الگ معنی بتاتے۔ اس طرح انھوں نے کتنے ہی لوگوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھایا۔

جو لوگ ناظرہ قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے، انھیں اس انداز سے قرآن پڑھانا شروع کرتے کہ چند ہی روز میں وہ قرآن مجید پڑھ جاتے۔

نبی ﷺ کی حدیث پاک کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی وہ خاص طور سے ترغیب دیتے اور لوگوں کو بتاتے کہ قرآن و حدیث پڑھنے اور ان کے احکام کے مطابق عمل کرنے ہی سے کامیابی کی راہیں کھلتی ہیں۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، وہ دنیا میں بھی خسارے میں رہیں گے اور آخرت میں بھی......!

وہ اس درجے میٹھی زبان اور پُرخلوص لہجے میں لوگوں کو قرآن و حدیث پر عمل کی دیواریں استوار کرنے کی تلقین فرماتے کہ سننے والے انتہائی متاثر ہوتے اور اپنی زندگیوں کو اللہ اور رسول ﷺ کے ارشادات کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرتے۔

ان کی معلومات کا دامن بہت وسیع تھا اور مختلف اہل علم کی تصنیفات ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ مثلاً متقدمین میں امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام بن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہم اللہ کی کتابوں کے وہ خاص طور سے شائق تھے اور بڑی دلچسپی سے ان کا مطالعہ فرماتے تھے۔ متاخرین میں علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، علامہ شبلی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی، علامہ اقبال، مولانا محمد جونا گڑھی اور حافظ محمد اسلم جیراجپوری کی تصانیف وہ بڑے اہتمام سے پڑھتے تھے۔ حالی، سرسید اور علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی کتابوں سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ غرض ان کا ذوق مطالعہ محدود نہ تھا۔ وہ حصول معلومات کے لیے ہر صاحب علم کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اس کے سامنے دامن طلب پھیلانے کی سعی کرتے۔

وہ کھلے دل کے عالم دین تھے۔ تعصب اور تنگ نظری سے ان کا ذہن صاف تھا۔ جہاں سے کوئی اچھی چیز ملتی، بلاتامل لے لیتے اور جہاں کوئی غلط شے دیکھتے، اس سے دور ہٹ جاتے۔ اخذ خیر اور ترک شر ان کا معمول تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ، صحابہ کرام کے واقعات، تابعین و تبع تابعین کے کوائف اور ائمہ دین کے

Marfat.com

حالات وہ خود بھی باقاعدہ پڑھتے اور دوسروں کو بھی ان سے باخبر رہنے کی تاکید فرماتے۔

سید احمد شہید بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی تحریک جہاد اور ان کی عملی سرگرمیوں سے انھیں بے حد لگاؤ تھا اور اس موضوع کی کتابیں وہ نہایت غور اور انہماک سے پڑھتے تھے۔ اس دور میں مجاہدین سے تعلق کا اظہار کرنا اور کسی صورت میں ان کی مدد کرنا انگریزی حکومت کے نزدیک بغاوت کے مترادف تھا، لیکن مولوی صاحب اس پاک باز گروہ سے قلبی علاقہ رکھتے اور روپے پیسے سے ان کی مدد کرتے تھے۔ مجاہدین کے سرحد پار مرکز سے ان کے آدمی ہندوستان آتے اور چھپ چھپا کر ان لوگوں سے ملتے تھے جو ان کی طرف مالی تعاون کے لیے ہاتھ بڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب کا شمار بھی ان کے معاونین میں ہوتا تھا اور وہ لوگ ان کے ہاں جاتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے کردار کی تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۵۴ء میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب سید احمد شہید اور ۱۹۵۵ء میں جماعت مجاھدین شائع ہوئی۔ میں اس وقت اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا۔ یکے بعد دیگرے یہ دونوں کتابیں مصنف شہیر نے مجھے تبصرے کے لیے ارسال فرمائیں۔ میں نے دونوں کتابوں کا نہایت توجہ سے ایک ایک لفظ پڑھا اور پھر انتہائی محبت اور عقیدت سے تبصرہ کیا۔ تبصرے میں مرحوم مصنف کو بعض امور کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ تبصرہ پڑھ کر انھوں نے مجھے خط لکھا کہ اس سلسلے کی چوتھی اور آخری جلد سرگزشت مجاھدین کے نام سے زیر ترتیب ہے، اگر جماعت مجاہدین کے معاونین کے تھوڑے بہت حالات مل سکیں تو وہ اس جلد میں شامل کریں گے۔

میں نے ان کو متعدد حضرات کے نام اور مختصر سے حالات دیے، جن میں مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ اس سلسلے میں میں ان کے صاحب زادے چوہدری عبداللہ مرحوم کو (خانیوال) خط لکھا۔ انھوں نے مجھے بھی مولوی صاحب کے کچھ حالات بھیجے، مہر صاحب کو بھی ارسال فرمائے۔ خود میں نے بھی مہر صاحب مرحوم سے اس کے بارے میں چند گزارشات پیش کیں۔ مہر صاحب نے مولوی صاحب کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے:

> ''مولوی صاحب ان خاموش کارکنوں سے تھے، جن کی مثالیں ہمارے عہد میں بہت کم رہ گئی ہیں۔ اصل وطن قادر والا، تحصیل زیرہ، ضلع فیروز پور تھا۔ ۱۸۸۵ء کے قریب پیدا ہوئے۔ مدت دراز تک گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ میں عربی کے ٹیچر رہے۔ مولوی عبدالرزاق صاحب ان سے کئی مرتبہ ملے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ تنخواہ میں سے تھوڑی سی رقم اپنے گزارے کے لیے رکھ لیتے، باقی مجاہدین کو بھجوا دیتے۔ لدھیانہ میں حافظ نورالدین بھی مولوی صاحب کے معاون و رفیق تھے۔ ظاہر ہے کہ جو بزرگ ذاتی مشاہیر کا بیشتر حصہ خدا کی راہ میں دے دیتے تھے، وہ دوسرے

Marfat.com

افراد سے بھی ضرور چندہ فراہم کرتے ہوں گے، لیکن ان کے طریق کار کی کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ جماعت کے آدمی خفیہ خفیہ ان کے پاس آتے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً انہی کے ہاتھ رقمیں بھیجی جاتی تھیں...... مولوی صاحب کے صاحب زادے نے بتایا کہ حکومت کو موصوف کی سرگرمیوں کا علم ہو چکا تھا اور مجاہدین سے ہمدردی کے باعث ان پر کڑی نگرانی کا انتظام ہو گیا تھا۔ تاہم وہ جس کام کو اہم دینی فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے، اسے ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوتے اور نگرانی کے باوجود ہر ممکن ذریعے سے روپیہ مجاہدین کو پہنچاتے رہے۔

''آخر ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول لدھیانہ سے گورنمنٹ ہائی سکول جالندھر میں ہو گیا۔ یقین ہے کہ جالندھر میں بھی خدمت مجاہدین کا کام جاری رکھا ہوگا۔ ۱۹۳۳ء میں سرکاری ملازمت سے وظیفہ لے کر قادر والا میں مقیم ہو گئے اور تقسیم تک وہیں رہے۔''

مولانا غلام رسول مہر نے ان کے بارے میں یہ سطور رقم فرمانے کے بعد بطور حوالے کے حاشیہ میں مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کیے ہیں:

''ان میں سے کچھ حالات میرے عزیز دوست مولوی عبدالرزاق نے بیان کیے۔ بعدازاں مولوی صاحب مرحوم کے صاحب زادے چوہدری محمد عبداللہ صاحب بی اے مالک فیروز پور سٹور خانیوال نے مولوی محمد اسحاق مدیر الاعتصام کے ایما پر مختصر سوانح لکھ بھیجے۔''

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ جب حکومت کو یہ علم ہو گیا کہ مولوی صاحب مجاہدین کی مالی امداد کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کی نگرانی بھی ہونے لگی تو انھوں نے ملازمت سے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن اس کا ذکر مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم سے کیا تو انھوں نے استعفا دینے سے روک دیا۔

مولوی صاحب مرحوم کی ہمارے ہاں (کوٹ کپورہ) میں آمدورفت رہتی تھی۔ ہمارا تعلق فرید کوٹ ٹرانسپورٹ کمپنی سے تھا۔ ایک دفعہ ریاست فرید کوٹ کی طرف سے ٹرانسپورٹ پر کئی قسم کے ٹیکس لگا دیے گئے تھے جو ناقابل برداشت تھے۔ بعض لوگوں نے اس کا تذکرہ مولوی صاحب سے کیا۔ اس وقت ریاست کے چیف جسٹس مولوی عبدالعزیز تھے۔ وہ مولوی صاحب کے شاگرد تھے۔ مہاراجا فرید کوٹ ان کا احترام کرتا اور ان کی بات مانتا تھا۔ مولوی صاحب نے ٹیکسوں کے بارے میں مولوی عبدالعزیز سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک، اپنی شکایت کی تفصیل مجھے لکھ کر دیں، میں اس پر غور کروں گا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولوی صاحب لوگوں کے ہمدرد اور بہی خواہ تھے۔ وہ ہر شخص کا ہر جائز کام کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسرے کی بات توجہ سے سنتے اور جہاں تک ممکن ہوتا اس کی مدد فرماتے۔

Marfat.com

وہ اپنے علاقے میں اسلام کے بہت بڑے مبلغ تھے اور نہایت حکمت عملی اور احسن طریقے سے اسلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس سلسلے کے متعدد واقعات سے دو واقعے بیان کرتا ہوں۔

ان کے تایا زاد بھائی کی بیوی فوت ہوگئیں۔ وہ خود تو رسم قل وغیرہ کے قائل نہ تھے، لیکن ان کے گاؤں اور رشتے داروں میں قدیم دور سے یہ رسم چلی آرہی تھی۔ متوفیہ کے بڑے بیٹے ان کے پاس آئے اور کہا قل خوانی کے موقعے پر گاؤں سے اور مختلف دیہات سے بہت سے لوگ آئیں گے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان کے لیے کھانے کا انتظام کرلیں۔ فرمایا کرلو۔

اب انھوں نے گائے ذبح کی اور چھ سات من آٹے کی روٹیاں پکوائیں۔ لوگ کئی کئی میل کی مسافت طے کر کے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ جب سب لوگ آرام سے بیٹھ گئے تو مولوی صاحب کھڑے ہوئے اور خطبہ مسنونہ پڑھ کر وعظ شروع کر دیا اور غمی شادی کے موقعے پر مسلمانوں میں جو رسوم رواج پا گئی ہیں، قرآن وحدیث کی رو سے ان کی تردید کرنے لگے۔ فرمایا: میت والے گھر سے کھانا جائز نہیں، جو شخص کھانے کے وقت اپنے گھر پہنچ سکتا ہے، اسے گھر جا کر کھانا چاہیے۔

وعظ ختم ہوا تو بہت سے لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے اور کھانا اسی طرح پڑا رہا۔

متوفیہ کے بیٹے نے کہا: کھانا آپ کی اجازت سے تیار کیا گیا تھا، لیکن آپ نے وعظ میں سارا معاملہ غلط قرار دے دیا۔

فرمایا: یہ کھانا غریبوں اور ناداروں کے لیے ہے اور وہی اس کے مستحق ہیں۔ ان میں تقسیم کردو۔ اچھی حیثیت کے لوگ میت والے گھر سے کیوں کھائیں۔

چناں چہ وہ تمام کھانا گاؤں کے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کیا گیا اور آئندہ گاؤں میں قل وغیرہ کی رسم ختم ہوگئی۔

ان کے گاؤں میں ایک بزرگ رہتے تھے، جن کا نام کریم بخش تھا۔ وہ تیز مزاج اور سخت طبیعت کے آدمی تھے۔ عقیدے سے متعلق کسی مسئلے میں وہ مولوی صاحب سے جھگڑ پڑے اور مولوی صاحب کو گریبان سے پکڑ لیا۔ معاملہ چوں کہ عقیدے کا تھا، اس لیے مولوی صاحب نے اسے بڑھنے نہیں دیا۔ فرمایا: مجھے اپنے عقیدے سے محبت ہے تو اسے بھی محبت ہے۔ مولوی صاحب کے بعض نوجوان رشتے داروں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور مرنے مارنے پر تیار ہوگئے، مگر مولوی صاحب نے روک دیا، کسی کو آگے نہیں آنے دیا۔

اس سے کچھ عرصے بعد پولیس نے کریم بخش پر ایک جھوٹا مقدمہ قائم کر دیا اور معاملہ فیروز پور عدالت میں چلا گیا۔ اتفاق سے مجسٹریٹ مولوی صاحب کا شاگرد (یا واقف) تھا۔ وہ کسی کو بتائے بغیر فیروز پور گئے اور

Marfat.com

مجسٹریٹ سے مل کر اسے بتایا کہ مقدمہ پولیس نے قائم کیا ہے اور جھوٹ پر مبنی ہے۔ مجسٹریٹ نے ملزم کو بری کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ مولوی صاحب تشریف لائے تھے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ مقدمے میں کوئی صداقت نہیں۔

کریم بخش یہ سن کر حیران رہ گیا۔ وہ مولوی صاحب کی خدمت میں آیا، اپنی غلطی کی معافی مانگی اور عمل وعقیدے میں مولوی صاحب کے ہم آہنگ ہو گیا۔

بعض دفعہ ان کی بات دلچسپ اسلوب میں ڈھل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی تجویز سے فیروز پور کی انجمن اہل حدیث نے ضلع فیروز پور کے علمائے اہل حدیث کا ایک اجتماع طلب کیا۔ میں بھی اس میں حاضر تھا۔ مولوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ وہ عام طور سے گفتگو کرتے ہوئے پنجابی میں ''اللہ جانداا ے'' کہا کرتے تھے۔ یعنی اللہ گواہ ہے، میں اپنی دانست میں صحیح بات کر رہا ہوں۔

شرکائے اجتماع کے سامنے کھانا رکھا گیا تو خدا جانے مولوی صاحب کو کیا سوجھی، کھڑے ہو کر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا:

اللہ جانتا ہے، مجھے میزبانوں نے نہیں کہا، میں اپنے طور پر کہہ رہا ہوں کہ روٹی تھوڑے سالن سے بھی کھائی جا سکتی ہے، اس لیے سالن احتیاط سے کھائیں۔ ہوسکتا ہے کہ سالن کم ہو جائے اور میزبانوں کو پریشانی لاحق ہو۔

جہاں تبلیغ میں سخت رویہ اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرتے، وہاں سختی کا برتاؤ بھی کرتے اور جوش میں آ جاتے، کچھ پروا نہ کرتے کہ نتیجہ کیا نکلے گا۔ یہ ان کی غیرت ایمانی کا سوال بن جاتا۔ ایک مرتبہ گاؤں کے چند نادان اور جاہل قسم کے لوگوں نے مسجد کے سامنے تکیے میں نقالوں کو بلایا اور کھیل تماشا شروع کر دیا۔ ایک لڑکے نے ہیر کا روپ دھارا اور ایک رانجھا بن گیا اور ڈھول بجنے لگا۔ ظہر کا وقت تھا اور مولوی صاحب مسجد میں تھے۔ انھوں نے ڈھول کی آواز سنی تو سخت غصے کی حالت میں مسجد سے نکلے اور جہاں اکھاڑا جما ہوا تھا، وہاں آ گئے۔ جس لڑکے نے ہیر کا زنانہ روپ اختیار کر رکھا تھا، اس سے کہا بیٹی تم ایک طرف ہو جاؤ...... اور جو لڑکا رانجھے کے روپ میں تھا، پورے جوش اور غصے کے عالم میں اسے تھپڑ رسید کیا اور ڈھول ڈھمکے اٹھا کر دور پھینک دیے اور پھر خود بھی بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔ لوگ بھاگ گئے اور مولوی صاحب کو چارپائی پر ڈالا گیا۔ کافی دیر بعد انھیں ہوش آیا۔

اس کے بعد گاؤں میں کبھی اس قسم کی بے ہودہ حرکت نہیں ہوئی۔

یہ معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے ''ہیر'' کو واقعی عورت سمجھا، یا یوں ہی اسے بیٹی کہا۔ تاہم اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ عورت بے شک کسی قسم کے کردار کی ہو، ان کے دل میں بحیثیت عورت کے اس کا احترام تھا۔

وہ بڑے خود دار تھے اور اپنے مرتبہ وشخصیت کی بے حد حفاظت کرتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

جالندھر کے محکمہ تعلیم میں ایک شخص راجا فاضل محمد ڈویژنل انسپکٹر تھے۔ مولوی صاحب اپنے ایک بیٹے کی سفارش کرنے ان کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا: مولوی صاحب! میں تین سال سے جالندھر میں ہوں۔ اس اثنا میں آپ کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے، لیکن آج اپنے کام کے لیے آگئے ہیں۔

فرمایا: واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ اللہ کا دروازہ چھوڑ کر مجھے آپ کے دروازے پر نہیں آنا چاہیے تھا۔ آئندہ ان شاء اللہ کبھی نہیں آؤں گا۔

یہ لفظ کہہ کر وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ راجا صاحب نے آوازیں دیں، پیچھے ملازم بھیجا، مگر نہیں گئے۔ فرمایا: پہلے غلطی ہو چکی، اب نہیں کروں گا۔

وہ بہت سے اوصاف کے مالک تھے۔ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کا کام کرتے۔ اگر کسی سکول میں داخلے یا ملازمت کے لیے جگہ نکلتی اور اس میں دو امیدوار ہوتے، ایک اچھی حیثیت والا ان کا کوئی عزیز۔ اور دوسرا غریب شخص، جس سے کوئی عزیزداری نہ ہوتی، مگر قابلیت واستحقاق میں دونوں مساوی ہوتے تو اپنے عزیز کے مقابلے میں غیر عزیز کی اور امیر کے مقابلے میں غریب کی مدد کرتے۔

اب اس مردِ مجاہد کی زندگی کے آخری دور کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے......!

وہ اپنے وطن سے رخصت ہو کر آخر اگست ۱۹۴۷ء میں قصور پہنچے۔ ہم لوگ ۲۱۔ اگست کی شب کو قصور آگئے تھے۔ وہیں ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ قصور بے شمار پناہ گزینوں کا مسکن بنا ہوا تھا اور ہیضے کی وبا پھیل گئی تھی۔ مولوی صاحب بھی اس کی لپیٹ میں آگئے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو سخت نڈھال ہو چکے تھے، لیکن مجھے پہچان لیا تھا۔ ان کے بڑے بیٹے چوہدری عبدالرحمٰن اس وقت پاک پتن کے ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان سے چھوٹے میاں عبدالعزیز بھی قصور پہنچ گئے تھے۔ وہ عالی قدر باپ کو پاک پتن لے گئے اور وہاں جا کر اسی رات وہ آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی صاحب مرحوم کے چار بیٹے تھے اور چاروں اعلیٰ تعلیم یافتہ...... ذیل میں مختصر الفاظ میں ان کا تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ سب سے بڑے چوہدری عبدالرحمٰن تھے، جو تقسیم ملک سے کافی عرصہ پہلے سے گورنمنٹ ہائی سکول پاک پتن میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے...... بڑے متدین اور متقی بزرگ تھے۔ پاک پتن میں انہی کی تگ وتاز سے مسجد اہل حدیث بنی...... میرا ان سے اس وقت تعارف ہوا، جب میں ۱۹۴۸ء میں جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور آیا اور پھر اخبار الاعتصام

Marfat.com

جاری ہوا تو اس کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ وہ لاہور آتے تو شیش محل روڈ پر بھی تشریف لاتے اور ان سے ملاقات ہو جاتی۔ ان کے صاحب زادے کا نام ڈاکٹر محمد اسحاق تھا۔ وہ آنکھوں کے ماہر معالج تھے اور اس موضوع کی مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ۱۹۶۲ء کے ستمبر کے آخری ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ وہ رات کو ہیٹر جلانے کے لیے اٹھے اور بجلی کا جھٹکا لگنے سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے اس لائق نوجوان کی اچانک وفات پر ۵۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء کے الاعتصام میں مندرجہ ذیل تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔

''یہ خبر ہم نے نہایت افسوس کے ساتھ سنی کہ ڈاکٹر محمد اسحاق وفات پا گئے۔

''ڈاکٹر محمد اسحاق ضلع فیروز پور کے ایک مقام قادر والا میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور اہل حدیث عالم اور حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنویؒ کے مرید خاص مولانا کرم الٰہی کے پوتے اور چوہدری عبدالرحمٰن صاحب (ہیڈ ماسٹر فاضل کا ہائی سکول پاک پتن) کے بیٹے تھے۔ بے حد متین اور نیک نوجوان تھے۔ مرحوم نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں قادر والا میں حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہو گئے تھے۔ وہاں سے واپسی کے بعد ایم بی بی ایس کیا اور امراض چشم کے سپیشلسٹ ہوئے۔ میو ہسپتال لاہور میں ڈاکٹر تھے۔ اب کچھ عرصے سے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیوی بچوں سمیت لندن چلے گئے تھے۔ یہ ان کا دو سال کا کورس تھا۔ گزشتہ ہفتے شب کو دس بجے کے قریب ہیٹر جلانے کی غرض سے اٹھے اور بجلی کا کرنٹ لگنے سے وہیں گر پڑے۔ انھیں اسی وقت ہسپتال پہنچایا گیا مگر جانبر نہ ہو سکے اور وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

''مرحوم کی نعش لندن سے لاہور اور لاہور سے ان کے وطن پاک پتن پہنچائی گئی۔ ان کی عمر ۳۴۔۳۵ سال تھی۔ بڑے ہونہار اور مخلص نوجوان تھے۔ مریضوں سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان کے جذبات کا پورا خیال رکھتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ان کے رویے سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

''اس قسم کے ہمدرد مخلص لوگ روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کی وفات سے ہمیں انتہائی افسوس ہوا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔''

چوہدری عبدالرحمٰن صاحب کے لیے جوان اور اپنے فن میں ماہر بیٹے کی موت شدید صدمے کا باعث تھی۔ انھوں نے اس المیے سے کئی سال بعد وفات پائی۔ اللہ ان سب کی مغفرت فرمائے۔

۲۔ میاں عبدالعزیز عمر کے اعتبار سے مولوی صاحب کے دوسرے بیٹے ہیں۔ آزادی وطن کے زمانے میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے ایک مقام ''دھن باد'' میں کاروبار کرتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان

Marfat.com

آئے۔ اواخر اگست میں قصور میں جب ان کی ملاقات اپنے والد گرامی سے ہوئی، اس وقت وہ زندگی کے آخری دن گزار رہے تھے اور پاک پتن پہنچے تو انتقال کر گئے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد میاں صاحب کراچی چلے گئے تھے اور وہاں کاروبار شروع کر دیا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ ان سے پہلی ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی۔ البتہ ان سے تعلق وتعارف سے متعلق جو بات ذہن میں محفوظ ہے، وہ یہ ہے کہ ۱۹۵۷ء اور اس کے پس وپیش کے دور میں اخباری کاغذ کے حصول میں بہت سی قانونی مشکلات حائل ہوگئی تھیں۔ پاکستان کا دارالحکومت کراچی تھا اور وہیں سے اخباری کاغذ کا کوٹہ منظوری کے مراحل سے گزرتا تھا۔ مجھے کسی نے میاں عبدالعزیز کے بارے میں بتایا کہ وہ کراچی میں مقیم ہیں اور مولوی کرم الٰہی کے فرزند ارجمند ہیں۔ اللہ کا نام لے کر (میرا خیال ہے) بغیر کسی تعارف کے خط لکھا اور اپنی مجبوری بیان کی۔ انھوں نے خط پہنچتے ہی دو مہینے کا کوٹہ منظور کرا دیا۔ اس طرح کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ہم انھیں خط لکھتے رہے اور وہ کاغذ کا کوٹہ منظور کراتے رہے۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں میں نے سہ روزہ منہاج جاری کیا۔ اس کے لیے بھی اخباری کاغذ کی منظوری کا سلسلہ کراچی سے متعلق تھا۔ میں نے ان کو خط لکھا۔ انھوں نے بہت کوشش کی۔ لاہور کے بھی تمام روزنامہ اخباروں نے لکھا مگر کوٹہ منظور نہ ہوسکا۔ یہ اس وقت ایک قانونی مسئلہ تھا۔ میں کرنافلی کاغذ پر اخبار چھاپتا رہا۔ یہ بہت مہنگا کاغذ تھا۔ تنگ آکر اپریل ۱۹۵۹ء میں میں نے منہاج بند کر دیا اور دوبارہ الاعتصام کی ادارت سنبھال لی۔

وہ انتہائی شریف اور وضع دار قسم کے آدمی ہیں۔ اپنے والد گرامی کے حالات میں انھوں نے ایک کتاب یادوں کے چراغ تصنیف کی ہے جو ''عباز کا ٹرسٹ، ڈی-۱۳۲ بلاک بی- نارتھ ناظم آباد کراچی ۷۴۷۰۰'' سے مل سکتی ہے۔ یہ کتاب بہت سے معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مولوی صاحب کے متعلق میں نے جو گزارشات پیش کی ہیں، ان میں سے بعض باتوں کا ماخذ یہی کتاب ہے۔

اب تک کی آخری ملاقات میاں صاحب سے ۱۹۸۹ء میں ان کے سب سے چھوٹے بھائی میاں عبدالقادر کے صاحب زادے کی شادی کے موقعے پر لاہور میں ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے اہل وعیال کو صحت وتندرستی کی نعمت سے نوازے رکھے، آمین۔

۳۔ مولوی صاحب کے تیسرے بڑے بیٹے چوہدری عبداللہ تھے، جنھوں نے تقسیم ملک کے بعد خانیوال میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں کاروبار شروع کر دیا تھا۔ میں ۱۹۵۰ء میں الاعتصام کی توسیع اشاعت کے لیے وہاں گیا تو خان عبدالعظیم خاں کے ہاں ٹھہرا۔ ان کا تعلق فیروز پور سے تھا۔ وہاں وہ ''ہندوستانی دواخانہ'' کے نام سے کاروبار کرتے تھے، آزادی کے بعد خانیوال میں اقامت گزیں ہوئے

Marfat.com

تھے اور دواخانے کا نام ''زمزم دواخانہ'' رکھا تھا۔ میرے وہ مہربان تھے۔

چوہدری عبداللہ صاحب سے وہیں ملاقات ہوئی۔ بہت اچھی طرح ملے۔ مجھے یاد پڑتا ہے، وہ جماعت اسلامی سے متاثر تھے۔ جماعت کے بعض رسائل وجرائد میں کچھ ایسی باتیں شائع ہوئی تھیں، جن کا جواب دینا ضروری تھا اور الاعتصام میں جواب دیا گیا تھا۔ چوہدری صاحب نے اس ضمن میں مجھ سے جو باتیں کیں، اس سے ان کے رجحانات کا پتا چلتا تھا۔

یہاں میں چوہدری صاحب مرحوم کی ایک تحریر درج کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے ''اہل حدیث اصحاب سے چند گزارشات'' کے عنوان سے ارسال کی تھی اور ۲۔ مارچ ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں شائع ہوئی تھی۔ انھوں نے پرخلوص انداز میں جماعت اہل حدیث کی اس کے بنیادی کام کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہم نے جن معاملات کو خدمت دین سمجھ رکھا ہے، اس کی صحیح صحیح نشان دہی کی ہے۔ آج بھی وہی صورت حال ہے جو اس وقت تھی۔ میں اہل حدیث حضرات سے یہ تو نہیں عرض کرسکتا کہ اس پر غور فرمائیں، کیوں کہ ہم غور وفکر کی منزل سے بہت آگے نکل چکے ہیں، بس زیادہ سے زیادہ عرض کرسکتا ہوں کہ ایک مخلص شخص کی مخلصانہ باتیں ملاحظہ فرمائیں۔

''تحریک اہل حدیث جن مقاصد کو لے کر اٹھی تھی، ہم ان پر عمل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو اکثر میرے دل میں پیدا ہوا کرتا ہے۔ اہل حدیث احیاے دین کا ایک پروگرام لے کر اٹھے تھے، لیکن افسوس کہ بعد میں ہم اپنے صحیح مقام سے پیچھے ہٹ گئے۔

''اب پاکستان کو معرض وجود میں آئے تین سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے، اور ساتھ ہی حکومت نے قراردادِ مقاصد پاس کرکے ہمارے لیے غافل بیٹھ رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔

اب بھی اگر ہمارے گلے میں انگریز کا بنایا ہوا قانون آویزاں ہے اور اسلام کا قانون پس پشت ہے تو اس کے جواب دہ کسی حد تک ہم بھی ہیں۔ جس تحریک کی ہم دعوت لے کر اٹھے تھے، اس کے برپا کرنے کی فکر کرنی چاہیے، لیکن ہم میں سے اکثر اس معاملے میں بالکل خاموش نظر آتے ہیں۔ شاید ہم دین کے چند فرائض ادا کرنے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اسلام کے سارے تقاضے پورے ہو چکے، اگر کچھ رہ گئے ہیں تو ان کے متعلق ہم سے جواب طلبی نہیں ہوگی۔

ہمارے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔ ہمارے ذمے پورے اسلام کو پاکستان میں برپا کرنا ہے۔ ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر سوچنا چاہیے کہ اس راہ میں ہم نے کون سا قدم اٹھایا ہے۔ ہماری اجتماعی حالت تو قدرت کے ہاتھوں بالکل منتشر ہوگئی۔ ہمارے علماے کرام مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ ان میں کچھ تو فکر معاش میں الجھ گئے اور کچھ شاید حدیث نبوی ﷺ کا سہارا لے کر گوشہ تنہائی کو ترجیح دینے لگے۔ رہا سہا ایک

Marfat.com

اخبار (الاعتصام) ہے، وہ بھی ہماری غفلت کے ہاتھوں شکوہ سنج ہے۔

اگر کہیں اکٹھے ہونے کا کوئی موقع رہ گیا ہے تو وہ ہمارے سالانہ جلسے ہیں، لیکن وہ بھی پرانی ڈگر پر قائم ہیں۔ سال کے بعد علمائے کرام آئے، وعظ کیے اور چلے گئے۔ سامعین نے وقتی طور پر کچھ اثر قبول کیا اور پھر بات ختم ہوئی۔ مصیبت یہ ہے کہ ان جلسوں میں بھی سامعین کے مذاق کی باتیں کہنے والے پسند خاطر ہوتے ہیں، جو عالم صحیح مقام کی نشان دہی کریں، ان کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے۔ کاش یہ ہمارے سالانہ جلسے ہی کسی نظام کے تحت ایک مرتب کردہ پروگرام کے تحت ہوں۔

اس معاملے میں میرا روئے سخن خاص طور پر مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجراں والا) اور مولانا عطاء اللہ صاحب بھوجیانی کی طرف ہے۔"

محمد عبداللہ بی۔اے

فیروز پور جنرل سٹور

خانیوال، ضلع ملتان۔

چوہدری عبداللہ کشیدہ قامت اور خوب صورت شخص تھے۔ مجھ سے بعض معاملات میں ان کی خط وکتابت رہی۔ وہ نیک باپ کے نیک فرزند تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

۴۔ مولوی صاحب کے چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے میاں عبدالقادر ہیں جو کراچی میں مقیم ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں ان کا خط آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ وہ مولوی کرم الٰہی کے بیٹے ہیں۔ یہ بھی تحریر کیا کہ بعض رسائل میں انھوں نے میرے فلاں فلاں مضامین پڑھے ہیں جو ان کے نزدیک بہت دلچسپ تھے۔

لاہور میں ان کے صاحب زادے کی شادی تھی اور یہاں کے جن دوستوں کو انھوں نے شادی میں شمولیت کی دعوت دی تھی، انھیں فلیٹی ہوٹل میں بلایا تھا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی تھی، میں شام کے بعد اپنے مرحوم دوست محمد سعید قادری کے ساتھ وہاں پہنچا۔ میاں صاحب دیکھتے ہی میری طرف لپکے...... "بھٹی صاحب ہیں"......!

میں نے یادفرمائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

وہیں میاں عبدالعزیز صاحب سے ملاقات ہوئی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندوں کو صحت وعافیت سے نوازے اور اپنے برگزیدہ اسلاف کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

۱۹۳۳ء میں کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ حال ضلع فرید کوٹ) کی انجمن اصلاح المسلمین کی دعوت پر ایک عالم دین تشریف لائے۔ دبلے پتلے، سانولا رنگ، بڑا سر، چھوٹی چھوٹی کھودی داڑھی، سفید کھدر کی قمیص، سفید کھدر کا تہمند اور سر پر سفید کھدر کی پگڑی، تہمند ٹخنوں سے اونچا۔ نہایت سادہ لباس اور انتہائی سادہ مزاج۔ بائیس تیئس سال کی عمر...... عمر کے اعتبار سے جوان تھے، لیکن دیکھنے میں آثار جوانی کہیں نظر نہیں آتے تھے......
یہ تھے حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی......

مولانا ممدوح ۱۹۰۹ء کے لگ بھگ موضع بھوجیاں (تحصیل ترنتارن، ضلع امرتسر) میں پیدا ہوئے۔ غریب گھر میں پرورش پائی اور غربت کے ماحول میں شعور نے انگڑائی لی۔ والد کا اسم گرامی میاں صدرالدین تھا جو اپنے دور کے مرد صالح تھے اور حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی کے عقیدت مند...... اس وقت موضع ''بھوجیاں'' میں مولانا فیض اللہ خاں مرحوم ومغفور کا سلسلہ درس وتدریس جاری تھا۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام مولانا عبدالرحمٰن تھا۔ دونوں باپ بیٹا طلبا کو تعلیم دیتے تھے اور مقامی کے علاوہ بیرونی دیہات وقصبات کے بہت سے طلبا ان سے کسب علم کرتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب بھی اس درس گاہ میں حصول علم کرنے لگے تھے۔ مولانا فیض اللہ کا تعلق پٹھان برادری سے تھا اور مزاج کے سخت تھے، لیکن ان کے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن نے نہایت نرم طبیعت پائی تھی۔

مولانا فیض اللہ خاں نے امرتسر کے غزنوی علما سے حصول علم کیا تھا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کے والد میاں صدرالدین بھی اسی حلقے سے وابستہ تھے، اس لیے مولانا فیض اللہ اور میاں صدرالدین کے باہم گہرے مراسم تھے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد کسی معاملے میں دونوں میں اختلاف پیدا ہوگیا اور اختلاف میں اس درجے شدت ابھر آئی کہ مولانا فیض اللہ نے میاں صدرالدین سے بول چال بند کر دی اور ان کے کم سن بیٹے عطاء اللہ کو جو وہاں تعلیم حاصل کرتا تھا، مدرسے سے خارج کر دیا اور حکم دیا کہ وہ آئندہ یہاں نہ آیا کرے۔

اب صورت حال یوں ہوگئی تھی کہ عطاء اللہ کو ان کے والد مسجد میں پڑھنے کے لیے بھیجتے تھے اور مدرسے کے مہتمم اور مسجد کے متولی مولانا فیض اللہ بچے کو سخت ڈانٹ پلاتے اور مسجد سے نکال دیتے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن باپ سے بار بار کہتے کہ اس بچے نے کیا بگاڑا ہے؟ آپ اسے مسجد سے کیوں نکالتے ہیں؟ یہ پڑھنا

Marfat.com

چاہتا ہے، اسے پڑھنے دیجیے لیکن باپ کو بیٹے کے یہ الفاظ سخت ناگوار گزرتے، وہ انھیں بھی ڈانٹ دیتے۔

کچھ عرصے کے بعد میاں صدرالدین وفات پا گئے۔ مولانا عطاء اللہ کا گھر پہلے ہی غربت کا شکار تھا، میاں صدرالدین کی وفات کے بعد تو یوں سمجھیے کہ افلاس نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا اور مسکنت کی بے رحم برکھا ٹوٹ کر برسنے لگی...... لیکن یہ کنبہ نہایت صابروشاکر تھا۔ نہ ماں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا، نہ بیٹے نے کسی کو اپنی بپتا سنائی۔ جو کہیں سے مل گیا، کھالیا اور اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

ادھر بیٹے کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور وہ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیتا تھا۔ مگر ماں نہ اسے پڑھنے کے لیے کوئی چھوٹی موٹی کتاب خرید کر دے سکتی تھی، نہ لکھنے کے لیے تختی یا کاپی خریدنے کی سکت تھی۔ پیسہ اس زمانے میں بڑا مہنگا تھا۔ آدھا پیسہ یعنی دھیلا بھی چلتا تھا اور دمڑی بھی۔ کہیں سے دھیلا یا دمڑی یا پیسہ ہاتھ آجاتا تو عطاء اللہ دکان سے اس کا ''چاک'' خرید لاتے اور گھر کی کچی دیواروں اور دروازوں پر لکھتے رہتے۔ جب تمام دیواریں (جہاں تک ہاتھ پہنچتا) بھر جاتیں تو پہلے الفاظ کو تھوڑے بہت مٹا کر دوبارہ لکھنا شروع کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے استاد کی رہنمائی اور اصلاح کے بغیر خود ہی لکھنا سیکھا۔

انھوں نے فارسی کے چند ابتدائی رسالے اپنے گاؤں (بھوجیاں) کے ایک بزرگ حاجی امان اللہ سے پڑھے۔ ترجمہ قرآن اپنے والد گرامی اور مولانا فیض اللہ خاں اور ان کے بڑے بیٹے مولانا عبدالرحمٰن سے پڑھا۔ حدیث کی دو کتابیں بلوغ المرام اور مشکوۃ شریف بھی مولانا عبدالرحمٰن سے پڑھیں۔ صرف ونحو کی تعلیم بھی مولانا عبدالرحمٰن سے حاصل کی۔

غربت وافلاس کی رفاقت میں پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچے تو لکھنے پڑھنے کی اچھی خاصی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں انھوں نے دہلی کا عزم کیا۔ وہاں مدرسہ حمیدیہ میں داخل ہوئے اور حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی سے تحصیل علم کرنے لگے۔ مولانا شرف الدین دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔ دہلی کے دینی مدارس کے اصحاب انتظام اس وقت ہر طالب علم کو تین روپے ماہانہ وظیفہ دیتے تھے۔ اس زمانے میں یہ معقول رقم تھی۔ طالب علم اس سے دو وقت کا کھانا بھی کھاتا تھا اور دوسری ضروریات بھی پوری کر لیتا تھا۔ مولانا عطاء اللہ کو بھی تین روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ انھیں ابتدائی عمر ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، لیکن تہی کیسہ ہونے کی بنا پر کوئی کتاب خریدنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اب وہ ایک یا سوا روپیہ مہینے میں کھانے اور دوسری ضروریات پر خرچ کرتے تھے اور دو پونے دو روپے کی کتابیں خریدتے تھے۔ وہاں اخبار اور رسالے وغیرہ پڑھنے کی بھی انھیں عادت پڑ گئی تھی جو کسی لائبریری سے پڑھنے کو مفت مل جاتے تھے۔ ان کے دہلی جانے کے ایک سال بعد ۱۹۲۵ء میں مولانا فیض اللہ خاں نے وفات پائی۔

Marfat.com

دہلی میں وہ پرانی کتابیں بیچنے والے کباڑیوں سے بھی کتابیں خریدتے تھے اور جامع مسجد کے اردگرد کی دکانوں پر بھی جاتے اور ان سے قیمتاً کتابیں لیتے تھے۔ وہاں ایک کتب خانے کا نام مکتبہ عزیزیہ ہے، جس کے مالک مولانا مفتی کفایت اللہ کے بیٹے سمیع اللہ تھے۔ مولانا عطاء اللہ اس کتب خانے کا ضرور چکر لگاتے تھے۔ وہ زیادہ تر حدیث، رجال حدیث اور شروح حدیث سے متعلق کتابیں خریدتے تھے۔ یہ ان کا خاص موضوع تھا اور اس سلسلے میں ان کی معلومات کا دائرہ بہت پھیلا ہوا تھا۔

قیام دہلی کے زمانے میں ملکی سیاسیات سے بھی انھیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ سیاسی جلوسوں میں جانا اور تقریریں سننا ان کے نزدیک لازمی قرار پا گیا تھا۔ ذہنی طور پر وہ انگریزی حکومت کی مخالف جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً کانگرس، مجلس خلافت اور جمعیت علمائے ہند سے انھیں خاص طور سے دلچسپی تھی اور ان کے مقرروں کی تقریریں وہ بڑے التزام سے سنتے تھے۔

وہ کئی سال دہلی رہے اور وہاں کے جید اساتذہ سے خوب استفادہ کیا۔ دہلی کے علما سے ان کے ذاتی تعلقات پیدا ہو گئے تھے اور وہ ان کی خدمت میں بالعموم حاضر ہوتے اور مختلف علمی اور سیاسی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے۔

موجودہ سعودی حکومت کے بانی سلطان عبدالعزیز ابن سعود ۱۹۲۵ء میں جب نجد وحجاز پر قابض ہوئے، اس وقت مولانا ممدوح دہلی میں تھے اور ۱۹۲۶ء میں جب وہاں مقابر کے انہدام کا سلسلہ شروع ہوا، اس وقت بھی وہ وہیں تھے۔ اس ضمن میں بعض لوگ سعودی حکومت کے حامی تھے اور بعض مخالف...... دونوں فریق عوامی جلسے منعقد کر کے اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کرتے تھے۔ اخباروں میں بھی یہ بحث جاری تھی اور مخالفت ومدافعت میں اشتہارات بھی چھپتے تھے۔ طلبا بھی ان نزاعی مسائل میں دلچسپی لیتے تھے اور وہ بھی دو گروہوں میں منقسم تھے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب انہدام مقابر کے باب میں سعودی حکومت کے حامیوں میں شامل تھے۔ انھوں نے دینی مدارس کے طلبا کی طرف سے حکومت نجد وحجاز کی حمایت میں اشتہار چھپوائے اور بعض اخبارات میں مضامین لکھے۔ ہندوستان کا یہ دلچسپ اور ہنگامہ خیز دور تھا۔

دہلی میں مولانا نے حدیث وفقہ کی تعلیم مکمل کی اور سند فراغت حاصل کی۔ اساتذہ ان کی محنت، لگن اور ذہانت کی وجہ سے ان سے بہت خوش تھے، بلکہ رجال حدیث کے بارے میں ان سے بعض اوقات معلومات حاصل کرتے تھے۔ حدیث اور شروح حدیث سے متعلق بعض کتابوں کے سلسلے میں ان سے پوچھتے اور احادیث کی صحت وعدم صحت کے باب میں ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔

وہ کئی سال کے بعد دہلی سے اپنے گاؤں ''بھوجیاں'' گئے تو کتابوں کی کئی بوریاں ان کے ساتھ تھیں اور وہاں کے لوگ اور ان کے رشتے دار حیران تھے کہ یہ کس حالت میں یہاں سے گئے تھے اور کس حالت میں

Marfat.com

واپس آئے ہیں۔ اب ان کے ذہن کی دنیا بدل چکی تھی اور مطالعے کا ذوق نکھر گیا تھا۔ لیکن سادگی، انکسار اور فروتنی کا سلسلہ وہی پہلے کا سا تھا۔ دہلی میں نہ پاجامہ پہنا، نہ شیروانی سلائی، نہ ٹوپی خریدی، نہ گرگابی سے پاؤں آشنا ہوئے۔ وہی تہمند، وہی کرتا، وہی پگڑی، وہی سرخ سی کھال کی جوتی...... یعنی وہی بانا جس کا ابتدائے حیات سے جسم کے ساتھ تعلق رہا تھا۔

گاؤں میں وہ تھوڑا ہی عرصہ رہے۔ اس کے بعد بعض دیگر علوم وفنون کے حصول کی غرض سے ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں ''لکھوکے'' کا عزم کیا۔ وہاں کم وبیش سو سال سے دینی علوم کا چشمہ جاری تھا، جس سے بے شمار علما وطلبا سیراب ہو چکے تھے۔ جس عہد کی ہم بات کر رہے ہیں، اس عہد میں وہاں کی مسند تدریس پر حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی متمکن تھے۔ وہ لباس، بات چیت اور رہن سہن کے سلسلے میں نہایت سادگی پسند تھے، لیکن بہت بڑے عالم دین اور پنجاب کے دینی مدارس میں جلیل القدر مدرس کی حیثیت سے مشہور تھے۔

داخلے کے وقت وہ ہر طالب علم سے دو چیزیں پوچھتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ کس برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کن کن اساتذہ سے اب تک اس نے کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔

اس عہد میں عربی مدارس کا کوئی باقاعدہ نصاب تعلیم نہ تھا۔ جہاں اساتذہ طلبا کو ایک خاص ترتیب سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھاتے تھے، وہاں طلبا اپنی مرضی سے بھی بعض کتابیں منتخب کرتے اور استاذ سے پڑھنا شروع کر دیتے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف نے بھی لکھوکے میں اسی طرح پڑھنے کا ارادہ کیا۔ استاد نے ان سے اپنے معمول کے مطابق چند سوالات کیے اور پھر فرمایا کہ آپ اتنی کتابیں دہلی کے اساتذہ سے پڑھ چکے ہیں، اب یہاں پڑھنے کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔

وہ داخلے کے خواہش مند طالب علم سے عام طور پر پنجابی میں کہا کرتے تھے کہ ''جوان جو کتاباں توں پڑھنا چاہنا ئیں، نہ مینوں آنیاں نیں نہ تینوں، دوویں اوکھے ہوواں گے، جا کسے ہور توں جا کے پڑھ۔''

مولانا عطاء اللہ حنیف سے بھی انھوں نے یہی فرمایا اور مدرسے میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت وہاں مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی تعلیم حاصل کرتے تھے، جنھوں نے بعد میں اہل حدیث کے جید عالم اور معروف مدرس کے طور پر شہرت پائی اور ۷۔ مئی ۱۹۸۷ء کو ان کا انتقال ضلع فیصل آباد کے شہر تاندلیاں والا کے قریب موضع کمیانہ چک ۴۰۵ گ ب میں ہوا۔ یہ دور طالب علمی میں مولانا عطاء اللہ حنیف کو جانتے اور ان کی قابلیت سے آگاہ تھے۔ ان کی کوشش سے ان کو وہاں داخلہ ملا۔

مولانا عطاء اللہ صاحب وہاں دو سال رہے۔ استاد کو ان سے واسطہ پڑا اور ان کو تعلیم دینے لگے تو بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ۲۶۔ نومبر ۱۹۵۲ء (۷۔ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ) کو بدھ کے دن صبح پانچ بجے جامعہ محمدیہ

Marfat.com

اوکاڑہ میں وفات پائی اور رینالہ خورد کے قریب چک نمبر ۱۸ ون۔ایل میں دفن کیے گئے۔آخر وقت تک وہ اپنے اس شاگرد سے خوش رہے اور مختلف موضوعات سے متعلق ان کی معلومات کا ہمیشہ انھوں نے اعتراف کیا۔مختلف اوقات میں ان کے تین صاحب زادے (مولانا حبیب الرحمٰن، حافظ شفیق الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن) ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔

لکھوکے کا یہ وہی مدرسہ ہے جو تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ میں منتقل ہو گیا تھا اور ''جامعہ محمدیہ'' کے نام سے جاری ہے۔ بہت مدت سے اس کے مہتمم وناظم جماعت اہل حدیث کے رہنما اور سابق ایم این اے مولانا معین الدین لکھوی ہیں۔

لکھوکے سے مولانا عطاء اللہ حنیف نے گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) کا عزم کیا۔ وہاں حضرت حافظ محمد گوندلوی کی مسند تدریس آراستہ تھی، وہاں انھوں نے مختلف علوم کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔

حضرت حافظ صاحب کا دائرۂ علم نہایت وسیع تھا۔ اللہ نے ان کو تقویٰ وتدین کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا اور ذہانت وفطانت کی دولت سے بھی وہ مالا مال تھے۔ان سطور کا راقم بھی ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں (دو سال) ان کے حلقہ درس میں شامل رہا ہے۔انھوں نے ۴۔جون ۱۹۸۵ء (۱۴۔رمضان المبارک ۱۴۰۵ء) کو سفر آخرت اختیار فرمایا۔

مولانا عطاء اللہ حنیف پر اللہ کا یہ خاص فضل رہا ہے کہ ان کے تمام اساتذہ ان سے خوش تھے اور وہ سب اساتذہ سے انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ان کے اساتذہ میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

۱۔ مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی: ان سے انھوں نے اپنے گاؤں بھوجیاں میں ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ترجمہ قرآن بھی ان سے پڑھا۔

۲۔ مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی: ان سے دہلی میں تعلیم حاصل کی۔

۳۔ مولانا شرف الدین دہلوی: ان سے بھی دہلی میں استفادہ کیا۔

۴۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی: ان کے حضور لکھوکے (ضلع فیروز پور) میں زانوئے شاگردی تہہ کیا۔

۵۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی: ان سے گوندلاں والا (ضلع گوجراں والا) میں حصول علم کیا۔

اساتذہ کا حلقہ بہت مختصر تھا اور اس مختصر حلقے کے تمام اصحاب فضل اپنے اس لائق شاگرد سے انتہائی مشفقانہ برتاؤ کرتے تھے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف ۱۹۳۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ قیام گوندلاں والا کے زمانے میں ان کی آمدورفت حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم ومغفور کے پاس گوجراں والا میں رہتی تھی۔گوجراں والا سے

Marfat.com

گوندلاں والا چار میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت کچا راستہ تھا، تانگے چلتے تھے اور ایک آنہ کرایا تھا۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب سے ان کے مراسم وعلائق آہستہ آہستہ بہت گہرے ہوگئے تھے جو زندگی کے آخر وقت تک قائم رہے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے ۲۰۔فروری ۱۹۶۸ء کو رحلت فرمائی۔

گوجراں والا میں حافظ صاحب سے حصول علم کے بعد وہ اپنے گاؤں بھوجیاں چلے گئے۔ وہاں کا مدرسہ مولانا فیض اللہ خاں نے جاری کیا تھا، جس کا نام انھوں نے ''فیض الاسلام'' رکھا تھا۔ کچھ عرصہ وہ اس مدرسے میں پڑھاتے رہے۔ یہ وہی مدرسہ ہے جس میں انھوں نے ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں اور پھر اس میں ان کا داخلہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں انجمن اہل حدیث پنجاب کا مدرسہ (جس کے سربراہ مرحوم سید محمد شریف شاہ گھڑیالوی تھے) گوجراں والا میں قائم ہوا۔ اس کے صدر مدرس مولانا عطاء اللہ حنیف کو مقرر کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرے مدرس مولانا عبداللہ بھوجیانی مرحوم کو بنایا گیا تھا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا عبداللہ صاحب بھوجیانی، حضرت مولانا فیض اللہ بھوجیانی کے بیٹے اور مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے کہنے پر ان کو اس مدرسے میں خدمت تدریس پر مامور کیا گیا تھا۔

گوجراں والا ہی سے وہ انجمن اصلاح المسلمین کی درخواست پر ۱۹۳۳ء میں کوٹ کپورے تشریف لائے۔ ان کے ذمے صرف وہاں کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمانا تھا، لیکن اپنے طور پر انھوں نے ارکان انجمن سے مشورہ کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اب ان کی علمی شہرت صوبہ پنجاب کی سرحدوں سے بھی آگے نکل گئی تھی اور دہلی اور یوپی کے کئی علاقوں اور شہروں کے اہل علم تک پہنچ گئی تھی۔ مقامی طور پر غیر مسلم بھی ان سے متاثر تھے۔ سیاسی حلقوں میں بھی انھیں احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔

مولانا کی ماہانہ تنخواہ وہاں پندرہ روپے مقرر ہوئی تھی۔ ممکن ہے بعض لوگ پندرہ روپے سن کر پریشان ہوں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پندرہ روپے آج کل کے نہیں، ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کے مراد ہیں، آج کل تو پندرہ روپے کی صابن کی ٹکیہ بھی نہیں آتی وہ زمانہ کتنا سستا تھا، چند چیزوں کے بھاؤ سنیے!

گندم	ڈیڑھ روپے من، یعنی ڈیڑھ روپے کی چالیس سیر۔
جو	بارہ آنے من۔
چینی	ایک روپے کی پانچ سیر۔
چاول	ایک روپے کے بیس سیر (چاول کئی قسم کے تھے اور بھاؤ سب کے الگ الگ تھے)
گڑ	ایک روپے کا پندرہ سیر۔

Marfat.com

گھی دیسی چھ پیسے کا سیر۔
بہترین کپڑا ایک روپے چار آنے کا گز۔
سلائی شلوار قمیص چار آنے۔
کرایہ مکان ایک کمرے، ایک بیٹھک اور ڈیوڑھی پر مشتمل مکان تین روپے ماہانہ۔
سن لائٹ کا صابن چھ پیسے ٹکیہ (کچھ عرصہ ایک آنہ بھی قیمت رہی)

باقی ضروریات کو اسی پر قیاس کیجیے اور پھر بتائیے کہ پندرہ روپے کی کس درجے اہمیت تھی۔

کوٹ کپورے میں مولانا عطاء اللہ صاحب نے قرآن مجید کا ترجمہ اور درس نظامی کی کتابیں پڑھانا شروع کیں، جس میں بیرونی طلبا بھی شامل تھے اور مقامی بھی......! اس دور میں اخبارات میں مدارس کا اعلان کرنے کا رواج نہیں تھا۔ سادہ زمانہ تھا اور تمام دینی امور (بلکہ دنیوی بھی) سادگی سے انجام پاتے تھے۔ اس مدرسے کا نہ کبھی کسی اخبار میں اعلان ہوا اور نہ کوئی اشتہار شائع کیا گیا، خود ہی اس کی تشہیر ہوگئی اور طلبا ادھر کا رخ کرنے لگے۔

آج کل معاملہ بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔ تشہیر زیادہ اور کام بہت کم۔ ہر ابتدائی درجے کے مدرسے کو دارالعلوم اور جامعہ قرار دیا جاتا ہے اور اخباروں میں اشتہاروں کا سلسلہ پورے زوروں پر ہے۔ علمائے کرام کے ان ارشادات کو ہم جھوٹ تو نہیں کہہ سکتے، لیکن یہ عرض کرنے کی ضرور اجازت چاہیں گے کہ ان اشتہاروں کے زیادہ تر مندرجات خلاف واقع ہوتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں جب مولانا عطاء اللہ حنیف ہمارے ہاں گئے ہیں، میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ ناظرہ قرآن مجید اور اردو کی وہ کتابیں جو اسلامی احکام و مسائل پر مشتمل ہیں، میرے دادا مرحوم میاں محمد نے گھر میں پڑھا دی تھیں۔ اب میں نے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ ساتھ ہی سیرت رسول کی مشہور کتاب رحمۃ للعالمین (تصنیف قاضی محمد سلیمان منصور پوری) بھی پڑھنے لگا تھا۔

قاضی صاحبؒ کے مولانا انتہائی معتقد اور مداح تھے اور ان کی تصنیفات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ کوئی شخص سیرت رسول اکرم ﷺ سے متعلق کسی کتاب کے مطالعے کے لیے پوچھتا تو اسے رحمۃ للعالمین پڑھنے کا مشورہ دیتے۔ ان کی دوسری تصانیف کو بھی لائق اعتنا ٹھہراتے اور ان کے مندرجات و مشمولات کا عقیدت سے ذکر فرماتے۔

ترجمہ قرآن اور رحمۃ للعالمین کے علاوہ دینیات کی بعض دوسری درسی کتابیں بھی انھوں نے مجھے پڑھانا شروع کر دی تھیں اور میں بڑے شوق اور توجہ سے پڑھنے لگا تھا۔ اس ضمن میں بعض اوقات کچھ لطیفے بھی ہو جاتے تھے۔

مثلاً ایک دفعہ انھوں نے علم صرف کی ایک کتاب پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ ''قال'' اصل میں قول تھا

Marfat.com

(یعنی قاف، واو اور لام مفتوح) ایک نہایت نیک اور پرہیزگار بزرگ وہاں تشریف فرما تھے جو صرف ونحو وغیرہ علوم اور ان کے قواعد سے آگاہ نہ تھا۔ وہ فوراً بول اٹھے کہ قرآن میں تو یہ لفظ ''قال'' لکھا ہے اور آپ کہتے ہیں کہ اصل میں قول تھا، کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ ان کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تو کہا: اچھا اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ غلط بتایا ہے اور اب آپ اس کی تصحیح فرمانے لگے ہیں۔ خدا کے لیے علم کے نام سے ان معصوم بچوں کا ذہن خراب نہ کریں۔

ایک دن ہم مشکوۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ ایک اور صاحب بھی آکر بیٹھ گئے۔ جس حدیث کی مولانا تشریح فرما رہے تھے، اس کے آخر میں لکھا تھا ''ھذا حدیث غریب'' یہ لفظ پڑھ کر ان صاحب نے مولانا سے پنجابی میں کہا:

''مولوی صاحب! کیوں اوکھے ہو رہے او، حدیث تاں وچاری غریب اے۔''

ان دنوں ہم علم صرف کی مشہور کتاب کتاب الصرف سے باب یاد کیا کرتے تھے۔ ایک لڑکے کا والد مسجد میں آیا اور بیٹے کو باب یاد کرتے اور جلدی جلدی زبانی پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا تو گھبرا گیا کہا: میں اپنے بیٹے کو یہ مغز کھپائی والا علم نہیں پڑھنے دوں گا۔ اس سے نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے نہ دین کا۔

مولانا ایک دفعہ جمعے کا خطبہ دے رہے تھے۔ ان کا تعلق ان علما سے تھا جو سیاسیات میں کانگرس کے حامی تھے۔ عربی خطبے میں انھوں نے دعا مانگی:

((اللھم اھلك الكفرة والفجرة واليهود والبر طانية .))

''اے اللہ! کافروں، فاجروں، یہودیوں اور انگریزوں کو ہلاک کر دے۔''

ایک شخص نے ایک پڑھے لکھے شخص سے کہا کہ مولوی صاحب نے یہ جو ''واليهوديه والبراطانيه'' کے لفظ کہے ہیں، یہ کسی اور مولوی صاحب سے تو کبھی سنے نہیں، ان کا مطلب کیا ہے؟

انھیں ان الفاظ کا مطلب بتایا گیا تو کہا: یہ تو گالیاں ہوئیں جو مولوی صاحب نے پنجابی کے بجائے عربی میں دی ہیں۔

ایک مرتبہ وہاں کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی تشریف لے گئے جو بہت بڑے مناظر تھے۔ مولانا لال حسین اختر بھی اس جلسے میں مدعو تھے۔ وہ بھی قادیانیوں کے خلاف زوردار تقریر کرتے اور مناظرے میں شہرت رکھتے تھے۔ مولانا حافظ محمد حسین روپڑی بھی شریک جلسہ تھے۔ ان حضرات کو ایک گاؤں کے لوگ اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ وہاں قادیانیوں کے چند گھر تھے۔ وہ کسی قادیانی مناظر و مبلغ کو، (جن کا نام مجھے یاد پڑتا ہے) جلال الدین شمس تھا، اپنے گاؤں لائے تھے اور

Marfat.com

انھوں نے مناظرے کا چیلنج دیا تھا۔ گاؤں کے چند سرکردہ مسلمان انجمن کے جلسے کے موقع پر کوٹ کپورے آئے اور مولانا عطاء اللہ حنیف سے کہا کہ جن حضرات علما کو آپ مناسب سمجھیں مہربانی فرما کر ان سے ہمارے ساتھ جانے کی درخواست کریں۔ چناں چہ مذکورہ بالا تینوں حضرات وہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ لوگ سواری کے لیے اونٹ لے کر آئے تھے۔

مولانا احمد الدین کے حصے میں اونٹنی آئی۔ وہ اس پر بیٹھے تو مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب سے بلند آواز سے کہا: مولوی عطاء اللہ! وَاِذَا الْعِشَارُ ''اتے لت''......!

قرآن کی سورہ تکویر کی آیت نمبر ۴ کے الفاظ ہیں: ﴿وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ o﴾ (قیامت کے روز جب اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی) عُطِّلَت کو انھوں نے پنجابی کا ''اتے لت'' بنا دیا جو اس وقت واقعاتی اعتبار سے بالکل صحیح تھا۔

اس لطیفے سے (اس کو سمجھنے والے) بڑے محظوظ ہوئے۔

کوٹ کپورہ اور اس کے قرب و جوار کے لوگ مولانا عطاء اللہ حنیف سے کافی متاثر تھے۔ ان کی شادی ان کے گاؤں ''بھوجیاں'' میں ہوئی تھی۔ ان کے بچپن کے زمانے میں (غربت کی وجہ سے) گاؤں کے جو لوگ (بالخصوص بعض رشتے دار) ان سے دور دور رہتے تھے، اب قریب آنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن انھیں ان کے قرب یا بعد کی کوئی پروا نہ تھی۔ دونوں حالتیں ان کے نزدیک برابر تھیں۔

بہرحال قیام کوٹ کپورہ کے زمانے میں ان کی شادی ہوئی۔ دس پندرہ دن کے بعد بیوی کو لے کر آئے تو وہ کھدر کی چادر لپیٹے شوہر کے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی آ رہی تھیں۔ شادی سے پہلے مولانا نے ایک سکھ درزی سے تین روپے ماہانہ کرائے پر مکان لے لیا تھا۔ بالکل نیا مکان تھا جو ایک کمرے، ایک بیٹھک، ایک ڈیوڑھی اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ بیٹھک کی تین چار الماریوں میں انھوں نے اپنی کتابیں رکھ لی تھیں۔ دولہن اپنے ساتھ کوئی جہیز نہیں لائی تھیں۔ ضرورت کے چند برتن انھوں نے یہیں خریدے تھے۔ تین چار چارپائیاں بھی یہیں بنوائیں...... دولہا میاں بھی دولہن کے لیے نہ کوئی زیور لے کر گئے تھے اور نہ ''بری'' کا کوئی سوٹ سلوایا تھا......

وہ نہایت نیک خاتون تھیں۔ انھوں نے آتے ہی گھر میں چھوٹی بچیوں کو قرآن مجید پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ جوان لڑکیاں اور بڑی عمر کی بعض عورتیں بھی ان سے قرآن مجید اور مولوی رحیم بخش کی اسلام کی کتاب (جو پہلی جلد سے چودہ جلدوں تک پھیلی ہوئی ہے) پڑھنے لگی تھیں۔

ان کا نام حنیفہ بی بی تھا اور بڑی چھوٹی سب عورتیں انھیں ''بہن جی'' کہا کرتی تھیں۔ وہ ۱۹۔ اپریل

Marfat.com

۱۹۵۷ء (۱۸۔ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ) کو فوت ہوئیں۔ اس اعتبار سے ان کی وفات پر تقریباً چالیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ان کو جاننے والی ہمارے ہاں کی بوڑھی عورتیں اب بھی ان کا نام ''بہن حنیفہ'' کہہ کر لیتی ہیں یا صرف ''بہن جی'' کہتی ہیں...... اور ''بہن جی'' کے لفظ سے پتا چل جاتا ہے کہ اس کی مشار الیھا کون ہے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف اور ان کی اہلیہ محترمہ (بہن حنیفہ) نے ہمارے ہاں بے حد دینی خدمات سرانجام دیں۔ مولانا نے خطابت وتدریس کے ذریعے اور ان کی اہلیہ مرحومہ نے خواتین کو قرآن مجید اور اردو کی دینی واسلامی کتابوں کی تعلیم کی صورت میں......!

قیام پاکستان کے بعد بھی ان دونوں میاں بیوی نے (جب تک زندہ رہے) ہمارے موجودہ گاؤں میں جانے اور وہاں کے پرانے لوگوں سے میل جول کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہاں کے لوگ بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ اب بھی ان کی اولاد واحفاد سے ان کا تعلق قائم ہے۔

مولانا عطاء اللہ صاحب میں ایک خوبی یہ تھی کہ ان میں دنیوی لالچ بالکل نہ تھا۔ مہمان ان کے ہاں بہت آتے تھے اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خدمت کرتے تھے۔ ان کے دوستوں اور تعلق داروں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ وہ سب سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ روپے پیسے کی حرص سے ان کا ذہن خالی تھا اور وہ اللہ کے سوا کسی سے کسی چیز کا سوال نہیں کرتے تھے۔ ان کی تمام ضرورتیں احسن طریقے سے اللہ تعالیٰ پوری کرتا تھا، اور اسی پر ان کو بھروسا تھا۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا، میں کوٹ کپورے سے مولانا کے حلقہ شاگردی میں داخل تھا۔ ہمارا اور ہمارے اکثر رشتے داروں کا تعلق ٹرانسپورٹ سے تھا۔ ایک مرتبہ دس بارہ بسوں کا قافلہ کیسے یا کنوایا، پاسنگ کے لیے لدھیانے کو روانہ ہوا۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ دس گیارہ سال کے ہم چھ سات بچے بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ انگریز سارجنٹ گاڑیاں پاس کرتا تھا اور اسے ''صاحب'' کہا جاتا تھا۔ گاڑیوں کی پاسنگ کا مسئلہ اس زمانے میں بہت سخت تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز دیکھی اور چیک کی جاتی تھی۔ تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہنا پڑا۔

ان دنوں اس نواح میں نئے نئے سینما ہال بنے تھے اور ان میں فلمیں چلنے لگی تھیں۔ کہا جاتا تھا مورتیں بولتی ہیں۔ ایک دن سب لوگ شام کے وقت سینما کی طرف روانہ ہوئے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ تھا۔ باہر ایک بڑے ہال میں جہاں ٹکٹ ملتے تھے، ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اندر فلم چالو ہوئی تو یہ مورتیں بولیں گی اور آپس میں باتیں کریں گی۔ دریا اور نہریں اور ریلیں بھی اندر چلیں گی۔ اندر جا کر دیکھا تو واقعی وہی منظر متحرک شکل میں سامنے تھا جو باہر تصویروں میں دیکھا اور لوگوں سے سنا

Marfat.com

تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس فلم کا نام ''سوتیلی ماں'' تھا اور اس میں نور جہاں اور دلیپ کمار اپنے فن کے جوہر دکھا رہے تھے۔ دریا میں کشتیاں چل رہی تھیں۔ نہایت تعجب ہوا کہ یہ کیا قصہ ہے اور کاغذ کی بے جان مورتیں کس طرح بولتی، حرکت کرتی، گاتی، ناچتی ٹاپتی اور ادھر ادھر بھاگی پھرتی ہیں۔

اب آگے سنیے کیا ہوا۔

ہم واپس اپنے گھر آئے تو کسی نے میرے دادا مرحوم کو میرے متعلق بتا دیا کہ اس نے دوسرے لوگوں کے ساتھ فلم دیکھی ہے۔ پہلے تو انھوں نے بتانے والے سے فلم کا مطلب سمجھا، پھر میری طرف توجہ فرمائی اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ مار کھاتے کھاتے میرا برا حال ہو گیا اور میں نے توبہ کی کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا، لیکن وہ میری توبہ سے مطمئن نہیں ہوئے۔ مجھے مولانا عطاء اللہ صاحب کے پاس لے گئے۔ انھوں نے بھی فلم کے مطالب و معانی سمجھنے کے بعد اس حقیر فقیر پر دادا جان والا عمل دہرایا۔ ان کے حضور بھی ہم نے رو رو کر توبہ کی اور رحم کے طالب ہوئے۔

اس کے بعد ہم نے فلم نہیں دیکھی، ٹی وی پر بھی فلم دیکھنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ ڈرامہ دیکھنے کا بھی شوق نہیں ہے۔ بالعموم خبریں بھی نہیں سنتا اور ہمارے ہاں کی خبریں قابل شنید ہوتی بھی نہیں۔ البتہ وقت کے ضیاع کا موجب ضرور ہوتی ہیں۔ ہمارے علمائے کرام جو فلموں اور اس قسم دوسرے پروگراموں کے گیت گانوں وغیرہ کی زوردار الفاظ میں مخالفت فرماتے ہیں، لازماً اسے دیکھتے ہوں گے اور دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ فرماتے ہوں گے کہ اس کا یہ حصہ غلط ہے، اور اس کی اس انداز سے مخالفت کرنی چاہیے۔ یہ لوگ مزے میں رہتے ہیں، تمام پروگرام بھی دیکھ لیے، آنکھیں بھی سینک لیں، سماعت بھی فرمالی، دل بھی خوش کر لیا اور پھر فریضہ تبلیغ بھی ادا فرما دیا۔ ایک تیر سے دو شکار...... باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی۔

ہمیں ٹی وی یا ریڈیو کے کسی پروگرام سے دلچسپی نہیں اور سرے سے پتا ہی نہیں کہ کس پروگرام کا کون سا حصہ خلاف شرع اور کون سا مطابق اسلام ہے۔ ہم ایک سال میں صرف ایک پروگرام دیکھتے اور سنتے ہیں۔ وہ ہے ۲۲۔ فروری کو ہندوستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق نشر ہونے والا پروگرام......! ہماری دلچسپی کا بس یہی ایک پروگرام ہے، جس کے ہم بے تابی سے منتظر رہتے ہیں۔ اسے کوئی غلط قرار دے یا صحیح، جہاں تک بس چلا فتوے سے بے پروا ہو کر ہم اسے دیکھتے رہیں گے...... بے شک ہر سال کی پچھلی باتیں ہی دہرائی جائیں۔ جب ہم یہ پروگرام دیکھتے ہیں تو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگلے مہینے پھر ۲۲۔ فروری آجائے تاکہ ہم پھر یہ پروگرام دیکھ سکیں۔ ممکن ہے اس طرح مستقل طور پر ٹیلی ویژن سے رابطہ پیدا ہو جائے اور علمائے کرام کی طرح ہم بھی ناچ گانے اور ڈرامے وغیرہ کے عادی ہو جائیں اور پھر تبلیغ کا ثواب

Marfat.com

بھی حاصل کر لیا کریں۔ شاید یہی عمل نجات کا سبب بن جائے۔ قرآن کے الفاظ میں وماذالك على الله بعزيز۔

سیاسی اعتبار سے ریاستوں کا ماحول نہایت گھٹن کا تھا اور مولانا عطاء اللہ صاحب خطبات جمعہ میں بسا اوقات کھل کر سیاسی باتیں کر جاتے تھے۔ اس لیے ان کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ۱۹۳۳ء سے آخر دسمبر ۱۹۳۶ء تک وہاں قیام فرما رہے۔

دسمبر کے آخری دنوں میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم ومغفور وہاں گئے اور ہمارے ایک بزرگ حاجی محمد علی مرحوم کے مکان پر ٹھہرے۔ رات کو عشا کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب کو بھی وہاں بلایا گیا۔ انجمن اصلاح المسلمین کے بعض ارکان بھی آ گئے۔ مولانا محمد علی نے فرمایا کہ مولانا عطاء اللہ صاحب کا اب یہاں مزید قیام کرنا مشکل ہے۔ آپ لوگ انھیں اجازت دیں، میں انھیں اپنے ہاں مرکز الاسلام لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں یہ میرے دو بیٹوں......محی الدین اور معین الدین......کو بھی پڑھائیں گے اور دیگر طلبا کو بھی تعلیم دیں گے۔

ارکان انجمن نے ان کی یہ تجویز بادل نخواستہ اس شرط کے ساتھ منظور کی کہ چند طلبا کو جو ان سے یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے، چناں چہ مولانا لکھوی نے یہ شرط منظور فرمائی اور یکم فروری ۱۹۳۷ء کو مولانا ساڑھے بارہ بجے کی ٹرین سے مرکز الاسلام پہنچ گئے۔ میں اور حاجی محمد رفیق (جو اس وقت ہمارے گاؤں میں سکونت پذیر ہیں اور میرے بچپن کے دوست ہیں) مولانا کے ساتھ تھے۔

یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ”مرکز الاسلام“ کیا تھا اور کہاں واقع تھا؟

”مرکز الاسلام“ کے عجیب وغریب نام کے پس منظر اور اس کے محل وقوع کا ذکر کرنے سے پہلے چند الفاظ میں مولانا محمد علی لکھوی کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم پنجاب کے مشہور بزرگ حضرت حافظ محمد لکھویؒ کے پوتے تھے۔ حافظ محمد خطہ پنجاب کے اولین عالم تھے، جنھوں نے سات جلدوں میں تفسیر محمدی لکھی۔ علاوہ ازیں زینت الاسلام اور قبر وقیامت سے متعلق احوال الاخرت تصنیف کی۔ ابواب الصرف ان کی وہ کتاب ہے جو شامل نصاب ہے اور عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ صحاح ستہ کی معروف کتاب سنن ابی داؤد پر عربی میں حاشیہ لکھا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

ضلع فیروز پور میں ایک چھوٹا سا گاؤں ”لکھوکے“ کے نام سے موسوم ہے، جو ایک شخص ”لکھا“ نامی نے آباد کیا تھا۔ اس گاؤں میں حافظ محمد صاحب نے ایک درس گاہ جاری کی جس میں ان کے نہایت قریبی عزیز حضرت مولانا عبدالقادر لکھوی اور پھر ان کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا عطاء اللہ لکھوی خدمت تدریس انجام دیتے رہے، جن کا ذکر گزشتہ سطور میں آچکا ہے۔

Marfat.com

مولانا محمد علی لکھوی نے لکھو کے سے تقریباً اڑھائی میل کے فاصلے پر ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ دو مربعے زمین میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام ''مرکز الاسلام'' رکھا۔ یہ جگہ آبادی سے دور تھی۔ مولانا نے یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہاں ایک گھر مولانا کا اپنا تھا۔ ایک مزارعے کا، ایک گھر عیسیٰ ترکھان کا اور ایک فتح محمد لوہار کا تھا، جسے ''پھتا'' کہا جاتا تھا۔ ایک مہمان خانہ تھا اور چند کمرے (یا کوٹھے) طلبا کے لیے بنائے گئے تھے۔ یہ تمام مکان کچے تھے اور خود ہی بڑی بڑی کچی اینٹیں بنا کر تعمیر کیے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم بہت بڑے عالم، نہایت ذہین اور انتہائی معاملہ فہم تھے۔ تہجد گزار اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔ انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ چمرکنڈ کی جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ مرکز الاسلام میں تیاری کرا کے بہت سے مجاہدین انھوں نے وہاں بھیجے، خود بھی کئی مرتبہ وہاں گئے۔

سیاسی اعتبار سے ذہنی ہم آہنگی مجلس احرار سے تھی۔ کئی دفعہ تقریر کے لیے اس کے جلسوں میں گئے۔ ۱۹۳۷ء میں فیروز پور میں مجلس احرار کا جو جلسہ منعقد ہوا تھا، اس میں ان کی کوششوں کا بڑا دخل تھا، جس کا تذکرہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق مضمون میں کیا گیا ہے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی ان کی بے حد تکریم فرماتے تھے۔ ایک یا دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ مولانا غزنوی کسی سیاسی معاملے میں قید ہوئے تو انھوں نے چینیاں والی مسجد کی خطابت کی ذمہ داری مولانا محمد علی لکھوی کے سپرد کی۔ اس مسجد میں کئی سال مولانا محمد علی مرحوم فریضہ تدریس بھی سرانجام دیتے رہے۔

غالباً ۱۹۲۸ء میں وہ حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ پھر مدینہ منورہ میں اقامت گزیں ہو گئے تھے اور مسجد نبوی میں سلسلہ درس شروع کر دیا تھا۔ وہاں شادی بھی کر لی تھی۔ بعدازاں کئی دفعہ وہ مرکز الاسلام تشریف لائے اور طویل مدت تک وہاں رہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت وہ مدینہ منورہ میں تھے اور ان کے اہل وعیال اور اعزہ واقربا اوکاڑہ میں آبسے تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں وہ ان سے ملاقات کے لیے اوکاڑے آئے۔ اس کے بعد تین چار مرتبہ تشریف لائے۔ اس عاجز پر انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ میرے نام بعض معاملات سے متعلق انھوں نے مدینہ منورہ سے چند خطوط بھی ارسال فرمائے جن میں سے بعض میرے پاس محفوظ ہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اپریل ۱۹۹۳ء میں میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ مولانا محمد علی لکھوی کون بزرگ تھے؟

میں نے جواب دیا: مولانا معین الدین لکھوی کے والد۔

پھر سوال کیا: ان کا تعلق چمرکنڈ کی جماعت مجاہدین سے رہا تھا؟

عرض کیا: رہا تھا۔

Marfat.com

کہا: وہ ضلع فیروز پور کے ایک مقام مرکز الاسلام میں رہتے تھے؟

جواب دیا: ہاں۔

انھوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پیشتر وہ لندن گئے تھے۔ وہاں انڈیا آفس لائبریری جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ لائبریری کے ایک شعبے میں چمرکنڈ کی جماعت مجاہدین کے بارے میں جو ریکارڈ پڑا ہے، میں نے اسے دیکھا، اس میں وہابی تحریک اور جماعت مجاہدین سے انسلاک رکھنے اور ان کی مدد کرنے والے بہت سے لوگوں کے نام لکھے ہیں۔ اس فہرست میں مولانا محمد علی لکھوی کا نام بھی مرقوم ہے۔ لکھا ہے کہ وہ آبادی سے دور ایک مقام مرکز الاسلام میں رہتے تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ ان کے آباواجداد سے قائم تھا۔ اپنے مسکن سے وہ مجاہدین بھیجتے اور اس جماعت کی مدد کرتے تھے۔

یہ بات ایک دوست نے بیان کی اور میں نے لکھ دی۔

بات کچھ دور نکل گئی۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ مرکز الاسلام کا نام میں نے آخر دسمبر ۱۹۳۶ء میں سنا تھا۔ سننے میں نام بڑا بھاری بھرکم تھا۔ خیال گزرا کہ شاید یہ اتنا ہی بڑا شہر ہوگا، جتنا بڑا اس کا نام ہے۔

اب ہم مرکز الاسلام کو روانہ ہوئے...... مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، حاجی محمد رفیق اور ان سطور کا راقم یکم جنوری ۱۹۳۷ء کو کوٹ کپورے سے صبح آٹھ بجے کی اس ٹرین پر سوار ہوئے جو دہلی سے آتی اور فیروز پور سے ہوتی ہوئی لاہور پہنچتی تھی...... فیروز پور اترے تو وہاں سے ساڑھے گیارہ بجے اس گاڑی پر سوار ہوئے جو فاضل کا اور بہاول نگر سے ہوتی ہوئی سمہ سٹہ جاتی تھی...... فیروز پور سے بجانب مشرق پہلا ریلوے اسٹیشن ''کھائی پھیمکی'' اور دوسرا ''جھوک ٹہل سنگھ'' آتا تھا۔ یہ چودہ میل کا سفر تھا اور چار آنے کرایہ تھا۔ ہم جھوک ٹہل سنگھ اترے اور جس طرف کو گاڑی جاتی تھی، اس کی لائن پر اسی طرف کو چلنے لگے۔ تقریباً پون میل کے فاصلے پر ریلوے لائن کے قریب دائیں جانب مرکز الاسلام تھا۔ اس مقام اور آبادی کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوا۔ ہم اچھا بھلا شہر چھوڑ کر آئے تھے، جس کے چار بڑے بڑے بازار تھے۔ بہت بڑی غلہ منڈی تھی، جنکشن ریلوے اسٹیشن تھا۔ دو ہائی سکول تھے، ایک لڑکیوں کا اور ایک لڑکوں کا۔ تین چار پرائمری سکول تھے، کئی ہزار افراد پر مشتمل آبادی تھی اور بائیس مسجدیں تھیں۔ اتنا بڑا شہر چھوڑ کر اب ہم بالکل جنگل میں آگئے تھے۔ اس سے میل یا پون میل سے کم فاصلے پر کوئی گاؤں نہ تھا۔ ایک سال ہم وہاں رہے۔ اسی زمانے میں مولانا محی الدین اور مولانا معین الدین سے ہماری دوستی ہوئی جو اللہ کے فضل سے اب تک قائم ہے اور ان شاء اللہ قائم رہے گی۔ وہاں بے شمار مہمان آتے تھے، جن کا کھانا ان کے گھر سے آتا تھا۔ اس درجے مہمان نواز، خوش اخلاق، عالی کردار اور ملنسار گھرانا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ پھر یہ لوگ جنگل میں رہتے تھے اور جھوک ٹہل سنگھ

Marfat.com

کے اکالی اور بعض مسلمان برادریوں کے لوگ ان کے مخالف تھے، مگر کسی کو کھل کر ان کے مقابلے میں آنے کی جرات نہ تھی۔ ان کی تفصیلات مولانا محمد علی لکھوی سے متعلق مضمون میں ان شاء اللہ بیان کی جائیں گی۔ یہاں چند باتیں مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے متعلق گزارشات پیش کرتے ہوئے معرض تحریر میں آگئی ہیں۔

مولانا عطاء اللہ صاحب سے میں نے مرکز الاسلام میں مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔ ان میں سے بعض کتابوں میں مولانا محی الدین، معین الدین اور حاجی محمد رفیق میرے ہم سبق تھے۔

۱۔ نسائی شریف — علم حدیث کی مشہور کتاب جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔
۲۔ قدوری — علم فقہ کی کتاب۔
۳۔ نور الانوار — اصول فقہ۔
۴۔ شرح نخبۃ الفکر — اصول حدیث۔
۵۔ مقامات حریری — ادب عربی۔
۶۔ فصول اکبر — علم صرف۔
۷۔ شرح مائتہ عامل — علم نحو۔
۸۔ ہدایت النحو — علم نحو۔
۹۔ مرقات — علم منطق۔

ان میں سے بعض کتابوں کے کچھ حصے کوٹ کپورے میں بھی پڑھے جا چکے تھے۔ بعض کے کچھ اسباق ۱۹۳۸ء میں فیروز پور میں پڑھے۔

اس اثنا میں مرکز الاسلام کی فضا اور وہاں کے ماحول سے ہم مانوس ہو گئے تھے لیکن ہوا یہ کہ فیروز پور کی انجمن اہل حدیث کے بعض ارکان مولانا عبید اللہ احرار اور خان عبدالعظیم خاں وغیرہ مرکز الاسلام مولانا محمد علی لکھوی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بات چیت کر کے مولانا عطاء اللہ صاحب کو خطیب اور مدرس کی حیثیت سے فیروز پور مسجد گنبداں والی میں لے آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ فیروز پور آ گیا۔ یہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ وہاں دو مدرس اور تھے، وہ تھے مولانا محمد شفیع ہوشیار پوری اور ان کے بھتیجے مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری۔ مولانا محمد شفیع آزادی وطن کے بعد صوبہ سندھ کے ایک مقام میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، اب بھی وہیں ہیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب آج کل جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں۔ میں نے فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے علاوہ ان دونوں بزرگوں سے بھی استفادہ کیا۔ فیروز پور کے مدرسے کا نام مولانا عطاء اللہ صاحب نے دارالحدیث نذیریہ رکھا تھا۔ اس کا افتتاح حضرت مولانا حافظ عبداللہ

Marfat.com

بڈھیمالوی نے کیا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد بہت سے لوگ موجود تھے اور اس فقیر کو حکم دیا گیا تھا کہ میں جامع ترمذی کی پہلی حدیث طالب علم کی حیثیت سے پڑھوں۔ حضرت حافظ صاحب مسجد میں منبر پر تشریف فرما تھے اور میں نے ان کے حضور کھڑے ہو کر ترمذی کی پہلی حدیث پڑھی تھی۔ پھر حافظ صاحب نے مجھے بیٹھ جانے کا حکم دیا اور اس حدیث کا ترجمہ کیا اور تشریح فرمائی۔

یہ سردیوں کا موسم تھا اور بجلی کی روشنی تھی۔ ہمارے ہاں بجلی نہیں تھی۔ ہم پہلی دفعہ فیروز پور میں بجلی کی روشنی سے آشنا ہوئے تھے اور حیران ہوتے تھے کہ یہ کیا شے ہے۔ ادھر بٹن دبایا اور ادھر تمام کمرہ روشنی سے بھر گیا۔

فیروز پور کی انجمن اہل حدیث اور مسجد گنبداں والی کے منتظمین میں زیادہ تعداد مجلس احرار سے تعلق رکھنے والے حضرات کی تھی اور سیاسیات میں وہ مولانا عطاء اللہ صاحب کے ہم خیال تھے۔ فیروز پور کی کانگرس کمیٹی کے مولانا نائب صدر اور ضلع فیروز پور کی جمعیت علمائے ہند کے صدر تھے۔ ضلع اور شہر کے جماعتی حلقوں میں ان کو بے حد احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں ان کی تنخواہ اکیس روپے ماہانہ تھی۔ باولی رام دیال میں ان کا مکان تھا، جس کا ماہانہ کرایہ پانچ روپے تھا۔

متعدد سرکاری ملازموں نے فیروز پور میں ان سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا۔ بیرونی طلبا بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے۔

کچھ عرصہ وہ مسجد سے متصل ایک مکان میں رہے۔ اس کا کرایہ تین روپے تھا اور پانچ روپے کرائے والے مکان سے یہ مکان کافی بڑا تھا۔ صحن بھی کھلا تھا اور کمرے بھی زیادہ تھے۔ لیکن فرق یہ تھا کہ پانچ روپے والا مکان نیا تھا اور تین روپے والا کچھ پرانی طرز کا تھا۔ نئے مکان کی دیواروں میں کئی الماریاں تھی جن میں کتابیں رکھی گئی تھیں۔

مولانا دو اخبار بذریعہ ڈاک منگواتے تھے۔ ایک سہ روزہ زمـــزم جو موہن لال روڈ لاہور سے نکلتا تھا (اب موہن لال روڈ کو اردو بازار کہا جاتا ہے) زمـــزم کے ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط تھے جو یوپی کے شہر غازی پور کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ دہلی چلے گئے تھے اور جمعیت علمائے ہند کے ترجمان روزنامہ الجمعیت کے ایڈیٹر مقرر کر لیے گئے تھے۔

دوسرا اخبار وہ سہ روزہ مـدینـہ منگواتے تھے جو بجنور (یوپی) سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مالک و ناشر مولوی محمد مجید حسن تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں اس کے ایڈیٹر ابو سعید بزمی تھے جو دینیات میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور دوسری طرف ایم اے پاس تھے۔ ان کے زمانہ ادارت (۱۹۳۹ء) میں مـدینـہ کا اردو نمبر شائع ہوا تھا۔ یہ نمبر ۲۰×۳۰/۴ سائز کی دو جلدوں میں تھا اور اپنے

Marfat.com

موضوع کے بہت سے مضامین پر محتوی تھا۔ اس ضخیم نمبر میں مسلمان اہل قلم کے مضامین بھی شامل تھے اور ہندو اصحاب علم کے بھی......!

فیروز پور میں اس فقیر نے مندرجہ ذیل کتابیں پڑھیں۔

۱۔ سنن ابی داؤد	صحاح ستہ کی مشہور کتاب۔
۲۔ جامع ترمذی	صحاح ستہ کی کتاب۔
۳۔ ابن ماجه	صحاح ستہ کی کتاب۔
۴۔ موطا امام مالك	یہ حدیث کی کتاب بھی ہے اور فقہ کی بھی۔
۵۔ جامع البیان	قرآن مجید کی تفسیر جو اس وقت شامل نصاب تھی۔
۶۔ جلالین کا کچھ حصه	یہ بھی قرآن مجید کی تفسیر ہے جو اس وقت مدارس میں پڑھائی جاتی تھی۔
۷۔ کنز الدقائق	فقہ کی درسی کتاب۔
۸۔ شرح وقایه	فقہ کی درسی کتاب۔
۹۔ توضیح تلویح	اصول فقہ کی درسی کتاب۔
۱۰۔ مختصر معانی	بیان وبلاغت سے متعلق۔
۱۱۔ مطول	معانی وبلاغت کی کتاب، بحث ''ما انا قلت'' تک داخل نصاب تھیں۔
۱۲۔ کافیه	علم نحو۔
۱۳۔ شرح جامی	علم نحو۔
۱۴۔ شافیه	علم صرف۔
۱۵۔ شرح تهذیب	منطق۔
۱۶۔ قطبی	منطق۔
۱۷۔ هدیه سعیدیه	
۱۸۔ مقدمه ابن الصلاح	اصول حدیث۔
۱۹۔ رشیدیه	علم مناظرہ۔
۲۰۔ سبعه معلقه	ادب عربی۔
۲۱۔ متنبی	ادب عربی۔
۲۲۔ عروض المفتاح	علم عروض سے متعلق۔

Marfat.com

۲۳۔ محیط الدائرہ فلکیات۔

علاوہ ازیں علم صرف ونحو کی علم الصیغہ، تحریر سنبٹ، مراح الارواح، زنجانی، حاشیہ شرح جامی (عبدالغفور لاری) وغیرہ۔ منطق کی رسالہ میر زاھد، میر قطبی، سلم العلوم وغیرہ۔ سراجی وغیرہ متعدد کتابیں مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا محمد شفیع صاحب اور مولانا ثناء اللہ صاحب سے پڑھیں۔

مولانا عطاء اللہ صاحب کو علم رجال، تاریخ اسلامی، سیاسیات وغیرہ موضوعات سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس سلسلے کی عربی اور اردو کتابوں کا بھی میں نے ان کی رہنمائی میں مطالعہ کیا۔ فارسی کی گلستان، بوستان اور بعض دوسری کتابیں انھوں نے پڑھائیں۔ ابتدا ہی سے انھوں نے میری علمی تربیت کے لیے بے حد کوشش فرمائی۔ میں بعض امور میں ان سے متاثر ہوا اور بعض میں بدقسمتی سے متاثر نہ ہو سکا۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔

بلاشبہ وہ میرے مشفق استاد تھے اور مجھے جو کچھ اللہ نے عطا فرمایا، وہ انھی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔

میں تین سال ان کی خدمت میں فیروز پور رہا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کے حکم سے حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی کے حلقہ درس میں گوجراں والے چلا گیا۔ ان سے دینیات کے مروجہ نصاب کی انتہائی کتابیں پڑھیں، جن کی تفصیل ان مضامین میں بیان کی گئی ہے جو ان دونوں اساتذہ گرامی قدر کے بارے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ صاحب کا اچھا خاصا کتب خانہ تھا جو انھوں نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ وہ لکھتے کم اور پڑھتے بہت زیادہ تھے۔ سفر میں بھی ان کی دلچسپی کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ عام طور سے بذریعہ ڈاک دو مقامات سے کتابیں منگواتے تھے۔ ایک مولانا عبدالتواب ملتانی تاجر کتب ملتان سے، دوسرے شرف الدین واولادہ بھنڈی بازار بمبئی سے......!

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی کتابوں سے انھیں بالخصوص دلچسپی تھی۔ ان کی جو کتاب مصر وغیرہ سے چھپتی اور شرف الدین واولادہ کے ہاں بمبئی پہنچتی، وہ فوراً خط لکھ کر منگوا لیتے۔ پھر اس کا مطالعہ شروع کر دیتے اور اسے ختم کر کے دم لیتے۔ کسی کتاب کے جو مقامات ان کے نزدیک اہم ہوتے، ان پر نشان لگاتے، جلد بڑی اچھی بندھواتے اور جلد ساز کو ہدایت کرتے کہ شروع میں تین یا چار سفید کاغذ زائد لگائے جائیں۔ ان کاغذات پر کتاب میں مندرج اہم مسائل کے حوالے مع صفحے اور تھوڑی سی عبارت کے درج فرماتے۔ بعض چھوٹے چھوٹے الگ الگ موضوع کے رسالے اکٹھے جلد کرا لیتے اور شروع کے سفید کاغذ پر ہر رسالے کا علیحدہ علیحدہ نام لکھتے۔

کتاب کے صفحہ اول کی پیشانی پر بالعموم اپنا نام اس طرح رقم فرماتے:

مملوکہ محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

Marfat.com

اس پر بعض دفعہ مقام سکونت بھی لکھتے مثلاً ''حال وارد مسجد گنبداں والی فیروز پور۔'' گھر میں ان کی چار پائی پر بھی مختلف موضوع کی کتابیں پڑی ہوتیں اور مصلے وغیرہ پر بھی......!

۱۹۴۶ء میں ان کی مستقل سکونت تو فیروز پور ہی میں تھی، لیکن ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں چک نمبر ۴۹۳ گ ب اوڈاں والا میں چلے گئے تھے۔ وہاں ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ایک بزرگ صوفی عبداللہ مرحوم نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جس نے بہت جلد پنجاب کے دینی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ صوفی صاحب مرحوم کا تعلق جماعت مجاہدین سے تھا اور وہ دراصل وزیرآباد (ضلع گوجراں والا) کے رہنے والے تھے۔ وہاں کی کشمیری برادری سے ان کا تعلق تھا اور جماعت مجاہدین کی مشہور شخصیت مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔

صوفی صاحب مرحوم کا قائم کیا ہوا یہ مدرسہ ان کی کوشش سے وہاں سے تین میل کے فاصلے پر ماموں کانجن منتقل ہوگیا تھا۔ اس کا نام دارالعلوم تعلیم الاسلام ہے اور اس کی بہت عمدہ عمارت بہت بڑے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن صوفی صاحب کی یادگار کے طور پر یہ مدرسہ اوڈاں والا میں بھی قائم ہے اور بہت اچھے انتظامات کے ساتھ جاری ہے۔

اس وقت اس مدرسے کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں، صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ۱۹۴۶ء میں اوڈاں والا کے مدرسے کے مہتمم صوفی عبداللہ مرحوم کی دعوت پر شیخ الحدیث کی حیثیت سے اوڈاں والے گئے اور ایک سال وہاں رہے۔ ۱۹۴۷ء کے رمضان المبارک کی رخصتوں میں فیروز پور آئے تو اگست کے مہینے میں ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان معرض قیام میں آ گیا۔ اب پنجاب میں جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ سکھوں نے بالخصوص مسلمانوں پر انتہائی مظالم ڈھائے تھے۔ مولانا اپنے اہل وعیال کے ساتھ فیروز پور سے نکلے اور قصور چلے گئے۔ قصور سے گونداں والا (ضلع گوجراں والا) کا عزم کیا۔ وہاں پہلے سے ان کے جاننے والے بہت سے لوگ موجود تھے۔ ان کے گاؤں ''بھوجیاں'' سے ان کے بعض رشتے دار بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اب مولانا نے بھی اس قصبے کو اپنا مسکن بنالیا تھا، لیکن عارضی طور پر۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ فیروز پور سے جب وہ قصور پہنچے اور دیکھا کہ مشرقی پنجاب کے مختلف مقامات سے مسلمانوں کے قافلوں کے قافلے قصور پہنچ رہے ہیں تو انھوں نے کسی صورت ایک فوجی کے ہاتھ مجھے خط بھیجا۔ خط چند الفاظ پر مشتمل تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ حالات انتہائی تشویش ناک ہو گئے ہیں، تم لوگ فوراً قصور آ جاؤ۔ اس میں بالکل سستی نہ کرو۔ چناں چہ ہم ۲۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو رات کے آٹھ بجے قصور پہنچ گئے۔ ہمارے بزرگوں میں سے کوئی صاحب بھی ہمارے ساتھ نہیں گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کوئی خطرے کی بات

Marfat.com

[illegible]

کے قریب مولانا محمد علی قصوری کی قیام گاہ پر پہنچے تو [illegible] وہاں بیٹھے تھے۔ [illegible] ہوئے بیٹھے تھے۔ مولانا محمد علی نے اسی وقت [illegible] کا انتظام کر دیا۔

کئی دن ہم وہاں رہے۔ اس اثنا میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی بھی [illegible] قصور آ گئے اور ہم سے ملے۔ وہ فیروز پور اور مختلف مقامات کے دوستوں کے بارے میں فکرمند تھے اور [illegible] تلاش کر رہے تھے۔

ان دنوں قصور میں انجمن بنائی گئی تھی، جس کا کام فوج اور پولیس کی مدد سے پناہ گزینوں کو مختلف مقامات سے قصور لانا اور ان کے لیے ادھر ادھر سے سامان خورد و نوش کا انتظام کرنا تھا۔ انجمن کے نگران و سربراہ مولانا محمد علی قصوری (ایم اے کینٹب) تھے۔ انجمن کے بعض ارکان نے بہ انداز درخواست ہم سے کہا کہ چند روز کے لیے ہم اپنا ٹرک ان کو دے دیں تاکہ وہ اس کے ذریعے پناہ گزینوں کی مدد کر سکیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے اور بھی متعدد ٹرکوں اور بسوں کو اپنی تحویل میں لے رکھا تھا اور بلاشبہ یہ نیک کام تھا۔ چناں چہ ہم نے عارضی طور پر ٹرک ان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح وہاں کے ڈی ایس پی سے ہمارے مراسم قائم ہو گئے۔ وہ شریف طینت اور محنتی پولیس افسر تھا۔ لمبا تڑنگا جوان، سانولا رنگ اور چہرے پر چیچک کے داغ، باہمت اور بے خوف شخص......! اس کا نام خضر حیات تھا۔

ایک دن ہم نے اس سے کہا کہ ہمارے استاذ محترم حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب کی دو ہزار سے زائد دینی اور مذہبی کتابیں فیروز پور رہ گئی ہیں۔ اگر ان کتابوں کو یہاں لانے کا کوئی انتظام ہو سکے تو یہ علم اور مذہب کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

وہ فوراً مان گیا اور پوچھا: آپ کو ان کے مکان کا پتا ہے، اور آپ وہاں پہنچا دیں گے؟

میں نے کہا: بالکل پتا ہے اور میں وہاں پہنچا دوں گا۔

پوچھا: خود مولانا صاحب کہاں ہیں؟

Marfat.com

بتایا: وہ گوندلاں والا ضلع گوجراں والا میں ہیں۔

اس کے بعد طے پایا کہ آج ہی مغرب کے بعد ہمارے ہی ٹرک سے فیروز پور چلیں گے اور کتابیں لانے کی کوشش کریں گے۔

اس وقت دونوں ملکوں میں سامان لانے کے لیے آنے جانے کی اجازت تھی۔ ستمبر کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مغرب کے بعد آٹھ بجے کے قریب ہم قصور سے روانہ ہوئے۔ پولیس اور فوج کے چند مسلح سپاہی ٹرک میں سوار کیے۔ ڈی ایس پی اور میں اور میرے ایک عزیز میاں محمد زکریا (جو آج کل جڑاں والا میں مقیم ہیں) اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ میرے دوست محمد علی (جنھوں نے چند سال پہلے کراچی میں وفات پائی) ٹرک چلا رہے تھے۔

قصور سے فیروز پور بجانب مشرق پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ دریائے ستلج کا ہیڈ حسینی والا، ہندوستان میں شامل ہے اور سرحدی لکیر اس سے ورے یعنی قصور کی طرف ہے۔ وہاں سے فیروز پور شہر اس وقت چار میل تھا۔ اب ممکن ہے شہر کی آبادی بڑھ کر ہیڈ کے قریب آگئی ہو۔ ہم نے ہیڈ حسینی والا عبور کیا۔ پھر اس سے چار میل آگے ریلوے پھاٹک پار کر کے شہر میں داخل ہوئے تو سبزی منڈی کے سامنے ایک انسانی لاش پڑی تھی اور ہر سو کاغذات، پرانے کپڑے اور چیتھڑے سے بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ملتانی دروازے میں پاکستان اور ہندوستان کی مشترکہ فوج کے سپاہی بیٹھے تھے۔ ان کو صورت حال بتا کر ہم آگے بڑھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمام شہر پر موت کا پہرہ ہے۔ بازاروں اور گلیوں میں کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا۔ سٹریٹ لائٹ نہایت مدھم تھی۔ کسی طرف سے کوئی انسانی آواز نہیں آرہی تھی۔ اوپر اور نیچے کے مکانوں کے دروازے بند تھے۔ کہیں کتے اور بلے بھی دکھائی نہیں دیے۔

گنبدانوالی مسجد کے قریب ہم نے ٹرک کھڑا کیا۔ دو سپاہی ٹرک کے پاس رہے۔ باقی لوگ مولانا عطاء اللہ صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوئے۔ پولیس اور فوج کے مسلح سپاہی ہمارے آگے پیچھے تھے اور ان کی نظر اوپر مکانوں کے دروازوں کی طرف بھی تھی۔ ڈی ایس پی کے ہاتھ میں بھی گولیوں سے بھرا ہوا پستول تھا۔ میں نے ان کو امرتسری دروازے کے اندر باولی رام دیال میں مولانا کے مکان کے دروازے پر جا کھڑا کیا۔ آہستہ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اندر سے دروازہ بند ہے اور شاید کوئی گھرانا اس میں آبسا ہے۔ دستک دی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اب ڈی ایس پی نے پورے زور سے پاؤں مارا اور دروازہ ٹوٹ گیا۔ نہایت چوکنے ہو کر مکان کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ گھر کا سامان لٹ چکا ہے۔ کتابیں بھی نہیں ہیں، کوئی الماری بھی نہیں ہے، لیکن ادھر ادھر پھٹے ہوئے کاغذات پڑے ہیں جن سے پتا چلا کہ یہاں کتابیں تھیں، جنھیں کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔ پھر سیڑھیوں پر چڑھے اور چھت پر گئے۔ وہاں بھی نہ کوئی سامان

Marfat.com

تھا، نہ چارپائی تھی اور نہ کوئی کتاب۔ البتہ کاغذ وہاں بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ چیتھڑے سے بھی پڑے تھے۔

وہاں سے مایوس ہو کر واپس آئے تو گنبدانوالی مسجد میں داخل ہو گئے۔ دیکھا کہ الماریاں خالی ہیں اور پنکھے اور بلب وغیرہ سب لوٹے جا چکے ہیں۔ وضو والی ٹونٹیاں بھی لوگ اتار کر لے گئے ہیں۔ البتہ دو چار پرانی صفیں پڑی ہیں یا مسجد کے اندر اور صحن میں چاروں طرف بکھرے ہوئے کچھ کاغذات نظر آ رہے ہیں۔ وہاں پھرتے پھراتے گیارہ بج چکے تھے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ قصور واپس آ گئے۔

اکتوبر (۱۹۴۷ء) میں ہم اپنے موجودہ گاؤں میں جا آباد ہوئے۔ نومبر کا مہینہ تھا کہ مولانا عطاء اللہ صاحب ہمارے گاؤں گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان تھے، معلوم ہوا کہ ان کا نام محمد یحییٰ ہے۔ بعدازاں یہ مولانا محمد یحییٰ کے نام سے معروف ہوئے اور شرق پور میں مسجد اہل حدیث کے خطیب مقرر کیے گئے۔ اب انھیں مولانا محمد یحییٰ شرق پوری کہا جاتا ہے۔ صاحب تقویٰ عالم دین ہیں۔ شرق پور میں انھوں نے بڑی خدمات سرانجام دیں اور دے رہے ہیں۔

بہرکیف مولانا عطاء اللہ صاحب نومبر ۱۹۴۷ء میں ملاقات کے لیے مولانا محمد یحییٰ کے ساتھ ہمارے گاؤں گئے۔ ہمارے پاس نہ کوئی چارپائی تھی، نہ بستر تھا اور نہ برتن...... اکثر لوگوں کا یہی حال تھا۔ زمین پر کماد کی سوکھی ''پرالی'' سی بچھا کر رات کو سوتے تھے۔ ان معزز مہمانوں نے بھی اسی طرح ہمارے ساتھ رات بسر کی۔

مولانا ہمارے گاؤں کے لوگوں سے ملے تو لوگ نہایت خوش ہوئے۔ لیکن اس خوشی میں بعض لوگ رو پڑے اور روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں، سب کا دکھ ایک تھا۔

حالات کچھ بدلے تو میں گوندلاں والے گیا اور مولانا سے ملا۔ وہ درس و تدریس کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں بھی انھوں نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے سے کچھ حضرات گوندلاں والا میں میرے واقف تھے اور میرے حالات سے دلچسپی رکھتے تھے، جن میں ایک کا نام حکیم محمد ابراہیم خلیل تھا اور دوسرے ان کے عزیز مولوی محمد الیاس ندوی تھے۔ ان سے بھی ملا۔ پھر مولانا کے بعض عزیز مجھے جانتے تھے، جو اب گوندلاں والا میں آ گئے تھے۔ ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا کے ساتھ میں ان کے گاؤں بھوجیاں گیا تھا اور دو یا تین دن وہاں رہا تھا۔ اس طرح وہاں کے چند افراد سے متعارف تھا۔ اب گوندلاں والا گیا تو ان سے دوبارہ ملاقات کا موقع ملا۔

گوجرانوالا میں اپنے استاد گرامی حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دی اور انھیں سلام عرض کیا...... اس سے کچھ دن قبل کوٹ کپورے کے ایک صاحب جو آزادی کے بعد گوجراں والے چلے گئے تھے، اپنے عزیزوں سے ملنے ہمارے گاؤں گئے تو انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مولانا محمد اسماعیل صاحب

Marfat.com

سے ملے تھے اور عرض کیا تھا کہ ان کا تعلق کوٹ کپورے سے ہے۔ اس وقت حضرت مولانا نے ان سے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ اب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ تمھارے متعلق مجھے بڑی تشویش تھی اور میں نے بعض لوگوں سے تمھارے بارے میں پوچھا بھی تھا۔

چھ سات دن میں اس نواح میں رہا اور اپنے دوستوں اور تعلق داروں سے مل کر واپس اپنے گاؤں آ گیا۔

قیام گوندلاں والا کے زمانے میں مولانا عطاء اللہ صاحب نے گوجراں والا کے ڈی سی کو ہفت روزہ الاعتصام کے اجرا کی درخواست دی تھی جو منظور کر لی گئی تھی۔ ۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کو پہلا شمارہ گوجراں والا سے نکلا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی بنائے گئے تھے۔ اس کے اخراجات کی ذمے دار اس وقت گوجراں والا کی انجمن اہل حدیث تھی، جس کے صدر وہاں کے ایک بزرگ حاجی اللہ دتا، سیکرٹری عجائب گھر (لاہور) کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کے والد مکرم جناب غلام محمد ڈار اور خزانچی جناب اسماعیل ضیا (سابق ایم پی اے) کے والد محترم حاجی محمد علی تھے۔ باقی ارکان انجمن میں حضرت مولانا محمد اسماعیل، قاضی عبدالرحیم، مہر محمد وزیر، بابو نصیر الدین، منشی محمد یوسف، میاں عبداللہ اہل حدیث، سیٹھ نظام الدین، حاجی عبدالکریم، غلام رسول پنساری اور خواجہ عبدالعزیز کے نام مجھے یاد ہیں۔ انجمن کے چند ارکان اور بھی تھے لیکن ان کے اسمائے گرامی ذہن میں محفوظ نہیں رہے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد یہ اخبار مرکزی جمعیت اہل حدیث نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور وہی اس کی آمدنی اور خرچ کی ذمے دار تھی۔

۱۹۴۸ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے مولانا عطاء اللہ صاحب کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے لاہور تشریف لانے کی دعوت دی اور وہ تشریف لے آئے۔ انھی دنوں مولانا غزنوی سے مغربی پاکستان میں جماعت اہل حدیث کے نظم ونسق کے لیے ان کی گفتگو ہوئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب کے علما سے اس وقت سب سے زیادہ تعلق حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ ان کی خط وکتابت بھی رہی تھی اور آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری تھا...... کوٹ کپورے میں، مرکز الاسلام میں اور فیروز پور میں مختلف مقامات کے علمائے کرام کے جو خطوط ان کے نام آتے تھے، وہ پڑھ کر اپنی کھدر کی قمیص کی بڑی سی جیب میں ڈالتے جاتے تھے۔ اس طرح ان کی جیب اچھے خاصے ڈاک خانے کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ ان تمام خطوط کا جواب وہ جمعرات کو دیتے تھے۔ جمعرات کو دینی مدارس میں آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے، چھٹی کے بعد وہ خطوں کا جواب لکھنا شروع کر دیتے۔ اس سے فارغ ہو کر کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوتے۔ اگر کوئی خط فوری جواب کا طالب ہوتا تو اسی وقت لکھ دیتے۔

Marfat.com

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ علما سے ان کا رابطہ رہتا تھا اور وہ ان میں سے اکثر کے ڈاک کے پتوں سے آگاہ تھے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے اہل علم کے بارے میں بالخصوص انھیں دلچسپی تھی، اس لیے نظم جماعت کے بارے میں مولانا غزنوی سے اولین گفتگو انہی کی ہوئی، جس میں مقامی طور پر پروفیسر عبدالقیوم، حاجی محمد اسحاق حنیف، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد حنیف ندوی اور میاں عبدالمجید وغیرہ حضرات کو شریک مشورہ کیا گیا۔ پھر لاہور سے باہر کے حضرات میں سے مولانا محمد اسماعیل صاحب (گوجراں والا) نے مولانا سے گفتگو فرمائی اور بعدازاں ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے ہال میں پاکستان کے علماوزعما کا اجلاس بلایا گیا، جس میں دو سو سے زائد حضرات نے شرکت کی۔ ان سطور کا راقم اس اجلاس میں شامل تھا۔

اس تنظیم کا نام مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان رکھا گیا تھا، اس لیے کہ اس سے قبل مشرقی پاکستان میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مشرقی پاکستان کے نام سے تنظیم قائم ہو چکی تھی، جس کے صدر مولانا عبداللہ الکافی کو بنایا گیا تھا...... جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم منتخب کیے گئے تھے۔

اس سے کچھ مدت بعد حکومت پاکستان نے سرکاری ملازموں کے نام گشتی مراسلہ جاری کر دیا تھا کہ وہ کسی سیاسی تنظیم کے عہدے دار نہیں ہو سکتے۔ جمعیت اہل حدیث اگرچہ سیاسی تنظیم نہیں تھی، تاہم اس کے بعض ریزولیشن سیاسی نوعیت کے تھے، اس لیے پروفیسر عبدالقیوم سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے جمعیت کی نظامت سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج (لاہور) میں شعبہ عربی میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے اور اس طرح سرکاری ملازم تھے۔

ان کے بعد حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔ مگر ان دنوں حکومت نے ان کو گوجراں والا میں نظر بند کر رکھا تھا اور وہ شہر کی میونسپل کمیٹی کی حدود سے باہر نہیں نکل سکتے تھے، اس لیے ان کی جگہ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ وہ کچھ عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ پھر مولانا محمد اسماعیل صاحب کی مدت نظر بندی ختم ہوگئی تو مولانا عطاء اللہ صاحب اس عہدے سے مستعفی ہو گئے اور مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم اعلیٰ کے طور پر کام کرنے لگے۔

مجھے ۱۹۴۸ء میں جمعیت کا ناظم دفتر بنایا گیا تھا اور مولانا عطاء اللہ صاحب ہمارے گاؤں سے مجھے لے کر آئے تھے...... ہوا یہ تھا کہ گاؤں میں جو زمین ہمیں الاٹ ہوئی تھی، وہ گاؤں سے ڈیڑھ فرلانگ دور تھی اور میں نے وہاں پانی کے ''کھال'' پر ایک کٹیا سی بنالی تھی، جسے پنجابی میں ''جھگی'' کہا جاتا ہے۔ جس مکان میں ہم نے سکونت اختیار کی اس کے پانچ کچے کمرے تھے اور جو سامان اس میں پڑا تھا، وہ تھا لوہے کا ایک کڑاہا، ایک

Marfat.com

لکڑی کی کھرلی، ایک گڑ بنانے والا بیلنا، ایک لکڑی کی الماری اور ایک لکڑی کا چھوٹا سا صندوق......! یہ پانچ چیزیں تھیں جو ہمیں اس مکان سے جانے والے سکھ سے وراثت میں ملیں۔

بہر حال میں نے اپنے کھیت میں چھوٹی سی جھگی بنالی تھی اور وہیں اپنی چارپائی لے گیا تھا۔ نہری پانی وہاں عام تھا، کھیت میں دو نلکے یعنی ہینڈ پمپ تھے۔ روٹی صبح وشام گھر سے آجاتی تھی اور میں وہیں رہتا تھا۔ ہمارے مکان میں جو لوہے کا کڑاہا تھا، اس میں تین چیزیں پڑی تھیں۔ ایک ہیر وارث شاہ، ایک جپ جی اور سکھ جی صاحب جس کا اردو نظم میں ترجمہ خواجہ دل محمد نے کیا ہے۔ اور تیسری چیز تھی کالے رنگ کا جالی کا کپڑا جو چار انگلی کے قریب چوڑا اور ایک گز کے قریب لمبا ہوگا۔ یہ ایک ''پٹی'' سی تھی، جسے سکھ صاحبان داڑھی پر باندھتے اور سر پر کیسوں کے اوپر اس کی گانٹھ دے لیتے ہیں۔ یہ تینوں چیزیں میں نے بہت حفاظت سے رکھی تھیں۔ افسوس ہے داڑھی اور کیسوں پر باندھنے والا جالی کا کالا کپڑا تو کہیں گم ہوگیا (حالاں کہ عقل شکل کی رو سے زیادہ ضرورت مجھے اسی کی تھی۔ کتابوں کا کیا ہے، یہ تو پڑھتے پڑھاتے ہی رہتے ہیں۔ وہ چیز اب یہاں کہاں ملے گی) لیکن دونوں کتابیں میرے پاس محفوظ ہیں۔ قرآن مجید روزانہ صبح کے وقت پڑھنے کا اللہ کے فضل سے میں بچپن ہی سے عادی ہوں۔ اگر کسی دن کسی وجہ سے قرآن نہ پڑھا جائے تو خیال رہتا ہے کہ معلوم نہیں آج دن کیسے گزرے گا۔ میں نے قرآن مجید اور یہ دونوں کتابیں اپنی جھگی میں رکھی تھیں۔ ان کتابوں سے میں نے اندازہ کیا کہ اس مکان کا مالک کوئی پڑھا لکھا شخص تھا اور اردو جانتا تھا۔ پیسہ ویسہ ہمارے پاس کوئی نہ تھا، لیکن اس کے باوجود دوسرے دن جڑاں والا سے تانگے والے کے ہاتھ میں روزانہ اخبار منگواتا تھا، جسے دو دن پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں اتوار کی چھٹی ہوتی تھی اور اخبار پر ایک دن بعد کی تاریخ لکھی جاتی تھی۔ یہ سطور ۲۵۔ دسمبر ۱۹۹۵ء کو لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں ۲۵۔ دسمبر کے اخبار پر ۲۶۔ دسمبر لکھا جاتا تھا۔ ۱۲۔ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں نے اخبار منگوایا اور اپنے کھیت میں شیشم کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھ کر پڑھنے لگا تو حزن وملال سے چیختی ہوئی شہ سرخی سامنے کھڑی تھی۔ ''قائد اعظم محمد علی جناح انتقال کر گئے۔''

تمہید طولانی ہوگئی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ایک دن تین بجے کے قریب میں اپنے کھیت کی جھگی میں ہیر وارث شاہ پڑھ کر بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تھوڑی دیر کماد میں ''گوڈی'' دے لوں، کہ اتنے میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب تشریف لے آئے۔ پہلے وہ ہمارے گھر گئے۔ وہاں سے پتا چلا کہ میں تو ''بن باس'' یا ''کھیت باس'' ہوگیا ہوں۔ انھوں نے فرمایا، مجھے ابھی اس کے پاس پہنچاؤ۔ لیکن میرے والد اور والدہ نے ان کو روکھا سوکھا کھانا کھلائے اور موسم کے مطابق لسی پانی پلائے بغیر آنے نہیں دیا۔

وہ آئے تو میں انھیں دیکھ کر حیران ہوا اور وہ مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ

Marfat.com

مولانا محمد اسماعیل صاحب کل لاہور آئے تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی اور مجھ سے مشورہ ہوا کہ جمعیت کے دفتر میں آفس سیکرٹری کا تعین نہایت ضروری ہے تاکہ لوگوں سے روزانہ خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہے، نیز دفتر ہر روز آٹھ دس گھنٹے کھلا رہے...... پھر فرمایا کہ مولانا اسماعیل صاحب نے مجھ سے پوچھا: اسحاق کہاں ہے؟

میں نے بتایا تو مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل صاحب دونوں نے فرمایا کہ آپ ابھی اس کے گاؤں جایئے اور جس حالت میں بھی وہ ہے، اسے پکڑ کر یہاں لایئے۔ اس لیے تم ابھی تیار ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ لیکن میں اسی وقت نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے دن جانے کے لیے عرض کیا۔

وہ تو میرے اصرار کے باوجود وہاں نہیں رکے، اسی وقت لاہور کو روانہ ہو گئے، لیکن میں دوسرے دن شام کے بعد جڑاں والا سے اپنے ایک عزیز محمد زکریا کے ساتھ ٹرک پر سوار ہوا اور رات کے بارہ بجے کے قریب شیش محل روڈ پہنچ گیا۔ دوسرے دن مولانا عطاء اللہ صاحب نے مجھے مولانا محمد داؤد غزنوی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انھوں نے چند باتیں پوچھیں تو ان کے فرمان کے مطابق مولانا عطاء اللہ صاحب مجھے جمعیت کے ناظم اعلیٰ پروفیسر عبدالقیوم کے مکان پر لے گئے۔ ان سے تعارف ہوا۔ اور اس طرح مجھے جمعیت کا ناظم دفتر بنا دیا گیا۔ پھر میں لاہور آ گیا اور اس وقت سے یہاں ہوں۔ یہاں بہت کتابیں پڑھیں، بہت خریدیں، بہت سی کتابیں لوگوں کو مفت میں دیں، بہت مضامین لکھے اور بہت سے رسائل و جرائد میں لکھے، کتابیں بھی تصنیف کیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے جالی کا وہ چھوٹا سا کالا کپڑا جو میرے سکھ بھائی صاحبان داڑھی اور سر پر باندھتے ہیں، بہت یاد آتا ہے۔ مجھ سے وہ ایسا گم ہوا کہ اس کے بعد آج تک اس جیسا کپڑا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کتابیں دیکھیں، قسم قسم کے کاغذ دیکھے اور ہر روز دیکھتا ہوں، حتیٰ کہ سکھ بھی بار ہا دیکھے اور ان سے باتیں بھی کیں، لیکن وہ کپڑا نہیں دیکھا اور آئندہ دیکھنا نصیب بھی نہیں ہوگا۔ اب میں یہ کرتا ہوں کہ اس کپڑے کو دیکھنے کی ریجھ زیادہ ہی آئے تو وہ دو کتابیں دیکھ لیتا ہوں، جن کے پاس لوہے کے کڑاہے میں وہ کپڑا پڑا تھا۔

بات پھر لمبی ہوگئی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بات سکھوں کے متعلق تھی۔ جن میں ایک عرصے تک میں رہا ہوں۔

یہ بڑی دلچسپ قوم ہے۔ جس کو چمٹ جائے اسے آسانی سے چھوڑتی نہیں۔ پنجابی کی مشہور کہاوت ہے کہ "سکھ تے رچھا کو جیہے نیں۔"

میرے ایک دوست کفایت اللہ صاحب مشرقی پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ میں رہتے ہیں اور خالصتان کی تحریک کے زبردست حامی ہیں۔ لاہور تشریف لائیں تو مجھے ضرور ملتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا: آپ واقعی سنجیدگی سے خالصتان کا مطالبہ کرتے ہیں؟

جواب دیا: بالکل سنجیدگی سے۔

Marfat.com

عرض کیا: سنجیدگی دو قسم کی ہے، ایک ''سکھی سنجیدگی'' اور ایک ''حقیقی سنجیدگی۔'' آپ ان دونوں میں سے کس سنجیدگی سے بات کرتے ہیں؟

بولے: دونوں سنجیدگیوں سے!

میں نے پوچھا: اگر خالصتان بن گیا تو آپ باہر کے ملکوں سے تجارت کے لیے بندرگاہ کون سی استعمال کریں گے؟

کہا: پاکستان سے کراچی کے لیے بات کریں گے۔

میں نے کہا: اگر میں آپ کو اس کے متبادل تجویز دوں اور سمندری تجارت کے لیے آپ کو کسی کا محتاج ہونے سے بچنے کی راہ دکھاؤں تو آپ اس پر غور کریں گے؟

بولے: ضرور کریں گے۔

عرض کیا: ایسا کرو کہ مشرقی پنجاب کے تمام ندی نالوں، جوہڑوں، تالابوں، چھپڑوں، سوؤں، نہروں اور دریاؤں کے پانی اکٹھے کر کے ایک چھوٹا سا اپنا ہی سمندر بنا لو اور اس کے ذریعے تجارت کرو۔ نہ اس میں کسی کی سانجھ نہ شریکہ، نہ رولا نہ گولا، نہ جھگڑا نہ جھمیلا۔ بس آزادی سے اپنی کماؤ، کھاؤ اور موج میلا کرو۔ جتنا آپ کا خالصتان ملک ہوگا، اتنی تجارت اس کے ذریعے آسانی سے ہو جایا کرے گی۔

میری یہ تجویز سن کر پہلے تو وہ ہنسے، پھر بولے کہ ہمارے اکثر دوستوں پر خالصتان کا اتنا نشہ چڑھا ہوا ہے کہ اگر انھیں یہ تجویز پیش کی جائے تو وہ ضرور اسے مان لیں گے۔

عرض کیا: میں نے یہ تجویز ماننے کے لیے ہی پیش خدمت کی ہے۔ میرے سوا کوئی اس قسم کی تجویز یا مشورہ آپ کو نہیں دے گا۔ میں بھی یہ تجویز اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ سکھوں سے میرا مدھ قدیم کا تعلق ہے، ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی، دماغ پر سارا زور دے کر اتنی بڑی تجویز سوچنے کی۔

اپنے ان دوستوں کی سیاسی سوجھ بوجھ پر تعجب ہوتا ہے جو تحریک خالصتان کی حمایت کرتے ہیں۔ خالصتان کا قیام ایک موہوم شے ہے۔ ہندوستان ہمارے ساتھ مخالفت کی جو وجوہ بیان کرتا ہے، ان میں خالصتان کی ایک وجہ بھی شامل ہے۔ پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو وہاں کی ہندو اکثریت کی طرف سے جن اذیتوں سے دوچار کیا جاتا ہے، اس میں اس انداز سے اس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ تم پاکستان کے حامی ہو اور پاکستان سکھوں کی حمایت کرتا ہے۔ حالاں کہ ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے۔

قیام پاکستان کے زمانے میں مشرقی پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے، ان کی تفصیلات نہایت اذیت ناک اور الم انگیز ہیں اور ان کا علم انہی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو مشرقی پنجاب سے یہاں

Marfat.com

آئے اور ان مظالم کا شکار ہوئے۔ اس کے بعد سکھ صاحبان بے شک نادم بھی ہوئے لیکن یہ ندامت بعد از وقت تھی، جس کا قطعاً کوئی فائدہ نہ تھا۔

حصول آزادی کے تھوڑا عرصہ بعد خالصتان کا مسئلہ شروع ہو گیا تھا اور سکھوں کے رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے (جو آزادی سے پہلے اور تحریک قیام پاکستان کے دوران مسلمانوں کی مخالفت میں انتہا پسند ہندوؤں سے بھی آگے نکل گئے تھے) سکھوں کے لیے علیحدہ حکومت کی مہم چلائی۔ وہ ننکانہ صاحب کی یاترا کے لیے پاکستان بھی آئے۔ ان کی صاحب زادی بھی یہاں تشریف لائیں۔ ماسٹر تارا سنگھ کی موت کے بعد سنت فتح سنگھ نے سکھوں کی زمام قیادت سنبھالی، لیکن کوئی کچھ نہ کر سکا۔ اب جو حالات روز بروز پیدا ہو رہے ہیں، وہ سب کے سامنے ہیں۔ مشرقی پنجاب سمیت پورے ہندوستان میں ایک کروڑ سے زائد سکھوں کی آبادی ہے۔ ان میں سے اکثر حکومت ہند کے ساتھ ہیں۔ مشرقی پنجاب کی حکومت میں زیادہ تعداد سکھ وزیروں کی ہے۔ معلوم نہیں ان حالات میں یہ کس طرح خالصتان قائم کر سکیں گے۔ اگر قائم ہو بھی گیا تو خطرہ ہے کہ تھوڑے عرصے بعد حکومت ہند سکھوں کو پاکستان کے خلاف میدان میں لا کھڑا کرے گی اور یہ ہمارے لیے مصیبت بن جائیں گے۔ یہ جذباتی لوگ ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت واہ گرو کا نام لے کر خالصہ کس طرف کو چل جائے۔

یہاں یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ آزادی سے قبل پنجاب انتیس ضلعوں پر مشتمل تھا اور اٹک کی لہروں سے لے کر دلی کی دیواروں تک پھیلا ہوا تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں سترہ ضلعے پاکستان کے حصے میں آئے اور بارہ ہندوستان کو ملے۔ ان بارہ ضلعوں کو جو مشرقی پنجاب سے عبارت تھے، حکومت ہند نے سکھوں کا زور توڑنے اور ان کی آبادی کو منتشر کرنے کے لیے تین صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ان صوبوں کو ہریانہ، ہماچل پردیش اور پنجاب کہا جاتا ہے۔ بعد ازاں پنجاب کی ریاستوں کے ضلعے بنائے گئے تو یہ صوبہ گیارہ ضلعوں کا بنا۔ اب صوبہ پنجاب اتنا محدود ہو گیا ہے کہ واہگہ سے شروع ہو کر ہوشیار پور جا کے ختم ہو جاتا ہے۔ ان اضلاع میں بھی سکھوں کی اکثریت ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ساتھ ہے اور کم تعداد میں خالصتان کے حامی ہیں۔

ہمارا بھلا اسی میں ہے کہ ہم نہایت ادب کے ساتھ ان کو سلام کریں۔

ست سری اکال

جو بولے سو نہال

اورنگ زیب عالم گیر کو اکثر سکھ مقرر اور پرچارک ''ترنگا'' کہا کرتے تھے۔ میں بہت چھوٹی عمر کا تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ہاں سکھوں کی تنظیم ''خالصہ دل'' کا جلسہ ہوا، جسے وہ ''دیوان'' کہتے تھے۔ اس میں ایک مشہور مقرر گیانی شیر سنگھ نے بھی تقریر کی تھی۔ وہ نابینا تھے اور مجھے یاد پڑتا ہے اکالی دل کے اخبار ''اکالی'' کے

Marfat.com

ایڈیٹر تھے جو لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے تقریر میں اورنگ زیب کو خوب نشانہ بنایا تھا، اور وہ بار بار ''ترنگا'' کہہ کر اس کے ان ''مظالم'' کا ذکر کرتے تھے جو اس نے گورو کے بیٹوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔

اب سکھ صاحبان کہتے ہیں کہ وہ سب باتیں غلط ہیں۔ وہ انگریزوں اور ہندوؤں نے بنائی ہیں تاکہ سکھ اور مسلمان آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں۔

بات مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے بارے میں ہو رہی تھی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ مولانا کا ضلعی تعلق بھی گوروؤں کی نگری امرتسر سے تھا اور میں نے ۱۹۴۰ء میں ان کے ساتھ اس نگری اور دربار صاحب کے درشن بھی کیے تھے، اس لیے سکھوں کے بارے میں بات لمبی ہوگئی...... بات اگرچہ یہ بھی بے مطلبی نہ تھی، تاہم اب اس مطلب کی طرف آتے ہیں جس کا بیان ہو رہا تھا۔

لاہور تشریف لانے کے بعد مولانا عطاء اللہ صاحب نے جو خدمات سرانجام دیں اختصار کے ساتھ ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں جو امرتسر میں مدرسہ غزنویہ کے نام سے معروف تھا، تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور کئی سال اس کے شیخ الحدیث رہے۔ اس اثنا میں ان سے بہت سے علما و طلبا نے استفادہ کیا۔

۲۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں تعلیم کا آغاز لاہور میں (دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں) ہوا تھا۔ اس وقت جو اساتذہ کرام یہاں خدمت تدریس پر مامور ہوئے، ان میں مولانا عطاء اللہ صاحب بھی شامل تھے، بلکہ جامعہ کے اولیں شیخ الحدیث وہی تھے۔

۳۔ جامعہ سلفیہ اور دوسرے دینی مدارس کا حالات کے مطابق نصاب تعلیم ترتیب دینے کے لیے اہل علم کی ایک کمیٹی بنائی گئی تھی، مولانا مرحوم اس کے رکن تھے۔

۴۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ان کو صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد کا عربی میں حاشیہ لکھنے کے لیے کہا۔ یہ بہت بڑا کام تھا جو انھوں نے شروع کیا۔ اچھا خاصا کام کر لیا گیا تھا، لیکن مکمل نہ ہو سکا۔

۵۔ تعلیقات سلفیہ کے نام سے صحاح ستہ کی معروف کتاب نسائی شریف کے حواشی مکمل کیے جو خود ہی شائع کیے۔ یہ حدیث کی نہایت اہم خدمت ہے، جو انھوں نے انجام دی۔ یہ حواشی بڑے مقبول ہوئے۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ دو یا تین مرتبہ شائع ہو چکے ہیں۔

۶۔ اشاعت کتب کے لیے ایک مکتبہ قائم کرنے کی تمنا مدت سے ان کے ذہن میں کروٹ لے رہی تھی۔ چناں چہ انھوں نے مکتبہ سلفیہ کے نام سے مکتبہ قائم کیا اور اس کی طرف سے بہت سی اہم کتابیں شائع

Marfat.com

کیں، جن میں بعض عربی کتابوں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ چند اہل علم سے مصر کے ممتاز صاحب قلم ابوزہرہ کی کتاب امام احمد بن حنبل ، حیات امام ابن تیمیہ ، حیات امام ابن قیم کے اردو ترجمے کرائے اور ان کے متعدد مقامات پر حواشی لکھ کر شائع کیے۔ پھر تفسیر احسن التفاسیر چھاپی، سیرت رسول ﷺ سے متعلق الرحیق المختوم شائع کی۔ دیوان حماسہ کا ترجمہ شائع کیا، سبعہ معلقہ کی شرح اور ترجمہ شائع کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں شائع کیں۔

۷۔ تقریباً بیس سال قبل انھوں نے دارالدعوۃ السلفیہ قائم کیا تھا۔ اس کی طرف سے بھی بہت سی اہم کتابیں شائع کیں۔ ایک مدرسہ جاری کیا، جس میں بے شمار بچوں نے قرآن مجید پڑھا اور کئی بچوں نے حفظ کیا۔ ایک مسجد بنائی۔ ہفت روزہ اخبار الاعتصام بھی دارالدعوۃ السلفیہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اب اس کے صدر ان کے شاگرد مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور سیکرٹری حافظ احمد شاکر ہیں۔ اس کے ارکان میں میاں عبدالمعید، چوہدری محمد صادق، پروفیسر سعید اقبال، مولانا ابوبکر صدیق اور ان سطور کا راقم شامل ہیں۔

۸۔ ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ وغیرہ کی ہزاروں عربی، اردو اور فارسی کتابوں پر مشتمل تھا۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اس میں مزید اضافہ کیا اور بڑی محنت سے ان کتابوں کی تعداد بڑھائی۔ اس کتب خانے میں انھوں نے بڑی دلچسپی لی اور لے رہے ہیں۔ یہ کتب خانہ مولانا نے اپنی زندگی میں استفادہ کرنے والوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔

۹۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد پاکستان کی سرحد پر ہندوستان کے بعض غیر مسلموں نے وہ کتابیں لانا شروع کر دی تھیں جو بہت سے اہل علم ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نہیں لا سکے تھے اور مجبوراً وہیں چھوڑ آئے تھے۔ پھر حسن اتفاق سے ان میں سے کچھ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئی تھیں۔ وہ کتابیں پاکستان کے بعض لوگ ان سے خرید کر آگے بیچ دیتے تھے۔ مولانا اس قسم کی کتابوں کی تاک اور تلاش میں رہتے تھے۔ اگر کوئی ایسی کتاب انھیں مل جاتی جس پر اصل مالک کا نام لکھا ہوتا تو وہ اپنی گرہ سے کتاب خرید لیتے، اور اس کے مالک کی تلاش شروع کر دیتے۔ اگر وہ مل جاتا تو کتاب اسے پہنچا دیتے، اس سے قیمت وصول نہیں کرتے تھے۔

۱۰۔ ایک مرتبہ پاکستان کے کسی تاجر کتب کے پاس انھوں نے دیکھا کہ گورمکھی زبان میں چھپی ہوئی ایک بہت بڑی سی کتاب پڑی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سکھوں کی مذہبی اور مقدس کتاب گرنتھ صاحب ہے۔ انھوں نے اسے خرید کر نہایت حفاظت سے اپنے گھر میں رکھ لیا، کچھ مدت بعد سکھ آئے تو انھیں

Marfat.com

دے دیا۔ انھوں نے نہایت شکریہ ادا کیا اور اس کی قیمت دینا چاہی لیکن نہیں لی۔

کتابیں خریدنا اور پڑھنا ان کا بنیادی مشغلہ تھا۔ کتاب کی جو قیمت دکان دار نے مانگی، انھوں نے عطا فرما دی۔ اس میں کمی کا مطالبہ نہیں کرتے تھے...... پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ان کی موجودگی میں کوئی شخص کسی دکان سے کتاب خریدنے آیا، لیکن جیب کا جائزہ لیا تو اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کتاب خریدی جاسکے۔ مولانا کو اس کی مجبوری کا اندازہ ہوا تو اپنی گرہ سے قیمت ادا کر کے اسے کتاب لے دی، حالاں کہ نہ دکان دار سے ان کا کوئی تعلق ہے اور نہ کتاب خریدنے والے سے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ مولانا کے بعض اساتذہ عظام اور اکابر علمائے کرام کے صاحب زادوں نے بھی ان سے استفادہ کیا۔ مثلاً حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے بیٹے مولانا محی الدین اور معین الدین ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے۔ مولانا عطاء اللہ لکھوی کے تین بیٹے مولانا حبیب الرحمٰن، حافظ شفیق الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن ان سے مستفید ہوئے۔ مولانا فیض اللہ خاں بھوجیانی کے پوتے اور مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی کے دو صاحب زادے حافظ بشیر احمد اور حافظ شبیر احمد نے ان کے دائرہ تلمذ میں شرکت کی۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے دو نامور فرزندوں پروفیسر محمد اور حکیم محمود نے ان سے علم حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی ان کے ہاں آمد و رفت رہتی تھی۔ عیدالفطر کے بعد ایک دن مولانا ندوی نے مجھ سے کہا کہ کل مولانا عطاء اللہ صاحب سے عید ملنے چلیں گے۔ ہم وہاں پہنچے تو دس گیارہ منٹ گزر گئے لیکن مولانا نے چائے نہیں منگوائی۔ مولانا ندوی بڑے دلچسپ عالم تھے۔ بولے۔

مولانا! ابھی آپ کے روزے ختم نہیں ہوئے؟

وہ مسکرائے اور اسی وقت چائے کا آرڈر دے دیا۔

خود مولانا عطاء اللہ صاحب بھی مزاح کا ذوق رکھتے تھے۔ لطیفہ سنتے بھی تھے اور سناتے بھی تھے۔

وفات سے کئی سال پہلے ان پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا۔ بیماری کے دنوں میں بھی وہ کتابیں منگواتے رہے اور مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا۔

بیماری کے دنوں میں ان کے پوتوں...... حماد، عباد اور خلاد...... نے ان کی بے حد خدمت کی۔ یہ چھوٹی عمر کے تھے، لیکن جد امجد کے بہت بڑے خادم ثابت ہوئے۔

اس عالم کبیر نے ۲، ۳۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء (۸، ۹۔ صفر ۱۴۰۸ھ) کی درمیانی شب کو سفر آخرت اختیار کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

مولانا عبدالقدوس میواتی

۱۹۵۱ء میں مولانا محمد داؤد غزنوی نے تحصیل چونیاں (موجودہ ضلع قصور) سے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ انہی دنوں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دبلے پتلے، میانہ قد، سر پر سادہ سا کپڑا، مختصر سی داڑھی، مگر پوری یعنی تراش خراش سے مبرا۔ دھیمی آواز، نرم لہجہ، انکسار کا پیکر، تواضع کا صحیح ترین نمونہ، لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر متانت آمیز بشاشت کا غلبہ۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ان کا اسم گرامی مولانا عبدالقدوس ہے اور کوٹ رادھا کشن میں اقامت گزیں ہیں، جسے عام لوگ ''کچی کوٹھی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کا آبائی وطن ضلع گوڑگانواں ہے۔

مولانا عبدالقدوس ۱۹۰۸ء کے پس وپیش متحدہ پنجاب کے ضلع گوڑگانواں کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، جس کا نام ''گلالتہ'' ہے۔ اس علاقے کو ''میوات'' کا علاقہ کہا جاتا ہے اور وہاں کے رہنے والے ''میواتی'' کہلاتے ہیں۔ میوات کا علاقہ پسماندہ علاقہ تھا، مذہبی اور دینی اعتبار سے بھی، علمی اور مالی اعتبار سے بھی۔ یہی وہ علاقہ ہے جس میں تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس نے تبلیغ واشاعت دین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ انھوں نے دہلی میں شیخ نظام الدین اولیاؒ کی خانقاہ کو مرکز بنایا اور میوات کے علاقے میں تبلیغی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ ان کی تگ وتاز تبلیغ سے بے شمار لوگ مستفید ہوئے اور کتنے ہی دیہات اور خاندانوں کی اصلاح ہوئی۔

عبدالقدوس کی ولادت میوات کے ایک غریب خاندان میں ہوئی ابھی بچپن ہی میں تھے کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور کوئی پرسان حال باقی نہ رہا۔ یتیمی، غربت، افلاس اور بھوک نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا۔ عمر بہت چھوٹی اور مصیبتیں بہت زیادہ۔ کچھ عرصہ لوگوں کے مویشی بھی چراتے رہے۔ بے پناہ آلام کے نرغے میں آنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔ ذہن صاف رہا اور اس میں حصول علم کا جذبہ کروٹ لینے لگا۔

اس زمانے میں ضلع گوڑگانواں میں ایک عالم دین مولانا عبدالجبار سکونت پذیر تھے جو مولانا عبدالوہاب دہلوی اور مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے شاگرد تھے۔ وہ ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ مروجہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور فراغت کے بعد کچھ مدت دہلی کے مدرسہ حمیدیہ واقع موری گیٹ میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے تھے۔ یہ مدرسہ وہاں کی مشہور شخصیت حافظ حمید اللہ نے جاری کیا تھا جو دہلی میں قینچی اور سوت کے کارخانوں کے مالک تھے اور جن کی عطاء غیر مجذوذ سے کئی دینی مدرسے اور علمی ادارے مستفید ہو رہے تھے۔

Marfat.com

مولانا عبدالجبار کئی سال آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے شعبہ تبلیغ سے بھی منسلک رہے تھے۔ ۱۹۳۰ء یا اس سے کچھ پہلے اپنے آبائی مسکن ''سوکھپوری'' آگئے تھے جو ضلع گوڑگانواں کا ایک اچھا خاصا قصبہ ہے، وہاں طلبا کو دینی علوم پڑھانا شروع کیے۔ لیکن بعدازاں مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی انھیں اپنے قصبے موضع ''شکراوہ'' لے گئے تھے۔ شکراوہ میں طویل عرصے تک خدمت تدریس میں مشغول رہے اور پھر اسی قصبے کی نسبت سے مولانا عبدالجبار شکراوی کے طور پر شہرت پائی۔ ۱۹۷۶ء میں ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس بیماری کی وجہ سے بہت کمزور ہوگئے تھے۔ مگر اس کے باوجود تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۲۳۔ نومبر ۱۹۸۵ء کو وفات پائی۔

عبدالقدوس نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوگئے۔ یہ ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس ہوگی۔ ان سے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ اس راہ میں کچھ قدم آگے بڑھے تو مولانا عبدالحکیم بلند شہری سے رابطہ پیدا ہوگیا۔ وہ عالم بھی تھے اور عامل بھی اور حسن اخلاق کی نعمت سے مالا مال بھی۔ عبدالقدوس کئی سال ان کی خدمت میں رہے۔ ان کی تعلیم وتربیت سے ان کا ذہن بالکل بدل گیا۔ ان کے دامن عقیدت سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے بیٹے کا نام بھی انھی کے نام پر عبدالحکیم رکھا۔

مولانا عبدالجبار اور مولانا عبدالحکیم سے استفادے کے بعد مزید تعلیم کے لیے دہلی کا عزم کیا اور وہاں کے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کی، جن میں مدرسہ رحمانیہ، مدرسہ عالیہ فتح پوری اور مدرسہ سعیدیہ شامل ہیں۔ ان مدارس میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول اور دیگر علوم کی تحصیل کی۔ یہاں کے اساتذہ میں مولانا احمد اللہ پرتاب گڈھی، مولانا شرف الدین دہلوی، مولانا عبیداللہ رحمانی اور مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی رحمۃ اللہ علیہم ایسے جلیل القدر حضرات شامل تھے، جن کے سامنے انھوں نے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ ان حضرات کی تقویٰ شعاری، زہد وعبادت اور طریق تدریس سے وہ نہایت متاثر ہوئے۔ اور طلبا کے ساتھ ان بزرگوں کو جو قلبی لگاؤ تھا، اس نے ان کے ذہن وفکر پر خاص طور سے اثر ڈالا۔ شکراوہ میں تحصیل علم کے زمانے میں مولانا حکیم عبدالشکور سے بھی انھوں نے حصول فیض کیا۔ اس طرح انھیں کئی اساتذہ سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اسی زمانے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام اور کام سے آگاہ ہوئے۔ اسی عہد میں ان کی تصنیفات کے مطالعے کا موقع ملا اور ان کے معلومات کی فراوانی اور بوقلمونی نے ان کے ذہن وفکر پر خاص طور سے اثر ڈالا۔

وہ زمانہ بھی عجیب تھا اور حالات کی رفتار بھی کچھ دوسرے انداز کی تھی۔ ہندو، سکھ، عیسائی، مسلمان، مرزائی۔ پھر ہندوؤں میں مختلف فرقے اور مسلمانوں میں متعدد افکار کے حامل لوگ۔ ان سب میں باہم مناظروں، مباحثوں اور مجادلوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دوسرں کے مذاہب ومسالک کے متعلق کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ تنقیدات ہوتی تھیں۔ جلسے منعقد کیے جاتے تھے اور لوگ بڑے شوق اور دلچسپی سے ان میں حصہ لیتے تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری چوں کہ مناظرات ومباحث میں سب سے اگلی صف کے عالم تھے اور

Marfat.com

اس باب میں ایک خاص ڈھنگ کے موجد اور حامل تھے، اس لیے لوگ انتہائی شوق و توجہ سے ان کی بات سنتے تھے، مولانا عبدالقدوس کو بھی ان سے تعلق خاطر تھا اور وہ بدرجہ غایت عقیدت و احترام سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مولانا ان کے علاقہ میوات میں تشریف بھی لے گئے تھے اور وہاں کے عام جلسوں میں ان کی تقریریں بھی ہوئی تھیں، اس بنا پر بھی وہ ان سے علاقہ قرب رکھتے تھے۔

۱۹۳۲ء کے قریب انھوں نے درس نظامیہ سے فراغت پائی اور اپنے علاقے کی درس گاہ شکراوہ میں جہاں خود اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا، خدمت تدریس انجام دینے پر مامور ہوئے۔ اسے علاقہ میوات کی مرکزی درس گاہ کی حیثیت حاصل تھی، اور شاید یہی اس زمانے میں اس نواح کی اولین درس گاہ تھی۔

درس و تدریس کے علاوہ قیام شکراوہ کے زمانے میں دو کام انھوں نے اور کیے جو اس وقت نہایت اہم تھے۔ اس کی ضروری تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:

۱۔ شکراوہ اور اس کے قرب و جوار کے بعض دیہات میں مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعداد محدود بھی تھی اور غیر منظم بھی۔ مولانا عبدالقدوس نوجوان تھے اور پرجوش اور باہمت بھی تھے۔ اچھے مقرر اور واعظ بھی تھے۔ علاقہ میوات کی انجمن اہل حدیث کا انھیں ناظم بنایا گیا۔ وہ گاؤں گاؤں گھومے، وعظ کیے، تقریریں کیں اور مسلمانوں میں جو غیر اسلامی رسوم، رواج پذیر ہو چکی تھیں اور غمی شادی کے مواقع پر ان میں جو ہندووانہ طریقے رائج ہو چکے تھے، انھوں نے میٹھے اور نرم انداز میں ان کی نشان دہی کی اور لوگوں کو کتاب و سنت کے احکام کی روشنی میں اپنا سفر حیات طے کرنے کی تلقین کرنے لگے۔ ان کی فروتنی، خاکساری اور وعظ و تبلیغ کے دھیمے اسلوب کی وجہ سے لوگوں نے ان کی طرف رجوع کرنا اور ان کی باتیں سننا شروع کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مقامات پر اصلاح کی نہایت عمدہ فضا تیار ہوگئی اور اسلام کے سادہ اور آسان احکام کو عوام مرکز توجہ قرار دینے لگے۔

۲۔ وعظ و تقریر کے علاوہ انھوں نے تحریری کام بھی شروع کر دیا تھا۔ جس طرح انھیں زبان پر قدرت حاصل تھی، اسی طرح اللہ نے ان کو قلم سے کام لینے کا ملکہ بھی عطا فرما دیا تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی سے پتا چلتا ہے کہ ان کا زاویہ فکر یہ تھا کہ اسلام کی اشاعت زبان سے بھی میٹھے الفاظ میں کرنی چاہیے اور تحریر میں بھی ہاتھ نرم رکھنا چاہیے۔ جو شخص میٹھے بول سے آشنا نہیں اور نرم لہجے میں بات کرنے کا سلیقہ نہیں رکھتا، وہ بڑا عالم تو ہو سکتا ہے، کامیاب مبلغ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مبلغ کے لیے شرط اولین عذوبت لسان اور نرمی گفتار سے بہرہ مند ہونا ضروری ہے، جو شخص اس صفت سے محروم ہے، وہ میدان تبلیغ کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اسلام، سلامتی اور امن کا مذہب ہے، سختی اور خشونت کا مذہب نہیں۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا عبدالقدوس نے اس علاقے اور زمانے کے حالات کے مطابق تقریری

Marfat.com

کام بھی کیا اور تحریری بھی......! اپنے عہد کے بعض اخبارات وجرائد میں مضامین لکھے اور ہلکے پھلکے انداز میں لوگوں کو راہ مستقیم پر لانے کی کوشش کی۔ بعض مسائل کے متعلق چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے اور شائع کیے۔ مثلاً اس زمانے میں دیہات میں جمعہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کا مسئلہ بڑے زور سے چل رہا تھا۔ مولانا موصوف علمائے کرام کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جن کے نزدیک قرآن وحدیث کی روشنی میں دیہات میں جمعہ پڑھنا ضروری ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس موضوع پر ایک رسالہ تحریر فرمایا جس کا نام تھا افتراض المجمعته فی القری۔

سات آٹھ سال وہ شکراوہ میں رہے۔ اس کے بعد اپنے گاؤں گلالتہ آ گئے۔ گلالتہ میں شکراوہ کی طرح تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ تدریس کا کئی سالہ تجربہ انھیں حاصل تھا اس لیے اس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔ گلالتہ میں اپنی درس گاہ کا نام ''دارالحدیث محمدیہ'' رکھا تھا۔

وہ اللہ پر بھروسا کرنے اور بھروسا رکھنے والے عالم دین تھے۔ جو کام کیا، اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا، دنیا کے لالچ اور روپے پیسے کی حرص کو کبھی ان کے دل کے دروازے پر پہنچنے کی جرات نہیں ہوئی۔ وہ سات آٹھ سال شکراوہ میں پڑھاتے رہے۔ یہ ان کی تدریس کا ابتدائی زمانہ تھا، اس وقت بھی انھوں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی، دین کی خدمت کو مقدم گردانا۔ مدرسے کے اصحاب انتظام نے جو دیا لے لیا۔ اگر نہیں دیا یا کسی وجہ سے نہیں دے سکے تو مانگا نہیں۔ اسی طرح گلالتہ میں دارالحدیث محمدیہ قائم کیا تو اس میں پہلا درجہ طلبا کو اور اس کے مدرسین کو حاصل رہا۔ اپنی ذات کو پیچھے رکھا۔ فقر ودرویشی ہمیشہ ان کے ہم رکاب رہی اور اسی کو اپنی اصلی متاع قرار دیا۔

آزادی وطن کے بعد پاکستان آ گئے اور ضلع قصور کے ایک قصبے کوٹ رادھا کشن میں سکونت اختیار کی۔ وہ نہایت نامساعد بلکہ حوصلہ شکن حالات تھے، اس کے باوجود اللہ پر توکل کر کے یہاں بھی درس گاہ جاری کر لی اور اس کا وہی پرانا نام ''دارالحدیث محمدیہ'' رکھا۔ چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا تھا، لیکن اس کی تہہ میں چوں کہ رضائے الٰہی کا بیج ڈالا گیا تھا اور اس پر اخلاص کی کھاد کی بھرمار کی گئی تھی، اس لیے بہت جلد یہ پودا تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا اور اس کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور طلبا کی اچھی خاصی تعداد وہاں جمع ہو گئی، جن کو وہ خود بھی تعلیم دیتے تھے اور چند اساتذہ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔

سادگی اور فروتنی ہمیشہ ان کے ساتھ رہی۔ پاکستان آنے کے بعد بڑے بڑے لوگوں کے ذہن بدل گئے تھے اور دنیوی مفادات اپنی تمام جاذبیت اور کشش کے ساتھ ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ بہت سے علمائے کرام بھی اس بہتی گنگا میں ڈبکیاں لینے لگے تھے۔ لیکن مولانا عبدالقدوس نے اپنی پرانی وضع قائم رکھی۔ ان کی جو عادات واطوار آزادی سے قبل تھیں، وہی آزادی کے بعد رہیں۔

طلبا سے ان کو انتہائی محبت تھی۔ ان کے مدرسے میں جو طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے، ان پر وہ بڑی

Marfat.com

شفقت فرماتے تھے، یعنی وہ شفیق استاذ اور رحم دل معلم تھے۔ طلبا کے مقابلے میں اپنی ضرورت کو وہ پس پشت ڈال دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ طلبا ان کا انتہائی احترام کرتے تھے۔

جس زمانے میں یہ فقیر ہفت روزہ الاعتصام کی خدمت ادارت پر مامور تھا، وہ جب بھی لاہور تشریف لاتے مجھے ضرور یاد فرماتے۔ ان کی میٹھی میٹھی باتیں سکون قلب کا باعث بنتیں۔ ان کے بعض مضامین بھی الاعتصام میں شائع ہوئے جو اپنے انداز کے اچھے مضامین تھے۔

جماعت کے اکابر علما سے ان کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا حافظ محمد گوندلوی، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کا وہ انتہائی احترام سے تذکرہ کرتے تھے۔ یہ حضرات بھی ان کے مقام و مرتبے کے مطابق ان کی تکریم فرماتے تھے۔

انھوں نے جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کیا گیا، بے حد غربت بھی دیکھی اور عزت واکرام کا دور بھی دیکھا۔ ہر حال میں شاکر وصابر رہے اور خشیت الٰہی کا عاطفہ ہر موقعے پر ان کے حریم قلب میں موجود رہا۔ طبیعت کی جو نرمی ابتدائی دور زندگی میں تھی، دور آخر میں بھی اس سے متصف رہے۔ تمام علما وزعما انھیں محترم گردانتے تھے۔ کوٹ رادھا کشن اور اس کے قرب وجوار میں بھی ان کی توقیر کی جاتی تھی اور لوگ عزت سے پیش آتے تھے۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو اللہ نے ان کو مرحمت فرمایا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ ان کا خلوص، ان کا انکسار اور خدمت دین کا جذبہ تھا۔

فقہیات میں وہ مسلک اہل حدیث کے حامل تھے اور عمر بھر اس کی تبلیغ کو اپنا مطمح نظر ٹھہرائے رکھا۔ لیکن ان کا انداز تبلیغ منفی نہیں تھا، مثبت تھا، یعنی وہ کسی کے مسلک فقہی پر اس انداز سے تنقید نہیں کرتے تھے کہ اس کے جذبات مجروح ہوں اور وہ ذہنی اذیت میں مبتلا ہو، بلکہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جو بات مبنی برصحت ہوتی، اس کی وضاحت فرماتے اور لوگوں کو اس کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کرتے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔

مہمان نوازی اور خدمت خلق کے اوصاف سے بھی اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ جو شخص ان کے وہاں جاتا، وہ عالم ہوتا یا غیر عالم، اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور اپنی حد میں رہتے ہوئے اس کی خدمت کرتے۔ بلکہ بعض دفعہ تو ان کے انداز گفتگو اور اظہار انکسار کی بنا پر شرم سی محسوس ہونے لگتی۔

ایک دفعہ ان سے ملنے کو جی چاہا اور میں کوٹ رادھا کشن گیا۔ دس بجے کے قریب ان کے مدرسے پہنچا، وہ طلبا کو درس دے رہے تھے۔ میں ایسی جگہ جا کر بیٹھ گیا، جہاں وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ درس سے فارغ ہوئے تو اٹھ کر سلام کیا، میری اچانک آمد پر نہایت خوش ہوئے اور دعا دی۔ کھانا کھلایا اور مدرسے کی عمارت دکھائی، جس صورت میں مدرسہ چل رہا تھا، اس کے متعلق بعض باتیں بتائیں۔ تین چار گھنٹے وہاں رہا۔ اجازت لے کر چلنے لگا تو اپنے

Marfat.com

صاحب زادے پروفیسر عبدالحکیم سیف کو بس سٹینڈ تک میرے ساتھ بھیجا اور ان کے کان میں کوئی بات کہی۔

کان میں کیا بات کہی؟

اس کا پتا اس وقت چلا جب انھوں نے لاہور جانے والی بس پر مجھے بٹھایا اور کرایہ کنڈیکٹر کو دیا۔ میں نے ہر چند روکنے کی کوشش کی، لیکن میری بات نہیں مانی گئی۔

اس مخلص ترین عالم دین نے ۲۶۔مئی ۱۹۷۸ء کو جمعے کے روز نماز فجر ادا کرتے ہوئے وفات پائی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

مجھے پتا چلا تو اس سے اگلے جمعے تعزیت کے لیے حاضر ہوا، پروفیسر عبدالحکیم سیف صاحب سے اظہار حزن وملال کیا اور جمعے کی نماز وہیں پڑھی۔ شام کو لاہور واپس آ گیا۔

اس وقت عبدالحکیم صاحب کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے سامنے دو راستے تھے، ایک یہ کہ مدرسہ بند کر دیں جو ان کے والد مکرم نے جاری کیا تھا اور خود کالج کی ملازمت کرتے رہیں۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ کالج کی ملازمت ترک کر دیں اور اپنے باپ کے جاری کیے ہوئے مدرسے کو قائم رکھنے کا عزم کر لیں۔ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور مدرسے کے قیام کو بنیادی اہمیت دی۔ چناں چہ مدرسہ جاری ہے اور کامیابی سے چل رہا ہے۔

اس مدرسے کے لیے انھوں نے پاکستان کے معروف عالم اور بہترین مدرس مولانا محمد صادق خلیل کی خدمات بھی حاصل کیں۔ وہ کئی سال وہاں رہے اور بہت سے طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کے زمانے میں بھی مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔

مولانا محمد صادق خلیل ایک عرصے تک اوڈاں والا ضلع فیصل آباد میں خدمت تدریس پر مامور رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد، راولپنڈی اور دارالعلوم رحمانیہ لاہور میں بھی مسند تدریس پر فائز رہے ہیں۔ وہ منجھے ہوئے مدرس ہیں اور درسیات پر انھیں عبور حاصل ہے۔

درس وتدریس کے ساتھ ساتھ ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ بہت اچھے مصنف اور مترجم ہیں۔ رواں دواں زبان میں عمدہ اسلوب سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں۔ عربی میں کئی علمی کتابوں کے ترجمے کیے اور خود ہی ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ یہ کتابیں مذہبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں اور شوق سے پڑھی گئیں۔

فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کے قریب ان کی سکونت ہے اور اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے بہت بڑا کتب خانہ قائم کیا ہے، جس سے ہر شائق تحقیق استفادہ کر سکتا ہے۔

مولانا محمد صادق خلیل کا ذکر یہاں ضمناً آ گیا تھا۔ اصل تذکرہ مولانا عبدالقدوس کا ہو رہا تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے وہ بہت سے اوصاف حمیدہ کے حامل عالم دین تھے۔

Marfat.com

مولانا عبدالخالق قدوسی

۱۹۶۶ء میں لاہور کی چینیاں والی مسجد کے منصب خطابت پر مولانا محمد اسحاق رحمانی فائز تھے۔ ان کا وطنی تعلق تو پتوکی کے ایک نواحی گاؤں ''گوہڑ'' سے تھا، لیکن کچھ عرصے سے وہ لاہور میں مقیم تھے۔ بڑے ملنسار، خراج، دوست دار اور دوست نواز تھے۔ ان کا مکان مسجد کے قریب ہی تھا۔ ایک دن شام کے وقت میں ان سے ملنے گیا تو حسب معمول نہایت شفقت سے پیش آئے۔ ایک اور صاحب ان کے پاس بیٹھے تھے، انھوں نے بھی اپنی نشست سے اٹھ کر بڑے احترام سے میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے، قدرے چھوٹا قد، درمیانے درجے کی سیاہ داڑھی تراش خراش سے محفوظ، سنت رسول ﷺ کے مطابق ٹخنوں سے اونچی شلوار، سر پر ٹوپی، چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ، رحمانی صاحب نے تعارف کرایا، یہ ہیں مولانا عبدالخالق قدوسی۔ یہ ان کی بھری جوانی کا وقت تھا، اور ان کی جوانی تمام آلائشوں سے بے خبر اور اپنی عمر کے ''ضروری تقاضوں'' سے ناآشنا تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس قسم کی جوانی کو عرف عام میں بے شک بڑھاپے کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن بارگاہ خداوندی میں اصل قدر ومنزلت اسی کو حاصل ہے۔

در جوانی توبہ کر دن شیوہ پیغمبری

بوڑھا ہو کر تو انسان خود بخود توبہ کے دروازے پر آ گرتا ہے کہ اس وقت سوائے توبہ کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ قویٰ جواب دے جاتے اور قوت عناصر ختم ہو جاتی ہے۔ بقول غالبؔ

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

وارث شاہ نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

بڈھا ہو کے چور مسیت وڑدایا رل پھردا نال مداریاں دے

اللہ! اللہ! کس درجے فرشتہ خصال تھا یہ شخص کہ جس کے اسلوب حیات کی ہر ادا سے خیر جھلکتی تھی اور نیکی ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھی۔

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

اب لوگوں کی آنکھ حیا سے خالی ہو گئی ہے اور دنیا والوں کے دل سے غیرت کا مادہ نکل گیا ہے۔ اس لیے خیر وشر کے درمیان خط امتیاز کھینچنا مشکل ہے۔ بہر حال جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس وقت چینیاں

Marfat.com

والی مسجد میں دینی علوم کا ایک مدرسہ جاری تھا۔ اس مدرسے میں مولانا عبدالخالق قدوسی خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔ ۸۰ روپے ان کا مشاہرہ تھا۔ مشہور ناشر و تاجر کتب شیخ محمد اشرف مرحوم اس مسجد کی انجمن کے سیکرٹری تھے، اس حیثیت سے مدرسے کا انتظام شیخ صاحب کے سپرد تھا۔

یہ پہلی ملاقات جو آج سے تیس برس قبل عبدالخالق قدوسی سے میرے ایک ہم نام دوست کے گھر ہوئی، جلد ہی گہرے تعلقات میں بدل گئی۔ اس ملاقات سے انیس بیس برس بعد تک وہ زندہ رہے، اس اثنا میں طرفین کا سررشتہ مراسم روز بروز مستحکم ہوتا چلا گیا۔

قدوسی صاحب کا مولد ''کوٹ رنجیت سنگھ'' تھا جو ضلع شیخوپورہ کا ایک گاؤں ہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی طرف منسوب ہے۔ شیخوپورہ سے بذریعہ سڑک گوجراں والا جائیں تو بجانب شمال یہ گاؤں دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ اس گاؤں میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی غلام محمد تھا اور وہ مولوی غلام محمد کے نام سے معروف تھے۔ نہایت پرہیزگار اور متدین بزرگ تھے۔ خاندانی پیشہ موچی تھا، لیکن کاشت کاری کا کام بھی ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ ہاتھ سے چمڑے کی بڑی خوب صورت جوتیاں بناتے تھے۔ دور دور سے لوگ جوتیاں بنوانے آتے۔ اس علاقے میں ان جیسا کوئی اور کاری گر نہ تھا۔ ان کی دین داری اور تقویٰ شعاری کی وجہ سے گاؤں کی مسجد اہل حدیث کی امامت و خطابت کی ذمے داری وہاں کے لوگوں نے انھی کے سپرد کر رکھی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں وہ کچھ عرصہ جیل میں بھی رہے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ اسلام میں پیمانہ خیر پیشہ نہیں، تقویٰ اور دین داری ہے۔ اگر کسی کا دل تقوے کے زیور سے مزین ہے اور اس کا باطن پرہیزگاری کی دولت سے مالا مال ہے تو وہ بارگاہ خداوندی میں انتہائی اونچے فرازوں پر متمکن ہے، ورنہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ کتنے ہی محدثین و فقہا کے بارے میں ہم تاریخ کی کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ گزراوقات کے لیے جو پیشہ انھوں نے اختیار کیا، وہ ان کے نام کا جز قرار پا گیا، کوئی جوتیاں بناتا ہے تو نعال کہلایا، کسی نے تنور میں روٹیاں پکانے کا کام شروع کیا تو اسے خباز کہا جانے لگا اور کسی نے تیل بیچنے کی دکان کھولی تو لوگوں نے اسے زیات کہا۔ کوئی پانی پلاتا ہے تو اسے سقاء سے پکارا گیا۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں آپ نعال کو بوٹ فروش یا شومیکر کہیں گے، خباز کو ہوٹل کا مالک قرار دیں گے۔ جن لوگوں نے پٹرول کے پمپ لگا رکھے ہیں وہ زیات ہوں گے۔ مختلف قسم کے مشروبات تیار کرنے والوں کو سقاء سے تعبیر کریں گے۔ بدمذاقی کی انتہا ہے کہ چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے کو از راہ حقارت موچی، تیلی، ماشکی، جولاہا کہا جائے اور کام بڑھ جائے تو اسے کارخانہ دار، مل اونر، پٹرول پمپ کا مالک اور ٹیکسٹائل ملز، ہوٹل اور فلور ملز کا مالک کہا جائے۔

Marfat.com

قدوسی صاحب کا خاندان ابتدا میں معتقد قبور تھا اور اس کے افراد میلوں اور عرسوں پر دکانیں لگاتے، باقاعدہ شدرحال کر کے اس قسم کے اجتماعات میں شرکت کرتے۔ مولانا نور حسین گرجاکھی کی تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ مولوی غلام محمد اور ان کے بھائی عامل کتاب وسنت ہوئے۔ مولانا نور حسین گرجاکھی جماعت اہل حدیث کے ممتاز واعظ اور مبلغ تھے۔ وہ اکثر شیخوپورہ آیا کرتے تھے۔ قدوسی صاحب کے والد مولوی غلام محمد سے ان کے بڑے قریبی مراسم تھے۔ قدوسی صاحب کے والد پنجابی میں شاعری کرتے تھے اور اچھا شعری ذوق رکھتے تھے۔ مولانا نور حسین بھی پنجابی کے شاعر تھے۔ ان کے بیٹے مولانا خالد گرجاکھی کی شادی مولانا عمر الدین صاحب کی بیٹی سے ہوئی جو کہ قدوسی صاحب کے استاد تھے اور ان سے مولوی غلام محمد کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا نور حسین جب بھی دھیرداڈوگراں آتے تو چند میل کے فاصلے پر کوٹ رنجیت سنگھ بھی آتے اور اپنے دوستوں سے ملتے۔ مولوی غلام محمد صاحب کے مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ جب کبھی لاہور آتے تو مولانا کی خدمت میں ضرور حاضری دیتے۔

بات عبدالخالق قدوسی کی ہو رہی تھی۔ بچپن میں ایک مرتبہ ان کو سخت بیماری نے آ گھیرا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ بہت علاج کرایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عورتیں اکثر ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوتی ہیں، ایک عورت نے یہ مشورہ دیا کہ بچے کو فلاں درخت کے نیچے نہلاؤ، حضرت صاحب کی توجہ سے بچہ درست ہو جائے گا، لیکن قدوسی صاحب کے والدین اس وقت پختہ عقیدے کے حامل ہو چکے تھے، نہ مانے۔ کہنے لگے جس نے دیا ہے وہی جانے۔ اپنے رب پر توکل کا صلہ یہ ملا کہ ان کے بیٹے کی بیماری ختم ہو گئی اور وہ اپنے تمام بہن بھائیوں سے زیادہ صحت مند ہو گیا۔

قدوسی صاحب بچپن ہی سے اپنے ہم عمروں سے مختلف تھے۔ کہتے ہیں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ کچھ ایسا ہی عالم ہمارے اس دوست کا تھا۔ ان کے دیگر بھائی مویشیوں کے لیے کھیتوں سے چارہ کاٹ کر لاتے اور انھیں کھلاتے لیکن قدوسی صاحب ان کاموں سے گریزاں رہتے۔ جب انھیں چارہ کاٹنے میں بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کو کہا جاتا تو کہتے کہ میں نے پڑھنا ہے، یہ کام نہیں کرنا۔ دوراندیش باپ نے اپنے بیٹے کے یہ اطوار دیکھے تو ارادہ کر لیا کہ بیٹے کو بہر صورت تعلیم دلائی جائے۔ چناں چہ انھوں نے تعلیم حاصل کی اور اس شان سے حاصل کی کہ حق ادا کر دیا۔

انھوں نے عمر کی کچھ منزلیں طے کیں اور شعور نے تھوڑی سی انگڑائی لی تو گاؤں کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ پرائمری تک کا مرحلہ بڑی کامیابی کے ساتھ طے کیا۔ مزید تعلیم کے لیے باپ کا ارادہ بیٹے کو ہائی سکول میں داخل کرانے کا تھا، لیکن بیٹے کا ذہن اس تعلیم سے آمادۂ مصالحت نہ ہوا۔ وہ دینی اور مذہبی تعلیم

Marfat.com

حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اب والد نے ان کو طبیب بنانے کی کوشش کی اور اس کے لیے قریب کے ایک گاؤں ''دھیرداڈوگراں'' چھوڑ آئے۔ وہاں ایک بزرگ مولوی عمرالدین فروکش تھے جو اس نواح کے اچھے طبیب بھی تھے اور دینی علوم کے شناور بھی۔

قدوسی صاحب علم طب کے حصول کی غرض سے ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے تو استاد کو پتا چلا کہ لڑکا دینی علوم سے بہرہ ور ہونے کا آرزومند ہے۔ چناں چہ انھوں نے صرف ونحو وغیرہ کی ابتدائی کتابیں پڑھانا شروع کر دیں۔ یہ سلسلہ تعلیم چوں کہ شاگرد کے طبعی رجحان سے ہم آہنگ تھا، اس لیے وہ نہایت شوق اور لگن سے یہ کتابیں پڑھنے اور ان کے مطالب سمجھنے لگے۔

مولوی عمرالدین بے شک محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے اور قدوسی صاحب بھی انہماک اور دل لگی سے تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن یہ کوئی خاص مدرسہ نہ تھا اور طلبا بھی ادھر کا رخ نہ کرتے تھے۔ بس چند لڑکے تھے جو مولوی صاحب موصوف کے زیرنگرانی بعض کتابیں پڑھتے تھے۔ لہٰذا قدوسی صاحب کا دل وہاں ٹکا نہیں، وہ چاہتے تھے کہ یہاں کے تنگ ماحول سے نکل کر کسی وسیع فضا میں جائیں، جہاں طلبا اچھی خاصی تعداد میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرتے ہوں۔ مولانا عمردین صاحب نے بھی حوصلہ افزائی کی اور جھوک دادو (نزد تاندلیاں والا) جانے کی ترغیب دلائی۔

قدوسی صاحب نے اپنے والد سے کہا لیکن وہ نہ مانے۔ ان کا دل نہ چاہتا تھا کہ اپنے لاڈلے بیٹے کو نظروں سے دور بھیجا جائے۔ مولوی عمردین کے مدرسے سے تو روزانہ آنا جانا ہو جاتا تھا، دور جانے کی صورت میں کئی مہینوں بعد بیٹے کی صورت دیکھنا پڑتی۔

قدوسی صاحب کے والد نے دھیرداڈوگراں سے کسی صاحب سے نو (۹) روپے لینے تھے۔ اس زمانے میں ۹ روپے کی بڑی اہمیت تھی۔ انھوں نے یہ رقم وصول کرنے کے لیے قدوسی صاحب کو بھیجا۔ قدوسی صاحب نے وہ پیسے وصول کیے اور فیصل آباد کی بس پر بیٹھ کر جھوک دادو، میاں محمد باقر صاحب کے پاس چلے گئے۔ اب گھر والے سخت پریشان...... والدہ چارپائی سے لگ گئیں...... سب بھائی اور والد اپنے بیٹے کو تلاش کر رہے ہیں۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ قریب کے دینی مدارس میں بھی پتہ کیا۔ مولوی عمردین صاحب سے بھی پوچھا لیکن کئی دنوں تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔ آخر قدوسی صاحب نے جھوک دادو سے خط لکھا اور اپنی اطلاع دی۔ مگر اس کارڈ پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ صرف ڈاک خانے کی مہر ہے اور اس پر ۱۸۔ مارچ ۱۹۵۵ء کی تاریخ ہے۔ یعنی تقریباً یہ ۴۱ سال قبل کی بات ہے۔ زمانہ بچپن کا یہ خط لفظ بہ لفظ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

از جھوک دادو ۷۸۶ بسوئے رنجیت کوٹ

جناب ابا جان

السلام علیکم کے بعد عرض یہ ہے کہ میں باخیریت ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتا ہوں۔صورت احوال یہ ہے کہ میں اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہوں اور گناہ معاف کرنا نہایت احسان ہوگا۔اور میں بہت اچھی درس میں پڑھتا ہوں۔آپ فکر کوئی نہ کریں اور نہ میرے پیچھے آویں۔ میں ان شاء اللہ بڑی عید کو آوں گا۔اس کے علاوہ پڑھائی اور منجی بسترا اور روٹی کا بہت اچھا انتظام ہے۔کوئی فکر نہ کرنا۔اگر خط پانا ہوتو پا دیں۔

ابا جان، بابا جان، بھائی نور محمد، محمد یعقوب......وغیرہ کو السلام علیکم اور تمام گاؤں کو۔

تاکید ہے کہ میرے پیچھے آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور خط پاتے رہنا با تاکید۔اور پھر میں معافی مانگتا ہوں نہایت عاجزی سے۔

میرا پتہ

جھوک دادو چوک ۴۲۷، ڈاک خانہ تاندلیاں والا، تحصیل سمندری، ضلع لائل پور

پاس طالب علم عبدالخالق

سچی بات یہ ہے کہ ''نیک مطلوب چاہتا ہوں'' سے لے کر ''خط پاتے رہنا'' تک تمام مندرجات خط لطف دے گئے۔ابتدائی دور کا انداز تحریر عام طور سے دلچسپ ہوتا ہے۔

جھوک دادو اگرچہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، لیکن نیک لوگوں کا مسکن اور پڑھے لکھے افراد کا مرجع ہے۔یہ گاؤں ضلع فیصل آباد میں منڈی تاندلیاں والا کے قریب ہے۔جس زمانے کی ہم بات کر رہے ہیں، اس زمانے میں وہاں ایک بزرگ میاں محمد باقر سکونت پذیر تھے جو اس علاقے کی ''طور'' برادری سے تعلق رکھتے تھے۔مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد مکرم حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے مرید اور شاگرد تھے۔اللہ نے اک علم کی دولت سے بھی نوازا تھا اور عمل کی نعمت سے بھی سرفراز کیا تھا۔انھوں نے اپنے گاؤں (جھوک دادو) میں ایک دینی و مذہبی مدرسہ جاری کر رکھا تھا، جس میں بہت سے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے اور کئی فاضل اساتذہ خدمت تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے۔قدوسی صاحب نے بھی حصول علم کے لیے یہیں ڈیرے ڈال دیے۔

دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور طریق تدریس سرکاری درس گاہوں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔درجات تعلیم اور جماعتوں کا سلسلہ ان کا اپنا وضع کردہ ہے، جس کی روشنی میں اساتذہ تدریسی گاڑی کو ایک خاص رفتار کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔قدوسی صاحب جھوک دادو گئے تو مدرسے کے مہتمم میاں محمد باقر نے ان سے کہا کہ انھیں پہلی جماعت (یا پہلے درجے) میں داخل کیا جائے گا، لیکن قدوسی صاحب کا اصرار تھا کہ

Marfat.com

انھیں دوسری جماعت میں داخل کیا جائے۔ مہتمم صاحب اس کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے کہ ان کے جانے سے پہلے دوسری جماعت کے طلبا اپنے نصاب کا کافی حصہ پڑھ چکے تھے۔ آخر اس شرط پر انھیں دوسری جماعت میں داخل کر لیا گیا کہ آئندہ امتحان میں اگر کامیاب نہ ہوسکے تو پہلی جماعت میں واپس جانا پڑے گا۔ قدوسی صاحب نے یہ شرط منظور کی اور محنت سے پڑھنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ امتحان میں اپنی جماعت میں اول رہے۔

اس مدرسے میں کچھ عرصہ انھوں نے نہایت تنگ دستی اور پریشانی کی حالت میں گزارا۔ وہ گھر میں کسی کو بتائے بغیر وہاں گئے تھے۔ صرف نو روپے نقد ان کے پاس تھے اور کپڑوں کا وہی جوڑا تھا، جو پہن رکھا تھا۔ اسے پانچ چھ دن کے بعد دھو کر پہن لیتے تھے...... ان کی محنت اور حصول علم کے شوق کی وجہ سے مدرسے کے اساتذہ اور مہتمم ان سے بہت خوش تھے۔ یہ بھی وہاں کے ماحول اور طریق تعلیم سے مطمئن تھے اور اس کا وہ انتہائی اچھے الفاظ میں تذکرہ کیا کرتے تھے، بالخصوص میاں محمد باقر کے تدین وتقوے سے بہت متاثر تھے۔

میاں محمد باقر صاحب مرحوم ومغفور سے ان سطور کے راقم کو بھی نیازمندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ واقعی ان کا درجہ ولی اللہ کا تھا۔ اس مرتبے کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ میاں صاحب مرحوم کے چار بیٹے تھے۔ حافظ محمد زکریا، مولانا حمزہ، مولانا عتیق اللہ اور چوتھے کا نام غالباً صہیب تھا۔ صہیب کے علاوہ باقی تینوں بیٹے اصحاب علم تھے۔ یہ سب حضرات یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ صہیب عالم دین تو نہ تھے، مگر بہت نیک تھے۔ زمین وغیرہ کا انتظام انہی کے سپرد تھا۔

جھوک دادو میں قدوسی صاحب نے مولانا عبدالرشید اور میاں محمد باقر صاحب کے صاحب زادے مولانا عتیق اللہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔

یہاں ان کی ابتدائی تعلیم کے سلسلے کی خود ان کی اپنی تحریر درج کر دی جائے تو بات بالکل پکی ہوجاتی ہے۔ ان کی ایک بوسیدہ سی کاپی ہمیں ملی ہے، جس میں بہت سی باتیں درج ہیں، ان میں ایک ۲۔ مئی ۱۹۵۷ء کی تحریر ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ

۱۔ شیخوپورہ میں ماسٹر مرزا صاحب سے اردو کی پہلی جماعت پڑھی۔

۲۔ ماسٹر ابراہیم سے اردو کی دوسری جماعت پڑھی۔

۳۔ ماسٹر محمد صاحب سے تیسری اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

۴۔ پانچویں جماعت کا آغاز ماسٹر محمود صاحب سے کیا تھا، لیکن بعد میں شاہ صاحب ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے آئے تو ان سے پانچویں جماعت کی تکمیل کی۔

قدوسی صاحب لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کا نام انھیں یاد نہیں رہا۔

Marfat.com

۵۔ اس زمانے میں ان کے گاؤں کوٹ رنجیت سنگھ کے امام مسجد حافظ فقیر اللہ تھے، قدوسی صاحب بیان کرتے ہیں کہ ان سے انھوں نے اردو کی بعض کتابیں پڑھیں اور قرآن مجید بھی پڑھا۔

۶۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس کے بعد انھیں دینی علوم کے حصول کا شوق پیدا ہوا تو والد صاحب انھیں ''ڈھیر دا ڈوگراں'' چھوڑ آئے جوان کے گاؤں سے تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں محدود سے پیمانے پر مولانا عمرالدین صاحب کا سلسلہ تدریس جاری تھا۔ وہاں انھوں نے ابواب الصرف کے بیس باب یاد کیے۔ صرف بھائی پڑھی اور قانونچہ کھیوالی کے دس بارہ اوراق پڑھے۔ فقہ کی مالا بدمنہ پڑھی۔ شکرستان حصہ اول ودوم اور کلید مصادر کے چند اوراق پڑھے۔

اس سے پانچ مہینے بعد جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ چلے گئے۔ وہاں میاں محمد باقر کے صاحب زادے مولانا عتیق اللہ سے مالا بدمنہ کے آخری بیس پچیس اوراق اور مصدر فیوض کے چند اوراق پڑھے۔ شیخ سعدی کی کتاب بوستان ان سے شروع کی۔ حافظ بنیامین صاحب سے جو قدوسی صاحب کے بے تکلف دوست تھے، مضاعف اور مہموز کے تمام ابواب یاد کیے۔ یہ وہی حافظ بنیامین صاحب ہیں جو آج کل جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں شیخ الحدیث کے منصب عالی پر فائز ہیں۔ مولانا عبدالرشید سے (دینی مدارس کے نصاب کی) دوسری جماعت کی کتابیں پڑھیں اور یہ کل کتابیں سولہ تھیں۔ ترجمہ قرآن مجید (چند سپارے) بلوغ المرام، القراۃ الرشیدہ (حصہ اول ودوم) نحو میر، زرادی، عربی کا معلم (حصہ دوم وسوم) ضریری وغیرہ۔

۲۲۔ جون ۱۹۵۶ء کو فیصل آباد (امین پور بازار) کی جامع مسجد اہل حدیث میں نماز جمعہ کے بعد مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جامعہ سلفیہ کی افتتاحی تقریب سے خطاب کیا۔ ان کے خطاب سے جامعہ سلفیہ کے درجہ ثانویہ کا افتتاح ہوا۔ جامعہ سلفیہ کے قیام کے ساتھ ہی میاں محمد باقر صاحب نے مولانا محمد حسین طور کی خدمات جامعہ سلفیہ کو منتقل کر دیں اور ساتھ ہی اپنے مدرسے میں اول اور دوم آنے والے طلبا کو بھی جامعہ سلفیہ کے حوالے کر دیا۔ قدوسی صاحب اول آئے تھے، اس لیے وہ جامعہ سلفیہ کے پہلے سال کے طالب علم ہوئے۔ وہاں پہلے سال مولانا محمد صدیق لائل پوری مرحوم سے معاشرتی علوم، علم الصیغہ، رحمتہ للعالمین وغیرہ کتابیں شروع کیں لیکن کوئی کتاب بھی پوری نہ پڑھی جا سکی، اس لیے کہ مولانا محمد صدیق زیادہ تر جلسوں میں شرکت فرماتے اور جامعہ سلفیہ سے باہر رہتے تھے، تدریس کا تسلسل جاری نہیں رہتا تھا۔

مولانا محمد اسحاق چیمہ بھی اس زمانے میں وہاں پڑھاتے تھے، ان سے شرح مائتہ عامل شروع کی، لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ وہ بہت اچھے مدرس تھے، لیکن ان کی اصل توجہ اپنے کاروبار کی طرف تھی، تدریس سے

Marfat.com

زیادہ تعلق نہیں رکھتے تھے۔

مولانا محمد حسین سے گلستان سعدی، دس پارے کا ترجمہ۔ فصول اکبری، مشکوۃ شریف جلد اول تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا عبدالحی سے یہ کتابیں پڑھیں: القراۃ الرشیدہ حصہ سوم وچہارم اور ھدایۃ النحو۔

قدوسی صاحب زمانہ طالب علمی سے ہی عربی زبان وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اپنے مضمون ''امام محمد گوندلوی اور جامعہ سلفیہ'' میں لکھتے ہیں۔

> مولانا عبدالغفار حسن جامعہ سلفیہ میں تشریف لائے تو اپنی فطری شرافت اور مقناطیسی شخصیت سے ماحول کو اچھا خاصا متاثر کیا۔ حضرت حافظ صاحب کی پیدا کردہ روحانی فضا کو مزید گہرا کیا اور اس کے ساتھ آپ نے لڑکوں میں عربی ادب کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں طلبہ کے اندر عربی زبان کے ساتھ اچھی خاصی مناسبت پیدا ہوگئی۔ طلبہ نے ایک مجلس بھی قائم کی جس کا نام الحفلۃ الادبیۃ تجویز ہوا۔ میں اس کا پہلا سیکرٹری جنرل تھا۔ اس مجلس کے اسبوعی اجلاس ہوتے جن میں طلبہ صرف عربی زبان میں تقریریں کرتے اور عام طور پر مولانا عبدالغفار حسن ہی اس کی صدارت کرتے۔

اس زمانے میں قدوسی صاحب عربی شاعری بھی کرنے لگے تھے جو کہ اسی مجلس کے سامعین کے سامنے پیش کی جاتی۔ اس دور کی یادگار ان کی ایک عربی نظم درج ذیل ہے جو تقریب بخاری کے موقع پر ۱۹۶۰ء میں انھوں نے کہی۔

الترحیب لضیوف الجامعة

مرحبا اهلا وسهلا یا ضیوف الجامعة — رام ظلکم علینا ما بقینا قائمین

انتم الا علون ما دمتم علی دین حنیف — عاملین بالکتاب فی الحدیث راغبین

قد قذفتم کل رای والقیاس الزائغ — لما سمعتم ما یقول رحمة للعالمین

انما هذا الذی جاء بکم فی الجامعه — لما دعونا کم فجئتم بالخلوص مسرعین

ما هنا شئی من الدنیا یرادرقبة — انما فیها علوم دینیة للمسلمین

یقرء القرآن فیها والصحاح اللامعه — والعلوم العقلیه والنقلیه للصالحین

قد اشرقت انوار ها بین الآفاق کلها — ولی ظلام البدعة والمحثون هاربین

لما تلائی شمسها نصف النهار لامعه — جاء الطلاب کلها من قطر قاصدین

Marfat.com

هو شیخنا شید المشائد الاتقیاء والا صفیاء بـحر العلوم کلها هو قدوة للسالکین
اسـمــه اسـم نبینـا اخلاقـه اخلاقـه فـاق الانـام کلها ما مثله فی العالمین
الیـوم ما من عالم الا استفاد من علمه امـام الانـام کلها ما مثله فی العالمین
قـال الـقدوسی شاکرا انه من خدامه حـمـدا کثیـرا طیبـا لله رب العالمین

قدوسی صاحب کی اس دور کی ایک اور نظم بھی ان کے کاغذات سے ملی ہے۔ یہ نظم انھوں نے آل پاکستان اہل حدیث کانفرنس پتوکی کے موقع پر کہی تھی، لیکن اس وقت یہ کانفرنس منعقد نہیں ہوسکی تھی۔ انعقاد سے چند گھنٹے پیشتر حکومت نے روک دی تھی۔

الخطاب

ایهـا الاخـوان جیؤا کل حین مرحبا مرحبا اهلا وسهلا یا اخلاء مصطفی
انتم الا علون ما لمتم علی دین حنیف فائزین فی القیامة ظاهرین فی الوریٰ
قـد قـذفـتـم کل رای والقیاس الزائفا فــاتـبـعـتـم مـا یقول خـاتم الانبیـاء
قـد اضـاتـم دینکم لها ضبت انواره بلغ العلی من جهدکم ارکانه فوق السما
لـمـا ارادا الملحدون ان یزیلوا نوره بالقوا ضب قد قنفتم کلهم تحت الثریٰ
لم تخافوهم وان کانوا ملوکا فی الوریٰ عصبة من قومکم غلبت علی آلافها
ربما ربطتم فی سبیل اللّٰہ من افراسکم ربــما فذوتم فی سبیله بالصوارم قاطعا
ربـمـا با قلام والسنة دفعتم محدثین ولو اعلیٰ ادبارها لما راو کم فی الوغیٰ
والـمـنـکـرین لسنة خیر الانام کلها لـم یلبثوا قدا مکم ولو اعلیٰ اعقابها
کان الجهاد بالسیوف والاسنة ذا بلذ والسهائم نا فنز من وقتکم فی ما مضی
معشر العلماء هبوا ودفعوا عن دینکم انـه صـار رمیتـه یـرهـی الیه من یشا
واترکوا تفریقکم قوموا علی دین وحید وامر وابالعرف وانهوا ما نهاه المصطفیٰ

جامعہ سلفیہ میں اپنی تعلیم کے دوسرے سال کو وہ "عام الفتن" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہاں وہ اس کی وضاحت نہیں کرتے۔ اس کی وضاحت انھوں نے اپنے مضمون "امام محمد گوندلوی اور جامعہ سلفیہ" میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> مولانا محمد صدیق اور مولانا محمد حسین طور کی وجہ سے تاندلیاں والا کے کافی لڑکے جامعہ میں اکٹھے ہوگئے، جس کی وجہ سے طلبا میں علاقائی تعصب پیدا ہوگیا۔ طلبہ کے دو گروہ ہوگئے اور بعض اساتذہ بھی اس میں ملوث ہوگئے۔ بدویت اور حضریت کی جاہلانہ بحثیں عام ہونے لگیں بلکہ

Marfat.com

ایک دفعہ اس موضوع پر بڑے لڑکوں میں مناظرہ بھی ہوا جس میں بدویت کی فضیلت میں متنبّی کا یہ شعر پڑھا گیا جو مجھے اب تک یاد ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية وفي البدوة حسن غير مجلوب

اس کے جواب میں شہریت کی فضیلت میں سورۃ یوسف سے والذی جاء بکم من البدو پڑھا گیا۔

جامعہ سلفیہ سے ۲۹۔اپریل ۱۹۵۸ء (۹۔شوال ۱۳۷۷ھ) کو وہ دوبارہ جھوک دادو چک نمبر ۴۲۷ گ ب کے مدرسے میں چلے گئے۔

وہ لکھتے ہیں کہ ابتدا میں صحت بہت خراب ہوگئی تھی، جس سے بہت (علمی) نقصان ہوا، وہاں کا پانی ان کو موافق نہیں آیا۔ فرماتے ہیں مدرسے کے مہتمم میاں محمد باقر ہیں جو استاد پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کے شاگرد ہیں اور اپنے زمانے کے ولی اللہ مانے جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ مدرسے کا باورچی نہایت ہی بدخلق ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بچائے۔

اس مرتبہ انھوں نے جن اساتذہ سے جو کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ وہیں کے ایک عالم مولانا محمد حسین طور (مرحوم) سے ترمذی شریف پڑھی۔ علاوہ ازیں یہ کتابیں بھی انھی سے پڑھیں۔ شرح وقایہ، شرح تھذیب، شرح نخبۃ الفکر، اصول شاشی، مقامات اور تلخیص العقائد کی تکمیل حافظ مختار احمد سے کی۔ الفیہ مولانا محمد یعقوب سے پڑھا جو ان دنوں وہاں شیخ الحدیث تھے۔

۵۔شعبان ۱۳۷۸ھ مارچ ۱۹۵۹ء کو سالانہ امتحان ہوا تو مجموعی طور سے ۸۳ فی صد نمبر حاصل کیے اور مدرسے میں اول رہے۔

یہاں وہ تھوڑا عرصہ ہی رہے۔ پھر فیصل آباد جا کر جامعہ سلفیہ میں داخل ہوگئے۔ فیصل آباد کو اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں کیا گیا تھا۔ ان دنوں وہ لائل پور تھا، یعنی غیر مسلم۔ سمندر پار کا ولایتی عیسائی۔ کسی زمانے میں پنجاب کا انگریز لیفٹیننٹ گورنر لائل کے نام سے موسوم تھا۔ یہ شہر اسی نے ۱۸۹۸ء میں قائم کیا تھا، جو اسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اسلام کا یہ اسمی یا رسمی بوجھ اس کے سر پر ضیاء الحق کے زمانے میں لادا گیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر اس کی تاریخ ضیائی مارشل لا کے دور میں بگاڑی گئی۔ مقصد غالباً سعودی عرب کی حکومت کو خوش کرنا تھا کہ ہم نے اپنے اتنے بڑے شہر کا نام اس کے حکمران کے نام پر رکھا ہے۔

ہمارے متعدد مقامات کو بعض مسلمان حکمرانوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، مثلاً قذافی سٹیڈیم، استنبول چوک، انڈونیشیا کے مرحوم حکمران سکارنو کے نام سے بھی ایک چوک یا سڑک موسوم ہے۔ معلوم نہیں ہمارے کسی حکمران یا شہر کے نام پر بھی کسی مسلمان ملک میں کسی شہر یا سڑک کا نام رکھا گیا ہے یا نہیں۔ یہ

Marfat.com

سخاوت اور دریا دلی غالباً ہمارے ہی حصے میں آئی ہے کہ اپنے ملک کے مقامات کی تاریخ بگاڑو، اس کا جغرافیہ ختم کرو اور دوسروں کے نام روشن کرو۔ میرے خیال میں نیکی اور سخاوت کی یہ یک طرفہ ٹریفک چل رہی ہے۔

فیصل آباد کے نام کی نسبت یہ جملہ معترضہ اثنائے کلام میں آ گیا تھا۔ بات قدوسی صاحب کی ہو رہی تھی کہ وہ حصول تعلیم کے لیے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں داخل ہو گئے اور وہاں انھیں تیسرے درجے یا تیسری جماعت میں داخل کر لیا گیا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ دینی مدارس کا نصاب تعلیم بالعموم آٹھ درجوں یا آٹھ جماعتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یعنی اگر طالب علم نے کسی مدرسے میں داخلہ لینے سے پہلے قرآن مجید اچھی طرح پڑھا ہو، تھوڑی بہت اس کے مطالب سے بھی شناسائی ہو، اردو زبان سے بھی دلچسپی ہو اور اسے صحیح تلفظ کے ساتھ روانی سے پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو، لکھنا بھی جانتا ہو تو باقی مروجہ علوم جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، صرف ونحو، معانی وبیان، عربی ادبیات وغیرہ شامل ہیں۔ عام طور سے آٹھ سال میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ اسے ''درس نظامی'' کہا جاتا ہے۔ مختلف مدارس کے نصاب تعلیم میں فرق بھی ہوتا ہے، کسی مدرسے میں بعض علوم کی کچھ کتابیں زیادہ پڑھائی جاتی ہیں، کسی میں کم۔

بہرحال قدوسی صاحب ڈیڑھ یا دو سال جامعہ سلفیہ میں رہے۔ چوتھی جماعت کا امتحان دیا تو جامعہ کے ارباب انتظام نے ابتدائی جماعتوں کی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا اور فیصلہ کیا کہ یہاں صرف انتہائی درجوں کے طلبا کو داخل کیا جائے گا۔

دراصل اپریل ۱۹۵۵ء میں جامعہ سلفیہ کا قیام اسی لیے عمل میں لایا گیا تھا کہ اس میں فارغ التحصیل مختی طلبا کو پڑھایا جائے گا اور اس انداز سے ان کی تربیت کی جائے گی کہ وہ مستقبل میں بہتر مدرس و معلم اور اچھے مصنف و مترجم بن سکیں۔ لیکن ابتدا میں اس منصوبے پر عمل نہیں ہو سکا۔ ہر قسم کے طالب علموں کو داخل کر لیا گیا تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ چالیس سال گزر جانے کے باوجود اب بھی اس کے مقصد قیام کی طرف توجہ مبذول نہیں فرمائی گئی۔

جامعہ کے اصحاب حل وعقد کے اس فیصلے کے بعد قدوسی صاحب کا وہاں تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ رہا تو وہ دوبارہ جھوک دادو چلے گئے۔ وہاں ایک سال قیام پذیر رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے جن اساتذہ کرام سے حصول علم کیا، وہ تھے مولانا محمد حسین، مولانا مختار احمد اور مولانا محمد یعقوب۔ یہ تینوں بزرگ دینی نصاب کے بہت اچھے معلم تھے اور بڑی جانفشانی سے فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔

قدوسی صاحب کی ایک تحریر ملی ہے جس کا تعلق رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ (اپریل ۱۹۵۷ء) سے ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ میں نے مندرجہ ذیل غیر درسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ

Marfat.com

ابتدا ہی سے ان کا مطالعاتی رجحان کیا تھا۔

۱۔ تراجم علماء حدیث ھند	مولانا ابو یحیٰ امام خان نوشہروی
۲۔ البشریٰ	
۳۔ ذکر الٰھی	امام ابن قیم، ترجمہ حافظ محمد زکریا
۴۔ ۱۸۵۷ء کے مجاھد	غلام رسول مہر
۵۔ اسوۂ صحابہ	حصہ اول
۶۔ اسوۂ صحابہ	حصہ دوم
۷۔ سیرت ثنائی	عبدالمجید سوہدروی
۸۔ دین اسلام	چوہدری افضل حق
۹۔ آزادی ھند	چوہدری افضل حق
۱۰۔ افادات ابن تیمیہ	ترجمہ حافظ محمد زکریا
۱۱۔ سلطان صلاح الدین (ایوبی)	رشید اختر ندوی
۱۲۔ ختم نبوت	حافظ محمد گوندلوی
۱۳۔ برزخ اور عذاب قبر	
۱۴۔ زندگی	چوہدری افضل حق
۱۵۔ سرگزشت مجاھدین	غلام رسول مہر
۱۶۔ امام ابن تیمیہ	محمد یوسف کوکن عمری

قدوسی صاحب ابتدا ہی سے نیک اطوار، سنجیدہ طبیعت اور کم گو تھے۔ تعلیم کے علاوہ کسی معاملے سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ اکثر اپنے چہرے پر رومال لٹکا کر رکھا کرتے تھے۔ مولانا یعقوب صاحب ان پر بہت زیادہ شفقت کرتے تھے۔ ان کی کم سن بیٹی قدوسی صاحب کو ماموں کہتی تھی۔ ایک دن کہنے لگی ماموں! آپ دلہن ہیں جو چہرہ چھپائے رکھتے ہیں۔ مولانا محمد یعقوب نے سنا تو مسکراتے ہوئے کہا: یہ تو قدوسی ہے، قدوسی صفت لڑکا ہے۔ پھر انھوں نے ان کو ''قدوسی'' کے لفظ سے پکارنا شروع کر دیا اور بعد ازاں یہ لفظ ان کے نام کا ایک مستقل جز قرار پا گیا اور وہ قدوسی کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ اب یہ نسبت ان کے بیٹوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ یعنی یہ اس نسبت کے وارث قرار پا گئے ہیں۔ اسے ان کی جاگیر سمجھ لینا چاہیے۔

جھوک دادو میں کچھ عرصہ قیام کے بعد قدوسی صاحب نے پھر جامعہ سلفیہ کا عزم کیا اور وہاں درس

Marfat.com

نظامیہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔۱۹۶۲ء میں جامعہ سے انھیں سند فراغت عطا ہوئی۔اس کے بعد مزید حصول علم کے لیے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا،لیکن مولانا محمد اسماعیل صاحب نے (جو اس وقت جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ تھے) انھیں اس ارادے کو عملی شکل دینے سے روک دیا اور فرمایا کہ پاکستان میں رہ کر خدمت دینی سرانجام دینی چاہیے۔اس زمانے میں مدینہ یونیورسٹی کو قائم ہوئے تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا۔اس لیے وہاں تعلیم حاصل کرنے میں بڑی کشش تھی۔ایک دفعہ قدوسی صاحب کی بیٹی نے اس بات کا اظہار کیا کہ اگر مولانا سلفی آپ کو مدینہ یونیورسٹی جانے کی اجازت دے دیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔قدوسی صاحب نے اس پر ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ مولانا اسماعیل سلفی میرے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتے تھے،ان کا فیصلہ ٹھیک تھا۔

چناں چہ ۱۹۶۳ء میں وہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کی قائم کردہ درس گاہ ''مدرسہ محمدیہ'' (گوجراں والا) کے منصب تدریس پر فائز ہو گئے۔ساتھ ہی گوجراں والا کی نواحی بستی ''کھوکھرکی'' میں جمعہ پڑھانا شروع کر دیا۔کھوکھرکی کے علاوہ کچھ مدت گوجراں والا اور شیخوپورہ کی بعض مسجدوں میں بھی وہ خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔۲۹۔اپریل ۱۹۶۵ء کو ان کی شادی ہوئی۔بارات میں مولانا محمد اسماعیل اور بعض دیگر علما بھی شامل تھے۔نکاح مسنونہ مولانا اسماعیل صاحب نے پڑھایا۔بارات جب شیخوپورہ سے لاہور روانہ ہونے لگی تو گاؤں کے بعض لوگوں نے کہا عبدالخالق کی بارات میں اہل حدیث جماعت کا بادشاہ آیا ہے۔۳۰۔اپریل ۱۹۶۵ء (یکم محرم ۱۳۸۴ھ) کو قدوسی صاحب کا ولیمہ تھا۔

۱۹۶۶ء کے آغاز میں گوجراں والا کی سکونت ترک کر کے لاہور آ گئے اور چینیاں والی مسجد کے مدرسے میں تدریس وتعلیم کے فرائض انجام دینے پر مامور ہوئے۔کچھ مدت یہ سلسلہ جاری رہا۔اس زمانے میں اس مسجد کے مستقل خطیب مولانا محمد اسحاق رحمانی تھے۔وہ کسی عارضے میں مبتلا ہوئے تو ان کی جگہ کچھ عرصہ خطابت کا فریضہ بھی ان کے سپرد رہا۔

انہی دنوں چینیاں والی مسجد کا خطیب علامہ احسان الٰہی ظہیر کو مقرر کیا گیا۔قدوسی صاحب کے ان سے مراسم پیدا ہو گئے تھے۔اسی مسجد میں انھوں نے مکتبہ قدوسیہ کے نام سے کتابوں کی خرید وفروخت کا کام شروع کر دیا جو ان کے رجحان طبعی کے عین مطابق تھا۔بعدازاں یہ مکتبہ شیخ محمد اشرف کے اشرف پریس (واقع ایبک روڈ) میں منتقل کر دیا گیا۔چند مہینے مکتبہ قدوسیہ کشمیری بازار میں بھی قائم رہا۔کراچی بھی وہ قیام پذیر رہے۔وہاں جماعت اہل حدیث کے ایک مدرسے میں پڑھاتے بھی تھے اور ساتھ ہی کتابوں کی تجارت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

بعدازاں وہ پھر لاہور آ گئے۔اب لاہور میں انھوں نے مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی تھی اور مکتبہ

Marfat.com

قدوسیہ کے نام سے اردو بازار میں کتابوں کی نشرواشاعت اور خرید وفروخت کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا تھا۔ یہ ان کا پیشہ بھی تھا اور ان کے ذوق طبع اور شوق علم سے ہم آہنگ بھی تھا۔

ابتدا میں پولیس چوکی کے سامنے کربلا گامے شاہ کے قریب مکتبہ قائم کیا گیا تھا اور میرے تعلقات کا اصل آغاز ان سے یہیں ہوا تھا اور یہیں ان تعلقات میں استحکام پیدا ہوا تھا۔ بعدازاں یہ مکتبہ اردو بازار کی غزنی سٹریٹ میں رحمان مارکیٹ میں منتقل ہوگیا تھا، اب بھی وہیں ہے۔ جس طرح بلی اپنے بچوں کی ابتدائی عمر میں انھیں ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل کرتی رہتی ہے اور سات گھروں کی سکونت کے بعد ان کی مستقل سکونت کا اہتمام کرتی ہے، اسی طرح قدوسی صاحب بھی اپنے مکتبہ قدوسیہ کو کندھوں پر اٹھائے مختلف مقامات میں گھومتے رہے۔ پھر اسے مستقل طور سے رحمان مارکیٹ میں جا رکھا۔

وہ تحقیقی ذوق کے عالم دین تھے اور اپنے مسلک میں بڑے پختہ...... کسی معاملے میں جو رائے قائم کر لیتے، اس پر جم جاتے۔ رائے بھی اپنے علم ومطالعہ کی روشنی میں قائم کرتے تھے۔ ادھر ادھر کی سنی سنائی باتیں ان کے اطمینان قلب کا باعث نہیں بنتی تھیں۔ نقد وجرح اور بحث وتکرار کی بھی عادت تھی اور اس میں بعض دفعہ بہت آگے بڑھ جاتے تھے۔ اس کی انھیں پروانہ ہوتی تھی کہ سامنے کون ہے اور وہ کس سے پنجہ آزمائی کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی دو مثالیں عرض کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ ایک مشہور وممتاز عالم کے بعض افکار سے مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم نے اظہار اختلاف کیا تو تاؤ میں آگئے، لیکن مولانا مرحوم ان کی افتادِ طبع سے واقف تھے، اس لیے خاموش رہے۔ وہ کئی دن اکیلے بل کھاتے رہے، مگر سمت مخالفت سے کوئی جواب نہ آیا تو چپ ہوگئے۔

مارچ ۱۹۸۴ء میں ہندوستان کے معروف عالم ومصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی لاہور تشریف لائے۔ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا معراج الحق بھی ان دنوں لاہور میں تھے۔ ۲۵۔ مارچ کو مولانا عطاء اللہ حنیف نے ان کو اپنے ادارے ''دارالدعوۃ السّلفیہ'' (شیش محل روڈ) میں چائے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں مولانا محمد حنیف ندوی، مکتبہ رشیدیہ کے مالک حافظ عبدالرشید، ڈاکٹر منیر احمد مغل، پروفیسر ڈاکٹر حمید یزدانی اور مولانا عبدالخالق قدوسی بھی شامل تھے۔ ان سطور کا راقم بھی موجود تھا۔

یہ ایک دلچسپ مجلس تھی، جس میں زیادہ باتیں معزز مہمان مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کیں۔ انھوں نے اپنے سعودی عرب کے زمانہ قیام کے بعض واقعات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک دن وہاں کے مشہور عالم جناب شیخ عبدالعزیز باز کا ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس میں ان لوگوں کو کافر قرار دیا گیا تھا جو زمین کو متحرک مانتے ہیں۔ یہ مضمون پڑھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ سائنس کے اس دور میں یہ بات مشاہدے میں

Marfat.com

آ چکی ہے اور علم الیقین کے درجے کو پہنچ گئی ہے کہ زمین ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے، لیکن شیخ ممدوح اسے متحرک ماننے والوں پر کفر کا دعویٰ لگا رہے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ چناں چہ اس مسئلے پر گفتگو کے لیے انھوں نے شیخ ممدوح سے وقت لیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خیر و عافیت کے ابتدائی کلمات کے بعد اس مضمون کا ذکر ہوا تو شیخ کے چہرے پر تعجب کے آثار ابھر آئے کہ ایک عالم دین ہونے کے باوجود یہ زمین کے متحرک ہونے کے قائل ہیں۔

مولانا نے فرمایا: بات آگے چلی تو انھوں نے نہایت ادب سے شیخ کی خدمت میں عرض کیا کہ زمین کے غیر متحرک یا ساکن ہونے کی آپ کے پاس کون سی ایسی وزنی دلیل ہے، جس کی بنا پر اپنے نقطہ نظر سے اختلاف کرنے والوں کی آپ برملا تکفیر کر رہے ہیں۔

شیخ نے جواب میں سورہ بقرہ کی یہ آیت پڑھی:

﴿وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ (البقرہ: ۳۶)

''اب تمھیں زمین میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔''

قرآن کی اس آیت کی رو سے شیخ عبدالعزیز بن باز نے فرمایا کہ اگر زمین متحرک ہو تو ہم کیسے زمین پر چل پھر سکتے ہیں اور کس طرح سکون سے زندگی بسر کر سکتے ہیں؟

مولانا اکبر آبادی نے بتایا کہ اس کے جواب میں انھوں نے شیخ سے عرض کیا کہ یہ بات اللہ نے قرآن میں اس طرح بھی بیان فرمائی ہے کہ ہم نے زمین کو تمھارے لیے جائے قرار اور فرش بنایا۔ اس قسم کی تمام باتوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ جن چیزوں پر سکون و اطمینان سے چلا پھرا جا سکتا ہے، ان میں آج کل کے بحری اور سمندری جہاز بھی ہیں جو پانی کی سطح پر تیرتے ہیں، اور ہوائی جہاز بھی ہیں جو فضا میں اڑتے اور ہزار ڈیڑھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہیں، اور لوگ ان میں بالکل اطمینان سے چلتے پھرتے بھی ہیں اور آرام بھی کرتے ہیں۔

اس موقعے پر مولانا عبدالخالق قدوسی نے مولانا اکبر آبادی سے کہا کہ شیخ ابن باز کی بات صحیح ہے کہ زمین ساکن ہے، اگر زمین متحرک ہو تو وہ سارا کاروبار ہی ختم ہو جائے جو اس پر ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ واضح طور سے زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کناں ہیں۔

مولانا اکبر آبادی نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ ہر بات الفاظ کے ظاہری معنوں میں نہیں لی جاتی۔ اردو کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس میں دوست سے مخاطب ہو کر کہا گیا ہے کہ تم نے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ہے...... ظاہر ہے کہ اس سے لوہے کی زنجیر مراد نہیں ہے، بلکہ شاعر کہنا یہ چاہتا

Marfat.com

ہے کہ محبوب نے محبت کی زنجیر میں جکڑ لیا ہے۔ دلچسپ مجلس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔

قدوسی صاحب نے ۱۹۶۶ء کے بعد چند سال تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ بعد میں حالات کی بنا پر مکتبہ قدوسیہ کی طرف پوری توجہ مبذول کر دی۔ اس لیے تدریس کے شعبے کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن کاروبار کو اپنے مطالعہ اور تحقیقی سرگرمیوں میں حائل نہیں ہونے دیا بلکہ کاروبار کو علمی ترقی کا ایک ذریعہ بنایا۔ وہ اس طرح کہ عرب ممالک اور اندرون ملک سے طرح طرح کی کتابیں فروخت کے لیے آتیں۔ ان میں سے جو کتابیں اپنے ذوق کی ہوتیں وہ علیحدہ رکھ لیتے۔ اس طرح ان کا ایک قابل قدر ذاتی کتب خانہ وجود میں آ گیا، جس میں خاصی نادر ونایاب کتب بھی شامل ہیں، اور زیادہ تر کتابیں رجال کے موضوع پر ہیں۔ اپنے علم وتحقیق اور فکر کی اشاعت کا قدوسی صاحب کو بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کے لیے وفات سے کچھ عرصہ قبل انھوں نے ایک بار پھر مسند تدریس سنبھال لی۔ پہلے وہ مدرسے سے ۸۰ روپے تنخواہ وصول کرتے تھے اس لیے کہ گزر بسر کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اب وہ ماشاء اللہ اس قابل تھے کہ مدرسے کی خود امداد کرسکیں۔ انھوں نے بلامعاوضہ اپنی تدریسی خدمات چینیاں والی مسجد کے سپرد کر دیں، جہاں چند طالب علم درس نظامی سے فارغ تھے اور بعض تو ان میں مدرسہ کے استاد بھی تھے۔ صبح تقریباً سات بجے کے لگ بھگ درس کا آغاز ہو جاتا اور نو بجے تک ان کی کلاس جاری رہتی۔ ارشاد الفحول اور حجۃ اللہ البالغہ قدوسی صاحب کے اسباق تھے۔ حجۃ اللہ البالغہ کے وہ گرویدہ تھے، اس کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے اور اسلامیات کی بے نظیر کتاب قرار دیتے تھے۔

قدوسی صاحب بہت اچھے مدرس تھے۔ طالب علم ان سے بہت مطمئن ہوتے۔ ان کے شاگردوں کی فہرست مختصر ہے، کیوں کہ انھوں نے صرف چند سال پڑھایا۔ لیکن ان کے بعض شاگرد بڑے قابل نکلے۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں۔

۱۔ حافظ محمد عبداللہ شیخوپوری: جماعت اہل حدیث کے معروف واعظ اور پختہ عالم ہیں۔ شیخوپورہ سے تعلق ہے۔ ابتدائی زمانے میں استفادہ کیا۔

۲۔ حافظ عبدالحمید ازہر: ابتدائی زمانے میں مستفید ہوئے۔ آج کل مکتب الدعوۃ، اسلام آباد میں متعین ہیں۔ بہت اچھے عالم دین ہیں۔

۳۔ عبداللہ ناصر رحمانی: کراچی میں استفادہ کیا۔ جماعت اہل حدیث کے بڑے معروف اور قابل عالم ہیں۔ حدیث پر گہری نظر ہے۔

۴۔ قاری روح الامین: ابتدائی زمانے کے شاگرد ہیں۔ بنگلہ دیش کے رہنے والے تھے۔

۵۔ محمد حسین ظاہری: باصلاحیت نوجوان ہیں۔ قدوسی صاحب سے حجۃ اللہ البالغۃ اور ارشاد

Marfat.com

الفحول پڑھیں۔ آج کل کویت میں دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے ہیں۔

۶۔ محمد ابراہیم: ٹاؤن شپ میں رہتے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں استفادہ کیا۔ قدوسی صاحب کے خاص شاگردوں میں تھے۔

۷۔ محمد کلیم الدین عثمانی: چینیاں والی مسجد میں استاد تھے، ابتدائی زمانے میں بھی استفادہ کیا اور بعد میں حجۃ اللہ البالغۃ وغیرہ کتابیں بھی پڑھیں، آج کل لاہور میں خطیب ہیں۔

۸۔ محمد یوسف لکھوی: چینیاں والی میں استاد تھے۔ قدوسی صاحب سے حجۃ اللہ البالغۃ وغیرہ کتابیں پڑھیں۔ حجۃ اللہ البالغۃ کے درس ریکارڈ بھی کیے۔ لیکن پتہ نہیں محفوظ ہیں یا ضائع ہو چکے ہیں۔

یہ چند شاگردوں کے نام ہیں، ان کے علاوہ اور بھی ہوں گے۔ لیکن اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے ہیں۔

قدوسی صاحب جیسا کہ ذکر ہو چکا، صاحب نظر عالم تھے۔ تحقیق کے رسیا تھے۔ شخصیات ان کا خاص موضوع تھا۔ اس لیے ان سے راہ نمائی لینے کے لیے بھی کئی احباب ان کے پاس باقاعدگی سے آیا کرتے تھے جن کی وہ بڑی فراخ دلی سے مدد کیا کرتے تھے۔ دوران مطالعہ اگر انھیں معلوم ہو جاتا کہ یہ حوالہ فلاں صاحب کے مطلب کا ہے یا انھیں اس کی ضرورت ہے تو وہ صاحب جب آتے تو انھیں بتاتے کہ یہ یہ حوالہ آپ کے لیے مفید ہے۔ اس طرح اگر کسی اہم کتاب کی صرف چند کتابیں آتیں تو پہلے اپنے خاص احباب میں تقسیم کرتے، بعد میں کسی اور کی باری آتی۔

حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کی سوانح عمری فضل حسین بہاری نے مرتب کی۔ قدوسی صاحب نے اس کی فوٹو کاپیاں ایک سے زائد کرائیں اور جن کے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھیں، انھیں دیں، اسی طرح مقدسی کی کتاب احسن التقاسیم بھی فوٹو سٹیٹ کرائی اور مختلف علما کو استفادے کے لیے دی۔

قدوسی صاحب کی دکان پر آنے والوں میں چند اصحاب مندرجہ ذیل تھے۔

ا۔ مولانا حنیف ندوی: مکتبہ قدوسیہ جب کشمیری بازار میں چوبارے پر تھا اس وقت سے آتے تھے۔ عبدالمجید شاکر جو کہ قدوسی صاحب کے بھتیجے ہیں اور چینیاں والی مسجد کے پڑوس میں کیسٹوں کا کام کرتے تھے، بتاتے ہیں کہ مولانا ندوی اکثر صبح کے وقت آتے سارا سارا دن تشریف فرما رہتے۔ قدوسی صاحب سے علمی مجالس جما کرتیں۔ چائے کا دور بھی ساتھ ساتھ چلتا۔ شام کو میں انھیں چھوڑنے جاتا۔

یہاں یہ بھی ذکر کر دیا جائے کہ قدوسی صاحب دو افراد کو بہت زیادہ احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی وہ دکان پر آتے تو اپنی نشست ان کے لیے خالی کر دیتے، انھیں عزت اور ادب سے بٹھاتے۔ ایک مولانا حنیف ندوی اور دوسرے علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ مکتبہ قدوسیہ جب اردو بازار لوئر مال پر منتقل ہو گیا تو

Marfat.com

مولانا ندوی اکثر رکشہ پر آتے۔ رکشہ دکان کے باہر رکتا تو قدوسی صاحب اپنی نشست سے فوراً اٹھ کھڑے ہوتے۔ دکان سے باہر آکر ندوی صاحب کا استقبال کرتے۔ آج جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں تو آنکھوں کے سامنے بالکل وہی منظر گردش کر رہا ہے کہ کس طرح مولانا ندوی رکشے سے نکلتے اور السلام علیکم کہتے اور قدوسی صاحب عقیدت اور محبت کے جذبات سے مولانا کو خوش آمدید کہتے۔

۲۔ پیر سید محب اللہ شاہ راشدی: سندھ کے معروف راشدی خاندان سے تعلق تھا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ ان کا کتب خانہ اپنے مخطوطات کی وجہ سے دنیا بھر کے اہل علم کے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔

۳۔ پیر سید بدیع الدین شاہ راشدی: پیر آف جھنڈا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ عربی، اردو اور سندھی میں کئی کتابیں لکھیں۔ سندھی زبان میں ایک ضخیم تفسیر بھی لکھی۔

۴۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر: قدوسی صاحب کا ان سے بے پناہ تعلق تھا۔

۵۔ مولانا عطاء اللہ حنیف: قدوسی صاحب کو مولانا مرحوم ہر مجلس میں یاد فرماتے۔ قدوسی صاحب مولانا مرحوم کے صدقہ جاریہ "دارالدعوۃ السّلفیہ" کی انتظامی کمیٹی کے بھی رکن تھے۔

۶۔ مولانا ارشاد الحق اثری: نگران ادارہ علوم اثریہ، فیصل آباد۔

۷۔ مولانا شمشاد سلفی: مشہور عالم اور بہت اچھے مقرر۔

۸۔ مولانا محمد علی جانباز: بانی و مہتمم جامعہ ابراہیمیہ، سیالکوٹ

۹۔ مفتی عبیداللہ خاں عفیف: قدوسی صاحب کے زمانہ طالب علمی کے ساتھی۔ حال مدرس جامعہ قدس، لاہور۔

۱۰۔ قاضی مقبول احمد: پروفیسر ٹیکنیکل کالج، لاہور۔

۱۱۔ حافظ محمد عبداللہ شیخوپوری: معروف واعظ اور عالم۔

۱۲۔ مفتی غلام سرور قادری: احناف کے بریلوی مکتبِ فکر کے ممتاز عالم۔

۱۳۔ مفتی جعفر حسین: نامور شیعہ عالم جن کا وطنی تعلق گوجراں والا سے تھا۔

۱۴۔ تاج الدین حیدری: مشہور شیعہ عالم و ذاکر۔

۱۵۔ مولانا عبیدالحق ندوی: مالک مکتبہ علمیہ، لیک روڈ، لاہور۔

۱۶۔ ڈاکٹر انجم رحمانی: ڈپٹی ڈائریکٹر، عجائب گھر، لاہور۔

۱۷۔ اکرام چغتائی: اردو سائنس بورڈ میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

۱۸۔ عبدالعزیز خالد: معروف ادیب و شاعر اور صاحب مطالعہ اہل علم۔

۱۹۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ: علما اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر۔

Marfat.com

۲۰۔ محمد اسحاق بھٹی: ان سطور کا راقم عاجز۔

قدوسی صاحب کا زیادہ تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔ جب بھی ان کی دکان پر جانے کا اتفاق ہوا، ان کو کسی نہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف پایا۔ وفات سے کچھ عرصہ پیشتر انھوں نے اپنے مطالعے کو تاریخ اہل حدیث کی صورت میں ترتیب دینا شروع کیا اور جماعت اہل حدیث کی بعض بڑی شخصیتوں کے بارے میں معلومات جمع کرنا شروع کی تھیں، جن میں نواب صدیق حسن خاں، حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی کے اسمائے گرامی لائق تذکرہ ہیں۔ خود میں بھی چوں کہ رجال وشخصیات کے تذکرہ وتاریخ سے دلچسپی رکھتا ہوں، اس لیے اس موضوع سے متعلق مجھ سے بھی ان کا سلسلہ گفتگو جاری رہتا تھا۔ بعض اصحاب کے حالات پر مشتمل چند کتابیں بھی انھوں نے مجھ سے لی تھیں۔

ان کے بڑے لمبے چوڑے منصوبے تھے۔ وہ ایک ایسی جامع کتاب لکھنا چاہتے تھے جس میں اہل حدیث کی پوری تاریخ آجاتی۔ ان کے یہ ارادے اس زمانے سے تھے جب انھوں نے وقتاً فوقتاً الاعتصام میں مختلف عنوانات پر لکھنا شروع کیا تھا تاہم بعد میں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ ان کو اپنا ارادہ موخر کرنا پڑا۔ مگر مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا۔ شہادت سے چند سال قبل بڑی تن دہی سے اپنے موضوع سے متعلق معلومات اکٹھے کرنا شروع کر دیے تھے۔ بیسیوں کتابیں ان کی نظر سے گزریں اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان پر نشانات بھی لگائے۔ پھر باقاعدہ کتاب کا آغاز کر دیا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ لکھنا شروع کرتے اور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کام کرتے۔ اس کے بعد چینیاں والی مسجد چلے جاتے اور وہاں سے اپنے مکتبہ میں تشریف لے جاتے تھے۔

وہ جو کام کرنا چاہتے تھے اس کا مختصر سا تعارف ہمیں ان کے کاغذات سے ملا ہے۔ ذیل میں وہ اس خیال سے نقل کیا جا رہا ہے کہ شاید کل کو کوئی صاحب ان خطوط پر کام کرنا چاہیں۔ اگر کوئی صاحب ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً یہ جماعت اہل حدیث کی اور اصحاب علم کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ لکھتے ہیں:

’’میں نے تاریخ اہل حدیث پر جب کام شروع کیا تھا تو میری تحقیق کا محور صرف برصغیر پاک وہند تھا، لیکن جب جماعت اہل حدیث کو میں نے بحیثیت ایک فقہی مکتب فکر کے پڑھنا شروع کیا تو لامحالہ مجھے ہندوستان سے باہر نکل کر اس سرزمین میں جانا پڑا جہاں سے آفتاب اسلام طلوع ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کے متعلق پڑھنا ضروری سمجھا اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص بھی اسلام کو اپنی اصلی حالت میں دیکھنا چاہتا ہے تو اسے حقیقت تک پہنچنے کے لیے ان تین صدیوں کا مطالعہ ضرور کرنا ہو گا اور مجھے یہ کہنے میں قطعاً تردد

Marfat.com

نہیں کہ ان تین سو سالوں میں آپ اسلام کا جو حقیقی اور خوب صورت چہرہ دیکھیں گے، اس کی عام فہم تعبیر فکر اہل حدیث ہے۔ بہرحال میں مطالعہ کرتے ہوئے جب برصغیر سے نکل کر دیار حبیب میں پہنچا اور براہ راست اصل ماخذ کی ورق گردانی شروع کی تو تاریخ اہل حدیث کے متعلق میرا ذہن علاقائی نہیں بلکہ آفاقی بن چکا تھا، اب میں جو تاریخ اہل حدیث کے نام سے کتاب لکھنا چاہتا ہوں، یہ اہل حدیث کی ایک جامع اور مفصل تاریخ ہوگی جو خیرالقرون سے دور حاضر تک چودہ سو سال پر محیط دستاویز ہوگی۔ یہ کتاب چودہ جلدوں میں مکمل ہوگی یعنی ہر صدی کے لیے ایک جلد مختص ہوگی۔ ہر صدی پر لکھتے ہوئے اس صدی کے سیاسی حالات کا عمومی جائزہ لینا ہوگا، اس میں یہ بات خاص طور پر بتائی جائے گی کہ کون سے مکاتب فکر کس حد تک سیاسی حالات سے متاثر ہوئے یا سیاسی حالات نے انھیں جنم دیا، کیوں کہ تاریخ میں یہ بات محفوظ ہے کہ بہت سے اعتقادی فرقے اور کئی فقہی مذاہب خالص سیاسی حالات کی پیداوار ہیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

اس کے بعد اس صدی کے اعتقادی اور فقہی مذہب کا مختصر جائزہ لیا جائے گا، ان کی علمی خدمات پر طائرانہ نظر ہوگی۔ اس کے بعد اہل حدیث کی سیاسی اور علمی خدمات کی مفصل روداد اور دوسری جماعتوں سے ان کے کام کا موازنہ ہوگا اور اس صدی کے علمائے اہل حدیث کا تفصیلی ذکر ہوگا، جس میں ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر مناسب گفتگو کی جائے گی اور ان کے علمی اور سیاسی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا جائے گا۔

نیز بعض صدیوں میں ہمیں بعض علاقوں کے متعلق ایک مستقل باب کا اہتمام کرنا پڑے گا جس میں فکر اہل حدیث کے نشوونما کی تفصیل بیان کی جائے گی۔ یہ ان علاقوں کے متعلق ہوگا جہاں اسلام اپنی اصلی شکل وصورت میں نہیں پہنچا اور عام لوگوں کو جو چیز اسلام کے نام پر پیش کی گئی وہ اسلام نہیں بلکہ کچھ اور ہی تھا اور لوگ نام کی وجہ سے دھوکہ کھا گئے۔ پھر کچھ اللہ والے اٹھے، انھوں نے اسلام کے غبار آلود چہرے کو صاف کیا جسے بعض لوگوں نے پہچان لیا، لیکن جن لوگوں کو اندھیرے سے پیار تھا انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہی لوگ جو گمراہی پر متفق تھے، حق کے معاملے میں اختلاف کا شکار ہوگئے۔ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ نفرتیں بڑھیں، معاملہ جنگ وجدال تک پہنچا جس نے ایک دردناک تاریخ کو جنم دیا، انتہائی دردناک۔ یہ باب ائمہ اہل حدیث کے حالات سے پہلے آئے گا۔

Marfat.com

ظاہر ہے یہ سفر بڑا طویل اور کٹھن ہے۔ اس کے لیے بڑے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے آج تک کسی نے اس باب میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی۔ اگرچہ تاریخ اہل حدیث کے نام سے ایک دو کتابیں نظر سے گزری ہیں لیکن دیکھنے سے انتہائی مایوسی ہوئی۔''

ہمارے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) میں بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی۔ مقصد فقط مولانا محمد حنیف ندوی اور اس فقیر سے ملنا اور اپنے ذوق و مطلب کی کچھ باتیں کرنا ہوتا تھا۔ ہم بھی ان کے مکتبے میں جاتے اور ان کی علمی کاوشوں سے مطلع ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

وہ بڑے مہمان نواز اور وسیع ظرف کے عالم تھے۔ چائے کا دور ان کے ہاں چلتا رہتا تھا۔ ساتھ ساتھ باہمی دلچسپی کی باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔

ان کا انداز تحریر سلیس اور عام فہم تھا۔ انھوں نے کوئی کتاب تو تصنیف نہیں کی البتہ بعض رسائل و جرائد میں ان کے جو مضامین شائع ہوئے وہ تحقیق اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے چند مضامین کا مختصر تعارف یہ ہے۔

۱۔ ردّ قادیانیت سے متعلق مولانا محمد حسین بٹالوی کی تحریری مساعی پر انھوں نے تفصیل سے لکھا اور مولانا کے اس فتوے کا تذکرہ کیا جس میں انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کی ہے۔ تکفیر مرزا کے متعلق یہ پہلا فتویٰ ہے جو مولانا بٹالوی نے ۱۸۹۰ء میں جاری فرمایا تھا۔ اس کے بعد دیگر علمائے کرام کے فتوے جاری ہوئے اور لوگوں کے علم میں آئے۔

اس فتوے کی دوبارہ اشاعت دارالدعوۃ السلفیہ کی جانب سے مارچ ۱۹۸۷ء میں ہوئی اور یہی مہینہ قدوسی صاحب کی شہادت کا مہینہ تھا۔ ۱۸۔ مارچ کو اس ''اولین فتوے'' کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا گیا جس میں قدوسی صاحب نے مقالہ پڑھا۔ یہ ان کی زندگی کا آخری مقالہ تھا۔ اس تقریب کی صدارت پیر سید بدیع الدین شاہ راشدی پیر آف جھنڈا نے کی۔ قدوسی صاحب کے بیٹے عمر فاروق کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا پیر صاحب بھی شخصیات کے بہت بڑے عالم ہیں، ان سے آپ کی ملاقات کیسی رہی؟ کہنے لگے اس میں کوئی شک نہیں کہ پیر صاحب بہت بڑے عالم ہیں، لیکن پیر صاحب نے جو چند ایک باتیں بتائیں، وہ مجھے پہلے سے ہی معلوم تھیں، البتہ میں نے انھیں سیر اعلام النبلاء وغیرہ کے حوالے سے بعض ایسی باتیں بتائیں جن کا انھیں علم نہ تھا، اس پر وہ میرے مشکور بھی ہوئے۔ سیر اعلام النبلاء امام ذہبی کی بڑی ضخیم کتاب ہے اور ۲۵ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس کا موضوع شخصیات ہے۔ دو دو تین تین جلدوں کی شکل میں بیروت سے شائع ہوئی۔ قدوسی صاحب اس کتاب کے بڑے شائق تھے۔ عرب ممالک میں آنے جانے والوں سے اس کی جلدیں منگواتے رہتے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب نے بھی کچھ جلدیں خود حاصل

Marfat.com

کیں، اور جو دستیاب نہ ہوسکیں وہ قدوسی صاحب سے لے لیں، لیکن ابھی چند جلدیں ہی مطالعہ سے گزری تھیں کہ وہ صاحب فراش ہو گئے اور یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ قدوسی صاحب نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور کہا کرتے تھے کہ شاید پاکستان میں یہ مکمل کتاب کسی کے پاس نہ ہوگی۔ اور اگر ہوگی تو اس نے اس طرح مطالعہ نہ کیا ہوگا۔ کتاب میں اگر کوئی اہم بات ہوتی تو وہ اس کے ایک طرف چھوٹی سی لائن کھینچ دیتے۔ ان کی ذاتی لائبریری کی اکثر کتب اس قسم کے نشانات سے بھری ہوئی ہیں۔ انھیں اپنے حافظے پر بڑا اعتماد تھا۔ اگر کہا جاتا کہ آپ ان نکات کو کسی کاغذ پر منتقل کر لیا کریں تو کہا کرتے تھے کہ میں جب تاریخ اہل حدیث شروع کروں گا، اس وقت ان تمام نکات کو اس کتاب میں شامل کرلوں گا، اور یہ میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

۲۔ انگریز اور اہل حدیث کے بارے میں انھوں نے بڑی وضاحت سے اظہار خیال کیا ہے اور واقعات وشواہد سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت کی مخالفت کو علمائے اہل حدیث نے ہمیشہ اپنے منصبی فرائض میں گردانا اور اس ضمن میں ہر قسم کی تکلیفیں برداشت کیں۔ قدوسی صاحب نے اس سلسلے کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کا تذکرہ مناسب صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ مضمون ۱۹۷۰ء میں الاعتصام کی متعدد قسطوں میں چھپا ہے اور اس موضوع کی بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اگر اسے کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے تو بڑا مفید رہے گا۔

۳۔ مولانا تمنا عمادی اپنے دور کے مشہور عالم تھے۔ بعض افکار میں وہ اہل قرآن (بلکہ منکرین حدیث) کے ہم نوا تھے۔ عربی ادبیات ان کا خاص موضوع تھا۔ اسماء الرجال سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ پھلواری (صوبہ بہار) کے رہنے والے تھے۔ بعدازاں ڈھاکے چلے گئے تھے۔ اصلی نام محی الدین تھا۔ بعض مسائل میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم نے ان کا علمی انداز میں محاکمہ کیا تھا۔ یہ ایک دلچسپ علمی وفنی بحث تھی جو الاعتصام کے ابتدائی دور کے چند شماروں میں اشاعت پذیر ہوئی تھی۔ امام ابن جریر طبری کو بعض لوگ شیعہ سمجھتے ہیں، مولانا تمنا عمادی اسی نقطہ نظر کے حامی تھے۔ کسی زمانے میں قدوسی صاحب نے بھی مولانا تمنا عمادی کے اس نقطہ نظر کے بعض پہلوؤں کو ہدف تنقید ٹھہرایا تھا اور ایک طویل مقالے میں ان کی گرفت کی تھی اور دلائل کے ساتھ امام طبری کو امام اہل سنت ثابت کیا۔

۴۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، قدوسی صاحب شعروشاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے عربی شاعری میں دلچسپی لینے لگے۔ ان کی عربی کی دو نظمیں پہلے آپ کے مطالعے میں آچکی ہیں۔ اب تیسری نظم پڑھیے جو ۱۹۷۴ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کے موقعے پر انھوں نے کہی تھی۔ نوائے وقت اور الاعتصام میں شائع ہوئی تھی۔

Marfat.com

مرحبا اھلا وسھلا یا رؤس المسلمین — یا کرام الناس طرا یا خیار العلمین
انی اری اللاھور تشرق کالضحی بقدومکم — ویرقص ما فیھا حبورا وغبطۃ للزائرین
حمدا لہ من جعلنا خیر امۃ مرحومۃ — وھو الذی قد خصکم لا مامۃ الناس اجمعین
ھبوا اعملوا لتنالوا ھذا المجد وھو تلالکم — وتلک لن یتات الا ان تکونوا مومنین

یہاں یہ عرض کردیں کہ خود عبدالخالق قدوسی بھی پنجابی کے اچھے خاصے شاعر تھے، ان کی بعض پنجابی نظمیں بڑی دلچسپ ہیں۔ اردو شاعری سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔

بہرحال قدوسی صاحب کے مضامین ومقالات متعدد اخباروں میں چھپے۔ ان کے صاحب زادے ابوبکر کو وہ تمام تحریریں مرتب کر کے ''مقالات قدوسی'' کے نام سے چھاپ دینی چاہئیں اور تشریح طلب مقامات کی حواشی میں وضاحت کردینی چاہیے۔ یہ کام کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے، بس تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے۔

اب ذیل میں ان میں سے چند مکتوبات ملاحظہ کیجیے۔ ان میں دومکتوبات گرامی مولانا محمد اسماعیل صاحب کے ہیں جو انھوں نے قدوسی صاحب کے نام تحریر فرمائے۔ دومکتوب قدوسی صاحب کے ایک شاگرد بذل الرحمٰن کے ہیں جن کا تعلق مشرقی پاکستان کے ضلع رنگ پور سے ہے۔ ان مکتوبات کی حیثیت ایک تاریخ کی ہے۔

(۱)

گجرانوالہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۶۶-۱۰-۹

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تحفۃ الاحوذی ج ا کے متعلق ناظم صاحب سے بات ہوگئی ہے۔ اب آپ فرمائیں کون سی کتاب عنایت فرماتے ہیں۔ پچھلی جلد کی قیمت اس وقت چالیس سے اوپر مل رہی ہے۔

والسلام

محمد اسماعیل

(۲)

گجرانوالہ — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۶۶-۱۲-۲۹

محترم مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب تشریف لائے، ملاقات نہ ہوسکی، افسوس ہے۔ آپ لاہور میں ہیں۔ ہم آپ کی نسبت دہاتی

Marfat.com

ہیں۔ شہروں میں خرچ بڑھ جاتے ہیں۔ آپ کا احساس درست ہے۔ غالب نے کسی دوست کو لکھا تھا

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا

آپ نے علمی کاروبار شروع کیا، بہت اچھا ہے بشرطیکہ اس کے لیے سرمایہ ہو۔

دو کتابیں علل لاحمد اور ذیل طبری کی قیمت کے متعلق نظر عنایت کی ضرورت ہے۔

اگر یہ کاروبار علم اور دین کی خدمت کے جذبہ سے کریں گے تو ''ہم خرما و ہم ثواب'' کے مترادف ہوگا۔

باقی کتب کے متعلق اپنی جیب پر غور کر کے عرض کروں گا۔

والسلام

محمد اسماعیل

اب قدوسی صاحب کے شاگرد کے دو مکتوب ملاحظہ فرمایے۔

(۱)

باسمہٖ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۹۔۱۔۶۹

بخدمت جناب محترم ومکرم استاد جی صاحب!

سلام کے بعد گزارش یہ ہے کہ میں نے گھر آنے کے بعد ایک کارڈ بھیجا تھا شاید مل گیا ہوگا۔ میں گھر آنے کے دو دن بعد ہی میمن سنگھ روح الامین، عبداللہ وفضل الرحمٰن وعبدالجبار وغیرہ کے گھر گیا تھا۔ ابھی خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ابا جان کے ساتھ زمینداری کا کام کرتا ہوں۔ مجھے شرم آتی ہے کہ میں بیٹھا رہوں اور ابا جان کام کرے۔ استاد جی! ابھی تو پڑھائی بھی شروع ہونے والی ہے۔ میں گھر میں بیٹھا ہوں لیکن میرا دل ودماغ آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہے کہ کب پڑھائی شروع کروں لیکن جانے کے کرایہ کے متعلق پریشان ہوں، کیا کروں، گاؤں والے ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ اور اس سال ہمارے ہاں دوسرے سالوں کی نسبت فصل بھی بہت کم ہوئی ہے۔ خطرہ ہے کہ گھر کے لیے کہیں اناج خریدنا نہ پڑے۔ والد صاحب کی محبت، کہ آنے کا کرایہ زمین فروخت کر کے بھیجا تھا۔ مجھے بتایا بھی نہیں تھا کہ زمین کا پیسہ بھیج رہا ہوں۔ بہرحال ابھی گھر سے کرایہ ملنے کی امید نہیں۔ شاید دو تین مہینہ کے بعد مل سکے۔ لیکن استاد جی مجھے یہ تو برداشت نہیں کہ تین مہینہ پڑھائی چھوڑ کر بیٹھا رہوں اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ گھر میں پڑھائی کروں اور والد صاحب میرے سامنے کام کریں۔ اور وہ بابرکت مہینہ بھی چلا گیا۔ اگر اس میں آپ کے علم میں یہ حالات لاتا تو آپ سے پوری توقع تھی کہ آپ میرے لیے ضرور کچھ کرتے۔ اب بھی ناامید نہیں ہوں بہرحال گیا وقت پھر ہاتھ نہیں

Marfat.com

آتا۔ استاد جی کوئی بندوست کر کے ۷۰ اروپیہ قرضہ حسنہ ایک سال کے لیے دے دیں۔ سراج الدین کو دے دیں، تاکہ وہ ٹکٹ کر کے بھیج دے اور میں جلدی آپ لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوسکوں۔ میں ان شاء اللہ آئندہ رمضان تک پورا پیسہ ادا کردوں گا۔ استاد جی آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ یہ خبر حافظ احسان الٰہی صاحب کو معلوم نہ ہو۔ اس کی وجہ ملاقات کے وقت ان شاء بتاؤں گا۔ استاد جی غلطی معاف کرنا اور بہت جلدی کوئی بندوبست کرنا تاکہ پڑھائی کا نقصان نہ ہو۔

جسدی ھھنا وقلبی لدیکم　　　السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم

فقط والسلام

آپ کا فرماں بردار شاگرد

بذل الرحمٰن

(۲)

باسمہٖ تعالیٰ　　　۱۳-۲-۶۹

بخدمت جناب محترم استاد جی صاحب

سلام بعد گزارش یہ ہے کہ آپ کے ارسال کردہ مبلغ ایک سو ستر روپے مل گیا۔ جزاك الله احسن الجزا فی الدارین۔ میں ان شاء اللہ عید الضحیٰ کے ایک ہفتہ بعد روانہ ہو رہا ہوں۔ راستے میں تین چار دن لگے گا۔ میرے والد صاحب کی دوسری شادی ہو رہی ہے۔ لہٰذا آنے میں کچھ دیر ہو رہی ہے۔

میری طرف سے سب کو سلام، غلطی معاف فرمانا۔

آپ کا فرماں بردار شاگرد

بذل الرحمٰن

قدوسی صاحب طالب علموں سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے۔ دکان پر کتابیں خریدنے کے لیے آنے والے طالب علموں سے خاص رعایت کرتے۔ ایک بار ان سے پوچھا کہ آپ طالب علموں کے لیے بڑی رعایت کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو کہنے لگے آج کل اول تو طالب علموں میں مطالعے کا ذوق ہی نہیں۔ اور اگر کسی میں یہ ذوق ہے تو اس کے پاس وسائل نہیں کہ وہ اتنی مہنگی کتابیں خرید سکے۔ میں جب ان کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا طالب علمی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ جب مجھے مطالعے کا بہت شوق ہوتا تھا لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ کوئی سستی سی کتاب ہی خرید سکوں۔

مکتبہ قدوسیہ ان کا ذریعہ معاش بھی تھا اور اس کی وساطت سے علم کی خدمت کرنا اور بزرگان دین کی

Marfat.com

قدیم کتابیں شائع کرنا بھی ان کا ایک مقصد تھا۔ چناں چہ اس کی طرف سے انھوں نے کئی ایک کتابیں شائع کیں۔ طوالت سے بچتے ہوئے ان میں سے چند یہاں درج کی جارہی ہیں:

۱۔ التمهيد لما فى الموطا من المعانى والاسانيد: یہ کتاب موطا امام مالک کی شرح ہے ۲۶ مبسوط وضخیم جلدوں پر محتوی ہے۔ اس کے مصنف کا اسم گرامی حافظ ابوعمر یوسف بن عبداللہ ابن محمد عبدالبر النمری اندلسی ہے۔ یہ ۲۵۔ ربیع الثانی ۳۶۸ھ کو پیدا اور آخر ربیع الثانی ۴۶۳ھ کو ۹۵ برس عمر پا کر فوت ہوئے۔ ابن عبدالبر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور ان کا دائرۂ درس وتدریس بھی بہت وسیع تھا۔ موطا بہ یک وقت حدیث کی کتاب بھی ہے اور فقہ کی بھی۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ حدیث وفقہ کی یہ بہت بڑی خدمت ہے جو مکتبہ قدوسیہ کی وساطت سے عبدالخالق قدوسی نے یہ کتاب چھاپ کر سرانجام دی۔

۲۔ ابجد العلوم: نواب محمد صدیق حسن خاں کی مشہور تصنیف ہے جس کا شمار کتب حوالہ میں ہوتا ہے۔ بڑے سائز کے تقریباً ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ایک عرصہ سے یہ کتاب نایاب تھی۔ قدوسی صاحب نے اسے نہایت خوب صورت طریقے سے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ کتاب عربی زبان میں ہے۔ ابتدا میں مصنف علام کے حالات وخدمات کا بیان ہے، ان کی ولادت ۱۲۴۸ھ میں اور وفات ۱۳۰۷ھ میں ہوئی۔

۳۔ البدایه والنهایه: جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے اس کتاب کے مصنف امام ابن کثیر ہیں (جو تفسیر ابن کثیر کے بھی مصنف ہیں) ابتدا سے لے کر مصنف کے زمانے (آٹھویں صدی ہجری) تک کی اسلامی تاریخ کی یہ مستند ترین کتاب ہے۔ سنین کی ترتیب سے نہایت احتیاط اور صحت کے ساتھ واقعات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔ مصنف نے ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ ان کا شمار امام ابن تیمیہؒ کے لائق ترین تلامذہ میں ہوتا ہے۔

۴۔ اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر: قرآن مجید کی عربی تفسیروں میں تفسیر ابن کثیر ایک نہایت مشہور تفسیر ہے جو پانچ جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہندوستان کے معروف عالم مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی نے کیا تھا۔ مولانا مرحوم بہت اچھے واعظ ومقرر بھی تھے اور ممتاز مصنف ومترجم بھی۔ انھوں نے ۱۹۴۱ء کو دہلی میں وفات پائی۔

۶۹۔۱۹۷۰ء میں جب کہ قدوسی صاحب کو مکتبہ قدوسیہ قائم کیے چند سال ہوئے تھے، انھوں نے علامہ احسان الٰہی ظہیر کے ساتھ مل کر چند کتب شائع کیں، جن میں فتاویٰ ثنائیہ، فتاویٰ نذیریہ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ قدوسی صاحب کا اپنا انداز کار تھا اور وہ آہستہ روی سے سنبھل سنبھل کر

Marfat.com

قدم اٹھانے کے عادی تھے، علامہ صاحب انتہائی تیز رفتاری سے کاروبار کرنے کے خوگر، دہلے پر نہلا یہ کہ وہ شیخ برادری سے تعلق رکھتے تھے جن کی ہمارے ہاں شہرت ہی کاروبار میں مستعدی اور تیزی کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کچھ عرصے بعد دونوں میں کاروباری علیحدگی ہوگئی۔ کتابیں تقسیم ہوئیں اور بڑے احسن طریقے سے ہوئیں۔ دلوں میں کسی قسم کی رنجش پیدا نہ ہوئی۔ علامہ صاحب کے حصے میں جتنی کتابیں آئی تھیں انھوں نے چند ہفتوں میں فروخت کرلیں۔ جب کہ قدوسی صاحب کو فروخت کرنے میں کافی عرصہ لگا۔

بعد میں قدوسی صاحب نے صحیح ابن خزیمہ، امام ابن حزم کی جوامع السیرۃ، مولانا اسماعیل صاحب کی مشکوۃ مترجم۔ نواب صدیق حسن خاں کی چند کتب اور بعض ایسی کتابیں جو کہ مسلک کتاب وسنت سے متعلق تھیں، شائع کیں۔

افسوس ہے قدوسی صاحب کی زندگی نے وفا نہ کی اور پیمانہ حیات جلد ہی چھلک گیا۔ ورنہ کتابوں کی نشرواشاعت کے سلسلے میں ان کے ارادے بڑے بلند تھے اور وہ بہت سی پرانی اور نئی چیزیں قارئین کے علم ومطالعے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ خاموشی سے کام کرنے کے عادی تھے اور میانہ روی سے میدان عمل میں قدم رکھتے تھے۔ شور اور ہنگامہ آرائی سے انھیں کوئی علاقہ نہ تھا۔

وہ علم وتحقیق کے رسیا تھے۔ یہی ان کا اصل میدان تھا اور یہی ان کی منزل مقصود تھی۔ معلوم نہیں وہ جماعتی سیاست میں کیوں کود پڑے۔ اس قسم کے لوگ جماعتوں کی سیاست سے ہمیشہ دامن کشاں رہتے ہیں، لیکن قدوسی صاحب گردن تک اس دلدل میں پھنس گئے تھے۔ مجھے اس معاملے میں ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ میں ان سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں علم کی اشاعت وترویج تک محدود رکھیں، ادھر ادھر کی بھاگ دوڑ سے اجتناب کریں، مگر وہ اس میں اتنا آگے نکل چکے تھے کہ واپسی کی راہیں مسدود ہوگئی تھیں۔ اب آگے صرف موت کی وادی تھی، جس میں وہ نہایت تیزی کے ساتھ ایک ہی لمحے میں داخل ہوگئے۔

یہ لمحہ انتہائی دردانگیز اور بہ درجہ غایت الم ناک تھا۔ ۱۹۸۷ء کے ۲۳۔ مارچ کی شب کو ان کے گھر کے قریب لاہور کے علاقہ قلعہ لچھمن سنگھ میں جماعت اہل حدیث کا جلسہ تھا، جس کے مقرروں میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کی حیثیت اصل مقرر کی تھی۔ قدوسی صاحب کا نام اس جلسے کے مقرروں میں شامل نہ تھا، یوں بھی وہ جلسوں کے مقرر نہ تھے۔ اور نہ جلسوں میں شرکت کرتے تھے لیکن اس جلسے میں شریک تھے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر تقریر کررہے تھے کہ اچانک بم کا دھماکہ ہوا جس سے آناً فاناً دس آدمی موت کا لقمہ بن گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔ شہادت کا رتبہ پانے والوں میں قدوسی صاحب کے علاوہ علامہ ظہیر اور مولانا حبیب الرحمٰن یزدانی بھی تھے۔

اس جلسے کے منتظم خود قدوسی صاحب تھے۔ ان کی زیرنگرانی ان کے بیٹوں، بھانجوں، بھتیجوں، نے جلسے

Marfat.com

کے انتظامات کیے۔ اس لیے سب سے زیادہ نقصان بھی اسی خاندان کا ہوا۔ قدوسی صاحب شہید ہوئے۔ ایک بھتیجے کی دو آنکھیں ضائع ہوئیں، ایک بھتیجے کی ایک آنکھ ضائع ہوئی، جب کہ چار اور قریبی عزیز زخمی ہوئے۔

شہادت سے کچھ دن پہلے اپنے اہل خانہ سے کہا کہ ہمارا کام تو ہو گیا۔ گھر والوں کے استفسار پر بتایا کہ آج خواب میں میرے استاد مرحوم میاں محمد باقرؒ آئے اور فرمانے لگے چلو میرے ساتھ، تمھیں لینے آیا ہوں۔ میں نے انکار کیا کہ نہیں ابھی میرے بہت سے کام باقی ہیں۔ لیکن میاں صاحب اصرار کر کے ساتھ لے گئے۔

وفات کے وقت عبدالخالق قدوسی کی عمر صرف ۴۷ برس تھی۔ جس حالت میں ان کی موت واقع ہوئی، اس کے پیش نظر وہ شہادت کی موت تھی۔ بم کے تیز اور زہر آلود ذرات نے ان کے جسم کو چھلنی کر دیا تھا۔

۲۴۔ مارچ کی سہ پہر کو چار بجے کے لگ بھگ دھماکے سے شہید ہونے والوں کی پہلی تین نعشیں جنازے کے لیے مینار پاکستان کے میدان میں لائی گئیں تو برابر پڑی ہوئی نعشوں کو دیکھ کر ہمیں ان دوستوں سے جو قدوسی صاحب کی میت ان کے گھر سے اٹھا کر لائے تھے، پوچھنا پڑا کہ ان کی میت کون سی ہے۔

جنازے کے بعد تدفین کے لیے ان کی میت اٹھائی گئی تو اقبال کے یہ شعر نوک زبان پر آ گئے جو ہم نے ان کی روح سے مخاطب ہو کر پڑھے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا نور سے معمور یہ خاکی شبستان ہو ترا

وہ جوان عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اندازہ کیجیے یہ کس قدر کربناک حادثہ تھا کہ ان کی اہلیہ پل بھر میں بیوی سے بیوہ ہو گئی تھیں، بچوں کو یتیم کہا جانے لگا تھا اور گھر کا تمام کاروبار آن واحد میں الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ بظاہر سنبھلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی اور خرچ اخراجات کی گاڑی کے آگے چلنے کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ مرنے والے نے اپنے پیچھے جو کچھ اس دنیا میں چھوڑا وہ ایک بیوی، چار کم سن بیٹوں اور دو معصوم بیٹیوں کے علاوہ چند کتابیں اور ایک غربت تھی۔ میرے خیال میں غربت کا اثاثہ سب سے زیادہ تھا جو بیوی کو شوہر کی طرف سے اور اولاد کو باپ کی طرف سے ورثے میں ملا۔

اولاد پر وہ بے جا سختی کے قائل نہیں تھے۔ تربیت کے نام پر کبھی ڈنڈا نہ اٹھایا تھا۔ انور طاہر نے جو کہ آج کل روزنامہ جنگ سے منسلک ہیں، ایک بار دیکھا کہ قدوسی صاحب دکان پر قالین پر نیم دراز مطالعے میں مصروف ہیں، اور بڑے بیٹے ابوبکر میز کی اوٹ میں ناول پڑھ رہے ہیں۔ انور طاہر نے کہا آپ ان بچوں کو ناول پڑھنے سے کیوں نہیں روکتے؟ جواب میں کہا آج یہ میرے سامنے پڑھ رہے ہیں، اگر میں زبردستی انھیں روکوں گا تو یہ کل کو چھپ کر پڑھیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ میں انھیں پیار سے سمجھاؤں، یہ خود بخود ناول چھوڑ دیں گے۔

Marfat.com

نیک اولاد بھی بہت بڑا ورثہ ہے بلکہ اصل ورثہ یہی ہے۔ جسے سعادت مند اولاد کی نعمت حاصل ہوئی، اس کا بیڑا پار ہوگیا۔ وہ دنیا میں بھی سکھی رہا اور آخرت میں بھی اسے سکھ چین نصیب ہوگا۔ الحمد للہ عبدالخالق قدوسی کو اللہ نے نیک اور سعادت مند اولاد کی دولت سے نوازا۔ وہ خود بھی قدوسی صفات تھے، انھیں اولاد بھی قدوسی صفات ملی۔

حدیث رسول اللہ ﷺ کی رو سے ان کا صدقہ جاریہ ہے۔ جو اچھا کام ان کی اولاد کرے گی اس کا ثواب انھیں برابر ملتا رہے گا۔ ان کی موت کے وقت ان کے دو بڑے بیٹے......ابوبکر اور عمر فاروق......شعور کی وادی میں داخل ہو چکے تھے اور باپ کے طریق کار سے تھوڑا بہت آشنا ہوگئے تھے۔ اپنے گھر کی حالت بھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھی جوان کے ذہن وفکر پر اثر انداز ہوئی۔ چناں چہ انھوں نے اللہ کا نام لے کر مکتبہ قدوسیہ کے معاملات کو ہاتھ میں لیا اور پھر کارساز مطلق نے ان کی حرکت میں برکت پیدا کی۔

اگر نیت صاف ہو اور انسان توجہ کے ساتھ دل لگا کر کام کرے تو یقیناً بھاگ جاگتے اور نصیب خوش گوار کروٹ لیتے ہیں۔ اس وقت بھنے ہوئے دانے بھی زمین میں ڈال دیے جائیں تو قسمت اپنا رنگ دکھاتی اور کھیتی لہلہانے لگتی ہے۔ ظاہری حالات بے شک کتنے ہی نامساعد ہوں اور ہواؤں کا رخ ناموافق دکھائی دیتا ہو، مگر قدرت ہاتھ پکڑتی اور وقت کی رفتار ساتھ دیتی ہے۔ پنجابی کے مشہور شاعر ہدایت اللہ نے سی حرفی میں اس حقیقت کو بڑے عمدہ الفاظ میں بیان کیا ہے

جدوں قسمت سولڑی آن ہوندی کھیتی جمدی بھجیاں دانیاں توں

عبدالخالق قدوسی کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں نے اپنے باپ کے قائم کردہ مکتبہ قدوسیہ کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اس کے دائرۂ عمل کو وسعت دی اور اس کی حدود کار کو آگے بڑھایا۔ بہت سی نئی کتابیں شائع کیں جو علم وادب کے فروغ واشاعت کا ذریعہ ثابت ہوئیں اور یہ سلسلہ بحمداللہ جاری ہے۔

عبدالخالق قدوسی اگرچہ ہم گنہگاروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں، اللہ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمادی......پھر بھی ہم عاجز بندوں کا فرض ہے کہ بارگاہ خداوندی میں ان کے لیے نہایت عجز کے ساتھ دعا کریں۔

اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ، واغسلہ بالماء والثلج والبرد.

نیز ان کی اولاد کے لیے بارگاہ قدس میں التجا کریں کہ ان کے حوصلے بلند رہیں اور ان کو خدمت علم کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں، آمین یا ارحم الراحمین۔

☆☆............☆☆............☆☆

Marfat.com

مولانا عبیداللہ سندھی

۱۹۳۹ء میں مرحوم و مغفور مولانا عطاء اللہ حنیف فیروز پور کی جامع مسجد اہل حدیث گنبداں والی میں درس وخطابت کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ میں ان سے وہاں عربی اور دینیات کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ ایک دن پتا چلا کہ مولانا عبیداللہ سندھی موضع ''فتوحی والا'' میں تشریف لائے ہیں۔

یہاں چند لمحے رک کر فتوحی والا کے محل وقوع اور اس کی اہمیت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لینا ضروری ہے۔

فیروز پور سے لاہور کو روانہ ہوں تو چار میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کا ہیڈ حسینی والا آئے گا جو ہندوستان میں شامل ہے۔ ہیڈ پار کر کے پاکستان کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس علاقے میں تین میل آگے بڑھیں تو سڑک (یعنی فیروز پور روڈ) کے بائیں جانب فتوحی والا گاؤں دکھائی دے گا جو دریائے ستلج کے کنارے گنڈا سنگھ والا کے قریب پاکستان کا ایک سرحدی گاؤں ہے۔ پہلے یہ گاؤں ضلع لاہور میں شامل تھا اور قصور کو تحصیل کی حیثیت حاصل تھی، اب یہ ضلع قصور میں واقع ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی اسی گاؤں میں تشریف لائے تھے۔ اس گاؤں کے لوگ مسلکاً اہل حدیث ہیں۔ یہاں ایک اہل حدیث بزرگ صوفی ولی محمد قیام فرماتے تھے جو سندھو جاٹ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے تدین اور تقوے کا بڑا شہرہ تھا اور فتوحی والا اور اس کے قرب وجوار کے لوگ ان سے بہت متاثر تھے۔ بڑے بڑے اہل علم اور اصحاب تصوف وہاں آتے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ مولانا محی الدین احمد قصوری ان سے باقاعدہ بیعت تھے اور انتہائی احترام سے ان کا نام لیتے تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالقادر قصوری، چچا مولانا عبداللہ قصوری اور چھوٹے بھائی مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کا بھی ان کے ہاں آنا جانا تھا اور یہ حضرات بہ درجہ غایت ان سے تکریم کا برتاؤ کرتے تھے۔

ان کا تعلق سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے تھا اور وہ کافی عرصہ بہ سلسلہ جہاد مرکز مجاہدین میں رہے تھے۔ اس اعتبار سے بھی ان کو اکرام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ نہایت سادہ مزاج اور درویش منش آدمی تھے۔ میں نے ان کو اپنے قدیم وطن (کوٹ کپورہ) میں دیکھا تھا اور ان کی تقریر سنی تھی۔

مولانا سندھی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے بلکہ ان کی ایک بیٹی کی شادی مولانا سندھی کے بھتیجے سے

Marfat.com

ہوئی تھی۔ جس دور کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں، اس سے قبل صوفی ولی محمد وفات پا گئے تھے۔ اب مولانا سندھی طویل عرصے کے بعد حجاز سے آئے تو اپنے اس مرحوم دوست اور رشتے دار کی تعزیت کے لیے وہاں تشریف لائے۔

فتوحی والا میں مولانا سندھی کی آمد کا سن کر جو حضرات ان کی زیارت وملاقات کے لیے فیروز پور سے تیار ہوئے، وہ تھے مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خاں، مہر محمد علی اور حکیم احمد علی۔ یہ لوگ تانگے پر سوار ہوئے اور تانگہ چلنے لگا تو مولانا عبیداللہ احرار نے مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ میں نے مولانا سندھی کا نام سنا تھا اور اپنے فہم کے مطابق ان کے کام سے بھی کچھ آگاہ تھا۔ بڑے شوق اور خاص جذبے کے ساتھ ہم مولانا سندھی کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے اور راستے میں ان کے عہد ماضی کی سیاسی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ مولانا عطاء اللہ حنیف کے سوا باقی تمام حضرات مجلس احرار سے منسلک اور اس کے سرگرم ارکان تھے۔ میں کم سن تھا، اس لیے اپنے بارے میں یہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا کہ کس جماعت سے متعلق تھا۔

مولانا سندھی بلاشبہ اپنے دور کے عظیم آدمی تھے۔ اللہ نے ان کو علم وفضل کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا اور ایثار وقربانی میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ سیاسی میدان میں انھوں نے جو تگ وتاز کی تھی اور آزادی برصغیر کے لیے وہ جن مشکل ترین مراحل سے گزرے تھے، ان کے پیش نظر وہ انتہائی احترام کے حق دار تھے، اور بے شک ہر حلقے میں ان کا انتہائی احترام ہوا۔

ہم فتوحی والے پہنچے تو مولانا سندھی مسجد میں تشریف فرما تھے جو صوفی ولی محمد کے کچے مکان سے ملحق تھی، بلکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے مکان کا ایک دروازہ مسجد کے حجرے کی طرف کھلتا تھا اور وہ اسی دروازے سے اپنے گھر سے مسجد میں آتے تھے۔ مولانا سندھی کے پاس چار پانچ آدمی بیٹھے تھے، جن سے وہ باتیں کر رہے تھے۔ ہم نے مولانا کو سلام کیا تو ازراہ کرم وہ کھڑے ہو کر ملے اور سب کو مصافحہ کیا۔ میانہ قد، گول چہرہ، متوازن نقش ونگار، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں ان کی ذہانت کی آئینہ دار، گورا رنگ، سفید داڑھی چہرے کے رنگ کے عین مطابق۔ ننگا سر بالوں سے بے نیاز، سفید کھدر کا لمبا کرتا اور سفید کھدر کی شلوار زیب تن۔ کرتے کے دائیں جانب کی سائیڈ پاکٹ سے، جسے ''کھیسہ'' کہا جاتا ہے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ سفید کھدر کا رومال نکالتے اور چہرے پر پھیرتے۔ گفتگو کرتے ہوئے چند لمحے گزر جاتے تو سامنے برتن میں رکھا ہوا ذرا سا گڑ منہ میں ڈال لیتے۔ جاذب قلب ونظر شخصیت کے مالک اور بڑے متحرک۔ اسلوب کلام پر اعتماد اور شان جلالی ہر لفظ میں نمایاں......!

کسی نے ہندوستان کی سیاست کے بارے میں کوئی سوال کیا تو فرمایا ملک میں دو ہی سیاسی جماعتیں ہیں، کانگرس اور مسلم لیگ۔ سیاسی کام کرنے والوں کو اپنی پسند اور صواب دید کے مطابق ان دونوں میں سے

Marfat.com

کسی ایک جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ تیسری کوئی جماعت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کانگرس سے تعلق پیدا کیا جائے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر ملک آزاد کرانے کی جدوجہد کی جائے۔

جمعیت علمائے ہند کے متعلق بات ہوئی تو ماتھے پر خفگی کی لکیریں تن گئیں۔ فرمایا یہ چند مولوی ہیں، جن کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں۔ اگر میرا بس چلے اور بات میرے اختیار میں ہو تو ان کی ٹانگیں توڑ دوں اور ان کو گولی سے اڑا دوں۔ جب ان الفاظ سے تسلی نہ ہوئی اور معاملہ "لیطمئن قلبی" کی منزل تک نہ پہنچا تو ارشاد ہوا کہ میرا جی چاہتا ہے، ان کی داڑھیاں مونڈ دوں۔ یہ عجیب وغریب اور انوکھی خواہش تھی جو ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی اور زبان پر آئی۔ پھر پہلو بدلا تو ایک خاص جذبے کی لہر ابھری اور فضا میں آواز گونجی۔ کیا بنا پھرتا ہے حسین احمد، کیا حیثیت ہے کفایت اللہ کی، کون پوچھتا ہے احمد سعید کو۔ اس طرح انھوں نے جمعیت علمائے ہند کے کتنے ہی اکابر کے نام لیے اور جو جی میں آیا ان کے متعلق دھڑلے سے ارشاد فرمایا۔ اب ان کے لہجے کے تیور بدل گئے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور کیفیت جلال آسمان کی رفعتوں سے ہم کنار تھی۔

سب لوگ خاموش بیٹھے سن رہے ہیں، ایک دوسرے کو حیرت وتعجب کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور زبان سکوت سے کہہ رہے ہیں کہ یہ اتنے بڑے عالم کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے حضور نہ کسی کو بولنے کی جرات ہے اور نہ ان کو ٹوکنے اور روکنے کی کسی میں ہمت......! اگر کوئی زبان کو حرکت دیتا بھی تو ان کے جلال کا سامنا کیسے کرتا۔ عافیت خاموش رہنے ہی میں تھی۔ ویسے بھی ان کی کسی بات کا جواب دینا بے مقصد تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ہم وہاں رہے اور حضرت مولانا کی گفتگو اور نہج کلام سے خوب مستفیض ہوئے۔ اس سے پہلے ہم نے علمائے دین کے بارے میں کسی چھوٹے بڑے شخص سے اس نوع کی باتیں نہیں سنی تھیں۔

ہماری بالکل وہی حالت تھی جو اس وقت رانجھے کی تھی، جب اس کی محبوبہ ہیر کو کھیڑے بیاہ کر "رنگ پور کھیڑیاں" لے گئے تو رانجھا جوگی کا روپ دھار کر وہاں پہنچا اور فقیروں کی طرح ہاتھ میں کشکول پکڑ کر مانگتا ہوا اس گھر کے دروازے پر گیا جس میں ہیر کی ڈولی آئی تھی۔ اب اس کا سامنا ہیر کی نند سہتی سے ہوا جو بڑی تند مزاج عورت تھی۔ جوگی کو دیکھتے ہی اس کا پارہ چڑھ گیا اور اسے سخت ڈانٹ پلائی۔ جوگی نے نرم لہجے میں کہا، ہم تو آباد اور بستا ہوا گھر دیکھ کر خیرات لینے آئے تھے، لیکن یہاں کچھ اور ہی قسم کی باتیں ہونے لگی ہیں۔

وارث شاہ اپنی کتاب ہیر وارث شاہ میں رانجھے کی یہ بات اس مصرعے میں منتقل کرتا ہے۔

گھر وسدا ویکھ سوال کیتا ایتھے ہو رہی گھور مسوریے نی

یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت مولانا سندھی کی زیارت اور ان کے ارشادات سننے کا شرف حاصل ہوا۔

ہم اجازت لے کر وہاں سے چلے اور تانگے میں سوار ہوئے تو مولانا کے ارشادات پر تبصروں کا سلسلہ

Marfat.com

شروع ہوگیا۔ اس قسم کی بات چیت پر جس قسم کے تبصرے ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ آپ خود ہی کر لیجیے۔ پھر تبصرے کرنے والے بھی احراری جو وادی سیاست کے ہر موڑ میں جمعیت علمائے ہند کے ساتھ قدم سے قدم اور دل سے دل ملا کر چلتے تھے۔ بہرکیف جتنے منہ ان سے کہیں زیادہ باتیں۔

عجیب تر معاملہ یہ کہ مولانا عطاء اللہ حنیف ضلع فیروز پور کی جمعیت علمائے ہند کے صدر تھے اور جمعیت کے بارے میں مولانا سندھی کے ارشادات براہ راست ان پر سیاسی حملے کے مترادف تھے، لیکن وہ سکوت کی چادر اوڑھے بیٹھے تھے۔ ویسے بھی ان کو اللہ نے اس خصوصیت سے نوازا تھا کہ وہ بزرگوں کے سامنے بولتے نہ تھے۔

مولانا عبیداللہ احرار نہایت دلچسپ آدمی تھے۔ ان کو ناموں کا ہندی ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ خود اپنے نام کا ترجمہ انھوں نے ''چھوٹو رام'' کیا تھا، مولانا عطاء اللہ ان کے بے تکلف دوست تھے۔ ان کو وہ ''رام دتہ'' کہا کرتے تھے۔ تانگے پر بیٹھے تو مولانا سے مخاطب ہو کر کہا: مولوی رام دتہ! آپ کا تعلق جمعیت علمائے ہند سے ہے اور ضلع فیروز پور کی جمعیت کے آپ صدر ہیں۔ ذرا دیکھیے، مولانا سندھی نے آپ کی ٹانگیں تو نہیں توڑ دیں یا آپ کو گولی سے تو نہیں اڑا دیا۔ یہ بھی دیکھ لیجیے کہ داڑھی محفوظ ہے۔

اپنی طرح مولانا عبیداللہ سندھی کو بھی انھوں نے اسی نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس طرح مولانا سندھی کا رکنا مشکل تھا، اسی طرح احراریوں کا رکنا بھی مشکل تھا۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا عبیداللہ احرار لائل پور (حال فیصل آباد) چلے گئے تھے اور انھیں مجلس احرار پاکستان کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا۔ لائل پور ہی میں وفات پائی۔ ان کی آواز بڑی بارعب اور مقررانہ تھی۔ وہ ان معنوں میں مولانا نہیں تھے، جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ البتہ مشہور ''مولانا'' ہی تھے۔ وہ خود بھی ازراہ مزاح اپنے آپ کو مولانا ہی کہا کرتے تھے۔ کسی کو ٹیلی فون کرتے تو کہتے ''میں مولانا عبیداللہ احرار بول رہا ہوں۔''

جو حضرات فتوحی والا میں مولانا سندھی سے ملاقات کے لیے گئے تھے، وہ سب میرے مہربان اور سراپا شفقت بزرگ دوست تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یکے بعد دیگرے یہ تمام لوگ سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ اب ان کی صرف یادیں اور باتیں باقی رہ گئی ہیں۔ وہ بھی شاید اس فقیر کے بعد ختم ہو جائیں گی۔ ان کے عزیز اور تعلق دار انھیں یاد تو کریں گے اور یاد کرتے بھی ہیں، لیکن ان کی یادوں کے تھوڑے یا زیادہ حصے کو تحریر و نگارش کے سانچے میں ڈھالنے والا کوئی نہیں۔

بات مولانا سندھی کے بارے میں ہو رہی تھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا سندھی، مولانا آزاد سے ملنے گئے تو ان سے بھی جمعیت علمائے ہند کے اکابر علما کے متعلق اسی قسم کے عزم و ارادے کا اظہار فرمایا، جس پر مولانا آزاد مسکراتے رہے۔

Marfat.com

حضرت مولانا سندھی کی اس اولین زیارت سے کم وبیش تین سال بعد ۱۹۴۲ء میں یہ فقیر لاہور آیا۔ چلتا پھرتا مولانا احمد علی صاحب کی مسجد میں پہنچ گیا۔ وہاں دیکھا کہ مولانا سندھی تشریف فرما ہیں، وہی تین سال پہلے والا حلیہ اور اسی قسم کا سفید کھدر کا لباس اور سر ننگا۔ ان کے بالکل قریب تین آدمی بیٹھے ہیں، جن میں سے ایک کو میں نے کچھ عرصہ قبل دیکھا اور انھیں پہچانتا تھا، وہ تھے مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ باقی دو کے بارے میں کسی سے پوچھا تو پتا چلا کہ ایک مولانا احمد علی صاحب ہیں اور دوسرے چوہدری افضل حق جو مجلس احرار کے مشہور رہنما تھے۔ ان چاروں حضرات یا اصحاب اربعہ سے ذرا ہٹ کر کچھ لوگ نہایت مودبانہ انداز میں خاموشی سے بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ میں بھی اسی طرح دوزانو ہو کر ان میں بیٹھ گیا اور ان کی گفتگو سننے لگا۔

اس سے چند روز بعد مارچ ۱۹۴۲ء کو لاہور میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے زیر صدارت جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، جس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا احمد علی کو اور ناظم مولانا داؤد غزنوی کو بنایا گیا تھا۔ اس کے اشتہارات بھی چھپ گئے تھے اور اخباروں میں بھی اعلان ہو گیا تھا۔ لیکن مولانا سندھی جمعیت کے مخالف تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ مولانا احمد علی اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر بنیں۔ مولانا داؤد غزنوی اور چوہدری افضل حق یہ درخواست کرنے ان کے پاس گئے تھے کہ وہ مولانا احمد علی کو یہ خدمت انجام دینے سے نہ روکیں۔

مولانا سندھی فرما رہے تھے کہ میرا بیٹا احمد علی طلبا کو قرآن مجید کا درس دیتا اور اس کے مطالب کی وضاحت کرتا ہے، اور یہی اصلی کام ہے جو اسے کرنا چاہیے اور وہ کر رہا ہے، لیکن آپ لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا اور اسے مولویوں کی فضول قسم کی سیاست میں الجھا کر اس کا وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا سندھی جلال میں تھے اور جوش اور غصے سے بول رہے تھے۔ مولانا احمد علی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ چوہدری افضل حق آہستہ آواز میں کہہ رہے تھے کہ مولانا! سیاسی حالات بڑے نازک ہیں، ملک وقوم کو مولانا احمد علی کی ضرورت ہے۔ آپ ہماری گزارش پر غور فرمائیں اور انھیں مجلس استقبالیہ کی صدارت سے نہ روکیں۔

اس سے کئی سال پیشتر (غالباً) گورکھ پور جیل میں انگریزی حکومت نے چوہدری افضل حق کو کوئی ایسی چیز کھلا دی تھی، جس سے ان کا حلق اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اونچی آواز سے بولنا ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا، اس لیے وہ بڑی مشکل کے ساتھ حلق سے آواز نکالتے اور آہستہ آہستہ بولتے تھے۔ لیکن مولانا سندھی کسی کی سننے اور ماننے کو تیار نہ تھے۔ وہ برابر یہی کہہ رہے تھے کہ جمعیت کے مولویوں کی سیاست غلط ہے اور میرا بیٹا قرآن کی تبلیغ وتدریس کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اس لیے اسے اجازت نہیں دوں گا کہ وہ جمعیت میں شامل ہو اور اس سے تعاون کرے یا اس کے جلسے کی مجلس استقبالیہ کا صدر بنے۔

Marfat.com

مولانا داؤد غزنوی جواب تک دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے، جوش میں آ گئے اور قدرے بلند آواز سے مولانا سندھی سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ کیا آپ نے ''میرا بیٹا، میرا بیٹا'' کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کیا ہم آپ کے بیٹے کو غلط راہ لگا رہے ہیں؟ ہم ان کے بدخواہ ہیں؟ اس ملک کی اصلی طاقت علما ہیں، جن کی آپ بار بار مولوی کہہ کر تحقیر کر رہے ہیں۔ انھوں نے ملک وقوم کے لیے بے پناہ قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ یہ قابل احترام اور معزز ترین لوگ ہیں، جن سے ہم آپ کے بیٹے کو متعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے مقام ومرتبے میں مزید اضافہ ہو۔ آپ جمعیت کے اہل علم کا حقارت سے نام لیتے ہیں، کیا مولانا حسین احمد مدنی کا مرتبہ آپ سے کم ہے؟ ملک اور ملک سے باہر ان کے ہزاروں شاگرد ہیں جو لوگوں کو قرآن وحدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم دے رہے ہیں، ان کے مقابلے میں آپ کے شاگردوں کی تعداد کتنی ہے؟ کیا مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ اور دیگر علمائے کرام کی خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان کے مقام کو گھٹا کر پیش کیا جائے؟ ملک کی دولت یہی بوریا نشین ہیں، جنھوں نے انگریزی استعمار سے ٹکر لی، ہمیں ان پر فخر ہے۔ آپ تو آرام سے سعودی عرب جا کر بیٹھ گئے حالات ٹھیک ہوئے تو واپس آ گئے۔ آپ نے کون سا معرکہ سر کیا ہے اور آپ کی کیا خدمات ہیں۔ مولانا داؤد غزنوی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں، لیکن مولانا سندھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ ایک بڑے آدمی کا بڑے آدمی سے انداز خطاب تھا، اس پر کسی نازک مزاج کو ناک بھوں چڑھانے یا کبیدہ خاطر ہونے یا کوئی خاص اثر لینے کی ضرورت نہیں۔ بڑوں کی باتیں بڑوں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہیں۔

پھر مولانا نے چوہدری افضل حق سے کہا کہ چلیے چوہدری صاحب! ہم کوئی اور انتظام کر لیں گے، یہ اپنے بیٹے کو لے کر بیٹھے رہیں۔

اس کے بعد یہ حضرات مولانا عبدالقادر قصوری کی خدمت میں گئے اور ان سے سارا واقعہ بیان کر کے کانفرنس کے صدر استقبالیہ بننے کی درخواست کی۔ وہ بیمار تھے، لیکن مان گئے۔ کانفرنس کا آغاز ہوا تو انھوں نے اپنے تحریر فرمودہ خطبہ استقبالیہ کی چند سطریں کھڑے ہو کر پڑھیں۔ پھر بیماری اور کمزوری کی وجہ سے معذرت کر کے کرسی پر بیٹھ گئے اور ان کا خطبہ استقبالیہ ان کے صاحب زادے مولانا محمد علی ایم اے کینٹب نے پڑھا۔

اب مولانا سندھی کی گرمی سردی کا ایک اور واقعہ سنیے۔

مولانا تاج محمود لائل پوری معروف عالم دین تھے جو سیاسیات میں مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ راقم الحروف پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے ۲۰۔ جنوری ۱۹۸۴ء کو وفات پائی۔ مولانا مرحوم کے حوالے سے ایک مرتبہ ہمارے دوست مولانا حافظ عبدالرشید ارشد (مکتبہ رشیدیہ لاہور) نے بتایا کہ قیام

Marfat.com

پاکستان سے چند برس پہلے کی بات ہے کہ مولانا احمد علی صاحب کی مسجد (شیراں والا دروازہ) میں بعض علمائے کرام (مولانا احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ اور مولانا حفظ الرحمٰن وغیرہ) ایک بزرگ کی خدمت میں حاضر تھے اور وہ بزرگ سخت زبان میں ان سے مخاطب تھے اور اس قسم کی باتیں کہہ رہے تھے کہ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو، تم ناکارہ لوگ ہو، بے مقصد اور فضول کام میں لگے ہوئے ہو، لیکن یہ علمائے کرام ان کے حضور خاموش کھڑے تھے، کسی بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا...... بقول حافظ عبدالرشید ارشد کے مولانا تاج محمود ان بزرگ کے طرز کلام سے حیران ہوئے......اور کسی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے، جو علما کے بارے میں اس درجہ سخت الفاظ استعمال کر رہے تھے؟ بتایا گیا کہ یہ مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔

اب یہ ہوا کہ جس کمرے میں مولانا سندھی تشریف فرما تھے، مولانا تاج محمود وہاں جا کر کھڑے ہو گئے۔ مولانا سندھی غصے میں تھے۔ مولانا تاج محمود سے پوچھا تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟ جواب دیا: میرا نام تاج محمود ہے، آپ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

فرمایا: چلے جاؤ یہاں سے!

میرا خیال ہے۔ یہ مارچ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے جو جمعیت علما ہند کی کانفرنس منعقدہ لاہور کے دوران پیش آیا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، مولانا سندھی جمعیت علمائے ہند کے مخالف تھے اور انھوں نے مولانا احمد علی صاحب کو اس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت قبول کرنے سے روک دیا تھا۔ جمعیت کے اس جلسے میں شرکت کرنے والے علمائے کرام مولانا سندھی کو سلام عرض کرنے آئے اور مولانا سندھی نے ان کو اسی لہجے میں خطاب فرمایا جس سے وہ ایک مدت اپنے مخالفوں کو خطاب فرماتے چلے آ رہے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ یہ علمائے کرام علم وادراک میں مولانا سندھی سے کم درجے کے نہ تھے، ہر حلقے میں متعارف تھے اور اپنا ایک مقام رکھتے تھے پھر ان کے مقابلے میں مولانا سندھی کا نقطہ نظر اتنا مضبوط بھی نہ تھا کہ وہ ان کے سامنے لاجواب ہو گئے تھے۔

بس اہل علم کے دلوں میں ان کا احترام تھا جو انھیں خاموش رہنے پر مجبور کرتا تھا، ورنہ ان کی ہر بات کا دلائل سے جواب دیا جا سکتا تھا۔

یہ علمائے احناف کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے بزرگوں اور بڑوں کے حضور مؤدب ہو کر بیٹھتے اور خاموشی سے کامل احترام کے ساتھ نظریں نیچے کر کے ان کی بات سنتے ہیں، اور حضرت حضرت کہتے ہوئے ان کی زبان خشک ہو ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ سمجھتے ہیں کہ احترام کے تقاضے پورے نہیں ہوئے......ان کے مقابلے میں جماعت اہل حدیث کے علمائے عظام کو لیجیے۔ یہاں ہر شخص مقام اجتہاد پر فائز ہے اور ہر چھوٹا بڑے کے

Marfat.com

مقابلے میں تلوار لیے کھڑا ہے۔ زبان سے بھی للکار رہا ہے اور قلم کے نام بھی فرمان شاہی جاری کر رکھا ہے کہ ''چل میرے خامہ بسم اللہ۔'' اس گستاخی کا نام ہم نے کلمہ حق رکھا ہے۔ جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا اور جن کی توجہ سے کچھ پڑھنے لکھنے کے لائق ہوئے، انہی کی مخالفت کو اپنا فرض ٹھہرالیا۔

مولانا سندھی کے بارے میں گزارشات پیش کرتے ہوئے، اپنی یہ چند یادداشتیں یہاں اس لیے بیان کر دی گئی کہ خدا جانے

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

بعض لوگ بڑے نازک مزاج واقع ہوئے ہیں، ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان کے اکابر کسی سے سخت کلامی سے پیش آ ہی نہیں سکتے۔ اگر کسی موقعے پر بہ امر مجبوری سختی کا مظاہرہ ان سے ہو بھی جائے تو اس کا لوگوں میں اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اس نوع کی واقعاتی تحریریں پڑھتے وقت خردبین لگالیتے ہیں اور ان میں سوئے ادب کے جراثیم تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بعض معاملات میں وہ صحابہ کرام کے سخت رویے کو تو معرض بیان میں لاتے ہیں۔ تابعین اور ائمہ حدیث وفقہ نے کہیں تلخ الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس کا تذکرہ بھی فرماتے ہیں، اس لیے کہ یہ ان کے نزدیک تاریخ کا حصہ ہے۔ لیکن اپنے ممدوح اور اکابر علما کے بارے میں اس نوع کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے، ان کی رائے کے مطابق یہ سوئے ادب ہے۔

ان کی خدمت میں احترام واکرام کے تمام لوازم کے ساتھ عرض ہے کہ کسی کی زبان سے سچی بات سن کر سیخ پا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو صداقت کی سرحدیں سکڑ جائیں گی اور حقیقت کی منزل تک رسائی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ انسان کو انسان ہی سمجھنا چاہیے اور ان سے متعلق واقعات کو اپنی فطری رفتار کے ساتھ آگے چلنے کا موقع دینا چاہیے اور سننے کے لیے ذہنوں میں وسعت اور کشادگی پیدا کرنی چاہیے، تاکہ لوگ ہر بڑی شخصیت کے طرز حیات کے تمام پہلوؤں سے روشناس ہو سکیں۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ہماری قومی وملکی اور علمی وعملی تاریخ کی عظیم شخصیت تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔ سیاسیات کی بہت سی خطرناک منزلوں کو انھوں عزم وحوصلے کے ساتھ طے کیا تھا۔ حصول آزادی کے لیے ایسی پر پیچ راہوں سے ان کو گزرنا پڑا تھا، جن کا ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ بڑے جی دار اور دل گردے کے رہنما تھے۔ حالات کے بے شمار نشیب وفراز سے گزرنے کی وجہ سے ان کی لوح طبع پر سختی اور جلال کے نقوش ابھر آئے تھے اور وہ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ ان کو وہی بات اچھی لگتی تھی جو ان کی سوچ کے مطابق ہوتی تھی۔

اللہ نے ان کو گوناگوں اوصاف سے نوازا تھا۔ ان کی حیثیت ایک فرد کی نہیں، ایک جماعت کی تھی اور

Marfat.com

انھوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے جو بسا اوقات انسانوں کا ایک پورا گروہ بھی انجام دینے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر وہ کسی کو ڈانٹتے تھے تو اس میں حق بجانب تھے، اگر کسی کو ہدف تنقید ٹھہراتے تھے تو ان کا مشاہدہ اور تجربہ اس باب میں ان کے زاویہ فکر کی تائید کرتا تھا۔

ان کے متعلق لکھنے والوں میں سے کسی نے ان کی عالمانہ حیثیت کو اجاگر کیا، کسی نے ان کے سیاسی افکار کی صراحت کی، کسی نے ان کے اقتصادی و معاشی نظریوں کو نمایاں کرنے کا فریضہ انجام دیا، کسی نے ان کے مطالعہ قرآن کو ہدف فکر ٹھہرایا، کسی نے ان کی تصنیفات کا جائزہ لیا، کسی نے ان کے مختلف ملکوں کے دوروں کی تفصیلات بیان کیں، کسی نے ان کی تدریسی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیا اور کسی نے ان کے نظریات وتصورات کے بعض دائروں کو الفاظ و حروف کے قالب میں ڈھالا۔

مولانا عبید اللہ سندھی جمعے کی شب کو قبل از صبح بتاریخ ۱۲۔ محرم ۱۲۸۹ھ (۱۰۔ مارچ ۱۸۷۲ء) پیدا ہوئے۔ مولد و مسکن ضلع سیالکوٹ کا ایک گاؤں ''چیاں والی'' تھا۔ باپ کا نام رام سنگھ، دادا کا جسپت رائے اور پردادا کا گلاب رائے تھا۔ خاندانی پیشہ زرگری تھا۔ بیٹے کی ولادت سے چار مہینے پہلے وسط نومبر ۱۸۷۱ء کو والد فوت ہو گیا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مر گیا، اب والدہ بیٹے کو اپنے میکے میں لے گئیں۔ ان کے میکے سکھ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کے والد نے جو اصلاً ہندو تھے، اپنے سسرال کی ترغیب سے سکھ مذہب قبول کر لیا تھا۔

مولانا کے دو ماموں جام پور (ضلع ڈیرہ غازی خاں) میں پٹواری تھے۔ جب ان کے نانا فوت ہو گئے تو والدہ بیٹے کو وہاں لے گئی تھیں۔

ان کی تعلیم کا آغاز ۱۸۷۸ء میں جام پور کے اردو مڈل سکول میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر چھ سال تھی۔ تیسری جماعت میں پہنچے تو نو سال کے تھے اور انھیں اسلام کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ چناں چہ اظہار اسلام کے لیے گھر سے نکل گئے اور دو سال ضلع سیالکوٹ میں رہے۔ سکول کے ذہین طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن گھر سے باہر اور سکول سے غیر حاضر رہنے کی وجہ سے اپنی جماعت سے ایک سال پیچھے رہ گئے۔

۱۸۸۴ء میں سکول کے ایک آریہ سماجی طالب علم سے تحفۃ الھند ملی۔ یہ کتاب ایک نومسلم مولانا عبید اللہ مالیر کوٹلوی کی تصنیف ہے، یہ بھی اصلاً ہندو تھے اور ان کا نام اننت رام اور والد کا نام منشی کوٹے مل تھا۔ ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں ''پایل'' کے رہنے والے تھے۔ اس گاؤں میں شرک اور بت پرستی اس قدر زوروں پر تھی کہ اسے بنارس ثانی کہا جاتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہاں کے بہت سے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

اننت رام نے اسلام قبول کر کے اپنا نام عبید اللہ رکھا اور وہ اسلام کے بہت بڑے عالم اور مبلغ ہوئے۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں انھوں تحفۃ الھند کے نام سے کتاب تصنیف کی، جس میں اسلامی تعلیمات، اپنے

Marfat.com

اسلام قبول کرنے کا واقعہ اور ہندو مذہب سے متعلق ضروری تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس دور میں ہندو مذہب ترک کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ اپنے موضوع میں یہ نہایت دلچسپ کتاب ہے جو مولانا عبیداللہ سندھی کو اپنے سکول کے ایک آریہ سماجی طالب علم سے دست یاب ہوئی۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) کو وفات پائی۔

جس وقت مولانا سندھی نے اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا، اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ جیسے جیسے وہ کتاب کا مطالعہ کرتے گئے، اسلام کی صداقت ان کے دل میں راسخ ہوتی گئی۔ ان کے قریب کے ایک گاؤں (کوٹ مغلاں) میں پرائمری سکول تھا، اس سکول کے چند طالب علم ان کے دوست تھے، وہ بھی ان کی طرح تحفۃ الھند سے متاثر تھے۔

اندازہ کیجیے اس زمانے کے تیسری چوتھی جماعت کے طالب علم بھی کس درجہ لائق تھے اور انھیں اس قسم کی مذہبی و دینی کتابوں کے مطالعے کا کتنا شوق تھا۔ اس عہد میں پرائمری چار جماعتوں کو کہا جاتا تھا اور چار جماعتوں والے اس درجہ ذہانت اور معلومات رکھتے تھے کہ موجودہ دور کے اکثر بی اے پاس نہیں رکھتے۔

کوٹ مغلاں کے پرائمری سکول کے انہی طالب علم دوستوں سے انھیں مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کی مشہور تصنیف تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعے سے اسلامی توحید کا پتا چلا اور شرک اور اس کی اقسام سمجھ میں آئیں۔

اس زمانے کے پنجاب میں حضرت حافظ محمد لکھویؒ کی تصنیفات کی بڑی شہرت تھی اور ان کی منظوم پنجابی کتابیں گھر گھر میں موجود تھیں جو ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں ایک کتاب کا نام احوال الآخرت ہے۔ مولانا سندھی کو یہ کتاب بھی میسر آ گئی۔ اس کے پڑھنے سے ان کی دنیا بالکل بدل گئی اور وہ تیزی کے ساتھ اسلام کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الھند کے مصنف کے نام پر عبیداللہ رکھ لیا۔

وہ فرماتے ہیں کہ ان کا ارادہ یہ تھا کہ جب مزید تعلیم کے لیے اگلے سال کسی ہائی سکول میں داخل ہوں گے تو اپنے اسلام کا اظہار کریں گے، لیکن دو چیزیں جلدی اظہار اسلام کا باعث بنیں، ایک احوال الآخرت کا بار بار مطالعہ اور دوسرے تحفۃ الھند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

شمسی حساب سے ۱۵۔ اگست ۱۸۸۷ء کو ان کی عمر پندرہ سال پانچ مہینے پانچ دن کی ہوئی تھی۔ اس دن وہ اللہ پر بھروسا کر کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا جس کا نام عبدالقادر تھا اور وہ کوٹ مغلاں کا رہنے والا تھا۔ دونوں عربی مدرسے کے ایک طالب علم کے ساتھ ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں کوٹلہ رحم شاہ پہنچے۔ قمری حساب سے ۵۔ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو باقاعدہ اسلام قبول کیا۔

Marfat.com

اس سے چند روز بعد ان کے اعزہ واقارب ان کی تلاش کو نکلے تو وہ سندھ کی طرف روانہ ہو چکے تھے، تعاقب کرنے والوں کو کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔ یوں سمجھیے کہ

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیار حرماں سے

علم صرف کی بعض عربی کتابیں انھوں نے اثنائے سفر میں اپنے ساتھی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قبول اسلام کے باقاعدہ اعلان سے قبل ہی انھوں نے ذاتی مطالعے سے اتنی استعداد پیدا کر لی تھی کہ اس قسم کے مشکل موضوع کی کتابیں پڑھنے لگے تھے۔

اس کے بعد وہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق بھر چونڈی والے کی خدمت میں گئے جو بقول مولانا سندھی کے ''اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے'' چند مہینے ان کی صحبت میں رہے۔ اس اثنا میں اسلامی تعلیمات اور اسلامی معاشرت کے بہت سے پہلو ان کے قلب وذہن میں راسخ ہو گئے۔

ایک دن حضرت حافظ صاحب نے ایک مجمعے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ عبیداللہ نے اللہ کے لیے اپنے ماں باپ کو چھوڑا ہے۔ اب ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ مولانا سندھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور ان کو اپنا ''دینی باپ'' قرار دے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بقول خود ''سندھ کو مستقل وطن بنایا یا وطن بن گیا'' اور وہ ''سندھی'' کہلانے لگے۔ مولانا نے قادری راشدی طریقے میں حافظ صاحب سے بیعت بھی کر لی تھی۔ حافظ صاحب نے ان کے لیے بڑی دعائیں کیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد وہ دین پور چلے گئے۔ وہاں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب کے خلیفہ اول مولانا ابوالسراج غلام محمد فروکش تھے۔ کچھ کتابیں وہاں پڑھیں۔ وہاں سے خلیفہ صاحب نے ان کی والدہ محترمہ کو خط لکھوایا، وہ آگئیں اور بیٹے کو واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا مگر وہ نہیں گئے۔

دین پور سے بعض دیگر مقامات کے چکر لگائے اور کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ پھر مظفر گڑھ ریلوے اسٹیشن سے ریل پر سوار ہوئے اور دیوبند پہنچ گئے۔ وہاں بعض اساتذہ سے استفادے کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ ان سے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ اور بیان ومعانی وغیرہ علوم کی بہت سی کتابوں کا درس لیا۔ یہ ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) کا واقعہ ہے۔

پھر گنگوہ کا عزم کیا اور وہاں مولانا رشید احمد گنگوہی سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

گنگوہ میں بیمار پڑ گئے تو دہلی کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں حکیم محمود خاں سے علاج کرایا اور اللہ نے تندرستی سے نوازا۔ حدیث کی بعض کتابیں دہلی میں مولانا عبدالکریم پنجابی سے پڑھیں، جو اس وقت کے مشہور دیوبندی عالم تھے۔ دہلی کے اثنائے قیام میں بقول خود ''دو دفعہ حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب کی

Marfat.com

زیارت کے لیے گئے۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سنے۔‘‘

۲۰۔ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۸ھ (یکم جنوری ۱۸۹۱ء) کو دہلی سے سیدھے بھرچونڈی (ضلع سکھر) پہنچے، لیکن وہاں جانے سے دس دن پہلے ان کے مرشد حافظ محمد صدیق وفات پا گئے تھے۔

شوال ۱۳۰۸ھ (جون ۱۸۹۱ء) میں حضرت حافظ صاحب کے خلیفہ ثانی مولانا ابوالحسن تاج محمود کے پاس امروٹ (ضلع سکھر) چلے گئے۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا اور وہ ان کے لیے بمنزلہ باپ کے ثابت ہوئے۔ ان کا نکاح سکھر کے اسلامیہ سکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ نکاح کے موقعے پر ان کی والدہ کو بھی بلایا گیا تھا۔ وہ بیٹے کے پاس دوران قیام میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کرتی رہیں۔

امروٹ میں مولانا ابوالحسن کا بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) تک مولانا سندھی نے اس سے خوب استفادہ کیا۔ اس کتب خانے کے علاوہ سندھ کے بعض دیگر کتب خانوں کی سیر بھی کی اور ان سے مستفید ہوئے۔

اس اثنا میں ان کو مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کے حالات پڑھنے کا موقع ملا جن سے وہ نہایت متاثر ہوئے۔ ان کے متعلق وہاں کے مختلف لوگوں سے بھی بہت سی باتوں کا علم ہوا۔

۱۸۵۷ء کے واقعات مولانا عبدالکریم پنجابی کے سامنے رونما ہوئے تھے اور دہلی پر انگریزوں کے ہاتھوں جو کچھ بیتی تھی، اس کے وہ عینی شاہد تھے، اس دور کے دردانگیز حوادث کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے، اس کا بھی ان پر اثر تھا۔ اس سے قبل سکھوں کے دور حکومت میں پنجاب جن حالات سے دوچار ہوا تھا، اس کے متعلق بھی وہ اپنے گھر کے افراد سے سنتے رہے تھے، اس طرح انگریزی حکومت کے خلاف ان کے دل میں شدید نفرت و بغاوت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔

۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں وہ دوبارہ دیوبند گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کی صحبت میں رہنے کے مواقع میسر آئے تو اس نفرت و بغاوت میں مزید اضافہ ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی آئندہ زندگی کا سفر کچھ اس انداز سے شروع کیا کہ جس میں علم و معرفت کے ساتھ ساتھ سیاست بھی چلتی رہے اور حصول آزادی کے لیے جدوجہد کا سلسلہ بھی جاری رہے۔

اس کے لیے امروٹ میں مطبع قائم کیا، عربی اور سندھی کی بعض نایاب کتابیں شائع کیں، ایک ماہانہ رسالہ ھدایت الاخوان جاری کیا۔

۱۳۱۹ھ (۱۹۰۲ء) کو مولانا راشد اللہ کی خدمت میں گوٹھ پیر جھنڈا میں ’’دارالرشاد‘‘ کے نام سے مدرسہ جاری کرنے کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ سات سال یہ خدمت سرانجام دی۔ مدرسے میں امتحان کے لیے دیگر اکابر علما کے علاوہ شیخ حسین بن محسن انصاری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی تشریف لائے۔

Marfat.com

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) کو شیخ الہند نے ان کو دیو بند طلب کر لیا اور ان کے حکم سے چار سال جمعیت الانصار میں کام کرتے رہے۔ ۱۳۳۱ھ (۱۹۱۳ء) کو انھیں دہلی بھیج دیا گیا۔ وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کا قیام عمل میں آیا۔ خود شیخ الہند اس کے سرپرست تھے۔ حکیم محمد اجمل خان اور نواب وقار الملک اس میں ان کے شریک کار تھے۔ اس طرح شیخ الہند اپنے اس شاگرد کو آئندہ کام کے لیے تیار کر رہے تھے۔ دہلی میں انھوں نے ان کا تعارف ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے کرایا اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر سے ملایا۔ اب نوجوانوں کے ایک فعال و مضبوط اور سرگرم گروہ سے ان کو متعارف ہونے کا موقع ملا۔ خود ان کے الفاظ ہیں کہ ''اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔'' مولانا آزاد کے علم اور سیاسی رجحانات سے مولانا سندھی بہت متاثر تھے، خود ان کے استاد گرامی قدر شیخ الہند، مولانا آزاد کے افکار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

اس وقت تک وہ ایک خاص انداز سے اندرون ملک میں مصروف تگ و تاز تھے، لیکن اب حالات دوسری کروٹ لیتے ہیں یعنی ان کا سمندر فکر ایک نئی شاہراہ سیاست کا رخ کرتا ہے اور وہ ایک وادی عمل و حرکت میں قدم زن ہوتے ہیں۔ ۱۹۱۵ء (۱۳۳۳ھ) میں جب کہ پہلی جنگ عظیم کو شروع ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، شیخ الہند انھیں کابل جانے کا حکم دیتے ہیں۔ اس ضمن میں عجیب بات یہ ہے کہ نہ انھیں کابل کے بارے میں مفصل پروگرام دیا جاتا ہے اور نہ ان کی طبیعت ترک وطن پر آمادہ ہے، لیکن استاد کا حکم ہے جس کی سعادت مند شاگرد بخوشی تعمیل کرتے ہیں اور کابل پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں تمام معاملہ غیر منظم اور غیر مربوط ہے۔ سات سال کابل میں قیام کیا اور اس اثنا میں وہاں کی حکومت کے تعاون سے آزادی وطن کے لیے کوشاں رہے۔ مولانا محمد علی قصوری بھی وہیں تھے اور ان کا مشن بھی یہی تھا۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ تحریک آزادی کے سلسلے میں ایک مرتبہ اچھی خاصی رقم کی ضرورت پڑی تو زیادہ واقفیت نہ ہونے کے باوجود مولانا محمد علی قصوری سے کچھ رقم طلب کی۔ انھوں نے حکومت سے پیشگی تنخواہ لے کر فوراً مطلوبہ رقم دے دی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا محمد علی قصوری (ایم۔ اے کینٹب) اس وقت کابل کے حبیبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔

۱۹۱۶ء میں افغانستان کے حکمران امیر حبیب اللہ خاں نے مولانا سندھی کو ''ہندوستان میں ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔''

مولانا فرماتے ہیں کہ اس حکم کی ''تعمیل فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی'' اور وہ صورت یہ تھی کہ ''میں انڈین نیشنل کانگرس میں شامل ہو جاؤں'' چناں چہ ''اس وقت سے میں کانگرس کا ایک داعی ہوں۔''

۱۹۲۲ء میں مولانا سندھی نے امیر امان اللہ خاں کے دور حکومت میں کابل کانگرس کمیٹی قائم کی، جس کا

Marfat.com

آل انڈیا کانگرس سے الحاق ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوششوں سے ''گیا'' کے اجلاس میں منظور کیا گیا۔

کابل کانگرس کمیٹی کے قیام کے بارے میں مولانا سندھی کا ارشاد ہے کہ ''برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگرس کمیٹی ہے، اور اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریذیڈنٹ ہوں۔''

یہاں یہ عرض کر دیں کہ ۱۹۲۲ء میں ''گیا'' کے مقام پر تین جماعتوں کے اجلاس ہوئے تھے۔ سی، آر داس کی صدارت میں کانگرس کا، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا اور مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی کی صدارت میں جمعیت علمائے ہند کا۔

مولانا سندھی ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک سات سال کابل میں اقامت گزیں رہے۔ پھر اسی سال (۱۹۲۲ء) میں ماسکو چلے گئے۔ سات مہینے وہاں قیام فرمایا۔ اس مدت میں اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے ''سوشلزم کا مطالعہ'' کرتے رہے۔ نیشنل کانگرس سے تعلق کی بنا پر ان کو سوویت روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ وہاں ان کی لینن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس وقت لینن سخت بیمار تھا اور اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔

۱۹۲۳ء میں وہ انقرہ (ترکی) پہنچے۔ ترکی جانے کے لیے ماسکو میں متعین ترکی سفیر اور روس کی وزارت خارجہ نے بڑی مدد کی۔ برطانوی کارندوں کو اس کا بالکل علم نہیں ہو سکا تھا۔ تین سال ترکی میں قیام رہا۔ اس اثنا میں تحریک اتحاد اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا، جس کے لیے مستقبل قریب میں مولانا کو ''کوئی مرکز نظر نہ آیا۔'' اس لیے انھوں نے ''ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگرس میں داخل کرنا ضروری سمجھا۔''

صفر ۱۳۴۵ھ (ستمبر ۱۹۲۶ء) میں وہ مکہ مکرمہ پہنچے۔ حکومت حجاز کو انھوں نے یقین دلا دیا تھا کہ یہاں وہ کوئی سیاسی پراپیگنڈہ نہیں کریں گے۔ حکومت حجاز نے ان کی بات کو صحیح گردانا اور وہاں وہ ''ایک طرح سے محفوظ ہو گئے۔'' حکومت حجاز سے اگر کبھی جزوی امداد کی درخواست کی تو حکومت نے اسے پورا کر دیا۔

مکہ مکرمہ میں ان کی تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور سے علمی مدد کی۔ ہندوستانی خاندان میں اول شیخ عبدالوہاب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی اور تیسرے ابوالشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے مولانا نے خوب استفادہ کیا۔

عرب خاندان سے شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ دارالحدیث مکہ میں اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرمین کا خاندان مراد ہے۔

تیرہ چودہ سال وہ مکہ مکرمہ میں سکونت پذیر رہے۔ اس طویل مدت میں انھوں نے قرآن مجید کا خوب مطالعہ کیا اور اس کے مشکل مقامات کو مرکز تحقیق بنایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتابوں کو کامل غور و

Marfat.com

تعمق سے پڑھا اور ان کی حکمت کو سمجھنے کی کوشش کی۔

یہ ان کے لیے یک سوئی اور فراغت کا زمانہ تھا، اس سے انھوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، مولانا اسماعیل شہید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے افکار و تصورات کو لائق اعتنا ٹھہرایا اور اس سے مستفید ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں انڈین نیشنل کانگرس نے ان کی وطن واپسی کے لیے کوشش شروع کی۔ ان کے ہندوستانی دوست احباب بھی اس سلسلے میں کوشاں رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکم نومبر ۱۹۳۷ء کو انھیں وطن واپس جانے کی اجازت سے مطلع کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن حج کا موسم قریب تھا، اس لیے ادائے مناسک حج سے فراغت تک مراجعت وطن کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔ ۱۹۳۹ء کے مارچ میں انھوں نے ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا۔ ۱۹۱۵ء میں وہ ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے، ۱۹۳۹ء میں واپس آئے۔ اس طرح تقریباً پچیس برس ملک سے باہر رہے۔ پچیس برس میں سے دس سال دوسرے ملکوں میں اور کم و بیش پندرہ سال مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔

ہندوستان واپس آ کر وہ کیا کرنا چاہتے تھے؟ اس کا جواب انھی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ''انڈین نیشنل کانگرس کا معمولی ممبر تو ہمیشہ رہوں گا تا کہ عدم تشدد کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی قانون کے اندر منضبط رہے، اور پریشان دوستوں کی مشوش حرکات سے محفوظ رہ سکوں، لیکن کانگرس کی کسی پارٹی کے عملی حصے میں شرکت نہیں کروں گا۔

۲۔ میرا محبوب مشغلہ فلسفہ شاہ ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہوگا۔ میں اعلیٰ طبقے کے اہل علم کو اس طرف متوجہ کروں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانش مند لوگ مخاطب ہوں گے۔ اگر کوئی غیر مسلم، ہندو، مسیح، آزاد منش، اس فلسفے کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری امداد کروں گا۔

۳۔ جب کبھی حالات مناسب پیدا ہوئے تو میں نیشنل کانگرس میں فلسفہ امام ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل دوں گا۔''

مولانا سندھی نے مولانا ظفر علی خاں کی زبان میں کہنا چاہیے کہ چوتھائی صدی ملک سے باہر گزاری۔ اس اثنا میں ہندوستان میں بہت سی سیاسی اور مذہبی تحریکوں نے جنم لیا اور متعدد جماعتیں قائم ہوئیں جو سیاسیات میں بھی سرگرم عمل ہوئیں اور مذہبیات میں بھی۔ تحریک ہجرت، تحریک عدم تعاون اور ترک موالات اور تحریک خلافت وغیرہ۔ پھر رولٹ ایکٹ کی شدید مخالفت ہوئی اور اس کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے قتل و غارت بھی کیا اور لوگوں کو قید و بند کی مصیبتوں میں بھی ڈالا۔ پرنس آف ویلز کی آمد پر اس کے استقبال کا

Marfat.com

پورے ملک میں بائیکاٹ کیا گیا۔ سائمن کمیشن کا مقاطعہ ہوا۔

سیاسی و مذہبی جماعتوں میں مجلس خلافت قائم ہوئی، جمعیت علماے ہند معرض قیام میں آئی، مجلس احرار خاص جوش و جذبے کے ساتھ ابھری اور اس کے مقرروں نے لوگوں کا خون گرمایا اور انگریزی اقتدار کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ تحریک کشمیر نے تو اس کی آواز ہر جگہ پہنچا دی تھی۔

پھر مذہبی تحریکوں میں سکھوں کی اکالی لہر اٹھی، شدھی کی تحریک پیدا ہوئی، اس کے مقابلے میں تبلیغ کے کارواں ملک کے بالخصوص یوپی کے مختلف علاقوں میں روانہ ہوئے، مسجد شہید گنج کا قصہ شروع ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں خاکساروں نے گلیوں اور بازاروں میں چپ راست کا ملک گیر ہنگامہ بپا کیا۔ کئی مرتبہ ہندو مسلم فسادات ہوئے، جن میں انتہائی شدت بھی آئی۔ راجپال کی شائع کردہ کتاب رنگیلا رسول کے خلاف سخت احتجاج ہوا اور اس کا ناشر، ایک شخص علم الدین کے ہاتھوں قتل ہوا، علم الدین کو پھانسی کی سزا دی گئی اور اسے غازی علم الدین شہید کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی باتیں مولانا کی ملک سے غیر حاضری اور عدم موجودگی کے زمانے میں ظہور میں آئیں، جن سے لوگوں کے ذہن بالکل دوسرے سانچے میں ڈھل گئے۔ جب ۱۹۱۵ء میں مولانا یہاں سے گئے ہیں اس وقت صورت حال اور تھی اور جب وہ ۱۹۳۹ء میں واپس آئے ہیں تو معاملات کچھ اور نوعیت کے تھے۔ حالات کی تبدیلی نے لوگوں کے ذہنوں کو بالکل بدل دیا تھا اور سوچ بچار کے پیمانے وہ نہیں رہے تھے جنھیں مولانا اپنے دور میں چھوڑ کر یہاں سے گئے تھے۔

جب مولانا ہندوستان سے رخصت ہوئے، اس وقت مسلم لیگ برائے نام تھی، جب وہ آئے تو اس کا گھر گھر چرچا تھا اور اس کی تحریک پاکستان زوروں پر تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی بھی وہ کیفیت نہ تھی جو ۱۹۱۵ء میں تھی۔

مولانا طویل عرصے کے بعد ہندوستان آئے تو پورے ملک میں ان کا شان دار استقبال کیا گیا، ہر سو مسرت کا اظہار ہوا۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ (دہلی) میں بالخصوص خوشیاں منائی گئیں، مسلمان جماعتوں کے سیاسی رہنما اس لیے ان کی آمد پر شاداں و فرحاں تھے کہ آزادی ملک کے سلسلے میں وہ ان کو اپنے مفید مشوروں سے نوازیں گے، لیکن چند روز کے بعد ہی اپنے مداحوں کے متعلق ان کا انداز کلام اور بات چیت کا لہجہ کچھ اس قسم کا ہو گیا کہ ملک کی تمام مذہبی و سیاسی جماعتوں کے قائدین نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے آپ کو ان سے الگ رکھا جائے، چناں چہ یہی ہوا۔

انھیں ''امام انقلاب'' کہا جاتا ہے۔ بے شک وہ امام انقلاب ہوں گے، لیکن گزارش یہ ہے کہ انقلابی جماعتیں ان کے یہاں سے جانے کے بعد قائم ہوئیں اور انقلابی تحریکیں جن کی وجہ سے برصغیر کی آزادی کا دور

Marfat.com

قریب آیا، ان کی غیر موجودگی میں ابھریں۔ ان کے زمانے میں تو شاید یہاں انقلاب کا نعرہ بھی ایجاد نہیں ہوا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ جمعیت علمائے ہند اور مجلس احرار وغیرہ سب انقلابی جماعتیں تھیں، جنھوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی، اور مولانا ان انقلابی جماعتوں اور ان کے انقلابی رہنماؤں پر تنقید فرماتے رہے اور انھیں اپنے سے دور رہنے پر مجبور کیا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ کسی سرکردہ اور معروف عالم دین نے ان کے تفصیلی حالات وسوانح تحریر نہیں کیے۔ ایک پروفیسر محمد سرور جامعی ہیں جنھوں نے مولانا سندھی کے بارے میں لکھا اور بہت لکھا۔ ان کی کتابیں ہی دراصل مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آگاہ ہونے کے لیے حوالے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں، لیکن سرور صاحب ان معنوں میں عالم دین نہ تھے، جن معنوں میں یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ سرور صاحب کی ایک کتاب افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھی ہے۔ اس کے بارے میں بعض حلقوں میں مشہور ہے کہ خود سرور صاحب نے اپنے افکار مولانا سندھی کے نام سے بیان کیے ہیں۔

مولانا سندھی بہت بڑے عالم تھے، وہ ایک غیر مسلم خاندان سے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن کے قابل اعتماد شاگرد تھے اور انھی کے حکم سے ملک چھوڑ کر افغانستان گئے تھے، پھر آزادی وطن کے لیے انھوں نے مختلف ملکوں کے چکر لگائے، بے شمار لوگوں سے ملے اور طویل عرصے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ علاوہ ازیں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان اوصاف کے حامل عالم دین کے سوانح حیات ان کے کسی معروف ہم مسلک عالم نے کیوں نہیں لکھے؟

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کو (جو خیر سے اب سندھی کہلانے لگے ہیں) داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ستمبر ۱۹۹۴ء کو مولانا سندھی کے بارے میں سیمینار کا اہتمام کیا اور پچاس سال کے بعد کراچی کی ایک علمی مجلس میں ان کے متعلق مقالے پڑھے گئے جو کتابی شکل میں ڈاکٹر صاحب نے شائع بھی کر دیے ہیں۔

مولانا سندھی کی تصنیفات کے سلسلے میں بھی کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ مارچ ۱۹۸۴ء میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی لاہور تشریف لائے تھے، ان کے اعزاز میں ۲۷ مارچ کو حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف نے ہفت روزہ الاعتصام کے دفتر میں عصرانے کا اہتمام فرمایا تھا۔ عصرانے میں حافظ عبدالرشید ارشد (مکتبہ رشیدیہ، لاہور) نے ایک صاحب سے تعارف کرایا کہ ان کا اسم گرامی ڈاکٹر محمد امین مغل ہے اور انھوں نے مولانا سندھی کی تفسیر سورۃ البقرہ پر انگریزی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے۔

میرے خیال میں مولانا کی تحریری خدمات پر اب تک صرف یہی اہم کام ہوا ہے، اور یہ بھی ایک مقالہ ہے جو یونیورسٹی میں پڑا ہے اور شاید پڑا ہی رہے گا۔ اس سے محترم مقالہ نگار کو تو ذاتی طور پر فائدہ پہنچ گیا کہ وہ

Marfat.com

ڈاکٹر ہوگئے اوران کی ڈگری ان کے لیے ترقی کا زینہ بنی، مگراس سے کوئی دوسرا شخص تو مستفید نہ ہو سکا۔

اہل حدیث حضرات تو بلاشبہ اپنے بزرگوں کے حالات لکھنے میں طویل عرصے تک سوچ بچار میں مصروف رہتے ہیں اور ان کی تصنیفات کا تذکرہ کرنے میں بھی عام طور سے احتیاط سے کام لیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک العجلة من الشیطان (جلد بازی شیطانی حرکت ہے) پھرکئی سال کے بعدان میں سے کسی کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ فلاں شخص پر لکھنے کا ارادہ ہے، معلوم نہیں ان کے حالات کہاں سے معلوم ہوں گے۔ اس وقت تک اس کو جاننے اور اس سے ملنے والے بھی دنیاے فانی سے کوچ کر چکے ہوتے ہیں۔ لیکن دیوبندی حضرات کی تو یہ عادت نہیں۔ خدا جانے مولانا سندھی کے بارے میں ان حضرات کے قلم کیوں حرکت میں نہ آئے۔ مولانا احمد علی صاحب کو وہ اپنا بیٹا قرار دیتے تھے۔ ان کے حلقے میں بھی خاموشی چھائی رہی۔ دیوبندی اصحاب قلم کی عام روایت یہ ہے کہ اپنے کسی بزرگ کی موت کے سوا مہینے بعد ان کے حالات میں کتاب میدان اشاعت میں لے آتے ہیں، لیکن یہاں پچاس سال بعد بھی کسی کے قلم میں جنبش نہ ہوئی۔

مولانا سندھی کے خاص اور پسندیدہ موضوعات میں سے ایک اہم موضوع قرآن مجید کے معانی ومطالب پر غور کرنا تھا۔ مولانا احمد علی صاحب نے لاہور میں ہمیشہ درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا۔ شعبان، رمضان اور شوال کے تین مہینے وہ فارغ التحصیل طلبا کو قرآن کے مطالب سمجھاتے تھے۔ طویل مدت کے بعد مولانا سندھی یہاں آئے تو قیام لاہور کے دنوں میں وہ بھی اپنے انداز میں طلبا کو درس قرآن دینے لگے۔ ۱۹۴۲ء میں مولانا معین الدین لکھوی بھی تین مہینے مولانا احمد علی کے درس میں شامل رہے۔ قرآن کا سہ ماہی نصاب مکمل ہوا تو مولانا سندھی سے تقسیم اسناد کے لیے عرض کیا گیا۔ امتحان میں اول درجے پر مولانا معین الدین آئے تھے۔ مولانا سندھی سے ان کا تعارف کرایا گیا تو نہایت خوش ہوئے اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لڑکا حضرت حافظ محمد لکھوی کا پڑپوتا ہے جو پنجاب کے مشہور مفسر قرآن اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ قرآن کے تفسیری امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا ہے۔ یہ اس درجے کا مستحق تھا اور اسے یہی درجہ حاصل کرنا چاہیے تھا۔ پھر فرمایا میں اس کے پڑدادے کی کتاب احوال الآخرت پڑھ کر مسلمان ہوا تھا۔ اس اعتبار سے یہ لڑکا میرا محسن ہے اور مجھے اسے دیکھ کر اور اس سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

مولانا سندھی نے ۲۲۔ اگست ۱۹۴۴ء کو وفات پائی اور انھیں دین پور (ضلع رحیم یار خاں) میں دفن کیا گیا۔

میں نے اپنی تصنیف فقہائے ہند کی متعدد جلدوں میں اچ شریف اور دوسرے بہت سے مقامات کے فقہائے کرام کے حالات قلم بند کیے ہیں، جی چاہتا تھا کہ کبھی ان مقامات کا چکر لگایا جائے اور وہاں جا کر ان بزرگان دین کے لیے دعا کی جائے جو اگرچہ ہم گنہگاروں کے محتاج نہیں تاہم دل میں ایک جذبہ موجود تھا۔ چناں چہ

Marfat.com

۱۹۸۸ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں اپنے ایک دوست محمد سعید قادری کے ساتھ وہاں پہنچا۔ قادری صاحب نہایت مخلص اور پیارے دوست تھے، افسوس ہے، چندروز کی علالت کے بعد نومبر ۱۹۹۰ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس سفر کے دوران ہم دین پور بھی گئے جو خان پور سے پانچ میل آگے ہے۔ عصر کی نماز ہم نے دین پور کی مسجد میں پڑھی۔ حضرات احناف فجر اور عصر کی نمازیں کچھ تاخیر سے پڑھتے ہیں۔ نماز کے فوراً بعد ہم مسجد سے نکلے اور ایک نوجوان سے قبرستان کا راستہ پوچھا۔ اس نے کہا کہ اس کا گھر قبرستان کے قریب ہے اور وہ گھر جا رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں، آپ کو قبرستان پہنچادوں گا۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے بتایا کہ ہم لاہور سے آئے ہیں۔

اس نے اپنا گھر دکھایا اور قبرستان سے واپسی کے بعد چائے کے لیے کہا۔ قبرستان میں مولانا سندھی کی کچی قبر کے قریب چھوٹی سی صف بچھی ہوئی تھی اور ایک شخص وہاں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ ہم نے اللہ کے حضور ہاتھ پھیلائے اور دعا مانگی۔ ان کے قریب ہی مولانا لال حسین اختر کی قبر تھی۔ اس پر تاریخ وفات مرقوم نہیں تھی، البتہ تختی پر ان کا نام لکھا تھا۔ ان کے لیے بھی دعا کی۔ وہ اس فقیر پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کو ۱۹۳۵ء میں اپنے وطن میں دیکھا تھا، وہاں انھیں سالانہ جلسے میں بلایا گیا تھا۔ تقسیم ملک کے بعد وہ لاہور آئے تو باہم میل جول کا سلسلہ بڑھا۔ اگر ان کے کچھ حالات میسر آجائیں تو ان پر لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ بڑے نفیس آدمی تھے۔ ان کا اصل وطن دھرم کوٹ رندھاوا (ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب) تھا...... قدرت کے بھی عجیب معاملے ہیں، کہاں پیدا ہوئے اور کہاں تدفین ہوئی۔

قبرستان سے واپس آئے تو وہ نوجوان اپنے گھر کے دروازے پر ہمارے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے گلی میں چارپائی بچھائی، دیہاتی کلچر کے مطابق ڈول میں چائے لایا اور مخلصانہ احترام کے ساتھ دو پیالوں میں ڈال کر ہمیں پیش کی۔ ایک بڑی سی تھالی میں دس پندرہ رس لاکر ہمارے سامنے رکھ دیے گئے۔ اس کے پرخلوص رویے سے ہم بہت متاثر ہوئے، نہ ہم اسے جانتے ہیں، نہ وہ ہم سے متعارف ہے، نہ آئندہ ملاقات کا امکان ہے لیکن اس کا خلوص ہمیشہ یاد رہے گا۔

اجازت لے کر چلنے لگے تو وہ ساتھ ہی چل پڑا۔ اب سورج شفق کی ارغوانی چادر اوڑھ کر نظروں سے غائب ہوگیا تھا اور مغرب کی اذان پردۂ سماعت سے ٹکرانے لگی تھی۔

میں نے پوچھا: یہاں کس مسلک کے لوگوں کی زیادہ آبادی ہے؟

کہا: دیوبندیوں کی۔

سوال کیا: بریلوی حضرات یہاں موجود ہیں؟

جواب دیا: نہیں۔

Marfat.com

گاؤں کے وسط میں ایک اونچے سے مکان پر شیعہ حضرات کا سیاہ علم لہرا رہا تھا۔

پوچھا: یہاں شیعہ حضرات کے کتنے گھر ہیں؟

بولا: صرف ایک، جس پر وہ علم گڑا ہوا ہے۔

میں نے کہا: یہ لوگ جہاں رہیں، تھوڑے ہوں یا زیادہ اپنا وجود منوا کر رہتے ہیں۔ ہم اہل حدیث ٹھہرے۔ کسی نہ کسی طرح تک اپنی بات نہ کرلیں، ہمیں صبر نہیں آتا۔

پوچھا: یہاں کوئی اہل حدیث کا گھر بھی ہے، جنھیں وہابی کہا جاتا ہے۔

کہا: نہیں۔

ہم مسجد میں آئے، مغرب کی نماز پڑھی۔ نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور واپس خان پور آگئے۔

ایک ہفتہ ہم اس علاقے میں رہے۔ تمام بڑے بڑے مقامات کی سیر کی۔ اس نواح کے مشہور بزرگوں کے مزار دیکھے اور دعائیں کیں۔

یہ ہمارا خالص غیر وہابیانہ دورہ تھا۔

دین پور واقعی دین پور ہے۔ اس گاؤں کا بانی شاید کوئی شخص دین محمد ہوگا اور وہ دین محمدی ﷺ پر عامل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گاؤں آگے چل کر دین داروں کا مسکن ہوا، اور پھر مدفن بھی اسی قسم کے لوگوں کا ٹھہرا۔

دین پور سے مغرب کے بعد ہم روانہ ہوئے تو ذہن بہت دور زمانہ ماضی میں چلا گیا، جب کہ نہ اس نواح میں سڑکیں ہوتی تھیں، نہ صحیح طور سے سیدھے راستے۔ آبادی بھی زیادہ نہیں تھی، کئی کئی کوس کے فاصلے پر مختصر آبادی والا کوئی چھوٹا سا گاؤں نظر آتا تھا۔ دوران سفر کھانے پینے کی کسی چیز کا میسر آنا بھی مشکل تھا۔ اب آبادی بھی بہت بڑھ گئی ہے اور جگہ جگہ تارکول کی شان دار سڑکیں بن گئی ہیں، ہر بڑی سڑک سے ذیلی سڑکیں نکال کر اس سے دیہات کا رابطہ قائم کر دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دور دراز کا سفر بھی آسان ہو گیا ہے۔ بہت عرصہ پہلے جب یہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں، لوگ پیدل چل کر یا اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے ذریعے اپنی منزل مقصود کو پہنچتے تھے۔ زیادہ تر اصحاب تصوف وسلوک اور اہل اللہ بے آباد مقامات پر یا کسی چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ کتنے باہمت تھے وہ لوگ جو محض نیکی سیکھنے، علم پڑھنے اور رشد و ہدایت کی باتیں سننے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ یہ بات ذہن میں گردش کرنے لگی کہ مولانا عبیداللہ سندھی کہاں پیدا ہوئے اور کس خاندان میں جنم لیا پھر کس طرح اسلام کی طرف متوجہ ہوئے، کس طرح دینی علوم حاصل کیے، کتنے ملکوں کا سفر کیا، کن کن لوگوں سے ملاقاتیں کیں، کس نہج سے زندگی بسر کی اور اب کہاں آسودۂ لحد ہیں۔

اللهم نور قبره ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس.

Marfat.com

مولانا احمد علی لاہوری

پورا قد، متوسط جسم، نورانی چہرہ، لمبی داڑھی، روشن آنکھیں، چلیں تو عالمانہ وقار کے حامل، بولیں تو موتی برسائیں، صاف ستھرے مگر سادہ لباس میں ملبوس، ہونٹوں پر ہر آن مسکراہٹ چھائی ہوئی، یبوست سے دور، عبوست سے نفور، ذہن تعصب سے خالی، گفتگو میں نرم، عمل میں گرم، کردار میں پاکیزہ، عمدہ خصائل، خوش مزاج، اخلاق میں قرآن کے قالب میں ڈھلے ہوئے، مہمان نواز، معاصرین کے احترام میں بے مثال، اہل علم کی تکریم میں سب سے آگے، چھوٹوں کے مشفق، متبع سنت، قاطع بدعت، مبلغ توحید، تحریک حریت برصغیر کے بطل جلیل، تفسیر قرآن میں یکتا، عمل بالحدیث میں حریص، فقہ میں ماہر، تصوف میں نمونہ سلف، طریقت میں منفرد، وعظ و تبلیغ دین میں پوری ایک جماعت کے قائم مقام، ایثار پیشہ، نصح و خیر خواہی کے پیکر، اعتدال و توازن کا مرقع، ذکر و فکر کا دل نواز مجموعہ، حامل شریعت محمدیہ ﷺ......! یہ تھے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ......!

سب سے پہلے مولانا مرحوم کا اسم گرامی میں نے ۱۹۳۵ء میں سنا۔ وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا اور تھوڑی بہت اردو پڑھ اور سمجھ لیتا تھا۔ ان دنوں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ہمارے وطن کوٹ کپورہ (مشرقی پنجاب) میں قیام فرماتے تھے اور وہاں کی مسند خطابت و تدریس ان کے سپرد تھی۔ میں ان سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھتا تھا۔ وہ کسی کام سے لاہور تشریف لائے اور واپسی پر ۲۰×۳۰/۱۶ سائز کی ایک موٹی سی کتاب عنایت کی۔ اسے کھول کر دیکھا تو وہ چند چھوٹے چھوٹے دینی اور مذہبی رسائل پر مشتمل تھی جو مولانا احمد علی مرحوم کے تصنیف کردہ تھے اور ایک ہی جلد میں مجلد تھے۔ ان کے نام اصلی حنفیت، میلاد مروجہ کی شرعی حیثیت وغیرہ تھے۔ انجمن خدام الدین شیراں والا دروازہ لاہور کی طرف سے شائع کیے گئے تھے۔ زبان سادہ اور عام فہم تھی۔ ان کے مضامین کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ ہر بات دل کی تہوں میں اترتی جاتی تھی۔ میں نے وہ رسالے بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے، بہت سے لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیے، متعدد افراد نے یہ رسالے انجمن خدام الدین سے منگوائے اور ان کا مطالعہ کیا...... رسالوں کا تعارف کراتے ہوئے مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف ان کے مصنف شہیر مولانا احمد علی صاحب کی بڑی تعریف کرتے اور ان کی علمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی وضاحت فرماتے۔

اس کے بعد وقت گزرتا گیا اور مولانا احمد علی کی بھرپور اور پر خلوص علمی، عملی اور سیاسی مساعی کے چرچے

Marfat.com

سننے اور پڑھنے میں آتے رہے۔ ۱۹۴۱ء کی سردیوں میں یہ فقیر حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل مرحوم (گوجراں والا) کے سلسلہ درس اور حلقہ تلمذ میں شریک تھا کہ ایک دن مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم انیس بیس سال کے ایک جوان رعنا کو جو سفید کھدر کا کرتہ شلوار پہنے ہوئے اور کھدر ہی کی سفید چادر اوڑھے ہوئے تھے، مولانا محمد اسماعیل مرحوم کی خدمت میں لے کر آئے اور ان کے مدرسے میں داخل کرایا۔ (میری عمر اس سے تین چار سال کم تھی) معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کے صاحب زادہ گرامی قدر ہیں اور ان کا نام عبیداللہ انور ہے۔ اس زمانے میں اگرچہ وہ ''مولانا عبیداللہ انور'' نہ تھے، تاہم ''صاحب زادہ'' تھے اور ملک کے بہت بڑے عالم دین کے بیٹے تھے، اس لحاظ سے سب طلبا ان کی تکریم کرتے تھے۔

مولانا عبیداللہ انور خاموش طبع اور کم آمیز تھے۔ پھر عالی مرتبت باپ کی طرح کسی قدر تصوف و طریقت کے جوہر اس عمر میں بھی ان میں پائے جاتے تھے۔ وہ زیادہ عرصہ وہاں نہیں رہے، مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ رہے ہوں گے۔ میں جب ان کو دیکھتا دل میں خیال آتا، کاش ان کے والد گرامی کی زیارت کا موقع ملے۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں جمعیت علمائے ہند کا سالانہ جلسہ زیر صدارت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی لاہور میں ہونا قرار پایا تھا اور اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا احمد علی کو اور ناظم مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو بنایا گیا تھا۔ اخبارات و اشتہارات میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے چھپتے رہے۔ لیکن مولانا عبیداللہ سندھی نے مولانا احمد علی کو سختی کے ساتھ صدر استقبالیہ بننے سے روک دیا تھا۔ روکنے کی اس زمانے میں کئی وجوہ بیان کی جاتی تھیں، جن کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ بعد میں صدر استقبالیہ مولانا عبدالقادر قصوری کو بنایا گیا تھا اور ناظم بہ دستور مولانا داؤد غزنوی رہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اب تک حضرت مولانا احمد علی مرحوم کے فقط اسم گرامی سے آشنائی تھی، ان کی زیارت کا موقع میسر نہ آیا تھا۔ ان دنوں ان کی مسجد (واقع شیراں والا دروازہ) میں ان کی زیارت بھی ہو گئی۔

دوسری مرتبہ ۱۹۴۸ء کے آخر میں ان کے دیدار ہوئے جب کہ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے لاہور آیا۔ نماز جمعہ پڑھنے کے لیے مولانا کی مسجد میں گیا، وہ تقریر کر رہے تھے، ان کی تقریر کے بعض جملے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا تھا۔

> ''پاکستان اسلام کے لیے بنایا گیا ہے۔ حکمرانو! اسے اسلام کے حوالے کر دو۔ اس ملک سے غیر اسلامی طور طریق مٹا دو۔ اس میں فقط اسلام ہی کی ترویج کرو۔ اگر اسلام نہیں لاؤ گے تو میں اللہ کے حضور تمھارے خلاف گواہ بنوں گا اور اس کے دربار میں عرض کروں گا کہ انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ جو لوگ لٹ پٹ کر یہاں آئے ہیں، وہ قیامت کے روز تمھارا دامن پکڑیں گے،

Marfat.com

اور میدان حشر میں تمھیں کھینچیں گے، وہ بڑا نازک وقت ہوگا، تم اللہ کو کیا جواب دو گے؟''

مولانا ایک خاص جذبے اور جوش سے یہ باتیں کہہ رہے تھے۔ ساتھ ہی لوگوں کی تائید بھی حاصل کر رہے تھے۔ انھوں نے سر سے عمامہ اتار رکھا تھا اور عجیب وغریب اسلوب سے جو بڑا ہی موثر اسلوب تھا، تقریر ارشاد فرما رہے تھے۔

نماز جمعہ کے بعد ہجوم میں گھس کر میں نے ان کو سلام کیا اور واپس آ گیا۔ یہ ان کی زیارت کا دوسرا موقع تھا اور تقریر سننے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا تھا۔

کچھ عرصے بعد ہفت روزہ الاعتصام جاری ہوا، اس کی ادارت میرے سپرد ہوئی تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کے متعدد مواقع میسر آئے، مولانا سید داؤد غزنوی کی معیت میں بھی ان کے ہاں گیا اور تنہا بھی کئی مرتبہ حاضر ہوا۔ میں جب جاتا دعا کی درخواست کرتا۔ وہ نہایت شفقت سے خیروعافیت پوچھتے اور دعا دیتے۔ اس ضمن میں چند واقعات جنھیں میرے ذاتی مشاہدات وتاثرات سے تعبیر کرنا چاہیے، ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۹۵۳ء میں جب تحریک تحفظ ختم نبوت کا ہنگامہ زوروں پر تھا، میں ایک دن مولانا غزنوی کا خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسجد میں گیا تو پتا چلا کہ گھر تشریف لے گئے ہیں۔ مسجد سے ایک آدمی مجھے گھر لے گیا۔ مولانا تشریف فرما تھے۔ باہر آئے اور حسب معمول تپاک سے ملے۔ کمرے میں بٹھایا اور حاضری کی وجہ دریافت فرمائی۔ میں نے مولانا غزنوی کا خط پیش کیا۔ خط پڑھا اور زبانی اس کا جواب دیا۔ فرمایا میں تم پر اعتماد کرتا ہوں کہ میرے ہی الفاظ مولانا سے بیان کرو گے۔ بعدازاں اصرار کر کے شربت کا گلاس عنایت فرمایا اور میں نے تبرک سمجھ کر پیا۔ رخصت کرنے کے لیے مسجد تک میرے ساتھ تشریف لائے۔ میں احتراماً ذرا پیچھے ہٹتا تو خود میرے برابر ہو جاتے۔

میں نے واپس آ کر سارا واقعہ مولانا غزنوی سے عرض کیا تو فرط مسرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اور حضرت مولانا کی درازی عمر کے لیے دعا فرمائی۔

۱۹۵۵ء میں ایک نہایت عجیب واقعہ پیش آیا جو میرے لیے بہت ہی خوشی کا باعث تھا۔ اس واقعہ سے پہلے اس کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے جو مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ مئی ۱۹۵۵ء میں حجیت حدیث کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صحیح بخاری کی احادیث کی صحت وعدم صحت کے بارے میں چند الفاظ ارشاد فرمائے، جو مسلک اہل سنت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے الاعتصام میں اداریہ لکھا جس میں صحیح صورت حال کی وضاحت کی گئی تھی اور محدثین کے موقف کی روشنی میں صحیح بخاری کی تمام احادیث کو صحیح ثابت کیا گیا تھا۔ اس پر جماعت اسلامی کے رسائل وجرائد نے ایک بحث شروع کر دی۔

Marfat.com

اس بحث نے اتنا طول کھینچا کہ دو ڈھائی سال جاری رہی۔ یہ ''اخباری جنگ'' اپنی فطرت کے مطابق چوں کہ مختلف محاذوں میں پھیل گئی تھی، اس لیے چند روز نامے بھی اس موضوع سے متعلق الاعتصام کے بعض اداریے اور شذرات شائع کرنے لگے، جن میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کا روز نامہ نوائے پاکستان پیش پیش تھا۔ پھر نوائے وقت اور امروز بھی بعض اوقات جماعت اسلامی کے سیاسی کوائف سے متعلق الاعتصام کا ادارتی مواد چھاپتے اور اپنے انداز میں اس پر تبصرہ کرتے تھے۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب کو بھی بعض امور میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی سے اختلاف تھا۔ جس کا وہ اظہار بھی کرتے رہتے تھے، اور یہ کوئی ایسی بات نہ تھی، اختلاف ہر شخص کو ہر شخص سے ہوسکتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جماعت اسلامی کے قائدین نے اپنے ایک کارکن افتخار احمد قدوسی (ناظم شعبہ خدمت خلق جماعت اسلامی لاہور) کی طرف سے مولانا احمد علی پر عدالت میں مقدمہ دائر کرا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مولانا نے کہا ہے کہ امریکہ کی طرف سے جماعت اسلامی کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ مولانا نے جماعت پر یہ الزام عائد کیا ہے اور اس کا مقصد جماعت کو بدنام کرنا ہے۔

جماعت اسلامی کی قیادت کی یہ عجیب حرکت تھی۔ مولانا احمد علی پر مقدمہ دائر کرنا اور انھیں عدالت میں لے جانے کی کوشش کرنا اچھی بات نہ تھی...... سیاسیات میں یہ سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کوئی کسی سے کہتا ہے، یہ روس سے پیسے لیتے ہیں، کوئی کہتا ہے امریکہ سے لیتے ہیں۔ لیکن کوئی کسی پر مقدمہ دائر نہیں کرتا، نہ اسے عدالت میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ خود جماعت اسلامی والوں کے اسلام اور سیاست کا کاروبار اس نوع کی الزام تراشیوں اور دوسروں کو رگیدنے کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ سیاست دانوں کے پاس ایک دوسرے پر گرمی سردی جھاڑنے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔

بہرحال یہ سلسلہ بہت آگے بڑھ گیا تو مولانا محمد علی قصوری (ایم۔اے کینٹب) مرحوم درمیان میں پڑے اور مصالحت کی غرض سے متعلقہ فریقوں کے بعض حضرات کو اپنے مکان (واقع ۲۱ ٹیمپل روڈ لاہور) میں مدعو کیا۔ جماعت اسلامی کی طرف سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، میاں طفیل محمد اور ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم تشریف لائے۔ مولانا احمد علی صاحب کی طرف سے خود حضرت مولانا مرحوم، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش مرحوم (ایڈیٹر نوائے پاکستان) شریک ہوئے۔ ان کے ساتھ تیسرے بزرگ اور تھے، جن کا چوہدری عبدالرحیم کہہ کر میکش مرحوم نے تعارف کرایا تھا۔

ایک مرتبہ مولانا عبیداللہ انور مرحوم نے مجھے بتایا کہ یہ چوہدری عبدالرحیم دراصل ہماری ریاست (فریدکوٹ) کے رہنے والے تھے اور طویل مدت سے حضرت مولانا احمد علی صاحب کے دامن عقیدت سے

Marfat.com

وابستہ تھے۔ مولانا ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور وہ انجمن خدام الدین کی بعض اہم ذمے داریوں پر فائز تھے۔ نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ تیکھے نقوش، گورے چٹے، دراز قامت، ہنس مکھ، کلے پر ململ کی سفید رنگ کی کلف لگی ہوئی طرے دار پگڑی۔!

جماعت اہل حدیث کی طرف سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف تشریف لائے تھے اور یہ بندۂ عاجز الاعتصام کے ایڈیٹر کی حیثیت سے شامل اجلاس تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی دعوت دی گئی تھی، لیکن بروقت اطلاع نہ پہنچنے کی وجہ سے وہ تشریف نہ لا سکے جس کا انھیں افسوس ہوا۔

میزبان خود مولانا محمد علی قصوری مرحوم تھے اور ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری گفتگوئے مصالحت میں ان کے معاون......!

دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور زیر بحث معاملات کی تمام شقیں سامنے آئیں۔ سب نے بحث میں حصہ لیا، لیکن مولانا احمد علی، مولانا عطاء اللہ حنیف اور یہ عاجز بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ میں چوں کہ سب سے کم سن تھا لہٰذا معزز مہمانوں کو پانی پلانے اور چائے پیش کرنے کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اس قسم کے مباحث سیاسی اور صحافتی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ یہ کوئی انوکھی یا نئی بات نہ تھی۔

بہر حال اس موقعے پر اختصار کے ساتھ یہ واقعہ اس لیے زبان قلم پر آ گیا ہے کہ میں مجلس سے اٹھ کر کسی کام سے باہر برآمدے میں آیا تو مولانا احمد علی صاحب بھی تشریف لے آئے، آتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گئے اور میرا ماتھا چوما۔ فرمایا:

''میں تمھارے مضامین ومقالات باقاعدہ عبید اللہ انور سے سنتا ہوں، خوش ہوتا ہوں اور تمھیں دعا دیتا ہوں۔ اللہ تمھیں صحت وعافیت سے رکھے۔ تم دین کی خدمت کر رہے ہو۔''

ان کے یہ الفاظ اور مشفقانہ انداز میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ میں نے سر جھکا کر اظہار تشکر کیا اور دعائے خیر میں یاد رکھنے کی درخواست کی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ فیصلہ ہوا تھا کہ جماعت اسلامی دو چار روز میں مولانا احمد علی صاحب کے خلاف دائر کردہ مقدمہ واپس لے لے گی۔ لیکن اس فیصلے پر فوری طور پر عمل نہیں ہوا تھا، تین چار مہینے کے بعد مقدمہ واپس لیا گیا تھا۔

ایوب خاں کی حکومت کا دور تھا۔ ایک روز میں نماز ظہر سے قبل اپنے دفتر میں بیٹھا الاعتصام کے لیے اداریہ لکھ رہا تھا کہ ایک صاحب آئے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا تھوڑی دیر تشریف رکھیے، ظہر کی اذان ہونے والی ہے، مولانا نماز کے لیے تشریف لائیں گے تو مل لیجیے گا۔

Marfat.com

مولانا آئے، نماز پڑھی اور اپنے نیچے کے کمرے میں جسے وہ بطور دفتر استعمال کرتے تھے، چلے گئے۔ میں نو وارد کو ان کے پاس لے گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ علاقہ نواب صاحب کے گاؤں علی رضا آباد سے آئے ہیں...... مولانا عبدالستار خاں نیازی نے انھیں بھیجا ہے۔ سنی المسلک ہیں، ان سے شیعہ حضرات کا کچھ جھگڑا ہو گیا ہے اور معاملہ مذہبی اعتبار سے سنگین نوعیت اختیار کر گیا ہے۔

مولانا غزنوی نے ان کی بات سن کر لاہور کے علمائے کرام کی میٹنگ طلب کی جن میں مولانا احمد علی صاحب کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ ان کو ٹیلی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سخت مصروف ہیں اور معذرت خواہ ہیں کہ فوری طور پر تشریف نہیں لا سکتے۔ لیکن کچھ حضرات آ گئے اور میٹنگ ہوئی۔ دوسرے روز مولانا کی سہولت کے پیش نظر مسجد شیراں والا ہی میں میٹنگ کا انتظام کر لیا گیا۔ مولانا مرحوم سب شرکائے میٹنگ سے ملے، بڑی خوشی کا اظہار کیا اور کاروائی میں پورا حصہ لیا۔ کارروائی میں نے لکھی، میٹنگ ختم ہوئی اور حاضرین واپس چلے گئے۔ کارروائی کو آخری شکل دے کر دستخط کرانے کی غرض سے میں دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بے حد شفقت سے پیش آئے۔ کارروائی پڑھی اور دستخط فرمائے۔ میں اجازت لے کر چلنے لگا تو کھڑے ہو گئے۔ میں نے ہر چند عرض کیا کہ تشریف رکھیے، میں اس ذرہ نوازی پر انتہائی شکر گزار ہوں۔ مگر نہیں مانے، مسجد کے دروازے تک میرے ساتھ آئے اور فرمایا:

''تم کئی وجہ سے میرے لیے باعث تکریم ہو، ایک تو مہمان ہو، دوسرے کار خیر سے آئے ہو۔ تیسرے مولانا غزنوی کے سفیر کی حیثیت سے آئے ہو، جو میرے لیے لائق احترام ہیں۔ سفیر کا احترام بھی ضروری ہے، چوتھی وجہ یہ ہے کہ تمھارے اداریے پڑھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔''

مجھے رخصت کرتے وقت فرمایا:

''مولانا غزنوی سے بہت بہت سلام کہنا۔''

یہ ان کے انکسار اور تواضع کی انتہا تھی۔ ورنہ کہاں یہ گنہگار اور سراپا معصیت اور کہاں وہ پیکر خیر اور مرقع علم و فضل......!

مولانا احمد علی اور مولانا سید داؤد غزنوی کے باہمی تعلقات بڑے پرانے اور گہرے تھے۔ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی انتہائی تکریم کرتے تھے۔ مجھے اس کا پورا علم اور کامل احساس تھا۔ مولانا غزنوی برداشت نہ کرتے تھے کہ مولانا احمد علی کے خلاف کوئی لفظ بھی کہا جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ لائق تذکرہ ہے۔

مولانا احمد علی صاحب نے ایک مرتبہ مجلس ذکر میں کشف قبور کے متعلق اپنے کچھ تجربات و مشاہدات بیان فرمائے اور کوئی ایسی بات کہی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ قبر میں میت جن حالات سے دوچار ہو اس کا انھیں

Marfat.com

مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ میں نے الاعتصام میں اس پر ایک شذرہ لکھا اور نہایت ادب سے چند سطور میں حضرت مولانا کے نقطہ نظر سے اظہار اختلاف کی جرات کی۔

اس کے تیسرے یا چوتھے روز مولانا غزنوی نے مجھے فرمایا:

''ایڈیٹر صاحب! میں نے مولانا احمد علی صاحب کے کشف قبور کے بارے میں آپ کا ادارتی نوٹ پڑھا۔ آپ یہ فرمایئے کہ اگر مولانا احمد علی صاحب اتنے نیک ہو جائیں کہ انھیں کشف قبور ہونے لگے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟''

اس ایک ہی جملے سے میرا مسئلہ حل ہو چکا تھا، میں نے عرض کیا: ''میں سمجھ گیا، آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔''

اس سے ان دونوں بزرگوں کی ذہنی ہم آہنگی، فکری مطابقت، مسائل تصوف میں موافقت اور تعلقات کی بہ درجہ غایت نزاکت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لاہور کی علمی اور تبلیغی تاریخ میں مولانا احمد علی مرحوم کی کچھ اولیات اور خصوصیات ہیں جن کی حیثیت صدقہ جاریہ کی ہے۔ اس عروس البلاد کی روحانی اور عملی فضاؤں میں ان کے اثرات ہمیشہ قائم رہیں گے اور مولانا مرحوم اس کے اجر و ثواب سے متمتع ہوتے رہیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

۱۔ مولانا مرحوم سے پہلے بھی اگرچہ لاہور کی چینیاں والی مسجد میں حضرت مولانا عبدالواحد غزنویؒ کا سلسلہ درس جاری تھا تاہم مولانا احمد علی پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے اپنے درس میں تسلسل پیدا کیا اور اس کو باقاعدگی کے سانچے میں ڈھالا۔ وہ بغیر کسی شدید مجبوری کے اس میں ہرگز ناغہ نہ کرتے تھے۔

۲۔ ان کا نہج تفہیم اور طریق کلام کچھ اس قسم کا تھا کہ ان کے درس قرآن مجید سے عوام اور خواص یکساں اثر پذیر ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے اور ان کے اصحاب عقیدت مختلف طبقات پر محیط ہیں۔

۳۔ وہ فقط لاہور ہی کے نہیں بلکہ برصغیر کے پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے سال میں سہ ماہی (شعبان، رمضان، شوال) سلسلہ درس قرآن کا آغاز کیا، جس میں پاک وہند کے مشاہیر علمائے کرام ان سے مستفید ہوئے۔ علما کی اس عالی مقام جماعت میں بعض بین الاقوامی شہرت کے حضرات بھی شامل ہیں، مثلاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اسی بلند بخت گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے عظیم و مشہور علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ندوۃ العلما لکھنؤ کے مہتمم اعلیٰ ہیں، جہاں تفسیر قرآن باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ مگر وہ قرآن کے خاص تفسیری نکات سمجھنے کے لیے لکھنؤ سے چلے اور لاہور آکر مولانا احمد علی کے دائرہ شاگردی میں داخل ہوئے۔ پھر مشرقی پنجاب کے لکھوی خاندان کے جلیل القدر رکن اور

Marfat.com

جماعت اہل حدیث کے رہنما مولانا معین الدین لکھوی نے بھی ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حالاں کہ خود ان کے آباواجداد کا بہت بڑا مدرسہ تھا اور ان کے پردادا حضرت مولانا حافظ محمد لکھویؒ پنجاب کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے تفسیر محمدی کے نام سے سات جلدوں میں پنجابی نظم اور فارسی نثر کے حواشی میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر کئی دفعہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہے، لیکن اس کے باوجود مولانا معین الدین لکھوی نے مفسر قرآن حضرت مولانا احمد علی کے باب علم پر دستک دی۔

۴۔ مولانا احمد علی طائفہ علما میں اولین بزرگ ہیں، جن سے بی۔اے اور ایم۔اے کرنے کے بعد متعدد حضرات نے باقاعدہ دینی علوم کی تحصیل کی اور اسلام کے مبلغین کی حیثیت سے شہرت پائی۔ پھر پاک وہند کے اونچے تعلیمی اداروں میں بلند مناصب پر فائز ہوئے مثلاً علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

۵۔ مولانا مرحوم پاکیزہ فکر اور صاف ذہن کے مالک تھے اور مسلکی تعصب سے پاک۔ اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خود اپنا بہت بڑا حلقہ ارادت وعقیدت رکھنے کے باوصف عمر بھر پہلے حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم اور ان کے بعد مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی اقتدا میں لاہور کے منٹو پارک میں (جواب اقبال پاک کے نام سے موسوم ہے) عیدین کی نماز ادا فرماتے رہے۔ ہمیشہ صف اول میں امام کے پیچھے جا کر بیٹھ جاتے اور پورا خطبہ سننے کے بعد وہاں سے اٹھتے۔

پھر ان کی یہ بلندی کردار اور وسعت قلب ونظر ملاحظہ ہو کہ اپنی ایک صاحب زادی مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم کے عقد میں دی جو مشہور اہل حدیث عالم ومبلغ، معروف مصنف ومناظر اور ہفت روزہ مسلمان اور جریدہ اهل حدیث کے نامور ایڈیٹر تھے۔ رحمهما الله تعالىٰ رحمة واسعة۔

۶۔ ان کے انہی اوصاف کی وجہ سے ان کے ارادت مندوں میں احناف کے علاوہ اہل حدیث بھی کثیر تعداد میں شامل ہوئے۔ ان کا یہ وصف قابل ذکر ہے کہ وہ معاصرانہ رقابت سے مبرا تھے۔ لاہور میں کسی ہم فکر عالم دین کے درس قرآن کا سلسلہ شروع ہوتا تو مسرت کا اظہار فرماتے۔ ۱۹۳۰ء میں مولانا محمد حنیف ندوی نے مسجد مبارک (اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور) میں درس قرآن کا آغاز کیا تو حضرت مرحوم مسجد مبارک میں گئے۔ مولانا ندوی کو مبارک باد دی اور دعا فرمائی۔

۷۔ مرحوم انتہائی جرات مند عالم دین تھے۔ وہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس شہر میں نہایت دلیری کے ساتھ تحریری اور تقریری صورت میں توحید کی تبلیغ کی اور زبردست مخالفت کے باوجود موحدین کی ایک عظیم جماعت پیدا کی جن میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی شامل تھے اور قدیم اہل علم حضرات بھی۔

Marfat.com

۸۔ انھوں نے اپنے تلامذہ اور ارباب عقیدت کو علمی درس بھی دیا اور عملی بھی، یعنی علم اور عمل دونوں طریقوں سے ان کی تربیت کا اہتمام کیا۔

۹۔ وہ ہر اس سیاسی میدان میں آگے آگے نظر آتے تھے جس میں ان کے نزدیک کوئی بہتری مضمر ہوتی۔ ان کی علمی و عملی زندگی کے کسی پہلو پر نگاہ ڈال لیجیے کہیں کوئی خلا نظر نہیں آئے گا، کتنے بھی دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھیے کوئی کمی دکھائی نہیں دے گی۔

﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝﴾ (الملک: ۳، ۴)

۱۰۔ ان کی امور دنیا سے بے نیازی اور شغف خدمت دین کا یہ عالم تھا کہ عمر بھر بلا معاوضہ تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ اگر کوئی بیرون لاہور سے بلاتا تو ان کا معمول تھا کہ وعدہ کرنے سے پہلے آمد و رفت کے اخراجات کا جائزہ لیتے۔ اگر اخراجات ہیں تو چلے جاتے ورنہ معذرت کر دیتے۔ بلاشبہ تبلیغ دین ان کا پیشہ تھا، لیکن اس سلسلے میں کسی سے کچھ لینا ہرگز ان کا شیوہ نہ تھا۔ کیا اس مادی دور میں کوئی اور عالم دین اس اونچے کردار کا حامل کہیں نظر آتا ہے؟

لاہور سے راولپنڈی جانے والی سڑک پر ضلع گوجراں والا میں ایک چھوٹا سا شہر گکھڑ ہے۔ گکھڑ ریلوے اسٹیشن سے مشرقی جانب چار میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام "جلال" ہے۔ اس گاؤں میں ایک نو مسلم رہتے تھے، جن کا نام شیخ حبیب اللہ تھا، ان کے گھر ۲۔ رمضان ۱۳۰۴ھ (جون ۱۸۸۷ء) کو جمعے کے دن مولانا احمد علی پیدا ہوئے۔ ان کے والد اور والدہ نہایت پرہیزگار تھے، قرآن مجید والدہ مرحومہ سے پڑھا۔ اس زمانے میں جلال سے ایک میل کے فاصلے پر سعد آباد میں ایک سکول تھا، جس میں اردگرد کے بچے حصول علم کے لیے آتے تھے۔ احمد علی کو بھی اس سکول میں بھیجا جانے لگا۔

بعدازاں یہ خاندان موضع جلال سے باہو چک منتقل ہو گیا، وہاں جا کر احمد علی کو قصبہ تلونڈی کھجور والی کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس سکول میں انھوں نے پانچ جماعتیں پڑھیں۔ پھر انھیں گوجراں والا کی جامع مسجد میں مولانا عبدالحق کے حلقہ درس میں بھیج دیا گیا، جہاں فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ والدین نے اپنے اس بچے کو دین اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چناں چہ ۱۸۹۵ء میں جب کہ ان کی عمر آٹھ نو سال کی تھی، مولانا عبیداللہ سندھی کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ انھیں اپنے ساتھ امروٹ شریف (ضلع سکھر) لے گئے۔ وہاں یہ مولانا سندھی سے حصول علم میں مشغول ہو گئے۔

یہاں یاد رہے کہ شیخ حبیب اللہ اور مولانا عبیداللہ سندھی دونوں ایک ہی وقت میں حلقہ بگوش اسلام

Marfat.com

ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی نے جب گوٹھ پیر جھنڈا (سندھ) میں مدرسہ ''دارالرشاد'' کی بنیاد رکھی تو احمد علی کو جو اس وقت آٹھ نو برس کے تھے، وہیں بلا لیا تھا۔ پھر وہیں تکمیل علم کی منزلیں طے ہوئیں اور وہیں دستار بندی ہوئی۔ دستار بندی مشہور عالم شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی نے کی تھی۔ اس کے بعد اسی مدرسے میں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔

پہلی شادی گوٹھ پیر جھنڈا میں مولانا سندھی کی صاحب زادی سے ہوئی۔ ایک سال بعد بچہ پیدا ہوا جس کا نام حسن رکھا گیا لیکن بچہ اپنی عمر کے ساتویں دن انتقال کر گیا، دوسرے دن اہلیہ بھی وفات پا گئیں۔

۱۹۱۳ء یا ۱۹۱۴ء میں دوسری شادی ابو محمد احمد چکوالی کی صاحب زادی سے ہوئی، نکاح شیخ الہند مولانا محمود حسن نے دیو بند کی جامع مسجد میں پڑھایا تھا۔

جس زمانے میں مولانا احمد علی گوٹھ پیر جھنڈا کے ''مدرسہ دارالرشاد'' کے ناظم تھے، اسی زمانے (۱۹۰۹ء) میں مولانا عبیداللہ سندھی نے دیو بند جا کر شیخ الہند مولانا محمود حسن کے حکم سے جمعیت الانصار کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی دور میں انھوں نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کی بنیاد رکھی۔

انہی دنوں مولانا احمد علی نے مولانا عبیداللہ سندھی کے ارشاد کے مطابق نواب شاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس میں کچھ عرصہ وہ طلبا کو تعلیم دیتے رہے۔

پھر ایک دور آیا کہ مولانا سندھی نے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کو دیو بند سے دہلی منتقل کر دیا، اس کی نگرانی اور اہتمام کے لیے مولانا سندھی نے شیخ الہند کے کہنے سے مولانا احمد علی کو دہلی بلا لیا۔ اس دوران میں علی گڑھ کے بعض حضرات کی خواہش پر مولانا سندھی نے مولانا احمد علی کو علی گڑھ بھیج دیا، لیکن وہاں وہ صرف ایک مہینہ مقیم رہے، بعدازاں پھر دہلی واپس آ گئے۔

تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں ہندوستان کی انگریزی حکومت نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا، جن میں مولانا احمد علی بھی شامل تھے۔ انھیں دہلی سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد شملے لایا گیا اور شملے سے لاہور لا کر تھانہ نولکھا کی حوالات میں رکھا گیا۔ یہاں سے جالندھر لے جایا گیا اور راہوں (ضلع جالندھر) میں نظر بند کر دیا گیا۔ راہوں میں وہ سات دن رہے، اس کے بعد پولیس لاہور لے آئی اور حکومت نے فیصلہ کیا کہ اگر دو ضامن ایک ایک ہزار روپے کی ضمانت دے دیں تو وہ لاہور میں قیام کر سکتے ہیں، چناں چہ ان کی اہلیہ کے چچازاد بھائی حافظ ضیاء الدین نے ایک ہزار کی ضمانت دی، دوسرے ضامن حافظ صاحب کی کوشش سے ملک لال خاں ہوئے۔ یہ ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔

لاہور آتے ہی انھوں نے درس قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا جو مختلف مقامات میں کچھ عرصے تک جاری

Marfat.com

رہا۔ بعد میں یہ سلسلہ مستقل طور پر شیراں والا گیٹ کی مسجد لائن سبحان خاں میں منتقل ہو گیا جو ان کی زندگی کے آخری دم تک قائم رہا۔

۱۹۲۳ء میں حکیم فیروز الدین کی تحریک سے انجمن خدام الدین قائم کی گئی، جس کے ذریعے انھوں نے تبلیغ قرآن وحدیث اور اشاعت توحید وسنت کے سلسلے میں بڑی جدوجہد کی۔

۱۹۲۵ء میں انھوں نے قرآن مجید کے ترجمے اور حواشی کا سلسلہ شروع کیا جو تھوڑے ہی عرصے میں تکمیل کو پہنچ گیا اور شائع ہو کر لوگوں کے استفادے کا باعث بنا۔

اس سے قبل ۱۹۲۴ء میں انجمن خدام الدین کے زیر انتظام مدرسہ قاسم العلوم جاری کیا۔ اس مدرسے میں درس نظامیہ کی نصابی تعلیم کے علاوہ تفسیر قرآن کا سہ ماہی نصاب بھی شامل تھا، جس سے بہت سے اہل علم مستفید ہوئے۔

مدرسہ قاسم العلوم جس عمارت میں شروع کیا گیا تھا وہ اس کے لیے کرائے پر لی گئی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں مدرسے کے لیے اپنی نئی عمارت بنائی گئی، جس کا افتتاح مولانا شبیر احمد عثمانی نے کیا۔

انجمن خدام الدین کی طرف سے نشر واشاعت کا شعبہ بھی قائم کیا گیا تھا، اس شعبے میں چونتیس اصلاحی رسائل پر مشتمل ایک سیٹ شائع کیا، یہ رسائل لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیے گئے۔

۱۹۴۵ء میں مدرسۃ البنات قائم کیا جس میں لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام تھا، اس مدرسے میں بے شمار لڑکیوں نے تعلیم حاصل کی۔ یہ مدرسہ اب بھی شیراں والا دروازے میں انجمن خدام الدین کی نگرانی میں جاری ہے۔

۱۹۵۵ء میں ہفت روزہ خدام الدین جاری کیا، جس کے اصلاحی اور دینی مضامین سے قارئین کو بہت فائدہ پہنچا۔

مولانا احمد علی صاحب مبلغ اسلام، مفسر قرآن اور سیاسی رہنما تھے۔ آزادی وطن کے سلسلے میں کئی دفعہ گرفتار ہوئے اور مختلف جیلوں میں رہے۔ حلقہ علما میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کا انداز بیان اور طریق گفتگو بڑا موثر تھا۔

انھوں نے ۲۳۔ فروری ۱۹۶۲ء (۱۷۔ رمضان ۱۳۸۱ھ) کو جمعے کے دن شب کے ساڑھے نو بجے وفات پائی۔ اس وقت وہ ۷۶۔۷۷ سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ دوسرے دن یعنی ۲۴۔ فروری (۱۸ رمضان) کو ساڑھے چار بجے کے قریب یونیورسٹی گراؤنڈ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اس عالم اجل کے جنازے میں لاہور اور بیرون لاہور کے ایک لاکھ کے قریب افراد نے شرکت کی۔ نماز جنازہ ان کے صاحب زادے مولانا عبیداللہ انور نے پڑھائی اور میانی صاحب کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

اختصار کے ساتھ مولانا احمد علی کی خدمت کو موٹے موٹے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

۱۔ خالص توحید وسنت کی تبلیغ۔

۲۔ برطانوی حکومت کے خلاف جہاد......اور

۳۔ تدریس قرآن حکیم۔

یہ خدمات انھوں نے چالیس سال سے زائد عرصے تک اخلاص وہمت کے ساتھ انجام دیں جو انتہائی ثمرآور ثابت ہوئیں۔

ان کی وفات کے وقت مولانا سید محمد داؤد غزنوی سخت بیمار تھے اور دل کی تکلیف میں مبتلا تھے، لیکن ان کے ساتھ انھیں جو روحانی اور قلبی تعلق تھا، وہ اتنا زیادہ تھا کہ تکلیف کے باوجود مجھے ساتھ لے کر جمعے کے دن ان کے گھر پہنچے اور ان کے صاحب زادے مولانا عبیداللہ انور اور دوسرے حضرات سے اظہار حزن وملال کیا۔ نماز جنازہ میں بھی شامل ہوئے، جنازے میں ان سطور کا راقم ان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

ان کی وفات پر مولانا غزنوی نے جو تعزیتی بیان اخبارات کو دیا، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اس بیان سے ان دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات کا بھی پتا چلتا ہے اور مولانا احمد علی کی خدمات گوناگوں کی بھی نشان دہی ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''مولانا احمد علی صاحب کی وفات میرے لیے انتہائی صدمے کا باعث ہے۔ مولانا مرحوم ملک کے ممتاز ترین علما میں سے تھے۔ ان کے سانحہ ارتحال سے ملت اسلامیہ کو جو نقصان پہنچا ہے، وہ ناقابل تلافی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم نے توحید وسنت کی اشاعت اور مشرکانہ رسوم کو مٹانے کے لیے شروع شروع میں جو تکالیف برداشت کیں، آج کل کے نوجوان علما ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم کے درس وتدریس کو جس تسلسل، پابندی اور قابلیت کے ساتھ انھوں نے تقریباً چالیس سال تک جاری رکھا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

انگریزی استعمار کے خلاف جب تک یہاں انگریز رہا، انھوں نے جہاد جاری رکھا۔ اس راہ میں تمام مصائب اور تکالیف کو انھوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

میرے ساتھ کئی دفعہ جیل جانے کا اتفاق ہوا، اور وہاں مجھے ان سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا۔ میں نے انھیں بہت مخلص اور ہمدرد رفیق پایا۔ وہ باوجود اپنے بزرگانہ اوضاع واطوار کے رفقائے جیل کے ساتھ تواضع، محبت اور خندہ پیشانی سے پیش آتے، اور بعض دفعہ ہمارے ساتھ بے تکلف مجالس میں بھی شریک ہو جاتے۔

Marfat.com

مولانا مرحوم نے ہمیشہ کلمۃ الحق کا اعلان بلا خوف لومۃ لائم کیا، جس میں ان کو بے حد تکالیف پیش آتی رہیں۔ لیکن علمائے ربانیین کے ذمے اعلائے کلمۃ الحق کا جو فریضہ عائد ہوتا ہے اسے ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔

غرض آج ملت اسلامیہ ایک عالم باعمل، مجاہد فی سبیل اللہ، عابد وزاہد، اور علوم قرآن کے معلم ومبلغ سے محروم ہوگئی ہے۔

دعا ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے صاحب زادگان اور جملہ متعلقین وفیض یافتگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

نیز ان کو توفیق مرحمت فرمائے کہ مولانا مرحوم کے مشن کو جاری رکھ سکیں...... ہم سب کی دعائیں ان کے شامل حال ہیں اور سب ان کے ساتھ اس صدمے میں شریک ہیں۔"

مولانا احمد علی صاحب کی خدمات کی تشریح بہت طویل ہے، جس میں مذہب، مسلک، تصوف، سیاست، دین، توحید، درس قرآن، تدریس وتعلیم، خشیت الٰہی، تعلق باللہ، ہمدردی، رواداری، اہل علم سے مراسم، رفقا سے روابط، بڑوں کی تکریم اور چھوٹوں پر شفقت وغیرہ سب باتیں شامل ہیں۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے اس تعزیتی بیان کو ان عنوانات کے مختصر مگر جامع متن سے تعبیر کرنا چاہیے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

فیروز پور، مشرقی پنجاب کا مشہور شہر ہے۔ لاہور میں اس کے نام کی ایک بڑی شاہراہ ہے جو فیروز پور روڈ کہلاتی ہے۔ لاہور سے بجانب مشرق یہ شہر پچاس میل کی اور قصور سے پندرہ میل کی مسافت پر دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے چار میل آگے ہے۔ اس شہر کی بنیاد فیروز شاہ سوم کے عہد حکومت میں رکھی گئی تھی۔

آزادی سے قبل اس شہر میں کئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم تھیں جو اپنے اپنے پروگرام کے مطابق خدمات انجام دے رہی تھیں۔ ان میں مجلس احرار اسلام بھی شامل تھی۔ فیروز پور شہر اور ضلع میں مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت رکھنے والے حضرات تعداد میں تو کم تھے مگر اپنی جگہ خاص اثر ورسوخ کے مالک اور معاشرتی اعتبار سے باوقار مرتبے کے حامل تھے۔ شہر کی مجلس احرار میں مولانا عبیداللہ احرار، خان عبدالعظیم خان، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ، حکیم احمد علی، مہر محمد علی اور حاجی نظام الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مجلس احرار سے میرا کبھی سیاسی تعلق نہیں رہا، لیکن ان سب حضرات سے مراسم تھے۔ پاکستان آنے کے بعد یہ مختلف مقامات میں بکھر گئے۔ عبدالعظیم خاں خانیوال میں، حاجی نظام الدین گوجراں والا میں، شیخ غلام حیدر ایڈووکیٹ لاہور میں، حکیم احمد علی کھڈیاں خاص (ضلع قصور) میں اور مولانا عبیداللہ احرار (جو بعد میں پاکستان کی مجلس احرار کے صدر منتخب کیے گئے) فیصل آباد میں آباد ہوگئے تھے۔ اب یہ تمام بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، فقط ان کی یاد باقی رہ گئی ہے جو روح کو تڑپاتی اور دل کو غم گسار کرتی ہے۔

جب تک یہ زندہ رہے، ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بعض کے جنازوں میں بھی بچشم اشک بار شرکت کی اور اس وقت ان کی یادوں نے قلب وذہن کو شدید جھٹکے دیے۔ ان میں سے بعض کے عزیزوں اور تعلق داروں سے سلسلہ روابط قائم ہے، جب کسی سے ملاقات کا موقع ملتا ہے، بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور بات شروع ہو جائے تو حافظے کی تہوں میں دبے ہوئے واقعات اچھل اچھل کر نظر وبصر کے زاویوں میں آجاتے ہیں اور پھر زبان ان کے اظہار و بیان کے لیے بے قرار ہو جاتی ہے۔

وہ ہم نشین اور یاران محفل بے شک اس دنیا سے رخت سفر باندھ گئے اور ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، مگر دل کی دنیا میں بدستور آباد ہیں۔ فیضی کا یہ شعر دیکھیے کس طرح اس صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔

ای ہم نفسان محفل ما رفتید، ولی نہ از دل ما

Marfat.com

کتنی ہی ایسی ہستیاں اس جہان ہست و بود سے یکے بعد دیگرے کوچ کر گئیں جن سے شب و روز کا تعلق تھا اور ان کی زندگی میں کبھی جدائی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ خیال یہی تھا کہ ہمیشہ اسی طرح رہیں گے اور ہنسی خوشی سے وقت گزرتا جائے گا۔ اب وہ لوگ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے ہیں تو آنکھیں کھلی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس بھری پڑی اور ہنستی بستی دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں اور زندگی کا لطف ختم ہو گیا ہے۔

زرفتن تو، من از عمر بے نصیب شوم
سفر تو کر دی و من در وطن غریب شوم

فیروز پور کی مجلس احرار کے یہ چند افراد اس شہر کی جان تھے اور وہاں کی سیاسی اور سماجی رونقیں ان کے دم قدم سے پورے جوبن پر تھیں۔

شہر سے چودہ میل کے فاصلے پر سوئے مغرب ایک گاؤں، جو تحصیل فیروز پور میں واقع تھا، ''لکھوکے'' کے نام سے موسوم تھا۔ اس گاؤں میں کئی پشتوں سے علم کا دریا رواں تھا اور درس و تدریس کے ہنگامے بپا تھے۔ اس میں ایک بزرگ مولانا محمد علی لکھوی فروکش تھے جو بہت سی کتابوں کے مصنف حضرت حافظ محمد لکھوی کے پوتے اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے فرزند ارجمند تھے۔ وہ مجاہدانہ فطرت کے مالک اور انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے۔ سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے ان کے قریبی مراسم تھے۔ کئی مرتبہ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے، جہاد کے لیے بہت سے لوگوں کو وہاں بھیجا، مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے رہے۔ وہ مولانا محی الدین لکھوی اور قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا معین الدین لکھوی کے والد گرامی قدر تھے۔ علم وادراک کی وسعت پذیر وادیوں میں اپنے اسلاف کی طرح انھیں کامل رسائی حاصل تھی۔

جلیل القدر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک فعال و متحرک شخصیت تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کی مخالفت کے لیے ۱۹۲۲ء کے پس و پیش اپنی زرعی زمین میں ایک باقاعدہ تربیت گاہ قائم کی تھی جس میں تعلیم کا انتظام بھی تھا اور جہاد کی مشق و تمرین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس کا نام انھوں نے ''دارالسلام'' رکھا تھا۔ یہ تربیت گاہ نہر سے دوسری طرف ان کے گاؤں کے قریب تھی۔ بعدازاں ۱۹۲۶ء کے لگ بھگ یہی کام لکھوکے سے ڈھائی میل کے فاصلے پر شروع کیا گیا۔ اس کے لیے دو مربعے زمین وقف کی گئی تھی اور اسے ''مرکز الاسلام'' کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔

مولانا محمد علی کا مجلس احرار سے باقاعدہ تعلق رکنیت تو نہ تھا، البتہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اس کے اکابر وعمائد سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ ہر اس جماعت کے ساتھ ہو جاتے تھے، جو برصغیر کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کا اعلان کرتی تھی۔ ان کا بہت بڑا حلقۂ ارادت اور دائرۂ متاثرین تھا۔ انھیں اس غلام ملک میں رہنا گوارا نہ ہوا تو ۱۹۳۰ء میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور مسجد

Marfat.com

نبوی ﷺ میں درس وتدریس میں مشغول ہو گئے تھے۔ پانچ چھ سال بعد ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے۔ دو سال یہاں رہے، ۱۹۳۸ء میں پھر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس سے نو سال بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں اوکاڑہ آئے، جہاں قیام پاکستان کے زمانے میں ان کے اہل وعیال اور اعزہ واقارب قیام پذیر ہو گئے تھے۔ اس عالم اجل نے ۴۔ دسمبر ۱۹۷۴ء کو وفات پائی اور مدینہ منورہ میں مدفون ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں مولانا کے مدینہ طیبہ جانے کے بعد مرکز الاسلام کی درس گاہ کی انتظامی ذمے داریاں ان کے صاحب زادوں مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی نے سنبھال لی تھیں۔ اب وہاں مجاہدین کی تیاری وتربیت کا سلسلہ تو ختم ہو گیا تھا، البتہ مدرسہ باقاعدہ قائم رہا، جس میں قدیم علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور جدید علوم سے بھی طلبا کو بہرہ مند کیا جاتا تھا، میں وہاں یکم جنوری ۱۹۳۷ء سے آخر سال تک طالب علم کی حیثیت سے اور مارچ ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک معلم کی حیثیت سے مقیم رہا۔

۱۹۳۷ء میں مولانا محمد علی لکھوی مرکز الاسلام میں تشریف فرما تھے۔ اس سال کی مئی کے پہلے ہفتے میں فیروز پور کی مجلس احرار کے تین رہنما...... مولانا عبید اللہ احرار، خان عبدالعظیم خان اور حکیم احمد علی...... ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اب سے پانچ مہینے بعد اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہم فیروز پور میں مجلس احرار کا جلسہ منعقد کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس میں ہماری رہنمائی فرمائیں اور ضلع فیروز پور کے قصبات ودیہات میں جلسے کی تشہیر کا اہتمام کریں۔

مولانا نے ان کی بات سنی اور درخواست منظور فرمائی۔ ان کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی نے جو پنجابی کے اچھے شاعر ہیں، جلسے کی تشہیر کے لیے دو تین پنجابی نظمیں لکھیں اور طلبا کے لیے لال رنگ کی قمیصیں سلا دی گئیں۔ مولانا محی الدین اور معین الدین کو ان کے قائد مقرر کر دیا گیا۔

مئی کا مہینہ، سخت گرمی کا موسم، طلبا نے لال رنگ کی قمیصیں پہنیں اور احرار کے جلسے کی تشہیر کے لیے چل کھڑے ہوئے۔ گاؤں گاؤں پیدل جاتے۔ اچھی سی آواز والا کوئی لڑکا نظم کا ایک شعر پڑھتا اور پھر سب لڑکے اس کے پیچھے پیچھے اس شعر کو دہراتے۔ اس طرح طلبا ہر گاؤں کی گلی گلی گھومتے، عورتیں گھر کے دروازے میں کھڑی ہو کر اور مرد باہر نکل کر انھیں دیکھتے اور بچے ساتھ چل پڑتے۔ جس گاؤں میں دوپہر ہو جاتی، وہاں کی مسجد میں چلے جاتے، لوگ گھروں سے روٹیاں لا کر انھیں کھلاتے اور لسی پانی پلاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد اگلے گاؤں کا قصد کر لیا جاتا۔ جس گاؤں میں رات پڑتی، وہاں کی مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ روٹی پانی کا انتظام اس گاؤں کے لوگ کرتے۔ عشا کے بعد مجمع اکٹھا ہو جاتا تو پہلے پنجابی نظم پڑھی جاتی، پھر قائد تقریر کرتا۔ صبح کو لسی پانی کے بعد پھر سلسلہ سفر شروع ہو جاتا۔

Marfat.com

نظموں اور تقریروں میں انگریزی حکومت کے مظالم بیان کیے جاتے، انگریز دشمنی کی پاداش میں مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو جن اذیتوں میں مبتلا کیا گیا تھا یا مبتلا کیا جا رہا تھا، ان کی وضاحت کی جاتی...... اس طرح کچھ عرصہ وہاں کے طلبا نے مجلس احرار اور اس کے قائدین وزعما کے ''فضائل ومناقب'' کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف کیا اور اپنی ہمت کے مطابق لوگوں کو اس کے جلسے میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کی تلقین کی۔

مولانا محی الدین اور معین الدین پنجاب کے مشہور علمی اور روحانی خاندان کے فرزند اور بڑے باپ کے بیٹے تھے، جن کا خاندانی اور ذاتی اعتبار سے اس علاقے میں بہت اثر تھا، اس لیے وہ جس گاؤں میں جاتے، لوگ عزت واحترام سے پیش آتے، ساتھ طلبا کا بھی داؤ لگ جاتا اور انھیں بھی ''مستحق تکریم'' گردانا جاتا۔ یعنی ان کے طفیل یہ طفیلی موج میں رہتے۔

ان دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کے ہولناک حادثے کی شکل اختیار کرنے میں چند لمحوں کا فرق رہ گیا تھا۔ دریائے ستلج کے ہیڈ حسینی والا سے جو نہریں نکلتی ہیں، ان میں ایک نہر بہاول پور کے علاقے کو جاتی ہے اور نہر صادقیہ کہلاتی ہے۔ وہ پختہ نہر ہے۔ نواب بہاول پور نے حسینی والا ہیڈ سے لے کر تمام نہر کو اپنے خرچ پر اندر سے پختہ کرا دیا تھا۔ اس میں کوئی بکری بھینس وغیرہ گر جائے یا انسان گر جائے تو اس کو باہر نکالنا اور اس کا باہر نکلنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے، اس لیے کہ پختہ اینٹوں میں کہیں ہاتھ ڈالنے اور گری ہوئی شے کو باہر نکالنے کی کوئی صورت نہیں۔ ایک دن شدید گرمی پڑ رہی تھی اور طلبا اس نہر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ایک ساتھی اور میرے دوست حاجی محمد رفیق نے (جو ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ب تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد میں رہتے ہیں) نہانے کے لیے اس پختہ نہر میں چھلانگ لگا دی۔ اب اس سے ان کا نکلنا مشکل ہو گیا۔ لڑکوں نے شور مچا دیا، ''حاجی ڈوب گیا، حاجی ڈوب گیا''...... جلدی سے مولانا محی الدین نے ایک بڑا سا کپڑا نہر میں پھینکا جس کو رفیق نے زور سے پکڑا اور اس طرح انھیں کپڑے کے ذریعے کھینچ کر نہر سے نکالا گیا۔

یہ منظر بڑا خوف ناک تھا۔ اس واقعے پر ستاون اٹھاون برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن اب بھی یہ واقعہ کبھی ذہن میں آتا ہے تو عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ پچھلے دنوں میں اپنے گاؤں گیا تو رفیق سے اس واقعہ کا تذکرہ ہوا۔

۱۹۳۷ء میں جب مجلس احرار کے جلسے کے لیے ضلع فیروز پور کے بعض دیہات کا چکر لگایا گیا تھا، اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ اب اس عمر میں وہ حالات یاد آتے ہیں تو خیال گزرتا ہے کہ انسان زندگی میں کتنی ہی منزلوں سے گزرتا ہے۔

Marfat.com

واپس آکر مولانا محمد علی لکھوی کو روداد سفر سنائی تو وہ نہایت خوش ہوئے اور طلبا کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ زندہ دل اور خوش مزاج عالم دین تھے۔ اس عہد کے طبقہ علما میں ان کا ایک خاص نوع کا نہج کلام تھا۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی　　　پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جلسے سے ایک دن پہلے مولانا محمد علی لکھوی کی قیادت میں احرار رضا کاروں کی طرح سرخ قمیصیں پہنے ایک بڑے جلوس کی شکل میں مرکز الاسلام کے طلبا فیروز پور پہنچے اور نعرے لگاتے ہوئے جلسے کے میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا محمد علی اسی لباس میں تھے جو وہ ہمیشہ پہنتے تھے، یعنی سفید کھدر کی قمیص، کھدر کا سفید عمامہ اور کھدر کا تہمند۔ ہر ضلع کے لیے الگ الگ کیمپ لگائے گئے تھے، ہمارا بھی ایک کیمپ تھا۔

احرار رضا کار سرخ قمیص کے ساتھ ایک صاف ستھری چمکتی دمکتی کلہاڑی ہاتھ میں رکھتے تھے، لیکن ہمارے پاس کلہاڑیاں نہیں تھیں۔ مجلس احرار کے بعض اکابر بھی سرخ قمیص پہنتے اور ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے تھے۔

عشا کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہونے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اسی دن جلسے کے میدان میں نماز عصر کے بعد مجھے پہلی مرتبہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ پورا قد، گٹھا ہوا جسم، سرخ وسفید رنگ، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، سیاہ اور سفید بالوں پر مشتمل داڑھی جو نہایت خوب صورتی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کھدر کی سرخ رنگ کی قمیص، سر پر قدرے اونچی دیوار کی قراقلی ٹوپی جس سے ان کے پٹے باہر جھانک رہے تھے، پاؤں میں پشاوری چپل، ہاتھ میں کلہاڑی، جس کا دستہ ان کی کمر کے برابر تھا اور خاکی رنگ کی ٹخنوں سے ذرا اونچی شلوار۔ وہ چل پھر کر جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ مولانا محمد علی لکھوی بھی ادھر آنکلے۔ وہ مصافحے کے لیے شاہ جی کی طرف بڑھے، شاہ جی بھی تیزی سے ان کی جانب آئے اور دونوں بزرگ بغل گیر ہوگئے۔ پھر گرم جوشی سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے سے خیر وعافیت پوچھی۔ اس وقت مولانا مظہر علی اظہر، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حسام الدین اور چند اور لوگ شاہ جی کے ساتھ تھے۔ وہ بھی احترام اور تپاک سے مولانا لکھوی سے ملے۔ اس کے بعد یہ حضرات بعض مقامی اصحاب کی رفاقت میں پنڈال میں داخل ہوگئے اور گھوم پھر کر انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔

یہ اولین موقع تھا کہ میں شاہ جی کے دیدار سے بہرہ مند ہوا۔ وہ مردانہ حسن کا پیکر دل نواز تھے اور اپنے اندر بڑی کشش رکھتے تھے۔ نظیری کا یہ شعر ان پر حرف بحرف صادق آتا تھا۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دل می کشد کہ جا اینجاست

آج جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، اس واقعہ پر اٹھاون برس کا طویل عرصہ بیت چکا ہے، مگر وہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے اور لیل ونہار کی بہت سی خوش گوار اور ناخوش گوار کروٹوں کے باوجود حافظے نے ان

Marfat.com

کے اس وقت کے حلیے اور ہیئت کذائی کا کوئی گوشہ فراموش نہیں کیا۔ ہر چیز کو نہایت احتیاط سے محفوظ کر رکھا ہے

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر وہ جو وقت ناز اک جنبش ترے ابرو میں تھی

مجلس احرار کے فیروز پور کے اس جلسے میں ہزاروں افراد کا مجمع تھا۔ شہر اور ضلع کے قصبات و دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آئے تھے۔ شہر سے جانب مغرب چار میل کے فاصلے پر دریائے ستلج کا حسینی والا ہیڈ عبور کرتے ہی لاہور کا ضلع شروع ہو جاتا تھا جو اب ضلع قصور کہلاتا ہے۔ اس نواح کے بہت سے لوگ شریک جلسہ ہوئے تھے اور وسیع پنڈال میں ہر طرف انسانوں کے سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔

بڑے چھوٹے تمام احراری شاہ جی کی زندگی میں بھی انھیں ''شاہ جی'' کہتے تھے، اب بھی شاہ جی کہتے ہیں۔ نہ کوئی ''شاہ صاحب'' کہتا تھا اور نہ فرط احترام سے ان کا نام لیتا تھا۔ جب کوئی احراری ''شاہ جی'' کہے تو سمجھ لیجیے، اس سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری مراد ہیں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ میرے مسلک کی رو سے ''تقلید'' جائز نہیں، لیکن میں اس سلسلے میں ''مقلد'' ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مقلد کسی امام فقہ کا نہیں، احراریوں کا......! جن کے نقطہ نظر سے مجھے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ مگر شاہ جی کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجبور ہوں کہ ان کی ''تقلید کا قلادہ'' اگر اپنے فکر و خیال کے دامن سے وابستہ نہیں کر سکتا اور اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا تو قلم کی ''گردن'' میں ضرور ڈال دوں۔ چناں چہ ان کی تقلید کرتے ہوئے، آئندہ سطور میں ہر جگہ میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری یا شاہ صاحب کے بجائے، شاہ جی لکھا ہے۔

عشا کی نماز سے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے بعد اچھے خاصے مجمعے کے ساتھ شاہ جی جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ امیر شریعت زندہ باد، مجلس احرار زندہ باد اور نعرۂ تکبیر سے فضا گونجنے لگی۔ سٹیج پر بیٹھے ہوئے تمام اکابر ایک دم کھڑے ہو گئے۔ سٹیج اتنا اونچا تھا کہ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اوپر جانا پڑتا تھا۔ شاہ جی نے سٹیج پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نگاہ ڈالی اور پھر ایک کرسی پر جو خاص طور سے ان کے لیے رکھی گئی تھی، تشریف فرما ہوئے۔

میرے خیال میں رات کے گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ تقریر کے لیے مائیک پر آئے اور پھر نعرے بلند ہونے لگے۔ ہاتھ کے اشارے سے انھوں نے نعروں کا سلسلہ بند کرایا اور ایک انداز خاص سے دائیں بائیں دیکھ کر مائیک کو ذرا اپنے قریب کیا اور خطبہ مسنونہ کے الفاظ سامعین کے پردۂ سماع سے ٹکرانے لگے۔ نہایت دلکش اور رسیلی آواز...... خطبے کے مضمون سے جب آواز کا زیر و بم ہم آہنگ ہوتا تھا تو لوگ جھوم جھوم جاتے تھے۔ پھر جب درود شریف پڑھنا شروع کیا اور اللھم صلی علیٰ محمد و علیٰ آل محمد کے الفاظ ان کی لسان سحر آفریں سے ادا ہوئے تو اس میں کچھ اور ہی لطف پنہاں تھا۔ اس وقت عقیدت و انکسار کے تمام لوازم ان کی ذات اور زبان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب آیات قرآن کی تلاوت کا آغاز ہوا

Marfat.com

تو ساکت و صامت فضا میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیات براہ راست آسمان سے نازل ہو رہی ہیں۔ سبحان اللہ! ان اوصاف کا حامل شخص اب کہاں پیدا ہوگا۔

ان کی تقریر متعدد مسائل پر مشتمل تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف خوب برسے، مرزائیت کی تردید میں ان کا اپنا اسلوب تھا جس کا نہایت موثر طریقے سے اظہار کیا، مسئلہ توحید کی وضاحت کی، اقسام شرک کو موضوع بحث ٹھہرایا اور قرآن کی بہت سی آیات تلاوت کیں اور ان کا ترجمہ سنایا۔ اس زمانے میں مجلس احرار نے حکومت الہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا، شاہ جی نے اسے بھی منقح کیا۔ کئی گھنٹے تقریر جاری رہی۔ ادھر موذن نے فجر کی اذان شروع کی اور اللہ اکبر کہا، ادھر مقرر نے خاموشی اختیار کر لی اور تقریر ختم ہوگئی۔

اس سے تقریباً تیرہ مہینے بعد ۱۹۳۸ء کے آخر میں دلی میں شاہ جی کی تقریر سننے کا شرف حاصل ہوا۔ جن حضرات کو دلی جانے اور اس شہر کو دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور وہاں کی جامع مسجد بھی دیکھی ہے، میں یہاں ان کو جلسے کا محل وقوع بتانے کی کوشش کروں گا۔

دلی کی جامع مسجد (جسے شاہ جہانی مسجد بھی کہا جاتا ہے) کے بڑے دروازے کے سامنے بہت بڑا میدان ہے، اسی میدان میں ہرے بھرے کا مزار ہے، یہیں سرمد کی قبر، مولانا شوکت علی کا مدفن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی آخری آرام گاہ ہے۔ میدان کے اختتام پر لال قلعے کا دروازہ ہے، اور یہ وہی قلعہ ہے جو مغل شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہان نے تعمیر کرایا تھا۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ایک خاصی چوڑی سڑک ہے جس پر بے شمار گاڑیاں چلتی ہیں جو لوگوں کو مختلف مقامات پر پہنچاتی ہیں۔

جامع مسجد کے جنوب میں اردو بازار ہے۔ میں دلی میں شاہ جی کے جس جلسے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، اس کا سٹیج اردو بازار کے قریب تھا اور بازار مقرر کی پشت کی جانب تھا۔ ان کے بائیں جانب جامع مسجد اور دائیں جانب لال قلعہ تھا۔ ان کے سامنے وسیع میدان میں لوگوں کا بہت بڑا مجمع تھا۔ یہ جلسہ جمعیت علمائے ہند کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ شاہ جی کی تقریر عشا کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی جو سیاسیات اور مذہبیات کا حسین و دل آویز مرقع تھی۔

لوگ اس طرح خاموش اور ہمہ تن گوش بیٹھے تھے کہ کان علیٰ رؤسھم الطیور جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جونہی سر ہلا، پرندے اڑے...... شاہ جی کہہ رہے تھے، آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے ملک کو ظالم کے پنجے سے چھڑانے کے لیے عمل و حرکت کے میدان میں اترنا مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے۔ مطالبہ آزادی کے مقابلے میں یہ پکڑ دھکڑ، یہ قید و بند، یہ سزائیں، یہ پھانسیاں میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتیں، آزادی مجھے انتہائی عزیز ہے۔ دلی والو! جس صورت میں آزادی ملے اور جن مشکلات سے گزر کر ملے، اسے

Marfat.com

حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا میری زندگی کا نصب العین ہے......

اس کے بعد جب انھوں نے دونوں ہاتھ ملا کر اور ہتھیلیاں اس انداز سے حاضرین کی طرف بڑھا کر جیسے پانی سے گزرنے کا راستہ بنا رہے ہوں، پنجابی کا یہ شعر پڑھا

جے ہیر سمندروں پار ہووے بکاں نال سمندر نوں چھٹ سٹاں

تو مجمعے کے سکوت کا بند ٹوٹ گیا۔ بیٹھے ہوئے لوگ داد و تحسین کے انداز میں اچھلنے لگے، جبہ و دستار میں ملبوس علمائے کرام تڑپ اٹھے، واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور ''امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد'' کے نعرے پنڈال میں گونجنے لگے۔

ظاہر ہے دلی کے سامعین میں سے بہت کم لوگوں نے پنجابی کے اس شعر کے معنی سمجھے ہوں گے، مگر شاہ جی نے جس اسلوب، جس ہیئت اور جس جذبے سے شعر پڑھا اور جس طرح دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر اسے عملی شکل میں ڈھالا، اس نے شعر کے ایک ایک لفظ کے مطلب کو نکھار دیا تھا۔

سامعین کی زبانوں سے ''واہ واہ'' کا لفظ سن کر شاہ جی نے کہا، میں تقریر کرتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں، واہ شاہ جی واہ......! جیل میں بند کر دیا جاتا ہوں تو کہتے ہیں، آہ شاہ جی آہ......! میں واہ اور آہ کے درمیان پھنسا ہوا ہوں۔

ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جو جولائی ۱۹۴۵ء تک چھ سال جاری رہی۔ انگریز کی مخالفت کی پاداش میں ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے زعما و قائدین کو گرفتار کر کے حکومت نے ملک کے مختلف جیل خانوں اور قلعوں میں بند کر دیا تھا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد انھیں رہا کیا گیا تو برطانیہ کی توپ و تفنگ کی جنگ جیتنے والی حکمران جماعت کنزرویٹو پارٹی اپنے ملک میں ووٹ کی جنگ ہار چکی تھی اور اس کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی، جس کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی تھے۔ انھوں نے مارچ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ملک کے سیاسی رہنماؤں سے گفتگو کے لیے برطانوی کابینہ کا ایک سہ رکنی وفد ہندوستان بھیجا جو اے وی الیگزینڈر، سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس پر مشتمل تھا، اسے کیبنٹ مشن کہا جاتا تھا۔

یہاں اس سلسلے کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں، اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ملک کے سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید کے بعد حکومت ہند نے ملک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا تھا۔ میں اس وقت مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) میں خدمت تدریس انجام دیتا تھا اور عمر کی بیسویں منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ ایک دن اخبار میں پڑھا کہ کل رات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری قصور تشریف لا رہے ہیں جہاں وہ جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔ میں نے اور مولانا معین الدین لکھوی نے قصور جانے اور شاہ جی کی تقریر سننے کا پروگرام بنایا...... یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے۔

Marfat.com

ہم قصور پہنچے تو فیروز پور اور دیگر مقامات کے بہت سے لوگ مل گئے جو شاہ جی کی تقریر سننے آئے تھے۔ طویل عرصے کے بعد شاہ جی اس نواح میں تشریف لائے تھے۔ شب کو نو بجے کے بعد ان کی تقریر شروع ہوئی اور چار گھنٹے جاری رہی۔ شدید سردی کا موسم تھا اور ہم نے کمبل اوڑھ رکھے تھے۔ وہ ملک میں انتخابات کے ہنگاموں کے دن تھے اور مسلم لیگ کی طرف سے وہاں کے دیہاتی حلقے میں میاں افتخار الدین انتخاب لڑ رہے تھے جو کچھ عرصہ پہلے کانگرس چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ شاہ جی نے انگریزی حکومت کی نہایت سخت لہجے میں مخالفت کی اور عالم اسلام اور ہندوستان پر اس کے مظالم تفصیل سے بیان کیے۔ مسلم لیگ کو بھی ہدف تنقید ٹھہرایا اور اس کے سیاسی نقطہ نظر کا تجزیہ کیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دور تک پھیلا ہوا انسانوں کا یہ ہجوم شاہ جی کی مٹھی میں ہے اور ان کی پرجوش خطابت نے ان کو پوری طرح مسحور کر رکھا ہے۔ انھوں نے بعض جماعتوں کے قائدین کی حکمت عملی کو بھی موضوع بحث بنایا اور اسلام سے متعلق ان کے قول و فعل کے تضادات کا جائزہ لیا۔ پھر اسلامی تعلیمات کی خصوصیات کا ذکر کیا۔

میں نے دیکھا کہ تقریر کے دوران شاہ جی ننگے سر تھے۔ نہ سر پر ٹوپی تھی نہ کپڑا۔ ان کے سفید گھنگریالے بال عجب بہار دکھا رہے تھے۔ سنا ہے شاہ جی نے اس وقت سے ٹوپی اتار دی تھی، جب انھیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا سید حسین احمد مدنی کی پگڑی اچھالی گئی ہے۔

یہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا جب مولانا حسین احمد مدنی صوبہ سرحد اور پنجاب کے دورے سے بذریعہ ٹرین دیوبند جا رہے تھے۔ ٹرین جالندھر اسٹیشن پر پہنچی تو چند مسلم لیگی نوجوان اپنے ایک ساتھی شمس الحق کی معیت میں وہاں آئے۔ مولانا کو برا بھلا کہا، ان کی پگڑی اتار لی، طمانچہ مارا اور گالیاں دیں...... اس حادثے کے بعد شاہ جی پہلی مرتبہ امرتسر کے ایک جلسے میں ننگے سر آئے تھے۔ فرمایا: جب سے میری قوم نے حسین احمد کی پگڑی اتاری ہے، میں نے عہد کیا ہے، آئندہ سر پر ٹوپی نہیں رکھوں گا۔

شورش کاشمیری نے اس حادثے کے متعلق اپنی کتاب بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل (مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء) کے صفحہ ۲۷۶ کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ ''ہمارے ایک دوست ڈاکٹر اکرام الحق قریشی جالندھر میں لیگ کے پرجوش کارکن تھے۔ حمید نظامی مرحوم کے کلاس فیلو رہے۔ ان کا بیان تھا کہ شمس الحق اپنے اس کارنامے کا کروفر لے کر مولانا عظامی کے ہاں پہنچا۔ وہ ان دنوں مقامی لیگ کے نائب صدر تھے۔ مولانا عظامی واقعہ سن کر کانپنے لگے۔ بار بار پوچھتے، واقعی تم نے یہی کیا ہے؟ کہنے لگے میاں! جس نے حسین احمد کے ساتھ یہ کیا ہے، اس کی تو نعش بھی نہیں ملے گی۔ سب کو معلوم ہے کہ شمس الحق پاکستان آ کر قتل ہو گیا، اس کی نعش تک نہ ملی، بلکہ معما ہی رہی۔ اس کا دوسرا ساتھی ہجرت کے وقت دریائے بیاس میں ڈوب گیا۔''

Marfat.com

اس حادثے کی تفصیل بعض عینی شاہدوں کے حوالے سے پاکستان کے ممتاز عالم اور مشہور خطاط جناب سید انور حسین صاحب (نفیس رقم) نے چارسدہ (پشاور) کے ایک ماہانہ رسالے النصیحہ کے مئی ۱۹۸۶ء کے شمارے میں تحریر فرمائی ہے جو نہایت دردناک اور دل ہلا دینے والی ہے۔ جن لوگوں نے جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا مدنی کی اہانت کا ارتکاب کیا تھا، بقول محترم مضمون نگار کے ''اس مجمعے کے سرغنہ شمس الحق عرف شمسی، فضل محمد اور فتح محمد تھے۔'' ان کا جو انجام ہوا اور جن اذیت ناک حالات سے وہ گزرے، ان کے تمام پہلو بدرجہ غایت عبرت ناک ہیں۔ ان کو پڑھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور پتا چلتا ہے کہ اللہ کی گرفت بڑی شدید ہے جس سے محفوظ رہنے کی ہر وقت دعا کرنی چاہیے۔ سید انور حسین (نفیس رقم) کے اس مضمون کا عنوان ہے ''شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے آخری سفر پنجاب کی روح فرسا روداد...... عبرت انگیز نتائج...... ثقہ راویوں کی زبانی۔''

شاہ جی جیسا بے خوف، مسلسل کئی گھنٹے بولنے والا، اپنے نقطۂ فکر کے اظہار میں مخلص اور زوردار خطیب برصغیر نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ایک خاص طرز و ادا کے واحد مقرر تھے جو اپنی تمام خوبیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ان کی خطیبانہ اداؤں کو بعض لوگوں نے اپنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔

یہ رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن ہندوستان آیا، شاہ جی دلی گئے اور ایک رات جامع مسجد کے سامنے والے میدان میں بہت بڑے اجتماع کو خطاب کیا۔ ان کی تقریر ہو رہی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو، کیبنٹ مشن کے ایک رکن مسٹر سٹیفورڈ کرپس کو وہاں لے گئے۔ کرپس چند منٹ جلسہ گاہ کے ایک کونے میں کھڑا ان کی تقریر سنتا رہا۔ وہ کچھ سمجھ تو نہیں سکتا تھا، لیکن مقرر کی حرکات و سکنات، جوش و جذبہ اور حاضرین کی تاثر پذیری کا اندازہ کر کے اس نے جواہر لال نہرو سے کہا کہ جو ملک اس قسم کے سیاسی مقرر اور خطیب رکھتا ہو، وہ آخر کب تک غلام رہ سکتا ہے۔ پھر اس نے کہا، یہ شخص شکل و صورت کے اعتبار سے ''فادر'' معلوم ہوتا ہے۔

شاہ جی کی تقریر اور مجلس احرار کے ہر جلسے میں لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ احرار مقرروں کی تقریریں سننے آتے تھے۔ لاہور میں شاہ جی کی تقریر کا اعلان کیا جاتا تو ایسے معلوم ہوتا، جیسے سارا شہر جلسہ گاہ میں اُمڈ آیا ہے۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا تھا کہ ریفرنڈم ہو گیا ہے اور لوگوں نے ہمارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ شاید اس زمانے میں ''ریفرنڈم'' لفظ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی جلسے میں بیس ہزار آدمی جمع ہو جائیں تو کہہ دیا جاتا ہے کہ سارا ملک ہمارے ساتھ ہے، حالاں کہ جلسے کے حاضرین میں سے بھی اکثر لوگ ان کے ساتھ نہیں ہوتے۔ احرار مقرروں کی بھی لوگ صرف تقریریں سنتے تھے، ووٹ انھیں کوئی نہیں دیتا تھا۔ وہ خود بھی کھلے دل سے کہتے تھے کہ لوگ تقریریں ہماری سنتے ہیں اور ووٹ سکندر حیات کو دیتے

Marfat.com

ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے سچے اور سچے لوگ تھے۔ موجودہ عہد کے جلسی جھوٹ سے وہ آشنا نہیں تھے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا اور پاکستان نقشہ عالم پر ابھر آیا۔ ہم لوگ اپنے آبائی وطن کی سکونت ترک کر کے چک نمبر ۵۳ گ۔ب تحصیل جڑاں والا ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) آ گئے۔ ٹھیک سے یاد نہیں رہا، اسی سال کے آخر یا ۱۹۴۸ء میں لائل پور میں مجلس احرار کا جلسہ ہوا۔ اس جلسے کا اہتمام مولانا عبیداللہ احرار نے (جو فیروز پور سے لائل پور جا بسے تھے) مولانا تاج محمود نے اور دیگر احرار دوستوں نے کیا تھا۔ ہمارے گاؤں کے بہت سے لوگ جلسہ سننے گئے تھے، میں بھی گیا۔ رات کے جلسے میں شاہ جی نے بھی تقریر کی اور شورش کاشمیری نے بھی......!

شورش نے اس زمانے میں ہفت روزہ چٹان جاری کر رکھا تھا اور وہ مجلس احرار سے الگ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ دوسرے زعمائے احرار نے بھی تقریریں کیں، لیکن سب کی تقریریں ڈھیلی تھیں اور لہجے مرجھائے ہوئے تھے۔ وہ جذبہ، وہ جوش، وہ تند و تیز اسلوب جو احرار مقرروں کا خاصہ تھا، مفقود تھا۔

کوئی زمانہ تھا کہ لاہور میں یا کسی اور جگہ اعلان ہوتا کہ شاہ جی رات کو دس بجے تقریر کریں گے تو لوگ پانچ بجے ہی رات کا کھانا اور پانی کا مٹکا لے کر جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے اور فجر کی اذان تک ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے رہتے مگر لائل پور کے اس جلسے میں ہم نے دیکھا کہ شاہ جی کی تقریر سامعین کے دلوں میں وہ گرمی نہ پیدا کر سکی جس کی ہم ان سے توقع رکھتے تھے۔

۱۹۵۲ء کے آخر میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے لیے ایک مجلس عمل (ایکشن کمیٹی) بنائی گئی تھی جس کے صدر مولانا سید ابوالحسنات قادری اور ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے شروع میں مجلس عمل کے تمام ارکان (مولانا غزنوی کے سوا) گرفتار کر لیے گئے تھے اور لاہور میں مارشل لا لگا دیا گیا تھا۔ جس کا ایڈمنسٹریٹر جنرل اعظم خاں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ پہلا مارشل لا تھا، جس سے پاکستان کے لوگ آشنا ہوئے۔ اس کے بعد مارشل لاؤں کی قطاریں لگ گئیں۔ اس اعتبار سے لاہور کے اس مارشل لا کو آئندہ مارشل لاؤں کی ریہرسل بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور تمہید بھی......!

میں ان دنوں جماعت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا اور مولانا داؤد غزنوی مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر تھے۔ مجلس عمل کی چند میٹنگیں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر (شیش محل روڈ) میں بھی ہوئیں جن میں مجھے شرکت کا موقع ملا اور میں نے ان سب حضرات کو قریب سے دیکھا اور سنا۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گرفتاریوں تک نوبت پہنچے تو مولانا داؤد غزنوی گرفتاری سے بچنے کی کوشش کریں تا کہ تحریک کی رفتار بند نہ ہو اور کسی نہ کسی شکل میں عمل و حرکت کا سلسلہ جاری رہے۔

Marfat.com

جن حضرات کو حکومت نے ابتدا ہی میں گرفتار کر لیا تھا، ان میں شاہ جی بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو کراچی میں گرفتار کر لیا تھا اور پھر سکھر جیل میں لایا گیا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی کی عدالت میں انکوائری شروع ہوئی تو انھیں سنٹرل جیل لاہور منتقل کر دیا گیا تھا۔ کئی سال ہوئے سنٹرل جیل کو منہدم کر دیا گیا ہے۔ اب یہ لاہور کا شان دار اور فیشن ایبل علاقہ ہے جسے شادمان کالونی کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ لوگوں کی بے پناہ اذیتوں اور شدید تکلیفوں پر یہ علاقہ تعمیر کیا گیا ہے۔

۱۹۵۳ء کے مارچ کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ مولانا داؤد غزنوی نے ان حضرات سے جیل میں ملاقات کا پروگرام بنایا، مجھے بھی ساتھ لے گئے، مزنگ چونگی سے گلبرگ کو جاتے ہوئے شادمان چوک پہنچیں تو بائیں جانب نکڑ پر ایک مسجد ہے جو پہلے چھوٹی سی مسجد تھی، اب خاصی وسیع ہو چکی ہے۔ اس کے بالکل سامنے سڑک سے دوسری طرف سنٹرل جیل کی ڈیوڑھی تھی جس میں انگریزی عہد کی ہیبت کے تمام عناصر خوف ناک صورت میں نمایاں تھے۔ قاعدے کے مطابق سنتری بندوق کندھوں پر رکھے ہر آن وہاں کھڑا رہتا تھا۔ مولانا داؤد غزنوی کی آخری سیاسی قید کے تین سال (۹۔ اگست ۱۹۴۲ء سے جون ۱۹۴۵ء تک) اسی جیل میں گزرے تھے۔ مولانا نے اپنا ملاقاتی کارڈ جیل کے ایک ملازم کے ہاتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھیجا۔ وہ باہر آئے، مولانا کو نہایت ادب سے جھک کر سلام کیا اور اپنے دفتر میں لے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ مولانا کے کہنے پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مولانا ابوالحسنات، شیخ حسام الدین اور شاہ جی کو وہیں بلا لیا اور گفتگو کے لیے دفتر کا ایک کمرہ دے دیا گیا۔ مولانا نے ان حضرات کو جیل سے باہر کی صورت حال سے آگاہ کیا اور جس رفتار سے تحریک چل رہی تھی اور گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اس کی تفصیل بتائی۔

اب شاہ جی بوڑھے ہو چکے تھے اور جسمانی کمزوری کے آثار ان کے چہرے پر عیاں تھے، مگر دل جوان تھا، جذبات کی دنیا پوری طرح آباد تھی اور کلمہ حق کہنے کا داعیہ جوبن پر تھا۔ انھوں نے مولانا سے فرمایا: آپ ہماری فکر نہ کریں۔ ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ جیل کی یہ کوٹھڑیاں ہمارے لیے نئی نہیں ہیں، عمر کا بہت بڑا حصہ انھی کوٹھڑیوں میں گزرا ہے۔ ہمیں یہاں کامل اطمینان اور سکون حاصل ہے۔ آپ ہمیں ہماری حالت پر چھوڑ دیجیے اور تحریک جاری رکھیے۔ خود کوئی ایسا قدم نہ اٹھایے کہ گرفتاری تک نوبت پہنچ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو تحریک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے...... تقریباً ایک گھنٹے تک ان سے ملاقات رہی اور ہم واپس آ گئے۔

جب تک تحریک تحفظ ختم نبوت میں گرفتار ہونے والے حضرات لاہور سنٹرل جیل میں محبوس رہے، مولانا داؤد غزنوی کئی مرتبہ ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ میں ان کے ساتھ صرف دو مرتبہ گیا۔ بعد میں شاہ جی کو سکھر جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔

Marfat.com

تحریک میں حصہ لینے والوں پر حکومت نے بے پناہ سختیاں کی تھیں اور بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اخبارات پر سنسر لگا دیا گیا تھا اور مجلس احرار خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ پھر ایک تحقیقاتی عدالت قائم کر دی گئی تھی جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔ آر کیانی پر مشتمل تھی۔ عدالت لاہور ہائی کورٹ میں قائم کی گئی تھی اور تحریک تحفظ ختم نبوت کے بہت سے رہنماؤں کے بیانات قلم بند کیے گئے تھے، جنھیں جیل سے پولیس کی تحویل میں لایا جاتا تھا۔ تحریک کی طرف سے مولانا داؤد غزنوی وکیل تھے۔ کمرہ عدالت لوگوں سے بھر جاتا تھا اور سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے اکثر وکلا کارروائی سننے کے لیے آتے تھے۔

مرزائیوں کی طرف سے بھی وکیل مقرر تھے۔ شاہ جی کو بیان دینے کے لیے جس دن عدالت میں طلب کیا گیا تھا، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم وہاں جمع تھا اور تمام اخباروں کے نمائندے موجود تھے۔ تحقیقاتی عدالت کی پوری کارروائی سنسر کی وجہ سے اخباروں میں نہیں آسکتی تھی۔ صرف اتنی خبر چھپتی تھی، جتنی حکومت چھپوانا مناسب سمجھتی تھی۔

شاہ جی کو جب ہائی کورٹ میں لایا گیا، ان کے آگے پیچھے پولیس کے اہل کاروں کا جمگھٹا تھا۔ وہ کمرہ عدالت میں آئے تو شلوار قمیص میں ملبوس تھے اور سر ننگا تھا۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ جب سے انھیں پتا چلا تھا کہ جالندھر ریلوے اسٹیشن پر مولانا حسین احمد مدنی کی پگڑی اتار دی گئی ہے، انھوں نے سر سے ٹوپی اتار دی تھی...... شاہ جی نے اپنے بیان میں مرزائیت کے پس منظر کی وضاحت کی اور پھر تفصیل سے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے، وہ شریعت اسلامی کی رو سے دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جو لوگ اس کو نبی مانیں اور اس کے لیے ظلی یا بروزی کی اصطلاحیں استعمال کریں یا اس کی مدافعت کریں یا حامیان تحفظ ختم نبوت کو صرف اس وجہ سے اذیت میں مبتلا کریں کہ وہ مرزا غلام احمد اور اس کے ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، میں صاف لفظوں میں اعلان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک وہ مسلمان نہیں ہیں۔

شاہ جی نے نہایت جرات مندانہ انداز میں کہا، جب تک میں زندہ ہوں، یہ اعلان کرتا رہوں گا اور یہ اعلان کرنا اور اس پر قائم رہنا میری زندگی کا نصب العین ہے، جس سے دنیا کی کوئی طاقت مجھے روک نہیں سکتی۔ جو شخص مجھے اس سے روکنے کی کوشش کرے گا، میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا، میں اس کی بات ماننے سے انکار کرتا ہوں۔

شاہ جی کا بیان خاصی دیر تک جاری رہا۔ درمیان میں بعض لوگوں نے نعرے لگائے تو عدالت نے نعرے لگانے سے روک دیا۔ خود شاہ جی نے بھی لوگوں سے کہا کہ نعرہ بازی بند کر دیں۔ اگرچہ یہ باقاعدہ عدالت نہیں ہے، تحقیقاتی عدالت ہے، تاہم عدالت کا احترام ضروری ہے، چاہے وہ کسی نوعیت کی ہو۔ بیان کے بعد عدالت نے حکم دیا کہ جب تک تحریک کے رہنماؤں کے بیانات اور تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے، شاہ

Marfat.com

جی کو سنٹرل جیل میں رکھا جائے، ممکن ہے کسی موقعے پر عدالت کو انھیں دوبارہ بلانا پڑے۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ برصغیر کے تمام سیاسی رہنماؤں نے ہر سیاسی تحریک میں چھوٹی بڑی ہر عدالت کا ہمیشہ احترام کیا ہے۔ عدالتوں میں نعرے بازی کرنا یا ایسے حالات پیدا کرنا جو نعرے بازی پر منتج ہوں یا عدالتوں کے طلب کرنے پر حاضر نہ ہونا ان کے نزدیک نہایت معیوب فعل تھا۔ وہ اختلاف کے باوجود عدالتوں پر اعتماد کرتے اور عدالتوں کے احترام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے تھے۔ احراری سیاسیات کے میدان میں انتہائی تیز رو تھے، مگر عدالتوں کو وہی حیثیت دیتے تھے، جس کی وہ قانونی اور اخلاقی طور سے مستحق ہیں۔

۲۶،۲۵۔ فروری ۱۹۵۶ء کو لاہور میں دلی دروازے کے باہر تحفظ ختم نبوت کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں دوپہر کے بعد شاہ جی نے تقریر کی۔ جیل سے رہائی کے بعد لاہور میں ان کی یہ پہلی تقریر تھی جو تین گھنٹے جاری رہی۔ بہت بڑے مجمعے کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے عقیدۂ ختم نبوت اور تحریک ختم نبوت کی وضاحت کی۔ لیکن اب ضعف ونقاہت نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ وہ مسلسل چالیس بیالیس برس تک لوگوں کے جذبات واحساسات کو الفاظ وحروف کے سانچے میں ڈھالتے رہے تھے، مگر اب ان میں وہ کس بل نہ رہا تھا، نہ اب برطانوی حکومت ان کی حریف تھی جس کی ستم گری کے بوقلموں واقعات سے ان کو پرتاثیر جملوں اور نوع بنوع فقروں کا ذخیرہ میسر آتا تھا، نہ کوئی سیاسی طاقت ان کے مدمقابل رہی تھی، جس پر تنقید کرتے ہوئے وہ نئے سے نئے اسلوب کلام اور انداز بیان سے حاضرین کو تڑپاتے اور گرماتے تھے۔ اس لیے ان کا لہجہ بہت مرجھا گیا تھا اور زور خطابت ماند پڑ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود جذبات وجوش میں تلاطم بدستور موجود تھا۔

اس تقریر میں شاہ جی نے مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائیں جو ہمارے جیسے ادنیٰ عقیدت مندوں کے نزدیک ان کی شان پروقار سے ہم آہنگ نہ تھیں لیکن یہ کسی خاص تاثر کی بنا پر ایک بڑے آدمی کا ایک بڑے آدمی اور پرانے ساتھی کا پرانے ساتھی کے متعلق اظہار خیال تھا، جس سے ان لوگوں کو کوئی خاص تعلق نہ تھا، جو دونوں بزرگوں کو ہر صورت میں لائق تکریم گردانتے تھے۔

جلسہ گاہ میں میں نے دیکھا کہ چند نوجوان چار پانچ کتابچے تقسیم کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک نوجوان میرے پاس آیا اور کتابچے دے کر آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھے تو وہ کتابچے میرے دو اداریوں پر مشتمل تھے جو میں نے الاعتصام میں لکھے تھے۔ سولہ سولہ صفحات کے یہ کتابچے میرے نام سے چھپے تھے اور مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان نے شائع کیے تھے۔ ان کتابچوں میں مولانا مودودی کے بعض افکار کو موضوع گفتگو بنایا گیا تھا۔

۱۹۵۶ء کے مارچ کی ابتدائی تاریخوں میں شاہ جی لاہور میں تھے اور مجلس احرار کے دفتر (بیرون دلی

Marfat.com

دروازہ) میں قیام فرماتے۔ ایک دن دس بجے کے قریب مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی دفتر الاعتصام تشریف لائے اور مولانا داؤد غزنوی سے ملے۔ میں اس وقت مولانا کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس زمانے میں بعض معاملات سے متعلق کچھ لوگوں نے شاہ جی اور مولانا غزنوی کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں، جن کا شاہ جی نے چند روز پیشتر ۲۶۔ فروری کی تقریر میں اپنے انداز خاص میں ذکر کیا تھا۔ مولانا اپنے پرانے ساتھی سے اس کی امید نہیں رکھتے تھے، اس لیے انھیں شاہ جی سے اس ضمن میں دوستانہ شکوہ تھا۔ مولانا تاج محمود اور مولانا مجاہد الحسینی چاہتے تھے کہ مولانا تکلیف فرمائیں اور شاہ جی کے پاس تشریف لے جائیں تاکہ باہمی گفتگو سے غلط فہمیاں دور ہو جائیں، مگر مولانا اس پر آمادہ نہ تھے۔ وہ فرماتے تھے، پہل شاہ جی کی طرف سے ہوئی ہے، از راہ کرم وہ تشریف لائیں اور اپنا نقطہ نظر واضح فرمائیں۔ میں بھی انھیں اپنا موقف بتاؤں گا۔ اگر میری غلطی ہوئی تو معافی مانگ لوں گا۔

خاصی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بالآخر مولانا نے فرمایا کہ میں اپنے ایڈیٹر (یعنی راقم عاجز) کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے ساتھ شاہ جی کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ یہ ان سے میرے موقف کی وضاحت کریں گے، اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا...... ان دونوں صاحبان نے یہ تجویز منظور فرمائی اور میں مولانا کی ''نمائندگی'' کے لیے ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ مجھے احساس تھا کہ میں مولانا کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کر سکوں گا اور شاہ جی کے حضور کھل کر بات کرنا میرے لیے مشکل ہو گا لیکن اس کے باوجود میں چل پڑا۔ حکم ماننا بھی ضروری تھا۔

اس دن ہلکی ہلکی سی بارش ہو رہی تھی۔ مجلس احرار کا دفتر دلی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے کی بلڈنگ کی دوسری اور تیسری منزل میں تھا۔ بارش کی وجہ سے سڑک پر گارے کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ اسی بلڈنگ میں احرار کے ترجمان روزنامہ آزاد کا دفتر تھا، جس کے ایڈیٹر ان دنوں مولانا مجاہد الحسینی تھے۔ ہم دوسری منزل میں گئے تو ایک بڑے کمرے میں موٹے بان کی چھوٹی سی چارپائی پر برصغیر کا شہنشاہ خطابت آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ فرش پر ایک دری بچھی تھی جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور اس کے بڑے بڑے سوراخ اس کی بوسیدگی اور کہنگی کا اعلان کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ عمر کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے اور اس پر بے شمار کاروان احرار گزر چکے ہیں۔

دری پر سات آٹھ آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے اور شاہ جی نظر کی عینک لگائے اور ہڈیوں کا ڈھانچا بنے مجلس احرار کے لیٹر پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے اور نگاہیں کاغذ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم تینوں ان کے انہماک کو دیکھ کر ''سرہانے میر کے آہستہ بولو'' کی عملی تصویر بنے تھوڑا سا آگے بڑھے۔ جوتے اتار کر اور بزبان خفی السلام علیکم

Marfat.com

کہہ کر، نہایت ادب سے دوزانو ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شاہ جی نے کاغذ سے نگاہ اٹھائی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مودبانہ اور نیازمندانہ سلام عرض کیا اور سر جھکا کر دونوں ہاتھ ان کے بابرکت ہاتھوں میں دے دیے۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کھڑے ہو کر میرا ان سے تعارف کرایا۔

میرا نام (جوان جیسے نامور حضرات کے ذکر کے مقابلے میں کسی شمار قطار میں آنے کے لائق نہیں) سنتے ہی بیسویں صدی کے برصغیر کا خطیب اعظم چارپائی سے اٹھا اور مجھے اپنی بغل میں لے لیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی سے کہا، تم خاموشی سے آکر بیٹھ گئے، آتے ہی کیوں نہیں بتایا، میں اپنے عزیز کو لینے کے لیے دروازے پر جاتا...... یہ الفاظ مجھ فقیر کے لیے بہت بڑا اعزاز تھے۔ پھر اس سے بڑا اعزاز یہ کہ مجھے اپنے برابر چارپائی پر بٹھایا۔ عجیب تر بات یہ کہ اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا اور جو بڑا سا تکیہ چارپائی پر پڑا تھا، ٹیک لگانے کے لیے عنایت فرمایا۔ میں اس پیکر شفقت کی پرخلوص باتیں سن کر اور کیفیت انکسار دیکھ کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا۔ ایک آدھ منٹ تو کسی نہ کسی طرح سرہانے کی طرف بیٹھا، پھر یہ عرض کر کے پائنتی میں آ گیا کہ اب تعمیل ارشاد ہو گئی اور الامر فوق الادب پر عمل کر لیا گیا......اس سے زیادہ اس فقیر میں ہمت نہیں۔

شاہ جی نے لطف و کرم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا، ''میں آپ کے اخبار الاعتصام کا باقاعدہ مطالعہ کرتا ہوں، آپ کے اداریے پڑھتا ہوں اور خوش ہو کر آپ کو دعا دیتا ہوں۔ آپ کے دو اداریے تو میں نے مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان کی طرف سے کتابی صورت میں شائع بھی کرائے ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان ''راہ اعتدال یا راہ اعتزال'' اور ایک کا ''متعہ کے جواز پر ڈرامائی استدلال'' ہے۔ پھر یہ دونوں کتابچے مجھے عنایت فرمائے۔

ان دونوں اداریوں کا تعلق مولانا مودودی کے بعض افکار سے تھا۔

اس کے بعد انھیں مولانا داؤد غزنوی کا سلام پہنچایا گیا۔ مولانا تاج محمود اور مجاہد الحسینی نے کہا کہ مولانا سے بہت باتیں ہوئی ہیں۔ وہ کسی وجہ سے خود تشریف نہیں لا سکے، میرے متعلق بتایا کہ یہ ان کے نمائندے کی حیثیت سے آپ سے بات کریں گے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مجھے شاہ جی کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا شرف حاصل رہا۔ تمام گفتگو میں انھوں نے یا تو مجھے ''اسحاق صاحب'' کہہ کر خطاب فرمایا یا ''میرے عزیز'' کہہ کر...... جمال و انکسار میں ڈوبے ہوئے لہجے میں انھوں نے کہا، میں فقیر آدمی ہوں، مولانا داؤد غزنوی سے خفا ہونے اور ان سے گلے شکوے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں امرتسر کی ایک مسجد میں بیٹھا زندگی کے دن گزار رہا تھا اور اپنے تھوڑے سے علم کے مطابق وعظ و نصیحت کی خدمات انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع ہو گئی۔ داؤد غزنوی مجھے جانتے تھے اور میرے طریق وعظ کا انھیں علم تھا۔ میں نہایت سادگی سے

Marfat.com

رہتا اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند باندھتا تھا۔ ان کا گھرانا فضل وکمال اور تصوف وطریقت کا گھرانا تھا، جس کے فیوض وبرکات کا دائرہ سارے پنجاب پر محیط تھا۔ ان سے ملاقات ہوتی تو نہایت مہربانی کا اظہار کرتے، میں بھی جھک کر سلام کرتا۔ ان کی جوانی کا زمانہ تھا، میں بھی جوان تھا، لیکن ان کا شمار اس دور کی مجلس خلافت کے قائدین میں ہوتا تھا اور میں گوشہ نشین امام مسجد..... ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، کیوں مسجد میں بیٹھے اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو، اٹھو میدان عمل میں نکلو، ملک وقوم کو تمھاری ضرورت ہے۔ میں ان کے کہنے سے مسجد کی چاردیواری سے باہر نکلا اور تحریک خلافت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میانوالی جیل میں ہم دونوں اکٹھے رہے اور بارہا جیل اور ریل میں ہماری رفاقت رہی۔ تحریک خلافت میں، جمعیت علمائے ہند میں (جس کے بانیوں میں خود داؤد غزنوی کا نام بھی شامل ہے) مجلس احرار میں اور بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں ہم نے ایک ساتھ کام کیا، ایک سٹیج پر تقریریں کیں اور بے شمار مواقع پر ہم سفر رہے۔ شاہ جی نے فرمایا، میں سیاست میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور استاد کا گلہ کرنا اس فقیر کا شیوہ نہیں۔ میری جوانی گزر گئی۔ کہولت کا زمانہ بیت گیا، اب بڑھاپے کی منزل میں داخل ہو گیا ہوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ میں ہرگز اس سیدزادے سے خفا نہیں۔ یہ میرا اللہ اللہ کرنے کا وقت ہے، گلے شکوے کی کتاب کھول کر بیٹھنے کا نہیں۔ اسحاق صاحب! میرا انھیں نیاز مندانہ سلام پہنچایے اور میری طرف سے عرض کیجیے کہ وہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں، مجھ گنہگار کے لیے دعا کریں، میں بھی ان کے لیے دعا گو ہوں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا۔ آپ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس فقیر کے پاس آنے کی زحمت گوارا کی۔

شاہ جی نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں۔ ان کا لہجہ انتہائی نرم اور طرز کلام بدرجہ غایت میٹھا اور پیارا تھا۔ اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے اور زبان کے طرز ادا نے ان کی کیفیت قلب کا پتا دیا۔

زندگی میں میری ان سے یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی، جو بہت سی گفتگوؤں پر بھاری تھی۔ اس میں شاہ جی نے اپنے دل کا صاف وشفاف آئینہ میرے سامنے رکھ دیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ گفتگو تاثیر پذیری کے بے شمار نقوش میری لوح قلب پر مرتسم کر گئی۔ میں نے واپس آ کر مولانا کو تمام باتیں تفصیل سے سنائیں اور شاہ جی نے ان کے بارے میں جن جذبات کا اظہار کیا تھا، اس کی وضاحت کی۔ ظاہر ہے خود مولانا بھی اپنے متعلق شاہ جی کے تاثرات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں غور اور توجہ سے سنیں اور دوران سماعت میں کئی مرتبہ اشک بار ہوئے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ بات چیت سے شاہ جی کی افسردگی کا اندازہ ہوتا تھا اور سننے والے بھی افسردہ تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ

Marfat.com

افسردہ دل، افسردہ کند انجمنے را

شاہ جی کی جسمانی حالت اور حلاوت کلام کو دیکھ کر داغ کا یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔

ہوش و حواس و تاب و تواں داغ جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں، ساماں تو گیا

شاہ جی برصغیر کے بے مثال خطیب اور عظیم مجاہد تھے۔ قرآن مجید پڑھتے تو معلوم ہوتا کہ قرات و تجوید کے تمام لوازم کے ساتھ لحن داؤدی سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ اردو بولتے تو شبہ پڑتا کہ غالب، ذوق اور داغ کی شاعری کو چھوڑ کر خطابت اختیار کر لی ہے۔ پنجابی میں بات کرتے تو محسوس ہوتا کہ راوی اور چناب نے اپنی روانیاں انھیں بخش دی ہیں۔

وہ غلامی کے دور میں پیدا ہوئے اور غلامی کے شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس خطہ ارض نے بڑے بڑے لوگوں کو جنم دیا، جن میں شہرہ آفاق سیاست دان بھی تھے اور اونچے درجے کے مقرر و خطیب بھی۔ منجھے ہوئے اصحاب درس و تدریس بھی تھے اور عالی مرتبے کے مصنف و مؤلف بھی...... پاکیزہ وش صوفیا و اتقیا بھی تھے اور اہل تحقیق مناظر و ناقد بھی۔ یہ حضرات ایک خاص فضا اور ماحول کی پیداوار تھے۔ اب ان اوصاف کے حامل لوگ کبھی پیدا نہیں ہوں گے۔ وہ سانچے مدت ہوئی ٹوٹ گئے جن میں یہ حضرات ڈھلے تھے اور وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو گیا جس میں یہ بزرگ عالم وجود میں آئے تھے۔

شاہ جی اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ان لوگوں میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ صف اول میں جگہ پاتے تھے۔ ان کی تقریر میں شیر کی گرج، خطابت میں دریا کی روانی اور تنقید میں تلوار کی کاٹ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش میں پھولوں کی مہک اور گلاب کی خوشبو بھی رچی ہوئی تھی۔

وہ انتہائی نرم گفتار بھی تھے اور بدرجہ غایت تیز کلام بھی۔ انگریزی حکومت کے خلاف لب کشائی کرتے تو زبان آگ اگلنے لگتی اور توحید و سنت کے موضوع پر وعظ کہتے تو لہجہ بدل جاتا اور نرمی و ملائمت کا پیکر شیریں بن جاتے۔ وہ سحر طراز خطیب اور شیوہ بیان مقرر تھے۔ جو بات کرتے، اخلاص میں ڈوب کر کرتے اور وہ بات سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اترتی اور اپنی جگہ بناتی چلی جاتی...... جس مسئلے کو موضوع بحث ٹھہراتے، اس کے متعلقات کی اس اسلوب میں وضاحت کرتے کہ حاضرین پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ وہ چھ چھ سات سات گھنٹے بے تکان بولتے اور دریا کی سی روانی سے بولتے۔ جب تک تقریر کا سلسلہ جاری رہتا، ایسے محسوس ہوتا کہ فضا پر نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔ وعظ و تقریر میں ایسے ایسے لطائف و ظرائف اور واقعات و حکایات بیان کرتے کہ کبھی محفل کشت زعفران بن جاتی اور کبھی آہ و بکا کی صدائیں بلند ہونے لگتیں۔ مجمع پوری طرح ان

Marfat.com

کی گرفت میں ہوتا۔ وہ ہنساتے بھی تھے اور رلاتے بھی تھے۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اس انداز میں شعر پڑھتے کہ معلوم ہوتا شاعر نے اسی مقام کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

انھوں نے جگرداری کے ساتھ انگریز سے ٹکر لی، بہادری اور حوصلے کے ساتھ قید و بند کی سختیوں کو جھیلا اور جرات و بے باکی سے حریف طاقتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کی عزیمت ان کی عظمت کا پتا دیتی ہے، ان کا ایثار ان کی بلندی کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کی درویشی ان کی رفعت کو اجاگر کرتی ہے۔

اگر وہ اپنی خداداد قابلیتوں کی بنا پر پیری مریدی کی راہ اپناتے تو لاکھوں ہاتھ ان کی بیعت کے لیے آگے بڑھتے اور انسانوں کے گروہ کے گروہ قدم بوسی کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اگر دنیوی مال و منال کی طرف عنان توجہ مبذول کرتے تو اپنی جاذب قلب و نظر شخصیت کی بنا پر عوامی محبوبیت کا مرکز قرار پاتے اور سیم و زر کے اونچے اونچے ڈھیر ان کے سامنے ہوتے۔

انھوں نے آرام و راحت کے بجائے تکلیف و اذیت کی راہ اپنائی اور اس وقت انگریز کے قلعہ اقتدار میں شگاف ڈالنے کے لیے میدان میں اترے، جب اس کے خلاف زبان سے کوئی لفظ نکالنا اپنے آپ کو بے پناہ مصائب کے سپرد کر دینے کے مترادف تھا، انھوں نے اس دور میں سلطان جابر کے سامنے آزادی و حریت کا کلمہ حق بلند کیا، جب اس کے صلے میں طوق و سلاسل کی گراں باریوں کو انگیز کرنا لازمی قرار پاتا تھا۔ انھوں نے تحریک ہجرت میں حصہ لیا، تحریک خلافت میں قربانیاں دیں اور ہر اس محاذ پر داد شجاعت دی جس سے انگریز کے پندار استعمار کو گزند پہنچ سکتا تھا۔ بلاشبہ ان کی سیاسی خدمات کا سلسلہ بہت طویل اور انتہائی دردناک ابواب پر مشتمل ہے۔

مجلس احرار کے قیام کے بعد، جس کے بانیوں میں خود شاہ جی بھی تھے، وہ زندگی کے آخری لمحوں تک مجلس احرار سے وابستہ رہے۔ اس میں یا تو درمیانے درجے کے لوگ شامل تھے یا غریب و نادار......! میرے خیال میں اس جماعت میں صرف ایک چودھری، ایک نواب زادہ اور ایک صاحب زادہ تھے۔ جب کہ بعض دوسری سیاسی جماعتوں میں کتنے ہی نواب اور نواب زادے اور صاحب زادے اور سیٹھ اور دولت مند موجود تھے۔ اس جماعت میں لوگ سر کٹانے کے لیے آتے تھے، جب کہ بعض دوسری جماعتوں میں ''سروں'' کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ جو کمال نیازمندی کے ساتھ سرکار کی دہلیز پر جھکے ہوئے تھے۔

احرار کے نواب زادہ اور صاحب زادہ (نواب زادہ نصر اللہ خاں اور صاحب زادہ فیض الحسن) کو میں نے مجلس احرار کے مرکزی دفتر لاہور میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۶ء میں اس وقت دیکھا تھا، جب صوبہ بہار میں فسادات کا زور تھا اور ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اور غریب مجلس احرار کے قائم کردہ بہار فنڈ میں غریب لوگ چندہ جمع کراتے تھے۔ میں بھی اپنے وطن کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ، مشرقی

Marfat.com

پنجاب) کے غریب مسلمانوں کی طرف سے تین سو ساٹھ روپے کی غریبانہ رقم جمع کرانے کے لیے مجلس احرار کے دفتر (لاہور) آیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس رقم کی رسید ثناء اللہ بھٹہ نے دی تھی اور انہی کے اس پر دستخط تھے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مجلس احرار کے چودھری (افضل حق) جو بے چارے فقط نام کے چودھری تھے، ۱۹۴۲ء میں وفات پا گئے اور آزادی کے فوراً بعد نواب زادہ اور صاحب زادہ دونوں اس جماعت سے الگ ہو گئے اور یہ جماعت بدستور قلندروں اور ملنگوں کی جماعت رہی۔ لیکن مجلس احرار کے یہ قلندر اور ملنگ اور درمیانے درجے کے لوگ ایثار اور قربانی کا مجسمہ تھے۔ آزادی وطن کے لیے عمل و حرکت کو عبادت قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں قید و بند کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو احرار سینہ تان کر میدان میں آ گئے۔ ملک کی انگریزی حکومت کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ ۸۔ اگست ۱۹۴۲ء کو جب کانگریس نے بمبئی میں ''ہندوستان خالی کرو'' ریزولیوشن پاس کیا تو اس کے نتیجے میں کانگریسی رہنماؤں اور بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا...... لیکن مجلس احرار کے قائدین و ارکان اس وقت جنگ کے بعد دوسری مرتبہ گرفتاریاں پیش کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس صورت حال کے متعلق سبھاش چندر بوس نے کانگریس پر طنز و طعن کے انداز میں ایک بیان میں کہا تھا کہ مجلس احرار کے ارکان کانگریسی نیتاؤں سے قربانی میں کہیں آگے ہیں جو آزادی وطن کے لیے تین سال کے عرصے میں حکومت برطانیہ کے خلاف سول نافرمانی کر کے دوسری مرتبہ جیلوں میں جا رہے ہیں۔

مجلس احرار سے تعلق رکھنے والوں کو شاید جیل جانے کا ''مرض'' لاحق ہو گیا تھا۔ جیل سے باہر کھلی فضا میں رہنا ان کو راس نہیں آتا تھا۔ دو ڈھائی مہینے باہر رہتے تو انھیں کھجلی سی ہونے لگتی، اس کا علاج ان کے نزدیک جیل جانا تھا۔

اس موقعے پر مشہور صحافی دیوان سنگھ مفتون کی آزادی سے پہلے کی ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ان کا اخبار ہفت روزہ ریاست تھا جو ملک کے بعض حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اس کا ایک کالم سوال و جواب کا تھا۔ کسی نے ان سے ملک کی مختلف سیاسی جماعتوں اور ان کے عمائد و ارکان کی خصوصیات کے بارے میں سوال کیا، جن میں مجلس احرار بھی شامل تھی۔ انھوں نے تمام جماعتوں کے بارے میں جواب دیا اور ان کا دلچسپ اسلوب میں تجزیہ کیا۔ مجلس احرار کے ارکان کے بارے میں ان کا جواب تھا کہ یہ ملک کی وہ سیاسی جماعت ہے، دھواں دھار تقریریں کرنا جس کے لیڈروں کا پیشہ ہے۔ وہ انگریزی حکومت کے بھی خلاف ہیں، ہندوؤں کے بھی مخالف ہیں، کانگریس سے بھی ان کا تصادم ہے اور مسلم لیگ سے بھی چپقلش ہے...... یہ لوگ سادہ زندگی

Marfat.com

بسر کرتے ہیں، جلسوں میں جائیں تو معمولی ہوٹل یا تنور سے دال روٹی کھا کر گزارہ کرتے ہیں...... جیل سے باہر رہنا ان کے لیے ناممکن ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کیے رکھتے ہیں، جس کے باعث جیل جانا ضروری ہو جائے۔

مولانا سید داؤد غزنوی سے ایک مرتبہ میں نے پوچھا کہ آپ مجلس احرار کے بانیوں میں سے تھے اور آپ کو اس میں بہت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مجلس احرار کو چھوڑ کر آپ کانگرس میں کیوں چلے گئے تھے؟ فرمایا مجلس احرار کا کانگریس سے بھی جھگڑا، مسلم لیگ سے بھی لڑائی۔ نتیجہ یہ کہ نہ کانگریسی لیڈر ان پر پورا اعتماد کرتے تھے اور نہ مسلم لیگی انھیں حق بجانب قرار دیتے تھے۔ میں جب تک مجلس احرار میں رہا لا یموت فیھا و لا یحییٰ کی سی کیفیت رہی۔ بالآخر اسے چھوڑ ہی دیا۔

برصغیر کو انگریزی استعمار سے نجات دلانے کے لیے شاہ جی نے جو جدوجہد کی وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ آزادی کی ہر تحریک کا طویل پس منظر ہوتا ہے، جس میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ہر دور میں متعدد جماعتیں اپنے اپنے انداز سے حصول آزادی کے لیے کوشاں رہتی ہیں اور مختلف عناصر اس کے لیے تگ و دو کرتے ہیں۔ پھر ان سب کی مخلصانہ کوششوں سے آزادی کی نعمت میسر آتی ہے۔

شمع حریت کبھی ایک ہی سمت سے صحن ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف اوقات وحالات میں مختلف سمتوں اور مختلف دروازوں اور ذریعوں سے آتی اور چمن زار وطن کو روشنی بخشتی ہے۔

اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو بلاشبہ آزادی وطن اور قیام پاکستان میں مجلس احرار اور شاہ جی کی تگ و تاز مجاہدانہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ احرار کا شمار ان جماعتوں میں ہوتا ہے جن کے ارباب قیادت کی سعی مسلسل سے ہم نے انگریز کی غلامی سے چھٹکارا پایا اور جن کی قربانیوں کی بدولت ہم حریت و آزادی کے مسرت آمیز دور میں داخل ہوئے۔

بعض حضرات کی سوچ کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ جس میں تنقید کا عنصر غالب رہتا ہے۔ بے شک ہر شخص کی اپنی سوچ ہے، جس کے اظہار کا اسے حق حاصل ہے، لیکن اس میں کسی جماعت اور اس کے ارکان کی قربانیوں کو بہرحال پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔

یہاں اس حقیقت کی بھی نشان دہی کر دوں کہ مجلس احرار اور اس کے اکابر کو یہ خصوصیت حاصل ہے اور غالباً یہ ان کے خلوص نیت کا نتیجہ ہے کہ ایک مکمل تاریخ اس کاروان فقر کی لکھی گئی جو کاروان احرار کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور ایسے شخص نے یہ خدمت سرانجام دی جو بظاہر کوئی مادی اور مالی وسائل نہیں رکھتا تھا اور جس کا ماضی فقر و فاقہ میں گزرا۔ وہ مرد قلندر تھا مرزا غلام نبی جانباز......! اللہ ان کی محنت قبول فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ یہ کتاب کسی پبلشر نے شائع نہیں کی، مصنف نے اپنی

Marfat.com

غربت کے باوجود خود ہی شائع کی اور خود ہی اس کی فروخت کا اہتمام کرتے رہے۔

شاہ جی اور چھوٹے بڑے تمام قائدین احرار میں یہ خوبی تھی کہ ہر آن اور ہر حال میں خوش وخرم رہتے تھے۔ لطیفے بازی اور ہنسی مذاق ان کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ اس پر ان کے مخالف سیاسی جماعتوں کے بعض لوگ طعنہ زن بھی ہوئے مگر انھوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

یہ حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ احرار ہمیشہ برصغیر کی انگریزی حکومت کے معتوب رہے اور بعض سیاسی جماعتوں نے بھی انھیں پریشانیوں میں مبتلا کیے رکھا اور ان پر کئی قسم کے الزام عائد کیے۔ پھر ان کے مادی وسائل بھی بہت محدود تھے اور بعض افراد تو مفلسی کی حالت میں تھے۔ اگر ان میں لطیفے بازی کی حس نہ ہوتی اور یہ لوگ ہنسی مذاق سے آشنا نہ ہوتے، ہر وقت ماتھے پر تیوری چڑھائے اور اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کیے رکھتے تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ انھوں نے ہمیشہ ہنسی مذاق اور لطائف وظرائف میں غم غلط کرنے کی کوشش کی...... اور ان حالات میں ان کے لیے یہ ضروری بھی تھا۔ تکلیفوں اور مصیبتوں کے احساس کو کسی نہ کسی حد تک دور کرنے کے لیے اس قسم کا اسلوب اختیار کرنے کو میرے خیال میں نامناسب نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ اسے مارشل لا کی قانونی بولی میں ''نظریہ ضرورت'' سے تعبیر کرنا چاہیے۔

شاہ جی نہایت حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ وہ کہیں تقریر کر رہے تھے کہ کسی نے ان سے سوال کیا، آپ کے نزدیک حضرت علیؓ کا درجہ بلند ہے یا حضرت عمرؓ کا......؟

جواب دیا، حضرت علیؓ میرے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مرید ہیں، اور حضرت عمرؓ آپ ﷺ کی مراد......! مجھے میرے نانا کے مرید اور مراد دونوں سے محبت ہے اور ان سے اظہار محبت کرنا جزو ایمان ہے۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک سے ایک دن پہلے ایک نوجوان نے ان سے کہا، شاہ جی! شدید گرمیوں کا موسم ہے اور کل سے روزے شروع ہو رہے ہیں۔ کوئی ایسا مسئلہ بتایئے کہ کھایا پیا بھی جائے اور روزہ نہ بھی ٹوٹے۔

فرمایا، کل روزہ رکھ کر میرے پاس آ جانا۔ میں تمھیں جوتے ماروں گا، تم جوتے کھاتے جانا اور آنسو پیتے جانا۔ کھاتے پیتے بھی رہو گے اور روزہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔

شاہ جی شاعر بھی تھے اور ندیم ان کا تخلص تھا۔ انھوں نے فارسی، اردو اور سرائیکی میں شعر کہے۔ ان کے اشعار کا مختصر سا مجموعہ سواطع الالہام کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اردو کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ذروں سے تابہ مہر، ستاروں سے تا چمن
عکس جمال یار کی تابندگی ہے دوست!

زمانہ اپنی ہر کروٹ میں لاکھوں رنگ بدلتا ہے
مگر اس کو بھی حسرت ہے کہ ہو گرگٹ نہیں سکتا

Marfat.com

وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں ادھر ڈھونڈتی ہے، ادھر ڈھونڈتی ہے

گر ہو دوائے عشق کی تلخی نصیب عقل بنتی ہے پھر تو بادہ و ساغر کہے بغیر
دار کے حقدار کو اور قید صد سالہ ملے ہائے قسمت مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

حماقت کی حد ہے کہ سولی پہ چڑھ کر سمجھتا ہے بندہ خدا ہو گیا میں

جب تک کہ غیر حق کی یوں ہی بندگی ہے دوست یہ زندگی بھی میری کوئی زندگی ہے دوست

مندرجہ ذیل شعر شاہ جی نے کہا اور پھر ساحر لدھیانوی کو عطا کر دیا تھا۔ بہت عمدہ شعر ہے، ملاحظہ ہو۔

چمن کو اس لیے مالی نے خون سے سینچا تھا کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں

شاہ جی نے اور ان کی جماعت مجلس احرار نے تحریک پاکستان سے اختلاف کیا تھا، لیکن جب پاکستان قائم ہو گیا تو وہ اس کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ میں نے اور میری جماعت نے قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی اور ہم ایک ہندوستان کے حامی تھے۔ اب پاکستان بن گیا ہے، ہم اپنے موقف میں ہار گئے ہیں اور ہمارے مخالف جیت گئے ہیں۔ پاکستان ہمارا ملک ہے اور ہمارا مستقبل اسی سے وابستہ ہے، ہم یہیں رہیں گے اور یہیں مریں گے۔ اب جو شخص پاکستان کی مخالفت کرے گا، ہم اس کے خلاف جنگ کریں گے۔

یہ ان کی اخلاقی جرات تھی اور قیام پاکستان سے اختلاف کی بنا پر سیاسی شکست کا اعتراف تھا۔ اس قسم کا اعلان کوئی بڑا آدمی ہی کر سکتا ہے اور بلاشبہ شاہ جی بڑے آدمی تھے، ورنہ ہم نے کتنے ہی لوگوں کو دیکھا ہے، جنھوں نے تحریک قیام پاکستان کی شدید مخالفت کی تھی، لیکن اب فرماتے ہیں کہ اس تحریک کے اصلی حامی ہم لوگ ہی تھے۔

شاہ جی میں ہم نے یہ صفت بھی دیکھی کہ قیام پاکستان کے بعد اگر کوئی شخص پاکستان یا اس کے قائدین کے خلاف کسی قسم کی بات کرتا تو وہ برداشت نہ کر سکتے اور ایسے شخص کو خوب ڈانٹ پلاتے۔

ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ایک دن ملتان میں ایک شخص شاہ جی سے ملاقات کے لیے گئے اور مختلف موضوعات سے متعلق باتیں کرتے رہے۔ شاہ جی نہایت خوش گوار موڈ میں تھے، مہمان نے بعض سوالات کیے تو شاہ جی نے اپنے انداز میں بہترین اسلوب میں ان کے جواب دیے۔ اثنائے کلام میں انھوں نے آزادی سے قبل کی سیاست کا قصہ چھیڑ دیا اور شاہ جی کے اس دور کے موقف کی تائید اور پاکستان پر تنقید کرنے لگے۔

اب شاہ جی کا رنگ بدل گیا اور ان صاحب کی طرف گھور کر دیکھا۔ فرمایا: آپ میرے پاس بیٹھے ہیں اور میرے سامنے میرے ملک پر تنقید کر رہے ہیں، وہ بھی میرے ماضی کے نقطہ نظر سے؟ آپ مجھ سے یہ توقع

Marfat.com

رکھتے ہیں کہ میں آزادی سے پیشتر کے دور ہی میں الجھا رہوں اور اپنی سوچ بچار کا معیار اسی کو قرار دیے رکھوں؟

شاہ جی نے فرمایا: فرض کیجیے، میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے کسی عزیز سے کرنا چاہتا ہوں، میری بیوی اس کا رشتہ اپنے عزیزوں کے ہاں کرنے پر اصرار کر رہی ہے۔ میری بیوی اپنی رائے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور لڑکی کا رشتہ میری خواہش اور کوشش کے برعکس میری بیوی کے عزیزوں کے گھر میں ہو جاتا ہے، تو کیا شادی ہو جانے کے بعد میں اس کی مخالفت کروں؟ اور اپنی بیٹی کا گھر اجاڑنے پر کمر بستہ ہو جاؤں؟

اگر ایسا کروں گا تو انتہائی کم عقلی کا مظاہرہ کروں گا اور اپنی بیٹی سے دشمنی کا ثبوت دوں گا۔

میں نے قیام پاکستان سے قبل بے شک اس سے اختلاف کیا تھا، اور میرے نزدیک میرا نقطہ نظر صحیح تھا، لیکن اب میں اس کی ہر پہلو سے حمایت کروں گا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ میرے ملک کو کسی قسم کا نقصان پہنچے، جو شخص کسی اعتبار سے بھی اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا میں اس کا پوری قوت سے مقابلہ کروں گا۔ اس کی مخالفت کرنے والا میرا دشمن ہے اور میں اپنے دشمن کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔

سیاسیات کا میدان بڑا وسیع ہے اور حالات کے مطابق ہر شخص کا اپنا اسلوب فکر ہے، جیسے جیسے حالات بدلتے جائیں گے، اسلوب فکر بدلتا جائے گا۔ سیاست میں ہمیشہ ایک ہی جگہ کھڑے رہنا، صحیح سیاست دان کا کام نہیں۔ وقت بدلے گا تو سیاست کے نشیب و فراز میں بھی تبدیلی آئے گی۔

قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو مرزائیت کی تردید اور ملک میں اسلامی نظام کی کوشش کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مرزائیت کے سلسلے میں تو انھیں کامیابی ہوئی لیکن اسلامی نظام کی منزل ابھی دور تک دکھائی نہیں دیتی۔

آزادی کے بعد وہ ملتان میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کوئی چھوٹا بڑا مکان الاٹ نہیں کرایا اور نہ حکومت کے کسی اہل کار سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے، اسی مکان میں وفات پائی اور اسی سے ان کا جنازہ اٹھا۔

شاہ جی کا سلسلہ نسب چھتیس واسطوں سے حضرت حسنؓ سے ملتا ہے۔ وہ ۱۴۔ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) کو ہندوستان کے صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ جب فہم و شعور نے انگڑائی لی اور عقل و خرد نے کچھ منزلیں طے کیں تو امرتسر آ گئے۔ وہاں کی ایک مسجد میں ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۶ء میں وعظ و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ سیاسی زندگی کا آغاز مولانا محمد داؤد غزنوی کے کہنے سے ۱۹۱۹ء میں ہوا، جب کہ تحریک خلافت شباب پر تھی۔ بارہا جیلوں میں گئے اور طویل قیدیں کاٹیں۔

عمل و حرکت کے اعتبار سے بھرپور زندگی بسر کی۔ وہ ایسا بے تاب اور مضطرب دل لے کر آئے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے قرار ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز اتنی پر درد اور پر سوز تھی کہ برصغیر

Marfat.com

اور عالم اسلام کے ہر سانحہ پر بے ساختہ بلند ہو جاتی تھی۔ ظلم کے خلاف ان کی صدا اس درجے موثر تھی کہ ایک آن میں صور اسرافیل بن جاتی تھی۔ ان کی آنکھیں اسلام اور اہل اسلام کی ہر اذیت پر اشک بار ہو جاتی تھیں۔ مسلمانوں کی ہلکی سے ہلکی تکلیف بھی نہ وہ خود برداشت کر سکتے تھے اور نہ یہ گوارا کرتے تھے کہ کوئی برداشت کرے۔ ناممکن تھا کہ وہ مظلوم کو ظلم وستم کے شکنجے میں جکڑا ہوا دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ ملک وقوم کی مصیبت کے وقت خود روتے اور دوسروں کو رلاتے تھے۔

انھوں نے غلام آباد ہندوستان میں انگریز کے خلاف زبردست ٹکر لی اور اس کی حکومت کو اپنا سب سے بڑا حریف گردانا۔ ایران، عراق، ترکی، حجاز، نجد، مصر، شام، بیت المقدس غرض ہر خطہ ارض کے مسلمانوں کی مظلومیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کے مصائب پر نوحہ خواں ہوئے۔

وہ مردِ مجاہد اپنے دور کی تمام حریف طاقتوں سے عمر بھر پنجہ آزما رہا، کبھی کسی سے مات نہ کھائی اور کسی کے سامنے ایک لمحے کے لیے سرنگوں نہ ہوا۔ لیکن عزرائیل کے مقابلے میں شکست کھا گیا اور فرشتہ اجل نے موت کا پیغام دیا تو سر جھکا دیا۔

موت کی تمہید بھی بڑی طولانی تھی جو فالج، لقوہ اور یرقان کے انتہائی الجھے ہوئے عنوانات پر مشتمل تھی اور مسلسل چار سال تک پھیلتی چلی گئی۔ بالآخر قمری حساب سے اکہتر اور شمسی حساب سے عمر کی تقریباً ستر منزلیں طے کر کے ۹۔ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ (۲۱۔ اگست ۱۹۶۱ء) کی شام کو چھ بج کر پچپن منٹ پر اس عالی مرتبت شخص کی کتاب حیات کا آخری ورق ختم ہو گیا اور اللہ ذوالجلال کی بارگاہ اعلیٰ وارفع سے مسرت انگیز ندا آئی۔

﴿يَـٰٓأَيَّتُهَا ٱلنَّفْسُ ٱلْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ٱرْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَٱدْخُلِى فِى عِبَـٰدِى ۝ وَٱدْخُلِى جَنَّتِى ۝﴾ (الفجر: ۲۷۔۳۰)

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

خواجہ عبدالوحید

۱۹۵۸ء کے مارچ یا اپریل کا مہینہ تھا۔ دن کے دس بجے کے قریب ایک صاحب مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملاقات کے لیے ان کی اقامت گاہ واقع شیش محل روڈ پر تشریف لائے۔ وہ ایک دن پہلے مولانا سے ملاقات کا وقت طے کر چکے تھے۔ میں اس زمانے میں ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا، جس کا دفتر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی دوسری منزل میں تھا۔ ان صاحب کی تشریف آوری کے وقت میں اس بلڈنگ کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔ انھوں نے مولانا کے بارے میں پوچھا اور میں انھیں ان کے کمرے میں لے گیا، جو سب سے نیچے کی منزل میں تھا اور جسے وہ بطور دفتر استعمال کرتے تھے۔ ان کا کتب خانہ بھی یہیں تھا۔

حلیے اور لباس کی وساطت سے میں آپ کو معزز مہمان سے ملانے کی کوشش کرتا ہوں۔ نکلتا ہوا قد، گٹھا ہوا متناسب جسم، ابھرا ہوا چہرہ، سرخی مائل گورا رنگ، سفید داڑھی اعتدال کے خوب صورت سانچے میں ڈھلی ہوئی، دائیں بائیں جانب سے کچھ چھوٹی اور نیچے سے قدرے بڑی، جسے فرنچ کٹ کہا جا سکتا ہے، نظر کی عینک کے سفید شیشوں کے پیچھے موٹی موٹی چمک دار آنکھیں ان کی ذہانت کی غماز، سر پر قراقلی ٹوپی، سفید لٹھے کی شلوار اور سفید قمیص زیب تن، وجاہت و وقار کا دلکش مجسمہ!

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے انھوں نے کچھ اونچی مگر مودبانہ آواز میں ''السلام علیکم'' کہا۔ مولانا جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے جلدی سے اپنی نشست سے اٹھے اور آگے بڑھ کر نہایت احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

یہ تھے خواجہ عبدالوحید...... ! عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے معروف عالم...... کئی کتابوں کے مصنف...... لاہور کے قدیم باشندے جنھوں نے اس شہر کی اصلی تہذیب اور پرانی ثقافت کی گود میں پرورش پائی، اور جن کا ذہن متنوع موضوعات کی بہت سی معلومات کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ قرآنیات کے علم ومطالعہ میں بالخصوص درک وانہماک رکھنے والے۔

مجھے پہلی دفعہ ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے زیادہ تر قرآن مجید اور اس کے انگریزی اور اردو تراجم سے متعلق گفتگو کی۔ مولانا کا بھی یہ پسندیدہ موضوع تھا، اس لیے دونوں نے اس کے متعدد پہلوؤں کو زیر بحث ٹھہرایا۔ شاہ عبدالقادر دہلوی کا پہلا اردو ترجمہ قرآن ہے، اس کے محاسن کا تذکرہ

Marfat.com

ہوا۔ اس کے بعد شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ہے، اس میں جونکھار ہے، اس کے متعلق بات چیت ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے کی یہ خصوصیت معرض بیان میں آئی کہ وہ قلعہ معلّٰی کی زبان کی عکاسی کرتا اور بہت سے مقامات میں دلی کے محاوروں کو اجاگر کرتا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی کا اپنا اسلوب کلام ہے، اس کا بھی تذکرہ ہوا۔ پھر نواب وحید الزمان، مولوی فتح محمد جالندھری، شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی اور بعض دیگر تراجم قرآن کی خصوصیات زیر بحث آئیں۔

اردو تفاسیر میں مولانا سید امیر علی ملیح آبادی کی مواہب الرحمن، مولانا عبدالحق حقانی کی تفسیر حقانی، مولانا اشرف علی تھانوی کی بیان القرآن، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تفسیر ثنائی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوا۔ ان سب تفسیروں کا الگ الگ اسلوب اور ہر مفسر کا ایک خاص طرز تحریر ہے۔

ان دونوں اہل علم کی یہ گفتگو بڑی دلچسپ اور معلومات افزا تھی۔ افسوس ہے اسے قلم بند نہیں کیا جا سکا۔ اگر یہ ضبط تحریر میں آجاتی تو میرے جیسے بہت سے لوگوں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوتی۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس موضوع پر کبھی کچھ لکھنے کی نوبت آئے گی ورنہ حافظے ہی میں چند چیزیں اٹکالی جاتیں۔

تین چار روز کے بعد خواجہ صاحب پھر تشریف لائے۔ اب مولوی ظفر اقبال ان کے ساتھ تھے۔ انھیں بھی قرآن اور علوم قرآن سے قلبی لگاؤ تھا۔ مخارج حروف، صحت الفاظ، قراءت وتجوید، قرآن کے رموز واوقاف اور اس کا رسم الخط ان کا خاص موضوع تھا۔

یہ نشست بھی خاصی لمبی رہی اور موضوع زیادہ تر وہی قرآن اور اس کے تراجم وتفاسیر والا۔ یہ موضوع بہت لمبا چوڑا ہے اور اس کے متعدد گوشے ہیں اور ہر گوشہ اپنے اندر بہت سی معلومات سمیٹے ہوئے ہے۔

اس دفعہ ان دونوں بزرگوں نے الگ الگ مولانا کو قرآن مجید پیش کیے۔ مولوی ظفر اقبال نے کسی خاص ترجمے والا بہت پرانا چھپا ہوا، بڑی تقطیع کا قرآن مجید عنایت کیا۔ خواجہ صاحب نے کسی باہر کے ملک کا مطبوعہ قرآن دیا، جس کا نہایت عمدہ کاغذ تھا، سنہری جلد تھی اور بہترین طباعت......!

یہ دوسرا موقع تھا کہ میں نے خواجہ عبدالوحید کو دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔

یہ ۱۹۵۸ء کی بات تھی۔ اب سولہ سال کی طویل مسافت طے کر کے ۱۹۷۴ء میں آجائیے۔ اس وقت مولانا محمد داؤد غزنوی کی وفات پر گیارہ سال گزر چکے تھے اور مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوئے نو سال ہو گئے تھے۔ ادارے کے اکیڈمک ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ تھے۔ ایک دن مولانا محمد حنیف ندوی اور ان سطور کا راقم شیخ صاحب کے کمرے میں بیٹھے آئندہ کام کا نقشہ ترتیب دے رہے تھے کہ دفتر کا ایک ملازم آیا

Marfat.com

اور بتایا کہ ایک صاحب کراچی سے آئے ہیں اور باہر کھڑے ہیں۔ وہ شیخ صاحب اور مولانا حنیف ندوی سے ملنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: اندر تشریف لے آئیں۔

میں نے ان کو دیکھا تو سولہ سال پہلے کا زمانہ آنکھوں کے سامنے گھوم گیا اور ذہن نے پیچھے کو زقند لگا کر فوراً پہچان لیا کہ یہ خواجہ عبدالوحید ہیں۔

گفتگو شروع ہوئی تو پتا چلا کہ وہ مولانا حنیف ندوی کے درس قرآن میں شامل ہوتے رہے ہیں اور اس سلسلے میں ان سے متاثر بھی ہیں۔ مولانا ندوی نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۸ء تک مبارک مسجد متصل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں خطبہ جمعہ اور درس قرآن کا سلسلہ جاری رکھا تھا، جس میں لاہور کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ شرکت کرتے رہے تھے۔

میں سولہ سال پہلے کی دو نشستوں میں بھی سامع رہا تھا، اب سولہ سال بعد اس نشست میں بھی اپنی وضع داری قائم رکھی اور سماعت سے آگے نہیں بڑھا۔ اہل علم کی مجلسوں میں عام طور پر میں سامع ہی رہتا ہوں۔ جو لطف سماعت میں ہے، وہ شریک کلام ہونے میں نہیں۔ سماعت میں کئی فائدے ہیں۔ بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اپنا بھرم قائم رہتا ہے، جب کہ شریک کلام ہونے سے بھرم کھل جاتا ہے۔ میرے نزدیک عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ سماعت سے گزارا ہو سکے تو اسی پر اکتفا کرو۔ بولنے سے جہاں تک ممکن ہو، پرہیز کرو۔ یہ حدیث ایسے مواقع پر بالخصوص ذہن میں رکھو کہ یا تو اچھی بات کرو یا خاموش رہو۔ اور ہم زیادہ تر خاموش ہی رہتے ہیں۔ اپنا بھرم بھی قائم رہا اور حدیث پر بھی عمل ہو گیا۔ اس طرح ہم پکے اہل حدیث رہے۔ فارسی کا بھی مشہور مقولہ ہے:

تا مردے سخن نگفتہ باشد، عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اس مجلس میں ان کتابوں کے بارے میں گفتگو ہوئی جو قرآن کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ خواجہ صاحب نے مولانا محمد حنیف ندوی سے فرمایا کہ وہ بھی اس موضوع پر کچھ تحریر فرمائیں۔ میرے خیال میں مولانا نے مطالعہ قرآن کے نام سے جن علمی مباحث کی اپنے انداز خاص میں وضاحت کی ہے اور قرآن کی جن اصناف علوم کو منقح فرمایا ہے، اس میں خواجہ صاحب کے مشورے اور رائے کا بھی دخل ہے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد لاہور چھاؤنی میں ایک دوست نے مجھے اپنے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کی دعوت دی۔ رات کے نو بجے کے قریب وہاں پہنچا۔ بے شمار لوگ مدعو تھے۔ بہت بڑا پنڈال تھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ آگ تاپنے کے لیے کوئلے کی انگیٹھیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ مشہور صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے آواز دی تو میں ان کے پاس جا بیٹھا۔ اتنے میں پنڈال کے دوسری طرف ایک شخص پر نظر پڑی، شبہ گزرا کہ وہ خواجہ عبدالوحید ہیں۔

Marfat.com

میاں محمد شفیع سے کہا: وہ دیکھیے خواجہ عبدالوحید بھی اس دعوت میں شریک ہیں۔ ادھر انگیٹھی نہیں ہے، میں ان کو یہاں لے کر آتا ہوں۔

میاں صاحب نے کہا: مشفق خواجہ کے والد؟

جواب دیا: ہاں! وہی۔

کہا: وہ تو سنا ہے بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ان کو یہاں لے آؤ، یہاں وہ آگ بھی تاپ لیں گے اور ہمیں کچھ علم کی باتیں بھی سنا دیں گے۔

میں وہاں پہنچا اور انھیں سلام کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور صاحب ہیں، مگر خواجہ صاحب کے ہم قد اور کسی حد تک ہم شکل بھی......!

خواجہ صاحب کو اللہ نے بہت سی خصوصیات سے نوازا تھا۔ لیکن وہ کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کس خاندان سے ان کا تعلق تھا؟ کہاں تعلیم پائی؟ بچپن کیسے گزرا؟ عہد جوانی کس حال میں بیتا؟ تصنیف وتالیف سے کب رابطہ قائم ہوا؟ وادی صحافت سے کب آشنا ہوئے؟ علوم قرآن سے کیوں کر بہرہ ور ہوئے؟ کیا کیا علمی خدمات انجام دیں؟ کن کن لوگوں سے مراسم رہے؟ دور کہولت کس طرح بسر کیا؟ عمر عزیز کے آخری حصے میں کن حالات سے واسطہ پڑا؟

آئیے آئندہ سطور میں اختصار کے ساتھ ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

لاہور کے بھاٹی دروازے میں داخل ہو کر کچھ آگے چلیں تو تحصیل بازار آتا ہے، وہاں ایک محلّہ ''تھڑیاں بھابھڑیاں'' کے نام سے موسوم تھا۔ تقسیم ملک سے قبل اس محلے میں زیادہ تر ''جینی'' مذہب کے لوگ آباد تھے۔ اس محلے میں ایک مکان کو ''للّی لاج'' (LILY LODGE) کہا جاتا تھا۔ یہ مکان تین بھائیوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ یہ بھائی تھے خواجہ کریم بخش، خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش۔!

یہ تینوں بھائی کون بزرگ تھے؟

سنیے!

خواجہ کریم بخش ہمارے ممدوح خواجہ عبدالوحید کے والد محترم تھے۔ خواجہ رحیم بخش اور خواجہ امیر بخش ان کے حقیقی چچا تھے۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک پورے تیرہ سال اس مکان کو لاہور کے بہت بڑے تہذیبی اور علمی وادبی مرکز کی حیثیت حاصل رہی۔ یہ تینوں بھائی مال ودولت میں بھی اس زمانے کے حالات کے مطابق اپنا ایک مقام رکھتے تھے اور علم وادب کے بھی رسیا تھے۔ ان کو اور ان کے مکان کو اس زمانے کے ادبی ''مرکز ثقل'' سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ سر شیخ عبدالقادر، سر چوہدری شہاب الدین، علامہ اقبال، خلیفہ

Marfat.com

نظام الدین، مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی عبداللہ ٹونکی، مولوی محمد حسن اور سید محمد شاہ وکیل کا شمار اس دور کے لاہور کی اہم علمی وادبی شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ یہ حضرات عام طور سے روزانہ شام کو یہاں آجاتے اور پھر دیر تک علم وادب کی یہ محفل جمتی۔ اس محفل کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال جب تک اپنا کلام اس محفل میں سنا نہ لیتے، کسی مجلس میں نہیں پڑھتے تھے۔ ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر بحث بھی اسی مکان اور اسی مجلس میں ہوتی تھی اور ان کے سامنے ہوتی تھی۔

وہ سادہ زمانہ تھا۔ کرسیاں اور صوفے گھروں میں بہت کم دکھائی دیتے تھے۔ نشست فرش پر ہوتی تھی۔ پہلے زمین پر بوریا بچھایا جاتا۔ پھر اس پر دری پھیلائی جاتی اور اس کے اوپر چاندنی۔ سب سے اوپر قالین بچھایا جاتا۔ ٹیک لگانے کے لیے دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے رکھ دیے جاتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں کوئلے سے بھر کر کمرے کے وسط میں لوہے کی بڑی انگیٹھی رکھ دی جاتی تھی، جس سے کمرہ گرم رہتا تھا۔

اس محفل میں شامل ہونے والے اکثر حضرات پاجامہ یا شلوار اور قدرے لمبا کوٹ پہن کر آتے تھے۔ بعض بزرگ فراک کوٹ زیب تن کرتے تھے۔ پتلون پہن کر کوئی نہیں آتا تھا، اس لیے کہ فرشی نشست میں پتلون پہننا تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

علامہ اقبال بھی اس مجلس میں عام طور سے شلوار اور کوٹ میں ملبوس ہوتے تھے۔ سر پر پگڑی باندھتے تھے جسے ''لنگی'' کہا جاتا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی رکھتے تھے۔

للّی لاج کی محفلوں میں علمی وادبی بحثوں کے علاوہ ملکی وملی مسائل بھی زیر بحث آتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی تھی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شرکائے محفل کے بعض بزرگوں کا شمار انجمن کے بانیوں میں ہوتا تھا۔

علامہ اقبال اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے اور اس محفل میں ضرور سناتے تھے۔ ان کی آواز میں بڑا سوز اور درد تھا، سامعین نہایت انہماک اور توجہ سے سنتے تھے اور ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اپنی مشہور نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ بھی علامہ نے للّی لاج کی ایک محفل میں سنائیں۔ سامعین میں خواجہ عبدالوحید بھی شامل تھے۔

خواجہ صاحب نے اس ادبی محفل کا جو ان کے گھر میں جمتی تھی، ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں، ایک دن شرکائے محفل میں سب سے پہلے علامہ اقبال آئے۔ اس وقت کمرہ محفل میں صرف وہی (یعنی خواجہ صاحب) بیٹھے تھے، اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی عمر اس وقت پندرہ سولہ سال کی ہوگی۔ علامہ نے بیٹھتے ہی ان سے پنجابی میں کہا: ''حقہ لاؤ۔'' انھوں نے ملازم سے حقہ تازہ کرایا اور علامہ کے سامنے رکھا۔ خواجہ

Marfat.com

صاحب فرماتے ہیں، میں نے پہلے بھی کئی دفعہ ان کے حکم پر ان کی خدمت میں حقہ پیش کیا تھا لیکن خاموشی کے ساتھ۔ کبھی کوئی بات نہیں کی۔ لیکن آج حقہ پیش کرتے ہوئے ان سے کہا:

''ڈاکٹر صاحب! آپ حقہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

یہ بات سن کر علامہ مسکرائے۔ پھر فرمایا:

''یار! شراب چھوڑ دی ہے تو اب حقہ بھی چھوڑ دوں؟''

دونوں کے درمیان یہ مکالمہ پنجابی میں ہوا۔ خواجہ صاحب کا فرمان ہے کہ یہ واقعہ ۱۹۱۸ء سے پہلے کا ہے، اس لیے کہ للّی لاج کی محفلیں ۱۹۱۸ء میں ختم ہوگئی تھیں۔

ایک اور دلچسپ واقعہ سنیے، جس کا تعلق خواجہ صاحب کے مکان للّی لاج سے نہیں بلکہ انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے سے ہے۔ خواجہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ اس جلسے میں اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں بھی موجود تھے اور سٹیج پر بیٹھے تھے۔ علامہ نے جلسے میں نظم پڑھی، جس کا ایک شعر تھا۔

کوئی آج مسلم خستہ جاں کو یہ جا کے میرا پیام دے
کہ وطن ہے دشمن آبرو تو اماں ہے ملک حجاز میں

یہ شعر سن کر حاضرین نے اخبار وطن کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں کی طرف دیکھا اور تالیاں بجانے لگے۔ حاضرین جلسہ کی اس شوخی طبع سے مولوی صاحب کا جو حال ہوا اس کا اندازہ خود قارئین کرام لگالیں۔ ان کے اخبار وطن کو ''دشمن آبرو'' سمجھنا دلچسپ لطیفہ تھا۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں، للّی لاج کی محفلوں میں بھی ایک مدت تک یہ لطیفہ چلتا رہا۔ مولوی صاحب کے سامنے بھی بعض اوقات ان کے دوست لطیفے کے طور پر یہ شعر پڑھ دیا کرتے تھے۔

مولانا ظفر علی خاں جس زمانے میں حیدر آباد (دکن) سے لاہور آئے، وہ ان کی جوانی کا زمانہ تھا اور وہ بڑے جوش وخروش میں تھے۔ اس مکان اور اس محفل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ مولانا ممدوح نے لاہور سے زمیندار اخبار جاری کرنے کا پہلی بار اعلان اسی مکان کی محفل علم وادب میں کیا تھا۔

ان محفلوں میں شریک ہونے اور ادبی مباحث میں حصہ لینے والے اکثر حضرات اس مکان کے قرب وجوار میں اقامت گزیں تھے، مثلاً چوہدری سر شہاب الدین کا مکان بازار جج عبداللطیف میں تھا جو بازار حکیماں کی مغربی سمت میں واقع ہے۔ مولوی احمد الدین لوہاری منڈی کی ایک گلی میں فروکش تھے۔ علامہ اقبال جو ان دنوں یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آئے تھے، ۱۹۰۸ء میں ان محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے، وہ انارکلی بازار کی ایک عمارت کے بالائی حصے میں سکونت پذیر تھے۔ مولوی انشاء اللہ خاں اپنی

Marfat.com

تعمیر کردہ عمارت ''وطن بلڈنگ'' میں سکونت پذیر تھے جو مزار شاہ محمد غوث کے سامنے ہے۔ ایک شخص بابو وہاب الدین تھے جو کسی سرکاری دفتر میں ملازم تھے اور بہت اچھا علمی ذوق رکھتے تھے۔

خواجہ عبدالوحید کے گھر کی ان محفلوں میں خود وہ اور گھر کے چھوٹے بڑے بچے بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ ان کے بزرگ بھی چاہتے تھے کہ خرد بھی ان کی باتیں سنیں اور اپنے فہم و عقل کے مطابق اکابر کی گفتگو سے مستفید ہوں۔

۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک ان کا گھر لاہور کا علمی، ادبی اور تہذیبی مرکز رہا۔ ۱۹۱۸ء میں یہ محفل اس لیے منتشر ہوگئی کہ خواجہ عبدالوحید کے والد خواجہ کریم بخش ملازمت سے ریٹائر ہو کر وسط ہند کی ایک ریاست ''دھار'' میں چلے گئے اور ان کے ایک چچا خواجہ رحیم بخش نے بسلسلہ ملازمت موجودہ مشرقی پنجاب کے ایک شہر کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔ دوسرے چچا خواجہ امیر بخش اس سے چار سال قبل ۱۹۱۴ء میں وفات پا گئے تھے۔

خواجہ عبدالوحید پر اللہ کا بہت بڑا احسان تھا کہ وہ ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علم و ادب کے ماحول میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا۔ ابتدا ہی سے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کی مجلسوں میں شرکت کے مواقع میسر آئے اور پھر تمام عمر پڑھنے لکھنے میں صرف کر دی۔ طبیعت کا جو خوب صورت سانچا آغاز عمر میں بن گیا تھا، زندگی کے ہر قدم پر اس میں جلا پیدا ہوتی گئی۔ اس سے جہاں خود ان کے ذہن و فکر میں تابانی کی لہریں ابھریں، وہاں دوسرے لوگوں نے بھی بہ قدر ظرف اس سے روشنی حاصل کی۔

خواجہ صاحب کے بھائی اور دوسرے اعزہ و اقارب بھی علم و کمال کی نعمت سے بہرہ مند تھے۔ مثلاً ان کے بڑے بھائی خواجہ عبدالمجید کی معلومات کا دائرہ اس درجے وسیع تھا اور زبان پر انھیں اس قدر عبور حاصل تھا کہ اردو لغت کے موضوع پر جامع اللغات کے نام سے ایک ضخیم و مستند کتاب تصنیف کی جو اہل علم میں مقبول و متداول ہوئی۔

ان کے ایک چچا زاد بھائی خواجہ فیروزالدین تھے جو خان بہادر خواجہ رحیم بخش کے فرزند گرامی تھے۔ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں بیرسٹری کی سند لی اور لاہور میں وکالت کا آغاز کیا۔ آزادی برصغیر سے قبل ان کا شمار لاہور کے مشہور قانون دانوں میں ہوتا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کے نفاذ کے نتیجے میں انگریزی حکومت نے پنجاب میں مارشل لا لگایا تو اس کی مخالفت میں لاہور میں جن سرکردہ سیاسی لوگوں کو سب سے پہلے گرفتار کیا گیا، ان میں خواجہ فیروزالدین بھی شامل تھے۔ اس طرح اس خاندان کے لوگوں نے سیاست کی وادی پرخار میں بھی قدم جمائے۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید کے خواجہ عبدالوحید حقیقی چچا تھے لیکن خواجہ عبدالرشید کون تھے؟ یہاں

Marfat.com

چند لفظ ان کے بارے میں بھی سنتے جائیے۔

وہ بڑے صاحب مطالعہ اور فاضل آدمی تھے۔ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) برھان (دہلی) اور دیگر متعدد تحقیقی رسالوں میں ان کے مضامین ومقالات چھپتے رہے۔ ان کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جو نایاب علمی کتابوں پر مشتمل تھا۔ ان کی وفات کے بعد وہ کتب خانہ لاہور عجائب گھر کو دے دیا گیا تھا، جس سے اہل علم مستفید ہو رہے ہیں۔

طویل عرصے تک وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی گورننگ باڈی کے رکن رہے۔ وہ ڈاکٹر اور معالج بھی تھے۔ کئی سال میو ہسپتال (لاہور) میں چیف ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ یہاں میں ان کے صرف دو واقعے بیان کروں گا۔

ایک دفعہ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے اور مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ کسی دن میں ہسپتال میں ایک مرض کے علاج کے لیے حاضر ہوں گا۔

بولے: ہسپتال آنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود حاضر ہو گیا ہوں۔ بتائیے کیا تکلیف ہے۔

کہا: میں اس قسم کے تکلفات میں پڑنے کا عادی نہیں، جب جی چاہے اور جہاں جی چاہے مجھے کوئی پکڑ لے اور دوا دارو کے لیے پوچھے، میں فوراً بتا دیتا ہوں۔

میو ہسپتال کی ڈسپنسری کے انچارج ایک دن میرے پاس آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کرنل عبدالرشید نے کسی معاملے میں انھیں سخت ڈانٹ پلائی ہے، جب کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر صاحب سے کہوں کہ میں اس شخص کو جانتا ہوں، یہ اپنے کام کے سوا کسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔

دوسرے یا تیسرے دن اتفاقاً ڈاکٹر صاحب سے کہیں ملاقات ہوئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ فلاں آدمی آپ کے ماتحت کام کرتا ہے اور آپ کے دست شفقت کا محتاج ہے...... ڈاکٹر صاحب کو خیال گزرا کہ وہ مجھ سے ملا ہے۔

چار پانچ دن کے بعد وہ شخص پھر میرے پاس آیا، اس نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے بلایا اور بڑی نرمی سے پوچھا کہ آپ نے بھٹی صاحب سے کوئی بات کی ہے؟

جواب دیا: جی ہاں کی ہے۔

فرمایا: مطمئن رہیے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، میں اس لیے آپ لوگوں سے بظاہر سخت الفاظ میں کچھ کہتا ہوں کہ کام میں مستعد رہیں۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس خاندان کے لوگ اتنے اصحاب علم اور اس قسم کی عادات واطوار

Marfat.com

کے حامل ہیں۔

خواجہ عبدالوحید ۳۔ جنوری ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے اور عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو حصول علم میں مشغول ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں اسلامیہ ہائی سکول شیراں والا دروازہ (لاہور) سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد کالج میں داخلے کا مرحلہ پیش آیا۔ ان کے بڑے بھائیوں نے گورنمنٹ کالج (لاہور) میں تعلیم پائی تھی۔ یہ بھی اسی کالج میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن اس میں مشکل یہ آپڑی تھی کہ انھوں نے میٹرک میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کی تھی، جب کہ گورنمنٹ کالج میں فرسٹ ڈویژن والوں کو داخلے کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ کالج کا پرنسپل انگریز تھا جس کا نام کرنل اسٹیفنسن تھا۔ علامہ اقبال سے اس کے اچھے تعلقات تھے اور خواجہ صاحب کو اس کا علم تھا۔ انھیں خیال آیا کہ علامہ سفارش کر دیں تو داخلہ مل جائے گا۔ چناں چہ انھوں نے علامہ کی خدمت میں اپنا مسئلہ پیش کیا اور انھوں نے اسی وقت پرنسپل کے نام سفارشی خط لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ داخلے کے لیے انٹرویو کا وقت آیا تو انھوں نے پرنسپل کو علامہ کا خط پیش کر دیا اور کچھ کہے اور پوچھے بغیر فوراً داخلہ مل گیا۔

کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر ۱۹۲۴ء میں اے۔ جی آفس میں ملازمت اختیار کر لی، لیکن علم و ادب سے ان کا تعلق بہ دستور سابق قائم رہا، بلکہ اس موضوع کے لوگوں سے ان کے مراسم روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ علامہ مرحوم اپنے ذاتی مکان میو روڈ پر چلے گئے تھے، خواجہ صاحب نے بھی اس سے کچھ فاصلے پر محلّہ محمد نگر میں مکان بنا لیا تھا۔ اس طرح دفتر آتے جاتے ان کو سلام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مولانا احمد علی صاحب لاہور تشریف لائے تو انھوں نے شیراں والا دروازے کے قریب ایک مسجد میں قرآن مجید کا درس دینا شروع کیا۔ ان کے درس میں کالجوں کے طالب علم بھی شریک ہوتے تھے، خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت کرنے لگے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب کے جن نوجوانوں سے گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم اور ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

۱۹۲۸ء میں خواجہ صاحب نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر ''اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں سے روشناس کرانا اور اسلامی تاریخ کے خدوخال کو نمایاں طور سے ان کے سامنے پیش کرنا تھا۔ پڑھے لکھے حلقوں میں اس کے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

۱۹۲۸ء کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ انڈین اورینٹل کانفرس کا پانچواں سالانہ جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ ۲۰۔ نومبر کو اس کے شعبہ عربی و فارسی کا اجلاس بصدارت علامہ اقبال ہونا قرار پایا تھا۔ خواجہ صاحب نے

Marfat.com

اس اجلاس میں دی سائنٹیفک سپرٹ ان دی قرآن (The Scientific Spirit in the Quran) کے عنوان سے انگریزی میں مقالہ پڑھا۔ بہت بڑا مجمع تھا اور اتنے بڑے مجمعے میں خواجہ صاحب کو پہلی دفعہ کچھ پڑھنے اور بولنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ مقالہ بہت پسند کیا گیا۔

سید سلیمان ندوی نے خواجہ صاحب سے اس مقالے کا اردو ترجمہ کرایا جو معارف (اعظم گڑھ) کے جنوری، فروری ۱۹۳۰ء کے دو شماروں میں شائع ہوا۔

اب پنجاب یونیورسٹی کے بعض مشہور اساتذہ سے خواجہ صاحب کے مراسم پیدا ہو گئے تھے، جن میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال، حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر سید طلحہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان حضرات کی رفاقت وصحبت سے ان کے ذہن وفکر کو بہت جلا ملی۔

۱۹۳۱ء میں ''ادارہ معارف اسلامیہ'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس ادارے کی مجلس عاملہ کے صدر سر شیخ عبدالقادر اور سیکرٹری پروفیسر محمد اقبال تھے۔ ارکان مجلس عاملہ میں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی، ملک عبدالقیوم اور خواجہ عبدالوحید شامل تھے۔ علامہ اقبال کا اس ادارے سے خاص تعلق تھا۔ سر شیخ عبدالقادر کی تجویز سے اس کا جائنٹ سیکرٹری خواجہ عبدالوحید صاحب کو بنایا گیا تھا۔

۱۹۳۲ء میں خواجہ صاحب اور ان کے بعض احباب کی تگ وتاز سے یوم اقبال منایا گیا، جس میں علامہ کی شعری اور ادبی وقومی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان کارناموں پر انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ یہ تقریب اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۶۔ستمبر ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوئی تھی۔ جلسے کی دو نشستیں ہوئیں جن میں علامہ کے فکر وفن سے متعلق مقالے پڑھے گئے۔ شام کو اس دور کے لاہور کے ایک مشہور ہوٹل میں جس کا نام ''اورینگ ہوٹل'' تھا، استقبالیہ دیا گیا۔ ان اجلاسوں میں خود علامہ بھی موجود تھے۔ اقبال شناسی کے سلسلے کا یہ اولین جلسہ تھا جو خواجہ عبدالوحید اور ان کے دوستوں کی کوشش سے ۶۔ستمبر ۱۹۳۲ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔

اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ خواجہ صاحب کی کوشش سے معرض قیام میں آیا تھا۔ مختلف اوقات میں اس انسٹی ٹیوٹ نے اسلامی دنیا کے متعدد مشاہیر اہل علم کا استقبال کیا، جن میں ترکی کی خالدہ ادیب اور رؤف پاشا شامل ہیں۔ پروفیسر جرمانوس بھی انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر تشریف لائے۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام میں یوم اقبال کے علاوہ یوم شبلی اور یوم غالب بھی منائے گئے۔ اس موقعے پر مولانا حسرت موہانی سے متعلق ڈاکٹر موہن سنگھ نے مقالہ پڑھا تھا۔

یہ سب معاملات خواجہ صاحب کی سعی وہمت سے سرانجام پائے تھے۔

خواجہ صاحب اپنے مکان پر بھی کسی بڑی شخصیت کی ہفتے یا مہینے کے بعد تقریر کرایا کرتے تھے۔ اس کا

Marfat.com

تذکرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ وہ پہلی مرتبہ مئی ۱۹۲۹ء میں لاہور گئے۔ اس زمانے میں ان کے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے۔ یوں تو لاہور کے ممتاز اہل علم واہل ذوق سے سید طلحہ کے تعلقات تھے اور اس وقت کی اہم شخصیتوں سے انھوں نے ان کو ملایا تھا، لیکن غزنوی خاندان سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اس خاندان کے بزرگوں سے ان کے خصوصی روابط و مراسم تھے۔ انہی دنوں سید طلحہ صاحب کی وساطت سے پہلی مرتبہ ان کو مولانا داؤد غزنوی سے ملاقات کا موقع ملا۔

ان کی وجاہت، ان کا پرنور اور دمکتا ہوا چہرہ، افغانی عربی حسن و وجاہت کا دل آویز امتزاج، ان کی پرکشش شخصیت اسی وقت سے ذہن میں مرتسم ہے۔ اس زمانے میں خواجہ عبدالوحید صاحب کے مکان پر ہر ہفتے یا مہینے میں ایک دوبار کسی ممتاز عالم یا کسی نامور شخصیت کی دینی تقریر ہوتی تھی۔ مختصر لیکن منتخب مجمع ہوتا تھا۔ جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ حضرات ہوتے تھے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں کہ وہ جس مجلس میں شریک ہوئے، اس میں مولانا داؤد غزنویؒ کی تقریر تھی۔ مولانا نے سورۂ بقرہ کی ان آیات پر تقریر کی:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ٥ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ٥﴾

(البقرہ: ۸۴-۸۵)

”اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول لیا اپنے خون نہ کرو اور اپنے لوگوں کو جلا وطن نہ کرو اور تم نے یہ قول منظور کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو، پھر تم وہی ہونا جو اپنوں کا خون کرتے ہو اور ناحق زبردستی بعض لوگوں کی مدد لے کر اپنے لوگوں میں سے ایک فرقہ کا دیس نکالا کرتے ہو (یعنی ایک فرقہ کو زبردستی اپنا مددگار بنا کر اپنی ذات والوں کو شہر بدر کرتے ہو)۔ پھر جن لوگوں کا دیس نکالا کرتے ہو، اگر وہ قید ہو کر تمھارے پاس آئیں تو تم چھڑائی (فدیہ) بھر کر ان کو چھڑا لیتے ہو، حالاں کہ ان کا نکالنا بھی تم پر حرام تھا کیا (اللہ) کی کتاب میں سے کچھ مانتے ہو کچھ نہیں مانتے، پھر جو لوگ تم میں ایسا کریں ان کا بدلہ اور کیا ہے یہی کہ دنیا میں رسوا ہوں اور قیامت کے دن سخت عذاب میں لوٹ پڑیں اور اللہ تمھارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔“

Marfat.com

ان آیات کی تفسیر کر کے انھوں نے اسے ہندوستان کے مسلمانوں پر منطبق کیا اور بتایا کہ کس طرح ان کا ایک گروہ انگریزوں کے جھنڈے کے نیچے اپنے دینی بھائیوں سے بغداد اور قط العمارہ اور ترکیہ کے میدانوں میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ یہاں ترکوں کے لیے چندہ جمع کرتا تھا اور خلافت اسلامیہ کی بقاء وتحفظ کے لیے کوشاں تھا۔ ان کی پراز اعتماد خطابت، متانت اور تقریر کی شستگی کا نقش دل پر اب تک قائم ہے۔

مولانا کی یہ پہلی تقریر سید ابوالحسن علی ندوی نے خواجہ عبدالوحید کے مکان پر مئی ۱۹۲۹ء میں سنی تھی۔ اس وقت خواجہ صاحب انتیس برس کے جوان رعنا تھے اور مولانا محمد داؤد غزنوی کی عمر پینتیس برس کی تھی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے باوجود خواجہ صاحب انگریزی حکومت کے کس قدر مخالف تھے اور اس زمانے میں برملا اپنے مکان پر انگریز کے مخالف مقرروں کو بلاتے اور خاص مجمعے میں ان سے تقریریں کراتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم ان سطور کے قارئین میں سے کسی صاحب کو مولانا داؤد غزنوی کی سیاسی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے یا نہیں۔ میں نے ان کی تقریریں سنی ہیں۔ وہ نہایت سخت الفاظ اور تیز لہجے میں انگریزی حکومت کی مخالفت کرتے تھے اور اس کے نتیجے میں دس سال کے لگ بھگ ملک کی مختلف جیلوں میں رہے تھے۔

خواجہ صاحب انگریزی اور اردو اخباروں میں سیاسی نوعیت کے مضامین بھی لکھتے تھے اور ان لوگوں سے ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے جو انگریزی حکومت کے شدید مخالف اور ناقد تھے۔

تاریخ کا پہیہ چلتا رہتا ہے اور حالات اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ کل کوئی اور بات تھی، آج کوئی اور ہے۔ پرسوں کوئی اور ہوگی۔ اس طرح زمانے کا رنگ بدلتا اور وقت کی عبا الٹتی پلٹتی رہتی ہے۔ کوئی دور تھا لاہور میں نیلا گنبد اور انارکلی کے چوک میں نگینہ بیکری کو ارباب علم وادب کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وقت کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر ونقاد وہاں آتے اور مختلف ادبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی وہاں آتے اور میر مجلس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ لاہور کے مشہور اخبار نویس بھی وہاں حاضری دیتے اور شریک محفل ہوتے تھے۔ تقسیم ملک کے کئی سال بعد تک نگینہ بیکری کو یہ اعزاز حاصل رہا۔ اس کا فرنیچر ٹوٹا پھوٹا تھا۔ چائے کے برتن بھی میلے کچیلے تھے لیکن اس کا کسی کو احساس نہ تھا۔ بہت سے ادبی وسیاسی مسائل وہاں زیر بحث آتے تھے۔

خواجہ صاحب کی معلومات بڑی وسیع تھیں اور مختلف موضوع کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ کہتے ہیں ان کا اصلی ساتھی ان کا سائیکل تھا، جس کے ہینڈل کے دائیں اور بائیں جانب کتابوں اور رسالوں کے دو بڑے بڑے تھیلے لٹکتے رہتے تھے۔ ایک تھیلا سائیکل کے کیریئر پر بندھا ہوتا تھا۔ اس طرح خواجہ صاحب کتابوں کے تین تھیلے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ خواجہ صاحب سائیکل چلانے کے دوران بعض دفعہ سو بھی جاتے تھے اور سائیکل کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر برابر آگے بڑھتا جاتا تھا، اسے معلوم تھا کہ ''صراط مستقیم'' کون سی ہے۔

Marfat.com

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کے سائیکل کا معاملہ عرب کے اونٹ کا سا تھا۔ عرب اونٹ پر سوار ہو کر آرام سے سو جاتا ہے اور اونٹ تمام خطرات سے بچتا ہوا نہایت احتیاط کے ساتھ سلسلہ سفر جاری رکھتا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔

خواجہ صاحب فی الواقع ''خواجہ'' تھے اور ''غیبی طاقتوں'' کی امداد انھیں حاصل تھی۔

خواجہ عبدالوحید کا تعلق لاہور کی کشمیری برادری سے تھا۔ وہ اسی شہر میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے، یہیں تعلیم کی منزلیں طے کیں، یہیں ملازم ہوئے اور اسی شہر کے لوگوں سے ان کا میل جول اور دوستانہ رہا۔ وہ سراپا خلوص اور پیکر نفاست تھے۔ گفتار اور کردار کے اعتبار سے انھیں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ وہ سب کے خیر اندیش تھے اور سب ان کے بہی خواہ۔

خواجہ صاحب کو اللہ نے یہ امتیاز بخشا تھا کہ انھوں نے صرف دنیوی اور انگریزی تعلیم کو کافی نہیں سمجھا، دینی اور مذہبی تعلیم کے حصول کو بھی ضروری قرار دیا۔ اس کے لیے یہاں کے معروف عالم مولانا احمد علی کے باب علم پر دستک دی اور ان سے علوم عربی اور علوم قرآن میں استفادہ کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کا بھی اس عہد میں چرچا تھا اور وہ مولانا احمد علی کے چچا تھے، خواجہ صاحب کو ان سے بھی مستفید ہونے کے مواقع میسر آئے۔ ممکن ہے دینیات میں ان کے علاوہ بھی کسی سے فیض حاصل کیا ہو۔

خواجہ صاحب نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سفر برابر جاری رکھا۔ ان کا پہلا مضمون ۱۹۱۸ء میں سر شیخ عبدالقادر کے مخزن میں شائع ہوا تھا جو اس زمانے کا مشہور علمی، ادبی اور تنقیدی ماہنامہ تھا۔

تحریر و نگارش کے اولیں دور میں خواجہ صاحب کا رجحان شعروشاعری اور افسانہ نگاری کی طرف تھا۔ چناں چہ لاہور کی تاج کمپنی کے اہتمام میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع بھی ہوا، جس کا نام تلاش سکون تھا۔ میرا خیال ہے، یہ مجموعہ ایک ہی مرتبہ شائع ہوا تھا، دوبارہ اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

وہ اردو میں بھی عبور رکھتے تھے اور انگریزی میں بھی۔ دونوں زبانوں میں ان کا قلم یکساں حرکت کناں رہتا تھا بلکہ انگریزی میں انھوں نے اردو کی نسبت زیادہ کام کیا۔ اب آیئے اختصار کے ساتھ ان کی خدمات گوناگوں سے متعارف ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ سب سے پہلے قرآن مجید کی طرف آیئے جو لسان جبریل کا آخری بول اور سینہ لاہوت کا آخری راز ہے۔

۱۔ علامہ عبداللہ یوسف علی دنیائے علم کے معروف عالم تھے۔ ان کے انگریزی ترجمہ قرآن اور تفسیر کو اللہ نے بڑی پذیرائی عطا کی۔ وہ لاہور کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف نے شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب نے خود مترجم کی خواہش سے اس پر نظر ثانی کی۔

Marfat.com

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو برصغیر کے حلقہ اہل علم میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ ان کی زبان کے بانکپن اور اسلوب تحریر کے تیکھے پن سے پڑھے لکھے لوگ خوب آگاہ ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ترجمہ وتفسیر اردو میں بھی کیا اور انگریزی میں بھی، جسے تاج کمپنی نے شائع کیا۔ انگریزی ترجمہ وتفسیر پر نظرثانی کے لیے خواجہ عبدالوحید کا انتخاب عمل میں آیا۔

۳۔ خود خواجہ صاحب نے اپنے استاد مکرم مولانا احمد علی صاحب کے کہنے پر انگریزی میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کا عزم کیا جو تکمیل کی منزل کو پہنچا۔

۴۔ تبویب القرآن کے نام سے انھوں نے موضوع وار آیات قرآنی کو مرتب کیا ہے۔ ہر آیت کا ترجمہ اردو میں بھی کیا گیا ہے اور انگریزی میں بھی۔

یہ بہت بڑی خدمت قرآن ہے جو انھوں نے نہایت حسن وخوبی سے سرانجام دی۔ ہم گنہگاروں کو یقین ہے کہ بارگاہ خداوندی سے انھیں ضرور اس کا اجر ملے گا۔

اب آیئے کتب سیرت کی طرف۔!

۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی کا انگریزی ترجمہ خواجہ صاحب نے سید صاحب مرحوم کے کہنے پر شروع کیا تھا۔ کام خاصا آگے بڑھ چکا تھا، لیکن مکمل نہ ہوسکا۔

۶۔ مولانا ظفر علی خاں ہماری علمی، سیاسی اور ادبی وصحافتی تاریخ کی مایہ ناز شخصیت تھے۔ کسی کتاب کا ترجمہ کرتے تو اصل کتاب اس کے مقابلے میں کم درجے کی معلوم ہوتی۔ مغربی مصنف ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی تصنیف کانفلیکٹ بٹوین ریلیجن اینڈ سائنس (Conflict Between Religion And Science) کا انھوں نے ''معرکہ مذہب وسائنس'' کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد حنیف ندوی نے لکھا تھا کہ اگر ڈریپر کی زندگی وفا کرتی اور وہ سن پاتے کہ ''معرکہ مذہب وسائنس'' ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے تو وہ انگریزی نسخہ تلف کرا دیتے اور اس کے اردو ایڈیشن پر فخر کرتے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے علامہ شبلی کی تصنیف الفاروق کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس پر نظرثانی کے لیے ان کی نگاہ انتخاب خواجہ عبدالوحید پر پڑی۔

یہ تھی اس دور کے مشاہیر اہل علم کے نزدیک خواجہ عبدالوحید کے علمی مقام کی اہمیت۔

اب خواجہ صاحب کی صحافت کے بارے میں چند باتیں ملاحظہ فرمایئے۔

۷۔ ۱۹۳۴ء میں انجمن خدام الدین (لاہور) نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار اسلام جاری کیا، جس کا پہلا

Marfat.com

شمارہ ۷۔ جون کو شائع ہوا۔ ہندوستان کی کسی دینی اور مذہبی جماعت کا شاید یہ اولیں اخبار تھا جو انگریزی زبان میں اس ملک کے مطلع صحافت پر نمودار ہوا تھا۔ انجمن خدام الدین کے بانی مولانا احمد علی صاحب تھے اور وہ خواجہ صاحب کے استاد تھے۔ انھوں نے خواجہ صاحب کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ اس اخبار سے علامہ اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اسے باقاعدگی سے پڑھتے اور خواجہ صاحب کو مناسب مشورے دیتے تھے۔ خواجہ صاحب اس کا اداریہ یا شذرات لکھتے تو چھپنے سے پہلے عام طور سے علامہ اقبال کو دکھا لیتے تھے، اس میں بعض دفعہ علامہ اصلاح وترمیم بھی کرتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ اداریے کا موضوع خود علامہ متعین فرماتے اور ان کے مشورے یا ہدایت کے مطابق خواجہ صاحب اداریہ لکھتے۔

اس زمانے میں چوہدری محمد حسین حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر تھے۔ یہ وہی چوہدری محمد حسین ہیں جو علامہ اقبال کے گہرے دوست تھے اور جنھوں نے ابتدا میں ان کی کتابیں چھپوانے کا اہتمام کیا تھا۔ علامہ کے ہاں ان کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خواجہ صاحب اخبار اسلام کے سلسلے میں کسی مشورے کے لیے جاتے تو اکثر اوقات چوہدری صاحب وہاں موجود ہوتے۔ وہ ان کی گفتگو میں تو حصہ نہ لیتے، نہ کوئی مشورہ دیتے، البتہ ان کی باتیں غور سے سنتے۔ علامہ بعض دفعہ ان کی موجودگی میں ایسا مشورہ بھی دیتے جو حکومت کی پالیسی کے خلاف ہوتا اور ہدایت کرتے کہ یہ باتیں ضرور لکھی جائیں۔ چوہدری صاحب اس وقت تو خاموش رہتے، لیکن اداریہ چھپ جانے کے بعد وہ اسے پڑھتے تو حکومت کے متعلقہ محکمے کی طرف سے خط آجاتا کہ ایڈیٹر اسلام پریس ایڈوائزر سے ملیں۔ چوہدری صاحب کو معلوم تھا کہ خواجہ صاحب سرکاری ملازم ہیں اور ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار پر کسی اور شخص کا نام چھپتا ہے۔ خواجہ صاحب ان کے دفتر جا کر ان سے ملتے تو چوہدری صاحب فرماتے:

''دیکھیے آپ نے اپنے اخبار میں فلاں بات حکومت کے خلاف لکھی ہے، آئندہ ایسا نہ ہو۔''

بقول خواجہ صاحب کے وہ جواب میں ''بہت اچھا'' کہہ کر واپس آجاتے۔

چوہدری صاحب کے اس طرزِ عمل سے خواجہ صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ جب وہ علامہ اقبال کی صحبت میں ہوتے ہیں تو اپنی سرکاری حیثیت کو بھول جاتے ہیں، اور جب پریس ایڈوائزر کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو انھیں یاد نہیں رہتا کہ علامہ اقبال کے ہاں انھوں نے کیا کہا اور کیا سنا تھا۔ چوہدری صاحب گویا اس طرح یہ ثابت کرتے تھے کہ وہ بیک وقت حکومت اور علامہ اقبال دونوں کے وفادار ہیں۔

خواجہ صاحب کے بقول اس قسم کی متضاد وفاداریوں کو نباہنا وہ خوب جانتے تھے۔

اخبار اسلام کا آخری شمارہ ۷۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو شائع ہوا، اس کے بعد یہ بند ہوگیا۔ آغاز اجرا سے لے

Marfat.com

کر آخر تک یہ اخبار پوری باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کی ترتیب اور ادارت کی تمام ذمے داری خواجہ صاحب کے سپرد تھی۔ انگریزی حکومت پر اس میں شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی اور خواجہ صاحب سرکاری ملازم تھے، اس لیے بحیثیت ایڈیٹر اس پر خواجہ محمد رشید وائیں کا نام لکھا جاتا تھا۔ وائیں صاحب لاہور کی آسٹریلیا فیملی کے سربراہ تھے اور دینی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

اخبار اسلام کے بند ہونے کا قصہ خواجہ صاحب یوں بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اخبار کے صفحہ اول پر ''مشرقی ممالک میں مغربی حکومتوں کے مظالم'' کے عنوان سے مضمون لکھا، جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے اقتباسات دیے گئے تھے، اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ جن کتابوں کے اقتباسات دیے گئے تھے، وہ دکانوں پر فروخت ہو رہی تھیں اور لائبریریوں میں موجود تھیں۔ اس کے باوجود حکومت پنجاب نے اخبار سے پانچ سو روپے کی ضمانت طلب کر لی۔ انجمن خدام الدین نے اس حکم کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی جو چیف جسٹس نے رد کر دی۔ اس پر انجمن نے اخبار بند کر دیا، اس لیے کہ اگر ضمانت داخل کی جاتی تو اس کے ضبط ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس مقدمے کی پیروی انجمن کی طرف سے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے کی تھی۔

۸۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی کی انجمن اشاعت القرآن کی طرف سے پندرہ روزہ الاسلام کا اجرا ہوا۔ یہ بھی انگریزی اخبار تھا اور خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔ یہ اخبار ۱۹۶۳ء تک دس برس جاری رہا۔

۹۔ انگریزی کا پندرہ روزہ یقین کراچی سے شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ خواجہ صاحب اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۰۔ روزنامہ پاکستان ٹائمز (لاہور) میں طویل عرصے تک خواجہ صاحب کے مضامین و مقالات چھپتے رہے۔

۱۱۔ آزادیٔ وطن سے قبل سول اینڈ ملٹری گزٹ (لاہور) انگریزی کا مشہور روزنامہ تھا۔ خواجہ صاحب اس کے مضمون نگاروں میں شامل تھے۔

۱۲۔ انگریزی اخباروں میں روزنامہ ڈان کی بڑی شہرت تھی اور شہرت ہے۔ آزادیٔ وطن سے پہلے یہ اخبار دہلی سے شائع ہوتا تھا، آزادی کے بعد کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے ارباب انتظام خواجہ صاحب کی نگارشات کے خاص طور سے منتظر رہتے تھے۔

۱۳۔ کسی زمانے میں زمیندار اور احسان لاہور کے معروف و ممتاز اخبار تھے۔ خواجہ صاحب کے افکار عرصے تک ان میں چھپتے رہے۔

۱۴۔ برصغیر کے تحقیقی رسائل و جرائد میں ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) کو ہر دور میں اہمیت حاصل رہی ہے۔

Marfat.com

اس کے صفحات بھی خواجہ صاحب کی تحریرات سے مزین ہوئے۔

علاوہ ازیں انھوں نے ڈاکٹر غلام جیلانی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ درست کیا۔

ڈاکٹر عبدالغنی نے (جو ریٹائرمنٹ کے بعد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے وابستہ ہوگئے تھے) عبدالقادر بیدل پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تھا، وہ بھی خواجہ صاحب نے درست کیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالغنی مرحوم نہایت شریف النفس اہل علم تھے، میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر سانڈے میں سکونت پذیر تھے۔ بعض دفعہ اپنے مطلب کی کتابیں وہ مجھ سے مستعار لیتے تو واپس کرتے وقت اس انداز سے شکریہ ادا کرتے کہ مجھے شرم آنے لگتی۔

خواجہ صاحب کو ایک زمانے میں موسیقی کا شوق بھی رہا۔ اس دور میں تھوڑا بہت ہارمونیم بھی بجانے لگے تھے۔

خواجہ صاحب باہمت عالم اور مستعد صاحب قلم تھے۔ علمی کاموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے ملازمت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وہ اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ۱۹۲۴ء میں ملازم ہوئے تھے، ۱۹۴۷ء تک (تیئس برس) ملازمت کی۔

خواجہ صاحب کو علامہ اقبال سے بے حد تعلق تھا۔ وہ ان کے بہت سے واقعات بیان کرتے اور نہایت احترام سے ان کا تذکرہ فرماتے۔ ایک وقت تھا کہ لاہور کے اخباروں میں روزنامہ احسان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ اخبار ہمیشہ علامہ کی توجہات کا مرکز رہا۔ علامہ نے اپنا وہ بیان اسی اخبار میں شائع کرایا تھا، جس کا تعلق حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے تھا۔ مولانا مدنی نے دہلی کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں''۔ اس پر مسلم لیگی اخباروں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا تھا، جس طریق سے اس کو اچھالا گیا، اس سے متاثر ہو کر علامہ نے بھی ایک مختصر مگر بہت زوردار نظم ارقام فرمائی، جس کا اخبارات میں بہت چرچا ہوا۔ اس پر مسلم لیگیوں اور مولانا مدنی کے طرف داروں میں زبردست مباحثہ ہوا۔ مولانا مدنی نے بھی اس سلسلے میں ایک بیان جاری فرمایا۔ آخر کار علامہ کا ایک بیان روزنامہ احسان میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ چوں کہ مولانا نے واضح طور پر فرمادیا ہے کہ انھوں نے ''اوطان'' والا جملہ خبر کے طور پر کہا تھا، نہ کہ اپنی رائے کے طور پر۔ اس کے بعد میرے اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہا۔ آخر میں علامہ نے مولانا کے شاگردوں سے فرمایا کہ ''مولانا سے عقیدت میں، میں ان سے پیچھے نہیں ہوں۔''

خواجہ صاحب اس سے آگے تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس صورت حال کے باوجود آج تک اس قصے کو اچھالا جارہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ارمغان حجاز حضرت علامہ کی زندگی میں شائع ہوتی تو یہ نظم اس میں شامل نہ کی جاتی۔''

Marfat.com

علامہ اقبال پر بہت لوگوں نے لکھا ہے اور بہت لوگ لکھیں گے۔ مگر جس انداز اور جس محبت کے ساتھ خواجہ صاحب نے اقبال کی زندگی کے شب و روز کو پیش کیا ہے، اور کسی نے نہیں کیا۔ مجھے یہ دعویٰ نہیں کہ اقبال کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ ان پر جو مقالات و مضامین لکھے گئے ہیں یا جو کتابیں چھپی ہیں یا چھاپی جا رہی ہیں، ان میں سے بعض نہایت عجیب و غریب ہیں۔ بعض لوگوں کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اقبال کی کتابوں میں ان کو دو چار حیوانوں کے نام نظر آئے تو اقبال اور حیوانات قسم کی کتاب لکھ دی یا مضمون تحریر فرما دیا۔ ''شاہین'' کا لفظ کہیں دکھائی دیا تو اقبال اور شاہین کے عنوان کے چند شعر اکٹھے کیے اور ادھر ادھر کی باتیں لکھ کر کتاب تصنیف کر ڈالی۔ کسی شعر میں عورت کا لفظ آ گیا تو اقبال اور عورت کے عنوان سے مضمون لکھ مارا۔ کسی نے ان کی کسی کتاب پر تبصرہ شروع کر دیا۔ کسی نے ان کے مخالفوں اور موافقوں کے نام لے کر گھر پورا کرنے کی کوشش کی اور اقبال شناس بن گئے۔

مارشل لا کے زمانے میں کچھ مذہبی قسم کے لوگوں کو اقبال کے جمہوریت کے خلاف چند اشعار دست یاب ہوئے تو وہ دکان کھول بیٹھے اور ''دو صد خر'' قسم کے شعروں کی خوب رٹ لگائی اور لگائی جا رہی ہے۔

کسی کی نظر جمہوریت کی تائید والے شعروں پر پڑی تو وہ

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

کا ورد فرمانے لگے۔

کسی نے مزدور و آجر کے سلسلے کے اشعار ڈھونڈ ڈھونڈ کر مضامین کی گاڑی چلانا شروع کر دی۔

ان حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر موضوع کے بیان کا خاص پس منظر ہوتا ہے اور کچھ حالات ہوتے ہیں جو شاعر کو اظہار جذبات پر مجبور کرتے ہیں، اور کچھ وقتی و ہنگامی داعیات و معاملات سامنے آ جاتے ہیں جو کسی مسئلے کو کسی قدر نمایاں اور کسی کو نرم الفاظ میں پیش کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان سب معاملات یا داعیات کو شاعر کی حتمی اور قطعی رائے نہیں قرار دیا جا سکتا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اقبال کے بارے میں جو باتیں مرحوم خواجہ عبدالوحید نے تحریر کی ہیں وہ منفرد اور دوسروں سے الگ نوعیت کی ہیں۔

دسمبر ۱۹۷۷ء کے نقوش کا اقبال نمبر اس وقت پیش نگاہ ہے، اس میں بہت سے لائق احترام حضرات کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ میرا یہ منصب نہیں کہ ان میں سے کسی مضمون کے بارے میں کچھ عرض کروں، اس لیے کہ میں ان معنوں میں اقبال شناس نہیں ہوں، جن معنوں میں ''شناس'' کا لفظ ہمارے ہاں بولا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ میرے نزدیک ان مضامین میں خواجہ عبدالوحید کا مضمون اقبال کے بارے

Marfat.com

میں ایسی بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، جن کا کم لوگوں کو علم ہے۔ اقبال کے حضور۔ کیا دیکھا، کیا سنا؟ خواجہ صاحب کا پر لطف اور معلومات سے بھرپور مضمون ہے۔

اقبال کی بول چال، لوگوں سے تعلقات، چھوٹے بڑوں سے مراسم، گھریلو زندگی، مجلسی زندگی، عوام سے روابط، وزیروں اور حکومت کے اہل کاروں سے بات چیت کا اسلوب، شرعی مسائل کے متعلق علما سے رجوع کی مثالیں، اپنا کلام سنانے اور پڑھنے کا انداز، پنجابی اور اردو سے محبت، ملکی اور مذہبی تہذیب وثقافت سے پیار، لباس، دینی معاملات سے لگاؤ، کھانے پینے میں بے تکلفی، انھیں کب تک ڈاکٹر کہا جاتا رہا اور کب علامہ کہنے کا رواج ہوا۔ یہ سب وہ باتیں ہیں جو خواجہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں، یعنی وہ ان کے عینی اور سمعی شاہد ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی شخص کے نہج حیات کی وضاحت کرتی ہیں۔ پڑھنے والا مضمون کے عنوان سے ہم رکاب ہو کر اپنے آپ کو اقبال کے حضور پاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ انھیں دیکھ بھی رہا ہے اور ان کی باتیں بھی سن رہا ہے۔ اس سے زیادہ اقبال کے عمل وقول کی ترجمانی کیا ہوگی؟

خواجہ صاحب کا تعلق طویل عرصے تک مولانا احمد علی صاحب کے حلقے سے رہا اور وہ نہایت احترام کے ساتھ مولانا کا نام لیتے ہیں۔ ان کے بعد اس حلقے کو اس قسم کا ہمہ اوصاف موصوف شخص نہیں ملا ہوگا، اور اب ہم قحط الرجال کے جس دور سے گزر رہے ہیں، اس کے پیش نظر تو آئندہ اس قابلیت کا آدمی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۱۹۴۸ء میں خواجہ صاحب لاہور سے کراچی چلے گئے تھے۔ ابتدا میں کراچی کا ماحول ان کے لیے اجنبی تھا، لیکن آہستہ آہستہ ان کے سامنے اللہ نے وہاں بھی ترقی کے دروازے کھول دیے اور وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ تدریس وتعلیم اور تصنیف وتالیف وغیرہ ہر محاذ پر انھوں نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے اور ہر میدان میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ ان کے مطالعے کی وسعت اور معلومات کی فراوانی ان کے آگے بڑھنے کا باعث بنی اور زبان کا نکھار اور تحریر کی پختگی ان کے ارتقا کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

میں نے اپنی دانست میں کسی حد تک خواجہ عبدالوحید کا تعارف کرانے کی سعی کی ہے اور ان کی خدمات بوقلموں کے چند گوشوں کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے لیکن بدقسمتی سے پرانی قدریں بدل گئی ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ ختم ہوگئی ہیں۔ موجودہ لوگ کچھ عرصہ قبل کے اہل علم کو یا تو سرے سے جانتے ہی نہیں یا تھوڑا بہت جانتے بھی ہیں تو ان کے متعلق معلومات سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ چنانچہ بہت سے قارئین اب بھی یہی کہتے ہوں گے کہ پتا نہیں چلا خواجہ عبدالوحید کون تھے۔

اس ضمن میں گزارش ہے کہ ہر انسان پر، اگرچہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو، دو دور آتے ہیں۔ ایک دور یہ کہ اس کا تعارف اس کے بڑوں کے حوالے سے کرایا جاتا ہے۔ یعنی اس کا باپ وہ تھا، دادا وہ

Marfat.com

تھا اور پردادا وہ تھا۔ پھر دوسرا دور آتا ہے، جس میں تعارف کے لیے چھوٹوں کا حوالہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے، یعنی یہ وہ شخصیت ہے، جس کا بیٹا فلاں ہے اور پوتا یا نواسہ فلاں شخص ہے۔ تو اس فارمولے کی روشنی میں نئی پود سے ہم خواجہ عبدالوحید کا تعارف اس طرح کرائیں گے وہ ہمارے ملک کے مشہور ادیب اور معروف صاحب قلم مشفق خواجہ کے والد محترم تھے۔

یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ کہتے ہیں جب اکبرالہ آبادی کے صاحب زادے عشرت حسین جنھیں وہ ''عشرتی'' کہا کرتے تھے، لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر آئے تو انھوں نے اس خوشی میں بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور کئی انگریز منصب داروں کو بھی بلایا۔ اکبر بھی بیٹے کی دعوت میں موجود تھے لیکن اکثر انگریز افسر انھیں نہیں جانتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان سے ان کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ یہ عشرت صاحب کے والد ہیں۔

اس پر اکبر نے ان سے کہا کہ اس حلقے میں اللہ میاں کا تعارف بھی اس طرح کرایا جاتا ہے کہ وہ حضرت مسیح کے والد ہیں۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ خواجہ صاحب مرحوم پر سب سے پہلے تفصیلی مضمون عبداللہ ملک نے لکھا تھا جو تقسیم ملک سے کچھ عرصہ بعد امروز میں چھپا تھا اور میں نے اسی زمانے میں وہ مضمون پڑھا تھا۔ اس کے بعض مندرجات اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ عبداللہ ملک کے بارے میں بھی سب سے پہلے خواجہ صاحب ہی نے لکھا تھا۔ یہ ۱۹۴۰ء کے پس وپیش کی بات ہے، جب ملک صاحب کی کتاب سرمایہ داری چھپی تھی۔ خواجہ صاحب نے ازراہ کرم سرمایہ داری کے سلسلے میں ملک صاحب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ حالاں کہ حقیقت میں وہ زمانہ ملک صاحب کی ''غریب داری'' کا ہوگا۔ سرمایہ داری، کاریں داری اور کوٹھیاں داری کا زمانہ تو ان کا اب ہے۔

خواجہ عبدالوحید صاحب کو روزانہ ڈائری لکھنے کی عادت تھی۔ ان کی ڈائری کے جو اوراق دست یاب ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کا حلقہ احباب اور دائرہ روابط بہت وسیع تھا، جس میں اس دور کی مختلف سیاسی جماعتوں کے بھی بڑے بڑے لوگ شامل تھے اور مذہبی طبقوں کے علمائے کرام بھی۔! مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان)، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خالدہ ادیب خانم، سروجنی نائیڈو، سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی وغیرہ حضرات سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ ان حضرات کے خطوط وہ کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے وضاحت طلب عبارتوں پر انھوں نے حواشی بھی لکھنا شروع کر دیے تھے لیکن افسوس ہے یہ معاملہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اگر یہ کام مکمل ہو جائے تو ۷۰/۸۰ سال پیشتر کے بہت سے علمی، ثقافتی اور سیاسی معاملات و مسائل شائقین کے سامنے آجائیں۔

Marfat.com

ان کے فرزندِ ارجمند مشفق خواجہ کو اللہ نے علم وادب کی دولت سے بھی نوازا ہے، تحریر ونگارش میں بھی ان کا منفرد مقام ہے اور شخصیات سے متعلق معلومات کی فراہمی بھی ان کا خاص موضوع ہے اور بات سے بات نکالنے اور معاملے کو ''سخن در سخن'' کی منزل بھی لے جانے میں بھی وہ مہارت رکھتے ہیں۔ پھر انتہائی خوشی کی بات یہ ہے وہ خامہ بجیب بھی ہیں اور ''خامہ بگوش'' بھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے نام کے دونوں جز حوصلہ افزا ہیں، مشفق بھی اور خواجہ بھی۔ ہمیں یقین ہے وہ اس موضوع کو مرکز التفات ٹھہرائیں گے اور اپنے گرامی قدر باپ کے شروع کیے ہوئے کام کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہوں گے۔ ان کی شفقت بھی جلوہ دکھائے گی اور خواجگی بھی۔ بس ضرورت خامے کو ''گوش'' سے اتار کر ہاتھ میں پکڑنے کی ہے۔

اب خواجہ عبدالوحید کی وصیت درج کی جاتی ہے جو انھوں نے وفات سے ایک سال پیشتر ۲۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو تحریر فرمائی اور اپنے بچوں، رشتے داروں اور شاگردوں کو ارسال کی تھی۔ یہ وصیت بھی ہے اور نصیحت بھی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

وصیت

آج میری زندگی کے اٹھتر سال پورے ہوگئے۔ میں اس موقعے پر اپنے بچوں سے کچھ باتیں نصیحت کی کہنا چاہتا ہوں۔ یہ میری طویل زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔

۱۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انسانی زندگی بہت مختصر ہے اور اس مختصر زندگی کا بھی ایک تہائی حصہ ہم سونے میں گزار دیتے ہیں۔ وقت اگر سوچ سمجھ کر خرچ کیا جائے تو انسان اپنی محدود زندگی میں بہت سے کام انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں دیانت داری کے ساتھ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ زندگی کا کوئی لمحہ بے کار اور فضول باتوں میں صرف نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت فضول اور بے کار کاموں میں صرف نہ کرے، وقت کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔

۲۔ انسان کی زندگی کی کامیابی اس پر منحصر نہیں کہ اس نے کتنی دولت کمائی یا کتنی جائیداد پیدا کی۔ بلکہ اصلی کامیابی اس میں ہے کہ اس کی زندگی سے کتنے لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی کہاں تک اطاعت کی۔

۳۔ زندگی میں اطمینان اور سکون، دولت کی فراوانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کی امیر ترین قوموں میں خودکشی زیادہ ہوتی ہے، بمقابلہ غریب اقوام کے جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے رحمت کی امیدوار رہتی ہیں۔ اس لیے کہ اطمینان حاصل ہوتا ہے اول تعلق باللہ استوار رکھنے سے، اور دوم گھر کی زندگی میں امن وامان قائم رکھنے سے۔ جن لوگوں کو تعلق باللہ کی استواری اور گھریلو زندگی کی

Marfat.com

خوش گواری حاصل نہ ہو وہ بے نصیب ہیں، اگرچہ ان کی ملکیت میں عالی شان محلات، بیش قیمت کاریں اور لاکھوں کروڑوں کے بینک بیلنس ہوں۔

۴۔ لہٰذا انسان کو اپنے بچوں کے لیے عیش و آرام کا سروسامان مہیا کرنے کے لیے جاوبے جا ہر طرح کے طریقے اختیار نہ کرنے چاہئیں بلکہ ان کو ''انسان'' بنانے کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے، تاکہ وہ خود غرض بن کر آنے والی نسلوں کے سامنے بری مثال پیش نہ کریں۔

۵۔ فہم و دانش حاصل کرنے کے لیے اچھے لوگوں کی سوسائٹی اختیار کرنی چاہیے۔ محض سینما، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ناچ، گانا، گٹر پریس کا مطالعہ انسان کو کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ نہ محض کتابیں پڑھنے سے عقل و شعور کی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ علم بڑھانے اور نیک عملی سیکھنے کے لیے اچھے صاحبان علم و عمل کی صحبت میں بیٹھنا چاہیے۔ اپنے جیسے لوگوں سے آدمی زیادہ کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ اپنے سے زیادہ جاننے والے اور زیادہ نیک عمل لوگوں ہی سے راہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

۶۔ اہل و عیال کے لیے سامان حیات مہیا کرنا انسان کا بہت بڑا فرض ہے، لیکن سامان تعیش کو سروسامان حیات نہ سمجھنا چاہیے۔

۷۔ ایک صاحب عقل انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ انسان پر اپنے گھر کے لوگوں کے علاوہ اور لوگوں کے بھی حقوق ہیں۔ ان ''اور'' لوگوں میں ماں باپ، بہن بھائی اور دوسرے حاجت مند لوگ بھی شامل ہیں۔ شریعت اسلامی میں ایک آدمی کا پیٹ بھر کر کھانا اس وقت جائز نہیں ہے جب کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔

۸۔ وہ لوگ دنیا کی نظر میں کبھی عزت نہیں پا سکتے جو ماں باپ اور بھائی بہنوں سے تعلقات استوار نہیں رکھتے۔

۹۔ جس طرح اپنے ماں باپ اور اہل خاندان سے حسن سلوک ضروری ہے، اسی طرح سسرال کی عزت اور ان سے حسن سلوک شرافت کا تقاضا ہے۔

۱۰۔ بچوں کا حق ماں باپ پر صرف یہی نہیں کہ انھیں اچھا کھلایا، پلایا، پہنایا جائے۔ بلکہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت زیادہ ضروری ہے۔ بچوں کو علم واسع و نافع دیا جانا چاہیے اور ساتھ ہی ایسی تربیت دینی چاہیے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔ وہ صرف یہ نہ سیکھیں کہ وہ دنیا سے کیا پا سکتے ہیں بلکہ انھیں یہ سوچنا چاہیے کہ وہ دنیا کو کیا دے سکتے ہیں۔

۱۱۔ زندگی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں سے تعلقات استوار رکھنے چاہئیں اور کم سے کم لوگوں سے بگاڑ پیدا کرنا چاہیے۔ اس اصول پر زندگی بسر کرنے سے بہت سا قیمتی وقت اچھے کاموں میں صرف کرنے کے لیے میسر

Marfat.com

آ سکتا ہے۔ بے کار لڑائی جھگڑوں میں وقت عزیز کا ضائع کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۲۔ انسانیت سیکھنے کے لیے دین کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ناگزیر ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، فلسفہ اور عشقیہ یا جاسوسی ناول پڑھنے سے ''انسانیت'' پیدا نہیں ہوتی۔

۱۳۔ بہت بولنا اچھا نہیں۔ اس لیے کہ زیادہ بولنے سے منہ سے بے کار اور فضول باتیں نکلتی ہیں۔ انسان کی گفتگو مدلل اور مختصر ہونی چاہیے تا کہ تھوڑے وقت میں بہت سی اچھی باتیں ہو سکیں۔

۱۴۔ مغربی تہذیب میں ''فیملی'' سے مراد صرف بیوی بچے ہیں۔ لیکن اسلام کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام میں ''فیملی'' میں ماں باپ، بہن بھائی سب شامل ہیں اور ان کے حقوق باحسن طریق واجب الادا ہیں۔

۱۵۔ ایک مردمومن کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ اگر رضائے الٰہی کے حصول اور خلق خدا کی بے غرضانہ خدمت کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے تمام خطرات سے محفوظ رکھے گا اور اسے کوئی بدبخت نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

۱۶۔ زندگی کا مادی سروسامان کتنا بھی جمع کر لیا جائے وہ سب یہیں رہ جائے گا اور قبر میں انسان خالی ہاتھ جائے گا۔ ہاں اس کے اعمال اس کا ساتھ دیں گے۔ اس لیے ہمیں اعمال نیک کی متاع گراں مایہ ضرور اپنی نجات کے لیے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میری دعا ہے کہ آپ سب اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندے بن جائیں اور وہ آپ کا ہمیشہ حامی و مددگار رہو۔ آمین

عبدالوحید خواجہ۔ کراچی
۲۔جنوری ۱۹۷۹ء
مطابق
۲۔صفر المظفر ۱۳۹۹ھ
بروز منگل

علم وادب کے اس پیکر خلوص نے بہت سا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد اپنی یادگار کے طور پر چھوڑا۔ قرآن مجید کو بالخصوص مرکز توجہ ٹھہرایا اور اس کے معانی ومطالب کی نہایت حسن وخوبی کے ساتھ وضاحت کی۔ یہ ان کا بہت بڑا ذخیرۂ آخرت ہے۔

لاہور کی سرزمین سے ابھرنے اور طویل عرصے تک علم وعمل کے میدان میں مصروف رہنے والا یہ مرد مجاہد ۲۸۔دسمبر ۱۹۷۹ء کو کراچی کے افق میں غروب ہو گیا۔ ہم عاجز بندے اس کے لیے اللہ کے حضور انہی الفاظ میں

Marfat.com

دعا مانگتے ہیں، جن الفاظ میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنے ایک برگزیدہ صحابی کی میت پر مانگی تھی۔

((اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ...... اللھم اکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ جنۃ الفردوس.))

خواجہ صاحب کے ماشاء اللہ دس بیٹے بیٹیاں ہیں اور سب کو اللہ نے علم کی دولت سے نوازا ہے۔ ان میں ایک بیٹے خواجہ عبدالقیوم ہیں جو دبئی رہتے ہیں۔

اپنے مرحوم والد خواجہ عبدالوحید کے متعلق ان کا ایک مضمون کراچی کے ماہنامہ اظہار کے اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے تاہم بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مضمون ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ اس کے مطالعے سے خواجہ صاحب کے متعدد واقعات خوانندگان محترم کے علم میں آئیں گے۔

''سنا تو یہ تھا کہ رات آرام کے لیے ہوتی ہے، لیکن میں جس گھر میں پیدا ہوا اور پرورش پائی وہاں گھر کے سربراہ کو ہمیشہ آدھی رات کو اپنے پروردگار کے آگے سربسجدہ دیکھا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ محترمہ سے ایک روز ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔ ''سارا محلّہ تو سو رہا ہوتا ہے اور ہمارے ابا رات کے دو اڑھائی بجے اٹھ جاتے ہیں؟

انھوں نے نہایت پیار اور شفقت سے بتایا کہ بیٹا یہی وقت اللہ کو یاد کرنے کا ہوتا ہے، اسی لیے تمھارے ابا اٹھ جاتے ہیں اور رات کا باقی حصہ تہجد پڑھنے میں گزار دیتے ہیں۔''

میں نے اپنی زندگی کے چوالیس برسوں میں کبھی کوئی ایسی رات نہیں دیکھی کہ جس رات والد محترم تہجد کے لیے نہ اٹھے ہوں۔ جوڑوں کے شدید درد کے باوجود بھی وہ رات کا آخری حصہ خدا کی حمد وثنا میں گزار دیتے تھے۔

ستمبر ۱۹۷۹ء کی ایک رات میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔ والد محترم خواجہ عبدالوحید کی شدید بیماری کی اطلاع مجھے دبئی میں ملی، میں مضطرب ہو کر اسی رات کو کراچی پہنچا۔ وہ سیونتھ ڈے ایڈونسٹ ہسپتال کے ایک کمرے میں بے ہوش پڑے تھے۔ بے ہوشی کے عالم میں بھی وہ زیرلب کچھ کہہ رہتے تھے۔ بہت کوشش کی لیکن نہ سنا جا سکا کہ کیا فرما رہے ہیں۔ آکسیجن ماسک ان کے منہ پر سے ہٹایا تو کمرے میں ان کی آواز گونجی ''یا اللہ میں نے تجھے ہر حال میں یاد کیا۔''

اٹھارہ گھنٹے تک مسلسل بے ہوش رہے اور اس بے ہوشی کی حالت میں ان کے منہ سے مسلسل یہی ایک فقرہ نکلتا رہا۔ ''یا اللہ میں نے تجھے ہر حال میں یاد کیا۔'' زبان سوکھ جاتی تو روئی بھگو کر ان کے منہ میں پانی کا ایک قطرہ ٹپکا دیا جاتا۔ اٹھارہ گھنٹے مسلسل بے ہوش رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آئے تو انھیں کچھ یاد نہ تھا کہ وہ بے ہوشی کی حالت میں کیا کہتے رہے ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ بے ہوشی کے عالم میں مسلسل

Marfat.com

''یا اللہ میں نے ہر حال میں تجھے یاد کیا'' کا ورد کرتے رہے ہیں تو وہ سن کر مسکرا دیے۔

دو ماہ تک مسلسل علاج کے بعد پھر ایک روز ڈاکٹروں نے کہا کہ ان کے دونوں گردے کام کرنا بند کر چکے ہیں۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے آپریشن نہیں کیا جا سکتا، اس لیے چھوٹی ہمشیرہ ڈاکٹر رفعت راٹھور سے مشورے کے بعد ہم لوگ والد صاحب کو گھر لے آئے۔ شدید بیماری کی وجہ سے وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ ان میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ بستر پر لیٹے لیٹے کروٹ خود بدل سکیں۔ عزیز واقربا، دوست واحباب ہر وقت ان کے پاس موجود ہوتے۔ جب بھی کوئی ان سے پوچھتا ''طبیعت کیسی ہے؟'' تو وہ سخت تکلیف کے باوجود یہی فرماتے: ''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے بہت بہتر ہوں۔'' ہسپتال سے گھر آنے کے بعد ان کی طبیعت خاصی سنبھل گئی۔ میں واپس دبئی آ گیا۔ ہفتے میں دو بار ان سے ٹیلیفون پر بات چیت ہوتی۔ ٹیلیفون پر ان کی آواز میں قطعاً کمزوری اور بیماری کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

۳۔ جنوری ۱۹۰۱ء والد محترم کی پیدائش کا دن ہے۔ ایک روز ٹیلی فون پر ان سے بات چیت کے دوران میں نے کہا کہ آپ کی سال گرہ کا دن قریب آ رہا ہے اور میں ۲۷ یا ۲۸ دسمبر کو کراچی پہنچ جاؤں گا۔ اس سال آپ کی سال گرہ کی تقریب بڑی دھوم دھام سے منائیں گے، کیوں کہ ۸۰ واں سال شروع ہو جائے گا۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولے۔ ''تم نے تو دبئی کو لاہور سمجھ رکھا ہے، جب جی چاہتا ہے چلے آتے ہو۔ پردیس کا معاملہ ہے، اتنی دور سے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' چوں کہ مجھے میرے بھائی مشفق خواجہ بتا چکے تھے کہ ۳۔ جنوری کی تقریب میں ہم سارے خاندان کے علاوہ والد محترم کے دوستوں اور ملنے والوں کو بھی مدعو کر رہے ہیں، اس لیے میں ۲۷ اور ۲۸۔ دسمبر کی درمیانی رات کو پونے تین بجے کی فلائٹ سے دبئی سے روانہ ہوا۔ صبح چھ بجے پاکستانی وقت کے مطابق کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ جب گھر پہنچا تو پتا چلا کہ والد محترم تو رات کے بارہ بج کر آٹھ منٹ پر اس فانی دنیا سے ناتا توڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔

خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم کی جن ہستیوں کے ساتھ زندگی میں خصوصی رفاقت رہی، ان میں علامہ اقبال، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا احمد علی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمہم اللہ جیسی ہستیاں شامل تھیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے ساتھ تیس سال رفاقت رہی۔ علامہ اقبال جب کبھی مسلمانوں کے خلاف کوئی خبر یا مضمون پڑھتے تو وہ ہمیشہ خواجہ صاحب کو اس بارے میں بتاتے اور پھر ان سے کہتے کہ وہ اخبار اسلام میں اس کا جواب دیں۔ خواجہ صاحب تفصیلی جواب لکھ کر علامہ اقبال کو بھیج دیتے اور علامہ مرحوم پڑھنے کے بعد اس پر اپنی رائے بھی دیتے اور بعض جگہوں پر نشان بھی لگا دیتے۔ نشان لگانے کا

Marfat.com

مطلب یہ ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب آئیں تاکہ ان سے تفصیلاً بات کی جائے۔ خواجہ صاحب کا کہنا تھا کہ جب میں علامہ اقبالؒ کے پاس جاتا تو وہ جوابی مضمون کے ایک ایک حصے پر بڑی تفصیل سے بات کرتے اور میں ہمیشہ بڑے غور سے ان کی گفتگو سنتا۔ پھر واپس آ کر جوابی مضمون میں مزید تبدیلی کر کے انھیں بھیج دیتا اور اسے چھاپنے کی منظوری دے دیتے۔

قادیانی مسئلے پر علامہ اقبالؒ نے جو ایک طویل مضمون لکھا تھا وہ انھوں نے خواجہ صاحب کو بھیجا۔ خواجہ صاحب نے مضمون کے ہر صفحے پر ایک تفصیلی نوٹ لکھا، جس کے جواب میں اس نوٹ کے نیچے علامہ نے پھر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ یہ سلسلہ بہت عرصے تک چلا۔ پھر علامہ مرحوم نے مضمون کو آخری شکل دی۔

کئی سال پہلے کا ذکر ہے، قادیانیوں کے خلاف تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ قادیانیوں نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں لکھنا شروع کیا کہ علامہ اقبالؒ نے کبھی قادیانیوں کے خلاف کوئی مضمون نہیں لکھا تھا اور یہ مضمون جو علامہ اقبالؒ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، سب فراڈ ہے۔ اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے اپنے اخبار الاسلام کے صفحہ اول پر علامہ اقبالؒ کے قلم سے اصل مسودے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی چھاپ دی۔ قادیانی خاموش ہو گئے، لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد مختلف لوگوں کے ذریعے اصل مسودہ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ خواجہ صاحب کے پاس جو شخص بھی اصل مسودہ دیکھنے آتا وہ اسے دکھا دیتے اور ساتھ ہی مضمون کی ایک فوٹو کاپی بھی دے دیتے۔ بعد میں جب قادیانیوں نے پوری طرح تسلی کر لی کہ اصل مسودہ انہی کے پاس ہے تو خواجہ صاحب سے سودا بازی کی کوشش کی گئی۔ انھیں ایک لاکھ روپے تک کی پیش کش کی گئی کہ وہ اصلی مسودہ قادیانیوں کو دے دیں۔ جب خواجہ صاحب نے انکار کیا تو ان سے کہا گیا کہ آپ جتنی رقم بھی مانگیں گے وہ آپ کو پہلے ادا کر دی جائے گی، بعد میں اصل مسودہ دے دیں تاکہ اسے ضائع کر دیا جائے اور یوں ہمیشہ کے لیے اس تاریخی دستاویز سے قادیانیوں کو نجات مل جائے۔ لیکن خواجہ صاحب نہیں مانے۔ انھوں نے قادیانیوں کی ہر پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اب یہ تاریخی دستاویز قوم کی امانت ہے اور میں اس میں خیانت نہیں کر سکتا۔

علامہ مرحوم نے سینکڑوں خطوط خواجہ صاحب کو لکھے جو انھوں نے نہایت حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں چند خطوط ایسے بھی تھے جن میں ذاتی باتیں تھیں۔ لیکن اکثریت ایسے خطوط کی تھی جن میں مسلمانوں اور اسلام کے موضوع پر بات کی گئی تھی۔ چند خطوط علامہ مرحوم کے میں نے ایسے بھی دیکھے ہیں جن میں نثر میں نہیں بلکہ شعروں میں گفتگو کی گئی تھی۔

خواجہ عبدالوحید صاحب ۳۔ جنوری ۱۹۰۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے

Marfat.com

طالب علم تھے، انہی دنوں ایک تقریب میں مولانا احمد علی لاہوری سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی باتوں اور شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہر روز مسجد شیراں والا میں پانچوں وقت نماز ادا کرنے جاتے، پھر بعد میں مذہبی تعلیم مولانا احمد علیؒ ہی سے حاصل کی اور آپ ہی کی وجہ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی مجلسوں اور علمی خزانوں سے فائدہ اٹھایا۔

۱۹۳۲ء میں مولانا احمد علی مرحوم نے انجمن خدام الدین کے زیر اہتمام ایک پندرہ روزہ انگریزی اخبار اسلام جاری کیا۔ اس کی ایڈیٹری کے فرائض خواجہ صاحب ہی کے سپرد کیے گئے۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس اخبار کے لیے خاص طور پر مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کا مشہور مضمون اسلام اور احمدیت اسی اخبار میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔

خواجہ صاحب نے پہلی سرکاری ملازمت اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں کی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ سرکاری ملازمت چھوڑ کر ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری (ڈنڈوت ضلع جہلم) کے مینجر کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ لیکن ڈنڈوت میں ان کے علمی و ادبی مشاغل ختم ہو کر رہ گئے تو انھوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور کراچی آ گئے۔ کراچی آ کر حکومت کے محکمہ اطلاعات سے وابستہ ہو گئے۔ کراچی میں سرکاری ملازمت کے دوران وہ انجمن حمایت اسلام، انجمن اشاعت القرآن، سندھ ہسٹاریکل سوسائٹی اور سینٹرل مساجد کمیٹی کے سیکرٹری رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصے تک انھوں نے اقبال اکیڈمی اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لیے بھی کام کیا۔ دس بارہ سال تک وہ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس گرلز کالج میں اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

۱۹۲۸ء میں خواجہ صاحب نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی تھی، جس کے سرپرست اعلیٰ علامہ اقبال تھے۔ خالدہ ادیب خانم، رؤف پاشا اور مفتی اعظم فلسطین پہلی بار انہی کی دعوت پر لاہور تشریف لائے تھے۔ پہلا یوم اقبال علامہ اقبال کی حیات ہی میں ۱۹۳۲ء میں اسی ادارے کے زیر اہتمام خواجہ صاحب نے منانے کا اہتمام کیا تھا۔

خواجہ عبدالوحید صاحب ایک عظیم مفکر، محقق، مورخ، صاحب فہم و بصیرت، جید عالم اور مرد حق تھے۔ انھوں نے زندگی بھر اسلامی نظریات کی ترویج و تبلیغ کی۔ انگریزی زبان میں ہزاروں مضامین لکھے جو صرف اپنے ہی ملک میں نہیں بلکہ دنیا کے مختلف ملکوں کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوئے۔

ان کا عظیم کارنامہ تبویب القرآن اور ببلوگرافی آف اسلامک اسٹڈیز ہے، جسے انھوں نے چالیس سال میں مکمل کیا۔ اور یہ کتاب ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے۔ قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ کیا جو اخبار اسلام اور الاسلام میں شائع ہو چکا ہے۔

غرض اس مرد مومن نے ساری زندگی دین اسلام کی خدمت کرتے ہوئے گزاری

خدا رحمت کندا ایں عاشقان پاک طینت را"

Marfat.com

خواجہ عبدالحی فاروقی

۱۹۵۰ء کی سردیوں کا کوئی مہینہ تھا اور جمعے کا دن......! جمعے کی نماز میں نے لاہور کی مسجد مبارک میں پڑھی اور میں زیادہ تر اسی مسجد میں جمعہ پڑھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جمعے کے بعد مسجد میں بہت سے دوستوں اور بزرگوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۹ء تک اس مسجد میں مولانا محمد حنیف ندوی خطبہ جمعہ دیتے رہے تھے، لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔

جمعے کے بعد دیکھا کہ صحن مسجد میں چند حضرات بیٹھے ہیں، جن میں سے مولانا عطاء اللہ حنیف، پروفیسر عبدالقیوم، مولانا محمد علی قصوری، میاں عبدالمجید، پروفیسر عبدالقیوم کے والد منشی فضل دین اور ملک نصر اللہ خاں عزیز کے نام مجھے یاد ہیں۔ میں بھی ان میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہ بزرگ ایک صاحب سے باتیں کر رہے تھے اور وہ صاحب انھیں دہلی اور ہندوستان کے بعض اہل علم کے متعلق کچھ بتا رہے تھے۔ ان کو اس سے پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سرخی مائل گندمی رنگ، کتابی چہرہ، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر نظر کا کچھ کالے سے رنگ کا چشمہ چڑھا ہوا، سر پر قراقلی ٹوپی، متوسط درجے کی داڑھی جس کے سفید بالوں میں سیاہ بال بھی دکھائی دیتے تھے، میانہ قد، شیروانی زیب تن جس کے تمام بٹن بند تھے۔ خالص دلی کے لہجے میں نستعلیق اردو میں بات کر رہے تھے۔ زبان کا لوچ اور طرز کلام نہایت موثر......!

مجلس ختم ہوئی تو مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے پوچھنے پر بتایا کہ یہ ہیں خواجہ عبدالحی فاروقی جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تفسیر قرآن مجید پڑھاتے رہے ہیں اور اب چند روز سے لاہور تشریف لے آئے ہیں۔

خواجہ عبدالحی کا نام تو بہت دفعہ سنا تھا اور ۱۹۳۴ء میں حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب نے ان کی دو کتابیں پیارے رسول اور خلفائے اربعہ ہمیں باقاعدہ درسیات میں پڑھائی بھی تھیں۔ لیکن ان کو دیکھنے اور ان کی چند باتیں سننے کا موقع آج پہلی دفعہ ملا تھا۔

خواجہ عبدالحی ۱۸۸۷ء (۱۳۰۵ھ) کو (موجودہ جغرافیائی حساب سے) مشرقی پنجاب کے ضلع گورداس پور کی تحصیل گڑھ شنکر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد گرامی کا نام خواجہ عبدالرحیم تھا اور وہ گورداس پور کے ایک وکیل خورشید عالم بیرسٹر کے منشی تھے۔ خواجہ صاحب نے حصول علم کا آغاز گورداس پور کے گورنمنٹ ہائی سکول

Marfat.com

سے کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد دیوبند کو روانہ ہوئے۔ وہاں جن اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ ۱۹۱۲ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔ اس وقت مولانا سندھی سے دیوبند کے علما و طلبا بہت متاثر تھے۔ خواجہ صاحب نے ان سے قرآن مجید اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف حجة الله البالغه کا درس لیا اور ان کے طریق تعلیم سے بے حد اثر پذیر ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کی تکمیل کے بعد انھیں اسلامیہ کالج میرٹھ میں عربی کا پروفیسر مقرر کر لیا گیا۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا سندھی کی کوشش سے دہلی کی مسجد فتح پوری میں ''نظارة المعارف القرآنیہ'' کا قیام عمل میں آیا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ خواجہ عبدالحی فاروقی بھی ان سے مستفید ہونے لگے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ ہفتے کی شام کو میرٹھ واپس تشریف لے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۵ء تک جاری رہا، اسی سال مولانا سندھی افغانستان گئے تو یہ سلسلہ منقطع ہوا۔

مولانا سندھی کا نہج درس قرآن عام علمائے کرام سے بہت حد تک مختلف نوعیت کا تھا۔ اس سے ان کا اصل مقصد طلبا میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرنا اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر انھیں آزادی و حریت سے ہم کنار ہونے کے لیے ایک متعین راہ پر لگانا تھا۔ خواجہ صاحب نے مولانا سندھی کے درس قرآن کے نوٹس لیے جنھیں بعد کو اپنے اضافوں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔

اصلی مبلغ و داعی اور واعظ و مصلح اسی شخص کو کہا جاتا ہے جو حالات و ماحول کا جائزہ لیتا رہے، وقت کے تقاضوں کی روشنی میں بات کرے اور دعوت و تبلیغ کے لیے اسی انداز کو اپنائے جس کی ضرورت ہو۔ غلام و محکوم ہندوستان میں ہمارے مبلغین و مصلحین میں سے بہت سے لوگوں نے یہی انداز اختیار کیا اور مخاطبین کو احساس دلایا کہ غیر کی محکومی سب سے زیادہ اذیت ناک ہے، اس سے نجات پانے کی کوشش کرنا ہر انسان بالخصوص ہر مسلمان کا فرض ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا احمد علی لاہوری اور خواجہ عبدالحی فاروقی نے درس قرآن میں اسی نقطے کو پیش نگاہ رکھا اور اس سے لوگ متاثر ہوئے اور آہستہ آہستہ اچھا خاصا حلقہ قائم ہو گیا۔

آگے چل کر خواجہ صاحب کا تعلق سرحد پار کی جماعت مجاہدین سے ہو گیا تھا۔ مولانا محی الدین احمد قصوری بھی ذہناً اسی جماعت سے منسلک تھے، چناں چہ اس ذریعے سے دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے اور عمل و فکر کی ہم آہنگی نے دونوں میں مخلصانہ مراسم کی نہایت خوش گوار فضا پیدا کر دی۔ یہ جنگ عظیم اول سے کچھ عرصہ پہلے یا اس کے ابتدائی دور کی بات ہے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے فرمان کے مطابق مولانا محی الدین احمد قصوری کلکتے چلے گئے تھے،

Marfat.com

جہاں انھوں نے ۱۹۱۵ء میں مولانا آزاد کی ہدایت کے مطابق اخبار اقدام جاری کیا، جس کی نگرانی خود حضرت مولانا آزاد فرماتے تھے۔ اس اخبار میں کام کے لیے مولانا محی الدین کو ایک ایسے رفیق و معاون کی ضرورت تھی جو اخبار میں خدمات سرانجام دینے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہو اور ایسا رازدان و رازدار بھی ہو کہ اس پر آنکھیں بند کر کے کامل اعتماد کیا جا سکے۔ اس کے لیے ان کی نظر انتخاب خواجہ عبدالحی فاروقی پر پڑی اور انھیں مولانا آزاد کے مشورے سے کلکتے آنے کی دعوت دی، اور وہ کوئی شرط عائد کیے بغیر بلا تامل کلکتے پہنچ گئے۔ کلکتے جانے سے پہلے وہ میرٹھ کے اسلامیہ کالج میں بطور استاذ اسلامیات خدمت انجام دیتے تھے۔

کلکتے میں یہ دونوں صاحبان ایک ہی جگہ اور ایک ہی کمرے میں سکونت پذیر تھے اور بقول مولانا محی الدین کے ''خواب و خور سب اکٹھی تھی۔''

اسی زمانے میں مولانا آزاد نے ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی، جس میں چند انگریزی خواں نوجوان اور چند علما نے شرکت کی اور مولانا نے ان میں درس قرآن کا سلسلہ شروع فرمایا۔ قرآن مجید کے ان دروس میں یہ دونوں بزرگ (مولانا محی الدین احمد اور خواجہ عبدالحی فاروقی) بھی شرکت فرمانے لگے۔ مولانا کو ان سے خاص قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جماعت حزب اللہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور مولانا نے جو توقعات اس سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں، اس لیے انھیں یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ یا ناسازگاری حالات کی بنا پر خود ہی ختم ہو گیا۔

بہر حال اقدام کے زمانہ اجرا میں مولانا محی الدین کا خواجہ صاحب سے جو رابطہ پیدا ہوا، وہ نہایت مستحکم تھا اور اس سے پتا چلا کہ وہ کتنے مخلص اور ایثار پیشہ تھے۔

تقریباً ایک سال دونوں اکٹھے رہے، سفر و حضر میں کامل رفاقت رہی۔ مولانا محی الدین فرماتے ہیں کہ انھوں نے خواجہ صاحب کو بہترین انسان اور سچے مسلمان پایا۔ وہ غیر مشروط طور پر ان کے پاس گئے تھے۔ پھر ایک سال کے عرصے میں کبھی انھوں نے کسی قسم کا تقاضا نہیں کیا۔ ان کو مولانا محی الدین کی مالی حالت کا اچھی طرح پتا چل گیا تھا۔ جو کچھ انھوں نے دیا، خواجہ صاحب نے خوش دلی سے قبول کر لیا۔ اگر مجبور ہو کر کبھی کوئی مطالبہ کیا بھی تو دوسری طرف سے انکار نہیں ہوا۔

مولانا محی الدین کے بقول دونوں کی دوستی کا اصلی زمانہ یہی تھا، جس میں آخر عمر تک کبھی فرق نہیں پڑا۔ مولانا قصوری فرماتے ہیں کہ اقدام کی تیاری میں نصف حصہ خواجہ صاحب کا ہوتا تھا۔ اداریہ عام طور سے مولانا ہی لکھتے تھے اور لکھ کر حضرت مولانا آزاد کی خدمت میں بھیج دیتے تھے۔ وہاں سے منظوری آنے پر وہ چھپتا تھا۔ فرماتے ہیں: ''میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری زندگی کا خوب ترین زمانہ تھا۔ سبحان اللہ! مولانا آزاد کی

Marfat.com

اصلاح کیا ہوتی تھی، بعض وقت ایک دو حرفوں کے پس وپیش کر دینے سے فقرہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے زمین سے اٹھا کر آسمان پر رکھ دیا ہے۔''

یہاں یہ واقعہ بھی بیان کر دیں کہ جولائی 1915ء (رمضان المبارک ۱۳۳۳ھ) میں مولانا آزاد نے کلکتہ میں ''دارالارشاد'' کے نام سے ایک مدرسہ جاری فرمایا تھا، اس مدرسے کے اجرا کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بہت ہی کم مدت میں نوجوانوں کی ایک جماعت کو قرآن مجید کی تعلیم سے آراستہ کر کے ملک میں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد امت کا فرض انجام دینے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس مدرسے میں تعلیم وتربیت حاصل کرنے والوں کا ایک گروہ عربی اور دینیات کے فارغ التحصیل طلبا کا اور ایک گروہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیم سے فارغ ہونے والوں کا تھا۔ ان طلبا کے قیام وطعام کی ذمہ داری مولانا آزاد نے خود اٹھائی تھی۔

خواجہ صاحب بھی طلبا کی اس جماعت میں شامل تھے، لیکن ۲۳۔ مارچ ۱۹۱۶ء کو جب حکومت بنگال کی طرف سے مولانا آزاد کو ایک ہفتے کے اندر اندر صوبے کی حدود سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تو انھیں مجبوراً کلکتے کی سکونت ترک کرنا پڑی۔ پنجاب اور یوپی وغیرہ صوبوں میں ان کا داخلہ پہلے سے بند تھا۔ اب انھوں نے صوبہ بہار کا رخ کیا اور وہاں کے ایک قصبے رانچی کو اپنا مسکن قرار دیا۔ پھر یہیں انھیں نظر بند کر دیا گیا اور وہ دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر میں رہا ہوئے۔ کلکتے سے ان کے نکلنے کے ساتھ ہی ''دارالارشاد'' بند ہو گیا۔

کلکتے کے دوران قیام میں خواجہ صاحب اور مولانا محی الدین اقدام کی ادارت بھی کرتے تھے اور مولانا کے درس قرآن میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ اقـــدام اپنے دور کا بہت اچھا اخبار تھا اور بہترین مضامین و مندرجات کا محیط......! لیکن افسوس ہے کہ مولانا آزاد کے کلکتے سے جانے کے ساتھ ہی حکومت نے اس کی بندش کے احکام جاری کر دیے۔

اقدام کے بند کر دینے کے بارے میں حکومت کی طرف سے جو آخری نوٹس ملا، اس میں دو باتوں کا ذکر تھا، ایک مولانا محی الدین احمد قصوری کے دو یا تین اداریوں کا جو حکومت کے نزدیک قابل اعتراض تھے، دوسرے خواجہ عبدالحی صاحب کے ایک مضمون کا جو سورہ عصر کی تفسیر پر مشتمل تھا۔

اخبار بند ہونے کے بعد یہ دونوں بزرگ کلکتے سے لاہور آ گئے۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں حکومت نے مولانا محی الدین قصوری کو گرفتار کر کے دسوہہ ضلع جالندھر میں نظر بند کر دیا۔ اور اسی دوران میں خواجہ صاحب کی گرفتاری بھی عمل میں آئی۔ دونوں کے خلاف ایک ہی الزام تھا اور دونوں ایک ہی جرم میں گرفتار اور نظر بند کیے گئے تھے۔

وہ جرم تھا سرحد پار کے مجاہدین کی اعانت اور انگریزی حکومت کے مخالفوں کے ساتھ تعاون وہمدردی......!

نظر بندی کے دنوں میں انھوں نے لاہور میں اکبری دروازے کے باہر اکھاڑا بوٹا مل کے قریب ایک دو

Marfat.com

منزلہ مکان کرائے پر لیا اور اس میں قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قرآن مجید سے انھیں انتہائی شغف تھا۔ یہی ان کی زندگی کا اصلی مصرف اور شب و روز کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ تمام عمر وہ اسی کارِ خیر میں مشغول رہے۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج، میڈیکل کالج اور دوسرے کالجوں اور یونیورسٹی کے طالب علم ان کے درس میں شرکت کرتے اور فیض یاب ہوتے تھے۔

اسلامیہ کالج کا پرنسپل اس وقت ہنری مارٹن تھا۔ وہ خواجہ صاحب کے درس میں شریک ہونے والے طلبا پر کڑی نگرانی کرنے لگا اور ان سے سخت باز پرس ہونے لگی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا نے احتجاج شروع کر دیا اور پرنسپل کے خلاف مظاہرے ہونے لگے۔ پرنسپل طلبا کے احتجاج اور مظاہروں کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکا اور اسے اپنے منصب سے الگ ہونا پڑا۔

خواجہ صاحب کے درس میں شریک ہونے والے طلبا میں سے بعض نے تحریک ہجرت میں بھی حصہ لیا اور عدم تعاون میں بھی سرگرمی کا ثبوت دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ خواجہ صاحب نظر بند بھی تھے اور اپنے مشن کی تبلیغ میں سرگرم بھی۔ اقبال کے بقول معاملہ یہ تھا کہ

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے
انھی پابندیوں میں رہ کے آزادی کی خو کرے

جنگ کے بعد خواجہ صاحب کی نظر بندی ختم کر دی گئی، لیکن اس سے کچھ عرصہ بعد ہندوستان میں رولٹ ایکٹ کا اجرا ہوا تو لوگ اس کے خلاف میدان عمل میں آ گئے اور پورے ملک میں اضطراب و بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیاں والا باغ میں ایک احتجاجی جلسے کا اعلان ہوا جو ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے زیر صدارت ہونا قرار پایا تھا، لیکن جلسے کے انعقاد سے پہلے ہی ان کو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو حکومت نے گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا۔ اب ڈاکٹر کچلو کی جگہ کرسی صدارت پر ان کی تصویر پڑی تھی۔ اس زمانے میں پنجاب کا گورنر سر مائیکل ایڈوائر تھا۔ لوگ جلسہ سننے کے لیے جلیاں والا باغ میں آئے تو اس نے جنرل ڈائر کو گولی چلانے کا حکم دیا اور سینکڑوں آدمی چند ثانیوں میں گولیوں سے بھون دیے گئے۔ اب پورے ملک کی سیاسی فضا انتہائی گرم ہو گئی تھی اور لوگ انگریزی حکومت کی مخالفت میں انتہائی جوش و جذبے کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ انگریزی حکومت بھی مقابلے کے لیے سخت سے سخت رویہ اختیار کرنے پر اتر آئی تھی۔

اس زمانے میں خواجہ عبدالحی فاروقی لاہور میں تھے اور نظر بندی سے آزاد ہو چکے تھے۔ جلسے جلسوں کا سلسلہ زوروں پر تھا۔ انھوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کے ایک بہت بڑے اجتماع میں پرجوش تقریر کی۔ اس تقریر کا مطلب انگریزی حکومت کے خلاف کھلا اعلان جنگ تھا۔ ۱۹۱۹ء کے مارشل لا کا زمانہ تھا، خواجہ صاحب

Marfat.com

کو گرفتار کر کے ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔

اس زمانے کے مارشل لا میں جو لوگ گرفتار ہوئے اور جیلوں میں محبوس کیے گئے ان کی فہرست بہت وسیع ہے جس میں مشہور سیاسی کارکن ملک لال دین قیصر مرحوم کا نام بھی آتا ہے۔ ان کے حوالے سے مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''لاہور کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں سے بہت سے لوگ جن میں اکابر بھی خاص تعداد میں شامل تھے، گرفتار ہوئے، دوسرے شہروں سے بھی لوگ گرفتار ہو کر آئے۔ وہ سب جیل میں رکھے گئے۔ باری باری ایک ایک مقدمے کی سماعت ہوتی تھی۔ قیصر مرحوم نے بارہا مجھ سے ذکر کیا کہ اس زمانے میں صرف دو فرد ایسے دیکھے، جن کی بہادری اور دلیری کی قسم کھائی جا سکتی ہے، ایک خواجہ عبدالحی فاروقی، دوسرے ڈاکٹر سیف الدین کچلو مرحوم۔ قیصر صاحب کہا کرتے تھے کہ صرف ان کے چہرے افتاد پر رنج وغم کے ہر اثر سے پاک دیکھے گئے۔ یہ بڑی سے بڑی سزا سن کر بھی ہنستے اور مسکراتے ہوئے آتے۔ باقی اسیروں میں سے اکثر ایسے تھے جو مقدمے کی سماعت سے پیشتر ہی رویا کرتے تھے۔ یا کم از کم رنج وغم سے افسردہ و پژمردہ تو سب تھے۔''

خواجہ صاحب کو مارشل کے تحت ضبطی جائداد اور عمر قید بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی، مگر وہ دو سال جیل میں رہے۔ پندرہ دن لاہور سنٹرل جیل میں اور کچھ دن کم دو سال ملتان جیل میں۔ اس کے بعد جب حکومت کی طرف سے عام معافی اور رہائی کا اعلان ہوا تو ان کی رہائی کے احکام بھی جاری کر دیے گئے۔

چلتے چلتے یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں اپنے گاؤں کرم آباد میں نظر بند تھے۔ انھوں نے وہاں ہفت روزہ ستارہ صبح جاری کیا جو بعد میں لاہور منتقل کر دیا گیا۔ خواجہ صاحب اس کے مدیر معاون تھے۔ تحریک ریشمی خطوط میں خواجہ صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے جو انڈیا آفس لائبریری (لندن) کے ایک ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

''عبدالحی خواجہ پسر خواجہ عبدالرحیم نے جو خورشید عالم بیرسٹرایٹ لا گورداس پور کا منشی کا ہے، گورداس پور، لاہور اور دیوبند کے مدرسے میں تعلیم پائی ہے۔ آخر الذکر مقام میں وہ عبیداللہ (سندھی) کا مخلص ساتھی تھا۔ وہ اسلامیہ کالج میرٹھ اور صوبہ جات متحدہ کے کئی اسلامی اداروں میں اور گوجرانوالا کے اسلامیہ ہائی سکول میں ملازم رہ چکا ہے۔ اگست ۱۹۱۵ء میں اس نے گورداس پور میں تقریر کر کے لوگوں کو جہاد پر ابھارا۔ کچھ عرصے تک وہ اقدام کلکتہ کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل رہا ہے۔ وہ نجم الدین احمد، ابوالکلام آزاد اور محی الدین عرف برکت علی قصوری کا

Marfat.com

ساتھی رہا ہے۔ یہ سب کے سب انتہائی درجے میں اتحاد اسلامی کے حامی ہیں۔"

"دیوبند میں مولانا محمود حسن کے مکان میں خفیہ میٹنگوں میں شامل ہوا کرتا تھا۔ جنود ربانیہ کی فہرست میں کرنل ہے۔"

۱۹۱۹ء میں ان کو گرفتار کیا گیا تھا، دو سال بعد ۱۹۲۱ء میں رہائی ملی اس سے ایک سال پہلے ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا، جس کا افتتاح شیخ الہند مولانا محمود حسن نے کیا تھا۔ شیخ الجامعہ یا مہتمم مولانا محمد علی جوہر تھے۔ خواجہ صاحب نے رہائی کے بعد علی گڑھ کا عزم کیا اور مولانا محمد علی سے ملاقات کی، وہ نہایت خوش دلی سے ملے اور انھیں جامعہ میں تفسیر قرآن کا استاد مقرر کیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو جامعہ کے ارباب انتظام کی طرف سے انھیں دیا گیا، اور یہی ان کا اصل موضوع تھا۔

اس سے پانچ سال بعد ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب خواجہ صاحب دل وجان سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ جامعہ کی منتقلی کے ساتھ ہی وہ بھی دہلی چلے گئے اور پھر کامل استقلال اور دلجمعی سے تدریسی خدمات سرانجام دیں اور ساتھ ہی تصنیفی سلسلے کا آغاز کر دیا گیا۔

جامعہ کے منتظمین میں سے خواجہ صاحب کو مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، خواجہ عبدالمجید، حکیم محمد اجمل خاں اور ڈاکٹر حسین خاں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور اساتذہ کی طویل فہرست میں مولانا محمد سورتی، حافظ محمد اسلم جیراج پوری اور پرنسپل محمد مجیب جیسے اصحاب علم ان کے رفقا میں شامل تھے۔

خواجہ صاحب نہایت مخلص، ایثار پیشہ، ہمدرد اور بے غرض عالم تھے۔ ان پر مالی کمزوری بھی مسلط رہی اور سیاسیات میں قید وبند کا سخت ترین دور بھی آیا، لیکن وہ ہر حالت میں صابر وشاکر اور بلند حوصلہ رہے۔ گھبراہٹ، پریشانی اور اضطراب کا کبھی ان کے ہاں گزر نہیں ہوا۔

جامعہ ملیہ کے زمانہ تدریس میں خواجہ صاحب نے حسب ذیل تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔

۱۔ تفسیر سورہ فاتحہ	۲۔ تفسیر سورہ بقرہ
۳۔ تفسیر سورہ آل عمران	۴۔ تفسیر سورہ الانفال وتوبہ
۵۔ تفسیر سورہ یوسف	۶۔ تفسیر سورہ نوح
۷۔ تفسیر سورہ حجرات	۸۔ قصہ حضرت موسیٰ وفرعون

۹۔ تفسیر پارہ عم یتساء لون

۱۰۔ اسباب النزول......بعض اہم آیات کے شان نزول کی وضاحت۔

۱۱۔ حالات قرآن مجید

Marfat.com

یہ کتابیں قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ مندرجہ تحت کتابیں ان سے یادگار ہیں جو ابتدائی درجوں کے طلبا اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے تصنیف کی گئیں۔

۱۲۔ نبیوں کے قصے ۱۳۔ ارکان اسلام

۱۴۔ ہمارے نبی ۱۵۔ پیارے رسول

۱۶۔ خلفائے اربعہ

۱۷۔ مرتبین صحاح ستہ۔ اس میں کتب صحاح میں سے ہر کتاب سے چند احادیث اور ان کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

ان تصنیفات کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں ان کے بہت سے مضامین شائع ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں شیخ عبداللہ نے کشمیر میں ''جامعہ اسلامیہ'' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا اور وہ خواجہ صاحب کو اس ادارے میں لے گئے تھے۔ کم وبیش دو سال خواجہ صاحب اس ادارے سے منسلک رہے۔

خواجہ صاحب ۱۹۵۰ء میں دہلی سے لاہور آئے اور اسی زمانے میں میرا ان سے تعارف ہوا۔ ۱۹۵۲ء میں ان کو اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں اسلامیات کے پروفیسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ مسجد مبارک میں خطبہ جمعہ ان دنوں مولانا محمد علی قصوری ارشاد فرماتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی یہ فریضہ خواجہ صاحب کے سپرد کر دیا جاتا تھا اور وہ حالات کے مطابق نستعلیق لہجے میں بڑی موثر تقریر کرتے تھے۔

میرا وہ الاعتصام کی ادارت کا دور تھا اور اس کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ خواجہ صاحب مہینے میں ایک دو مرتبہ علاقے کا چکر بھی لگاتے۔ کچھ دیر کے لیے دفتر الاعتصام میں تشریف لا کر اس فقیر کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں بھی جاتے اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرتے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف سے بھی ملاقات ہوتی اور بات چیت کا دور چلتا۔

خواجہ صاحب کا شمار عہد رفتہ کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جو برصغیر کی سطح ارض پر چلتی پھرتی تاریخ تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا اور ان کی رفاقت وہم نشینی کا شرف حاصل کیا تھا۔ ان کے اندر علم وسیاست کا ایک جہان آباد تھا۔ اس فقیر کو چودہ پندرہ سال ان سے میل ملاقات کے مواقع میسر رہے، اب افسوس ہوتا ہے کہ کبھی ان کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہ کی اور ان کے بیتے ہوئے دنوں سے آگاہی حاصل کرنے کی طرف دھیان نہ گیا۔ حالاں کہ یہ میری دلچسپی کا موضوع تھا۔ تاہم چند باتیں جو انھوں نے بعض مجلسوں میں بیان فرمائیں اور میرے ذہن میں محفوظ ہیں، عرض کرتا ہوں۔

ایک دن مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ کچھ عرصہ الہلال یا البلاغ میں مولانا کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ یہ شاید اس زمانے کی بات ہے جب ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء میں انھوں نے

Marfat.com

مولانا محی الدین احمد قصوری کی دعوت پر کلکتے جا کر ان کی رفاقت میں اخبار اقدام میں کام کا آغاز کیا تھا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ الھلال کے دورِ اول کا پہلا شمارہ ۱۳۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا اور آخری شمارہ ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو چھپا، اس کے ساتھ ہی حکومت بنگال کی طرف سے دوسری دفعہ ضمانت طلبی کی بنا پر الھلال کی اشاعت بند کر دی گئی تھی۔ اس سے ایک سال بعد ۱۲۔ نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ جاری کیا گیا جو ۳۱۔ مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ الھلال کے آخری دنوں میں البلاغ کے زمانے میں خواجہ صاحب کلکتہ میں مقیم تھے اور اقدام سے وابستہ تھے، معلوم ہوتا ہے، اس زمانے میں انھوں نے ان دونوں اخباروں یا دونوں میں سے ایک میں تھوڑا بہت عرصہ کام کیا۔

انھوں نے بتایا کہ اخبار کا جو حصہ ہمارے متعلق تھا، وہ مکمل ہو جاتا تھا۔ ہم مولانا سے کہتے کہ اپنے مضامین عنایت کریں تاکہ اخبار بروقت چھپ سکے۔ مولانا فرماتے ہاں! میرے بھائی ابھی لکھتا ہوں۔ اس طرح دو تین دن گزر جاتے اور وہ لکھنے پڑھنے کے دوسرے کاموں میں مصروف رہتے۔ جب انھیں کہا جاتا کہ آج آخری دن ہے اور کل اخبار چھپنا چاہیے تو رات کو بیٹھ جاتے، اداریہ، تفسیر قرآن، انتقاد وغیرہ تمام مضامین لکھ کر صبح کو ہمارے حوالے کر دیتے۔ ہم مسودہ پڑھتے تو ان کے انداز، زبان، الفاظ کی بندش اور فقروں کے دروبست سے نہایت خوش ہوتے، لیکن مولانا پھر مسودہ منگوا لیتے، ہم حیران ہوتے کہ یہ انھوں نے کیا کیا۔ تمام مضمون ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔ اس سے بہتر اور کیا لکھیں گے۔ اب اس میں کانٹ چھانٹ ہوتی تو پہلے کی نسبت اس میں کہیں زیادہ نکھار پیدا ہو جاتا۔ وہ الفاظ کے بادشاہ تھے اور اپنی بات بہتر سے بہتر شکل میں بیان کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ طباعت کے آخری مرحلے تک اس میں تبدیلی کرتے رہتے تھے۔ بعض اوقات چھپا ہوا مضمون اخبار سے نکال دیتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ مقررہ معیار کے مطابق نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن انھوں نے بیان کیا کہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے لاہور آنے سے دو ایک دن پہلے وہ نئی دہلی میں مولانا کی خدمت میں گئے اور انھیں بتایا کہ وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر مولانا نے فضا میں نظریں جمالیں اور فرمایا: وہ بھی کیا زمانہ تھا جب اکٹھے رہتے تھے اور مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔ پھر ارشاد ہوا، آپ جا رہے ہیں، میرے لائق کوئی کام ہے تو بتایئے۔

عرض کیا، وہ چائے پلا دیجیے جو کبھی کبھی کلکتے میں آپ پلایا کرتے تھے۔

چناں چہ چائے بنائی گئی، ایک پیالی خود انھوں نے پی اور ایک مجھے عنایت کی۔ میں اجازت لے کر رخصت ہونے لگا تو دروازے تک چھوڑنے آئے۔ جب میں نے کہا: اب بظاہر آئندہ ملاقات کا کوئی امکان نہیں ہے تو چہرے پر پژمردگی سی آ گئی اور نگاہیں نیچی کر لیں۔

Marfat.com

خواجہ صاحب نہایت متانت اور آہستگی سے بعض اوقات عجیب وغریب قسم کی بات ارشاد فرما دیتے تھے۔

ایک مرتبہ جب وہ آسٹریلیا بلڈنگ میں رہتے تھے، انھوں نے اپنے ایک صاحب زادے کی شادی پر کچھ لوگوں کو بلایا، جن میں مولانا اسماعیل غزنوی، حکیم ہدایت اللہ بٹالوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ملک نصر اللہ خاں عزیز اور ان سطور کا راقم شامل تھے اور خواجہ صاحب کی چھوٹی سی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں بارات روانگی کے لیے تیار ہوئی تو دولھا میاں بیٹھک میں آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ انھوں نے سہرا باندھ رکھا تھا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب نے سہرا دیکھا تو فرمایا خواجہ صاحب سہرا......!

ابھی انھوں نے یہی لفظ بولا تھا، آگے کچھ نہیں کہا تھا کہ خواجہ صاحب نے بات پکڑ لی۔ فرمایا: ہندوستان میں سہرا شادی والے لڑکے کی علامت ہے، اس سے پتا چل جاتا ہے کہ شادی اس لڑکے کی ہو رہی ہے۔ اس کا جائز یا ناجائز ہونے سے کوئی تعلق نہیں......!

یہ لفظ کہہ کر لڑکے سے مخاطب ہوئے۔

فرمایا: بیٹے! سہرا اتار دو۔

میرے خیال میں سہرے کے متعلق خواجہ صاحب کی یہ نہایت عمدہ توجیہ تھی اور برصغیر کے کلچر کے عین مطابق! اس کے بعد کسی نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

۱۹۵۲ء میں خواجہ صاحب کو اسلامیہ کالج (لاہور) میں اسلامیات کے پروفیسر مقرر کیا گیا۔ تنخواہ تین سو روپے ماہانہ تھی۔ پہلے آسٹریلیا بلڈنگ کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ اس کے بعد ریلوے روڈ پر تاج کمپنی کے قریب کرائے پر مکان لے لیا تھا۔

۷۔ جنوری ۱۹۶۵ء کو رات کے وقت ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ دوسرے دن ۸۔ جنوری ۱۹۶۵ء (۴۔ رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ) کو بروز جمعہ وفات پا گئے۔ قبرستان میانی صاحب میں مدفون ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

سید محمد متین ہاشمی

۱۹۷۵ء کی گرمیوں کا موسم تھا کہ ایک دن گیارہ بجے کے قریب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اس زمانے کے اکیڈمک ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں ان کے کمرے میں گیا تو ایک صاحب سے تعارف کراتے ہوئے کہا:

آپ ہیں مولانا محمد متین ہاشمی!

پھر ان کو میرے متعلق بتایا۔

انھوں نے اپنی نشست سے کھڑے ہو کر میری طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ قدرے چھوٹا قد، دبلے پتلے، گندمی سا رنگ، معتدل داڑھی، جسے سفید اور سیاہ بالوں کا مختصر مجموعہ کہنا چاہیے۔ سر پر قراقلی ٹوپی، سفید ململ کا کرتا اور سفید لٹھے کا پاجامہ زیب تن، وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چلتے تھے، اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ کمرے سے باہر نکلے اور چھڑی کے سہارے چلنے لگے۔

ان دنوں انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مشہور تصنیف سطعات کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب تصوف کے موضوع سے متعلق ہے اور عربی زبان میں ہے۔ شاہ صاحب نے جس موضوع پر اظہار خیال فرمایا ہے، اس میں کچھ اپنی خاص اصطلاحات استعمال کی ہیں، جس کی جھلک سطعات میں پائی جاتی ہے۔

مولانا محمد متین ہاشمی کے پاس اردو ترجمے کا مسودہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے یہ ترجمہ شائع کیا جائے۔

شیخ صاحب نے مجھے کہا کہ مولانا ہاشمی کا فرمان ہے یہ ترجمہ آپ دیکھ لیں اور پھر مناسب سمجھیں تو کتابت کے لیے کاتب کو دے دیں۔

میں نے عرض کیا: مولانا ہاشمی کا ترجمہ میں کیا دیکھوں گا، یہ عالم فاضل ہیں اور شاہ ولی اللہ کے افکار پر ان کی نظر ہے اور پھر کتاب تصوف کے موضوع پر ہے اور میں تصوف سے ناآشنا ہوں۔ لہٰذا مسودہ اسی طرح کاتب کے حوالے کر دیتا ہوں۔

مولانا محمد متین ہاشمی نے فرمایا: ''آپ مسودہ ضرور دیکھیے اور اچھی طرح پڑھ کر کاتب کو دیجیے۔ میں چاہتا ہوں اس کی پروف ریڈنگ بھی آپ ہی کریں۔''

Marfat.com

چناں چہ یہ کتاب ادارے کی طرف سے شائع ہوئی اور اس کے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا، اس پر عمل کیا گیا۔

اس سے قبل ان کا نام تو میں نے کئی دفعہ میاں عبدالمجید مالواڈہ اور ان کے صاحب زادوں سے سنا تھا، جن کے مکان میں وہ سکونت پذیر تھے اور ان کی علمی سرگرمیوں کا بھی علم تھا، لیکن ان سے ملاقات آج پہلی مرتبہ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ان سے بہت قریبی روابط پیدا ہو گئے تھے۔

مولانا متین ہاشمی اسم با مسمی تھے۔ متین اور سنجیدہ طبیعت کے مالک۔ ہر معاملے میں متانت کا غلبہ اور چہرے پر تحمل و بردباری کے آثار نمایاں۔ خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش کردار!

وہ صوبہ یوپی کے ایک قصبے غازی پور کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ معروف و ممتاز اہل حدیث عالم حضرت مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اسی قصبے کے رہنے والے تھے۔ علمی اعتبار سے ہندوستان میں اس قصبے کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خود مولانا متین ہاشمی کے اکابر اونچے درجے کے لوگ تھے، جن کا اس نواح کے اچھے خاصے زمینداروں میں شمار ہوتا تھا۔ نیکی اور دین داری میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے، طبابت اور حکمت کئی پشتوں سے اس خاندان میں چلی آرہی تھی۔ علم و فضل سے بھی وہ آراستہ تھے۔ مغلوں کے عہد اقتدار میں مدتوں حکومت کے ایوانوں میں ان حضرات کا عمل دخل رہا اور ان میں سے بعض با قاعدہ کئی اہم مناصب پر فائز رہے۔

گوناگوں اوصاف کے حامل اس خاندان میں مولانا محمد متین ہاشمی ۱۷۔ اگست ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے شہر غازی پور کے ایک دینی مدرسے سے حاصل کی، جس کا نام ''چشمہ رحمت'' تھا۔ اس کے بعد عازم دیوبند ہوئے اور وہاں کے دارالعلوم کے جلیل القدر اساتذہ کے حضور زانوئے شاگردی تہہ کیا، جن میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا اعزاز علی اور مولانا عبدالخالق ملتانی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہاں تمام مروجہ علوم کی تحصیل کی اور نصاب کے مطابق تفسیر و حدیث اور فقہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔

تین سال دارالعلوم دیوبند میں اقامت گزیں رہے اور اس اثنا میں وہاں کے فاضل اساتذہ سے خوب استفادہ کیا۔ اس دور کے علما اور اساتذہ سے مستفید ہونا بلاشبہ بہت بڑا اعزاز تھا جو مولانا ہاشمی کے حصے میں آیا۔

اگرچہ مولانا محمد متین ہاشمی کے تعلقات بہت سے علما و اکابر سے رہے اور مختلف اوقات میں مختلف معاملات سے متعلق متعدد حضرات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن وہ بہت زیادہ متاثر تین بزرگوں سے ہوئے، وہ تھے مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ ان کے فضل و کمال، تقویٰ و تدین اور معرفت و ادراک نے ان پر خاص طور سے اثر ڈالا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ پڑھے تو ذہن میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ پھر ان کی تفسیر

Marfat.com

اور تذکرہ وغیرہ کا مطالعہ کیا تو عالم فکر کو ایک نئے اسلوب سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس کے بعد انھوں نے دو مرتبہ مولانا سے ملاقات کی۔

ایک مرتبہ دیوبند سے اپنے چند رفقا کی معیت میں دہلی جا کر ان سے ملے۔ مولانا چند روز کے لیے دہلی میں قیام فرما تھے۔ یہ حضرات ان کی قیام گاہ پر پہنچے اور اپنے نام اور دارالعلوم دیوبند کے الفاظ لکھ کر ملاقات کے لیے اطلاع بھجوائی، مولانا نے فوراً اندر بلا لیا اور کافی دیر سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ہاشمی نے بتایا کہ مولانا انتہائی شفقت سے پیش آئے، لیکن اس کے باوجود جب انھوں نے ہم سے پوچھا کہ کس مقصد کے لیے آئے؟ تو ان کے رعب کی وجہ سے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔

دوسری دفعہ الہ آباد میں پنڈت جواہر لال نہرو کے مکان پر مولانا سے ملاقات کی۔ اس وقت بھی وہ اپنے چند دوستوں کے ہمراہ مولانا کی خدمت میں گئے تھے۔

ہاشمی صاحب نے بتایا کہ مولانا کی قیام گاہ سے کچھ فاصلے پر ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان لڑکی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پوچھنے پر کسی نے بتایا کہ نوجوان مرد خان عبدالغفار خاں کے بیٹے عبدالولی خاں ہیں اور لڑکی کا نام اندرا ہے اور یہ پنڈت جواہر لال کی بیٹی ہے۔

مولانا آزاد سے اس ملاقات میں بھی وہ مرعوب ہی رہے، ان کے ارشادات سنتے رہے، خود کسی نے کوئی بات نہیں کی۔

مولانا متین ہاشمی اگرچہ مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد اور عقیدت مند تھے، لیکن سیاسیات میں ان کا زاویہ فکر مولانا مدنی سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اس سلسلے میں وہ مولانا شبیر احمد عثمانی کے ہم نوا تھے اور ان کی جمعیت علمائے اسلام کے باقاعدہ رکن تھے۔ جس طرح مولانا عثمانی آزادی سے قبل قیام پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہم خیال تھے، اسی طرح مولانا متین ہاشمی مسلم لیگ کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر تحریک پاکستان کی حمایت کرتے تھے۔ اس لیے تقریروں کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا اور اخبارات و رسائل میں مضامین و مقالات کا بھی۔ یعنی ہر لحاظ سے پوری طرح سرگرم عمل!

فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملکی سیاسیات میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس اثنا میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند لی اور پھر ایم۔اے پاس کیا۔ اپنے آبائی قصبے غازی پور کے مدرسہ ''چشمہ رحمت'' میں پڑھانے لگے۔ مولانا ہاشمی دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن بڑے متعدل مزاج تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ''چشمہ رحمت'' کی مجلس انتظامیہ کے ارکان بریلوی نقطہ نظر کے حامل تھے، لیکن انھوں نے خود مولانا سے منصب تدریس قبول کرنے کی

Marfat.com

درخواست کی اور وہ کافی عرصہ اس مدرسے میں خدمت تدریس سرانجام دیتے رہے۔

تدریس کے علاوہ ہاشمی صاحب تحریر ونگارش کا بھی ذوق رکھتے تھے اور عمر کے ابتدائی مراحل ہی میں طبیعت میں یہ شوق ابھر آیا تھا۔ پھر سیاسیات میں بھی ایک خاص ذہن کے مالک تھے۔ دہلی سے مولانا عبدالوحید صدیقی نے نئی دنیا کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا، مولانا ہاشمی نے اس میں کچھ مضامین لکھے تو ان کے انداز واسلوب سے متاثر ہوکر مولانا صدیقی نے ان کو اپنے اخبار سے منسلک کرلیا اور وہ ایک عرصے تک اس میں نائب مدیر کی حیثیت سے مصروف عمل رہے۔

آزادی وطن سے چار سال بعد ۱۹۵۱ء میں اپنے آبائی مسکن غازی پور سے نکلے اور مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کے شہر سید پور میں جا مقیم ہوئے۔ وہاں بھی علمی، تدریسی اور سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ پہلے ایک سکول میں پڑھانا شروع کیا۔ اس کے بعد ایک کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے اور پھر اس کالج کے پرنسپل بنا دیے گئے۔ بعدازاں ''جامعہ اسلامیہ عربیہ'' کے نام سے خود اپنا ایک دارالعلوم قائم کیا، جس کی مسند شیخ الحدیث پر متمکن ہوئے۔

یوپی، بہار اور مغربی بنگال سے جو علمائے کرام ترک وطن کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے تھے، ان کی تنظیم کے لیے ''انجمن مہاجرین علمائے مشرقی پاکستان'' قائم کی گئی، مولانا متین ہاشمی اس انجمن کے صدر تھے، اس انجمن کے ذریعے انھوں نے مشرقی پاکستان کے علمائے کرام کو منظم کرنے کی کوشش کی، جس کے حوصلہ افزا نتائج نکلے۔

۱۹۵۷ء میں مولانا اطہر علی، مولانا فرید احمد اور پاکستان کے سابق وزیر اعظم چوہدری محمد علی نے نظام اسلام پارٹی قائم کی تو مولانا ہاشمی اس میں شامل ہوگئے۔ اس کی تنظیم کے سلسلے میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بارایٹ لامرحوم) کی قیام گاہ (بیرون یکی دروازہ لاہور) میں اس پارٹی کا اجلاس منعقد ہوا، جو حضرات اس میں شرکت کے لیے مشرقی پاکستان سے آئے تھے ان میں مولانا محمد متین ہاشمی بھی شامل تھے۔

میاں عبدالعزیز مرحوم کے پوتے...... میاں عبدالوحید اور میاں عبدالمعید...... بھی نظام اسلام پارٹی سے منسلک تھے اور انہی کے گھر میں اس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ بیرون لاہور کے شرکائے اجلاس کے قیام وطعام کا انتظام انہی کے ذمے تھا، اسی اجلاس میں ان کی ملاقات مولانا ہاشمی سے ہوئی جو آگے چل کر باہمی مراسم کی مستحکم شکل اختیار کرگئی۔

۱۹۷۰ء میں ہاشمی صاحب نے صدر شمالی بنگال کے حلقے سے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔ اس وقت ان کا تعلق نظام اسلام پارٹی سے تھا اور اسی کے ٹکٹ پر انتخاب کے میدان میں اترے تھے، لیکن کامیاب نہیں ہوسکے۔

انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں جب علیحدگی کا ہنگامہ بپا ہوا اور اسے بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک بنانے کی تحریک نے زور پکڑا تو مولانا ہاشمی نے حامیان پاکستان سے مل کر تحریک چلانے کا عزم کیا۔ یہ

Marfat.com

انتہائی نازک دور تھا اور پاکستان کی سلامتی کا نعرہ لگانے والوں پر ہر وقت موت کا سایہ منڈلاتا رہتا تھا، مکتی باہنی اور عوامی لیگ کے علیحدگی پسند ہر اس شخص کی جان کے دشمن تھے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے اتحاد کی بات کرتا تھا۔ مولانا متین ہاشمی نے اس خطرناک زمانے میں بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا اور پاکستان کے مخالفوں سے معرکہ آرا ہوئے، لیکن حالات بہ درجہ غایت خوف ناک شکل اختیار کر گئے تھے اور مشرقی پاکستان جلد ہی بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہو گیا تھا۔ فضا و ماحول کی ہیبت ناکیوں کے پیش نظر مولانا ہاشمی نے بچوں کو تو کچھ عرصے پہلے کراچی بھیج دیا تھا مگر خود دہشت پسندوں کے نرغے میں آ گئے اور عرصے تک مبتلائے اذیت رہے۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے کراچی پہنچے اور کراچی سے لاہور آئے۔

یہاں آنے سے کئی سال قبل (جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا) ان کا تعلق میاں عبدالوحید اور میاں عبدالمعید سے قائم ہو چکا تھا اور اس تعلق کا باعث میاں صاحبان اور ہاشمی صاحب کا نظام اسلام پارٹی سے انسلاک تھا۔ اسی انسلاک اور سیاسی ہم آہنگی کی بنا پر میاں صاحبان نے ان کو لاہور آنے کی دعوت دی، چناں چہ ۱۹۷۲ء میں وہ لاہور آ گئے اور انہی کے مکان (بیرون یکی دروازہ) میں اقامت گزیں ہوئے اور پھر کئی سال ان کے ہاں مقیم رہے۔ تعلقات کی یہ نوعیت ہمیشہ برقرار رہی۔ میاں صاحبان کو اللہ خوش رکھے وہ مولانا ہاشمی کا بڑا احترام کرتے اور ان کو اپنا بڑا بھائی سمجھتے رہے، ان کے بچوں سے اپنے بچوں کا سا سلوک کرتے تھے۔ مولانا ہاشمی اور ان کے اہل وعیال بھی ان کی تکریم کرتے تھے۔

۱۹۷۲ء کے دسمبر میں مولانا محمد متین ہاشمی کی خدمات، شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ضلع جھنگ کی درس گاہ جامعہ محمدی کے لیے حاصل کر لی گئی تھیں، ۱۹۷۴ء تک (دو سال) مولانا وہاں درس وتدریس میں مشغول رہے۔ جامعہ محمدی کے ارباب انتظام کی طرف سے انھیں ساڑھے آٹھ سو روپے ماہانہ پیش کیے جاتے تھے، جو اس زمانے کے لحاظ سے معقول مشاہرہ تھا۔

۱۹۷۴ء میں انھیں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) کے ریسرچ سیل میں ایڈوائزر مقرر کر دیا گیا، پھر ڈائریکٹر ریسرچ سیل بنا دیا گیا۔ ان کی شان کے مطابق یہ بہترین منصب تھا، جس کے وہ حق دار قرار دیے گئے۔ اس منصب کی نازک ترین ذمے داریوں کو انھوں نے نہایت محنت اور قابلیت کے ساتھ نبھایا۔

تصنیف وتالیف سے انھیں پہلے سے دلچسپی تھی اور اسلام کے مختلف موضوعات سے متعلق ان کی بعض علمی کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے ریسرچ سیل سے وابستہ ہوئے تو کئی مزید اہم کتابیں معرض تصنیف میں آئیں، جو ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے بھی اور مضامین ومندرجات کے اعتبار سے بھی علمی حلقوں میں مقبول ہوئیں۔ ان کی تصنیفات میں سے مطبوعہ کتابیں درج ذیل ہیں۔

Marfat.com

۱۔افسانہ اسلام: یہ کتاب اسلام کی تاریخ سے متعلق ہے۔۱۹۶۵ء میں چھپی۔

۲۔قرآن مجید کی آخری سورتوں کی تفسیر: سال طباعت ۱۹۶۹ء

۳۔تفسیر سورۃ یٰس: سال طباعت ۱۹۷۰ء

۴۔سطعات (اردو ترجمہ) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عربی کتاب کا ترجمہ جو تصوف کے موضوع پر ہے۔ یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۵۔اسلامی حدود اور ان کا فلسفہ: سال طباعت ۱۹۷۸ء

۶۔اسلامی حدود: سال طباعت ۱۹۷۸ء

۷۔اسلام کا قانون شہادت: سال طباعت ۱۹۷۹ء

۸۔عشر کی برکات

۹۔اسلامی نظام عدل

۱۰۔فہرست مخطوطات: دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کے عربی اور فارسی مخطوطات کی فہرست مرتب کی۔ پہلی جلد سے ساتویں جلد تک اس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۱۔الشفاء (اردو ترجمہ دو جلدوں میں)

۱۲۔سید ھجویریؒ: حضرت خواجہ علی ہجویریؒ کے سوانح حیات اور تعلیمات وافکار۔

۱۳۔روشنی: مولانا ہاشمی کی ریڈیائی تقریریں، ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے دو جلدوں میں شائع کی گئیں۔

مندرجہ ذیل کتابیں بہ صورت مسودات موجود ہیں۔

۱۴۔ابو داؤد: یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔ مولانا محمد متین ہاشمی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

۱۵۔المجاتہ العربیہ (اردو ترجمہ)

۱۹۸۱ء میں مجلہ منہاج جاری کیا، جس کے متعدد موضوعاتی شمارے شائع ہوئے۔ ہر شمارہ تین مہینے کے بعد شائع کیا جاتا ہے جو کسی اہم علمی و تحقیقی موضوع کے بارے میں مختلف اہل علم کے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں مولانا ہاشمی کے بہت سے مقالات ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں چھپے۔ ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن میں جو اسلامی و مذہبی نوعیت کی تقریریں کیں وہ اس سے الگ ہیں اور کثیر تعداد میں ہیں۔ ان میں سے صرف دو کتابیں روشنی کے نام سے چھپی ہیں۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا مولانا محمد متین ہاشمی کا نام میں نے پہلی دفعہ میاں عبدالمجید اور ان

Marfat.com

کے صاحب زادوں سے سنا تھا، جن کے مکان میں وہ فروکش تھے۔ یہ اہل حدیث خاندان ہے اور مولانا متین ہاشمی پکے حنفی المسلک اور دیوبندی عالم تھے۔ میاں عبدالمجید عام طور پر مجھے کہا کرتے تھے کہ ہاشمی صاحب بہت بڑے عالم ہیں اور شاہ ولی اللہ کے افکار اور تصورات پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ پھر معصومانہ لہجے میں فرماتے، لیکن ہیں پکے دیوبندی حنفی......!

مولانا محمد متین ہاشمی سے ملاقات کا موقع اس وقت ملا جب سطعات کا ترجمہ لے کر ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے۔ یہ تصوف کی کتاب ہے اور یہی کتاب میرے اور مولانا متین ہاشمی کے درمیان تعلقات کا باعث بنی۔ تصوف کا بنیادی نقطہ لوگوں میں محبت اور الفت کی فضا پیدا کرنا اور دلوں کے بعد کو قرب سے بدلنا ہے۔ لہٰذا اس کتاب نے غیر شعوری طور پر اپنا رنگ دکھایا اور ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

مسلمان کا مسلمان سے ملنا اور بغیر کسی دنیوی لالچ کے فقط لوجہ اللہ باہم ربط و تعلق رکھنا عبادت میں شامل اور باعث رضائے خداوندی ہے۔ حدیث رسول ﷺ میں اسے الحب اللہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اس اولین ملاقات کے بعد بارہا ان سے ریڈیو پاکستان (لاہور) میں ملاقات ہوئی۔ اپنے مرحوم بیٹے سراج منیر کی شادی کے موقعے پر بھی انھوں نے مجھے یاد فرمایا۔ کئی دفعہ ان کی خدمت میں ان کے گھر اور دفتر (دیال سنگھ لائبریری) میں حاضر ہوا۔ وہ بھی متعدد مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے۔ وہ ہر دفعہ محبت سے پیش آئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

ایک مرتبہ انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور کو اپنی بعض تصانیف تبصرے کے لیے دیں، اور ریڈیو کے جس پروڈیوسر کو دیں، انھیں ہدایت کی کہ تبصرہ اس فقیر سے کرایا جائے۔ یہ ایک اعزاز تھا، جس کا ان کی بارگاہ علم سے اس عاجز کو مستحق سمجھا گیا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے مولانا محمد متین ہاشمی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ وہ بہت اچھے مقرر ہیں اور اثر انگیز تقریر کرتے ہیں۔ اس سے کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے منعقد کردہ محاضرات قرآنی میں ان کی تقریر سننے کا موقع ملا تو پتا چلا کہ واقعی بہت اچھے مقرر ہیں، روانی، تسلسل، اظہار جذبات اور اسلوب بیان و دلائل کے اعتبار سے تقریر قابل داد تھی۔ مجھے موضوع اور تقریر کے اکثر حصوں سے اتفاق نہ تھا تاہم تقریر کے بعد ان کو داد دی اور جن پہلوؤں سے اختلاف تھا اپنے انداز سے اس کا ذکر بھی کیا، وہ باتیں سنتے رہے اور مسکراتے رہے، جواب کسی بات کا نہیں دیا، یہ ان کی مہربانی تھی۔

مولانا محمد متین ہاشمی کے بارے میں جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ ایک صابر شخص تھے۔ سراج منیر سے پہلے ان کے تین بیٹے فوت ہوئے تھے۔

Marfat.com

۱۔ محمد مبین سب سے پہلا بیٹا تھا جو صرف تین دن زندہ رہا۔

۲۔ بلال محمد گیارہ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

۳۔ محمد علی چھ مہینے زندہ رہ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔

سراج منیر ان کے چوتھے بیٹے تھے جنھوں نے ۲۵۔ستمبر ۱۹۹۰ء کو عین عالم جوانی میں اچانک وفات پائی۔ مولانا ہاشمی جو پہلے ہی ایک ستم رسیدہ اور موت گزیدہ شخص تھے، سراج منیر کی وفات سے بالکل نڈھال ہو گئے۔ یہ ان کا لائق، صاحب علم اور عاقل و فہیم بیٹا تھا، اس کی موت نے باپ کے اندر کی تمام قوتیں سلب کر لیں اور وہ تھوڑے عرصے بعد فالج میں مبتلا ہو گئے۔

ایک ذہین اور لائق بیٹے کی موت کا صدمہ اور اس کے ساتھ بیماری کا غم، وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے۔ ہر آنے والی گھڑی انھیں موت سے قریب کرتی رہی۔ آخر جمعۃ المبارک کے دن تین بج کر پچاس منٹ پر ۱۰۔جنوری ۱۹۹۲ء کو ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو گیا اور وہ اس جہان فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرے دن ساڑھے دس بجے فیصل ٹاؤن میں ان کی قیام گاہ کے قریب کھلے میدان میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی، جس میں بہت سے لوگوں نے شرکت کی۔ نمازہ جنازہ مشہور خطاط اور عالم دین مولانا سید انور حسین (نفیس رقم) نے پڑھائی۔ ایک سید عالم دین کا جنازہ ایک سید عالم دین نے پڑھایا اور نہایت خشوع وخضوع اور سکون کے ساتھ یہ فرض کفایہ ادا کیا۔

مولانا محمد متین ہاشمی دیوبندی عالم تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور بعض دیگر علمائے دیوبند کے شاگرد تھے۔ حصول علم دارالعلوم دیوبند میں کیا تھا اور سند فراغ وہیں سے حاصل کی تھی۔ تعلق ارادت مولانا مدنی سے تھا اور وہ اسی حیثیت سے معروف تھے۔

ان کی تصنیفی وتدریسی اور سیاسی وخطابتی خدمات اکثر موجودہ دیوبندی علما سے زیادہ تھیں۔ لیکن نہایت افسوس ہے کہ کوئی معروف اور سکہ بند دیوبندی عالم ان کے جنازے میں شامل نہیں تھا۔ بے شک مولانا سعید الرحمٰن علوی اور حافظ عبدالرشید ارشد شریک جنازہ تھے اور جنازہ پڑھایا بھی دیوبندی عالم سید انور حسین (نفیس رقم) نے تھا، لیکن ان تینوں حضرات کو اس زمرے میں شامل نہیں سمجھا جاتا، جس میں ایک مسجد دار اور مدرسہ دار یا جامعہ دار عالم کو سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح گاؤں یا علاقے کا اصلی چوہدری وہی ہوتا ہے جو ڈیرے دار ہو، اسی طرح علمائے کرام میں اصلی عالم اسی کو تصور کیا جاتا ہے جو کسی مسجد کا خطیب یا مدرسے کا مدرس یا جامعہ کا مہتمم ہو۔ ڈیرے دار چوہدری کی طرح اس قسم کے عالم دین کو ہم مسجد دار یا مدرسہ دار یا جامعہ دار عالم قرار دیتے

Marfat.com

ہیں، اور یہ تینوں حضرات عالم ہونے کے باوجود اس میں سے کسی کے بھی ''دار'' نہیں ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد متین ہاشمی کی مغفرت فرمائے۔ ان کی خدمات علمی کا دائرہ بہت وسیع تھا اور ان شاء اللہ بارگاہ الٰہی میں لازماً اس کو شرف قبول حاصل ہوگا۔

اب گھر کا تمام بوجھ ان کے اکیلے بیٹے عزیز القدر محمد بلال کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ بلال اور دیگر تمام اہل خانہ کی مدد فرمائے اور انھیں صبر جمیل سے نوازے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

حمید نظامی

۱۹۴۹ء کے مئی کی آخری تاریخوں میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی پہلی کانفرنس دارالعلوم تقویۃ الاسلام (لاہور) میں بصدارت حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی منعقد ہوئی تھی۔ صدر استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی تھے۔ قاعدے کے مطابق کانفرنس کے آغاز میں مولانا ندوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اس کے بعد مولانا سیالکوٹی نے خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ دونوں خطبے تحریری تھے اور انداز و معلومات کے اعتبار سے انتہائی لائق تعریف!

اس وقت اخبار الاعتصام جاری نہیں ہوا تھا۔ اس سے تین مہینے بعد اگست ۱۹۴۹ء میں الاعتصام کا اجراعمل میں آیا تو اس کے تین شماروں (۱۸، ۲۵۔ نومبر اور ۲۔ دسمبر ۱۹۴۹ء) میں مولانا ندوی کا پر از معلومات خطبہ معرض اشاعت میں آیا۔ لیکن مولانا سیالکوٹی کا خطبہ اسی ہفتے شائع ہو گیا تھا۔

میں اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا۔ کانفرنس سے دوسرے دن مولانا سیالکوٹی نے مجھے یاد فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں نوائے وقت کے دفتر جاؤں۔ اس کے ایڈیٹر جناب حمید نظامی صاحب سے ملوں، انھیں مولانا کا سلام پہنچاؤں اور عرض کروں کہ نوائے وقت میں ان کا خطبہ شائع کر دیا جائے۔

مولانا نے فرمایا کہ حمید نظامی صاحب ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ خطبہ وہ اپنے اخبار کی دو تین اشاعتوں میں چھاپ دیں گے۔

میں گیا، مولانا کا خطبہ کانفرنس، ان کے سلام کے ساتھ انھیں پیش کیا اور ان کی طرف سے اشاعت کے لیے کہا۔ انھوں نے واقعی احترام کے ساتھ مولانا کا نام لیا اور خطبے کی اشاعت کا وعدہ کیا۔ ان کو سلام بھی کہا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے حمید نظامی صاحب کو دیکھا۔

اخبار الاعتصام گوجرانوالا سے جاری ہوا تھا اور مجھے اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی کے فرمان کے مطابق فروری ۱۹۵۰ء کو اخبار میں خدمت سرانجام دینے کے لیے گوجرانوالے بھیج دیا گیا تھا۔ مولانا ندوی نے مجھے اخبار کے اداراتی شذرات لکھنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ وہ خود اداریہ لکھا کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ شذرات اس شرط پر لکھوں گا کہ آپ میرا لکھا ہوا ایک ایک لفظ دیکھیں گے اور اسے درست فرمائیں گے۔

مولانا میرے کرم فرما تھے۔ انھوں نے میری گزارش منظور فرمائی اور میں نے ان کے حکم کے مطابق لکھنا

Marfat.com

شروع کر دیا۔ وہ میرا لکھا ہوا ہر لفظ دیکھتے تھے اور بہت سی باتیں سمجھاتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب قیام پاکستان کی تحریک میں بے پناہ کردار ادا کرنے والا اخبار روزنامہ نوائے وقت پنجاب کی مسلم لیگی حکومت کے زیر عتاب تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس کے صفحات سچ کے لیے وقف تھے۔ اور صدق مقال اور صدق تحریر اس کا شیوہ تھا۔ اس کی سزا اسے یہ دی گئی کہ اس پر سنسر کی پابندی عائد کر دی گئی۔ مولانا نے مجھے فرمایا کہ اس پر شذرہ لکھو اور لکھ کر مجھے دکھاؤ۔ نوائے وقت پر جو آزمائشیں آئیں اور حمید نظامی نے جس جواں مردی سے ان کا مقابلہ کیا، وہ پاکستان کی تاریخ صحافت کا مستقل باب ہے۔ اگر وہ تمام واقعات تاریخ وار چھاپ دیے جائیں تو یہ صحافت کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔

بہرحال مولانا کے فرمان کے مطابق میں نے نوائے وقت پر سنسر کی پابندی کے عنوان سے شذرہ لکھا۔ مولانا کو دکھایا۔ انھوں نے اس کی نوک پلک درست کی اور وہ ۱۶۔ نومبر ۱۹۵۱ء کے الاعتصام کے صفحہ ۲ پر چھپا...... جی چاہتا ہے کہ اسے یہاں شائع کر دیا جائے تاکہ قارئین کرام کو معلوم ہو کہ اس زمانے کے الاعتصام میں، جو ایک مذہبی جماعت کا ترجمان تھا، کس قسم کے اداریے اور ادارتی شذرات شائع ہوتے تھے۔ نیز پتا چلے کہ مسلم لیگ کے حامی بلکہ اس کے مبلغ اخبار کے مدیر کو مسلم لیگی حکومت نے کن کن پریشانیوں سے دوچار کیا۔ یہ شذرہ ۲۰×۳۰/۴ سائز کے ڈیڑھ کالم میں چھپا تھا۔ ''گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را'' کے طور پر ملاحظہ فرمایے:

''اگر اخبارات کی روش گورنمنٹ کے نزدیک قابل اعتراض ہو تو اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ جمہوریت وانصاف کے تقاضوں کا خون کیے بغیر عدالت کے دروازوں پر دستک دی جائے۔ اگر عدالت گورنمنٹ کو حق بجانب قرار دے تو سمجھا جائے کہ گرفت صحیح تھی، ورنہ شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ اخبار نویس سے ناحق مواخذے کی معافی مانگی جائے۔ یہ کیا دھاندلی ہے کہ عدالتوں کے ہوتے ہوئے اخبارات کا گلا گھونٹا جائے۔

نوائے وقت کے معاملے میں گورنمنٹ کی یہ تیسری مداخلت ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے خود گورنمنٹ کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ اس اوچھے وار سے تو لوگ الٹا یہ سمجھ رہے ہیں کہ برسر اقتدار طبقہ عوام میں بڑی تیزی سے غیر مقبول ہو رہا ہے۔

یہ حقیقت اب کسی کی نظروں سے اوجھل نہیں رہی کہ جو لوگ اس وقت حکومت کے دروبست پر قابض ہیں، جن کے ہاتھ میں ملک کے نظم ونسق کی باگ ڈور ہے اور جن کے کندھوں پر قوم کی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کی ذمہ داریوں کا بار ہے، وہ اپنے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو رہے ہیں اور

Marfat.com

اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ملک کو غیر جمہوری راستوں پر ڈال رہے ہیں۔

اب اگر اخبارات دیانت داری سے اس صورت حال کو واضح کرتے ہیں اور بہ صورت احتجاج فسطائیت کے ان بڑھتے ہوئے رجحانات کو روکنے کے لیے ساعی ہوتے ہیں تو یہ جرم کیوں کر ہوگا؟ قیام پاکستان پر تین سال سے زائد عرصہ گزر رہا ہے، اور مسائل متنازعہ فیہ کی زلف پریشاں کا ایک پیچ بھی نہیں سنور پایا، ایک عقدہ اور گتھی بھی سلجھاؤ کی منت پذیر نہیں ہوسکی۔ پھر اگر اس سلسلے میں ارباب اقتدار کے تساہل و بے تدبیری کا ماتم کیا جائے تو یہ سیفٹی ایکٹ کی بے پناہیوں کی تحریک کا موجب کیوں کر ٹھہرے؟

رائے عامہ اگر فی الواقع یہ سمجھ رہی ہے کہ ہزاروں مہاجرین جو بے اطمینانی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور مسئلہ کشمیر روز بروز جن نزاکتوں اور گتھیوں کا حامل ہو رہا ہے اور اسلامی دستور کو بلطائف الحیل جس بے دردی سے ٹالا جا رہا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری موجودہ قیادت پر عائد ہوتی ہے، تو کیا یہ جھوٹ ہے؟ پھر عوام اگر یہ رائے بھی رکھتے ہوں کہ جب تک اس قیادت کے تسلط واقتدار کو ہٹایا نہیں جاتا اس وقت تک ان مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آتا اور سلجھاؤ کی کوئی شکل پیدا نہیں ہوتی، تو کیا اس کا اظہار کرنا اور لوگوں کی یہ آواز حکومت کے کانوں تک پہنچانا قانوناً جرم ہے؟

یہ زمانہ انتخابات کا ہے اور انتخابات ہی سے یہ معلوم ہوگا کہ ملک اپوزیشن کو کس احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس زمانے میں حزب مخالف کی آواز کو دبانا اور کسی اخبار پر پابندیاں عائد کرنا سخت معیوب ہے اور اس اعتراف کے مترادف ہے کہ حکومت اتنی کمزور ہے کہ کسی قسم کی تنقید کی تاب نہیں لاسکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ علائم کسی بھی حکومت کے لیے خوش گوار نہیں ہوسکتے۔

نوائے وقت کے خلاف جو دو الزام گورنمنٹ نے مثال کے طور پر پیش کیے ہیں، ہمیں شبہ ہے کہ گورنمنٹ انھیں ثابت نہیں کر پائے گی اور نتیجتاً غیر ہر دل عزیز ہو جائے گی۔ اس قسم کی حرکات ناروا سے عوام کے دلوں میں اس کا کوئی اثر باقی نہیں رہے گا۔

نوائے وقت پر سنسر کی اس پابندی کو ہم جمہوریت اور عدل وانصاف کے تقاضوں اور اسلامی اصولوں کے قطعاً منافی سمجھتے ہیں۔ جس اخبار نے قیام پاکستان کی راہ ہموار کی ہو، اس کے ساتھ حکمرانوں کا اس قسم کا برتاؤ کرنا انتہائی قابل مذمت ہے۔"

نظامی صاحب نے یہ شذرہ پڑھا تو مولانا حنیف ندوی کو شکریے کا خط لکھا اور دعا کی درخواست کی۔ یہ شذرہ نوائے وقت میں شائع بھی کیا گیا۔

Marfat.com

الاعتصام جمعیت اہل حدیث کا ترجمان تھا اور جمعیت کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے، مولانا غزنوی نے بتایا کہ ٹیلی فون پر نظامی صاحب نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا تھا۔ حالاں کہ یہ کوئی شکریے کی بات نہ تھی۔ صحافتی اخلاق کا تقاضا ہے کہ کسی اخبار کی پالیسی سے اختلاف ہو تو بھی ایسے مواقع پر اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے اور ظالم کے ہاتھ کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنا چاہیے۔

اس دور کی حکومت نے نوائے وقت کی مخالفت کو اپنا فریضہ قرار دے لیا تھا اور وہ اس کے الفاظ سونگھتی رہتی تھی۔ جوں ہی اس کی قوت شامہ نے کسی جملے اور پیراگراف کو اپنے خلاف سمجھا، اس پر ہلہ بول دیا۔ ایک عرصے تک یہ چڑھائی جاری رہی۔ اس ضمن میں ۲۰۔ اپریل ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں ہم نے نوائے وقت کے عنوان سے مندرجہ ذیل شذرہ لکھا تھا:

> ''دنیا بھر کے جمہوری ملکوں کا قاعدہ ہے کہ ان میں حزب مخالف کے اخبارات کو اختلاف رائے اور تنقید کی کھلی اجازت دی جاتی ہے مگر ہمارے ملک کی ریت ہی جدا ہے۔ یہاں ایسے اخبارات کو ملک دشمن اور غدار سمجھا جاتا ہے...... حالاں کہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، نوائے وقت کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خدمات کو اس کی تعمیر میں بے حد دخل ہے۔
>
> یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ سنسر کے باوجود اس کا پریس کیوں چھینا گیا ہے اور کیوں اب تک نئے ڈیکلریشن کے راستے میں موانع پیدا کیے جا رہے ہیں؟
>
> نوائے وقت نے اگر سنسر کے دوران میں متعلقہ حکام کی نافرمانی کی ہے تو اس کی سزا سنسر اٹھ جانے کے بعد کیوں دی جا رہی ہے؟ اور اگر وہ الزامات صحیح ہیں جو اس پر لگائے جا رہے ہیں تو کیوں انھیں کھلی عدالت میں پیش نہیں کیا جاتا؟ حکومت کو عدالتوں پر آخر کیوں بداعتمادی ہے؟''

۱۹۵۱ء میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایک پارٹی نے نوائے وقت کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اس دور کی مسلم لیگی حکومت کے اشارے پر کی گئی تھی، جس مسلم لیگ کی حمایت و تائید میں نوائے وقت کے ایڈیٹر نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا اور اس کے اخبار کا ایک ایک لفظ مسلم لیگ کی امداد و نصرت کا اعلان کر رہا تھا، اب وہ ایڈیٹر بھی مسلم لیگ کی حکومت کے نزدیک معتوب تھا اور اس کا اخبار بھی زیرِ عتاب تھا۔ اس اخبار کو کسی اور شخص کے حوالے کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔ ملک کے جن اخباروں نے اس وقت حکومت کے اس منصوبے کی مخالفت کی، ان میں ہمارا چھوٹا سا اخبار الاعتصام بھی شامل تھا، جو ان دنوں پنجاب کے ایک چھوٹے شہر گوجراں والا سے شائع ہوتا تھا اور جس کی آواز نہایت محدود تھی۔ تاہم اپنی ہمت کے مطابق ہم نے اپنی آواز بلند کی اور ۴۔ مئی ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں ''ایک مذبوحی حرکت''

Marfat.com

کے عنوان سے مندرجہ تحت ادارتی شذرہ لکھا:

''کئی دنوں سے سننے میں آ رہا ہے کہ نوائے وقت کا ڈیکلریشن حاصل کرنے کے لیے کوئی صاحب کوشش فرما رہے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ صرف افواہ ہوگی، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ اس میں صداقت کا کوئی شمہ بھی موجود ہے تو یہ انتہائی شرم ناک فعل اور نہایت مذبوحی حرکت ہے۔ حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ نوائے وقت کے مالکوں کو اس کے دوبارہ اجرا کی اس سے بہت پہلے اجازت دے دیتی، لیکن اگر اس کی اپنی مصلحتیں اس راہ میں حائل ہوئی ہیں تو وہ کم از کم کسی دوسرے شخص کو تو اس کی تاریخی شہرت کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہ دے۔ جو صاحب نوائے وقت کا نام اپنانا چاہتے ہیں، انھیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا وہ تنقید و بے باکی کی ان روایات کو بھی اپنائیں گے جو اس اخبار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ صرف نام اپنانے سے تو سوائے بدنامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر نوائے وقت کا سیاسی مسلک ہی انھیں پسند آ گیا ہے تو اس کا ڈیکلریشن حاصل کیے بغیر بھی وہ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

یاد رہے نوائے وقت صرف ایک اخبار نہیں ہے، وہ ایک ادارہ ہے جو بہت سی خصوصیات کا حامل ہے۔ ان خصوصیات کو قائم رکھنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔''

اندازہ کیجیے مسلم لیگ کے حامی اور اس کی تحریک کو آگے بڑھانے والے اخبار کو اس کی حکومت کے ہاتھوں کتنی ابتلاؤں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی تاریخ کا یہ گوشہ (ذرہ سے اشارے کنائے میں) ہم اپنے قارئین کے علم و مطالعہ میں لانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک ادارتی نوٹ ملاحظہ کیجیے جو ہم نے ۳۔اگست ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں ''نوائے وقت کا ڈیکلریشن'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

''حکومت پنجاب نے ایک قانونی نکتے کا سہارا لے کر نوائے وقت کا پہلا ڈیکلریشن منسوخ کر کے ایک دوسرے اخبار نویس کو دے دیا تھا، لیکن قاعدے کے مطابق جب وہ بھی وقت پر اخبار نہ نکال سکے تو ان کے نام منتقل شدہ ڈیکلریشن بھی منسوخ ہو گیا۔ اب نوائے وقت کے پہلے ناشر حمید نظامی صاحب نے حکومت سے پھر ایک دفعہ درخواست کی ہے کہ انھیں نوائے وقت کے دوبارہ اجرا کی اجازت دی جائے۔ اس کے ساتھ پی۔ این۔ ای۔ سی کے نائب صدر مولانا اختر علی خاں صاحب نے بھی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ نظامی صاحب کی درخواست منظور کی جائے اور انھیں دوبارہ نوائے وقت کے اجرا کی اجازت دے دی جائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ نوائے وقت خدمت ملک کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ اس نے

Marfat.com

پاکستان کے موقف کی اس وقت وضاحت کی جب کہ ملک کے بڑے بڑے اخبار خضر وزارت کی حمایت میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ تقسیم ملک کے بعد بھی اس نے جس محنت اور ذہانت سے ملک کی خدمت کی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ نوائے وقت نے کبھی غیر معتدل رویہ اختیار نہیں کیا۔ معلوم نہیں حکمران طبقہ اس سے کیوں خار کھاتا ہے۔ ہمارے نزدیک حکومت نے اس کی اشاعت بند کر دینے کے متعلق عجلت سے کام لیا ہے۔ اگر اس پر مزید غور کیا جاتا تو معاملہ یہاں تک نہ پہنچتا۔

بہرحال جب واقعہ یہ ہے کہ اس کے دوسرے ناشر بھی مدت معینہ میں اخبار شائع نہیں کر سکے تو قانون کو حرکت میں لانا چاہیے اور نوائے وقت کا ڈیکلریشن اس کے اصل حق دار حمید نظامی صاحب کو دے دینا چاہیے۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں، یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اس وقت پریس اور حکومت کے باہمی تعلقات کا زیادہ سے زیادہ مضبوط ہونا ضروری ہے۔

باقی رہا اس کا معیار تنقید، تو جہاد کے رویے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوائے وقت متانت اور سنجیدگی کی راہ کسی وقت بھی نہیں چھوڑے گا، لیکن اگر حکومت کی مصلحتیں یہی ہیں کہ حمید نظامی صاحب کو اس کی اجازت نہ دی جائے تو دوسرے ناشر کو صحافتی اخلاق کا بلند نمونہ پیش کرنا چاہیے اور نوائے وقت کا ڈیکلریشن اس کے اصل ناشر کے حوالے کر دینا چاہیے۔''

یہاں یہ یاد رہے کہ نوائے وقت کا ڈیکلریشن جب حکومت نے ایک اور صاحب کو دے دیا تھا تو نظامی صاحب نے روزنامہ جہاد جاری کر لیا تھا۔ یہ اخبار مجھے یاد پڑتا ہے، کسی دوسرے شخص کا تھا جو نظامی صاحب نے ان سے لیا تھا۔ جہاد چند روز جاری رہا (اور تاریخ بتاتی ہے کہ عام طور سے جہاد چند روز ہی جاری رہتا ہے) اس کے بعد انھیں اپنا اخبار نوائے وقت مل گیا تھا۔

یہ ایک طویل مگر دلچسپ کہانی ہے اور اس کا خاص پس منظر ہے، جس کا تعلق سیاست سے بھی ہے اور صحافت سے بھی......! میں اس کے بعض پہلوؤں سے آگاہ ہوں، لیکن میرا یہ موضوع نہیں...... یہ دلچسپ واقعات کسی دوسرے شخص کو بیان کرنے چاہئیں۔ اس سے نوائے وقت کی تاریخ بھی نکھرے گی، حمید نظامی کے ذاتی اور صحافتی کردار کی بلندیاں بھی سامنے آئیں گی اور اس دور کے پاکستان کی مسلم لیگی حکومت کا بھی پتا چلے گا کہ وہ اپنے ہی اخبار کے خلاف کس درجے پست حرکتوں پر اتر آئی تھی۔

یہ آج سے پینتالیس برس (تقریباً نصف صدی) پہلے کی بات ہے۔ موجودہ دور کے بہت سے صحافی

Marfat.com

اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ میرا خیال ہے، نوائے وقت کی دوبارہ اشاعت کے بعد نظامی صاحب نے اس کی کسی اشاعت میں ہمارا یہ شنذرہ شائع کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، الاعتصام کا اداریہ مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے تھے اور ادارتی شنذرات وہ بالعموم مجھ سے لکھواتے تھے اور پھر ان کی نوک پلک درست کرتے تھے۔ نوائے وقت سے متعلق شنذرات مجھ سے لکھوائے گئے تھے۔ اس زمانے میں نظامی صاحب نے دو یا تین خطوط مولانا کے نام ارسال کیے تھے، جن میں ان کے نام کا ایک خط اتفاق سے میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں الاعتصام گوجراں والا سے لاہور آ گیا اور اس کی ادارت میرے سپرد ہوئی تو بعض معاملات میں (جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) نظامی نے مختلف اوقات میں مجھے تین خطوط بھیجے جو میرے پرانے کاغذات میں محفوظ ہیں۔

اب وہ چند سطری خط پڑھیے جو نظامی صاحب نے مولانا کے نام بھیجا۔

۷۔ اگست ۱۹۵۱ء

مکرمی مولانا!

السلام علیکم

الاعتصام میرے نام آ رہا ہے۔ میں اسے پڑھتا ہوں اور استفادہ کرتا ہوں۔ نوائے وقت کے متعلق اس میں جو نوٹ لکھے گئے ہیں، وہ بھی میرے مطالعے میں آئے۔ اس پر میں آپ کا اور آپ کے ارکان ادارہ کا شکرگزار ہوں۔ میری درخواست ہے کہ آپ دعا کریں اللہ مجھے کلمہ حق کہنے کی توفیق عطا فرمائے اور ثابت قدم رکھے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

مخلص

حمید نظامی

مولانا محمد حنیف ندوی سے تو نظامی صاحب کے مراسم تھے، لیکن میں نے ان کو اس سے پہلے صرف ایک دفعہ ۱۹۴۹ء کے جون کی پہلی یا دوسری تاریخ کو دیکھا تھا، جب میں حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا وہ خطبہ صدارت انھیں دینے گیا تھا جو انھوں نے مئی ۱۹۴۹ء کی مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی کانفرنس منعقدہ لاہور میں پڑھا تھا۔

اب چھ سال کا سفر طے کر کے ۱۹۵۵ء کے مئی میں آ جایے۔ اس سال کے مئی کی ۱۵ تاریخ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے برکت علی ہال (لاہور) میں سنت رسول ﷺ اور حدیث کے موضوع پر تقریر

Marfat.com

کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"کوئی شریف آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حدیث کا جو مجموعہ ہم تک پہنچا ہے، وہ قطعی طور پر صحیح ہے، مثلاً صحیح بخاری جس کے بارے میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے، حدیث میں کوئی بڑے سے بڑا غلو کرنے والا بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جو چھ سات ہزار احادیث درج ہیں وہ ساری کی ساری صحیح ہیں۔"

مولانا مودودی کے یہ الفاظ صحیح بخاری کے متعلق اہل سنت کے نقطہ نظر سے قطعاً مختلف تھے، اس لیے ہم نے اس پر الاعتصام میں گرفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت اسلامی کے رسائل و جرائد حرکت میں آ گئے۔ لکھنے اور بیانات دینے میں ماشاء اللہ یہ لوگ بہت تیز ہیں اور پھر ان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ جو بات ایک مرتبہ زبان یا قلم سے نکل گئی، وہ بے شک صداقت کی میزان میں پوری نہ اترتی ہو، مگر یہ اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے پوری طاقت سے میدان میں ڈٹ جائیں گے۔ اس اعتبار سے اللہ نے ان کو بڑے استقلال سے نوازا ہے۔

بہرحال یہ ایک اخباری بحث تھی جو چل پڑی اور پھر دور تک پھیلتی چلی گئی۔ تحریک پاکستان کے بارے میں مولانا مودودی کی تحریریں، آزادی ملک کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں کے متعلق ان کے مضامین، مسلم لیگ اور اس کے قائدین پر ان کی تنقیدات، جہاد کشمیر کے سلسلے میں ان کی رائے وغیرہ بہت سی باتیں درمیان میں آ گئیں اور سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ نوائے وقت نے بھی اس میں دلچسپی لی اور الاعتصام کے بعض وہ شذرات شائع کیے جن میں مولانا مودودی کی مسلم لیگ کی تحریک پاکستان اور جدوجہد آزادی سے متعلق نگارشات زیر بحث آئی تھیں۔ انہی دنوں نوائے وقت نے ایک ادارتی نوٹ میں فریقین سے بحث بند کرنے کی اپیل بھی کی تھی۔ لیکن اس اپیل کے جواب میں جماعت اسلامی کے ایک اخبار نے لکھا کہ الاعتصام میں دو کمیونسٹ یہ بحث چلا رہے ہیں ایک مولانا محمد حنیف ندوی اور دوسرا یہ راقم عاجز (محمد اسحاق بھٹی) دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ صحیح بخاری اور حدیث وسنت کی جماعت کا محاذ کمیونسٹوں نے سنبھال لیا ہے اور اس کی مخالفت کا جماعت اسلامی نے!

جماعت کے ہفت روزے کی اس تحریر کے فوراً بعد مولانا داؤد غزنوی نے مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا اور الاعتصام کے نقطہ نظر کی تائید میں قرارداد منظور کی۔

نوائے وقت نے لکھا کہ کسی دینی اور مذہبی جماعت کے ارکان کو اس طرح مطعون کرنا مناسب نہیں۔ صحیح بخاری کے متعلق بحث کو علمی حدود میں رکھنا چاہیے۔ ہم بھی اتنے دل گردے کے مالک اور اس درجہ صابر

Marfat.com

وشا کر نہیں تھے کہ کسی بات کا جواب نہ دیں اور خاموشی سے بیٹھے سب کچھ سنتے رہیں۔ ہم نے بھی الاعتصام میں اپنے کمیونزم کا جواب دیا اور ان لوگوں کے اسلام کا جائزہ لیا جو حالات کے مطابق بدلتا اور حکمت عملی کا روپ دھارتا رہتا ہے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد (غالباً ۱۹۵۵ء کے نومبر کے آخری دنوں کی بات ہے کہ) میں اور مولانا محمد حنیف ندوی نماز مغرب کے بعد ریگل چوک سے ٹمپل روڈ کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک صاحب آئے اور نہایت ادب سے کہا:

''السلام علیکم مولانا......!''

مولانا نے بڑی محبت سے جواب دیا: ''وعلیکم السلام! کہیے مزاج اچھے ہیں؟''

ان صاحب نے متانت اور نرم لہجے سے مسکراتے ہوئے کہا: جماعت اسلامی کے اخبارات نے آپ کی مخالفت شروع کر دی ہے اور آپ کو کمیونسٹ بنا دیا ہے۔

مولانا نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا: معلوم نہیں انھوں نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے۔ (پھر میری طرف اشارہ کر کے فرمایا) الاعتصام کے ایڈیٹر تو یہ ہیں، مولانا اسحاق صاحب...... میں نے جب سے یہ بحث شروع ہوئی ہے، ایک لفظ بھی الاعتصام میں نہیں لکھا۔

اب ان صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا اچھا آپ ہیں، مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر......

یہ تھے جناب حمید نظامی...... نوائے وقت کے ایڈیٹر۔

میانہ قد، نکھرا ہوا صاف گندمی رنگ، انگریزی لباس میں ملبوس، چوڑا چہرہ، گٹھا ہوا متوازن جسم، آنکھوں پر نظر کی عینک، ننگا سر، انگریزی بال، کھلی پیشانی، کشادہ سینہ، دیکھنے میں چالیس، پینتالیس کے درمیان ہوں گے۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے نظامی صاحب کے بہت اچھے مراسم تھے۔ ایک مرتبہ وہ مولانا سے ایک فقہی مسئلہ پوچھنے آئے۔ ان کے کوئی عزیز یا دوست غالباً لندن رہتے تھے، ان کی شادی کا معاملہ تھا۔ مجھے کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ لڑکی لاہور میں تھی اور جن سے نکاح کے بارے میں بات ہو رہی تھی، وہ لندن میں تھے، سوال یہ تھا کہ نکاح ٹیلی فون پر ہو سکتا ہے؟ مولانا نے کچھ اس انداز کا جواب دیا تھا کہ اگر ٹیلی فون پر آواز پہچانی جا سکتی ہے اور ایجاب وقبول کے الفاظ واضح طور سے سنے جا سکتے ہیں اور گواہوں کی آواز سے بھی طرفین آشنا ہیں تو نکاح صحیح ہوگا۔

ایک دفعہ مولانا داؤد غزنوی نے بتایا کہ ایک تقریب میں نظامی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی۔ گفتگو

Marfat.com

کرتے ہوئے انھوں نے مولانا سے کہا کہ جو مذہبی رسائل وجرائد ان کے پاس آتے ہیں، وہ ان سب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اخبار اختلافی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے الاعتصام کے بارے میں انھوں نے مولانا سے کہا کہ اس میں نوے فی صد اصلاحی، تحقیقی اور سیاسی معاملات سے بحث کی جاتی ہے، صرف دس فی صد مذہبی یا مسلکی یا اختلافی مسائل بیان کیے جاتے ہیں۔ ان کے لیے بھی طریق اظہار منفی نہیں، مثبت اختیار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس وقت کے الاعتصام کی زبان، انداز اور اسلوب بیان کی بھی تعریف کی۔

اس زمانے میں مجھے اور مولانا حنیف ندوی کو ہوٹل بازی کی بڑی عادت تھی۔ شام کے بعد کسی ہوٹل میں چلے جاتے تھے۔ عام طور سے انارکلی میں دہلی مسلم ہوٹل یا میجسٹک ہوٹل میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ نشست رہتی تھی۔ کافی ہاؤس بھی چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھی مال روڈ پر کسینو کا رخ کر لیتے۔ وہاں کئی دفعہ نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی اور ان سے بات چیت کا موقع ملا۔ اب میرے ان سے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ وہ دھیمے لہجے میں آہستہ آہستہ بات کرتے تھے اور بات بڑی جان دار اور پختہ ہوتی تھی۔

مولانا حنیف ندوی سے وہ بہت تکریم سے پیش آتے تھے۔ مولانا ان کے اسلامیہ کالج کے دور طالب علمی میں مسجد مبارک کے خطیب تھے جو اسلامیہ کالج سے متصل ہے اور حمید نظامی ان کے خطبات جمعہ میں بھی شریک ہوتے رہے اور نماز مغرب کے بعد اس مسجد میں ان کا درس قرآن بھی سنتے رہے تھے۔ مولانا سے گفتگو میں وہ اس زمانے کی ان کی بعض باتوں کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔

۱۹۶۰ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی، جس کا نام تھا امام ابن تیمیہ۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے حالات میں یہ نہایت مفصل اور جامع کتاب ہے۔ کتاب کے مصنف مدراس یونیورسٹی کے پروفیسر محمد یوسف کوکن تھے۔ ۷۔ فروری ۱۹۶۱ء کے نوائے وقت میں اس پر تبصرہ شائع ہوا تھا، جس میں تبصرہ نگار نے امام کی ذات گرامی اور ان کے علمی وعملی کارناموں پر نہایت تکلیف دہ انداز سے اظہار رائے کیا تھا۔ میں اس وقت الاعتصام کا ایڈیٹر تھا، میں نے اس کی دو اشاعتوں میں امام ابن تیمیہؒ اور اس کتاب کے متعلق تبصرہ نگار کی خدمت میں گزارشات پیش کی تھیں۔ اس پر حمید نظامی مرحوم نے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔

۲۔ مارچ ۱۹۶۱ء

مکرمی!

سلام مسنون

الاعتصام میں امام ابن تیمیہؒ کے متعلق آپ کے مضامین نظر سے گزرے۔

Marfat.com

واقعی تبصرہ نگار نے امام علیہ الرحمہ سے انصاف نہیں کیا، بلکہ زیادتی کی۔ میں نے تبصرہ پڑھنے کے بعد ہی ان سے یہ عرض کر دیا تھا کہ انھوں نے انصاف اور توازن سے کام نہیں لیا۔ آپ کے مضمون کی اشاعت کے بعد دوبارہ ان سے یہی بات کہی ہے اور آپ کا مضمون بھی ان کی خدمت میں بھیجا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کتابوں پر تبصروں کا کسی اخبار کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختلف اصحاب تبصرے کرتے ہیں اور یہ ان کی ذاتی رائے ہوتی ہے، تاہم تبصرہ زیر بحث واقعی توازن سے عاری بلکہ نظریہ بظاہر تعصب پر مبنی تھا اور اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

میں نے وہ کتاب بھی پڑھی ہے۔ ذاتی عقائد کے اعتبار سے میں ایک حنفی مسلمان ہوں اور گو بدعتی نہیں ہوں، مگر بزرگان دین کے مقابر کا احترام کرتا ہوں اور اہل اللہ کے مزارات پر حاضری کو معیوب نہیں سمجھتا۔ مگر امام ابن تیمیہؒ کو میں اسلام کا ایک نامور، بڑا مخلص اور بڑا بہادر فرزند سمجھتا ہوں۔ وہ بلاشبہ ایک حق پرست اور حق گو مجاہد تھے۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

والسلام

مخلص

حمید نظامی

نظامی صاحب مرحوم کا یہ خط اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے، کسی قسم کے تبصرے یا رائے کا محتاج نہیں ہے۔

میرے پاس پاکستان اور ہندوستان کی متعدد معروف شخصیتوں کے خطوط موجود ہیں، نظامی صاحب کے بھی تین خطوط میرے ذخیرہ مکتوبات کی زینت ہیں۔

فروری ۱۹۵۶ء کو میں نے ہفت روزہ الاعتصام کا حجیت حدیث نمبر شائع کیا، جو ۲۰×۳۰/۴ سائز کے ایک سو صفحات پر مشتمل اور برصغیر پاک و ہند کے معروف اہل علم اور مشہور اصحاب قلم کے مضامین پر محتوی تھا۔ یہ نمبر اخبارات و رسائل کو تبصرے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ نظامی صاحب کو بھی یہ نمبر پیش کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس نمبر کی وصولی کے بعد مندرجہ ذیل خط لکھا۔

۲۷۔فروری ۱۹۵۶ء

مکرمی! سلام مسنون

الاعتصام کا حجیت حدیث نمبر ملا۔ میں نے اس کے چند مضامین پڑھ بھی لیے۔ آپ نے بڑی محنت سے یہ نمبر مرتب کیا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کیجیے۔ نوائے وقت میں جلد ہی اس پر تبصرہ ہوگا۔

Marfat.com

حضرت مولانا داؤد غزنوی کی خدمت میں میرا اسلام پہنچایے۔

والسلام
مخلص

حمید نظامی

جنوری ۱۹۵۸ء میں میں نے سہ روزہ منہاج جاری کیا۔ اس وقت اخباری کاغذ کا حصول بہت مشکل تھا اور نئے اخبار کے لیے تو کہنا چاہیے کہ ناممکن تھا۔ نوائے وقت میں منہاج پر تبصرہ کیا گیا تھا، جس میں حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ منہاج کے لیے اخباری کاغذ کا کوٹہ منظور کرے۔

اس سے کچھ دن بعد میں اس سلسلے میں ان کے مکان پر صبح نو بجے کے لگ بھگ پہنچا۔ انھیں اطلاع ہوئی تو مجھے اندر بلالیا۔ بتایا کہ وہ نوائے وقت کے لیے اداریہ لکھ کر ابھی فارغ ہوئے ہیں...... میں نے اخباری کاغذ کی بات کی تو دوسرے دن نوائے وقت میں اس پر نوٹ شائع ہوا۔

لاہور میں ان دنوں ایک صاحب ڈاکٹر عبدالستار تیموری تھے جن کا تعلق (غالباً) تعلیمی پریس (ہسپتال روڈ) سے تھا۔ ان سے میرے بہت اچھے مراسم تھے اور حکومت کے اونچے طبقے تک ان کی رسائی تھی۔ انھوں نے اس ضمن میں خود بھی کوشش کی اور نظامی صاحب سے بھی کہا۔ اس پر نظامی صاحب نے مجھے خط لکھا۔ یہ خط اپریل ۱۹۵۸ء کی کسی تاریخ کا مکتوبہ ہے، لیکن تاریخ مٹ گئی ہے، پڑھی نہیں جاتی، خط کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

اپریل ۱۹۵۸ء

مکرمی! السلام علیکم۔

منہاج کے لیے کاغذ کے بارے میں ڈاکٹر عبدالستار تیموری نے مجھ سے بات کی ہے۔ وہ بھی کوشش کر رہے ہیں اور میں نے بھی بعض موثر شخصیتوں سے بات کی ہے۔ دیکھیے کب کامیابی کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام
مخلص

حمید نظامی

حکومت بے شک ایک ہی جماعت کی ہو، لیکن اس کے ارکان ذہنی طور پر ہمیشہ ایک سے زائد گروپوں میں بٹے ہوتے ہیں پاکستان میں بھی یہی صورت حال رہی ہے اور حمید نظامی کا تعلق ان میں سے ایک گروپ سے رہا ہے۔

حمید نظامی بلاشبہ بہت سی خصوصیات کے حامل تھے جو ان کے اکثر معاصرین میں نہیں پائی جاتی تھیں۔

Marfat.com

وہ ۳۔ اکتوبر 1915ء کو سانگلہ ہل (ضلع شیخوپورہ) میں پیدا ہوئے، میٹرک تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج (لاہور) میں داخلہ لیا جو اس عہد میں پنجاب کے مسلمانوں کا معروف ترین تعلیمی ادارہ تھا۔ مطالعہ و مضمون نگاری سے انھیں خاص شغف تھا۔ کالج کا ایک رسالہ کریسنٹ کے نام سے جاری تھا، اس میں لکھنا شروع کیا۔ بعدازاں اس کے منصب ادارت پر متمکن ہوئے۔ تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر سے بھی دلچسپی تھی اور ہندوستان کے کالجوں کے کئی مباحثوں اور مذاکروں میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں اپنے چند ہم جماعتوں اور ہم مکتبوں کے ساتھ مل کر پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی۔ کچھ عرصہ اس کے صدر بھی رہے۔ اس سلسلے میں بعض ساتھیوں کے ہم رکاب ہو کر چند شہروں کا دورہ کیا اور وہاں کے کالجوں میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی شاخیں قائم کیں۔

۱۹۳۸ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور پھر ایف۔سی کالج میں داخل ہوئے اور انگریزی میں ایم۔اے کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد صحافتی میدان میں باقاعدہ قدم زن ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سیاسی نوعیت کا ایک ماہنامہ ساربان نکلتا تھا، اس کے مدیر معاون کے طور پر کچھ مدت خدمات انجام دیں۔

پنجاب کانگرس کمیٹی طویل عرصے تک دو گروپوں میں بٹی رہی۔ ایک کا نام ستیہ پال گروپ تھا اور دوسرے کا بھارگو گروپ۔ ڈاکٹر ستیہ پال مذہبی اعتبار سے آریہ سماجی تھے، لیکن معتدل اور متوازن ذہن کے مالک۔ ان کے ساتھی بھی اعتدال پسند تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بھی آریہ مذہب کے حامل تھے، لیکن جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے اور مرض تعصب میں مبتلا۔

ڈاکٹر ستیہ پال کچھ عرصہ پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ انھوں نے پنجاب کی کانگریس کمیٹی کے مشترکہ سرمائے سے لاہور سے نیشنل کانگرس کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا۔ اس کے عملہ ادارت میں حمید نظامی، چراغ حسن حسرت اور مشہور کمیونسٹ ادیب باری علیگ بھی شامل رہے، لیکن سیاسی نقطہ نظر سے اختلاف کی بنا پر یکے بعد دیگرے یہ تینوں اس اخبار سے علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہ اخبار بھی مختصر سی زندگی لے کر آیا تھا اور جلد ہی افق صحافت سے غائب ہو گیا تھا۔

حمید نظامی بڑے تیز اور مستعد شخص تھے۔ شعور کی وادی میں داخل ہوتے ہی مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تو اس میں شرکت کی اور اس کے متعدد مشہور رہنماؤں سے روابط پیدا کیے۔ اسی سال کلکتے میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں اپنے بعض احباب کے ساتھ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔

اب ان کے قافلہ حیات نے ایک نیا موڑ کاٹا اور ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو دو تین دوستوں کے ساتھ مل کر

Marfat.com

نوائے وقت کے نام سے ایک چھوٹا سا پندرہ روزہ اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار صرف چھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ خالص سیاسی اخبار تھا۔ اس کے پہلے صفحے پر سخن ھائے گفتنی کے عنوان سے حمید نظامی کا ایک مستقل کالم غریب شہر کے قلمی نام سے چھپتا تھا۔ اسی طرح حالات حاضرہ کے سلسلے میں چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے جاتے تھے۔

اس زمانے میں انھوں نے چند مہینے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا میں رپورٹنگ کی تربیت بھی حاصل کی۔ بعد ازاں مسلمانوں کی ایک خبر رساں ایجنسی اورینٹ پریس آف انڈیا کی لاہور برانچ کے منیجر مقرر کیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوائے وقت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

جب پندرہ روزہ اخبار سے لوگ کچھ متعارف ہو گئے تو ۱۵۔ نومبر ۱۹۴۲ء کو اسے ہفت روزہ کر دیا گیا۔ اس وقت یہ اچھا خاصا مقبول ہو گیا تھا اور اس کی اشاعت بھی بڑھ گئی تھی۔

میں نے ہفت روزہ نوائے وقت سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں فیروز پور میں دیکھا تھا۔ میرے ایک دوست چوہدری غلام حسین تہاڑیہ کے بعض عزیز فیروز پور کی بستی تہاڑیاں میں رہتے تھے۔ وہ ان کے گھر گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ان کی بیٹھک میں ہفت روزہ نوائے وقت پڑا تھا۔ اس کے مضامین و مندرجات کی صاحب خانہ نے تعریف کی، ہم تھوڑی دیر وہاں رہے اور اس اثنا میں اس اخبار کی چند باتیں پڑھنے کا موقع ملا۔ یہ ترپن (۵۳) سال قبل کی بات ہے۔

۲۲۔ جولائی ۱۹۴۴ء کو نوائے وقت روزنامہ کر دیا گیا۔ یہ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا اور کاغذ بہت کم ملتا تھا۔ اس بنا پر نئے اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کرنا بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ لیکن نواب مشتاق احمد گورمانی اس وقت مرکزی حکومت کے کسی اہم منصب پر متمکن تھے۔ انھوں نے مدد کی اور نظامی صاحب کو روزنامہ اخبار جاری کرنے کی اجازت مل گئی، مگر حکومت کی طرف سے کاغذ اور قیمت کی عائد کردہ پابندیوں کی بنا پر اخبار صرف چھ صفحات کا شائع ہوتا تھا۔ حمید نظامی نے اس کی ادارتی ذمے داریاں قبول کیں اور شیخ حامد محمود نے انتظامی معاملات اپنے ہاتھ میں لیے۔ میاں محمد شفیع بھی اس میں تھوڑا بہت کام کرتے تھے۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں بنگال کے مشہور صاحب قلم مولانا راغب احسن مرحوم بھی شامل تھے۔

نوائے وقت کے اداریے اور شذرات بالخصوص بہت متوازن اور جان دار ہوتے تھے، ''سرراہے'' کا انداز بھی بڑا معقول تھا۔ اس کے ابتدائی دور کی یہ روایات اب تک قائم ہیں۔ اس وقت بھی اس کے ادارتی صفحے کو بے حد اہمیت حاصل تھی، اب بھی حاصل ہے۔ لاہور سے بے شمار روزنامے جاری ہوئے اور بڑی آب و تاب سے میدان صحافت میں وارد ہوئے۔ جنھوں نے نئے سے نئے اسلوب اختیار کیے اور اپنے اندر بڑی جاذبیت اور کشش پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن نوائے وقت کے قاری کو متاثر نہ کر سکے۔ جن لوگوں کو اس

Marfat.com

اخبار کی عادت پڑ گئی ہے اس کا اس کے بغیر گھر پورا نہیں ہوتا۔

ابھی بتایا گیا ہے کہ نوائے وقت جنگ کے زمانے میں روزنامہ کیا گیا تھا اور ڈیکلریشن کے حصول میں نواب مشتاق احمد گورمانی نے مدد کی تھی۔

گورمانی صاحب سے نظامی صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ بہت عرصہ پیشتر کی بات ہے ایک شخص نے جس کا نام مجھے یاد پڑتا ہے، حکیم سیف علی تھا، گورمانی صاحب کے خلاف ہائی کورٹ میں کیس کر دیا تھا کہ ''جب یہ ریاست بہاول پور کے وزیراعظم تھے، انھوں نے سردار پٹیل سے خط و کتابت کر کے ہندوستان سے ریاست بہاول پور کا الحاق کرنے کی سازش کی تھی۔'' یہ کیس بالکل بے جان اور جھوٹا تھا۔ جو بعض بڑی شخصیتوں کے کہنے سے بنایا گیا تھا۔ بہت لوگ اس کی کارروائی سننے ہائی کورٹ جاتے تھے۔ میں بھی جاتا تھا۔ حمید نظامی اور شورش کاشمیری وہاں موجود ہوتے تھے۔

ایک دن عجیب معاملہ ہوا، بغیر کسی جان پہچان کے حکیم سیف علی ایک شخص کے ساتھ میرے پاس آ گئے۔ میں اس وقت ہفت روزہ الاعتصام کا ایڈیٹر تھا اور اس کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا۔ میں نے اس قسم کے لوگوں سے کبھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ جس شخص کے ساتھ وہ آئے تھے، وہ میرے جاننے والے تھے۔ مجھے سخت غصہ آیا اور بے حد کوفت ہوئی۔ وہ اونچی آواز میں باتیں کرتے تھے اور ایک چھوڑ کر دوسرے کمرے میں مولانا داؤد غزنوی تشریف فرما تھے۔ میں نہایت پریشان کہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کروں۔ مولانا کے تعلقات گورمانی صاحب سے بھی تھے اور نظامی صاحب سے بھی۔ چار پانچ منٹ تو میں نے دل پر جبر کر کے ان کی باتیں سنیں۔ پھر صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں کام میں مصروف ہوں، اس سے زیادہ آپ کو وقت نہیں دے سکتا۔ وہ کمرے سے نکلے تو سکھ کا سانس آیا۔

جن لوگوں نے تحریک آزادی ہند اور تحریک حصول پاکستان میں حصہ لیا ہے، وہ نہایت قابل احترام لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق ملک وقوم کی خدمت کی اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ ان میں سے جو لوگ جیلوں میں گئے وہ بھی ہمارے عظیم محسن ہیں، جنھوں نے حصول آزادی کے لیے تقریریں کیں، ان کے بھی ہم دل وجان سے احسان مند ہیں اور جنھوں نے اس موضوع پر مضامین لکھے ان کے بھی بے حد قدردان ہیں۔ غرض جس نے جس صورت بھی آزادی وحریت کے لیے جدوجہد کی، اس نے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔

حمید نظامی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے نامساعد حالات میں اخبار کے ذریعے کام کا آغاز کیا اور پھر کسی نوع کی تکلیف کا احساس کیے بغیر خاص جوش وجذبے کے ساتھ آگے بڑھتے گئے، تا آنکہ اللہ نے

Marfat.com

کامیابی عطا فرمائی۔

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ پاکستان بن گیا تو خود انہی کی جماعت کے قائدین نے جن کی کچھ عرصہ پیشتر وہ حمایت کرتے رہے تھے اور کر رہے تھے اور جن کے حق میں اداریے اور مضامین لکھتے رہے تھے اور لکھ رہے تھے، اقتدار میں آ کر ان کی مخالفت شروع کر دی اور اسی اخبار کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے، جس کے کالم ان کی تقریروں اور بیانوں کے لیے وقف تھے۔

پنجاب کی دولتانہ وزارت کے دور میں ایک معمولی تکنیکی غلطی کی بنا پر اپریل ۱۹۵۱ء میں اس کا ڈیکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور جو پریس اسے الاٹ ہوا تھا وہ سربمہر کر دیا گیا۔ اس کے بعد نظامی صاحب نے اخبار جہاد جاری کیا تو پریس کو مجبور کیا گیا کہ وہ یہ اخبار چھاپنے سے انکار کر دے، چناں چہ اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد نوائے وقت جاری کیا گیا...... پھر بڑی مشکل سے اصل ڈیکلریشن حاصل ہوا۔

اس موضوع کی اچھی خاصی تفصیل گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سیاسی لیڈر اگرچہ کسی جماعت کے ہوں، انھیں اپنے مطلب سے غرض ہوتی ہے۔ ہر شخص سے، وہ اپنی جگہ بڑا ہو یا چھوٹا، ان کا پیمانہ مراسم اپنا مفاد ہوتا ہے۔ جب تک ان کے ذاتی مفاد کی ترجمانی ہوتی رہے، وہ خوش رہتے ہیں، جوں ہی ان کے طریق کار کے کسی پہلو سے اختلاف کا اظہار ہوا، انھوں نے آنکھیں پھیر لیں اور پھر جو اذیت وہ پہنچا سکتے ہیں، پہنچانی شروع کر دی۔ ان کی دوستی مطلب کی ہے، مطلب نکلا، دوستی ختم۔ ایک پنجابی لوگ گیت میں اس قسم کے لوگوں کی نفسیات کی خوب ترجمانی کی گئی ہے اور ان کے دوستانے کو 'لڈوواں دی یاری' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لڈو مک گئے یرانے ٹٹ گئے جھوٹھی یاری لڈوواں دی

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد حکومت نے اعلان کیا تھا اور اس کے لیے ایک باقاعدہ محکمہ قائم کیا گیا تھا کہ جو لوگ مشرقی پنجاب میں زمینیں اور مکانات چھوڑ آئے ہیں، وہ اس محکمے میں کلیم داخل کرائیں...... زمینوں کے کلیم میں تو کوئی گھپلا نہیں ہو سکتا تھا، کلیم داخل کرانے والے کے نام اتنی ہی زمین آنا تھی جو مشرقی پنجاب کے محکمہ مال کے کاغذات میں درج تھی۔ البتہ مکانوں کے کلیم میں گھپلے کا امکان تھا، اس لیے کہ مکانوں کے کلیم کے فیصلے کا انحصار شہادتوں پر تھا۔ شہادت دینے والے جو کہہ دیتے تھے۔ اس کے قریب قریب فیصلہ ہو جاتا تھا...... منظور شدہ کلیموں کی خرید و فروخت کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ دس ہزار روپے کا کلیم چھ سات ہزار روپے میں مل جاتا تھا۔

بعض لوگوں نے غیر مسلموں کے متروکہ مکانوں میں سکونت اختیار کر لی تھی یا ان کی دکانوں پر قابض ہو

Marfat.com

گئے تھے۔ ان قابضین وساکنین میں مقامی لوگ بھی تھے اور پناہ گزین بھی۔ حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ مقامی لوگ دس ہزار روپے تک کا متروکہ مکان یا دکان خرید سکتے ہیں، اس سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن پناہ گزین اس پابندی سے مستثنیٰ تھے، انھیں اس سے زیادہ رقم کی جائداد خریدنے کی اجازت تھی۔

نظامی صاحب مرحوم نے نوائے وقت میں حکومت کے اس فیصلے کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ قیام پاکستان میں صرف پناہ گزینوں ہی نے حصہ نہیں لیا، مقامی لوگوں نے بھی اس کے لیے جدوجہد کی ہے۔ حکومت دونوں کو ایک ہی سطح پر رکھے اور مقامی لوگوں کو بھی متروکہ جائداد خریدنے کی اسی طرح اجازت دے، جس طرح پناہ گزینوں کو دی ہے۔

بعض اخبارات اور پناہ گزین رہنماؤں نے نوائے وقت کے اس نقطہ نظر کو محل اعتراض ٹھہرایا تھا، اور بعض مقامیوں نے اس کی تائید کی تھی۔

بعض حضرات نے پناہ گزینوں کو مہاجر اور مقامیوں کو انصار قرار دیا۔ میں نے بھی اس پر الاعتصام میں ایک نوٹ لکھا تھا اور عرض کیا تھا کہ نہ ہم لوگ مہاجر ہیں اور نہ یہاں کہیں انصار نظر آتے ہیں۔ بس یہی مقامی اور پناہ گزین کی یا لوکل اور ریفوجی کی اصطلاح رہنے دیجیے۔ نہ ہم نے ہجرت کی اور نہ ادھر کسی نے انصار کا کردار ادا کیا۔ ہم میں سے بھی بے شمار لوگوں نے جھوٹے کلیم داخل کرائے اور لوگوں سے اپنے حق میں شہادتیں دلائیں۔ یہاں کے بھی بہت سے لوگوں نے دل کھول کر لوٹ مار کی اور جس قدر مال و دولت سمیٹ سکتے تھے، سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس مسئلے پر جھگڑنے کی اب کیا ضرورت ہے، سب کا اللہ ہی بھلا کرے۔

بہر حال یہ سلسلہ بھی چند روز اخباروں میں چلتا رہا۔

حمید نظامی بے شک اپنے عہد کے بہت بڑے صحافی اور منجھے ہوئے اخبار نویس تھے۔ ان کی نظر بڑی وسیع تھی اور حدود مطالعہ دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جس مسئلے پر لکھتے تھے، اس کا خوب تجزیہ کرتے تھے۔

۱۸۔ فروری ۱۹۶۲ء کو ان پر دل کا حملہ ہوا، بڑے بڑے معالجوں کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن افاقہ نہ ہوا۔ ۲۱۔ فروری کو گیارہ بجے کے قریب میں اور مولانا محمد حنیف ندوی ان کے مکان پر عیادت کے لیے گئے تو بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ ہمارے دوست مشتاق صاحب اور مرحوم حمید الملکی نے ہمیں دیکھا تو دوڑ کر آئے اور انتہائی غم گین لہجے میں بتایا کہ حالت بہت خراب ہے۔ مولانا کوثر نیازی ان کے قریب بیٹھے سورہ یٰس پڑھ رہے ہیں۔

نہایت مختصر مگر انتہائی تکلیف دہ مرض میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۲۔ فروری ۱۹۶۲ء (۱۷۔ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ) کو جمعرات کے دن وہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ شمسی حساب سے چھیالیس برس چار مہینے انیس دن عمر پائی۔ ان کی نماز جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھی گئی، جس میں ہر حلقے کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

Marfat.com

ان کی وفات پر میں نے ۹۔ مارچ ۱۹۶۲ء کے الاعتصام میں مندرجہ ذیل تعزیتی نوٹ لکھا۔

''مدیر نوائے وقت جناب حمید نظامی کی وفات ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ وہ کامیاب صحافی اور بدرجہ غایت محبِّ وطن انسان تھے۔ ان کا اسلوب نگارش اور انداز گفتگو نہایت عمدہ اور دل نشین تھا۔ اداریہ نویسی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ بڑی وزنی بات کہتے تھے اور ملک وقوم کی محبت میں ڈوب کر لکھتے تھے۔ ان کی رائے کو ہر حلقے میں اہمیت دی جاتی تھی اور ہر طبقے کے لوگ اس سے متاثر ہوتے تھے۔ وہ سیاسیات میں ایک خاص نظریے کے حامل اور مستقل عقائد ورجحانات کے مالک تھے اور ان پر ہر حال میں کاربند رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض لوگ خبروں سے پہلے نوائے وقت کا اداریہ پڑھنے کے لیے مستعجل ہوتے تھے۔

ان کے اصول بالکل واضح تھے، اور وہ تھے، حب وطن اور خیرخواہی ملک وقوم......! ان کی تمام تحریریں اسی محور کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ کسی کی مخالفت کریں یا موافقت، اس اصول سے کسی لمحے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے۔ اسی لیے ہر طبقہ وخیال کے لوگوں میں انھیں قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔ ان کی بعض تحریروں کے بعض پہلوؤں سے اتفاق یا اختلاف کی گنجائش تو ہوسکتی ہے، لیکن ان کی نیت اور اخلاص میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

گزشتہ کچھ مدت سے تو ان کی نگارشات میں اور بھی خوش گوار تبدیلی پیدا ہوگئی تھی اور ان کا رہوار قلم محبت اسلام کی وادیوں میں تیزی کے ساتھ گھومنے لگا تھا اور اس ضمن میں ان کے اداریے نہایت موثر اور وزنی ہوتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے دل کی بات کہتے اور اپنے قارئین کے جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کرتے تھے۔

حمید نظامی جہاں ایک نکتہ شناس صحافی تھے، وہاں ایک مخلص رہنما بھی تھے۔ ان کی وفات سے صحافتی حلقوں میں اتنا بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے کہ جس کے آسانی سے پر ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انھوں نے ایسے وقت میں داعی اجل کو لبیک کہا ہے، جب کہ اس ملک کے لوگوں کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ انھوں نے صرف چھیالیس برس ساڑھے چار مہینے عمر پائی اور اس چھوٹی عمر میں حیرت انگیز طور پر بہت ترقی کی۔ وہ بلند کردار اور عالی ہمت شخص تھے، جو بات حق سمجھتے تھے، برملا اس کا اظہار کرتے تھے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان ومتعلقین اور تمام دوستوں کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔''

Marfat.com

سید ابوالحسنات قادری

۱۹۵۳ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے کی ایک میٹنگ مولانا سید داؤد غزنوی کی قیام گاہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں ہوئی۔ اس میٹنگ میں جو حضرات تشریف لائے تھے، ان میں انجمن حزب الاحناف کے سابق امیر اور مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد قادری بھی تھے۔ پورا قد، متناسب جسم، گندمی رنگ، بھرا ہوا چوڑا چہرہ، سبز رنگ کا عمامہ باندھے، ٹخنوں سے اونچی پاجامہ نما شلوار اور لمبا سا کوٹ پہنے ہوئے۔ یہ اس مجلس عمل کے صدر تھے جو اس وقت تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں بنائی گئی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی کو اس کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا ابوالحسنات کو دیکھا۔ چہرے پر بشاشت اور لبوں پر مسکراہٹ، خوش مزاج اور خوش کلام، ہر شخص ان کی عزت کرتا تھا اور وہ سب سے احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بزرگ ہر قسم کے گھمنڈ، غرور، رعونت اور ہٹو بچو کے مرض سے محفوظ ہیں۔

اس کے بعد کئی دفعہ ان کی زیارت ہوئی اور کئی دفعہ ان سے ملنے اور باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور حالات دوسرا رخ اختیار کر گئے ہیں۔ متعدد لوگوں سے سنا اور بارہا اخباروں میں پڑھا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک میں مختلف مذہبی جماعتوں کے جو علمائے کرام شامل تھے، وہ ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتے تھے، اس لیے کہ کسی دوسرے فقہی مسلک کے امام کے پیچھے ان کی نماز نہیں ہوتی تھی۔ لیکن تحریک تحفظ ختم نبوت کے زمانے میں یہ بات نہ تھی، مجھے ان دنوں مجلس عمل کی کئی میٹنگوں میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ ان میٹنگوں میں احناف کی بریلوی شاخ سے تعلق رکھنے والے مولانا ابوالحسنات موجود ہیں، دیوبندیوں کے مولانا محمد علی جالندھری اور بعض دیگر حضرات علما شریک ہیں اور اہل حدیث مسلک کے مولانا سید داؤد غزنوی تشریف فرما ہیں۔ نماز کا وقت آ گیا ہے تو اذان کہی گئی اور فقہی مسلک کا لحاظ کیے بغیر کسی ایک عالم کو آگے کیا اور سب نے اس کے پیچھے نماز پڑھی۔ بلکہ مولانا داؤد غزنوی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری اصرار کرتے تھے کہ مولانا ابوالحسنات نماز پڑھائیں اور مولانا ابوالحسنات مصر ہوتے تھے کہ مولانا داؤد غزنوی فریضہ امامت سرانجام دیں۔ عام طور سے مولانا ابوالحسنات کی اقتدا میں نماز پڑھی جاتی تھی۔ سبحان اللہ! کیسا اچھا زمانہ تھا اور کیسے عمدہ لوگ تھے۔

Marfat.com

مولانا سید ابوالحسنات دراصل ہندوستان کے شہر الور کے رہنے والے تھے اور وہاں کے معروف عالم دین مولانا سید دیدار علی شاہ کے فرزند گرامی قدر تھے۔ مولانا دیدار علی ۱۸۵۶ء (۱۲۷۲ھ) کو الور میں پیدا ہوئے۔ ان کے اساتذہ کی فہرست میں مولانا قمرالدین الوری، مولانا کرامت اللہ خاں دہلوی، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا احمد علی سہارن پوری اور مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی جیسے اکابر اصحاب فضیلت کے اسمائے گرامی درج ہیں۔

مولانا دیدار علی سلسلہ نقشبندیہ میں مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی کے، سلسلہ چشتیہ میں مولانا سید علی حسین کچھوچھوی کے اور سلسلہ قادریہ میں مولانا احمد رضا خاں کے حلقہ ہائے ارادت میں شامل تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا دیدار علی کچھ عرصہ رام پور کے مدرسہ اشاعت العلوم کی مسند تدریس پر فائز رہے۔ پھر اپنے شہر الور میں قوت الاسلام کے نام سے ایک دارالعلوم قائم کیا۔ بعدازاں لاہور آئے اور مدرسہ نعمانیہ میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ ۱۹۱۷ء (۱۳۳۵ھ) میں آگرہ کی شاہی مسجد کے خطیب اور مفتی مقرر کیے گئے۔

۱۹۲۲ء (۱۳۴۰ھ) میں دوبارہ لاہور تشریف لائے اور مسجد وزیر خاں کی خطابت اور درس وتدریس کا منصب سنبھالا۔ ۱۹۲۵ء (۱۳۴۳ھ) میں مرکزی انجمن حزب الاحناف قائم کی اور اس کے ساتھ ہی دارالعلوم حزب الاحناف کی بنیاد رکھی۔

۲۰۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء (۲۲۔ رجب ۱۳۵۴ھ) کو لاہور میں وفات پائی۔

مولانا دیدار علی کے فرزند دلبند مولانا سید الحسنات محمد احمد قادری کی ولادت ۱۸۹۶ء (۱۳۱۴ھ) کو الور میں ہوئی۔ ابتدا میں قرآن مجید حفظ کیا اور قرات وتجوید کے علم سے بہرہ مند ہوئے۔ رنگائی، کارپینٹری، گھڑی سازی اور خیاطی بھی سیکھی، مرادآباد میں ایک طبیب سے جن کا نام حکیم حامی الدین تھا، علم طب حاصل کی۔ مولانا نعیم الدین مرادآبادی اور مولانا احمد رضا خاں صاحب سے مروجہ علوم وفنون کی تحصیل کی۔ مولانا شاہ علی حسین کچھوچھوی سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوئے۔

مروجہ تعلیم سے فراغت کے بعد الور ہی میں درس وتدریس اور وعظ وخطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ بہت اچھے واعظ اور خطیب تھے۔ انداز بیان ایسا تھا کہ لوگ بڑے شوق سے ان کی باتیں سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے۔

ان کے والد گرامی مولانا سید دیدار علی نے وفات پائی تو مسجد وزیر خاں کی مجلس انتظامیہ کی طرف سے لاہور تشریف لانے اور والد محترم کی جگہ خطابت وتدریس کا فریضہ سرانجام دینے پر اصرار کیا گیا۔ چناں چہ الور سے عازم لاہور ہوئے اور والد مکرم کی مسند سنبھالی۔

تمام مسالک فقہ کے اہل علم سے ان کے مراسم تھے اور ملکی وقومی سطح کی ہر مشترکہ مجلس میں شرکت فرماتے

Marfat.com

تھے۔تحریک تحفظ ختم نبوت کی مجلس عمل کے صدر تھے۔گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اپنے رفقا کے ساتھ پہلے سکھر جیل میں، پھر لاہور سنٹرل جیل میں رہے۔

لاہور میں ربیع الاول کے مہینے میں موچی دروازے کے باہر سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں حنفی، اہل حدیث اور شیعہ، ہر مسلک کے فقہ کے علمائے کرام نے شرکت کی اور تقریریں ارشاد فرمائی تھیں، مولانا سید ابوالحسنات اس مشترکہ سیرت کانفرنس میں مقرر کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔

۱۷۔فروری ۱۹۶۰ء کو بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار (۸۰۰۰۰) ارکان نے ایوب خاں کو صدر مملکت منتخب کیا۔صدر منتخب ہوتے ہی ملک کا آئین بنانے کے لیے انھوں نے گیارہ افراد پر مشتمل ایک آئین کمیشن قائم کیا۔صدر ایوب کے قائم کردہ آئین کمیشن کی طرف سے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا۔جو اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا اور ملک کی بہت سی اہم شخصیتوں کو بھی بھیجا گیا تھا۔یہ سوال نامہ بہت سی شقوں پر مشتمل تھا۔اس کا جواب دینے کے لیے ۵،۶۔مئی ۱۹۶۰ء کو جامعہ اشرفیہ (نیلا گنبد لاہور) میں مختلف مکاتب فکر کے انیس علما وزعما جمع ہوئے تھے اور انھوں نے اس کا مفصل جواب دیا تھا۔مولانا ابوالحسنات اس اجلاس میں شریک تھے اور تمام کارروائی میں انھوں نے حصہ لیا تھا۔ان کے صاحب زادے مولانا خلیل احمد بھی اس اجلاس میں شامل تھے۔

ایک مرتبہ کسی اہم مسئلے پر غور کرنے کے لیے مولانا داؤد غزنوی نے لاہور کے تمام مکاتب فقہ کے علما کا اجلاس بلایا۔مولانا ابوالحسنات کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی،لیکن وہ بیمار تھے،اس لیے اجلاس میں تشریف نہیں لا سکے تھے۔اجلاس میں جو فیصلہ ہوا تھا،اس کی انھیں اطلاع دینے اور اس پر ان کے دستخط کرانے کے لیے مولانا داؤد غزنوی نے مجھے ان کی خدمت میں بھیجا۔میں ان کے دولت کدے پر پہنچا تو ان کے صاحب زادہ گرامی قدر مولانا خلیل احمد سے ملاقات ہوئی، وہ مجھے مولانا کی خدمت میں لے گئے۔مولانا تکیے پر ٹیک لگائے نیم دراز سے تھے۔میں نے سلام عرض کیا تو بیٹھنے کی کوشش کی۔عرض کیا: آپ اسی طرح لیٹے رہیے،اٹھنے کی تکلیف نہ فرمائیے۔

بولے: کیوں نہ اٹھوں، آپ تو ذاتی طور پر ہی میرے لیے قابل احترام ہیں۔اب تو آپ مولانا داؤد غزنوی کے قاصد کی حیثیت سے آئے ہیں، میرا فرض ہے کہ جتنا اٹھ سکتا ہوں، اٹھنے کی کوشش کروں۔

وہ بہت کمزور ہو چکے تھے اور یہ الفاظ نحیف آواز میں آہستہ آہستہ ان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

لیکن ہوا یہ کہ اٹھنے کی کوشش میں ان کا سانس اکھڑ گیا اور شدید کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور کھانستے کھانستے نڈھال ہو گئے، کافی دیر یہ کیفیت رہی۔پھر کچھ سنبھلے تو کارروائی مجھ سے سنی اور مولانا خلیل احمد سے قلم لے کر اس پر دستخط کیے اور معذرت کی کہ وہ بیماری کی وجہ سے اس اجلاس میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ساتھ ہی فرمایا کہ میری عدم شمولیت کی بنا پر آپ کو آنے کی تکلیف کرنا پڑی۔

Marfat.com

ان کے اس منکسرانہ انداز بیان اور نرم اسلوب کلام سے میں بڑا متاثر ہوا۔ اس سے ندامت بھی ہوئی کہ میری وجہ سے انھیں اتنی تکلیف پہنچی یہ بھی بار بار خیال آیا کہ یہ کس درجے بلند اخلاق عالم دین ہیں جو مجھ خرد سے اتنے لطف وکرم کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اس کا ذکر میں نے واپس آ کر مولانا داؤد غزنوی سے کیا تو وہ آب دیدہ ہو گئے اور فرمایا مولانا ابوالحسنات کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔

ان کی زندگی کا یہ واقعہ جو میرے ساتھ بیتا، ہمیشہ یاد رہے گا، اور اسے یاد رکھنا چاہیے۔

مولانا ابوالحسنات جہاں وعظ وتقریر میں مشہور تھے، وہاں متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے، اچھے طبیب بھی تھے اور کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اور حافظ تخلص کرتے تھے۔

ان کی تصنیفات وتراجم میں مندرجہ کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ تفسیر الحسنات

۲۔ ترجمہ کشف المحجوب

۳۔ اوراق غم

۴۔ طیب الوردہ شرح قصیدہ بردہ

۵۔ مخمس حافظ

۶۔ مسدس حافظ

۷۔ دیوان حافظ اردو

۸۔ مرزائیت پر تبصرہ

علاوہ ازیں متعدد رسائل وجرائد میں مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین ومقالات سپرد قلم کیے۔

انھوں نے ۲۰۔ جنوری ۱۹۶۱ء (۲۔ شعبان ۱۳۸۰ھ) کو جمعے کے روز انتقال کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

کوثر نیازی

۱۹۴۸ء میں جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر کی حیثیت سے میں لاہور آیا تو جن حضرات سے تعارف وتعلق کے مواقع میسر آئے ان میں جماعت اسلامی کے بعض افراد بھی شامل تھے۔ ان کی تعداد اس زمانے میں اگرچہ بہت محدود تھی، مگر تھے وہ بڑے متحرک اور مستعد......!

لاہور کی جماعت اسلامی کا چھوٹا سا دفتر تھا جو گوال منڈی کے مین بازار میں ملک نصراللہ خاں عزیز کے اخبار سہ روزہ کوثر کی پرانی بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے بوسیدہ کمرے میں پناہ گزیں تھا، بلکہ اس دور کے لائل پور کے جانگلیوں کی بولی میں "شوہدہ پناہیں" تھا۔ غالباً ضلع لاہور کی جماعت کا دفتر بھی اسی کے ساتھ نتھی تھا۔ وہ وقت ہی ایسا تھا، لوگ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے پناہ گزین (یا پناہ گیر) کی حیثیت سے پاکستان آئے تھے اور کئی کئی خاندان جو ایک دوسرے سے بالکل نا آشنا تھے، ایک ہی مکان میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان حالات میں اگر ایک ہی نوعیت اور ایک ہی نقطہ نظر کے حامل دو دفتر ایک کمرے میں گھس گئے تھے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ بعد کو اسی علاقے میں دفتر کوثر کے بالمقابل جماعت کے دفتر کے لیے ایک الگ مکان کرائے پر لے لیا گیا تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت لاہور کی جماعت کے قیم (یا اس کے دفتر کے نگران) مولوی محی الدین تھے جو پتوکی کے قریب ایک گاؤں "گوہڑ" کے رہنے والے تھے۔ چند افراد کے سوا اس گاؤں کے مکین ارائیں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ محی الدین کا تعلق بھی اسی برادری سے تھا۔

ان دنوں وہ مولانا محمد داؤد غزنوی کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام (واقع شیش محل روڈ) میں علوم عربیہ واسلامیہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہیں ان کا قیام تھا۔ جمعیت اہل حدیث کا دفتر بھی اسی بلڈنگ میں تھا، اس لیے ان سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور پھر بہت جلد یہ ملاقات باہمی دوستی میں بدل گئی تھی۔

محی الدین کو جماعت اسلامی کی طرف سے تیس روپے ماہانہ حق خدمت کے طور پر ملتے تھے۔ مولانا محمد داؤد غزنوی نے بھی دارالعلوم کا کوئی کام ان کے سپرد کر رکھا تھا، تیس روپے وہ دیتے تھے، اس طرح انھیں ساٹھ روپے ماہانہ مل جاتے تھے۔ دو وقت کا کھانا دارالعلوم کے ذمے تھا۔ لیکن محی الدین بڑا دوست نواز، کھلے ہاتھ، کھلے منہ، چھوٹے پیٹ مگر کھلے معدے کا نوجوان تھا، خود بھی کھاتا تھا اور ملنے والوں کو بھی کھلاتا تھا۔ ساتھ

Marfat.com

روپے کا اطلاق اس زمانے میں اچھی خاصی رقم پر ہوتا تھا، مگر محی الدین یہ کھا پی کر چند روز میں ختم کر دیتا تھا اور پھر دوستوں سے ادھار مانگنا شروع کر دیتا تھا۔ جماعت اسلامی کے دفتر کا بھی وہ مقروض ہی رہتا تھا۔ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ ملنسار اور ہنس مکھ۔ خود بھی خوش رہتا اور دوسروں کو بھی خوش رکھتا۔ اس کا شمار جماعت اسلامی سے نکلنے والے دوسرے گروہ میں ہوتا تھا۔ پہلا گروہ جو جماعت سے علیحدہ ہوا مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا سید محمد جعفر پھلواروی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا نذیر الحق میرٹھی اور مستری محمد صدیق وغیرہ حضرات پر مشتمل تھا۔ اس گروہ میں زیادہ تعداد سکے بند علمائے کرام کی تھی۔

جناب مصطفیٰ صادق صاحب کا محی الدین گہرا دوست تھا، اور ان کی کوشش سے اکتوبر یا نومبر ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب میں پاکستان کے سفارت خانے (جدہ) میں ملازم ہو گیا تھا۔ ملازمت اختیار کرنے کے تین چار مہینے بعد ۷۔ جنوری ۱۹۷۶ء کو اس نے ۴۸۔۴۷ سال کی عمر میں جدے میں اچانک وفات پائی اور مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوا۔

نماز جنازہ اس کے مشفق استاد مولانا عبدالغفار حسن نے پڑھائی تھی جو اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے۔

محی الدین کے بارے میں یہاں ایک اور بات بتا دیں، اور وہ یہ کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب میثاق کے نام سے جو ماہانہ رسالہ شائع کر رہے ہیں، اس کا ڈیکلریشن دراصل محی الدین نے اپنے نام سے حاصل کیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ میں نے ۱۹۵۷ء کے آخر میں ایک سہ روزہ اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس میں جو دوست میرے معاون یا مشیر تھے، وہ تھے مولانا محمد صادق خلیل (فیصل آباد)، قاضی محمد اسلم سیف (ماموں کانجن) اور جناب خلیل اثری (چک نمبر ۴۷۹ گ ب تحصیل سمندری)۔ اخبار کے نام کا مسئلہ سامنے آیا تو دو نام زیر غور آئے، منہاج اور میثاق...... اسی اثنا میں ایک دن محی الدین نے مجھ سے کہا کہ وہ ماہانہ رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں، جس کے مدیر و مرتب مولانا امین احسن اصلاحی ہوں گے، تم اس کا کوئی سا نام تجویز کر دو۔ میں نے ان کو یہ دونوں نام بتائے اور کہا کہ ہم منہاج کا ڈیکلریشن حاصل کر لیتے ہیں، آپ میثاق کا کر لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہم نے جنوری ۱۹۵۸ء میں منہاج جاری کیا جو چودہ پندرہ مہینے جاری رہا اور پھر دوستوں کے مشورہ سے اسے بند کر دیا گیا اور میں نے دوبارہ الاعتصام کی ادارت سنبھال لی۔

میثاق کے پبلشر طویل عرصے تک محی الدین رہے اور پھر یہ ذمے داری کسی اور صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ یہ رسالہ بفضل خدا باقاعدگی سے جاری ہے۔ اس زمانے میں میثاق کی لوح پر سن عیسوی نہیں لکھا جاتا تھا، ہجری سن تحریر کیا جاتا تھا، مثلاً شعبان ۱۳۸۲ھ...... اس طرح میثاق کے اصحاب انتظام نے کیلنڈر کی حد

Marfat.com

تک اسے اسلامی بنا لیا تھا۔ اور ہمارا اسلام ہمیشہ اسی قسم کا رہا اور ان شاء اللہ اسی قسم کا رہے گا۔ یعنی کیلنڈری اسلام۔ یا کبھی زیادہ خادم اسلام بننے کا جذبہ ذہن میں ابھرا تو کہیں تقریر کر دی یا اخباروں میں مضمون لکھنا شروع کر دیے اور مطمئن ہوگئے کہ الحمد للہ ہم نے تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کر دیا۔ اس طرح ہم ہمیشہ تقریری، اخباری، زبانی اور کلامی اسلام میں رہے۔ اسلام کے متعلق کوئی چھوٹی بڑی بات یا کلام کرنے والے ہی کو شاید ''متکلم اسلام'' کہا جاتا ہوگا اور اس طرح ہم سب متکلمین اسلام ہیں۔ میرے خیال میں یہی کافی ہے۔ ثواب ہی کمانا ہے، وہ کسی نہ کسی بہانے کما ہی لیا جاتا ہے۔ اسی کا نام غلبہ اسلام کے لیے کوشاں رہنا ہے۔ یا کبھی پوری دنیا کے لوگوں نے کروٹ لی تو کسی پارٹی کے خرچ پر امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ کا عزم کر لیا اور وہاں تقریریں کرنے لگے اور خوش ہوگئے کہ ہم نے گورے لوگوں کو اردو یا پنجابی میں اسلام کے احکام سنا دیے اور وہ ہمارے اسلوب تفہیم اور انداز بیان سے بہت خوش ہوئے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم نے ان لوگوں میں اپنی مادری اور قومی زبان میں اسلام کی اشاعت کی جو اس سے بالکل نابلد تھے۔ بس ہم نے حجت پوری کر دی۔ ماننا یا نہ ماننا ان کا کام ہے۔

بات محی الدین کی ہو رہی تھی اور میں اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے امریکہ اور یورپ کے ملکوں کی طرف دوڑ پڑا، جب کہ جیب میں کرایہ اپنے گاؤں جانے کے لیے بھی نہیں ہے۔

محی الدین کے پاس دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں ایک اور صاحب آیا کرتے تھے، ان کا نام تھا چوہدری عبدالغنی......! وہ بھی ارائیں تھے اور پتوکی کے نواح میں ایک گاؤں ''گہلن'' کے رہنے والے تھے۔ ان کا تعلق ضلع لاہور کی جماعت اسلامی سے تھا۔ میل ملاقات اور بات چیت میں محی الدین سے کافی حد تک مختلف...... وہ تشریف لاتے اور میرا ان سے آمنا سامنا ہو جاتا تو میں نہایت ادب کے ساتھ انھیں سلام عرض کرتا...... یہ سلام دراصل ان سے رحم کی اپیل ہوتی تھی...... وہ جماعت اسلامی کے نہایت محنتی اور فعال کارکن تھے...... بہت سال ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محی الدین پہلے ''کوثری'' کہلاتے تھے، اس لیے کہ تقسیم ملک سے قبل وہ مشرقی پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ میں تعلیم حاصل کرتے رہے تھے، اور جس مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اس کے نام کا ایک جز لفظ کوثر تھا، غالباً پورا نام مدرسہ کوثر العلم تھا۔ لہٰذا وہ خود کو محی الدین کوثری لکھتے تھے۔ پھر جماعت اسلامی سے الگ ہوئے تو ذہن میں آیا کہ اپنی نسبت اسلاف کی طرف کرنی چاہیے، چنانچہ محی الدین سلفی کہلانا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ نسبتاً سلفی ہوگئے۔

اسی زمانے میں صفدر حسن صدیقی، عبدالحمید کھوکھر اور نعیم صدیقی سے تعارف ہوا۔ ان حضرات کا یہ جوانی

Marfat.com

کا زمانہ تھا۔ خوب صورت، دراز قامت اور بڑے متین۔ بچ بچ کر اور تول تول کر الفاظ زبان سے نکالتے تھے۔ جماعت کے یہ سرگرم کارکن تھے۔ نعیم صدیقی کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ ان کو قلم بھی دیا اور زبان بھی دی۔ پھر قلم اور زبان سے انھوں نے جماعت کے نقطہ نظر کے مطابق اس کی بے پناہ خدمت بھی کی۔

ہمارے ہاں رواج کچھ ایسا ہے کہ نئے لوگ سامنے آتے ہیں تو پرانے لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سب جماعتوں میں چلتا ہے۔ پنجابی کی کہاوت ہے۔ ''نویں نویں مت پرانے کیہدے چت۔'' یعنی نئے نئے دوست بنا لیے ہیں، اب پرانے لوگ کسے یاد ہیں۔ لیکن اس کہاوت پر عمل کرنے سے پرانی اور بنیادی تاریخ اور جماعتوں کی تعمیر و تنظیم کے ابتدائی اور اصلی نقوش مٹ جاتے ہیں۔ اسی لیے اس کہاوت کے مقابلے میں سیانے لوگ ''نواں نو دن، پرانا سو دن'' کی کہاوت کو ترجیح دینے کے قائل ہیں۔ بہرحال فقہی زبان میں یہ راجح مرجوح کا مسئلہ ہے۔ پسند اپنی اپنی۔ لیکن ہم پرانے لوگ، پرانے لوگوں کو پسند کرتے ہیں اور انہی کا تذکرہ ہمیں اچھا لگتا ہے۔

اگست ۱۹۴۹ء میں اخبار الاعتصام جاری ہوا اور میں اس سے منسلک ہوا تو جماعت اسلامی کے اور بہت سے حضرات سے تعارف و ملاقات کی راہیں نکلیں۔ ان میں ملک نصر اللہ خاں عزیز کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ملک صاحب سے اگرچہ میں بہت چھوٹا تھا تاہم آہستہ آہستہ ان سے بے تکلفی تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مولانا محمد حنیف ندوی کے بے تکلف دوست تھے، اور جس سے مولانا کی دوستی تھی، اس سے میرے مراسم قائم ہونا لازمی تھا۔

انہی دنوں جماعت اسلامی کے ایک اور صاحب سے تعارف ہوا، جن کے اخلاق و کردار اور بات چیت کا مجھ پر انتہائی اثر پڑا۔ ان کا نام شیخ فقیر حسین تھا اور وہ دراصل مشرقی پنجاب کے شہر کپور تھلہ کے رہنے والے تھے۔ میرے خیال میں جماعت کے کسی خزانچی قسم کے منصب پر فائز تھے۔ ان کے متعلق سنا گیا تھا کہ جماعت کے مال و اسباب میں سے کسی کو کوئی چھوٹی سے چھوٹی شے بھی آسانی سے نہیں دیتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان سے اگر کوئی پینسل مانگتا تو فرماتے تھے کہ مجھے اس بات کا ثبوت ملنا چاہیے کہ آپ کو جو پینسل پہلے دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی ہے، اور ثبوت اس طرح ملے گا کہ اس پینسل کا آخری چھوٹا ٹکڑا مجھے دکھایا جائے۔ چناں چہ وہ ٹکڑا انھیں دکھایا جاتا اور وہ اسے بطور ثبوت اپنے پاس رکھتے تو دوسری پینسل دی جاتی...... معلوم ہوا تھا کہ خود مولانا مودودی کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا، گویا کہ اس سلسلے میں ان کے نزدیک بڑے چھوٹے سب برابر تھے، یعنی مکمل مساوات......! کہتے ہیں مساوات عملاً ہو نہیں سکتی۔ ہو کیوں نہیں سکتی، شیخ فقیر حسین نے کر کے دکھا دی...... اگرچہ اس کا نام پینسلی، قلمی اور کاغذی مساوات ہے، تاہم ہے تو مساوات......!

Marfat.com

بہت سالوں سے جماعت اسلامی کے لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے، اس لیے معلوم نہیں تھا کہ شیخ فقیر حسین کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں...... یہ سطور لکھتے وقت ان کا پتا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اپنے پرانے دوست چوہدری بشیر احمد خاں کو ترجمان القرآن کے دفتر ٹیلی فون کیا، انھوں نے بتایا کہ وہ تو مدت ہوئی وفات پا چکے۔ یہ سن کر بے ساختہ زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون کے الفاظ نکلے اور دیر تک ذہن میں پرانی یادیں گھومتی رہیں۔ ساتھ ہی اپنی بے خبری پر سخت ملامت بھی ہوئی۔

ہم گناہ گاروں کی دعا معلوم نہیں بارگاہ خداوندی میں شرف قبول حاصل کرتی ہے یا نہیں، تاہم ہمارا کام مردوں کے لیے دعا کرنا ہے۔ اس لیے ہم اللہ کے حضور دست بہ دعا ہیں کہ وہ اپنے اس مخلص وامین بندے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ میرے خیال میں وہ صحیح معنوں میں مرد صالح اور مرد فقیر تھے۔ ایسے صاف ستھرے کردار کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

یقیناً ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ کوئی آدمی آیا ہوگا اور بے شک ان کی طرح اس کا تعلق بھی جماعت اسلامی سے ہوگا، اگر کسی مہربان کے ماتھے پر شکن نہ پڑے تو سوال یہ ہے کہ جماعتی چیزوں کی حفاظت اور ان کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں یہ بھی اسی طرح محتاط ہیں، جس طرح وہ تھے...... وہ تو اس معاملے میں بانی جماعت اور امیر جماعت کی بھی پروا نہیں کرتے تھے، کیا اب بھی یہی صورت حال ہے......؟ ایسا تو نہیں کہ ادھر امیر صاحب نے تخت امارت پر بیٹھے تالی بجائی (جسے موجودہ دور میں گھنٹی بجائی کہا جاتا ہے) اور ادھر وہ دوڑتے ہوئے ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوگئے اور سر جھکا کر اور آنکھیں نیچی کر کے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر سراپا ادب بنے ان کے حضور کھڑے ہوگئے کہ سمع وطاعت امیر بھی ضروری ہے، اور وہ اسی انداز قیام کی طالب ہے...... ایسے مواقع ادب پر پیٹ پر ہاتھ رکھنے یا باندھنے کا مطلب درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ پیٹ بڑا پاپی ہے، اس کے لیے سامان ضروریہ کا مہیا کرنا فرائض انسانی میں شامل ہے اور وہ اسی ہیئت کا متقاضی ہے جو وہ بنائے کھڑے ہیں۔

جماعت اسلامی کے جس عہد کی ہم بات کر رہے ہیں، اس عہد کے نوجوان بڑے معتبر بن کر رہتے تھے۔ لباس، بول چال اور رہن سہن میں جماعت کے بانی وسربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا پورا تتبع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ شیروانی، سفید لٹھے کا استری کیا ہوا کھلی موری کا پاجامہ، ٹوپی، داڑھی کی ایک خاص زاویے کے مطابق تراش خراش، پاؤں میں پالش کیے اور چمکتے دمکتے ہوئے موکیشن یا بوٹ...... اسے ان کا یونی فارم کہنا چاہیے۔ ان نوجوانوں کا طرز حیات ہمارے جیسے عام لوگوں سے بہت حد تک مختلف تھا اور دیکھنے والوں کو مرعوب اور متاثر کرتا تھا۔ اردو میں بات کرتے تھے اور ادھر ادھر کے ''کالا لوگ'' سے حتی الامکان اشتراک کلام وسلام سے پرہیز کیا جاتا تھا۔ جماعتوں کے کارکن عوامی ہوتے ہیں، لیکن یہ خواصی تھے اور انھی لوگوں

Marfat.com

سے ہم کلام ہوتے تھے، جنھیں یہ اپنی دانست میں خواص سمجھتے تھے۔ اس زمانے کی جماعت کے ان نوجوانوں کے، جنھیں میں جانتا تھا، چہرے مہرے اب بھی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ تقریباً سبھی میرے ہم عمر تھے۔ اگر چاہوں تو ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ مضمون لکھ سکتا ہوں، جس میں یہ قاری کو ان شاء اللہ اپنی تمام عادات واطوار کے ساتھ سامنے کھڑے یا عمل وحرکت میں مصروف نظر آئیں گے۔

جماعت اسلامی کے اس دور کے اخبار نویس حضرات میں مصطفیٰ صادق، ابوصالح اصلاحی، سعید ملک اور ارشاد احمد حقانی قابل ذکر ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے ارشاد احمد حقانی ان میں سب سے زیادہ سنجیدگی پسند تھے۔ ان دنوں ابوصالح اصلاحی نگینہ بیکری میں زیادہ بیٹھتے تھے جو انارکلی اور نیلا گنبد کے چوک میں ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ وہیں ان سے میرا تعارف ہوا تھا۔ انھوں نے کسی دوست کے ساتھ مل کر جن کا نام غالباً بشیر احمد ارشد تھا، یثرب کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا تھا، جس پر میں نے الاعتصام میں تبصرہ کیا تھا اور اس پر انھوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا تھا۔

سعید ملک تسنیم میں آئے تو بعض مسائل میں ان سے اخباری جھڑپیں بھی ہوئیں۔ ان ''مسائل جھڑپیہ'' میں سے ایک مسئلے کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر مالیر کوٹلہ سے تھا۔ وہاں کی مسجد اہل حدیث کی امامت وخطابت کے معاملے نے مقامی طور پر جھگڑے کی سی شکل اختیار کر لی تھی اور فیصلے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد سے رجوع کیا گیا تھا۔ مولانا نے فیصلہ دیا تھا کہ مسجد اہل حدیث کا خطیب وامام کسی اہل حدیث عالم ہی کو ہونا چاہیے۔ یہ ایک سیدھی سی بات تھی، لیکن سعید ملک نے اس کے خلاف تسنیم میں اداریہ لکھا، اور میں نے الاعتصام میں اس کا جواب دیا۔ اس طرح ایک بحث کی سی صورت ابھر آئی تھی، جس میں جماعت اسلامی کے بعض مقالہ نگاروں نے حصہ لیا تھا اور اہل حدیث حضرات میں سے مولانا محی الدین احمد قصوری نے مولانا آزاد کے فیصلے کو صحیح قرار دیا تھا۔ یہ ۱۹۵۴ء کے اگست اور ستمبر کا واقعہ ہے۔

اس واقعہ سے بہت سال بعد غالباً ۱۹۷۵ء کی بات ہے، میں ایک دن اپنے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) سے گھر جا رہا تھا کہ مصطفیٰ صادق سے ملنے کو جی چاہا۔ ان کے اخبار وفاق کا دفتر اس وقت مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں تھا۔ میں گیا تو وہ حسب معمول بہت اچھی طرح ملے۔ اس اثنا میں انھوں نے کسی سلسلے میں سعید ملک کو (راولپنڈی) ٹیلی فون کیا۔ میں نے بھی ان سے بات کی۔ بیس اکیس برس کے بعد علیک سلیک کا موقع ملا تھا۔ نہایت خوش ہوئے...... وہ بھی ان حضرات میں سے تھے جو جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تھے۔ اللہ بخشے میرے ساتھ ان کا ہمیشہ اخلاص کا برتاؤ رہا۔

چلتے چلتے یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مجیب الرحمٰن شامی سے میری پہلی ملاقات مصطفیٰ صادق کے اخبار

Marfat.com

وفاق کے دفتر (واقع شاہ دین بلڈنگ) ہی میں ہوئی تھی۔ غالباً ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا عہد حکومت تھا۔ شامی صاحب نئے نئے جیل سے رہا ہو کر آئے تھے اور کراری زبان اور دبنگ لہجے میں مصطفیٰ صادق سے اپنی جیل بیتی بیان کر رہے تھے...... ''پہلی ملاقات'' کا لفظ معلوم نہیں زبان قلم سے کیوں ٹپک پڑا۔ دراصل فقہ کی بولی میں یہ پہلی رویت تھی۔ مجھے انھوں نے عینک کے شیشوں میں سے اس طرح دیکھا، جس طرح کسی اجنبی کو دیکھا جاتا ہے، اور تھوڑی دیر بعد بات مکمل ہوئی تو اٹھ کھڑے ہوئے...... جاتے وقت مصطفیٰ صادق سے مصافحہ کیا، میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ تاہم میں مصافحے کے لیے اٹھنا چاہتا تھا، لیکن ہوا یہ کہ اچانک میرے انکسار کی رگ پھڑک اٹھی اور اس نے ایک دم انگڑائی لے کر انانیت کا روپ دھار لیا اور شامی صاحب کے طرزِ عمل کے پیش نظر ہاتھ کو مصافحے کے لیے اٹھنے سے سختی کے ساتھ روک دیا اور تنبیہہ کی کہ یک طرفہ احترام شان تواضع کے منافی ہے اور اس سے فقر کی دولت میں جو ایک ملنگ کی عمر بھر کی کمائی ہے، کمی واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ساتھ ہی ندائے غیب پردۂ سماع سے ٹکرائی، تم پنجابی ہو اور پنجابی کی یہ بات ہمیشہ یاد رکھو۔

جیہڑا تینوں یاد نہیں کردا
توں وی یاد نہ کریا کر

وہ چلے گئے تو مصطفیٰ صادق صاحب نے بتایا، یہ مجیب الرحمٰن شامی تھے۔

ظاہر ہے، اسے ملاقات نہیں کہا جا سکتا، زیادہ سے زیادہ اس پر رویت کا اطلاق ہی ہو سکتا ہے۔ پھر یہاں رویت اور رویت میں بھی فرق پڑے گا۔ میری رویت عینی تھی کہ میں نے ان کو براہ راست بغیر کسی واسطے کے دیکھا تھا، اور شامی صاحب کی رویت عینکی تھی کہ انھوں نے مجھے عینک کی وساطت سے دیکھا تھا۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی شاید نامناسب نہ ہوگا کہ ہمارے ہاں رویت کا اطلاق عدم رویت پر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ عدم رویت پر ہی ہوتا ہے۔ رویت ہلال کمیٹی کو لیجیے، جس سے ہمیں ہر قمری مہینے کی آخری تاریخ کو واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا کوئی رکن نہ چاند دیکھتا ہے اور نہ اللہ کے فضل سے دیکھ سکتا ہے، یعنی عملاً دیکھتا نہیں اور منطق کی اصطلاح میں بالقوۃ دیکھ سکتا نہیں، لیکن اس کے باوجود اسے رویت ہلال کمیٹی کہا جاتا ہے، حالاں کہ اس کا نام ''رویت بدر کمیٹی'' ہونا چاہیے، اس لیے کہ جن حضرات پر یہ کمیٹی عام طور سے مشتمل ہوتی ہے، وہ اگر کوشش فرمائیں تو چودھویں رات کا چاند ہی دیکھ سکتے ہیں، جسے ''بدر'' کہا جاتا ہے۔

یہ تو یوں ہی ایک بات تھی جو مقطع میں آپڑی تھی۔ اب آگے چلیے اور وہی گزارشات سماعت فرمایے، جن کا تعلق سرعنوان سے ہے۔

میرے خیال میں ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ جماعت اسلامی کے ایک اور صاحب سے تعارف ہوا۔ ملک

Marfat.com

نصر اللہ خاں عزیز کے اخبار کـوثـر کا ان دنوں جماعت اسلامی کے حلقوں میں بڑا اثر تھا۔ میں ایک دن اس کے دفتر گیا تو دیکھا کہ ایک نوجوان (بلکہ نوعمر) کوثر کے مینجر محمد شریف قریشی کے پاس بیٹھے ہیں۔ چند منٹ کے بعد وہ ملک صاحب کے پاس آئے اور ایک کاغذ ان کی طرف بڑھایا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا، اور یہ دراصل ان کا ایک چھوٹا سا مضمون تھا جو انھوں نے کوثر کے لیے تحریر کیا تھا اور وہ اسے ملک صاحب کو دکھانا چاہتے تھے۔ ملک صاحب نے وہ کاغذ ان سے پکڑتے ہوئے مجھ سے کہا، یہ کوثر صاحب ہیں، میں چاہتا ہوں، یہ کـوثـر میں کام کریں۔ لمبا قد، جسم تناسب واعتدال کے خوب صورت دائرے کے اندر، نہ فربہ نہ کمزور، سرخی مائل رنگ، کھلے پائنچے کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور شیروانی پہنے اور نظر کی عینک لگائے ہوئے۔ تیکھے نقش، چھوٹی چھوٹی داڑھی، سر پر قراقلی ٹوپی، نرم کلام اور دیکھنے میں نازک اندام۔ یہ ان کی اٹھتی جوانی کا زمانہ تھا۔ ملک نصر اللہ خاں نے بتایا کہ ضلع میانوالی سے ان کا تعلق ہے۔ نام محمد حیات ہے۔ ماشاء اللہ شاعر بھی ہیں اور "کوثر" تخلص کرتے ہیں۔ امید ہے محنت سے کام کریں گے اور ان شاء اللہ ترقی پائیں گے۔ اب ملک صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور انھوں نے خندہ پیشانی سے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

یہ پہلی ملاقات تھی جو کوثر نیازی سے ہوئی۔ ان کا تعارف کراتے ہوئے ملک نصر اللہ خاں عزیز نے جو الفاظ کہے تھے، وہ آگے چل کر حقیقت کے قالب میں ڈھلے۔ کوئی اختلاف کرے یا اتفاق، کوثر نیازی نے بلاشبہ بہت ترقی کی، وہ خانہ غربت سے آئے تھے اور منصب وزارت تک پہنچے۔

کوثر نیازی اگرچہ "ماجھے دی جٹی" نہ تھے، ضلع میانوالی کے پٹھان تھے، تاہم پہلی ملاقات کے وقت ان کا رنگ وروپ دیکھ کر میرے ذہن میں پنجابی کا یہ لوک گیت گھومنے لگا تھا۔

میں ماجھے دی جٹی رنگ میرا سے ورگا

پنجابی میں سیب کو "سے" کہا جاتا ہے۔

کوثر نیازی کا خاندانی اعتبار سے کوئی قابل ذکر پس منظر نہ تھا اور ان کے آباواجداد میں کسی ایسے شخص کا سراغ نہیں ملتا جو علم وعمل کے کسی گوشے میں یا سیاسیات ملکی کے کسی شعبے میں کسی قسم کی شہرت ونا موری کا حامل ہو۔ وہ صرف میٹرک پاس کر کے لاہور آئے تھے اور یہاں آنے سے پہلے اپنے علاقے کے کسی پرائمری سرکاری سکول میں معلم تھے، لیکن اللہ نے بہت جلد ان کے سامنے ترقی کے دروازے کھول دیے اور وہ مختلف میدان ہائے کار میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ابتدا میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف ان کا سرمایہ دینیات تھا مگر چوں کہ مطالعے کے عادی اور جماعت اسلامی کے دیگر حضرات کے برعکس ہر طبقہ فکر کے اہل علم کی کتابیں پڑھنے کے شائق تھے، اس لیے نہایت عجلت کے ساتھ ان کی معلومات کے دائرے بھی وسیع

Marfat.com

ہونے لگے اور مراسم و تعلقات کی حدیں بھی پھیلنے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان منزلوں تک پہنچے جہاں اس سے قبل نہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن پہنچ سکا تھا اور نہ ان کے ہم عمر و معاصرین میں دوسرے مذہبی و دینی حلقوں کے کسی فرد کی وہاں تک رسائی ہوئی تھی۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے اور ان کے عمل و حرکت کے کسی پہلو کی تحسین کسی کو کوئی دنیوی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ فوت شدہ شخص کی تعریف کے سلسلے میں دنیوی نفع و نقصان کو ہرگز پیش نگاہ نہیں رکھنا چاہیے، صرف نبی ﷺ کے اس فرمان کو مدارِ عمل ٹھہرانا چاہیے کہ اپنے مردوں کو اچھے الفاظ میں یاد کرو اور ان کی اچھی باتیں معرض بیان میں لاؤ۔

جماعت اسلامی یوں تو ہمیشہ پڑھے لکھے لوگوں کی جماعت رہی ہے، لیکن جنھیں علمائے دین کہا جاتا ہے اور جن کے لیے ہمارے معاشرے میں مولوی یا مولانا کا لفظ بولا جاتا ہے، ان کی تعداد اس میں ہر دور میں کم رہی، جب کہ ہمارے ہاں لوگوں کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ اسی جماعت کو دین و مذہب اور اسلام کی اصل مبلغ و داعی قرار دیتے ہیں، جس کے ارکان کی زیادہ تعداد علمائے کرام پر مشتمل ہو، اور وہ علمائے کرام عوامی مقرر بھی ہوں جو وعظ و تقریر کے ذریعے سے لوگوں کو اپنے نقطہ نظر سے باخبر اور متاثر کر سکیں، صرف ادھر ادھر کی چند چلتی ہوئی سیاسی باتیں کر کے لوگوں کا گھر پورا کرنے کی کوشش نہ کریں۔

کوثر نیازی جب جماعت سے منسلک ہوئے، اس وقت مولانا مودودی کے سوا، جن حضرات کو مولانا کہا جاتا تھا، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، موجودہ پاکستان یعنی اس وقت کے مغربی پاکستان کی جماعت میں ان کی تعداد صرف پانچ تھی اور اسلام کی ایک مدعی جماعت میں یہ تعداد ظاہر ہے کہ انتہائی محدود تھی، ان علمائے کرام کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ مولانا امین احسن اصلاحی

۲۔ مولانا عبدالغفار

۳۔ مولانا حکیم عبداللہ (روڑی والے)

۴۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف......اور

۵۔ مولانا مسعود عالم ندوی

اب ان حضرات علما کے بارے میں چند الفاظ سنیے۔

مولانا امین احسن اصلاحی بلاشبہ ممتاز عالم دین تھے اور ہیں، لیکن وہ تحریر و نگارش اور تصنیف و تالیف کے عالم ہیں۔ تقریر بھی کر لیتے ہیں اور لوگ ان کی تقریر سنتے بھی ہیں اور متاثر بھی ہوتے ہوں گے۔ لیکن عوام

Marfat.com

سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ وہ عوامی مقرر ہیں اور نہ عوامی مصنف......!

مولانا عبدالغفار حسن علم وحلم اور عمل وکردار کے اعتبار سے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم رجال کی زبان میں کہنا چاہیے کہ آباو اجداد کی طرف سے نسبت عالی کے حامل ہیں۔ خود بھی بہت نیک اور منجھے ہوئے عالم دین ہیں لیکن ان کا اصلی میدان تدریس وتعلیم اور مسائل کی تحقیق وتدقیق ہے۔ اللہ نے ان کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے مگر وعظ وتقریر سے انھیں کوئی خاص علاقہ نہیں۔

مولانا حکیم عبداللہ روڑی والے ایک متقی باپ کے متقی بیٹے تھے۔ ان کے والد گرامی مولوی محمد سلیمان اپنے علاقے میں نہایت اچھی شہرت کے مالک تھے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اور امام ابن قیمؒ کی کتب کے حد درجہ شائق تھے اور اپنے ملنے والے علما کو ان کے مطالعے کی ترغیب دیتے تھے۔ میرے دادا میاں محمد مرحوم سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ مجھے اپنے دادا کے ساتھ دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ مئی ۱۹۴۶ء میں اکیلا بھی ان کی زیارت کے لیے روڑی گیا۔ ان کا علاقہ کچھ ایسا تھا کہ وہاں جانے کے لیے باقاعدہ شد رحال کرنا پڑتا تھا اور میں نے شد رحال کیا تھا۔ وہ خود بھی ہمارے ہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے منڈی جہانیاں کو اپنا مسکن بنا لیا تو وہاں بھی میں ایک مرتبہ ان کو سلام عرض کرنے گیا تھا۔ خود مولانا حکیم عبداللہ میرے مہربان اور مشفق تھے۔ لیکن وہ عوام میں رہنے کے باوجود عوامی واعظ یا مقرر نہ تھے۔ ان کا ایک خاص قسم کا مزاج، خاص قسم کا نہج کلام اور خاص قسم کا طریق تقریر تھا۔ ان دونوں باپ بیٹے پر ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

مولانا حضرات کی اس فہرست میں چوتھا نام مولانا عبدالرحیم اشرف کا ہے۔ وہ بے شک بہت اچھے مقرر تھے۔ عوام وخواص برابر ان کی تقریر سے اثر پذیر ہوتے تھے۔ وہ کئی سال جماعت اسلامی سے وابستہ رہے اور تقریر وتحریر کے ذریعے انھوں نے جماعت کی بہت خدمت کی۔ میری ان سے (اب تک کی) آخری ملاقات فیصل آباد میں ۲۹۔ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ (۲۵۔ مارچ ۱۹۹۳ء) کو مولانا محمد اسحاق چیمہ کے جنازے میں ہوئی تھی۔ بہت کمزور اور معمر ہو گئے ہیں۔ اللہ ان کو صحت وعافیت سے نوازے۔

اب مولانا مسعود عالم ندوی کی طرف آیئے۔ وہ صرف لکھنے پڑھنے اور تصنیف وتالیف کے عالم تھے۔ ان کی زبان میں لکنت تھی، لیکن ان کا قلم لکنت سے پاک تھا اور سطح قرطاس پر تیزی سے دوڑتا تھا۔ انھوں نے جماعت کی طرف سے دارالعروبہ کے نام سے ایک چھوٹا سا ادارہ قائم کیا تھا، جس میں وہ بعض طلبا کو جدید عربی پڑھاتے تھے، لیکن ان سے استفادہ وہی لوگ کر سکتے تھے، جو پہلے سے عربی ادب سے کچھ شناسا ہوتے تھے...... مولانا مسعود عالم ندوی نے ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۴ء کو اچانک کراچی میں وفات پائی۔ ان کے متعلق بھی

Marfat.com

مضمون لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مجھ پر وہ بڑی شفقت فرماتے تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں علمائے کرام یا مولانا حضرات کی تعداد بہت کم تھی اور بہت کم ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے، لیکن اس کا جواب دینا میرے فرائض میں شامل نہیں۔ اس موقعے پر کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کوثر نیازی ان معنوں میں ہرگز مولانا نہیں تھے، جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، بلکہ وہ ''مولانہ'' تھے، لیکن انھوں نے شہرت مولانا کی حیثیت سے پائی اور لفظ مولانا ان کے نام کا جز قرار پا گیا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ ابتدا میں جب وہ اپنی کسی تقریر یا کارروائی سے متعلق کوئی اطلاع اخبارات کو اپنے قلم سے لکھ کر بھیجتے تھے تو اس میں اپنے آپ کو مولانا لکھتے تھے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انھوں نے خود کو مولانا کے طور پر مشہور کیا، اور اس کا فائدہ زیادہ تر جماعت اسلامی کو پہنچا اور اس کے نصب العین اور نقطہ نظر کی تشہیر ہوئی۔

جماعت اسلامی کے رکن یا کارکن کی حیثیت سے مولانا کوثر نیازی کی کچھ اولیات ہیں، جن کا مندرجہ ذیل سطور میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ جماعت میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے میٹرک یا ایف اے کے طالب علموں اور عربی و دینی مدارس کے ابتدائی اور درمیانی درجوں کے طلبا میں تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان طلبا میں مولانا داؤد غزنوی کے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے بعض طلبا بھی شامل تھے، اور ان سرکاری سکولوں کے طلبا میں خود میرا بھائی محمد حسین جو اس وقت میٹرک کا طالب علم تھا، مولانا کوثر نیازی کے جلسوں کا انتظام کرنے والوں میں شامل ہوتا تھا۔ یہ طالب علم اپنی گرہ سے اپنی حیثیت کے مطابق پیسے جمع کر کے جلسے کا انتظام کرتے تھے۔ ان جلسوں کا جماعت کے کسی شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا، لیکن شہرت جماعت کی ہوتی تھی اور یہ جلسے اس کی تقویت کا باعث بنتے تھے۔ ان میں ایک جلسہ جو اس سلسلے کا پہلا جلسہ تھا، چوک رنگ محل میں ہوا تھا۔ اس کے منتظمین میں اس وقت کے مکتبہ ادبستان کے مرحوم مالک اور اس دور کے روزنامہ کوھستان کے جنرل منیجر محمد رفیق ملک کے بیٹے (خالد اور عبدالواحد) بھی شامل تھے۔ دوسرا جلسہ اس سے پندرہ بیس دن بعد پانی والے تالاب میں ہوا تھا۔ ایک جلسہ دہلی دروازے اور لنڈا بازار کے چوک میں منعقد کیا گیا تھا...... یہ جلسے عشا کی نماز کے بعد ہوتے تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ جلسوں کا انتظام کرنے والے طلبا کا جماعت اسلامی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ وہ جلسے ہیں جو مجھے یاد ہیں، ان کے علاوہ بھی یقیناً ہوئے ہوں گے۔

۲۔ مولانا کوثر نیازی جماعت میں واحد اور اولیں شخص تھے، جنھیں بعض مذہبی جماعتوں کے اصحاب انتظام

Marfat.com

اپنے جلسوں میں وعظ وتقریر کے لیے بلاتے تھے، مثلاً شیعہ حضرات ان کو اپنے جلسوں میں دعوت شمولیت دیتے تھے۔ بریلوی حضرات بعض عرسوں کے اجتماعات میں ان سے تقریریں کراتے تھے۔

۳۔ مختلف مقامات پر سیرۃ النبی ﷺ کے بارے میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں بھی مولانا ممدوح کو دعوت شرکت وتقریر دی جاتی تھی۔ جماعت کے اور کسی عالم ومقرر کو نہ اس وقت یہ اعزاز حاصل تھا نہ اب ہے۔

۴۔ اس زمانے میں لاہور میں کوئی ایسی مسجد نہ تھی، جس میں جماعت اسلامی کا کوئی آدمی وعظ وتقریر کر سکتا۔ یہ لوگ مختلف مسجدوں میں مختلف مکاتب فکر کے ائمہ مساجد کی اقتدا میں جمعے کی نماز پڑھتے تھے۔ مولانا کوثر نیازی جماعت میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اپنے ذاتی اثر ورسوخ اور شوق کی بنا پر ایک مسجد میں خطبہ جمعہ دینا شروع کیا۔ یہ مسجد شاہ عالمی مارکیٹ میں واقع ہے، اس لیے ان کے خطبہ جمعہ میں کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے، مقامی بھی اور باہر سے مال تجارت خریدنے کی غرض سے آنے والے تاجر بھی......! میں نے کئی دفعہ اس مسجد میں جمعہ پڑھا اور ان کی تقریر سنی۔ اس وقت اسی علاقے میں ان کے اخبار شہاب کا دفتر تھا۔ جمعے کے بعد ان کے ساتھ دفتر آیا اور تکے کباب وغیرہ کھائے۔ اس قسم کی چٹ پٹی چیزیں کھانے کا اس زمانے میں ان کو بہت شوق تھا۔ اس میں وہ اپنے دوستوں کو بھی دعوت شرکت دیتے تھے۔

۵۔ ایک مرتبہ انھوں نے رمضان المبارک سے چند روز پیشتر مختلف معاشرتی ومذہبی طبقوں سے تعلق رکھنے والے پچاس پچپن افراد کی لوہاری دروازے کے باہر نعمت کدہ ہوٹل میں ایک میٹنگ بلائی، جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ رمضان میں ریل گاڑیوں کے اوقات اس طرح مقرر کیے جائیں کہ سحری اور افطار کے وقت گاڑیاں ایسی جگہ پہنچیں جہاں لوگ آسانی سے سحری اور افطاری کا انتظام کر سکیں، بلکہ فجر اور مغرب کی نمازیں باجماعت ادا کر سکیں۔ اگر ممکن ہو تو ریل میں پانچوں نمازوں کے باجماعت پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک میٹنگ دہلی مسلم ہوٹل میں ہوئی تھی اور حاضرین کی چائے وغیرہ کا انتظام ہوٹل کے ٹھیکیدار (یا منیجر) سردار محمد نے کیا تھا جو لمبے تڑنگے کشمیری جوان تھے اور مولانا کوثر نیازی کے دوست تھے۔ ان دونوں میٹنگوں میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اور میں شریک ہوا تھا۔

۶۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں جماعت اسلامی نے بادشاہی مسجد کے سامنے حضوری باغ میں غلاف کعبہ کی جو نمائش کی تھی اور پھر ریل گاڑی کے ذریعے لوگوں کی ''زیارت'' کے لیے اسے مختلف علاقوں اور شہروں میں لیے پھرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں مولانا کوثر نیازی نے بہت محنت اور تگ وتاز کی تھی، بلکہ اس

Marfat.com

سلسلے کی منصوبہ بندی میں ان کا بڑا دخل تھا...... میں نے اخبار الاعتصام میں اس کی مخالفت کی تھی اور بہت سے علما نے اس حرکت کو غیر شرعی قرار دیا تھا۔

۷۔ عربوں کی حمایت کے لیے انھوں نے ''محبان عرب'' کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی، جس میں ملک کی متعدد سیاسی و دینی جماعتوں کے افراد شامل تھے، مجھے بھی اس میں شامل کیا گیا تھا۔ ملک معراج خالد، مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی کو بھی اس کی میٹنگوں میں بلایا جاتا تھا۔

۸۔ مولانا کوثر نیازی کو جماعت اسلامی میں یہ انفرادیت حاصل تھی کہ وہ تمام مسالک فقہ کے علماے دین سے براہ راست رابطہ رکھتے تھے، علماے کرام کا بھی ان سے تعلق تھا۔ وہ علما کا بے حد احترام کرتے تھے اور بالعموم ہر عالم کو حضرت مولانا کہہ کر پکارتے تھے۔ علما بھی ان کو کم سن ہونے کے باوجود قابل اکرام گردانتے تھے۔

۹۔ مذہبی اور دینی نوعیت کی ان میٹنگوں میں وہ شرکت کرنے کی پوری کوشش کرتے تھے، جن کا تعلق علماے دین سے ہوتا تھا۔ بعض میٹنگوں کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ ان میں مولانا مودودی کو دعوت دی گئی، لیکن وہ خود نہیں آسکے، اپنی جگہ مولانا کوثر نیازی کو بھیجا۔ اس سلسلے کی ایک میٹنگ جس کا تعلق شیعہ سنی کے بعض معاملات سے تھا، مولانا سید داؤد غزنوی نے اپنے ہاں بلائی تھی اور ایک مولانا احمد علی کی مسجد (شیراں والا دروازہ) میں منعقد کی گئی تھی۔ ان میٹنگوں میں میں بھی حاضر تھا۔

۱۰۔ جماعت اسلامی کے اصحاب قلم میں ان کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انھوں نے اہل علم کے بارے میں بھی لکھا، جن کا جماعت سے کبھی تعلق نہیں رہا۔ ان کے علاوہ جماعت کے اہل قلم نے اپنی جماعت کے ارکان و متعلقین کے بارے ہی میں اظہار خیال فرمایا، غیر جماعت کے اصحاب فکر ورائے کے متعلق کچھ تحریر فرمانا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ ملک نصر اللہ خاں عزیز اس سے مستثنیٰ تھے، انھوں نے جماعت سے باہر کے اہل علم کے بارے میں بھی لکھا، اس لیے کہ ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع تھا۔

۱۱۔ وہ جماعت اسلامی کے اولیں اخبار نویس تھے جو اپنے اخبار شہاب میں جماعت کے سوا دوسری دینی اور سیاسی جماعتوں کے جلسہ ہاے عام کی روداد بھی تفصیل کے ساتھ شائع کرتے اور ان جلسوں کا آنکھوں کا دیکھا حال ضبط تحریر میں لاتے تھے۔ لاہور میں منعقد ہونے والے جلسوں کی رپورٹ اس زمانے کے مشہور صحافی حامد مجید لکھتے تھے۔ شہاب کے علاوہ جماعت کے کسی اخبار میں دوسری جماعتوں کے جلسوں کی روداد نہیں شائع ہوتی تھی۔ صرف جماعت کے جلسوں کے بارے میں لکھا جاتا تھا۔

۱۲۔ لاہور میں ٹیلی ویژن آیا تو اس میں درس قرآن کا ایک پروگرام شروع کیا گیا تھا، جس کا عنوان تھا،

Marfat.com

بصیرت......! اس وقت سوموار کو ٹیلی ویژن میں چھٹی کی جاتی تھی، کوئی پروگرام اس دن نشر نہیں ہوتا تھا...... چھ دنوں میں بصیرت پروگرام دو دو دن تین آدمی کرتے تھے، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا کوثر نیازی اور مولانا نصیر الاجتہادی......اس پروگرام کی وجہ سے مولانا کوثر نیازی نے بڑی شہرت پائی اور ان کا نام دور دور تک پہنچا۔

مولانا کوثر نیازی نے جماعت اسلامی کی بہت خدمت کی۔ اس خدمت کے نتیجے میں جہاں وہ خود ابھرے وہاں جماعت کی شہرت کے دائرے بھی وسیع ہوئے، اس لیے کہ وہ جماعت کے رکن تھے، اور ان کی جدوجہد کا اصل مرکز جماعت تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے وہ لاہور کی جماعت کے قیم بھی رہے تھے، جس کے معنی ناظم اعلیٰ یا سیکریٹری جنرل کے تھے...... یا کوئی اور منصبی ذمے داری ان کے سپرد تھی۔

وہ جماعت سے الگ بھی ہوگئے تھے، اور یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ جماعتوں میں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، کوئی کسی وجہ سے الگ ہوگیا اور کوئی شامل ہوگیا۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ جماعت سے علیحدہ ہوئے اور علیحدگی کے بعد انھوں نے جماعت کی شدید مخالفت بھی کی۔ بعض ایسے حضرات بھی ہیں، جنھوں نے مخالفت اور موافقت میں کتابیں لکھیں۔ بعض بزرگ اس درجے توازن کی پٹڑی سے اترے کہ جماعت میں شرکت کی تو جوشِ حمایت میں کتاب لکھ ڈالی اور علیحدگی اختیار فرمائی تو مخالفت میں کتاب تصنیف کرنا ضروری سمجھا، یعنی دونوں صورتوں میں اہلِ کتاب......!

کوثر نیازی نے لاہور آتے ہی جماعتی کاموں میں جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا، اس سے جماعت کے بعض لوگ بڑے متاثر ہوئے تھے، اور اسی تاثر کا نتیجہ تھا کہ ان کی شادی جماعت کے مشہور اور پرانے ارکان عبدالحمید کھوکھر اور حاجی عبدالرشید کی ہمشیرہ سے ہوئی۔ کھوکھر برادران کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ حاجی عبدالرشید کا سوہا بازار میں سونے کے زیورات کا کاروبار تھا، جب کہ عبدالحمید کوئی اور کاربار کرتے تھے۔ اس کے برعکس کوثر نیازی کی مالی حالت بہت کمزور تھی اور ان کی پہلے سے باہم کوئی تھوڑی بہت جان پہچان بھی نہ تھی۔ محض جماعتی انسلاک کی بنا پر رشتہ ہوا تھا۔ غالباً یہ ۱۹۵۳ء کے فروری کی بات ہے۔ وہ تحریک تحفظ ختم نبوت کا زمانہ تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ نکاح سے تھوڑی دیر بعد رات کو پولیس نے انھیں گرفتار کر کے لاہور کی سنٹرل جیل میں بند کر دیا تھا۔ اس پر انھوں نے ایک نظم کہی تھی، جس کا کوئی شعر تو اس وقت ذہن میں نہیں ہے، البتہ نظم دلچسپ تھی۔ یہ نظم انھوں نے جیل میں کہی تھی...... یہاں یہ یاد رہے کہ سنٹرل جیل کو منہدم کر کے اس کی جگہ شادماں کالونی تعمیر کی گئی ہے، جو لاہور کا خوب صورت اور فیشن ایبل علاقہ ہے۔

Marfat.com

جیل میں انھوں نے تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان دنوں معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل سلفی بھی اسی جیل میں تھے۔ کوثر نیازی نے ان سے صحیح بخاری کا کچھ حصہ پڑھا تھا جس کا ذکر وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ وفات سے چند روز پہلے ۲۶۔ رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ (۹۔ مارچ ۱۹۹۴ء) کی افطار پارٹی میں تقریر کرتے ہوئے بھی انھوں نے اس کا ذکر کیا تھا۔

انھوں نے صحافتی زندگی کا آغاز سہ روزہ کوثر سے کیا تھا، لیکن روزنامہ تسنیم میں بھی کام کیا۔ تسنیم کا پہلا دفتر کوثر کے ساتھ گوال منڈی میں تھا۔ پھر نیلا گنبد کے آس پاس کہیں منتقل کر دیا گیا تھا۔ عربک کالج (دہلی) کے سابق پرنسپل عبدالجبار غازی سے (جو اس وقت جماعت اسلامی کے سرگرم رکن تھے اور بعد کو اس سے علیحدہ ہو گئے تھے) میری پہلی ملاقات تسنیم کے اسی دفتر میں ہوئی تھی۔ رات کے نو بجے کا وقت تھا اور میں مولانا داؤد غزنوی کا ایک ضروری پیغام لے کر ان کے پاس گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا دفتر شاہ عالم مارکیٹ میں ممتاز ہوٹل کے قریب ایک بلڈنگ میں چلا گیا تھا۔ دفتر پہلی (اور غالباً دوسری منزل میں بھی تھا) اور مولانا کوثر نیازی کی رہائش اس کی تیسری منزل میں تھی۔ پانی عام طور سے تیسری منزل میں نہیں جاتا تھا، وہ خود ہی نیچے سے بالٹی میں پانی بھر کر اوپر لے جاتے تھے۔ یہ ان کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔
کچھ عرصہ شیخ قمرالدین کے ماہنامہ تعمیر انسانیت کی ادارت بھی وہ کرتے رہے۔ ان کا انداز تحریر عام فہم اور سادہ تھا۔

۱۹۵۹ء میں انھوں نے ہفت روزہ شہاب جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ میں اس سے پیشتر سہ روزہ منہاج جاری کر کے اسے بند بھی کر چکا تھا، (اس کا ذکر گزشتہ سطور میں آچکا ہے) شہاب کے سلسلے میں انھوں نے مجھ سے بات کی تو میں نے کہا جو سرمایہ آپ اخبار پر خرچ کرنا چاہتے ہیں، وہ کسی نیک کام پر خرچ کیجیے۔ بہرحال انھوں نے اور نعیم صدیقی صاحب نے شہاب جاری کرنے کا عزم کیا۔ ایک دن کوثر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ دفتر کے لیے فرنیچر کہاں سے خریدا جائے۔ میں نے کہا یہ آپ کی جیب اور مرضی کا مسئلہ ہے، اس کے لیے انہی کی طرف رجوع کیجیے اور انہی سے مشورہ لیجیے۔ البتہ دو چیزیں میں آپ کی خدمت میں پیش کیے دیتا ہوں۔ ایک بڑی میز جو میں نے منہاج کے لیے خریدی تھی اور ایک کتابت کے لیے تخت، جس پر تین کاتب بیٹھ کر لکھ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں لیتھو کی کتابت ہوتی تھی۔ کاتب لکڑی کے تخت پر بیٹھ جاتا تھا اور تختی کی ٹیک لگا کر کتابت کرتا تھا۔

بہرحال بڑی میز اور ایک تخت میں نے ان کی خدمت میں پیش کیا۔ قیمت پوچھی تو عرض کیا مخلصانہ دعا کی ضرورت ہے۔ یہ ایک معمولی بات تھی، لیکن انھوں نے اسے یاد رکھا اور کئی دفعہ اس کا ذکر کیا۔

Marfat.com

شہاب کچھ عرصے تک بہت اچھا اخبار رہا اور ہفت روزہ اخبارات میں اس نے بڑی شہرت پائی۔ نعیم صدیقی صاحب شہاب سے الگ ہو گئے تھے۔ کیوں الگ ہو گئے تھے؟ یہ معلوم نہیں۔

شہاب میں مستقل لکھنے والوں کی فہرست میں اس دور کے نوجوان صحافی حامد مجید بھی شامل تھے جو عبداللہ بٹ مرحوم کے بھانجے ہیں، اس زمانے میں مولانا کوثر نیازی سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے جو طویل عرصے تک قائم رہے۔

پھر وقت نے کروٹ لی اور مولانا کوثر نیازی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے اور اپنے آپ کو کلیتاً سیاست کے حوالے کر دیا۔ ان دنوں شہاب نے جو رنگ پکڑا اسے دیکھ کر گھن آتی تھی اور اس میں جس قسم کا مواد چھپنے لگا تھا وہ ہر معقول آدمی کے لیے اذیت رساں تھا۔ ایک دن میں نے بطور شکایت اس کا ذکر کیا تو جواب دیا کہ ایک مدت سے وہ اخبار سے الگ تھلگ ہیں۔ جن لوگوں نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے، وہی اس کے ذمے دار ہیں۔

ان کی یہ بات اگرچہ خلاف واقعہ نہ تھی، لیکن جب اخبار پر ان کا نام چھپ رہا تھا تو انھیں اس سے بری الذمہ نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ بہر حال جس نے بھی یہ سلسلہ شروع کیا اور اسے جاری رکھا، اس نے نہایت غلط کام کیا۔ اختلاف کی کچھ حدود ہوتی ہیں، اسے حدود سے باہر لے جانا آداب صحافت کے بھی منافی ہے اور اخلاقی اقدار کے بھی خلاف ہے۔

یحییٰ خاں کے مارشل لا کے زمانے میں ان کو جیل میں بند کر دیا گیا اور ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ پہلے ان کے وکیل میاں محمود علی قصوری تھے، پھر ایک دوسرے قانون دان رضا کاظم صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں۔ میں نے اس زمانے میں ان کو جیل میں چند کتابیں بھجوائیں، جس کا انھوں نے شکریہ ادا کیا...... یہ ان کی عالی ظرفی تھی، ورنہ ہمارے معاشرے میں اکثر لوگ اس قسم کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انھوں نے جیل ہی میں الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ پھر وزیر بھی ہو گئے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں وزیروں، حاکموں اور سرکاری منصب داروں میں میل ملاقات سے بہت گھبراتا ہوں، لیکن مولانا کوثر نیازی سے ان کے زمانہ وزارت میں کئی دفعہ ملنے کا اتفاق ہوا، وہ اسی طرح ملے، جس طرح منصب وزارت پر متمکن ہونے سے قبل ملتے تھے۔ ان کی محبت، پیار اور دوستانہ تعلقات کے جذبے کو وزارت نے مجروح یا متاثر نہیں کیا۔ دوسروں کا معلوم نہیں کیا تجربہ ہے، میرا ان کے بارے میں یہ تجربہ ہے کہ ان کا جو انداز ملاقات وزارت سے پہلے تھا، دور وزارت میں بھی وہی رہا، اس اثنا میں میں نے کبھی ان کی گردن اکڑی ہوئی نہیں دیکھی۔ وزارت سے الگ ہو جانے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اس فقیر پر اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ کسی وزیر یا منصب دار سے کبھی کوئی ذاتی کام نہیں پڑا اور اپنے

Marfat.com

لیے کسی سلسلے میں کسی کے دروازے پر آج تک دستک نہیں دی...... مولانا کوثر نیازی سے تین چار دفعہ تین چار کاموں کے لیے کہا اور وہ کام انھوں نے کر بھی دیے، لیکن وہ میرے یا میرے کسی بھائی یا عزیز کے کام نہ تھے...... ان کاموں میں ایک کام ایک ایسے صاحب کا تھا، جنھیں میں جانتا بھی نہ تھا...... ۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ چونیاں (ضلع قصور) کے ایک گاؤں سے وہ میرے دوست عبدالعلیم خاں کا رقعہ لے کر آئے۔ انھوں نے اپنا نام اسماعیل بتایا، ان کے ساتھ ایک اور شخص تھا، جس کا نام ذہن میں نہیں رہا۔ اسماعیل کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اور ان کی بیوی حج کے لیے جا رہے تھے اور انھوں نے بینک میں روپے جمع بھی کرا دیے تھے۔ ان کا ایک ہی بچہ تھا جو چھ سات سال کا تھا۔ ان کے حج پر جانے کے بعد بچے کی حفاظت اور نگہداشت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ حکومت کی طے شدہ پالیسی کے مطابق سولہ سال سے کم عمر کا بچہ والدین کے ساتھ سفر حج پر نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اسماعیل کی خواہش تھی کہ انھیں بچے کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت مل جائے۔ اس کام کے لیے وہ مجھے حج اور مذہبی امور کے وزیر مولانا کوثر نیازی کے پاس اسلام آباد لے جانا چاہتے تھے۔ مگر میرا جانے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ان سے کہا: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کام خلاف قانون ہے۔ دوسری یہ کہ وزیر سے ملاقات کے لیے پہلے وقت لینا چاہیے۔ وقت لیے بغیر تھانے دار نہیں ملتا، وزیر کیسے ملے گا۔ ہم وہاں جائیں وہ نہ ملیں یا وہاں نہ ہوں تو کتنی کوفت ہوگی۔ مگر اسماعیل اور ان کے ساتھی مصر تھے کہ میں ان کے ساتھ جاؤں...... معلوم نہیں ان کو میرے اور مولانا کوثر نیازی کے تعلقات کے بارے میں کیا بتایا گیا تھا۔ وہ کہتے تھے، ہم آج ہی لاہور سے چل پڑیں اور کل صبح وزیر صاحب سے مل لیں۔ میں نے ان کو ہر چند سمجھانے بلکہ ٹرخانے کی کوشش کی، لیکن وہ نہیں مانے۔

یہ باتیں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں میرے کمرے میں ہو رہی تھیں۔ وہیں اتفاق سے ادارے کے اس وقت کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ تشریف لے آئے۔ وہ کسی سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہماری گفتگو سنی تو مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: آپ چلے جایے، نیک کام ہے، شاید ہو ہی جائے۔ شیخ صاحب کی یہ بات سن کر تو یوں کہیے کہ وہ لوگ شیر ہو گئے اور مزید اصرار کرنے لگے۔ بہرحال اسماعیل اور ان کا ساتھی اور یہ عاجز رات کو گیارہ بجے بس پر سوار ہوئے اور صبح پانچ بجے کے لگ بھگ راولپنڈی پہنچے۔ میں راستے میں یہی دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ ہماری عزت رکھے اور کام ہو جائے۔

میرے صبح کے وقت کے کچھ معمولات ہیں، جن میں ایک معمول یہ ہے کہ روزانہ قرآن مجید پڑھتا ہوں۔ جس دن کسی وجہ سے قرآن نہ پڑھ سکوں تو فکر مند رہتا ہوں کہ خدا جانے آج دن کیسے گزرے گا۔ قارئین کرام اگر اجازت دیں تو عرض کروں کہ ان معاملات کے لیے جو میرے نزدیک اہم ہوں، قرآن کی

Marfat.com

طرف رجوع کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے۔ چناں چہ اس دن بھی مسجد گیا اور قرآن مجید پڑھا۔ اپنے طریقے کے مطابق کچھ پڑھ کر قرآن کھولا تو سورہ کہف کی یہ آیت نکلی۔

﴿یَنْشُرْ لَکُمْ رَبُّکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَیُهَیِّیْٔ لَکُمْ مِّنْ اَمْرِکُمْ مِّرْفَقًا﴾ (الکھف: ۱٦)

یعنی تمھارا پروردگار اپنی رحمت کا سایہ تم پر پھیلا دے گا اور تمھارے اس معاملے کے لیے سارے سروسامان مہیا کر دے گا۔

اب تک مجھے فکر لاحق تھا کہ معلوم نہیں کیا بنے گا۔ یہ آیت پڑھتے ہی یقین ہوگیا کہ جس مقصد کے لیے آئے ہیں، اللہ اس میں کامیابی عطا فرمائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد اخبار خریدا تو پہلے صفحے پر تین کالمی سرخی جمی ہوئی تھی کہ کل مرکزی کابینہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سولہ سال سے کم عمر کے بچے والدین کے ساتھ سفرِ حج پر نہیں جا سکتے۔ یہ خبر اس سے کئی دن پہلے بھی آچکی تھی، آج دوسری دفعہ آئی تھی...... میرے ساتھیوں کو اس خبر سے تشویش ہوئی، لیکن میرا دل مطمئن تھا۔ اس سے پہلے وہ مطمئن تھے، میں مطمئن نہیں تھا...... اب میں مطمئن تھا، وہ مطمئن نہیں رہے تھے۔

وزارت حج و اوقاف اور مذہبی امور کا دفتر اس وقت چک لالہ میں تھا۔ ہم دس بجے کے قریب وہاں پہنچے تو استقبالیہ میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے جو وزیر صاحب سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ ان میں میرے جاننے والے صرف ایک صاحب تھے، اور وہ تھے اردو ڈائجسٹ کے مالک و مدیر جناب الطاف حسین قریشی کے برادر محترم ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی صاحب! انھیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ اس ماحول میں کوئی تو واقف ملا۔ انھوں نے کھڑے ہو کر نہایت احترام سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے استقبالیہ کے اہل کار کو مولانا کوثر نیازی کی خدمت میں پہنچانے کے لیے کارڈ پیش کیا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا:

مولانا آپ کو جانتے ہیں؟

ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔

لیکن میں نے اس سوال کا ان الفاظ میں جواب دیا: جب وہ وزیر نہیں تھے تو وہ بھی مجھے جانتے تھے، میں بھی انھیں جانتا تھا۔ وزیر ہونے کے بعد میں تو انھیں جانتا ہوں، وہ مجھے جانتے ہیں یا نہیں، اس کا پتا آج چلے گا۔

معلوم ہوا کہ کسی عرب ملک کے وفد سے گفتگو ہو رہی ہے۔ دس منٹ کے بعد دفتر استقبالیہ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور متعلقہ اہل کار نے مجھے کہا: مولانا آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ ان کا کمرہ استقبالیہ سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اپنے دونوں رفقا کے ساتھ وہاں پہنچا تو وہ دروازے پر کھڑے تھے۔ نہایت تپاک سے ملے

Marfat.com

اور خیر و عافیت پوچھی۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے بارے میں دریافت کیا اور چند ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر پوچھا: بتائیے کیسے آنا ہوا؟

یہاں میں نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے اور ان کے سوال کے اصل الفاظ بیان نہیں کیے۔ انھوں نے کہا تھا: فرمایئے کیسے تشریف آوری ہوئی؟

میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا اور آمد کا مقصد بیان کیا۔

انھوں نے پوچھا: آج کا اخبار پڑھا ہے؟

میں نے کہا: جی ہاں پڑھا ہے۔

اس کے بعد کہا: ایک درخواست لکھیے کہ بچے کو کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا: ہم میں سے کسی کو پتا نہیں کہ وزیر کو کن الفاظ میں مخاطب کیا جاتا ہے اور کس طرح درخواست لکھی جاتی ہے۔

اس پر وہ مسکرائے اور اپنے سیکرٹری سے کہا کہ ان کے لیے اس مضمون کی درخواست لکھ دیں۔ سیکرٹری نے درخواست لکھ دی اور بچے کے باپ اسماعیل نے اس پر دستخط کر دیے۔

مولانا نے اسماعیل سے پوچھا کہ پہلے پیسے کس بینک میں جمع کرائے ہیں؟ انھوں نے پتوکی کے ایک بینک کا نام لیا۔ مولانا نے درخواست منظور کی اور لکھ دیا کہ بچے کے سفرِ حج کے پیسے فلاں بینک میں جمع کرائے جائیں۔

ہم ان کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے تو جناب ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی صاحب بیٹھے تھے اور ان کو دوسرے دن ملاقات کے لیے وقت دیا گیا تھا۔ ان کے پاس اپنی گاڑی تھی، بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا: میں آپ کے لیے بیٹھا ہوں، مجھے اسلام آباد جانا ہے، اگر آپ میرے ساتھ جانا چاہیں تو گاڑی میں بیٹھیے...... اللہ انھیں خوش رکھے، ہم ان کے ساتھ اسلام آباد گئے۔ مجھے وزارت داخلہ کے ایک صاحب سے ملنا تھا۔

یہ بات ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب تو یقیناً بھول گئے ہوں گے، لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ انھوں نے اس فقیر پر احسان فرمایا تھا۔ اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔ احسان ہر شخص کا یاد رکھنا چاہیے۔ اور میں یاد رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

اسی طرح کا ایک اور دوست کا کام تھا، اس کے لیے اسلام آباد نہیں جانا پڑا تھا، مولانا لاہور آئے، میں ان دوست کو ساتھ لے کر جا کر ان سے ملا اور کام ہو گیا۔

ایک مرتبہ میرے ایک نہایت قابلِ احترام شخص نے اپنا ایک واقعہ سنایا، جس میں وہ حق بجانب تھے اور ان کا خیال تھا کہ مولانا کوثر نیازی اس میں دلچسپی لیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرا

Marfat.com

رقعہ لے جائیں اور ان سے مل لیں، اگر ان کے بس میں ہوا تو وہ آپ کی مدد کریں گے۔ لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ میں نے کہا اگر میرے رقعے پر کام نہ ہوا تو جانے سے بھی نہیں ہوگا۔ آپ رقعہ لے جائیں۔ ان شاء اللہ کام ہو جائے گا۔ چناں چہ وہ رقعہ لے کر گئے اور کام ہو گیا۔

ایک دفعہ ہمارے ایک مشترکہ دوست نے مجھے بتایا کہ مولانا کوثر نیازی نے تمھارے متعلق کہا ہے کہ یہ عجیب آدمی ہے، مجھے دوسروں کے کام کے لیے تو دو ایک مرتبہ کہا ہے، لیکن اپنے کسی ذاتی کام کے لیے کبھی اشارہ تک نہیں کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا کوئی ایسا ذاتی کام ہے ہی نہیں، جس کے لیے ان کو تکلیف دینے کی ضرورت پڑے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کی عادت تھی کہ رات کو ٹیلی ویژن پر اگر کوئی ایسی بات نشر ہوتی جو ان کے نزدیک کسی پہلو سے خاص اہمیت کی حامل ہوتی یا صبح کے اخبار میں اس قسم کی کوئی خبر چھپتی تو دفتر میں مجھ سے پوچھا کرتے کہ رات کی کوئی قابل ذکر یا آج کی اہم خبر کیا ہے؟ اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ میں ان کے سوال کی تہہ کو پہنچ سکا ہوں یا نہیں۔

ایک دن یہی سوال ہوا تو میں نے کہا رات میں نے ٹیلی ویژن دیکھا تھا اور اس کی اہم خبر کل کا مشاعرہ اور جوش ملیح آبادی کی داد تھی...... مولانا مسکرائے اور فرمایا: ٹھیک ہے، آپ سمجھ گئے، یہ لوگ ہیں جو وزیروں سے کام لیتے ہیں۔

بات یہ تھی کہ مولانا کوثر نیازی کے عہد وزارت میں ایک مرتبہ ان کی زیر صدارت کراچی میں مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے میں جوش ملیح آبادی بھی تھے۔ انھوں نے کسی شاعر کو کسی شعر پر داد نہیں دی۔ بس خاموش بیٹھے رہے، لیکن جب مولانا کوثر نیازی پڑھنے لگے تو جوش صاحب کا سر بصورت داد ہلنے لگا اور زبان کلمات تحسین کا ورد کرنے لگی۔ بلاشبہ نیازی صاحب شاعر تھے، لیکن جوش جیسے اونچے درجے کے شاعر کا ان کو اس انداز سے داد دینا ان کی شان سے ہم رنگ نہ تھا...... یہ داد کوثر نیازی کو شاعری کی نہیں دی جا رہی تھی، ان کی وزارت کو دی جا رہی تھی، اور مولانا حنیف ندوی کا مجھ سے رات کی ''کوئی اہم خبر'' پوچھنے سے یہی مطلب تھا۔

۱۹۷۷ء کے شروع کی بات ہے۔ یہ ان کی وزارت کا آخری سال تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جمعرات کا دن تھا، گیارہ بجے کے قریب اسلام آباد سے ان کا ٹیلی فون آیا کہ میرے پاس آپ کی صرف دو کتابیں ہیں، ایک الفہرست (ابن ندیم) کا ترجمہ، دوسری برصغیر پاک وہند میں علم فقہ ان کے علاوہ آپ کی کوئی تصنیف میرے پاس نہیں ہے۔ کیا میں اب آپ کی تصانیف کا حق دار نہیں رہا؟

میں نے جواب دیا میں صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ آپ کے پاس پہنچوں گا اور اب تک کی چھپی ہوئی

Marfat.com

اپنی تمام کتابیں لیتا آؤں گا۔ چنانچہ رات گیارہ بجے لاہور سے روانہ ہوا اور صبح ان کے گھر اسلام آباد پہنچ گیا اور سلسلہ فقہاے ہند کی جتنی جلدیں اس وقت تک چھپی تھیں، ان کو پیش کر دیں۔

انھوں نے ایرانی چائے پلائی اور کہا کہ یہ چائے مجھے شہنشاہ ایران نے دی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ڈلی والا گڑ کھلایا، جس میں گری اور بادام ڈالے گئے تھے، کہا یہ گڑ میانوالی سے آیا ہے۔ اور بھی چند چیزیں کھلائیں۔

اس وقت ان کے پاس چار پانچ آدمی بیٹھے تھے، ان سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں اور پندرہ سال اس جماعت کے ترجمان اخبار الاعتصام کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ اب کئی سال سے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہیں اور وہاں تصنیف وتالیف کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتابیں جواب مجھے دی گئی ہیں، میں ایک دوست سے لے کر پڑھ چکا ہوں، لیکن خریدی اس لیے نہیں کہ انہی سے لینا چاہتا تھا۔ کہا ان کتابوں میں بہت سے بزرگان دین کے حالات لکھے گئے ہیں، ان میں اگر کسی ایسے عالم اور بزرگ کا انھیں پتا چل گیا جو اہل حدیث کے کسی مسئلے پر عامل تھا تو اس کا خاص طور سے ذکر کیا ہے...... پھر کہا یہ جماعت اہل حدیث سے اب اس قسم کا تعلق نہیں رکھتے جو پہلے تھا، لیکن ''چور چوریوں جاندا اے، ہیرا پھیریوں نہیں جاندا۔''

ایک دفعہ ٹیلی فون کیا تو اثنائے گفتگو میں ایک مضمون کا ذکر چھیڑ دیا جو میں نے ایک ماہنامے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھا تھا۔ کہا: میں کراچی سے اسلام آباد کے لیے ہوائی جہاز پر سوار ہوا تو اتفاق سے میری سیٹ پر وہ ماہنامہ پڑا تھا۔ دیکھا تو اس میں مولانا آزاد پر آپ کا مضمون تھا جو میں نے دلچسپی سے پڑھا...... از راہ کرم مضمون کی تعریف کی۔

کئی سال کی بات ہے، وہ جنگ میں مولانا داؤد غزنوی پر مضمون لکھنا چاہتے تھے۔ لاہور آئے تو مجھ سے رابطہ پیدا کیا اور مولانا کے بارے میں چند باتیں پوچھیں اور مضمون لکھا جو پہلے جنگ میں چھپا، پھر ان کی کتاب جنھیں میں نے دیکھا میں منتقل ہوا۔

مولانا علی محمد صمصام جماعت اہل حدیث کے مشہور واعظ اور پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اللہ نے ان کی زبان میں بڑی تاثیر بھری تھی۔ نہایت میٹھے اور پیارے انداز میں وعظ کہتے تھے۔ دراصل ضلع امرتسر کے ایک گاؤں ''کا کڑیالا'' کے رہنے والے تھے۔ آزادیِ وطن کے بعد ضلع لائل پور کی تحصیل جڑاں والا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۹ گ ب میں آبسے تھے۔ یہ گاؤں قصبہ ستیانہ کے قریب ہے۔ مولانا کوثر نیازی سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک دوست کے بتانے پر کہ مولانا کوثر نیازی کا بیٹا فاروق اچانک ایک حادثے میں وفات پا گیا ہے، محض انسانی ہمدردی کی بنا پر مولانا علی محمد صمصام تعزیت کے لیے ان کے گھر اسلام آباد گئے۔ بہت

Marfat.com

سے لوگ بیٹھے تھے، یہ سب سے پچھلی صفت میں بیٹھ گئے۔ سادہ لباس اور دیہاتی وضع قطع۔ نیازی صاحب کی نظران پر پڑی تو ان کے پاس آئے، نام اور پتا پوچھا اور اتنی دور سے تعزیت کے لیے آنے پر شکریہ ادا کیا...... وہ تھوڑی دیر بیٹھے اور چپکے سے اٹھ کر چلے گئے...... اس سے کچھ عرصہ بعد انھیں اطلاع ملی کہ انھیں حاجیوں کے ایک قافلے کا امیر بنا کر حج پر بھیجا جا رہا ہے۔

میرے ایک دوست محمد یٰسین شاد ملتان رہتے ہیں۔ وہ کسی کام سے اسلام آباد گئے تو مولانا کوثر نیازی سے بھی ملے۔ اثنائے گفتگو میرا نام آیا تو شاد صاحب نے ان سے میری ایک کتاب کا ذکر کیا جو مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات میں ارمغان حنیف کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب کوثر نیازی صاحب کو نہیں بھجوائی جا سکی تھی اور اس کا انھیں علم بھی نہیں تھا۔ شاد صاحب کے بتانے پر انھوں نے کتاب طلب کی تو میں نے بذریعہ ڈاک بھجوا دی۔ پانچ چھ دن کے بعد خط آیا کہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ لاہور آؤں گا تو آپ کے دفتر ضرور پہنچوں گا اور باتیں ہوں گی۔ اس سے تیسرے دن بعد ان کا فون آیا کہ میں مال روڈ فیروز سنز کے قریب جبار پیپر ملز کے دفتر میں ٹھہرا ہوں۔ آپ ساڑھے بارہ بجے یہاں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ وقت مقررہ پر وہاں پہنچا تو نہایت مسرت سے ملے۔ ساڑھے تین بجے تک محفل جمی اور مختلف مسائل پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد وہ دو تین مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تشریف لائے اور بہت سی باتیں کیں۔

ایک دن مجھ سے کہا شخصیات پر اپنے مضامین کتابی شکل میں چھاپ دیجیے۔ ان کی حیثیت آنکھوں دیکھے واقعات اور سامنے گزری تاریخ کی ہے۔

وفات سے کچھ عرصہ قبل ایسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل بدل گئے ہیں۔ ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے ان سے ہنسی مذاق کا سلسلہ تو چلتا ہی تھا، لیکن ان کی ذہنی حالت اور قلبی کیفیت کچھ دوسرا رنگ اختیار کر گئی تھی۔ ایک دن انھوں نے بتایا کہ میں اپنی معلومات کی روشنی میں قرآن سے متعلق کام کر رہا ہوں۔ زندگی کے یہ آخری دن ہیں، جی چاہتا ہے ان کا کوئی............ مصرف نکل آئے۔ باتوں باتوں میں موت کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ ان کے طرز کلام سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ موت محمد حیات کے در حیات پر آ کھڑی ہے اور فرشتہ اجل کواڑ کھول کر اندر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مقرر ہونے کے بعد وہ اس کے ارکان کے تقرر کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ بعض جماعتوں کے سربراہوں کے متعلق انھوں نے بتایا کہ وہ ان سے بات نہیں کرتے، براہ راست صدر اور وزیراعظم سے کہتے ہیں کہ ان کے اتنے آدمی کونسل میں شامل کیے جائیں۔

Marfat.com

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ بعض جماعتوں کے سربراہ خود انھیں مجبور کر رہے ہیں کہ ان کے فلاں فلاں آدمیوں کو کونسل کے رکن مقرر کیا جائے ...... یہ باتیں انھوں نے تفصیل سے کیں اور ان تمام جماعتوں اور ان کے سربراہوں کی کوششوں کا الگ الگ تذکرہ کیا۔

ان کا خیال تھا کہ بعض جماعتوں کے زیادہ افراد کونسل میں چلے جائیں گے اور کوئی ایسا کام نہیں کرنے دیں گے، جس کی اس دور میں ملک وقوم کو ضرورت ہے۔

ان سے آخری ملاقات ۲۶۔رمضان المبارک ۱۴۱۴ھ (۹۔مارچ ۱۹۹۴ء) کو ہوئی۔

جمعیت علمائے اہل حدیث پاکستان کی طرف سے لاہور کے انٹرنیشنل ہوٹل میں ان کے اعزاز میں افطاری کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جمعیت کے ناظم اعلیٰ قاضی عبدالقدیر خاموش نے اس دعوت افطار میں بڑی تعداد میں مختلف سیاسی اور دینی جماعتوں کے ارکان کو بلایا تھا۔ مولانا کوثر نیازی نے اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے پرانی یادوں کا تذکرہ کیا۔ دعوت کا اہتمام چوں کہ جماعت اہل حدیث کی طرف سے کیا گیا تھا، اس لیے انھوں نے تقریر میں جماعت کے علمائے کرام کے مرتبہ علمی کے بارے میں چند باتیں کیں۔ مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل اور مولانا محمد حنیف ندوی کی بڑی تعریف کی۔ اپنے پرانے دوستوں اور تعلق داروں میں میرا نام بھی لیا۔ قاضی عبدالقدیر کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں کیا۔ قاضی صاحب نے بھی تقریر میں ان کی تشریف آوری پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

ان کی تقریر کے یہ الفاظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو انھوں نے قاضی عبدالقدیر کی دعوت کے موقعے پر کہے۔

”پہلی زندگی تو جیسے گزری، گزر گئی۔ اب سفینہ ساحل پر آ لگا ہے۔ دلی تمنا ہے کہ اللہ کے دین کی خدمت کے کچھ اسباب پیدا ہو جائیں اور مغفرت کی کوئی صورت نکل آئے۔“

کھانے کے بعد اس دن ایک بات انھوں نے مجھے خاص طور سے کہی، جس کا تعلق مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم سے تھا۔ بات یہ تھی کہ اخبار الاعتصام کے ارباب انتظام مولانا عطاء اللہ حنیف کے حالات وکوائف سے متعلق اخبار کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔ مولانا عطاء اللہ کے صاحب زادے حافظ احمد شاکر صاحب نے ایک دن مجھے کہا کہ میں مولانا سے متعلق مضمون کے لیے مولانا کوثر نیازی سے کہوں۔ غالباً اس کے بعد حافظ صاحب نے خود بھی ان سے مضمون کی درخواست کی...... ۲۶۔رمضان کے افطار ڈنر میں نیازی صاحب نے مجھ سے اس کا ذکر کیا اور کہا آپ مولانا عطاء اللہ صاحب کے بارے میں چند باتیں لکھ کر مجھے بھیج دیں تاکہ میں ان باتوں کو مضمون کی شکل دے سکوں۔

مولانا عطاء اللہ صاحب اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے تھے، اس لیے بھی وہ ان کے بارے میں

Marfat.com

کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کی خواہش کے مطابق چند باتیں لکھ کر بھیجنے کا وعدہ کیا۔لیکن اس سے دوسرے دن لاہور ہی میں ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور وہ اسلام آباد چلے گئے۔ پھر میرے کچھ بھیجنے اور ان کے مضمون لکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

۱۹۔مارچ ۱۹۹۴ء (٦۔شوال ۱۴۱۴ھ) کو ہفتے کے روز دوپہر کے وقت ان کا انتقال ہوگیا۔یعنی ان کے بقول سفینہ ساحل پر آلگا۔انا للہ وانا الیہ راجعون.

وہ اللہ سے مغفرت کے متمنی تھے۔اوران شاءاللہ ان کی مغفرت ہوگئی ہوگی۔زندگی کے آخری چھ سات دن خیروبرکت کی مجلسوں اور ذکرواذکار کی محفلوں میں گزرے۔ہم عاجز بندے اللہ کی رحمت بے پایاں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ان کی مغفرت کا باعث ہوئی ہوں گی۔

اللهم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه.

دنیا اور دنیا داروں کے معاملات بھی عجیب وغریب ہیں۔مولانا کوثر نیازی اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے تو بہت سے لوگ ان کے مدح سرا ہوئے اوراس منصب کے لیے ان کے تقرر کو صحیح قرار دیا...... بالخصوص ان حضرات نے اخباروں میں اونچے سروں میں ان کے حق میں بیان دیے جونظریاتی کونسل کی رکنیت کے خواہاں تھے۔ان بیانات کے پس منظر کو وہ خوب سمجھتے تھے۔ان کی وفات پر ان میں سے کسی نے کوئی تعزیتی بیان نہیں دیا،اس لیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔پنجابی کا ایک لوک گیت اس قسم کے لوگوں کے ذہن وفکر کی خوب ترجمانی کرتا ہے۔

دنیا مطلب دی ویکھی ٹھوک وجا

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

قاضی حبیب الرحمٰن منصور پوری

۱۹۲۶ء کے لگ بھگ حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم نے اپنے آبائی گاؤں ''لکھو کے'' (ضلع فیروز پور، مشرقی پنجاب) سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر سکونت اختیار کر لی تھی۔ اپنے اس مسکن کا نام انھوں نے ''مرکز الاسلام'' رکھا۔ وہاں انھوں نے ایک درس گاہ بھی قائم کی تھی۔ ان کے دونوں صاحب زادے مولانا محی الدین اور معین الدین وہیں تھے۔ ۱۹۴۳ء میں چوہدری غلام حسین تہاڑیہ اور ان سطور کا راقم وہاں خدمت تدریس سرانجام دینے پر مامور تھے۔ چوہدری غلام حسین وہاں کے ایک قریبی گاؤں چک تہاڑیاں کے رہنے والے تھے اور ارائیں برادری کے زمین دار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فیروز پور کے رام سکھ داس (آر۔ایس۔ڈی) کالج سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد وہ محکمہ ریلوے میں ملازم ہو گئے تھے اور گارڈ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ لیکن مرکز الاسلام کے پرکشش ماحول نے ان کو ملازمت چھوڑ کر وہاں کے حلقہ رنداں میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مرکز الاسلام میں ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے لاہور آکر پنجاب یونیورسٹی سے لائبریری سائنس کا کورس کر لیا تھا۔ مختلف مقامات کے کالجوں میں لائبریرین کے طور پر سرکاری ملازمت کرتے رہے۔ آج کل ریٹائرمنٹ کے بعد تلونڈی (ضلع قصور) میں مقیم ہیں اور میرے قدیم مخلص دوستوں کی فہرست میں ان کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے، جب ملاقات ہوتی ہے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

مولانا محمد علی لکھوی مرحوم و مغفور جلیل القدر عالم اور منقولات و معقولات کے ماہر تھے اور ان دنوں مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ ۱۹۴۳ء کے ماہ جون کی کوئی تاریخ تھی کہ دوپہر کے ایک بجے کے قریب شور ہوا: قاضی صاحب تشریف لائے ہیں۔

مولانا محی الدین اور معین الدین دونوں بھائی جلدی سے باہر نکلے۔ میں اور چوہدری غلام حسین بھی ان کے ساتھ گئے۔ دیکھا کہ گورے چٹے، تیکھے نقش و نگار کے ایک صاحب نگاہیں نیچے کیے آرہے ہیں۔ چھوٹی موری کا سفید لٹھے کا پاجامہ اور بادامی رنگ کی ٹھنڈی شیروانی زیب تن۔ پاؤں میں جرابیں اور کالی گرگابی، سر پر پٹیالے شاہی انداز کا سفید عمامہ، لمبی داڑھی جس کے سیاہ بال کم ہیں اور سفید زیادہ، دبلے پتلے، نکلتا ہوا قد اور ہونٹوں پر متانت سے بھرپور ہلکی سی مسکراہٹ۔ ساتھ ایک اور شخص ہے جو وضع قطع اور لباس سے مزدور

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے۔ وہ ان کا بھاری بھرکم ٹین کا بکس سر پر اٹھائے ہوئے ہے۔ سب نے نہایت ادب سے ان کو سلام کیا۔ وہ بھی انتہائی تپاک اور خندہ پیشانی سے ملے اور بغل گیر ہوئے۔ شیشم کے درخت کے سائے میں کھڑے کھڑے دو تین منٹ میں ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھی اور معزز مہمان کو ہمارے کمرے میں لایا گیا۔ وہیں ان کے لیے چارپائی بچھا دی گئی اور موسم کے مطابق بستر لگا دیا گیا۔ شیروانی اتاری تو بالکل دھان پان اور ہڈیوں کا ڈھانچہ۔

مولانا محی الدین نے پوچھا: لسی پئیں گے یا شربت؟

بولے: پہلے تازہ پانی پلایے، پھر گرم گرم چائے کی پیالی لایے۔ سفر کی وجہ سے تکان محسوس ہو رہی ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے فیروز پور ریلوے سٹیشن پر چائے پی تھی، اب پھر طلب ہو رہی ہے۔

جون کا مہینہ، سورج سوا نیزے پر آیا ہوا، دوپہر آفتاب کی حدت سے تپ رہی ہے اور سر سے پاؤں تک پسینے نچڑ رہے ہیں، انتہائی تعجب ہوا کہ یہ عجیب شخص ہیں جو اس ابلتے موسم چائے طلب فرما رہے ہیں۔

ان کے ساتھی سے پوچھا گیا: آپ کیا پئیں گے؟

اس نے جواب دیا: لسی۔!

اس کے لیے لسی کا جگ لایا گیا۔ نمکین لسی کے دو بڑے بڑے گلاس اس نے حلق میں انڈیلے اور چلتا بنا۔ اس شخص کو سامان اٹھانے کے لیے مہمان نے جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے سٹیشن سے پکڑا تھا۔ آٹھ آنے اسے دیے گئے جو اس زمانے میں ڈیڑھ دو فرلانگ تک سامان اٹھا کر لے جانے کی بہت بڑی اجرت تھی۔

یہ مہمان گرامی تھے قاضی حبیب الرحمان منصور پوری۔ سیرت طیبہ کی شہرہ آفاق کتاب رحمۃ للعالمین کے مصنف نام دار حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ کے حقیقی بھتیجے اور قاضی عبدالرحمان منصور پوری (جنھیں وکیل صاحب کہا جاتا تھا) کے فرزند ارجمند۔ یہ فیروز پور سے آنے والی ٹرین سے تشریف لائے تھے جو دن کے ساڑھے بارہ بجے وہاں پہنچتی تھی۔

ان کی زیارت کا شرف اس سے کئی سال پہلے ۱۹۳۷ء کو مرکز الاسلام میں بھی حاصل ہوا تھا اور اپنے وطن کوٹ کپورہ میں بھی ان کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں، لیکن وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ اب ان سے تفصیلی ملاقات اور کھل کر بات چیت کے مواقع میسر آئے۔ ورع و تدین کی بنا پر ان کے حلقہ عزیز داری میں انھیں ''صوفی صاحب'' کہا جاتا تھا۔ اس وقت میرے خیال میں وہ عمر عزیز کی کم و بیش پچاس منزلیں طے کر چکے ہوں گے۔ میں نے ان کو اس جسم و جان میں غور سے دیکھا تو وہ پورے حبیب الرحمان کے بجائے حبیب الرحمان کا ایسا نازک اور جاذب نظر خلاصہ معلوم ہوئے جسے قدرت کے دست حسن آفرین نے نہایت خوب

Marfat.com

صورتی سے انسانی شکل میں ڈھال دیا تھا۔

قاضی صاحب ممدوح نے میٹرک تک تعلیم اپنے وطن پٹیالہ میں حاصل کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''میں نے انٹرنس پٹیالہ میں پاس کیا۔'' ان کا گھر دینی علوم کا گہوارہ تھا۔ یہ علوم انھوں نے گھر ہی میں پڑھے تھے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور آئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہ کالج اس عہد میں ہندوستان بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں کا تعلیمی مرکز تھا اور ریلوے روڈ پر واقع تھا۔ اب بھی وہیں ہے۔ البتہ قیام پاکستان سے کچھ عرصے بعد اس کا ایک حصہ ڈی۔ اے۔ وی کالج (دیانند اینگلوورنیکلر کالج) میں منتقل ہو گیا تھا، جسے اب ''اسلامیہ کالج سول لائن'' کہا جاتا ہے۔

قاضی حبیب الرحمان کے زمانہ تعلیم میں ریلوے روڈ کو ''کیلیاں والی سڑک'' کہا جاتا تھا، اس لیے کہ وہاں کیلوں کے باغ تھے۔ اب بھی لاہور کے پرانے لوگ اسے کیلیاں والی سڑک کہتے ہیں۔ اس دور میں اسلامیہ کالج کے ہوسٹل کا ایک حصہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بارایٹ لا) مرحوم کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) میں تھا۔ قاضی حبیب الرحمان اپنے زمانہ طالب علمی میں اسی ہوسٹل میں رہتے تھے۔ اب اس تاریخی کوٹھی کو مسمار کر کے دکانوں میں بدل دیا گیا ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے مالواڈہ کمپلیکس...... کچھ عرصہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی تعلیم پاتے رہے۔

قاضی صاحب ممدوح کا دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔ تفسیر، حدیث، شروح حدیث، فقہیات، خلافیات، سیرت، تاریخ، رجال، ادبیات وغیرہ ہر موضوع پر بے تکان اور روانی سے گفتگو کرتے تھے۔ قرآن وحدیث اور سیرت کے مختلف مقامات پر مستشرقین اور استشراق زدہ لوگ جو اعتراضات کرتے ہیں، اس پر ان کی اچھی نظر تھی اور جس نہج سے ان کا منہ بند کیا جا سکتا ہے، اس سے بھی وہ آگاہ تھے۔ عیسائی مشنریوں کی اسلام سے متعلق تنقیدات کا علمی اسلوب میں جواب دینا اور انہی کی کتابوں کے حوالے سے ان کی گرفت کرنا، ان کا خاص موضوع تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی اور میرے زمانہ ادارت میں اس ضمن میں الاعتصام میں ان کے مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ تحریر کی متانت اور معلومات کی کثرت کتاب کے بنیادی اجزا ہیں۔ یہ کتاب میاں عبدالمجید مرحوم (سابق ناظم مالیات مرکزی جمعیت اہل حدیث) نے شائع کی تھی۔

عیسائیت سے متعلق قاضی حبیب الرحمان کی دلچسپی کا اصل باعث ان کے لائق صد احترام تایا قاضی محمد سلیمان منصور پوری مرحوم ومغفور تھے۔ اس موضوع پر سلسلہ کلام میں وہ اکثر انہی کے حوالے دیا کرتے اور ان کا ذکر انتہائی تکریم کے لہجے میں کرتے تھے۔ وہ انھیں ''بڑے قاضی صاحب'' یا ''تایا صاحب'' کہا کرتے تھے۔ جب ان کے بارے میں بات شروع ہو جاتی تو ان کے بہت سے واقعات نوک زبان پر آجاتے اور پھر

Marfat.com

انتہائی جذبات محبت وعقیدت کے ساتھ مسلسل سناتے چلے جاتے۔

عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں سے وہ آگاہ تھے۔ قدیم شعرا کے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے۔ بالخصوص فارسی سے کافی شغف تھا۔ غرض وہ کسی موضوع میں بند نہ تھے۔ جس مسئلے میں زبان کو حرکت دیتے، مختلف کتابوں کے حوالوں کی مدد سے پورے اعتماد سے بات کو آگے بڑھاتے چلے جاتے۔ دھیمے لہجے سے گفتگو کا آغاز کرتے اور آخر کلام تک روانی سے یہ سلسلہ جاری رہتا۔ وہ اپنی بات میں دوسرے کی مداخلت برداشت نہ کرتے تھے، نہ عام طور سے اسے بولنے کا موقع دیتے۔ اسلام کے اوامر واحکام کے بارے میں ان کے احساسات نہایت نازک تھے۔ اس کے کسی پہلو سے متعلق کوئی ادنیٰ سی تنقید اور نرم سے نرم لفظوں میں بھی کوئی اعتراض سننا انھیں گوارا نہ تھا۔

جون ۱۹۴۳ء میں جب وہ مرکز الاسلام تشریف لائے مولانا محمد علی لکھوی مرحوم اس وقت مدینہ منورہ میں فروکش تھے۔ البتہ ان کے فرزندان گرامی مولانا محی الدین اور معین الدین وہیں تھے اور یہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ قاضی صاحب اس سے پہلے کئی مرتبہ وہاں جا چکے اور ان کے مہمان رہ چکے تھے۔ مولانا محمد علی کی مہمان نوازی اور ان کے علم وعرفان کی وسعتوں سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے دونوں صاحب زادوں کے اخلاق حسنہ اور عادات واطوار کا بھی ان پر بہت اثر تھا جو ان کے عالی قدر باپ کی تربیت سے ان میں منتقل ہوئے تھے۔ جس شخص کی زندگی کے کسی گوشے سے قاضی حبیب الرحمان اثر پذیر نہ ہوتے، اس کے ہاں چند ثانیوں کا قیام بھی ان کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ اس ضمن میں وہ انتہائی حساس تھے۔ ان کا خاص معیار انتخاب اور انسان کی پرکھ کا اپنا ہی پیمانہ تھا، جو اس پر پورا نہ اترتا، اس سے ہم کلام ہونا پسند نہ کرتے۔

انھوں نے بہت بڑا منصوبہ اپنے ذہن میں یہ بنا رکھا تھا کہ ایک مثالی یونیورسٹی قائم کی جائے گی جو ''اسلامی یونیورسٹی'' ہوگی۔ اس میں ہزاروں کی تعداد میں طلبا کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے اور انھیں ہر زبان اور ہر مضمون کی تعلیم دی جائے گی اور ان کے لیے شان دار ہوسٹل بنائے جائیں گے۔ ہر مضمون اور ہر فن کے مشہور وماہر اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ کچھ استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے، کچھ جامعہ ملیہ دہلی سے، کچھ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے، کچھ ندوۃ العلما لکھنؤ سے، کچھ دارالعلوم دیوبند سے اور کچھ ہندوستان کے مختلف مدارس اہل حدیث سے لیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ کوشش کی جائے گی کہ جامعہ ازہر (قاہرہ) اور بعض دیگر اسلامی ملکوں کے سربراہوں اور ماہرین تعلیم سے رابطہ کر کے وہاں کے ممتاز اساتذہ کی خدمات مستعار لی جائیں۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اساتذہ کے قیام کے لیے ان کے مقام ومرتبے کے مطابق یونیورسٹی کیمپس میں الگ الگ بنگلے تعمیر کیے جائیں گے اور اس یونیورسٹی کا ایک وائس

Marfat.com

چانسلر اور ایک چانسلر ہوگا۔

وہ نہایت سنجیدگی سے کہا کرتے تھے کہ ہماری یونیورسٹی سے ملحق کالجوں کا پورے ہندوستان میں ایک جال بچھا دیا جائے گا۔ ان کالجوں میں اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ حضرات کو پرنسپل اور پروفیسر مقرر کیا جائے گا۔ مختلف ملکوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اسی یونیورسٹی اور انھی کالجوں کے فارغ التحصیل لوگوں کو بھیجا جائے گا۔ اس لیے کہ وہ یہاں سے تعلیم و تربیت حاصل کر کے بہترین مبلغ اور مقرر ہو چکے ہوں گے۔

اس مجوزہ ذہنی یونیورسٹی کے قیام کے لیے رہ رہ کر ان کی نگاہ انتخاب مرکز الاسلام پر پڑتی تھی۔ ان کے خیال میں ابتدائی تعلیم کا سلسلہ وہاں جاری تھا ہی۔ دو مربعے زمین بھی تھی اور مزید زمین حاصل کرنے کے امکانات بھی تھے۔ بس ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں سے پروفیسروں کو بلوا کر اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا باقی تھا، اور یہ ان کے نزدیک کوئی مشکل کام نہ تھا۔ اگر اس کے لیے ان سے سرمائے کی بات کی جاتی تو جواب دیتے، اتنا سرمایہ جمع کرنا کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ملک میں بہت سے سرمایہ دار موجود ہیں۔ کام کا منصوبہ بن جائے اور اس پر عمل شروع ہو جائے تو سرمایہ دار خود ہی سرمایہ دینے لگیں گے۔ ان کے بچے بھی تو آخر اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کریں گے، وہ والدین کو سرمایہ دینے پر مجبور کریں گے۔

اس یونیورسٹی کے قیام کے بارے میں وہ اپنے دل میں اس درجہ جذبہ صادقہ رکھتے تھے اور اس قدر بے تاب رہتے تھے کہ ہر شخص سے اس کا تذکرہ فرماتے اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے صاف لفظوں میں اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے۔ اس نواح کے ایک گاؤں میں ایک شخص نور محمد رکوال رہتے تھے، ہم سے وہ مخلصانہ تعلق رکھتے تھے۔ چوہدری قسم کے آدمی تھے اور بہت ملن سار...... سنا ہے چند سال پیشتر انھوں نے حج بیت اللہ کیا اور اس کے بعد حجرہ شاہ مقیم (ضلع اوکاڑہ) میں انتقال کر گئے۔ اللہ مغفرت کرے، بڑے پیارے آدمی تھے۔

نور محمد کی مرکز الاسلام میں کافی آمد و رفت تھی۔ ایک دن ہم نے دیکھا کہ قاضی صاحب ان سے محوِ گفتگو ہیں اور یونیورسٹی کے منصوبے کا ذکر کر رہے ہیں۔ پہلے تو ان کو یونیورسٹی کا مطلب سمجھایا۔ پھر اثنائے گفتگو میں کہا کہ جب تک یونیورسٹی کے طلبا کے لیے کمرے تعمیر نہیں ہو جاتے، ہم ان کے لیے عارضی طور پر کھس کی ٹٹیاں بنا دیں گے اور ایک طالب علم کو ایک ایک ٹٹی دے دیں گے۔

قاضی صاحب اردو میں گفتگو کر رہے تھے، نور محمد بے چارے ان پڑھ تھے، وہ ان سے پنجابی میں بات کرتے تھے۔ وہ ''ٹٹی'' کا مطلب بیت الخلا سمجھے۔ بولے: قاضی صاحب! یہ کھلی جگہ ہے، چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے، یہاں ٹٹیاں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

قاضی صاحب نے فرمایا: ٹٹیاں نہیں بنائیں گے تو طالب علم رہیں گے کہاں؟

Marfat.com

نور محمد نے قاضی صاحب کے اس سوال کا بصورت سوال ہی جواب دیا کہ طالب علم کیا ولایت سے پڑھنے کے لیے یہاں آئیں گے؟ یہ جنگل ان کے لیے کافی نہیں ہے؟ ٹٹیاں نہ بنیں گی تو انھیں قبض ہو جائے گا؟

پھر کہا: طالب علم ٹٹیوں میں کیسے رہیں گے؟ غلاظت میں انھیں بدبو نہ آئے گی؟ نور محمد کے اس سوالیہ جواب سے قاضی صاحب کے چہرے پر خفگی کے آثار ابھر آئے، مگر انھوں نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے نہایت آرام سے فرمایا: بھائی نور محمد! ان کے لیے ٹٹیاں بنانا ضروری ہے۔ اس پر ہمارا کیا خرچ ہوگا۔ ایک ایک طالب علم کے لیے ایک ایک ٹٹی بن جائے گی۔ سرکنڈا یہاں عام ہے، کاٹ کر بنا دیں گے۔

نور محمد نے مسکراتے ہوئے کہا: حضور! آپ میری بات نہیں سمجھے، میں کہتا ہوں سرکنڈا کاٹ کر جو ٹٹیاں بنائیں گے، کیوں نہ طالب علم اس کی اوٹ میں بیٹھ کر ٹٹی کر لیا کریں۔

یہ دلچسپ بحث کافی دیر جاری رہی اور ہم محظوظ ہوتے رہے۔ نہ قاضی صاحب نور محمد کی بات سمجھے، نہ نور محمد قاضی صاحب کی۔ آخر نور محمد نے ہتھیار ڈال دیے اور کہا:

میرے خیال میں تو اس جنگل میں ٹٹیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آگے جو آپ کی مرضی۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، ٹٹیاں ضروری ہیں تو بنا لیجیے۔

قاضی صاحب تقریباً دو مہینے وہاں رہے، لیکن افسوس کہ ان کے منصوبے پر عمل نہ ہو سکا۔

اس کے بعد وہ ادھر ادھر کے چکر کاٹتے ہوئے اپنے بہت ہی قریبی عزیزوں کے ایک گاؤں ''بڈھیمال'' تشریف لے گئے جو علما کا گاؤں تھا اور ضلع فیروز پور کی تحصیل ''مکتسر'' میں واقع تھا۔ ان کے ننھیال کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہاں کے لوگ تحصیل جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۶ گ ب میں منتقل ہو گئے تھے جو ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب سے بارہ تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔

بڈھیمال کے باشندوں سے بھی قاضی صاحب نے یونیورسٹی کا منصوبہ بیان کیا۔ وہ لوگ اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے اور آپس میں رشتے دار تھے۔ تمام زمین بنجر تھی اور ریت کے اونچے اونچے ٹیلے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں آندھی آتی تو چلنا پھرنا اور ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آندھی کے تیز جھکڑ پیدل چلنے والے کے پاؤں زمین پر نہ جمنے دیتے اور اسے دھکیلتے چلے جاتے۔ بہر حال وہاں کے نمبردار محمد سلیمان مرحوم نے قاضی صاحب کی دیرینہ خواہش پوری کر دی اور اپنی زمین کا ایک قطعہ ان کے حوالے کر دیا۔

اب قاضی صاحب نے اپنے اس ''یونیورسٹی کیمپس'' میں پانی کا نلکا لگوایا اور صفیں بچھا دیں، جنھیں کلاس رومز کہنا چاہیے۔ پڑھانے کے لیے دو استادوں کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ گاؤں کے سب لڑکوں اور ان پڑھوں کے نام ''یونیورسٹی'' میں باقاعدہ روزانہ حاضر ہونے اور علم حاصل کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ یوں

Marfat.com

سمجھیے کہ جبری تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا اور لوگ دیکھتے تھے کہ ہر لڑکا تختی ہاتھ میں پکڑے اور بستہ گلے میں لٹکائے یونیورسٹی کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ پورے کیمپس میں کوئی کمرہ یا مکان تعمیر نہیں کیا گیا تھا، کھلی فضا میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس اعتبار سے کہنا چاہیے کہ وہ ''قاضی حبیب الرحمان اوپن یونیورسٹی'' تھی۔ دن بھر قاضی صاحب (یعنی وائس چانسلر یا چانسلر صاحب) وہاں رہتے اور دو عدد اساتذہ کی (جنھیں یونیورسٹی بولی میں پروفیسر کہنا چاہیے) اور تیس بتیس طلبا کی نگرانی کرتے۔ رات کو گاؤں تشریف لے جاتے جو آدھ فرلانگ پر تھا۔ اپنی کامیابی پر جو طویل جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی تھی، وہ نہایت شاداں و فرحاں تھے۔

ایک دن غروب آفتاب سے کچھ پہلے قاضی صاحب اپنی اس اوپن یونیورسٹی میں تنہا تشریف فرما تھے کہ ناگہاں اس زور کی آندھی آئی کہ ان کے لیے اس کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ آندھی نے آناً فاناً ان کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور جدھر کا رخ کیا، ساتھ ساتھ اڑاتی چلی گئی۔ دبلے پتلے منحنی سے آدمی تھے، اڑتے اڑتے ایک گاؤں کی (جس کا نام غالباً ''باجا'' تھا) دیوار کے ساتھ جا لگے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا کہ راستے میں کنویں یا پانی کے جوہڑ جیسا کوئی خطرناک مقام نہیں آیا، سیدھے ایک مکان کی دیوار کے ساتھ جا ٹیک لگی۔

آندھی کی شدت کو دیکھ کر بڈھیمال کے چند نوجوان قاضی صاحب کو لینے کے لیے ''یونیورسٹی'' پہنچے۔ آندھی نے صورت حال کچھ ایسی بنا دی تھی کہ اگر وہاں نلکا نہ ہوتا تو یونیورسٹی کا محل وقوع تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔ نلکے کی نشانی سے یونیورسٹی کا سراغ لگایا گیا۔ دیکھا تو صفیں یعنی کلاس روم اڑ چکے ہیں اور قاضی صاحب غائب ہیں۔ تلاش کرنے والے سخت پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔

آندھی کا زور کچھ کم ہوا تو مالک مکان باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی دیوار کے ساتھ کھڑا ہے۔ پہلے تو اسے شبہ ہوا کہ چور ہے جو آندھی سے فائدہ اٹھا کر چوری کرنا چاہتا ہے۔ پھر قریب آ کر دیکھا تو قاضی صاحب کو پہچان لیا، کیوں کہ ان کی یونیورسٹی اس کے گاؤں کے راستے میں پڑتی تھی اور وہاں سے گزرتا ہوا وہ کئی مرتبہ انھیں دیکھ چکا اور آتے جاتے متعدد بار یونیورسٹی کے نلکے سے پانی پی چکا تھا۔ اس طرح وہ اگرچہ قاضی صاحب کا نمک خوار نہ تھا مگر ان کا ''آب نوش'' ضرور تھا۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گیا، چارپائی پر بٹھایا، گرد و غبار جھاڑی، کپڑے صاف کیے اور ہاتھ منہ دھلائے، پانی پلایا اور ان کے طلب کرنے پر چائے پیش کی۔ اس کے بعد ان کو ساتھ لے کر بڈھیمال کو روانہ ہوا۔ کچھ آگے بڑھے تو بڈھیمال کے چند نوجوان مل گئے جو ان کی تلاش میں نکلے تھے اور ادھر کو جا رہے تھے۔

یہاں یہ بتاتے چلیں کہ قاضی حبیب الرحمان صاحب نے اس یونیورسٹی کا نام ''جامعہ سلیمانیہ'' رکھا تھا۔ اس سے ان کی مراد تو اپنے تایا قاضی سلیمان منصور پوری تھے، لیکن وہ بطور مزاح مسکراتے ہوئے فرمایا کرتے

Marfat.com

تھے کہ میں یہاں سید سلیمان ندوی کو بلاؤں گا تو وہ سمجھیں گے کہ ''جامعہ سلیمانیہ'' ان کی طرف منسوب ہے۔ ایک نہایت متقی بزرگ مولانا صوفی محمد سلیمان (روڑی والے) تھے جو بہت سی طبی کتابوں کے مصنف مولانا حکیم عبداللہ روڑی والے کے والد محترم تھے، انھیں وہ جامعہ سلیمانیہ میں تشریف لانے کی دعوت دیں گے تو وہ خیال فرمائیں گے کہ یونیورسٹی کا یہ نام ان کے نام پر رکھا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے لیے زمین دینے والے محمد سلیمان نمبردار سمجھتے ہوں گے کہ اس کا انتساب ان کی طرف ہے۔

جامعہ سلیمانیہ کے اس گاؤں کے طلبا میں ہمارے عزیز دوست قاضی محمد اسلم سیف کا اسم گرامی بھی شامل ہے جو خیر سے اب دارالعلوم تعلیم الاسلام (ماموں کانجن ضلع فیصل آباد) کے ناظم اور اس کے ماہنامے تعلیم الاسلام کے مدیر ہیں۔ اس تاریخی آندھی کے بعد جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا، قاضی صاحب نے ''یونیورسٹی'' میں ایک چھوٹا سا کچا کمرہ تعمیر کرا لیا تھا جسے ''وائس چانسلر ہاؤس'' کہنا چاہیے۔ قاضی صاحب کی چارپائی، بستر اور ضروری سامان وغیرہ اسی کمرے میں تھا۔ ایک دن قاضی صاحب نے اندر پڑی ہوئی چارپائی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے یونیورسٹی کے بعض طلبا سے فرمایا: ''چارپائی باہر نکالو'' ......اس پر طلبا نے ایک دوسرے سے کہا: آئندہ یاد رکھنا ''منجی'' کو چارپائی کہتے ہیں۔ چارپائی باہر نکالی گئی تو قاضی صاحب نے ''جامعہ سلیمانیہ'' کے طالب علم محمد اسلم سیف کو حکم دیا کہ ''اندر سے تکیہ لاؤ۔''

وہ فوراً اندر گئے اور ایک کتاب جو قاضی صاحب کے زیر مطالعہ تھی، اٹھا لائے۔ قاضی صاحب نے فرمایا: ''میں نے تکیہ مانگا ہے؟''

اب سعادت مند شاگرد نے اندر جا کر کتاب رکھ دی اور اس کے بجائے ہاتھ میں چھتری پکڑی اور نہایت ادب سے قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کر دی۔

قاضی صاحب نے فرمایا: ''تم نے سنا نہیں، میں نے تکیہ لانے کو کہا ہے۔''

لائق شاگرد نے پھر تعمیل ارشاد کی، اور کمرے میں جا کر دیکھا کہ کونے میں قاضی صاحب کا ایک بڑا سا بکس پڑا ہے جو ان کے ضروری کاغذوں، مسودوں اور کپڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہونہار طالب علم نے اسے پورے زور سے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور قاضی صاحب کے سامنے لا رکھا۔

قاضی صاحب نے بکس دیکھا تو فرمایا: ''یہ کیا لے آئے ہو؟ بھائی! میں نے تکیہ کہا ہے جسے تم سرہانہ کہتے ہو۔''

خدمت گزار طالب علم محمد اسلم سیف نے عرض کیا: پہلے ہی کہہ دیتے کہ سرہانہ لاؤ۔ خود اتنا کھپنے اور مجھے کھپانے کی کیا ضرورت تھی۔

اس سے کچھ عرصے بعد ملک آزاد ہو گیا، پاکستان معرض وجود میں آ گیا اور قاضی حبیب الرحمان کی جامعہ

Marfat.com

سلیمانیہ ختم ہوگئی۔ یوں سمجھیے کہ آزادی کی خیر میں ''شر'' کا پہلو یہ تھا کہ قاضی حبیب الرحمان کی یونیورسٹی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔

قیام پاکستان کے بعد قاضی حبیب الرحمان کے عزیز واقارب اور دوست احباب مختلف مقامات میں بکھر گئے اور خود قاضی صاحب نے اپنے بعض متعلقین کے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا اصل سرمایہ ان کی کتابیں تھیں جو مختلف موضوعات پر مشتمل تھیں اور اچھی خاصی تعداد میں تھیں، لیکن یہ بھی ایک جگہ نہ تھیں۔ کچھ تو ان کے آبائی وطن پٹیالہ میں رہ گئی تھیں اور کچھ مغربی پنجاب کے بعض مقامات میں پہنچ گئی تھیں۔ ایک بکس کہیں تھا، دو کہیں اور تین کہیں۔

ڈیرہ غازی خاں میں کوئی شخص ان کا ہم ذوق نہ تھا، ویسے بھی وہ افراتفری کا دور تھا۔ ان کی اولاد ایک بیٹے اور ایک بیٹی پر مشتمل تھی۔ بیٹے کا نام قاضی رضی الرحمان اور بیٹی کا سلمہ تھا۔ رضی الرحمان ملازمت کے سلسلے میں واہ کینٹ چلے گئے تھے اور سلمہ (ریٹائرڈ) جنرل غلام عمر کی اہلیہ ہیں۔ یہ وہیں رہتی تھیں جہاں ان کے شوہر رہتے تھے۔ آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ یہ وہی جنرل غلام عمر ہیں، جنھیں ۱۹۷۱ء میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے مسند اقتدار پر بیٹھتے ہی چند دیگر فوجی افسروں کے ساتھ ان کے منصب سے علیحدہ کر دیا تھا۔

۸۔ دسمبر ۱۹۴۸ء کو میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور آ گیا۔ مرکزی جمعیت کا دفتر اس زمانے میں شیش محل روڈ پر دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں تھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ قاضی حبیب الرحمان تشریف لائے ہیں۔ نہایت ادب سے سلام عرض کیا۔ انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی، وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ کئی دن وہ میرے پاس رہے۔ لاہور میں اپنے ان دوستوں سے ملے جو پٹیالہ اور ہندوستان کے دیگر مقامات سے یہاں آئے تھے یا پہلے سے لاہور کے رہنے والے تھے، لیکن چند روز بعد قاضی صاحب کہیں چلے گئے۔ دو تین ماہ کے بعد پھر تشریف لائے۔ شیش محل روڈ پر میرے پاس اقامت گزیں رہے اور پندرہ بیس دن کے بعد غائب ہوگئے۔

۱۹۔ اگست ۱۹۴۹ء کو مولانا محمد حنیف ندوی کی ادارت میں گوجراں والا سے ہفت روزہ الاعتصام جاری ہوا۔ اس کے اجرا سے تھوڑا عرصہ بعد معاون مدیر کی حیثیت سے مجھے بھی اس سے منسلک کر دیا گیا۔ ۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے۔ الاعتصام کا دفتر گوجراں والا سے لاہور (شیش محل روڈ پر) منتقل ہوگیا اور اس کی ادارت میرے سپرد کر دی گئی۔ ایک دن میں اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار کے لیے اداریہ لکھ رہا تھا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور ''السلام علیکم'' کی آواز پردہ سماع سے ٹکرائی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے قاضی حبیب الرحمان کھڑے تھے۔ میں جلدی سے اٹھا اور جھک کر دونوں ہاتھ ان

Marfat.com

کے ہاتھوں میں دے دیے اور نہایت احترام سے عرض کیا: تشریف رکھیے۔

وہ میرے مہربان اور مشفق تھے۔ ان کی عادت تھی کہ جب تشریف لاتے، چائے کا ایک چھوٹا بند ڈبہ لے کر آتے۔ چائے وہ بار بار پیتے تھے، لیکن ایک نشست میں ایک پیالی سے زیادہ نہیں پیتے تھے۔ میں نے ان کے لیے چائے منگوانا چاہی تو فرمایا میرے سامان میں چائے کا ایک ڈبہ پڑا ہے۔ بہت اچھی چائے لایا ہوں، کسی سے کہو، یہیں چائے بنائے اور اسی ڈبے سے بنائے۔ ایک پیالی تمھارے لیے اور ایک میرے لیے، وہ خود بھی پینا چاہے تو اپنے لیے بھی بنا لے۔ میں نے دفتر میں سٹو و رکھا تھا۔ دفتر کے ایک شخص کو چائے بنانے کے لیے کہا۔ چائے تیار ہو کر آئی تو قاضی صاحب چائے بھی پی رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی تعریف بھی کرتے جا رہے ہیں۔ دیکھو اس کا رنگ کیسا اچھا ہے، اس کی خوشبو کتنی اچھی ہے اور یہ نہایت عمدہ چائے ہے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں پھر چائے کی طلب ہوئی۔ پھر بنائی گئی۔ اس کے بعد پھر بنائی گئی۔ پھر بنائی گئی۔ اور وہ ڈبہ شام تک ختم ہو گیا۔

انھیں بازار میں اگر کوئی ایسا کام ہوتا، جس میں دوسرے کی مدد ان کے نزدیک ضروری ہوتی تو اس کو ساتھ لے جانے پر اصرار فرماتے۔ اسے اپنا بھی کوئی کام ہے یا نہیں، اس کی انھیں پروا نہ ہوتی۔ ایک دن فرمایا کہ میری کتابوں سے بھرے ہوئے تین بکس جہانیاں منڈی پڑے ہیں، دو اوکاڑے میں ہیں، چار ڈیرہ غازی خاں میں ہیں، اتنے فلاں شہر میں ہیں اور اتنے فلاں شہر میں۔ یہ تمام بکس بغیر تالوں کے ہیں۔ میرے ساتھ چلو، انارکلی سے ان کے لیے دس پندرہ تالے خرید کر لائیں۔

عرض کیا: جہاں جہاں بکس پڑے ہیں، وہیں سے تالے خرید لیے ہوتے۔

فرمایا: مجھے لاہور جو آنا تھا، سوچا کہ وہیں سے خرید لیں گے۔ انارکلی سے ایک روڈ کو گھومتے ہوئے بائیں جانب نکڑ پر جو دکان ہے، وہاں بہت مضبوط اور اچھے تالے ملتے ہیں اور کچھ سستے بھی ہوتے ہیں، وہاں چلیں اور تالے خرید کر لائیں۔

میں اس وقت الاعتصام کے لیے اداریہ لکھ رہا تھا۔ ہر چند معذرت کی اور اپنی مجبوری اور مصروفیت کا ذکر کیا لیکن قاضی صاحب نہیں مانے۔ فرمایا: اداریہ تو پھر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ نہ کہہ سکا کہ تالے بھی تو پھر کسی وقت لائے جا سکتے ہیں۔ بہرحال میں نے اپنا کام چھوڑا اور قاضی صاحب کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

چلنے لگے تو فرمایا: پہلے چائے منگواؤ، پی کر چلیں گے۔ چائے منگوائی گئی، وہ آہستہ آہستہ چائے پیتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ چائے پینے میں لگائے۔ ابھی چند قدم چلے تھے اور شیش محل روڈ سے باہر نہیں نکلے تھے کہ ایک چائے خانے کے سامنے جا کر قدم روک لیے۔ فرمایا: پہلی چائے سے تسلی نہیں ہوئی، یہاں ایک پیالی چائے پی لیں۔

وہ چیونٹی کی چال چلتے تھے۔ بھاٹی دروازے آئے تو ارشاد ہوا، ایک پیالی چائے پینے کو جی چاہتا ہے۔

Marfat.com

ایک پیالی پینے میں پندرہ بیس منٹ وہاں صرف ہوئے۔ چلتے چلتے انارکلی کے قریب پہنچے تو فرمایا: کشمیرٹی سٹال کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عام چائے والے ایک پیالی کے دو آنے لیتے تھے لیکن کشمیرٹی سٹال میں ایک پیالی ڈھائی آنے میں ملتی تھی۔ فرمایا: دوسروں کی نسبت یہ دو پیسے زیادہ تو بے شک لیتے ہیں، لیکن ان کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔

اب دفتر سے لے کر کشمیرٹی سٹال سے باہر نکلنے تک پورا ڈیڑھ گھنٹا صرف ہو چکا تھا۔ تالے دیکھنا، انھیں پسند کرنا اور ان کا بھاؤ چکانا جو اصلی کام تھا، ابھی باقی تھا اور قاضی صاحب کی رفتار کاروچال کے پیش نظر یہ بہت بڑی منزل تھی، جسے طے کرنے کا مرحلہ ابھی پیش نہیں آیا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم ایبک روڈ پر پہنچے اور اس مکان پر جا کھڑے ہوئے جہاں سے تالے خریدنا مقصود تھا۔

تالے دیکھنا شروع کیے۔ ایک دیکھا، دو دیکھے، چار دیکھے، دس دیکھے، کوئی بقول قاضی صاحب کے ان کے بکسوں کی کنڈیوں سے چھوٹا تھا، کوئی بڑا۔ کسی کے دام زیادہ تھے، کوئی مضبوط نہ تھا اور کسی کی کنجیاں اچھی نہ تھیں۔ کم ازکم ایک گھنٹہ ہم اس اہم کام میں مصروف رہے، مگر انھیں کوئی تالا پسند نہ آیا اور ہم وہاں سے خالی ہاتھ چل پڑے۔ قاضی صاحب اب تھک بھی چکے تھے اور تھکاوٹ دور کرنے کا ان کے نزدیک ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا چائے پینا۔ حکم ہوا دہلی مسلم ہوٹل میں چلیں، وہاں چائے بھی پییں گے اور تھوڑا سا ستا بھی لیں گے۔ مجبوراً تعمیل حکم ہوئی اور ہم دہلی مسلم ہوٹل میں جا بیٹھے۔ اب قاضی صاحب چائے بھی پی رہے ہیں اور دہلی مسلم ہوٹل کی تاریخ بھی بیان کر رہے ہیں۔ میں نہایت ادب سے ان کے سامنے بیٹھا اس طرح سن رہا ہوں جیسے یہ سب باتیں آج پہلی دفعہ میرے علم میں آ رہی ہیں، اس سے قبل مجھے ان کا کچھ پتا نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد فرمایا: اب نیلا گنبد کی طرف جانا چاہیے۔ شاید ادھر تالوں کی کوئی اچھی سی دکان ہو۔ چناں چہ ہم نے ادھر کا عزم کیا۔ چلتے چلتے قاضی صاحب کو پھر چائے کی طلب ہو گئی تھی اور خوش قسمتی سے ہم نگینہ بیکری کے عین سامنے کھڑے تھے۔ فرمایا: یہ بہت پرانا چائے خانہ ہے، کسی زمانے میں اس میں بڑے بڑے لوگ چائے پیتے تھے اور اس کی چائے کی بڑی شہرت تھی۔ ایک مدت کے بعد ادھر آنا ہوا ہے، یہاں بیٹھ کر ذرا چائے پی لیں۔

قاضی صاحب عمامے کو ''صافہ'' کہتے تھے۔ ہم نگینہ بیکری کے اندر گئے تو فرمایا کہ جب ہم تمھارے دفتر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے، سامنے سے ٹھنڈی ہوا آئی اور سیدھی صافے کے بیچ میں سے ہوتی ہوئی سر میں گھس گئی۔ اس کی وجہ سے تمام جسم میں سردی سرایت کر گئی، جس کا اثر اب تک باقی ہے اور یہ اثر چائے پینے ہی سے ختم ہو گا۔

Marfat.com

پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم نگینہ بیکری سے باہر نکلے تو فرمایا: مجھے پاخانہ آیا ہے، اس کا انتظام کرو۔

اب تو کارپوریشن والوں نے بعض علاقوں میں کہیں کہیں بیت الخلا بنا دیے ہیں، اگرچہ چلنے پھرنے والوں کی تعداد کے اعتبار سے بہت کم ہیں، لیکن اس زمانے میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا...... میں نے کہا: ذرا سوچ لوں کہ اس کا کیا انتظام کیا جائے۔

خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولے: اتنے عرصے سے لاہور میں رہ رہے ہو، یہ پتا نہیں کہ اس علاقے میں بیت الخلا کہاں ہے۔ سوچو گے کب؟ میں سخت تکلیف میں ہوں۔ بڑی پریشانی ہوئی کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر بولے: خاموش کھڑے ہو، کیا تمھیں میری تکلیف کا احساس نہیں؟

عرض کیا: بہت احساس ہے، لیکن ذرا سوچنے کا موقع تو دیجیے کہ کہاں چلیں۔

اس جواب سے وہ اور خفا ہوئے اور کہا: کارپوریشن والوں کو لوگوں کی اس ضرورت کا احساس نہیں ہے۔ انھوں نے کیوں بازاروں میں بیت الخلا نہیں بنائے؟

اس کا جواب تو میرے پاس نہیں تھا، کیوں کہ نہ میں کارپوریشن تھا اور نہ کارپوریشن والا۔ البتہ قاضی صاحب کے لیے جگہ سوجھ گئی۔ عرض کیا: آیئے، جلدی کیجیے۔

میں انھیں دھنی رام روڈ پر اپنے ایک مرحوم دوست مولوی محمد ابراہیم آزاد کی دکان ''آزاد ٹیلرنگ ہاؤس'' میں لے گیا۔ انھوں نے ہمیں آتے دیکھا تو اٹھ کر مصافحے کے لیے آگے بڑھے۔ میں نے کہا: مصافحہ پھر کیجیے گا، پہلے قاضی صاحب کو بیت الخلا میں لے جایے۔

کافی دیر کے بعد قاضی صاحب فارغ ہوئے تو اندر کھڑے کھڑے آواز دی، جسم میں سردی چڑھ گئی ہے، جلدی سے چاے منگواؤ۔

جی میں آیا کہ ان سے کہوں پہلی چاے نے اتنی مصیبت میں پھنسایا ہے، اب پھر ''اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے'' کو فرما رہے ہیں۔ مگر ان کے سامنے اس قسم کی بات کرنے کی جرات کہاں سے لاتا۔

اسی وقت تعمیل ارشاد ہوئی، چاے منگوائی گئی اور گرم گرم پیالی ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔

قاضی صاحب جو فرما دیں، اس سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ایک دن ارشاد ہوا کہ ریلوے اسٹیشن کے ری فریش منٹ روم میں چاے پینے چلیں۔ بھاٹی دروازے سے ریلوے اسٹیشن تک تانگے والا اس دور میں آنے سواری کا کرایہ لیتا تھا۔ ہم دونوں چار آنے کرایہ خرچ کر کے وہاں پہنچے۔ چھ پیسے کا پلیٹ فارم ٹکٹ تھا، تین آنے اس پر خرچ ہوئے۔ چار آنے ہاف سیٹ چاے کے دیے۔ چاے پینے کے بعد فرمایا: دیکھا کتنی اچھی چاے ہے اور کتنی سستی ہے۔ ہاف سیٹ میں چھ پیالیاں چاے کی نکلتی ہیں اور ان چھ پیالوں کے صرف

Marfat.com

چار آنے وصول کیے جاتے ہیں۔

عرض کیا: چائے تو واقعی سستی بھی ہے اور اچھی بھی ہے، لیکن اس پر خرچ صرف چار آنے نہیں ہوتے۔ آٹھ آنے دو آدمیوں کا آمدورفت کا کرایہ، تین آنے کے دو پلیٹ فارم ٹکٹ اور چار آنے کی چائے۔ یہ کل پندرہ آنے ہوئے۔ یعنی روپے سے صرف ایک آنہ کم۔ یہ چائے سستی نہیں پڑتی، بہت مہنگی پڑتی ہے۔

میرا یہ حساب سن کر قاضی صاحب طیش میں آگئے۔ بولے: تانگے کا کرایہ اور پلیٹ فارم ٹکٹ اس میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ یہ پیسے تو ویسے بھی آئیں تو خرچ ہوں گے، دیکھنا یہ ہے کہ چائے والے نے کتنے پیسے لیے، اس نے تو صرف چار آنے لیے۔ کم از کم ایک مرتبہ یہاں روزانہ آنا چاہیے۔ چائے بھی اچھی ملے گی اور تفریح بھی ہو جایا کرے گی۔

ایک دن فرمایا: میں ریواز گارڈن ایک دوست کے ہاں جا رہا ہوں، شام کے بعد سات بجے کے قریب یہاں آجاؤں گا اور کھانا تمھارے ساتھ کھاؤں گا۔ میرا یہیں اپنے دفتر الاعتصام میں انتظار کرنا۔

ریواز گارڈن اس زمانے میں ایڈیشنل سیکرٹری، ڈپٹی سیکریٹری اور اسسٹنٹ سیکریٹری سطح کے سرکاری ملازموں کی اقامت گاہ تھی۔ بعد میں ان بنگلوں کو منہدم کر کے وہاں پلاٹ بنائے گئے اور فروخت کر دیے گئے۔

سردیوں کے دن تھے۔ میں نے رات کے دس بجے تک ان کا انتظار کیا۔ اس کے بعد گھر چلا گیا اور کھانا کھا کر سو گیا۔ خیال یہ تھا کہ اب قاضی صاحب نہیں آئیں گے۔ رات کے بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں مکان کے بالائی حصے میں رہتا تھا، کھڑکی سے دیکھا تو نیچے قاضی صاحب کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ دفتر کا چپراسی ہے۔ نیچے اتر کر دروازہ کھولا اور قاضی صاحب کو سلام عرض کیا تو بجائے اس کے کہ اتنی دیر سے تشریف لانے کی کوئی وجہ بیان فرمائیں، الٹا مجھ غریب پر برس پڑے۔

فرمایا: تم نے میرا انتظار نہیں کیا اور گھر آگئے۔ مجھے سخت پریشانی ہوئی، ایسا کیوں کیا؟

عرض کیا: آپ نے سات بجے تشریف لانے کا فرمایا تھا۔ میں نے دس بجے تک انتظار کیا، اس کے بعد خیال ہوا کہ شاید آپ کے دوست نے آپ کو روک لیا ہے۔ اب آپ کل ہی تشریف لائیں گے، اس لیے گھر آگیا۔

بولے: میں نے کہا جو تھا کہ ضرور آؤں گا۔ تمھیں میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اتنی جلدی گھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔

اب سوائے اس کے چارہ نہ تھا کہ اپنی غلطی کا اعتراف کروں اور پھر خاموش ہو جاؤں۔ اس وقت ایک مسئلہ کھانے کا تھا۔ سوچنے لگا کہ معلوم نہیں، کھانا کھائیں گے یا کھا آئے ہیں۔ اس کے متعلق پوچھا جائے یا نہ پوچھا جائے۔ آخر پوچھ ہی لیا اور عرض کیا: کھانا کھائیں گے؟

تعجب اور حیرانی کے انداز میں فرمایا: تم کھا چکے؟ یہ ایک اور غلطی کی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ کھانا اکٹھے

Marfat.com

کھائیں گے۔ تم نے اکیلے ہی کھا لیا۔ مجھے تو ابھی کھانا ہے۔

عرض کیا: بارہ بج رہے تھے، شدید انتظار کے بعد کھانا کھایا ہے۔

اب قاضی صاحب کو کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد چائے کے لیے حکم ہوا۔ اس وقت دودھ کا حصول ایک اہم مسئلہ تھا۔ میں اس زمانے میں بھاٹی دروازے کے اندر نور محلے میں رہتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی محمد حسین بھی تھے، جو میٹرک کا امتحان دے رہے تھے۔ انھوں نے کہا: میں دودھ لاتا ہوں۔ چناں چہ وہ دس منٹ کے بعد دودھ لے کر آئے تو بتایا کہ سینما کا آخری شو ابھی چل رہا ہے، اس کی کینٹین سے دودھ لایا ہوں، اور کہیں سے نہیں ملا۔

میں نے قاضی صاحب سے عرض کیا: سینما کے شر میں خیر کا پہلو یہ ہے کہ رات کے ساڑھے بارہ بجے ہماری چائے کے لیے وہاں سے دودھ مل گیا۔

انھیں سینما وغیرہ سے سخت نفرت تھی، بولے: بزرگوں سے اس قسم کی باتیں نہیں کرتے...... وہ بہت کم کھاتے تھے۔ ایک چھوٹی سی چپاتی ایک وقت میں بمشکل کھا پاتے۔ پھر بہت ہی آہستہ آہستہ کھاتے تھے۔ باتوں کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا۔ کھانے کے دوران میں کبھی سالن ٹھنڈا ہو جاتا اور اسے دو تین بار گرم کرایا جاتا، کبھی چپاتی ٹھنڈی ہو جاتی، اسے بھی بعض دفعہ گرم کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی۔

اس طرح جو عورتیں ان کی عادت سے واقف نہیں ہوتی تھیں، وہ بسا اوقات تنگ پڑ جاتی تھیں۔

کھانے میں یہ عجیب معاملہ پیش آیا کہ ہم نے اس دن قیمہ پکایا تھا، جس میں مٹر اور آلو ڈالے گئے تھے۔ قاضی صاحب کی نگاہ آلوؤں پر پڑی تو میری طرف گھور کر دیکھا اور فرمایا: تمھیں معلوم نہیں کہ آلو بادی ہوتے ہیں اور میں بادی چیزیں نہیں کھاتا۔

میں تو یہ لفظ سن کر گھبرا اٹھا کہ یا اللہ اب کیا ہوگا، لیکن میری بیوی نے مجھ سے کہا: چچا جان کے لیے آپ کیا لے گئے ہیں، ان کے لیے تو قیمہ اور مٹر پکائے گئے ہیں۔

میں پلیٹ واپس لے گیا۔ اس نے آلو نکال دیے اور اس میں قیمہ اور مٹر اور ڈال دیے۔ قاضی صاحب بہت خوش ہوئے۔ بولے: دیکھا بہو ہمارا کتنا خیال رکھتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں آلو نہیں کھاتا، اس نے ہمارے لیے مٹر اور قیمہ الگ پکائے ہیں۔

پھر اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: بہو تم ہماری بھتیجی بھی ہوتی ہو اور بھانجی بھی، اسی لیے ہمارا خیال رکھتی ہو۔

اللہ کا شکر ہے، بیوی کی حاضر دماغی کام آئی اور میں قاضی صاحب کی مزید ڈانٹ ڈپٹ سے بچ گیا۔

اس سے کچھ عرصہ بعد وہ پھر لاہور آئے اور ایک دن صبح صبح غریب خانے پر تشریف لائے۔ فرمایا: ایک تو غسل کرنا ہے، دوسرے صافے (یعنی عمامے) کو کلف لگانا ہے۔

Marfat.com

جمعے کا دن تھا اور سردیوں کا موسم۔ ناشتے کے بعد غسل کے لیے پانی گرم کیا گیا تو فرمایا: انگیٹھی غسل خانے میں رکھ دو۔

حسب ارشاد انگیٹھی غسل خانے میں رکھ دی گئی، اس کے اوپر گرم پانی کا دیگچہ تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ پانی ٹھنڈا نہ ہو اور وہ حسب ضرورت گرم اور ٹھنڈا پانی ملا کر نہاتے رہیں گے اور انگیٹھی سے غسل خانہ گرم رہے گا۔

انھوں نے اندر سے غسل خانے کا دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھالی۔ اس میں گرم پانی بھی تھا اور ٹھنڈا بھی، کوئلے کی انگیٹھی بھی تھی، لیکن ہم حیران کہ کافی دیر گزر جانے کے باوجود نہ برتن کی آواز آتی ہے، نہ پانی کی اور نہ قاضی صاحب کے کھانسنے کی۔ ہم سخت پریشان کہ یا اللہ خیر ہو۔ کبھی دروازے پر کان لگا کر آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی اوپر جاتے ہیں اور کبھی سیڑھیوں کی طرف سے اندر کو جھانکنے کی سعی کرتے ہیں۔ کبھی خود کھانستے اور باتیں کرتے ہیں، لیکن اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی ہے، بالکل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ ہم سب افراد خانہ انتہائی پریشانی کے عالم میں سیڑھیوں میں بیٹھے ہیں اور اللہ کے حضور ہاتھ اٹھا کر خیر خیریت کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اندر سے برتن کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو جان میں جان آئی۔

اس اثنا میں ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ قاضی صاحب کا عمامہ جو کلف لگا کر چھت پر سوکھنے کے لیے ڈالا گیا تھا، ہوا کے جھونکے سے اڑ کر گلی میں بجلی کے کھمبے پر جا گرا۔ اب ہم اس کو کھمبے سے اتارنے کے جتن کر رہے ہیں، لیکن کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حسن اتفاق سے ایک پڑوسی کے گھر میں لمبا سا بانس تھا، وہ منگوایا گیا اور اس کی مدد سے عمامہ کھمبے سے اتارا گیا۔ بہرحال ڈھائی گھنٹے کے بعد قاضی صاحب غسل خانے سے باہر نکلے اور فوراً گرم گرم چائے کی پیالی ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔

قاضی حبیب الرحمان منصور پوری نہایت متقی اور واقعۃً ولی اللہ تھے۔ ان کے بعض ساتھی اور دوست بتایا کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک پیسہ نہیں ہوتا تھا اور اچھے خاصے اخراجات کا منصوبہ بنا لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے سامان فراہم کر دیتا تھا۔ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے۔ بغیر کسی نوع کے ظاہری اسباب کے اللہ تعالیٰ ان کی تمام ضرورتیں پوری کر دیتا تھا۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے، کپڑوں کے کئی کئی جوڑے بکس میں رکھتے تھے۔ عام طور پر گرم اور ٹھنڈی دو دو شیروانیاں ان کے پاس ہوتی تھیں۔ بعض غربا و مستحقین کی مالی امداد بھی کرتے تھے...... عیدالاضحیٰ کے موقعے پر اپنے وطن (پٹیالہ) میں ہوتے تو بالالتزام قربانی کرتے۔ تنگ دستی میں مسکینوں کی نصرت ان کا شیوہ اور اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں پر سخاوت کرنا ان کا پیشہ تھا۔

ایک نہایت عمدہ کتاب عشرہ مبشرہ تصنیف کی جو ان عالی مرتبت دس صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح

Marfat.com

پر مشتمل ہے جن کی زندگی ہی میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دے دی تھی۔ یہ کتاب خود ہی شائع کی۔

ایک مختصر سی کتاب جو صرف ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کے بارے میں صحف انبیا کی روشنی میں لکھی۔ اس کا نام ہے سیـــرت آنـــحـــضـــرت ﷺ یعنی ایلیا کے مصداق حقیقی کی تعیین ووضاحت (ماخوذ از صحف انبیا مندرجہ بائبل)۔

اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی قسط یا پہلی جلد کہنا چاہیے، وہ ان حوالوں کی روشنی میں چھوٹی اور کتابیں بھی لکھنا چاہتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ معاملہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ ایک جگہ جم کر اور بیٹھ کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ چلتے پھرتے رہتے تھے اور منصوبے بنانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

ان کتابوں کے علاوہ بہت سے مسودات جو مختلف موضوعات پر مشتمل تھے، ان سطور کے راقم نے ان کے بکسوں میں دیکھے۔ ان کا خط عجیب سا تھا، لمبے لمبے لفظوں میں لکھتے تھے۔ چند جملوں بلکہ لفظوں میں صفحہ بھر جاتا تھا۔

قاضی صاحب کی دعاؤں، کوششوں اور مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ قیام پاکستان کے بعد ظہور میں آیا۔ یہاں دو اسلامی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، ایک بہاول پور میں اور ایک اسلام آباد میں۔ ان کے علاوہ خالص دینی علوم کی کئی جامعات معرض قیام میں آئیں۔ ان تمام یونیورسٹیوں اور جامعات میں طلبا کو قدیم تعلیم بھی دی جاتی ہے اور جدید بھی۔ علوم دینیہ سے بھی بہرہ ور کیا جاتا ہے اور دیگر علوم سے بھی۔!

پھر ان میں مصر اور سعودی عرب وغیرہ اسلامی ملکوں کے اساتذہ بھی تعلیمی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ سعودی عرب کے اساتذہ جنھیں ''مبعوث'' کہا جاتا ہے، پاکستان کے بہت سے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں خدمت تدریس پر مامور ہیں، ان کی تنخواہیں سعودی حکومت ادا کرتی ہے۔

آزادی برصغیر کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ، دارالعلوم دیوبند، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن) جامعہ ملیہ دہلی اور ہندوستان کی دیگر بہت سی تعلیم گاہوں کے اساتذہ و معلمین اور ان کے فارغ التحصیل حضرات پاکستان آئے اور انھوں نے اس ملک کی متعدد درس گاہوں میں تعلیمی خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ ان درس گاہوں سے جن حضرات نے فراغت پائی اور تکمیل نصاب کی سندیں حاصل کیں، ان سے کتنے ہی اہل علم مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں استاد مقرر ہوئے اور علوم وفنون کے سلسلے کو آگے بڑھانے کا باعث بنے۔ یورپ، افریقہ، اور امریکہ وغیرہ کے بہت سے ملکوں میں اسلام کی تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ جاری ہوا۔ یعنی قاضی حبیب الرحمان منصور پوری نے جو خواب دیکھا تھا، وہ شرمندہ تعبیر ہوا، اور جس کام کے لیے وہ عرصہ دراز تک کوشاں رہے تھے، وہ تکمیل کی منزل کو پہنچا۔ لیکن افسوس ہے، یہ سب چیزیں قاضی

Marfat.com

صاحب نہ دیکھ سکے۔

قاضی حبیب الرحمان متوکل علی اللہ، تہجد گزار، متبع سنت نبوی ﷺ، عاشق رسول عربی ﷺ، علما کے قدردان اور بزرگان دین سے والہانہ تعلق رکھنے والے تھے۔ نماز انتہائی خشوع وخضوع سے پڑھتے اور اس کے تمام ارکان نہایت اعتدال وتوازن سے ادا کرتے، اوراد ووظائف کے پابند تھے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ حالت وظیفہ ہی میں ان کی وفات ہوئی۔

اس عالم ہمہ اوصاف اور صوفی مصفا قلب نے بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، زبان کو کبھی کسی کی غیبت سے آلودہ نہیں کیا۔ انھوں نے برصغیر پاک وہند کے بہت سے چھوٹے بڑے شہروں کی سیاحت کی اور اپنے دور کے کبار علما وفضلا سے تعلقات استوار کیے، لیکن وہ ڈیرہ غازی خاں کی مٹی میں دفن ہوئے اور غالباً ان کے عہد کا کوئی بڑا عالم اور ممتاز فاضل ان کی میت کو کندھا دینے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔

۴۔ جولائی ۱۹۵۷ء کو میرے اس زمانے کے دفتر (الاعتصام شیش محل روڈ لاہور) میں تشریف لائے اور مختلف موضوعات سے متعلق ان سے گفتگو ہوئی۔ دو تین دن کے بعد ڈیرہ غازی خاں چلے گئے۔ ۱۷۔ جولائی کو ان کے صاحب زادے قاضی رضی الرحمان کا خط مجھے ملا، جس میں لکھا تھا کہ ڈیرہ غازی خاں پہنچنے کے بعد ان کو بخار ہو گیا۔ ۱۴۔ جولائی کو بخار اتر گیا اور انھوں نے غسل صحت کیا۔ ۱۵۔ جولائی کو ضعف قلب کے باعث پھر تکلیف ہوگئی۔ اس دن ظہر کے لیے وضو نہیں کر سکے۔ تیمّم سے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

بلاشبہ ان کے خاندان کے تمام افراد زیور علم سے آراستہ ہیں، لیکن مرحوم قاضی حبیب الرحمان کا ذوق جستجو سب سے نرالا تھا۔ وہ اپنے خاندان میں ایک خاص وضع قطع، خاص اسلوب زیست، خاص انداز کلام اور تقویٰ وتدین کی ایک خاص روایت کے امین تھے۔ ان کی وفات کے ساتھ ہی حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کے خاندان سے اس روایت کا خاتمہ ہو گیا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

ذیل سنگھ گیانی

۱۹۸۲ء میں گیانی ذیل سنگھ ہندوستان کی حکومت کے منصب صدارت پر متمکن ہوئے۔ پانچ سال اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۲۴۔ جولائی ۱۹۸۷ء کو اس سے الگ ہو گئے۔ ۲۵۔ دسمبر ۱۹۹۴ء کو وفات پا گئے۔
میں ان سطور میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ میرے بچپن کے دوست اور تقریباً پچاس برس قبل کے ساتھی گیانی ذیل سنگھ کون تھے، ان کا ماضی کیسا تھا، انھوں نے کس طرح طفولیت کی منزلیں طے کیں اور کن کن مراحل سے گزرتے ہوئے عالم شباب کو پہنچے۔ ہمارے ساتھ ان کے مراسم کی کیا نوعیت تھی، وہ ہم سے کس طرح پیش آتے تھے اور ہم ان سے کس طرح کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان چند واقعات کی نشان دہی کروں گا جو انھیں ایک غیر معروف گاؤں اور پسماندہ علاقے سے نکال کر دہلی کی راہ پر گامزن کرنے اور کچے گھر سے بھارتی حکومت کے قصر صدارت تک پہنچانے کا باعث بنے...... وارث شاہ نے اپنی کتاب ہیر وارث شاہ میں ایک جگہ رانجھے کی زبان سے کہلوایا ہے۔

چھوٹی عمر دیاں یاریاں بہت مشکل   پتر مہراں دے کھولیاں چار دے نی

بلاشبہ گیانی ذیل سنگھ آبادی کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے بڑے ملک کے سب سے بڑے منصب پر فائز ہوئے، لیکن انھوں نے ''چھوٹی عمر دیاں یاریاں'' کو جسے وارث شاہ نے ''بہت مشکل'' قرار دیا ہے، یاد رکھا اور خوب نباہا۔ اتنے بڑے منصب پر پہنچنے کے بعد بھی میرے خیال میں وہ ''آپھرے'' یا آپے سے باہر نہیں ہوئے۔

دوستی کا نہ کوئی حدود اربعہ اور جغرافیہ ہے، نہ یہ مذہب اور مسلک کی پابند ہے، نہ کسی ملک اور شہر تک محدود ہے اور نہ کسی منصب اور عہدے کی طالب ہے۔ ''بس دل کے لگ جانے کے ڈھب کچھ اور ہیں۔'' گیانی جی کا اور میرا یہی معاملہ تھا جو آخر تک قائم رہا۔ ہمارا اس دور کا یارانہ تھا جب نہ کوئی عہدہ ہوتا تھا نہ منصب۔ نہ امارت کو کوئی اہمیت حاصل تھی اور نہ غربت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ نہ روپیہ پیسہ معیار تعلق قرار پاتا تھا اور نہ سرکار دربار سے ربط وانسلاک کو پیمانہ دوستی قرار دیا جاتا تھا۔ ہم ایک ہی جگہ کے رہنے والے اور ہر وقت کا ساتھ، یوں سمجھیے کہ

ماو مجنوں ہم سبق بودیم دردیوان عشق

میں انھیں کبھی کبھی خط لکھتا تھا۔ وہ بھی مجھے خط لکھتے تھے۔ ان کے ایک خط نے دلی سے لاہور تک ہوائی

Marfat.com

جہاز کا سفر تیرہ دن میں طے کیا تھا۔ آیے اب ان یادداشتوں کی وساطت سے جو میرے خزانہ ذہن میں محفوظ ہیں، آپ کو گیانی ذیل سنگھ سے ملانے کی کوشش کریں:

پورا قد، اکہرا بدن، گورا اور سرخ رنگ، خوب صورت چہرہ، تیکھی ناک، موٹی موٹی آنکھیں، درمیان کے اوپر کے دو دانت ذرا سے اونچے، کھودی داڑھی، مونچھیں لبوں کو چھوتی ہوئی، تنگ موری کا سفید کھدر کا پاجامہ، سفید کھدر کی بغیر کالر کے قمیص، نیلی یا سفیدی پگڑی، موسم کے مطابق جیکٹ یا شیروانی پہنے ہوئے، سکھ مذہب کے مطابق ''پنج ککوں'' یعنی کچھا، کڑا، کرپان، کیس اور کنگھے کے پابند۔ کم گو، معاملہ فہم، متحمل مزاج اور نرم خو۔ پنجابی کے اچھے مقرر، تعصب سے خالی، چہرے سے متانت اور سنجیدگی عیاں۔ یاروں کے یار، دکھ درد کے سانجھی، ساتھیوں کے ہمدرد اور خیر خواہ، لڑائی جھگڑے سے نفور، جیب کے غریب مگر دل کے سخی، سیاسی جوڑ توڑ کے ماہر۔ یہ تھے وہ گیانی ذیل سنگھ جو اگرچہ مجھ سے نو دس سال بڑے تھے، تاہم چھوٹی عمر سے لے کر ۲۰۔اگست ۱۹۴۷ء کو رات گیارہ بجے تک (جب میں ان سے جدا ہوا) میرا ان سے دوستانہ اور یارانہ رہا۔

گیانی سنگھ کے گاؤں کا نام ''سندھواں'' تھا۔ یہ گاؤں میرے قدیم شہر کوٹ کپورہ ریاست فریدکوٹ (حال ضلع فریدکوٹ مشرقی پنجاب) سے بجانب مغرب دو میل کے فاصلے پر اس سڑک پر واقع ہے جو فریدکوٹ سے ہوتی ہوئی فیروز پور اور وہاں سے لاہور آتی ہے۔ اس سڑک کو لاہور کے لوگ فیروز پور روڈ کہتے ہیں۔ یہ گاؤں لاہور سے بجانب مشرق بذریعہ سڑک (یعنی فیروزپور روڈ) ٹھیک ۷۸ میل اور میرا قدیم وطن کوٹ کپورہ جہاں بچپن سے لے کر بیس اکیس سال تک کا میرا جوانی کا زمانہ گزرا، یہاں سے ۸۰ میل کی مسافت پر ہے۔

گیانی ذیل سنگھ ۵۔مئی ۱۹۱۶ء کو ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سردار کشن سنگھ سکھوں کی ترکھان برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں، سنا ہے کہ آلات زراعت اور لکڑی کا گھریلو سامان بناتے تھے جس کی مزدوری ان کو چھ مہینے کے بعد سال میں دو مرتبہ ربیع اور خریف کی فصل کے موقعے پر غلے کی صورت میں ملتی تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ بہت بھلے مانس اور شریف آدمی تھے۔ اپنے مذہب کے پابند تھے۔ کام بھی کرتے جاتے تھے اور ''واہ گرو واہ گرو'' بھی پکارتے رہتے تھے۔ گیانی جی نے ایک مرتبہ بتایا کہ ان کے باپو جی اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

رام، رحیم تے خدا دا نام اکو اے بھرماں چ پے گئی دنیا

ان کی شرافت کی وجہ سے گاؤں کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ وہ بھی سب سے نرمی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس گاؤں میں ان کی برادری کا ایک ہی گھر تھا۔ پچاس گھماؤں زمین تھی لیکن زیادہ زمین بنجر تھی۔ ان کے تین بیٹے تھے۔ ذیل سنگھ سب سے چھوٹے تھے۔ دو بڑے بیٹے ہل چلاتے اور کاشت کاری کرتے تھے۔

Marfat.com

باپ نے چھوٹے بیٹے کو بھی اپنا تھوڑا بہت کام سکھایا، یہ بھی ابتدائی عمر میں کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے ان کے گھر میں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ باپ نے چھوٹے بیٹے ذیل سنگھ کو سکھ مذہب کا عالم یعنی گیانی بنانے کے لیے شرومنی پر بندھک کمیٹی میں امرتسر بھیج دیا تھا۔ وہاں یہ کئی سال تعلیم حاصل کرتے رہے اور گیانی بنے۔ اس زمانے میں یہ صرف گورمکھی زبان جانتے تھے، اردو یا کسی اور زبان سے آشنا نہ تھے۔ ذہین آدمی تھے اور پنجابی میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ پھر اپنے مذہب کے عالم بھی تھے، اس لیے پر بندھک کمیٹی نے ان کو اپنا با تنخواہ پرچارک مقرر کر دیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی ریاستوں میں سیاسی تحریر وتقریر کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی ریاست کا کوئی شخص سیاست بازی کا شوقین ہوتا تو وہ ریاست کی سکونت ترک کر کے ایسے علاقے میں چلا جاتا جسے براہ راست انگریزوں کا ماتحت ہونے کی بنا پر ''انگریزی علاقہ'' کہا جاتا تھا۔

برصغیر میں چھوٹی بڑی پانچ سو اکیاون ریاستیں تھیں۔ ان میں تحریر وتقریر کی آزادی کے حصول اور سیاسی گھٹن کو دور کرنے کے لیے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ایک سیاسی جماعت بنائی گئی تھی، جس کا نام آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس رکھا گیا تھا۔ اس کے پہلے صدر کشمیر کے شیخ عبداللہ مرحوم منتخب ہوئے۔ اس کانفرنس کا پہلا اور آخری جلسہ عام ۱۹۳۹ء کے ابتدا میں شیخ عبداللہ کے زیر صدارت لدھیانہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، اس لیے کہ کسی ریاست میں سیاسی جلسوں کا انعقاد نہیں ہو سکتا تھا، لیکن شیخ عبداللہ کو حکومت کشمیر نے گرفتار کر لیا تھا، لہٰذا اس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی۔ اسی جلسے میں کانفرنس کے مستقل صدر مدراس کے پٹابی سیتا رامیہ کو بنایا گیا۔ یہ وہی پٹابی سیتا رامیہ تھے جو آزادی کے بعد مدراس کے گورنر مقرر ہوئے۔ میں بھی مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف کے ساتھ اس جلسے میں گیا تھا۔ مجھے یاد ہے لدھیانہ میں ہمارا قیام میاں عبدالحی مرحوم کی مسجد میں تھا۔ یہ اہل حدیث کی مسجد تھی اور اس کے متولی اور منتظم وہی میاں عبدالحی تھے جو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت میں وزیر تعلیم تھے۔ یہ مسجد ان کے مکان سے متصل تھی، تین دن اس کانفرنس کا جلسہ جاری رہا اور ہم تین دن اسی مسجد میں مقیم رہے۔

آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس بعض وجوہ سے ریاستوں میں مقبول نہ ہو سکی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے کہ تمام ریاستوں کے الگ الگ مسائل تھے اور کسی ایک مقصد پر سب لوگوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا۔ پھر شیخ عبداللہ کی گرفتاری اور قید کی وجہ سے زیادہ دیر قائم بھی نہ رہ سکی، صرف مشرقی پنجاب کی چند ریاستوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ان ریاستوں کی آسان زبان میں اس جماعت کا نام ''ریاستی پرجامنڈل'' تھا۔

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہماری ریاست فرید کوٹ میں بھی پرجامنڈل کی شاخ قائم کرنے کے لیے

Marfat.com

خفیہ طور پر صلاح مشورے ہونے لگے۔ ان خفیہ سرگرمیوں کا مرکز ہمارا شہر کوٹ کپورہ تھا۔ اس میں دلچسپی لینے والے لوگوں کی میٹنگیں یا تو کسی کے گھر میں ہوتی تھیں یا باہر کھیتوں میں۔ ایک ایک آدمی مختلف راستوں سے پہلے سے طے شدہ مقام پر پہنچ جاتا اور سلسلہ مشاورت شروع ہو جاتا۔ ان میٹنگوں میں مسلمان اور سکھ زیادہ اور ہندو نسبتاً کم تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ سکھوں میں اکثر لوگ وہ تھے جنھوں نے ۱۹۱۹ء کی اکالی لہر میں حصہ لیا تھا اور قید و بند کی منزلوں سے گزر چکے تھے۔ وہ عمر رسیدہ لوگ تھے۔ ان میں گیانی ذیل سنگھ پچیس چھبیس سال کے نوجوان تھے۔ کبھی کبھی میں بھی ان میٹنگوں میں شامل ہوتا تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے بارے میں تو مجھے معلوم نہیں، لیکن ریاست فرید کوٹ کے سکھوں میں بعض لوگ کمیونسٹ بھی تھے، جو ان میٹنگوں میں آتے تھے۔ ان میں رلیا سنگھ برگاڑی اور چنن سنگھ ڈوڈ کے نام مجھے یاد ہیں۔ یہ مہاراجہ فرید کوٹ ہراندر سنگھ کی مخالفت میں بہت تیز اور پرجوش تھے۔ اس زمانے میں گیانی ذیل سنگھ نے پربندھک کمیٹی سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور وہ اس کے پرچارک نہیں رہے تھے۔ میرا یہ طالب علمی کا زمانہ تھا اور چودہ پندرہ سال کی عمر تھی۔

فرید کوٹ کی پولیس اور سی آئی ڈی کو بھی ان میٹنگوں اور خفیہ سرگرمیوں کا پتا چل گیا تھا، چناں چہ وہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جولائی ۱۹۳۹ء میں گیارہ بارہ آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا، جن میں پانچ مسلمان، پانچ سکھ اور دو ہندو تھے۔ سکھوں میں چار کے نام مجھے یاد ہیں: بھائی دیال سنگھ، گیانی ذیل سنگھ، لہنا سنگھ اور رام سنگھ۔ گیانی ذیل سنگھ کے علاوہ باقی سکھ ۱۹۱۹ء کی اکالی لہر میں مختلف سزائیں کاٹ چکے تھے۔ ہندوؤں میں ایک کا نام جگدیش اور ایک کا بہاری لال تھا۔ مسلمانوں کے نام یہ تھے: حاجی خیر الدین، مولوی محمد سلیمان، قاضی عبیداللہ، محمد حسین اور غلام محمد۔ ان میں غلام محمد سب سے کم عمر تھے۔

ان کی گرفتاری کے بعد کوٹ کپورہ کے چند سرکردہ افراد مشورے کے لیے پاکستان کے ممتاز ماہر قانون میاں محمود علی قصوری کے والد محترم مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کی خدمت میں قصور گئے۔ مولانا قصوری مسلکاً اہل حدیث تھے۔ اپنے دور کے مشہور وکیل بھی تھے اور ہندوستان کی سیاسیات کے نشیب و فراز سے بھی خوب آگاہ تھے۔ دس سال پنجاب کانگریس کے صدر رہے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ قصور کے لیے بس چلنے لگی تو کم عمری کے باوجود میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔ مولانا قصوری کو تمام واقعات سنائے گئے۔ مجھے یاد ہے انھوں نے فرمایا تھا کہ ”عالمی حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ تین مہینے تک یورپ کی بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ شروع ہو جائے گی جو عالم گیر جنگ کی شکل اختیار کر لے گی اور برطانوی حکومت جس کے ہم محکوم ہیں، اس جنگ کا بہت بڑا فریق ہوگی۔ یہ جنگ اتنی طویل ہوگی کہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی، جب تک اس کا کوئی ایک فریق ختم نہیں ہو جاتا۔ اس اثنا میں معلوم

Marfat.com

نہیں کیا حالات پیدا ہوں گے اور ہندوستان کے سیاسی معاملات کس سمت کو چلنا شروع ہوں گے۔ عین ممکن ہے ان گرفتار شدہ لوگوں کو لمبے عرصے تک جیل میں رہنا پڑے۔'' مولانا قصوری نے مزید کہا: ''میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح جیل سے باہر آ جائیں، میرے خیال میں موجودہ حالات کا تقاضا یہی ہے۔''

مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم کی یہ رائے ان کو جیل میں پہنچائی گئی۔ لیکن صاف لفظوں میں معافی مانگنے کے علاوہ جیل سے باہر آنے کی کوئی صورت نہ تھی اور یہ لوگ معافی مانگنے کے لیے تیار نہ تھے۔ آخر ان پر مختلف مقدمات قائم ہوئے اور عدالت کی طرف سے سب کو تین تین سال قید بامشقت اور تین تین سو روپے جرمانے کی سزا دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں چھ چھ مہینے مزید قید بامشقت کاٹنے کا حکم جاری ہوا۔ جرمانہ کسی نے ادا نہیں کیا اور نہ ان میں سے کسی کی مالی حیثیت اس قابل تھی کہ جرمانہ ادا کر سکتا۔ ساڑھے تین سال بعد یہ لوگ جیل سے باہر آئے، اس وقت دوسری عالم گیر جنگ زوروں پر تھی اور ملک کے بے شمار سیاسی لوگ مختلف جیلوں میں بند تھے۔ یہ جنگ گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے تین مہینے بعد ۳۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہو گئی تھی۔

فرید کوٹ کے ان قیدیوں میں جیسا کہ پہلے بتایا گیا پانچ یا چھ سکھ تھے۔ حصول آزادی تک یہ سب زندہ تھے۔ اب ان میں سے کوئی بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ جگدیش اور بہاری لال آزادی کے وقت نوجوان تھے۔ معلوم نہیں اب زندہ ہیں یا نہیں۔ بہاری لال پنجابی کا شاعر تھا اور دیوانہ تخلص کرتا تھا۔ پانچ مسلمانوں میں سے حاجی خیرالدین رہائی سے کچھ عرصہ بعد دسمبر ۱۹۴۳ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے وفات پا گئے تھے۔ اس طرح کی اچانک موت ہمارے علاقے میں یہ پہلی موت تھی۔ اس نواح میں یہ بیماری اس سے قبل کسی نے نہ سنی تھی اور لوگ اس پر انتہائی تعجب اور حیرانی کا اظہار کرتے تھے۔ کئی دن یہ بات مشہور رہی کہ حاجی خیرالدین کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے، ان کی قبر بولتی ہے اور وہ کہتے ہیں، میں زندہ ہوں، مجھے قبر سے نکالو۔ چناں چہ قبر پر لوگ آتے اور اس پر کان لگا کر ان کی آواز سننے کی کوشش کرتے۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ کچھ لوگ گڈا اور کسیاں لے کر آ گئے کہ ہم حاجی خیرالدین کو قبر کھود کر ان کو باہر نکالیں گے اور پھر گڈے پر رکھ کر گھر لے جائیں گے۔ علاج معالجے کے بعد یہ تندرست ہو جائیں گے۔ بڑی مشکل سے بعض لوگوں نے انھیں سمجھایا تو وہ اس حرکت سے باز آئے۔

حاجی خیرالدین ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے حاجی محمد رفیق اس وقت انگریزی فوج میں ملازم تھے۔ بعد میں ان کو ۱۹۴۶ء میں ریاست فرید کوٹ کی پرجا منڈل کا آفس سیکرٹری بنا دیا گیا تھا۔ اب وہ ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب منصور پور (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں مقیم ہیں اور میرے دوست ہیں۔

Marfat.com

مولوی محمد سلیمان ۱۹۷۵ء میں راجہ جنگ (ضلع قصور) میں فوت ہوئے۔

قاضی عبیداللہ ہمارے گاؤں سے تیرہ چودہ میل کے فاصلے پر چک نمبر ۳۶ گ ب (تحصیل جڑاں والا ضلع فیصل آباد) میں اقامت گزیں تھے اور ہماری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۹۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ میرے اقربا میں سے تھے۔

چوہدری محمد حسین پتوکی (ضلع قصور) میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں کی مسلم لیگ کے کارکن ہیں۔ ارائیں برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے دوست ہیں۔

غلام محمد کا تعلق ہمارے گاؤں سے ہے۔ اب کئی سال سے اپنے اکلوتے بیٹے کے پاس کراچی رہتے ہیں۔

قید کے زمانے میں گیانی ذیل سنگھ نے قاضی عبیداللہ سے اردو پڑھی۔ جیل کی جن کوٹھڑیوں میں یہ بند تھے، ان کی پشت کی دیوار مشترکہ تھی۔ اس دیوار سے انھوں نے ایک چھوٹی سی اینٹ نکال دی تھی اور ایک سوراخ سا بنا لیا تھا، جس میں پورا چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ صرف ایک دوسرے کی آنکھیں دکھاتی دیتی تھیں۔ جب یہ دونوں اپنی علیحدہ علیحدہ جیل کی مشقت سے فارغ ہو کر شام کو کوٹھڑیوں میں واپس آتے اور جیل کے کارندے انھیں بند کر کے چلے جاتے تو یہ پشت کی دیوار سے اینٹ نکال دیتے اور سوارخ سے گیانی ذیل سنگھ، قاضی عبیداللہ سے اردو پڑھتے۔ یہ پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں کا کمال تھا۔ جب جیل کے کسی کارندے کے آنے کا وقت ہوتا تو اینٹ رکھ کر اس سوراخ کو بند کر دیا جاتا۔ گیانی جی بہت اچھی اور صحیح اردو پڑھنے لگے تھے۔ اردو بولتے بھی تھے۔ مختلف اردو شعرا کے چند شعر یاد کر لیے تھے جو وہ عام گفتگو اور تقریروں میں برمحل پڑھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کے کچھ شعر بھی ان کو یاد تھے اور اقبالؒ کے یہ بہت مداح تھے۔ علامہ اقبالؒ کے بارے میں اپنے اس نقطہ نظر کا اکثر اظہار کرتے کہ ان کی شاعری کے دو دور ہیں: ایک نیشنلزم کا اور ایک دوسرا۔ ''دوسرے دور'' کی وہ وضاحت نہیں کرتے تھے۔ لیکن تعریف دونوں کی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ''اقبالؒ ہندوستان کا بہت بڑا شاعر ہے۔''

گیانی جی نے جیل میں قاضی عبیداللہ سے قرآن مجید بھی پڑھنا شروع کیا تھا۔ چند سپارے پڑھ بھی لیے تھے۔ جیل سے باہر آ کر مجھ سے بھی قرآن مجید پڑھتے رہے۔ بہت ہی ادب واحترام کے ساتھ منہ ہاتھ دھو کر قرآن مجید پڑھتے تھے۔ مجھ سے قرآن کا تھوڑا سا ترجمہ بھی پڑھا تھا۔ وہ ہمیشہ قرآن شریف کہا کرتے تھے۔ انھوں نے کئی دفعہ یہ الفاظ کہے: ''قرآن شریف واقعی اللہ کا کلام ہے، اس نے جو تعلیمات انسان کو دی ہیں، وہ بلاشبہ صحیح ہیں۔ لیکن افسوس ہے لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ اگر قرآن شریف پر عمل کریں تو نہ اللہ کے سوا کسی کی محکومی قبول کریں اور نہ دنیا میں دنگا فساد بپا ہو۔ چاروں طرف امن ہی امن ہو جائے اور لوگ سکھ چین

Marfat.com

کی زندگی بسر کرنے لگیں۔''

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء کے آخر میں پنجاب کی ریاستوں میں پھر تحریک آزادی شروع ہوئی۔ یہ تحریک بہت زوردار تھی اور ۱۹۴۶ء میں اس نے شدت اختیار کر لی تھی۔ ہماری ریاست فرید کوٹ بھی اب اس تحریک کی زد میں آچکی تھی۔ ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی اور جلسے جلوس کی قطعی ممانعت...... ان حالات میں طے کیا گیا کہ دفعہ ۱۴۴ توڑی جائے، سول نافرمانی شروع کر دی جائے اور پانچ پانچ آدمی گرفتاریاں پیش کریں۔ اس کے لیے پہلے تو ہم لوگ فیروز پور گئے۔ وہاں گوکھلے ہال میں سائبان نصب کیے اور ڈیرہ لگا لیا۔ پھر فرید کوٹ شہر کے ریلوے اسٹیشن کو مرکز بنایا گیا جو انگریزی علاقہ ہونے کی وجہ سے ریاستی حکومت کی دسترس سے باہر تھا۔ اسٹیشن سے چند قدم دور ہٹ کر ہم درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ جون ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے میں پانچ پانچ آدمیوں کا جتھا بنا کر گرفتاریاں دینے کا پروگرام بنایا گیا۔ جون کا مہینہ گرمی کی شدت سے تپ رہا تھا کہ دن کے گیارہ بجے پانچ آدمیوں کا پہلا جتھا نعرے لگاتا ہوا آیا اور ریلوے لائن عبور کر کے ریاست کی حد میں داخل ہو گیا۔ اس جتھے میں دو مسلمان، میں اور قاضی عبیداللہ، دو سکھ بھائی دیال سنگھ اور لہنا سنگھ اور ایک ہندو چیتن دیو شامل تھے۔ بے شمار لوگ جمع تھے جو ریاستی حکومت کے خلاف اور گرفتاری دینے والوں کے حق میں زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ کچھ مسلمان، سکھ اور ہندو ایسے بھی تھے جو چند گز کے فاصلے پر ریلوے اسٹیشن کے اندر کھڑے ہماری مخالفت میں تقریریں کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب فرید کوٹ کے سکھ حکمران کو ''اولوالامر'' قرار دے کر اس کی ''اطاعت'' کا اعلان فرما رہے تھے۔ ان تقریروں کا ہمارے بعض ساتھی اسی لب و لہجے میں جواب دینا چاہتے تھے، لیکن گیانی ذیل سنگھ سب کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ یہ لوگ تو ہمیں اشتعال دلا کر تحریک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن ہمارا فرض ہے کہ حالات کا پورے صبر اور تحمل کے ساتھ مقابلہ کریں اور ہر صورت میں امن اور شانتی کی فضا قائم رکھنے کی کوشش کریں۔

ہم لوگ جتھے کی شکل میں نعرے لگاتے ہوئے ریاست کی حد میں داخل ہوئے تو پولیس کی بہت بڑی جمعیت نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر ہمیں گرفتار کر لیا اور اپنی گاڑی میں بٹھا کر تھانے لے گئی۔ وہاں ضروری کارروائی کے بعد جیل پہنچا دیا۔ شام تک ڈھائی سو آدمیوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔ پہلی رات کو تو سب کو ایک ہی بارک میں رکھا گیا جس کو بارک نمبر ۱۴ کہا جاتا تھا۔ یہ رات نہایت اطمینان کے ساتھ ہنستے کھیلتے گزری۔ ان میں سب سے زیادہ مسلمان، اس سے کم سکھ، اور ہندو بہت تھوڑی تعداد میں تھے۔ دوسرے دن صبح صبح جیل کے حکام آئے۔ لہنا سنگھ نے کہا: ''جیل حکام سے ہمارے کچھ مطالبات ہیں جن کو ماننا ضروری ہے۔'' ایک افسر نے کہا: ''ابھی تمھارے مطالبات سنیں اور مانیں گے، ذرا صبر کرو۔'' اتنے میں

Marfat.com

انھوں نے ایک کاغذ نکالا اور باری باری تیرہ آدمیوں کے نام پکار کر انھیں علیحدہ کر دیا اور اسی وقت وہاں سے نکال کر چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا، جنھیں ''سنگین کوٹھڑیاں'' کہا جاتا تھا۔ ایک ایک تپڑ، ایک ایک کمبل اور ایک ایک لوہے کی باٹی ان کے حوالے کی۔ ان تیرہ آدمیوں میں سے سات سکھ، چار مسلمان، میں، صوفی خوشی محمد، قاضی عبیداللہ اور دوست محمد خاں اور دو ہندو تھے۔

صوفی خوشی محمد فریدکوٹ شہر کے رہنے والے اور ریاست کی ایک تحصیل گوبانہ منڈی میں سرکاری ملازم تھے۔ وہ ملازمت چھوڑ کر پرجا منڈل میں شامل ہوئے تھے۔ ارائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔

دوست محمد خاں بھی فریدکوٹ شہر کے باشندے تھے اور ہمارے ساتھ منسلک ہونے سے قبل خاکسار تحریک سے وابستہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد قصور آ بسے تھے۔ قصور میں ریلوے اسٹیشن کے قریب انھوں نے ایک ہوٹل کھول لیا تھا جس سے معقول آمدنی ہوتی تھی۔ ان کے کئی نوجوان لڑکے تھے جو کسی وجہ سے آپس میں جھگڑ پڑے۔ باپ نے چھڑانے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بیٹے نے باپ کے سر پر لوہے کا سریا دے مارا اور وہ وہیں انتقال کر گئے۔ مرحوم بہت جی دار اور دلچسپ آدمی تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ پٹھان تھے اور نہایت مخلص...... جیل میں قرآن مجید گلے میں لٹکا کر آئے تھے۔ ان کا زیادہ وقت تلاوت قرآن میں صرف ہوتا تھا۔ سوموار کو صبح کے وقت جیل حکام کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ معائنہ کو آتا تو حکم یہ تھا کہ باٹی مانج کر رکھی جائے، اور دروازے کے اندر سپرنٹنڈنٹ کے پیچھے قیدی کھڑا ہو جائے اور جو عرض معروض کرنی ہو، کرے۔ لیکن خاں صاحب اس وقت قرآن پڑھنا شروع کر دیتے اور بدستور بیٹھے پڑھتے رہتے۔ اگر جیل کا کوئی حاکم آواز دیتا اور کھڑا ہونے کو کہتا تو جواب نہ دیتے۔ اکثر یہ ہوتا کہ سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد قرآن مجید بند کر دیتے۔

ہمارے آنے سے پہلے ان کوٹھڑیوں میں مرچیں بھری ہوئی تھیں اور یہ ہمارے لیے رات کو صاف کرائی گئی تھیں۔ لیکن ابھی تک مرچوں کا اثر باقی تھا، جس سے ناک اور حلق میں خارش سی ہوتی تھی۔ اس اثر سے کئی دن سب کو چھینکیں آتی رہیں۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہم تیرہ آدمیوں کے سوا باقی سب لوگوں کو جیل سے نکال دیا گیا ہے۔ رات کو پہرے دار آوازیں دینے لگا تو اس نے بارک نمبر ۱۴ کا نام نہیں لیا۔ بارک نمبر ۱۳ کہا اور پھر ۱۵...... جواب آیا ''بہت اچھا۔'' میں سویا ہوا تھا۔ قاضی عبیداللہ نے مجھے آواز دے کر جگایا اور کہا: غور سے سنو، بارک نمبر ۱۴ نہیں بولا گیا، جس میں ہمیں کل رات رکھا گیا تھا۔ میں نے سنا تو اس نے واقعی بارک نمبر ۱۴ نہیں کہا تھا۔ بولے: ''معلوم ہوتا ہے یا تو انھیں جیل سے باہر نکال دیا ہے یا پھر کہیں اور بند کر دیا گیا ہے۔ بارک نمبر ۱۴ اب قیدیوں سے خالی ہے۔ دوسری صبح جیل کے نمبردار کھانا لے کر آئے تو معلوم ہوا کہ ان سب کو جیل سے باہر

Marfat.com

نکال دیا گیا ہے اور صرف ہم تیرہ آدمیوں کو رکھا گیا ہے، جوان سنگین کوٹھڑیوں میں محبوس ہیں۔

یہ بارہ کوٹھڑیاں تھیں۔ چھ ایک دوسری کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، جن میں مجھے، قاضی عبیداللہ، دوست محمد خاں، صوفی خوشی محمد، بھائی دیال سنگھ اور ایک ہندو کو بند کیا گیا تھا (جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا) چھ کو ہماری پشت کی کوٹھڑیوں میں بند کیا گیا تھا اور ایک کو کہیں اور رکھا گیا تھا۔

ہماری کوٹھڑیوں کے بالکل سامنے تین پھانسیاں نصب تھیں۔ ہم ذرا گردن اونچی کر کے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھتے تو ساتھ ساتھ تین پھانسیاں صاف نظر آتی تھیں۔ ایک دفعہ ہماری موجودگی میں تین حقیقی بھائیوں کو جو سکھ تھے، ایک ساتھ پھانسی دیا گیا تھا۔ جس صبح انھیں پھانسی پر لٹکایا جانا تھا، اس رات یہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رات کو تینوں بیک آواز پکارتے تھے: ''مسلمان بھائیو! السلام علیکم، ہندو بھائیو! رام رام۔ سکھ بھائیو! ست سری اکال جو بولے سونہال۔ یہ ہماری اس دنیا کی زندگی کی آخری رات ہے، خدا کے لیے ہمیں معاف کر دو۔''

یہ منظر نہایت دردناک تھا۔ مسلمان ہندو اور سکھ قیدی ان کے سلام، رام رام اور ست سری اکال کا جواب دیتے تھے۔ تمام رات یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح چھ بجے جب ان کو پھانسی پر چڑھایا گیا تو اسی قسم کے الفاظ کہتے کہتے ان کی آواز حلق سے اٹک کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ ان کو پھانسی دینے کے بعد کھانا آیا تو غم اور افسوس کی وجہ سے ہم میں سے کسی نے نہیں کھایا۔

نمبردار قیدیوں سے ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں ''گولے والا'' کے رہنے والے تھے۔ گاؤں میں دو سکھ خاندانوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ یہ تینوں بھائی دونوں فریقوں کو لڑائی سے روکنے کے لیے گئے تھے۔ اتنے میں ایک فریق کے دو آدمی قتل ہو گئے اور قتل ان بھائیوں کے ذمے لگا دیا گیا۔ مخالفوں نے عدالت میں ان کے خلاف شہادتیں دیں۔ اصل قاتل بچ گئے اور ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان میں سے چھوٹا بھائی بیس اکیس سال کا نوجوان اور غیر شادی شدہ تھا، دو بڑے بھائی شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ پھانسی دینے کے لیے لاہور کے محلہ مزنگ سے ایک عیسائی کو بلایا جاتا ہے۔ اسے ایک آدمی کو پھانسی دینے کے پانچ روپے معاوضہ دیے جاتے ہیں (جسے پنجابی میں ''پنج روپے سر'' کہا جاتا تھا)، آنے جانے کے لیے ریل کا کرایہ اور ایک شراب کی بوتل دی جاتی ہے۔

میری کوٹھڑی کے ساتھ دائیں جانب دوست محمد خاں اور ان کے ساتھ آخر میں بھائی دیال سنگھ کی کوٹھڑی تھی۔ بائیں جانب قاضی عبیداللہ، ان کے ساتھ صوفی خوشی محمد اور آخر میں ایک ہندو نوجوان تھے۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن اپنے اپنے دروازے میں بیٹھ کر باتیں کر لیتے تھے۔ ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ

Marfat.com

سے سب کی آواز ایک دوسرے کو صاف سنائی دیتی تھی۔ ہندو نوجوان آخری کوٹھڑی میں تھا اور پھانسیاں نسبتاً اس کے قریب تھیں، وہ سہم گیا اور تینوں بھائیوں کی پھانسی کا منظر دیکھ کر دوسرے دن معافی مانگ کر چلا گیا۔ اس کا باپ کسی زمانے میں جیل کا داروغہ رہ چکا تھا اور ملازمت کے دوران ہی فوت ہو گیا تھا۔ یہ خود سرکاری ڈرائیور تھا اور ملازمت چھوڑ کر پرجامنڈل میں شامل ہوا تھا، لیکن پھانسی سے اس قدر خوف زدہ ہوا کہ جیل میں رہ نہ سکا۔

بھائی دیال سنگھ بہت بھلے مانس تھے۔ وہ اپنی کوٹھڑی سے رات یا دن کے وقت مجھے آواز دیتے: ''ساک مدا! ہجرت جوسب دی گل سنا۔'' (یعنی محمد اسحاق، حضرت یوسفؑ کا واقعہ سناؤ) کبھی کہتے: ''کران وچ جو کاف والیاں دی بابت لکھیا اے، اوہ سنا۔'' (یعنی قرآن مجید میں اصحاب کہف کے بارے میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ سناؤ) اس قسم کے واقعات میں انھیں سناتا رہتا تھا، وہ نہایت دلچسپی سے سنتے اور اثنائے کلام میں کسی کو بولنے نہ دیتے، جو بول پڑتا، اس کو خوب ڈانٹ پلاتے اور کہتے: ''تم قرآن کی بات نہیں سنتے اور اپنی ہانکے چلے جا رہے ہو، کچھ شرم کرو، اللہ سے ڈرو۔''

ہماری گرفتاری کے بعد ریاست فرید کوٹ کی یہ تحریک بہت شدت اختیار کر گئی تھی اور دور دراز سے لوگ گرفتاریاں دینے کے لیے آنے لگے تھے۔ راولپنڈی، گوجراں والا، لاہور، قصور اور فیروز پور سے بھی جتھے گئے۔ دوسری طرف بٹھنڈہ، نابھہ، جیتو اور پھول وغیرہ سے قافلوں کے قافلے آئے۔ لاہور سے مشہور سکھ لیڈر بابا کھڑک سنگھ اور راولپنڈی سے سوشلسٹ رہنما منشی احمد الدین بھی جتھے لے کر آئے۔ یعنی یہ ایک قسم کی صوبہ گیر سی تحریک ہوگئی تھی۔ اس کی قیادت گیانی ذیل سنگھ کر رہے تھے۔ ابتدا ہی میں فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ اس تحریک میں گیانی جی گرفتاری نہیں دیں گے اور تحریک کو پرامن طریقے سے صحیح رخ پر آگے بڑھائیں گے۔ اس سلسلے میں گیانی جی کی مدد کے لیے ریاست نابھہ کے قصبہ جیتو سے برش بھان اور مالیر کوٹلہ سے خواجہ نورالدین بھی فرید کوٹ پہنچ گئے تھے۔ خواجہ صاحب بہت جی دار آدمی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور آگئے تھے۔ انارکلی میں ان کی جوتے کی دکان تھی اور کرشن نگر میں مکان تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔

گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے یہ تحریک نہایت کامیابی سے چلائی۔ پولیس لوگوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی، بلکہ گرفتاری پیش کرنے والوں کو بسوں میں بٹھا کر پندرہ پندرہ، بیس بیس میل دور لے جا کر کہیں چھوڑ آتی تھی۔ پولیس کے بعض شریف اہل کار ان لوگوں کو کھانے پینے یا واپسی کرائے کے لیے کچھ پیسے بھی دے دیتے تھے۔ یہ لوگ جس گاؤں میں جاتے، وہاں کے باشندے ان کا بہت احترام کرتے اور خوب کھلاتے پلاتے، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ قومی خادم اور سیوادار تھے۔

ہم تیرہ آدمیوں پر جو فرید کوٹ جیل میں محبوس تھے، جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔ ہندو مجسٹریٹ پولیس کی

Marfat.com

بھاری نفری اور دیگر اہل کاروں کے ساتھ مقدمے کے سلسلے میں پہلے دن جیل آئے تو ہمیں ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ ملزم نیچے زمین پر بیٹھ گئے۔ مجسٹریٹ نے حکم دیا: ''ملزم کھڑے ہو جائیں۔'' لیکن کوئی ملزم کھڑا نہیں ہوا۔ بھائی دیال سنگھ نے کہا: ''بیٹھ کر بھی بات کی جاسکتی اور سنی جاسکتی ہے۔'' اس پر مجسٹریٹ نے غصے سے بھرپور نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ پھر کھڑے ہونے کا حکم بھی نہیں دیا۔

مجسٹریٹ نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد تمام ملزموں کو غور سے دیکھا، سب کی حاضری لگائی اور پھر ایک ایک کا نام لے کر ان پر جو الزامات عائد کیے گئے تھے اور تعزیرات ہند کی جو دفعات لگائی گئی تھیں، اس کی تفصیل بیان کی اور ہر دفعہ کے تحت جو سزا دی جاسکتی تھی، اس کا ذکر کیا۔ مجموعی طور پر یہ کل سزا ساٹھ ساٹھ سال بنتی تھی۔ یعنی ہر ملزم کو ساٹھ سال جیل میں بند رہنا تھا۔ مگر کسی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس زمانے میں سیاسی لوگوں پر اسی طرح دفعات لگائی جاتی اور اسی طرح سزائیں سنائی جاتی تھیں۔ سزا سن کر ایک ملزم نے کہا: ''بچیاں والیا، ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔'' کہا، کرو: بولا: ''مہربانی کر کے اس میں چالیس چالیس سال اور جمع کر دیجیے تاکہ ایک ایک سنچری پوری ہو جائے۔'' حکم ہوا: ''خاموش رہو۔'' اس کے بعد میں نے بھولی بھالی سی شکل بنا کر عرض کیا: ''کیا ہمارے اور ہمارے بال بچوں کے بیاہ شادی یہیں ہوں گے؟'' اس پر وہ تھوڑا سا مسکرائے، مگر جواب کچھ نہیں دیا۔

ہم پر جیل کا جو کارندہ دن کے وقت متعین تھا، اس کا نام بھاگ سنگھ تھا، بوڑھا آدمی تھا اور ہمیں کوئی تکلیف نہ دیتا تھا۔ صحن کا دروازہ اندر سے بند کر کے ہمیں کوٹھڑیوں سے باہر نکال دیتا تھا۔ میں سب سے کم عمر تھا اور پہلی مرتبہ فرید کوٹ جیل میں گیا تھا۔ میرا وہ خاص طور سے خیال رکھتا تھا اور باہر کی باتیں بھی بتا دیتا تھا۔ وہ اسحاق کی بجائے مجھے ''بھاگ'' کہا کرتا تھا۔ لفظ اسحاق وہ بول نہیں پاتا تھا۔ وہ رازداری میں مجھے بتا دیتا کہ باہر تحریک زوروں پر ہے اور تم بھاگوں والے ہو، کامیاب ہو کر یہاں سے جاؤ گے۔ وہ مجھے تاکید کرتا کہ تحریک کی جو بات وہ مجھے بتائے گا، میں اس کا ذکر دوسروں سے نہیں کروں گا۔

جیل میں کھانا تقسیم کرنے پر نمبردار قیدی متعین تھے، وہ بھی ہمارا خیال رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ آپ لوگ قومی قیدی ہیں۔ آپ کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے، جتنا جی چاہے کھاؤ، ہم تو یہی کر سکتے ہیں اور آپ کی خدمت کو نیکی سمجھتے ہیں۔

جیل میں کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ ہر سوموار کو چار بجے بعد دوپہر تمام قیدیوں کو آدھ آدھ سیر حلوہ ملتا تھا جسے وہ ''کڑاہ پرشاد'' کہا کرتے تھے۔ روزانہ تین اور چار بجے کے درمیان آدھ آدھ پاؤ بھنے ہوئے چنے اور آدھ آدھ پاؤ ہر قیدی کو گڑ ملتا تھا۔ اتوار کو کپڑے دھونے کے لیے پاؤ بھر صابن دیا جاتا تھا۔

Marfat.com

فرید کوٹ کے داروغہ جیل کا نام عجایب سنگھ تھا۔ یہ بہت شریف اور نرم آدمی تھا۔ حتی الامکان کسی کو تکلیف نہ پہنچاتا۔ ایک دن دس بجے کے قریب وہ ہمارے پاس آیا اور کہا: ''میں صابن بھیج رہا ہوں، مہربانی کر کے آپ لوگ آج اپنے کپڑے دھولیں۔''

یہ صابن ملنے کا یعنی اتوار کا دن نہیں تھا۔ ہم اس پر متعجب ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد سب کو ایک ایک ٹکیہ صابن دیا گیا۔ ہم نے کپڑے دھوئے۔ دوسرے دن دس بجے کے قریب پھر عجایب سنگھ داروغہ جیل آیا اور کہا: ''مہربانی کر کے میرے ساتھ چلیے۔''

وہ ڈیوڑھی میں لے گیا۔ ہم نے دیکھا کہ گورے چٹے ایک صاحب وہاں تشریف فرما ہیں۔ کھدر کی ٹوپی، کھدر کی شیروانی اور تنگ موری کا کھدر کا پاجامہ پہنے اور نظر کا چشمہ لگائے ہوئے۔ ان کے ساتھ ریاست کے چیف سیکرٹری رام سنگھ بیٹھے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر یہ دونوں کھڑے ہوگئے اور سب سے ہاتھ ملائے۔ کھدر پوش آدمی نے چیف سیکرٹری سے اردو میں کہا: ''آپ تشریف لے جایے، میں ان لوگوں سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں سمجھا یہ بھیم سین سچر ہوں گے، ان کی تصویر میں نے اخباروں میں دیکھی تھی جو ان صاحب سے کچھ ملتی جلتی سی تھی۔ لیکن انھوں نے بتایا: ''میرا نام سیف الدین کچلو ہے اور میں پنجاب کانگرس کا صدر ہوں۔''

میں نے ان سے کہا: ''پنجاب کانگرس کے صدر تو مولانا داؤد غزنوی تھے۔'' (ہماری گرفتاری کے وقت مولانا ہی پنجاب کانگرس کے صدر تھے۔ جیل میں ہمیں کوئی اخبار وغیرہ نہیں ملتا تھا اور نہ باہر کی کوئی بات اندر پہنچتی تھی، اس لیے ہمیں معلوم نہ تھا کہ باہر کے ملکی اور سیاسی حالات کیا ہیں) انھوں نے بتایا: ''نئے انتخاب میں مولانا داؤد غزنوی صدر نہیں رہے۔ اب یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ باہر تحریک بہت زور سے چل رہی ہے اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے کانگرس ہائی کمان نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ آپ لوگ بالکل نہ گھبرائیں، دو ایک روز میں پنڈت جواہر لال نہرو یہاں آرہے ہیں، وہ مہاراجہ سے گفتگو کریں گے۔ پرجامنڈل کے مطالبات مان لیے جائیں گے اور آپ لوگوں کو رہا کر دیا جائے گا۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ریاستی حکومت تحریک کی شدت سے انتہائی پریشان ہے اور وہ جلد از جلد کوئی آبرومندانہ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے۔

وہ اردو بولتے تھے اور تمام گفتگو انھوں نے اردو میں کی۔ ہمارے سکھ ساتھی جنھیں اردو بولنے میں دقت پیش آتی تھی، پنجابی میں بات کرتے تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب انھیں اردو میں جواب دیتے تھے۔

جو لوگ جیل میں بند تھے، ان کے بارے میں جیل سے باہر کئی قسم کی افواہیں مشہور ہوگئی تھیں۔ کچھ لوگ

Marfat.com

کہتے تھے انھیں جیل میں زہر دے کر مار دیا گیا ہے۔ کوئی کہتا تھا، انھیں کسی دوسرے شہر بھیج دیا گیا ہے، اور ایک افواہ یہ بھی تھی کہ انھیں دلی روانہ کر دیا گیا ہے اور یہ مہاراجہ کی دلی کی کوٹھی میں بند ہیں۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر کچلو نے بھی بتائیں اور باہر آ کر بھی پتا چلا۔ ڈاکٹر کچلو کے جیل آ کر ہم سے ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ ہم لوگ کس حال میں ہیں۔ کسی قسم کے تشدد یا سختی کا شکار تو نہیں ہیں۔

ان دنوں ہندوستانی رہنماؤں سے ملک کی آزادی کے سلسلے میں گفتگو کے لیے برطانوی کیبنٹ مشن یہاں آیا ہوا تھا اور مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما اس سے مصروف گفتگو تھے۔ کچھ عرصے بعد اس مصروفیت سے وقت نکال کر پنڈت جواہر لال نہرو فرید کوٹ آئے۔ لیکن ریاست میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ پنڈت نہرو بذریعہ ریل آئے تھے۔ بہت بڑا ہجوم ان کے استقبال کے لیے فرید کوٹ کے ریلوے اسٹیشن پر جمع تھا۔ وہ ہجوم کے ساتھ پیدل چل کر شہر میں داخل ہونے لگے تو فیروز پوری دروازے پر ایک ہندو مجسٹریٹ کھڑا تھا۔ اس نے ان کو کاغذ دکھایا اور کہا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے، آپ اندر نہیں جا سکتے۔ پنڈت جی نے کاغذ کے پرزوں کو اسی طرح پکڑا اور اسے پھاڑ کر زمین پر پھینکتے ہوئے کہا: ''ہم اس قسم کے کاغذ کے پرزوں کو اسی طرح کیا کرتے ہیں۔''

پھر ہجوم سے مخاطب ہو کر بولے: ''بڑھو نوجوانو!''

اس کے بعد وہ غلہ منڈی گئے اور وہاں جا کر تقریر کی۔ بعدازاں راجہ فرید کوٹ ہراندر سنگھ نے اپنی کار بھیجی اور پنڈت جی کو اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ وہ وہاں گئے اور دونوں نے باہم بات چیت کی۔ اس کے نتیجے میں ہمیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی اگرچہ خفیہ طریقے سے عمل میں آئی تھی، تاہم لوگوں کو اس کا پتا چل گیا تھا۔ ضروری کارروائی کے بعد جیل حکام نے ہمیں ڈیوڑھی سے باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ بے شمار لوگ نعرے لگاتے ہوئے ہمارے استقبال کے لیے جیل کی طرف دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ان میں گیانی ذیل سنگھ بھی تھے جو سب سے بغل گیر ہو کر ملے اور ہماری رہائی اور مطالبات تسلیم کیے جانے کی مبارک باد دی۔ میں ان سب سے کم سن تھا۔ گیانی جی نے مجھ سے کہا:

''میں دو وجہ سے تمھارے متعلق فکر مند تھا، ایک اس لیے کہ تم پہلی مرتبہ جیل گئے تھے، دوسرے اس لیے کہ تم باقی سب ساتھیوں سے کم عمر ہو۔ یہ لوگ تو پہلے کئی مرتبہ جیل جا چکے ہیں اور کافی عمر کے بھی ہیں۔''

رہائی کے بعد ہمارا ایک گروپ فوٹو لیا گیا، جس میں گیانی جی بھی شامل تھے اور میرے ساتھ کھڑے تھے۔ فوٹو کے بعد چتین دیو کی بہن سچیتا دیوی نے سب کے ماتھے پر تلک لگانا شروع کیا۔ میری باری آئی تو میں نے انکار کر دیا اور کہا: ''میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔'' وہ مسکرا کر آگے بڑھ گئیں۔

گیانی جی نے میرے اس جواب پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مشترکہ زندگی میں اپنے مذہب کے رسوم

Marfat.com

درواج کو محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جہاں مذہب کا معاملہ ہو، اگرچہ لوگ اسے چھوٹا ہی قرار دیں، اس کی حفاظت بہرصورت کرنی چاہیے۔

بعض کٹر قسم کے سکھ حضرات پرجامنڈل کی اس تحریک کے اس لیے مخالف تھے کہ یہ تحریک سکھ حکمرانوں کو ختم کرنے کے لیے شروع کی گئی ہے اور اس میں جو لوگ شامل ہیں، وہ اپنے اپنے مذہب کے پابند نہیں رہے۔ گیانی جی اپنی تقریروں میں اس نقطہ نظر کی سختی سے تردید کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم سب لوگ اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہیں۔ اس سلسلے میں وہ میرے تلک نہ لگانے کی مثال بھی دیتے تھے۔ رہائی کے بعد فرید کوٹ میں گیانی جی کی قیادت میں بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔

رہائی سے تھوڑی دیر پہلے پنڈت جواہر لال نہرو ریاست نابھہ کے ایک مقام ''جیتو'' چلے گئے تھے۔ وہ جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ رہا شدہ لوگ آج رات مجھے بٹھنڈہ ریلوے اسٹیشن پر ملیں۔ چناں چہ ہم شام کے بعد اپنے گھروں میں جانے کے بجائے اپنے تمام دوستوں کے ہمراہ بذریعہ ریل بٹھنڈہ پہنچے...... دہلی جانے والی ٹرین جو لاہور سے آئی تھی، روانہ ہونے والی تھی اور جواہر لال فرسٹ کلاس کے ڈبے میں لیٹے ہوئے تھے۔ تین گورے بھی اس میں سوار تھے۔ ہم نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کھڑے ہو کر ملے اور سب سے ہاتھ ملائے۔ ہمیں رہائی کی مبارک باد دی اور مہاراجہ فرید کوٹ سے اپنی گفتگو کی مختصر روداد سنائی۔ اتنے میں گاڑی نے وسل دیا' اور ہم نیچے اتر آئے۔ وہ دروازے پر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر ہمیں الوداعی سلام کیا۔ فرید کوٹ سے ٹرین میں بیٹھ کر ہمارے بہت سے دوست اور عزیز بھی ہمارے ساتھ ہی بٹھنڈے چلے گئے تھے۔ رات ہم وہیں رہے۔ رات کے کھانے اور صبح کے ناشتے کا وہاں کے لوگوں نے انتظام کیا تھا۔ گیانی جی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ دوسرے دن صبح سات بجے کی ٹرین سے کوٹ کپورہ پہنچے۔ اسٹیشن پر بے شمار لوگ جمع تھے۔ اس موقعے پر بہت بڑا جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کی قیادت گیانی جی نے کی۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جیتو میں جواہر لال نہرو نے تقریر کی اور دوران تقریر میں کہا کہ میں ۱۹۱۹ء کی اکالی لہر کے زمانے میں یہاں آیا تھا اور ریاست نابھہ کی حکومت نے میری سخت نگرانی کی تھی اور کسی کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مجھے شدید پیاس لگی تھی اور ایک سکھ نے جرات کر کے مجھے پانی بھی پلایا تھا اور کھانا بھی کھلایا تھا۔ تقریر میں انھوں نے اس سکھ کا نام بھی لیا اور کہا کہ اگر وہ زندہ ہے اور یہاں موجود ہے تو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ زندہ نہیں ہے یا اس وقت موجود نہیں ہے تو اس کی اولاد یا رشتے داروں میں سے کوئی شخص موجود ہو تو مجھے ملے۔ اس نے مجھ پر احسان کیا تھا، اس پر ۲۸ برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور اب تک مجھے یاد ہے۔ یہ الفاظ سن کر مجمعے سے ایک بوڑھا سکھ اٹھا اور بولا: ''مہاراج! وہ شخص میں ہوں۔''

Marfat.com

جواہر لال نے اس کو سٹیج پر بلایا اور بھرے مجمعے میں اس سے بغل گیر ہوئے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ جواہر لال کو حکومت نابھہ نے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا اور بڑی اذیت پہنچائی تھی۔ سنا گیا تھا کہ جواہر لال تحریری معافی نامہ داخل کر کے جیل سے رہا ہوئے تھے۔ بعض لوگوں کے بقول یہ تحریری معافی نامہ ریاست نابھہ کے ریکارڈ میں موجود تھا...... اب معلوم نہیں، یہ معافی نامہ موجود ہے یا ضائع کر دیا گیا ہے۔

ہماری رہائی کے بعد ۱۹۴۶ء میں ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کو باقاعدہ منظم کیا گیا۔ مسلمان اس میں کثیر تعداد میں شامل تھے۔ کوٹ کپورہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ چند افراد کے سوا وہاں کے تمام مسلمان پرجامنڈل سے منسلک تھے۔ جو لوگ (مسلمان یا غیر مسلم) اس میں شامل نہ تھے، وہ بھی اس کی مخالفت نہ کرتے تھے، اس لیے کہ ریاستی حکومت سے اس کے مطالبات سب کے لیے فائدہ مند تھے۔ البتہ فرید کوٹ شہر کے مسلمان کم تعداد میں اس میں شامل تھے۔ اس کی اصل وجہ ان کی ملازمت کی مجبوریاں تھیں۔

ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کے پہلے باقاعدہ انتخاب میں گیانی ذیل سنگھ کو صدر اور قاضی عبیداللہ کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ کوٹ کپورہ کی پرجامنڈل کے صدر بھائی دیال سنگھ منتخب ہوئے اور میرا انتخاب بطور جنرل سیکرٹری ہوا۔ فرید کوٹ شہر کی پرجامنڈل کے صدر کا نام مجھے یاد نہیں رہا، البتہ جنرل سیکرٹری صوفی خوشی محمد کو بنایا گیا تھا۔ صدر دفتر کوٹ کپورہ کی غلہ منڈی میں تھا۔ اسی بلڈنگ میں کوٹ کپورہ کی پرجامنڈل کا دفتر تھا۔ آفس سیکرٹری حاجی محمد رفیق تھے، جن کے والد حاجی خیر الدین ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک (ساڑھے تین سال) جیل کاٹ چکے تھے۔

گیانی ذیل سنگھ کو اب بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ہم اکٹھے میٹنگوں میں شامل ہوتے، پرجامنڈل کے سلسلے میں اکٹھے ہی ریاست کے قصبات اور دیہات کا دورہ کرتے اور جہاں جانا ہوتا ایک ساتھ جاتے۔ آنا جانا، بیٹھنا اٹھنا اور کھانا پینا بالکل اکٹھا اور ہر وقت کا ساتھ۔

گیانی جی صبح سات آٹھ بجے کے لگ بھگ اپنے گاؤں سندھواں سے پیدل چل پڑتے۔ فرید کوٹ اور کوٹ کپورے کا سات میل کا فاصلہ تھا۔ گیانی جی کا گاؤں کوٹ کپورے سے دو میل کے فاصلے پر لب سڑک بجانب مغرب اور فرید کوٹ سے پانچ میل کی مسافت پر بجانب مشرق تھا۔ سات میل کے اس ٹکڑے میں تانگے چلتے تھے اور تانگے والے گیانی جی کو جانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ جو تانگہ فرید کوٹ سے کوٹ کپورے یا کوٹ کپورے سے فرید کوٹ جاتا، وہ ان کے گاؤں سے گزر کر جاتا تھا۔ صبح وہ اپنے گھر سے کوٹ کپورہ کے لیے پیدل روانہ ہوتے تو جو تانگے والا انھیں دیکھتا، تانگے پر بٹھا لیتا اور اڈے پر جا کر اتارتا۔ اڈے سے کوٹ کپورے کی غلہ منڈی جہاں پرجامنڈل کا دفتر تھا، زیادہ سے زیادہ دو فرلانگ ہوگی۔ اسی طرح شام کو

Marfat.com

جب گیانی جی دفتر سے اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوتے تو فرید کوٹ جانے والا تانگے والا انھیں بٹھا لیتا اور ان سے کرایہ نہیں لیتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ تانگے کے کرایے کے لیے دو تین آنے عام طور پر ان کے پاس ہوتے بھی نہیں تھے۔ سب ملنگ اور قلندر اکٹھے ہوئے تھے۔ پیسے ویسے کسی کے پاس نہ تھے۔ بس ایک جذبہ تھا جس نے سب کو ایک لڑی میں پرو رکھا تھا۔

ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کے پردھان گیانی ذیل سنگھ کی مالی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے گھر میں پانی کا نلکا بھی نہیں تھا اور اس دور میں ڈھائی تین سو روپے کا نلکا لگوانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ روزانہ دفتر آ کر نہاتے تھے، البتہ ''کیسیں نہانا'' ہوتا تو عام طور پر گھر میں نہاتے۔ اس دن دفتر نہیں آتے تھے۔ بعض دفعہ ''کیسیں'' بھی دفتر آ کر نہاتے تھے۔

سکھ صاحبان روزانہ نہاتے ہیں تو سر کے بال یعنی ''کیس'' نہیں دھوتے۔ چار پانچ دن کے بعد کیس دھوتے ہیں اور اس کے لیے بہت اہتمام کرتے ہیں۔ اس زمانے میں دیہاتی سکھ زیادہ تر لسی سے کیس دھوتے تھے اور پھر خشک ہونے کے لیے انھیں کھلا چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کافی دیر کے بعد کیس خشک ہوتے تھے۔ سر کے بالوں سمیت نہانے کو سکھ صاحبان ''کیسیں نہانا'' کہتے ہیں۔

گیانی جی کا مکان گاؤں کے درمیان میں تھا اور کچا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کچی دیواریں تھیں۔ دروازے پر لکڑی کے کواڑ بھی نہیں تھے۔ پانچ چھ مہینے کے بعد گھر کی عورتیں مکان پر مٹی گارے کی لپائی کرتی تھیں۔ باورچی خانہ بھی الگ یا چھتا ہوا نہیں تھا...... ''چبوترے'' پر ہی ایک دیوار کے ساتھ چولہا چوکا بنایا گیا تھا۔ یہیں دودھ گرم کرنے کا مٹی کا ''ہارا'' تھا۔ بس یہی ان کی سادہ سی ''رسوئی'' تھی۔ تینوں بھائی ایک ہی مکان میں رہتے تھے اور ایک ہی صحن تھا۔

ایک مرتبہ گیانی جی بیمار پڑ گئے تو مجھے ملاقات کے لیے پیغام بھجوایا۔ میں اور حاجی محمد رفیق (پرجامنڈل کے آفس سیکرٹری) صبح صبح سائیکلوں پر ان کی عیادت کو گئے۔ اکتوبر کے دن تھے۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی: ''گیانی جی!''

گیانی جی پرانے زمانے کا کھدر کا ''ٹھیکہ'' ہوا لحاف اوڑھ کر سو رہے تھے۔ گھر کی عورتیں کام کاج میں مصروف تھیں۔ یہ نقشہ آج بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے۔ آواز سن کر گیانی جی آنکھیں ملتے اور ''واہ گرو واہ گرو'' کہتے ہوئے اٹھے، چارپائی پر بیٹھے اور لحاف اوڑھے ہوئے آواز دی: ''اندر آ جاؤ۔''

ہم جا کر اسی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ بیبیوں نے ہمیں سلام کیا۔ ہم نے بھی احترام سے ان کو سلام کیا۔ ہم نے دیکھا کہ گیانی جی کے ساتھ تین چار چھوٹے چھوٹے بچے لیٹے ہوئے ہیں۔ کوئی پائنتی کی طرف ہے، کوئی

Marfat.com

سرہانے کی طرف۔ گیانی جی نے آواز دی: ''بیبیو، چاہٹا بناؤ۔ سکتر جی آئے نے۔''

میں اس زمانے میں چائے نہیں پیتا تھا۔ ہر چند انکار کیا، لیکن گیانی جی نہیں مانے۔ کانسی کے بڑے بڑے چھنوں میں چائے آئی۔ چائے بھی گرم اور چھنے اس سے بھی زیادہ گرم۔ ہم نے پیار اور خلوص کی یہ چائے بڑے پریم اور محبت کے ساتھ پی اور گیانی جی کے ساتھ ہی چھنے خالی کر دیے۔

سکھ صاحبان اس زمانے میں عام طور پر چائے کو ''چاہٹا'' کہتے تھے۔

ایک دفعہ عید کے موقعے پر آٹھ دس سکھوں اور ہندو دوستوں کے ساتھ گیانی جی عید کی مبارک باد دینے کے لیے ہمارے گھر آئے۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی محمد حسین کو سوڈا واٹر کی بوتلیں لانے کو کہا۔ گیانی جی بولے: ''بوتلیں کیا کرنی ہیں، عید کو سویاں پکائی جاتی ہیں۔ سویاں لاؤ۔''

میں الگ الگ پلیٹوں میں سویاں لایا تو کہا: ''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے، کتنی پلیٹیں لاؤ گے، پرات میں ڈال کر لاؤ تاکہ جلدی جلدی کھا کر دوسرے دوستوں کے ہاں جائیں۔''

چناں چہ میں ایک بڑی سی پرات میں سویاں لایا اور سب نے مل کر کھائیں۔

قرآن مجید سے ان کو پیار اور لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ ریاست فریدکوٹ کی گونیانہ منڈی میں ہم نے پرجامنڈل کا جلسہ منعقد کیا جس میں تقریر کے لیے اس دور کے مشہور سکھ لیڈر گیانی گورمکھ سنگھ مسافر کو بلایا گیا تھا۔ میں تقریر کے لیے کھڑا ہونے لگا تو گیانی جی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔ ''بسم اللہ پڑھ اور قرآن شریف کی کوئی آیت تلاوت کر کے تقریر کرنا۔''

ایک مرتبہ فریدکوٹ کے گھنٹہ گھر چوک میں عشا کے بعد پرجامنڈل کا جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ اس میں لاہور سے سردول سنگھ کویشر کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ کویشر جی کو دعوت دینے کے لیے میں اور چنن سنگھ ڈوڈ لاہور آئے تھے۔ ان کا مکان چیمبرلین روڈ پر مائی لاڈو کی مسجد کے سامنے تھا۔ یہ وہی مکان تھا جس میں آزادی کے بعد اپنے زمانے کے نامور سیاسی رہنما غازی عبدالرحمٰن خواجہ اقامت گزیں ہو گئے تھے جو تقسیم ملک کے زمانے میں امرتسر سے لاہور آئے تھے۔ بہت بڑا مجمع سردول سنگھ کویشر کی تقریر سننے آیا تھا۔ انھوں نے تقریر کے آغاز میں سورہ عصر پڑھی اور پھر اردو میں اس کا ترجمہ کیا۔ ترجمہ صحیح تھا، لیکن قرآن مجید کے الفاظ غلط پڑھے تھے۔ گیانی جی نے مجھ سے پوچھا: ''کویشر جی نے قرآن شریف کے الفاظ غلط تو نہیں پڑھے؟'' میں نے جواب دیا: الفاظ غلط پڑھے ہیں، البتہ ترجمہ صحیح کیا ہے۔ اس کے بعد وہ سردول سنگھ کویشر کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ قرآن شریف کی کوئی آیت تقریر میں پڑھنی ہو تو پہلے اسے اچھی طرح یاد کر لینا چاہیے۔ میں نے سنا ہے کہ زیر زبر کی غلطی سے معنوں میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ لیکن لوگ خوش تھے کہ ایک سکھ مقرر نے

Marfat.com

قرآن کی آیات پڑھی ہیں اور ان کا ترجمہ کیا ہے۔

ریاست فرید کوٹ کی پوری تاریخ میں کبھی مسلم اور غیر مسلم جھگڑا نہیں ہوا، کبھی کسی عبادت گاہ کے بارے میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ جہاں کسی کا جی چاہا، مسجد تعمیر کر لی اور جہاں جی چاہا، اذان کہنا شروع کر دی۔ مسلمان اور غیر مسلم اتفاق سے رہتے تھے اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں سے غیر مسلم مرعوب تھے۔ فرید کوٹ کے حکمرانوں کا خاندان ''براڑ'' تھا اور یہ سب حکمران شروع سے لے کر آخری حکمران ہراندر سنگھ تک مسلمانوں کا احترام کرتے رہے۔ پرجا منڈل کی تحریک کے زمانے میں ایک مرتبہ بعض لوگوں نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان فساد کرانے کی کوشش کی، لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے، رعیت کے کسی مذہب کے لوگوں نے دوسرے مذہب کے عبادت خانے پر قبضہ نہیں کیا۔

ایک مرتبہ نہ جانے مہاراجا ہراندر سنگھ کو کیا سوجھی کہ فرید کوٹ کے ایک بازار کی چھوٹی سی مسجد پر قبضہ کر کے اس میں میونسپل کمیٹی کا دفتر قائم کر دیا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس مسجد کے اردگرد کی زیادہ تر آبادی غیر مسلموں کی تھی لیکن وہ حکومت کی اس حرکت سے خوش نہ تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مسجد پر جبراً قبضہ کیا جائے۔ یہ واقعہ ریاست کے مسلمانوں کے لیے نہایت ذہنی اذیت کا باعث بنا۔ مجھے یاد ہے فرید کوٹ کی جامع مسجد میں رات کے وقت ایک میٹنگ ہوئی جس میں کوٹ کپورے کے بھی بہت سے مسلمان شامل ہوئے جو دو لاریوں میں سوار ہو کر آئے تھے۔ مسلمانوں نے حکومت سے مسجد کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن حکومت نے ان کا یہ جائز مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ مرحوم و مغفور مولانا عطاء اللہ حنیف ان دنوں کوٹ کپورے میں اقامت گزیں تھے اور وہاں کی جامع مسجد کے خطیب تھے۔ انھوں نے جمعے کے خطبوں میں حکومت کو نشانہ تنقید بنایا اور زوردار الفاظ میں مسجد کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا اور پھر ضمانت پر رہا کیا گیا۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ جرات اور بہادری کا ثبوت ہمارے ایک رشتے دار صوفی رفیق احمد بھٹی نے دیا۔ ان کے جذبہ ایمان نے جوش مارا تو وہ اس مسجد میں گئے اور جا کر اذان کہہ دی۔ ایک سکھ حکومت کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس نے اس مرد قلندر کو گرفتار کر کے جیل میں محبوس کر دیا۔ خان بہادر مولوی عبدالعزیز کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا۔ مولوی صاحب اس زمانے میں ریاست فرید کوٹ کے سیشن جج تھے، بعد کو انھیں چیف جسٹس بنا دیا گیا تھا۔ وہ ریاست کے وزیر مال بھی رہے۔ انھوں نے صوفی رفیق احمد بھٹی کو سات سال قید بامشقت کی سزا دی۔ صوفی صاحب کی ہمت مردانہ ملاحظہ ہو کہ انھوں نے اس کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہیں کی۔ حالاں کہ انھیں اپیل کا حق حاصل تھا۔ یہ جون ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے۔ ٹھیک اکتیس مہینے بعد راجا فرید کوٹ جیل کے معائنے کے لیے گیا۔ وہ مختلف بارکوں اور کوٹھڑیوں کا چکر لگاتا ہوا صوفی رفیق احمد بھٹی کی کوٹھڑی

Marfat.com

کے سامنے پہنچا تو رک گیا۔ صوفی صاحب سے پوچھا: ''کس جرم میں قید ہو اور کتنے عرصے سے جیل میں بند ہو؟''

انھوں نے جواب دیا: ''میں نے اس مسجد میں اذان کہی تھی جس کو آپ نے مسلمانوں سے چھین کر اپنے قبضے میں کر رکھا ہے اور اس جرم میں مجھے سات سال کی قید ہوئی تھی۔ اس میں سے اکتیس مہینے یعنی دو سال سات مہینے قید کاٹ چکا ہوں۔''

راجہ فرید کوٹ نے صوفی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی باقی قید معاف کر دی اور اسی وقت انھیں رہا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ یہ ۱۹۳۸ء کے آخر کی بات ہے۔ لیکن مسجد بدستور ریاستی حکومت کے قبضے میں رہی۔ صوفی رفیق احمد بھٹی آج کل اچھرہ لاہور میں مقیم ہیں اور خان بہادر مولوی عبدالعزیز مرحوم نے تقریباً بیس سال ہوئے کہ بورے والا (ضلع وہاڑی) میں وفات پائی۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۳۷ء میں مولانا معین الدین لکھوی کے والد محترم مولانا محمد علی لکھوی نے اعلان کیا اور اشتہارات شائع کیے کہ وہ اپنے مسکن مرکز الاسلام (ضلع فیروز پور) سے مسجد کی واگزاری کی تحریک شروع کریں گے اور گرفتاری کے لیے اس وقت تک لوگوں کو فرید کوٹ بھیجتے رہیں گے جب تک مسجد مسلمانوں کو واپس نہیں دے دی جاتی۔ اس اعلان سے ریاستی حکومت گھبرا اٹھی اور ریاست کی سرحد پر جو مولانا محمد علی لکھوی کے مسکن سے تین چار میل کے فاصلے پر تھی پولیس متعین کر دی گئی اور ہر آنے جانے والے شخص سے پوچھ گچھ ہونے لگی۔ مگر یہ تحریک اشاعت اشتہار کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔

۱۹۴۶ء میں جب ریاست فرید کوٹ میں پرجامنڈل کی تحریک شروع ہوئی تو حکومت کے سامنے جو مطالبات پیش کیے گئے ان میں عبادت گاہوں کی آزادی اور تحفظ کا مطالبہ بھی شامل تھا اور ایک یہ مطالبہ بھی تھا کہ فرید کوٹ کی جس مسجد پر حکومت نے جبراً قبضہ کر رکھا ہے، وہ مسلمانوں کو واپس کر دی جائے۔ اس مطالبے میں سکھ صاحبان بالخصوص سرگرم تھے۔ میں تو اس زمانے میں جیل میں تھا۔ لیکن رہائی کے بعد پتا چلا کہ جب جواہر لال نہرو راجا فرید کوٹ سے گفتگو کے بعد اس کے محل سے باہر نکلے تو انھوں نے وہاں موجود لوگوں سے کہا کہ مہاراجا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ دو ایک روز میں قیدی بھی رہا کر دیے جائیں گے اور مسجد بھی مسلمانوں کے لیے واگزار کر دی جائے گی۔ یہ بات بہت سے مسلمانوں نے بھی بتائی اور غیر مسلموں نے بھی۔ پرجامنڈل کے جن مطالبات کی فہرست لے کر وہ مہاراجا کے پاس گئے تھے، اس میں مسجد کی واپسی اور واگزاری کا مطالبہ شامل تھا اور مہاراجا نے اسے تسلیم کیا۔

بہرحال یہ مسجد مسلمانوں کے لیے ریاستی حکومت نے واگزار کر دی اور رہائی کے بعد ہم نے پہلا جمعہ اسی مسجد میں پڑھا۔ جمعے کے موقعے پر سکھ اور ہندو بہت بڑی تعداد میں آئے تھے اور مسلمانوں کی اس خوشی میں

Marfat.com

شریک ہوئے تھے۔ پر جامنڈل سے تعلق رکھنے والے افراد بالخصوص وہاں حاضر تھے۔ گیانی ذیل سنگھ بھی بازار میں مسجد کے قریب ایک جگہ آ کر بیٹھ گئے تھے۔ جمعے کے بعد گیانی جی نے مختصر سی تقریر بھی کی اور مسلمانوں کو اپنی اور غیر مسلموں کی طرف سے مسجد کی واگزاری پر مبارک باد دی۔ خطبہ جمعہ مولوی محمد سعید شبلی مرحوم نے پڑھایا تھا جو احناف کے بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔

پر جامنڈل کی تحریک میں گیانی ذیل سنگھ نے بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ ایک مرتبہ ۱۹۴۶ء کی تحریک کے دوران ریاست کی پولیس نے ان کو اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے اور پولیس اسی حالت میں انھیں چھوڑ کر چلی گئی۔ اتفاق سے میرے دو عزیز میاں محمد صدیق اور میاں محمد زکریا جو تقسیم کے بعد جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) میں مقیم ہو گئے تھے، ادھر سے بس لے کر آ رہے تھے کہ ان کی نظر گیانی جی پر پڑی۔ ان کو دیکھ کر وہیں بس روکی اور انھیں اٹھا کر دودھ وغیرہ پلایا اور محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ خاصی دیر بعد وہ ہوش میں آئے۔

گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو ریاست فرید کوٹ کے جن پولیس آفیسروں نے زیادہ نشانہ ستم بنایا، ان میں ایک پولیس انسپکٹر عجائب سنگھ تھا جو بڑا سخت مزاج اور بدتمیز تھا۔ لیکن اپنے مطلب کے لیے بہت میٹھا بھی تھا۔

ہم فرید کوٹ جیل میں تھے کہ ایک رات سخت آندھی آئی۔ وہ ''روہی'' کا علاقہ تھا، اور جیل کے پچھلی جانب ریت کے ٹیلے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام ٹیلوں کی ریت نے ہماری کوٹھڑیوں پر دھاوا بول دیا ہے۔ میری کوٹھڑی کے بائیں جانب قاضی عبیداللہ کی کوٹھڑی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ قاضی عبیداللہ کی کوٹھڑی سے مجھے کھسر پھسر سنائی دینے لگی۔ میں منہ سر لپیٹ کر لیٹا ہوا تھا، منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو تین چار آدمی لوہے کی سلاخوں کے ساتھ باہر کھڑے ان سے باتیں کر رہے تھے۔ میں سخت حیران ہوا، سمجھنے کی کوشش کی، لیکن کوئی بات سمجھ نہ آئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس وقت یہ کون لوگ یہاں آئے ہیں۔ چند منٹ بعد وہی حضرات میری کوٹھڑی کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور میرا نام لے کر آواز دی۔ میں نے لیٹے لیٹے دیکھا تو انھیں پہچان نہ سکا۔ انھوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا، بولے: ''میں عجائب سنگھ پولیس انسپکٹر ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی ایک اور عجائب سنگھ تھا جو داروغہ جیل تھا۔ یہ بہت شریف اور نرم دل آدمی تھا۔ تیسرا آدمی بہرام خاں تھا۔ یہ بھی جیل کا ایک آفیسر تھا۔ لمبا قد، متوازن جسم، بڑی بڑی مونچھیں، دیکھنے میں بڑا بارعب اور ہیبت ناک، لیکن بات چیت اور میل جول میں نرم، بہت اچھا آدمی تھا۔ ہم لوگوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ کسی سکھ ریاست میں اس قسم کے دھیمے مزاج کے کم ہی مسلمان اہل دیکھنے میں آئے ہیں۔ جیل خانوں میں جہاں ہر سو ہیبت ہی ہیبت چھائی ہو، اس قسم کے آدمیوں کو بسا غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ پچاس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن میں بہرام خاں کو نہیں بھولا۔ وہ مجھے اکثر یاد آتا ہے اور مسکراہٹ کے وقت اس کی بڑی

Marfat.com

بڑی مونچھوں کے عقب میں اس کے سفید دانت اب بھی مجھے صاف دکھائی دے رہے ہیں۔

اب عجائب سنگھ پولیس انسپکٹر کی سنیے۔ اس نے مجھے نرمی سے کہا: ''تم پرجامنڈل کو چھوڑ دو اور ریاست کی مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کو مضبوط بناؤ۔''

میں نے کہا: ''آپ کو مسلم لیگ سے کیا تعلق؟''

بولے: ''مہاراجا چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں، اس کو مستحکم بنائیں اور پھر اسی کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کریں۔ حکومت ان کی پوری مدد کرے گی اور سکھوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں ان کو ترجیح دے گی۔''

اس نے یہ بھی کہا کہ تم مسلم لیگ میں شامل ہونے اور ریاست میں اس کو مستحکم کرنے کا وعدہ کرو تو ابھی تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔

کافی دیر اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نہیں مانا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمھاری جائداد ضبط کر لی جائے گی۔ میں نے کہا: جاؤ جو جائداد میرے نام ہے، وہ ضبط کر لو۔ میرے نام کچھ بھی نہیں تھا جو کچھ تھا وہ میرے والد (میاں عبدالمجید) کے نام تھا۔

وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ مسلم لیگ میں شامل ہونے کی صورت میں تمھیں بہت سی مراعات دی جائیں گی۔ اس کے بعد پتا چلا کہ قاضی عبیداللہ سے بھی اس نے اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۶ء میں ریاست فریدکوٹ میں مسلم لیگ بنائی گئی تھی، لیکن اس کا دائرۂ رکنیت صرف شہر فریدکوٹ کے ان مسلمان حضرات تک محدود تھا جو سرکاری ملازم تھے اور ملازمت کی وجہ سے پرجامنڈل کے ہم نوا نہیں تھے، عام مسلمانوں کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ایک سیاسی ضرورت کے لیے سرکار کے کہنے سے اس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ورنہ جہاں کوئی سیاسی جماعت قائم نہ ہو سکتی ہو، وہاں مسلم لیگ جو خالص مسلمانوں کی سیاسی جماعت تھی، کیوں کر معرض قیام میں آ سکتی تھی۔

عجائب سنگھ پولیس انسپکٹر گیانی سنگھ کا شدید مخالف تھا۔ گیانی جی نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس نے ان کو اکالی دل میں شمولیت اختیار کرنے، اس کو ریاست میں منظم کرنے اور سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے کہا تھا۔ ہندوؤں پر زور دیا تھا کہ ہندو مہاسبھا بنائیں اور مسلمانوں کی مخالفت کریں، حالاں کہ ریاست میں ہندو مہاسبھا نہیں تھی۔ اس طرح عجائب سنگھ نے ہر مذہب کے لوگوں سے ان کے مذہب کے مطابق الگ الگ بات کی اور ان کی کمزور رگ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

گیانی ذیل سنگھ کے جگری دوست قاضی عبیداللہ ریاست فریدکوٹ کی پرجامنڈل کے جنرل سیکرٹری تھے

Marfat.com

جب کہ گیانی ذیل سنگھ اس کے صدر تھے۔ قاضی عبیداللہ نے پرجامنڈل میں سب سے زیادہ قربانی دی اور کئی سال جیل میں رہے۔ جب جیل سے باہر آتے ریاستی حکومت کی طرف سے کوئی نہ کوئی مقدمہ قائم کر کے انھیں گرفتار کر لیا جاتا۔ ان کے چھوٹے بھائی قدرت اللہ اور بوڑھے والد میاں محمد سلیمان مرحوم کو بھی کئی مرتبہ گرفتار کر کے مبتلائے اذیت کیا گیا۔ لیکن یہ بہت سخت جان اور دل گردے کے لوگ تھے۔ ہر قسم کی اذیتیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ ایک دفعہ گندم کی کٹائی سے چند روز پہلے ان دونوں بھائیوں اور باپ کو گرفتار کر کے حوالہ زنداں کر دیا گیا۔ ادھر گندم بھی پک چکی تھی اور اس کی کٹائی شروع ہوگئی تھی...... ایک زمیندار کے لیے یہ نہایت نازک موقع ہوتا ہے۔ ان کی گندم کی کٹائی پرجامنڈل کے ارکان نے کی جن میں گیانی ذیل سنگھ بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی گندم کاٹتے تصویریں اتاری گئی تھیں، کھانے پینے کا انتظام ہم نے خود کیا تھا۔ قاضی عبیداللہ کے گھر سے ازراہ ہمدردی نہ کسی نے روٹی کھائی نہ پانی پیا۔

ان دنوں گیانی ذیل سنگھ عام طور پر نیلی پگڑی باندھتے تھے۔ قاضی عبیداللہ کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ پرجامنڈل سے تعلق رکھنے والے سکھوں کو سفید پگڑی باندھنی چاہیے۔ نیلی پگڑی اکالیوں کی علامت ہے جو فرقہ پرستی اور تعصب کی دلیل ہیں۔ کوٹ کپورہ کی پرجامنڈل کے پردھان بھائی دیال سنگھ کا یہی نقطہ نظر تھا اور وہ اس سلسلے میں قاضی عبیداللہ کے حامی تھے۔ گیانی ذیل سنگھ اصولی طور پر ان کی بات کو صحیح قرار دیتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ میں بہت عرصے تک اکالی دل سے وابستہ رہا ہوں اور اس دوران نیلی پگڑی باندھتا رہا ہوں، اس لیے فوری طور پر اسے چھوڑنا مشکل ہے، کچھ عرصے بعد چھوڑ دوں گا اور سفید پگڑی باندھنا شروع کر دوں گا۔ لیکن قاضی عبیداللہ بہت تیز تھے، وہ گیانی جی کی اس قسم کی باتوں سے اور زیادہ غصے میں آجاتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں ''تدریج'' کے قائل نہ تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کو بھی بدلنا چاہیے اور جس کام اور لباس سے فرقہ پرستی کا اظہار ہوتا ہو، اسے بلاتاخیر ترک کر دینا چاہیے، اس مسئلے نے اندر ہی اندر خاصی الجھن پیدا کر دی تھی۔

بالآخر یہ ہوا کہ قاضی عبیداللہ نے دفتر جانا بند کر دیا اور کہا کہ وہ سیکرٹری شپ سے استعفا دے دیں گے اور گیانی ذیل سنگھ کی صدارت میں کام نہیں کریں گے تاوقتیکہ وہ نیلی پگڑی باندھنا ترک نہیں کریں گے۔ ادھر گیانی جی نے مجھ سے کہا کہ میں قاضی صاحب پر ان کی پوزیشن واضح کروں اور انھیں استعفا دینے سے روکوں۔ کئی مہینے یہ قصہ چلتا رہا۔ میں کوٹ کپورے کی پرجامنڈل کا جنرل سیکرٹری تھا۔ اب ریاست کی پرجامنڈل کے جنرل سیکرٹری کا کام بھی میرے سپرد کر دیا گیا۔ آخر میں نے کسی نہ کسی طرح قاضی صاحب کو نرم کر لیا۔ ان کا زیادہ وقت اپنے محلے کی مسجد کے حجرے میں گزرتا تھا، میں جاتا تو نہایت محبت سے پیش

Marfat.com

آتے، حالاں کہ میں ان سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔

میں نے ایک طرف قاضی عبیداللہ کو نرم کیا، دوسری جانب گیانی ذیل سنگھ سے کہا کہ وہ ہفتے میں دو یا تین بار سفید پگڑی باندھا کریں تا کہ ان کی ''سنگ'' دور ہو اور آہستہ آہستہ سفید پگڑی کی عادت پڑے۔ بہر حال انھوں نے سفید پگڑی باندھنا شروع کر دی، ابتدا میں کچھ حجاب سا رہا، بعد میں اس کے عادی ہو گئے تھے۔ ایک دن میں گیانی جی اور بھائی دیال سنگھ کو قاضی عبیداللہ کی مسجد لے گیا۔ یہ اچانک حملہ تھا...... قاضی صاحب بہت اچھی طرح ملے۔ دوستانہ گلے شکوے کیے اور بات ختم ہوگئی۔ پھر ہم ان کو پرجامنڈل کے دفتر لے گئے۔ وہ کافی عرصے بعد دفتر گئے تھے۔ بہت سے لوگ وہاں بیٹھے تھے۔ میں قاضی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر انھیں آگے لے گیا اور ان کے لیے راستہ بناتے ہوئے کہا:

''آئی میم کواری رستہ صاف کرو۔''

اتفاق سے قاضی صاحب اس زمانے میں کنوارے تھے اور یہ پنجابی بولی ان کے حسب حال تھی۔ ان کے رنگ روپ کی وجہ سے بھی ان پر چسپاں ہوتی تھی۔ اس کی مجھے خوب داد ملی۔

اس کے بعد گیانی جی سفید پگڑی باندھنے لگے تھے، اگرچہ ''سر کا مزہ'' بدلنے کے لیے کبھی کبھی نیلی پگڑی بھی باندھ لیتے تھے، لیکن زیادہ تر سفید پگڑی ''زیب سر'' کرتے تھے۔ بھائی دیال سنگھ جو اکالی لہر میں قید کاٹ چکے تھے، اکالی دل اور نیلی پگڑی کے خلاف تھے۔ وہ اسے مذہبی شعار نہیں سمجھتے تھے بلکہ تعصب کا نشان قرار دیتے تھے۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ''زیب سر'' کا لفظ میں نے گیانی جی کے سامنے بھی استعمال کیا تھا۔ جس دن وہ پہلی مرتبہ سفید پگڑی باندھ کر آئے تو اتفاق سے کئی سکھ صاحبان دفتر میں بیٹھے تھے۔ ان میں ایک صاحب گوربخش سنگھ تھے جو نئے نئے فوج سے ریٹائر ہو کر ہمارے طبقے میں شامل ہوئے تھے۔ انھوں نے گیانی جی کی سفید پگڑی دیکھ کر کہا۔ ماشاءاللہ، میں نے کہا آج انھوں نے سفید پگڑی ''زیب سر'' فرمائی ہے۔ گیانی جی بولے۔ ''زیب تن'' تو ہم نے سنا ہے، یہ ''زیب سر'' کیا ہوتا ہے؟ گوربخش سنگھ نے جواب دیا: ''وہی جو زیب تن ہوتا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ قاضی عبیداللہ اور گیانی جی کے اختلاف کے دنوں میں جب اس مسئلے پر گفتگو ہوتی تو گیانی جی بہت دھیمے اور نرم لہجے میں بات کرتے اور اس طرح سنبھل سنبھل کر بولتے جیسے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ بعض اوقات تو ان پر واقعی ترس آنے لگتا۔ اس کے برعکس قاضی صاحب سراپا احتجاج بن جاتے، تند و تیز لہجے میں بات کرتے اور ان کا چہرہ جو ماشاءاللہ پہلے ہی سرخ تھا، اور سرخ ہو جاتا اور ایسے لگتا جیسے رخساروں میں انگارے دہک رہے ہوں۔ میں اگر آہستہ بات کرنے اور جذبات پر قابو رکھنے

Marfat.com

کے لیے گزارش کرتا اور یہ کہتا کہ گیانی جی آرام سے بول رہے ہیں، آپ بھی آرام سے بات کریں تو مجھ پر برس پڑتے اور جوش میں آ کر کہتے۔ ''جاؤ تم اور تمھارا گیانی اپنا کام کرو، میں تمھیں جانتا ہوں، میں سچ کہنے سے نہیں رک سکتا، گیانی دس گیارہ سال سے ہمارے ساتھ کام کر رہا ہے اور ابھی تک اکالیوں سے ڈرتا ہے۔''

ان کی اس قسم کی باتوں سے ہم سہم جاتے اور ڈر کے مارے خاموشی اختیار کر لیتے۔

گیانی جی طبعاً نرم مزاج تھے اور دوسرے کے بارے میں بات کرنے اور رائے دینے میں بہت محتاط تھے۔ ان سے اگر کوئی سخت رویہ اختیار کرتا تو خاموش رہتے، اپنے ساتھیوں کی کمزوری کو چھپاتے اور ان کی اچھائی جگہ جگہ بیان کرتے۔ اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کا بالخصوص احترام کرتے۔ بھائی دیال سنگھ ریاستی پرجامنڈل کے معمر رہنما تھے اور بااصول آدمی تھے۔ شریف، متین، دیانت دار اور معاملہ فہم...... جس بات کو صحیح سمجھتے، اس پر اڑ جاتے اور جسے غلط سمجھتے، اس کی برملا مخالفت کرتے...... بعض معاملات میں وہ گیانی ذیل سنگھ کی رائے سے اتفاق نہ کرتے تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لیکن گیانی جی ان کے سامنے ہمیشہ خاموش رہتے۔ بھائی دیال سنگھ مجھے محمد اسحاق نہیں کہتے تھے، وہ یہ الفاظ زبان سے ادا نہیں کر پاتے تھے۔ اس لیے کہتے: ''ساک ممدا! جیلے نال نہ پھریا کر۔ ایہہ بڑا تسی اے۔'' (یعنی محمد اسحاق! تم ذیل سنگھ سے تعلق نہ رکھو، یہ متعصب آدمی ہے) لیکن یہ محض ان کا خیال تھا اور غلط فہمی پر مبنی...... میں واقعات کی روشنی میں اس کی تردید کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ذیل سنگھ میں کبھی کوئی تعصب کی بات نہیں دیکھی۔ وہ میرے نزدیک بلاشبہ غیر متعصب تھے۔

بھائی دیال سنگھ اپنے مذہب کے پابند تھے۔ جس طرح وہ خود اپنے مذہب کی رسوم و عبادات پابندی سے بجا لاتے تھے، اسی طرح دوسروں کو بھی اپنے مذہب پر پابند رہنے اور عمل کرنے کی تاکید کرتے۔ نماز کا وقت ہو جاتا تو مجھے خاص طور سے کہتے۔ ''ساک ممدا!'' نماج دا ویلا ہو گیا اے، اٹھ پہلاں نماج پڑھ، پھیر گورمتے کراں گے۔'' (یعنی اسحاق نماز کا وقت ہو گیا، اٹھو پہلے نماز پڑھو، پھر صلاح مشورے کریں گے۔)

بھائی دیال سنگھ کا لڑکا اوتار سنگھ جو اس زمانے میں نوجوان تھا، چند امور میں اکالی دل کا حامی تھا اور کسی نہ کسی طریقے سے اس کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ اگر باپ کے سامنے وہ اس قسم کی بات کرتا تو وہ سخت خفا ہوتے اور غصے سے کہتے۔ ''اوتار سیاں بندہ بن جا، میرے کولوں مار نہ کھائیں۔''

''میں تاں کجھ نہیں کہیا باپو جی۔'' کہہ کر اوتار سنگھ خاموش ہو جاتا۔

یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۴۶ء میں آریہ سماجیوں نے نظام حیدر آباد (دکن) کے خلاف تحریک چلائی تھی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے چار چار پانچ پانچ آدمی روزانہ حیدر آباد جا کر گرفتاری دیتے تھے۔ ظاہر ہے یہ خالص فرقہ وارانہ تحریک تھی اور معروف معنوں میں اس کا کوئی سیاسی مقصد نہ تھا۔ فقط

Marfat.com

حیدر آباد (دکن) کی مسلمان حکومت کی مخالفت اس کا اصلی مقصد تھا۔ ہمارے ایک دوست مہاشہ کہر چند ایک دن پرجامنڈل کے دفتر آئے۔ یہ آریہ سماجی تھے اور پرجامنڈل سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کی طرف سے دس پندرہ آدمیوں کو گرفتاری کے لیے حیدر آباد بھیجنا چاہیے۔ بھائی دیال سنگھ یہ الفاظ سن کر بھڑک اٹھے اور سختی سے کہا کہ ہم فرقہ وارانہ معاملات میں ہرگز حصہ نہیں لیں گے۔ پھر اسی پر بس نہیں کی، رات کو غلہ منڈی میں ایک جلسہ عام منعقد کیا، جس میں مختلف حضرات نے تقریریں کیں اور حکومت حیدر آباد کے خلاف آریہ سماجیوں کی تحریک کی مذمت کی۔ بھائی دیال سنگھ نے اس جلسے میں پنجابی میں یہ ریزولیشن پیش کیا کہ ''اسیں آریہ سماج دی ایس لہر دی جو ریاست حیدر آباد دے خلاف چلائی گئی اے، نکھدیا کردے ہاں، ایس لئی کہ ایہ اک خاص فرقے دی لہر اے، جہید ا سیاست نال کوئی واسطہ نہیں۔''

یعنی ہم آریہ سماج کی اس تحریک کی جو ریاست حیدر آباد کے خلاف چلائی گئی ہے، مذمت کرتے ہیں، اس لیے کہ یہ ایک خاص فرقے کی تحریک ہے، جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی تائید ایک ہندو بہاری لال دیوانہ نے کی جو بہت دبنگ نوجوان تھا۔ یہ ریزولیشن متفقہ طور پر منظور ہوا۔

دیال سنگھ کا میرے دل میں اس وقت بھی احترام تھا، اب بھی احترام ہے۔ وہ ''سنت'' آدمی تھے۔ لوگ ان کی عزت کرتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے۔ میں ان کے سامنے بھی لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ یہ سنت آدمی ہیں، ان کی عزت اور سیوا کرنی چاہیے۔

کر سنتاں دی سیوا سرگاں نوں جاویں گی۔

اس زمانے کے چھوٹے بڑے بہت سے واقعات ذہن میں گھوم رہے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ انھیں بیان کر دیا جائے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی اندیشہ ہے کہ اس سے دامن تحریر بہت دراز ہو جائے گا، تاہم چند باتیں عرض کرتا ہوں۔

دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد ۱۹۴۵ء میں جب ہندوستان کی برطانوی حکومت نے سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو رہا کیا اور کچھ عرصے بعد عام انتخابات کا اعلان کیا تو ملک کے لیڈروں نے دوروں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جن میں اس عہد کے مشہور سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش نارائن بھی شامل تھے۔ وہ پنجاب کے دورے پر آئے تو ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ ضلع فیروز پور کے ایک شہر ''موگا'' پہنچے تو ریاست فرید کوٹ کی پرجامنڈل کے ہم چند ارکان ان سے ملنے گئے۔ ہم نے جے پرکاش نارائن کو فرید کوٹ آنے اور تقریر کرنے کی دعوت دی۔ وہ مان گئے اور اپنے پروگرام میں کچھ تبدیلی کر کے اپنی اہلیہ کے ساتھ دوسرے دن چار بجے فرید کوٹ پہنچے۔

گرمیوں کا موسم تھا اور رمضان کا مہینہ۔ فرید کوٹ شہر کی غلہ منڈی میں نماز عشا اور تراویح کے بعد دس

Marfat.com

بجے ان کی تقریر کا اعلان کیا گیا۔ مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی (جو جید عالم دین تھے اور جنھوں نے ۸۔ مئی ۱۹۸۷ء کو موضع کمیانہ ضلع فیصل آباد میں وفات پائی) اس زمانے میں ہر سال فرید کوٹ کی مسجد اہل حدیث میں نماز تراویح پڑھاتے اور قرآن مجید سناتے تھے۔ ہم نے ان سے جلسے کی صدارت کے لیے عرض کیا۔ از راہ کرم انھوں نے ہماری گزارش منظور فرمائی اور جلسے کی صدارت کی۔ سٹیج سیکرٹری کے فرائض میرے ذمے تھے۔ تلاوت قرآن مجید اور نظم کے بعد جے پرکاش نارائن نے تقریر شروع کی۔ نہایت شستہ اور عام فہم اردو میں انھوں نے اظہار خیال کیا۔ تقریر میں انگریز کی مخالفت کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کی۔ کسی جماعت یا کسی رہنما کا کسی بھی انداز میں نام نہیں لیا۔

بہت بڑا مجمع ہمہ تن گوش تھا۔ جلسے کے دوران خیر خواہانہ رنگ میں ایک شخص نے میرے کان میں کہا کہ کچھ افراد نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ تم لوگ رات کو جلسے سے فارغ ہو کر کوٹ کپورے جاؤ گے تو تمھیں راستے میں پکڑا جائے گا اور سب کی پٹائی کی جائے گی۔ جوانی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ڈر، جھجک اور گھبراہٹ کا کبھی تصور بھی ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میں نے نہایت بے باکی سے جواب دیا، جلسہ ختم کر کے ہم یہاں سے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ کون ہمارا راستہ روکتا ہے۔ میرے ایک عزیز عبدالشکور کا ریس کا گھوڑا تھا جو بہت دوڑتا تھا۔ میں نے ان سے تانگہ لے کر آنے کے لیے کہہ رکھا تھا، کیوں کہ جلسے کے بعد واپس اپنے گھر پہنچنا تھا۔ رات کے ایک بجے جلسہ ختم ہوا اور ساتھ ہی آسمان پر بادل چھا گئے اور ہلکی ہلکی سی بارش ہونے لگی۔ میں، گیانی ذیل سنگھ، بھائی دیال سنگھ اور قاضی عبیداللہ تانگے پر سوار ہوئے تو میں نے ان سے کہا کہ راستے میں حملے کا خطرہ ہے، اس لیے چوکس رہنا اور اِدھر اُدھر دھیان رکھنا ضروری ہے۔ ذیل سنگھ نے یہ الفاظ سن کر گھبراہٹ کا اظہار کیا تو عبدالشکور نے کہا: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم چلیں گے تو کوئی ہمیں پکڑ نہیں سکے گا۔ بس دعا کیجیے کہ درخت گرا کر راستہ نہ بند کر دیا گیا ہو۔

فرید کوٹ سے کوٹ کپورہ بجانب مشرق سات میل کے فاصلے پر ہے اور گیانی ذیل سنگھ کا گاؤں ''سندھواں'' جو راستے میں پڑتا ہے، وہاں سے پانچ میل ہے۔ ان دنوں فرید کوٹ اور سندھواں کے درمیان کوئی آبادی نہ تھی، راستے میں لب سڑک صرف ایک گوردوارہ تھا جو بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں ایک نلکا تھا، جس کے ساتھ ایک پختہ چوبچا سا بنا ہوا تھا اور تانگے والے وہاں گھوڑوں کو پانی پلاتے تھے۔ اس کے اردگرد کافی دور تک پھیلا ہوا چھوٹے بڑے درختوں کا ایک ذخیرہ تھا۔ میں اور گیانی ذیل سنگھ تانگے میں اگلی سیٹ اور قاضی عبیداللہ اور بھائی دیال سنگھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اندھیری رات تھی، رات کے سناٹے میں گھوڑا دوڑنے لگا تو اس کے ٹاپوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور اس کے زوردار

Marfat.com

قدموں سے تارکول کے سیاہ کمبل میں لپٹی ہوئی سڑک کے تن بدن سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ہم ''بابا فرید دی مال'' سے تین فرلانگ آگے نکلے ہوں گے کہ سڑک کے دونوں طرف جھاڑیوں میں کھٹکھٹاہٹ سی ہوئی اور ایک دم چار لاٹھیاں اوپر کو اٹھ گئیں، لیکن ہم نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ موقعے کی نزاکت کو بھانپ کر شکور نے خاموشی کا قفل توڑا اور چھانٹا لہراتے ہوئے گھوڑے کو للکارا۔ گھوڑے نے جب خطرہ محسوس کیا اور مالک کی آواز سنی تو اور تیز ہو گیا۔

ادھر بھائی دیال سنگھ نے مجھ سے مخاطب ہو کر ذرا اونچی آواز میں کہا: ''ساک مدا چلا دے پستول۔''

ہم بالکل خالی ہاتھ تھے اور پستول چلانے کی آواز محض ''پھوکا ڈراوا'' تھا۔ اتنے میں برق رفتار گھوڑا جو تیزی سے سفر کو نگل رہا تھا، ایک میل آگے نکل کر گوردوارے تک جا پہنچا۔ ہم چاروں تو خطرے میں تھے ہی اور خطرناک بھی تھے۔ ہمارے ساتھ پانچواں عبدالشکور بھی خطرے کی زد میں تھا۔ مگر اللہ نے سب کو محفوظ رکھا اور چند منٹ میں ہم سندھواں پہنچ گئے۔ تانگہ سڑک پر کھڑا کیا۔ میں اور قاضی عبیداللہ تانگے سے اترے اور گیانی ذیل سنگھ کو ان کے گھر چھوڑ کر آئے۔ پھر چار پانچ منٹ بعد کوٹ کپورے جا پہنچے۔ پہلے غلہ منڈی گئے، وہاں ''بازار مائی سیواں'' میں بھائی دیال سنگھ کی دودھ دہی کی دکان تھی اور دکان کے اوپر ان کی سکونت تھی، ان کو وہاں اتار کر قاضی عبیداللہ کے مکان پر گئے اور پھر اپنے گھر میں پہنچے۔ اتنے میں سحری کی اذان ہونے لگی اور ہم سحری کھانے میں مشغول ہو گئے۔ تمام رات بھاگ دوڑ میں گزر گئی۔

دوسرے دن آٹھ نو بجے پرجا منڈل کے دفتر پہنچے۔ کچھ دیر بعد گیانی جی اور دوسرے دوست بھی آ گئے۔ رات کی باتیں ہونے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا: سیاست کے عشق نے دلوں سے خوف و ہراس نکال دیا ہے۔ اگر خدانخواستہ رات کسی کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو پنجابی کی یہ بولی ہم پر بالکل صحیح ثابت ہوتی:

کندھاں ٹپ کے بھنا لیے گوڈے
نی پیٹے عشق دیے

یہ وہی گیانی ذیل سنگھ ہیں جو پانچ برس ہندوستان کے صدر رہے اور ہزاروں محافظ اور باڈی گارڈ جن کے آگے پیچھے چلتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اتنے لمبے عرصے کی چھوٹی چھوٹی باتیں انھیں یاد رہی ہوں گی۔ مجھے چوں کہ خود ''بڑا آدمی'' بننے کا تجربہ نہیں ہے، اس لیے میں سمجھتا تھا کہ بڑا بننے کے بعد انسان پہلی باتیں بھول جاتا ہے، گیانی جی بھی بھول گئے ہوں گے، لیکن ان کے ایک خط سے (جو انھوں ۴۔ اپریل ۱۹۸۴ء کو مجھے لکھا تھا اور ۱۲۔ اپریل کو مجھے ملا تھا) معلوم ہوا کہ وہ پچھلی باتوں کو بھولے نہیں، وہ باتیں انھیں یاد ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں۔ ''آپ کے خطوط پا کر بے حد خوشی ہوئی، بڑی پرانی یادیں فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔''

Marfat.com

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ گیانی جی، بھائی دیال سنگھ اور دوسرے غیر مسلم رمضان کے دنوں میں دفتر آتے تو ہمارے سامنے نہ پانی پیتے تھے نہ کچھ کھاتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ آپ کی طرح روزہ نہیں رکھتے، کیوں کہ یہ ہمارے مذہب میں شامل نہیں ہے، لیکن روزہ رکھنے اور اپنے مذہب پر عمل کرنے والوں کی ہم قدر کرتے ہیں اور روزہ دار کے سامنے کھانا پینا ہمارے نزدیک گناہ ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ یہ گناہ ہمارے اعمال ناموں میں لکھا جائے۔

آج سے پچاس برس پہلے جس گیانی ذیل سے میری دوستی تھی، وہ ایک غریب گھرانے کے غریب آدمی تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی اور گیانی جی ریاست فرید کوٹ کی مقامی سیاست میں مصروف رہنے کی وجہ سے بیوی اور بیٹی کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے اخراجات کی ذمے داری گیانی جی کے بڑے بھائیوں کے سپرد تھی۔ گیانی جی ان دنوں ''ہرنیا'' کے مریض بھی تھے اور کمر پر پیٹی باندھ کر رکھتے تھے۔

گیانی جی کے پرانے ساتھیوں میں ایک شخص چودھری محمد حسین ہیں جو فرید کوٹ جیل میں ان کے ساتھ ساڑھے تین سال قید کاٹ چکے ہیں اور آج کل پتوکی (ضلع قصور) میں مسلم لیگ کے سرگرم رکن ہیں۔ ابتدا ہی سے ان کے دونوں پاؤں ٹیڑھے ہیں۔ وہ ارائیں برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ پاؤں کے نقص کی وجہ سے ان کے لیے رشتے کے حصول میں دقت پیش آرہی تھی۔ گیانی جی کو اس کا بہت احساس تھا، چناں چہ انھوں نے ذاتی کوشش سے ایک گاؤں کے ارائیں خاندان میں ان کی شادی کرادی۔ جس لڑکی سے ان کی شادی ہوئی، اس کو وہ اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ چودھری محمد حسین نے مجھے بتایا کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد وہ ہندوستان گئے تو گیانی جی سے ملے۔ گیانی جی نے ان سے خاص طور پر پوچھا کہ ہماری بیٹی کا کیا حال ہے۔

مشرقی پنجاب کے جس علاقے سے میرا اجدی پشتی تعلق تھا، اس میں پنجابی کے لوک گیتوں اور بولیوں کی کئی قسمیں تھیں۔ ان میں ایک قسم کا نام ''کویشری'' تھا۔ مغربی پنجاب کے کسی شخص سے میں نے ''کویشری'' کا لفظ نہیں سنا اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نواح میں اس کا رواج تھا یا نہیں تھا۔ پنجابی میں ہر گانے والا کویشری کے انداز میں نہیں گا سکتا تھا۔ یہ ایک الگ ہی انداز تھا اور بڑا موثر اور دردناک تھا۔ اس انداز سے گانے والے کو ''کویشر'' کہا جاتا تھا۔

گاؤں کی کھلی جگہ میں اکھاڑہ جم جاتا تھا اور لوگ ایک بڑا سا دائرہ اور حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے۔ کویشر درمیان میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ اکھاڑے میں چل پھر کر پہلے اپنے خاص انداز اور لہجے میں ایک واقعہ بیان کرتا اور پھر اس کو آگے چلانے کے لیے کہتا ''ہن دیکھو بھلا اگے کی معاملہ پیش اونداا ے۔'' اس کے بعد وہ کان پر ہاتھ رکھ کر گانا شروع کر دیتا، جس میں واقعہ کی پوری تفصیل آجاتی، اکثر اوقات کویشری ایسے دردناک

Marfat.com

واقعے پر مشتمل ہوتی کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور اس کو ایک خاص رنگ میں ڈھالنا کویشر کے فن کا کمال سمجھا جاتا تھا۔

بعض لوگ سیاسی کویشری بھی گاتے تھے۔ وہ کسی دردناک سیاسی واقعہ کو پنجابی بولیوں یا گیتوں کا جامہ پہناتے اور پھر اسے ایک خاص رنگ میں گاتے۔ سننے والے یوں محسوس کرتے جیسے یہ واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ بعض دفعہ کویشری لگانے والا ایک ہی شخص ہوتا اور بعض دفعہ دو یا تین ہوتے جنھیں ''جوڑی'' کہا جاتا تھا۔

ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں کا نام دیپ سنگھ والا تھا۔ وہاں ہم نے ریاستی پرجامنڈل کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ گیانی ذیل سنگھ اس جلسے میں موجود تھے۔ مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ جلسے میں ایک کویشر کو بھی بلایا گیا تھا جو سکھ تھا اور سیاسی کویشری لگاتا تھا۔ رات کے وقت اس نے کویشری لگائی، جس میں ایک ایسے شخص کی داستان بیان کی گئی تھی، جسے انگریزی حکومت نے بغاوت کے جرم میں پکڑا، اس پر مقدمہ چلایا اور کالے پانی کی سزا دی۔ اس کی ماں اور ایک بہن تھی۔ ماں نے بیٹے اور بہن نے بھائی کی جدائی میں جن جذبات کا اظہار کیا...... کویشر نے اسے ایسے دردناک الفاظ میں بیان کیا کہ سب کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ گیانی جی بھی آب دیدہ ہو گئے اور مجھ سے کہا: ''اسحاق جی! اس کویشر کے بعد کسی کی تقریر دل لگا کر نہیں سنی جائے گی۔''

واقعی ایسا ہی ہوا، خود گیانی جی کی تقریر بھی جسے لوگ بڑے شوق سے سنتے تھے، توجہ سے نہ سنی گئی اور چند باتیں بیان کرنے کے بعد انھیں بیٹھ جانا پڑا۔

ہمارے ساتھ گیانی ذیل سنگھ کے تعلقات کی یہ نوعیت تھی کہ خوشی اور غمی کے موقعے پر وہ ہمارے ہاں آتے اور اس میں شرکت کرتے تھے۔ جون ۱۹۴۶ء میں میرے ماموں عبدالخالق عین عالم جوانی میں وفات پا گئے۔ گیانی جی کو پتا چلا تو اپنے کئی مسلمان اور غیر مسلم دوستوں کے ساتھ افسوس کے لیے ہمارے گھر آئے، میرے نانا حکیم محمد رمضان مرحوم اور دیگر متعلقین سے ملے اور سب سے الگ الگ اظہار افسوس کیا۔

کوٹ کپورہ کی انجمن اصلاح المسلمین کا ہر سال مارچ کے مہینے میں تین دن سالانہ جلسہ ہوتا تھا، جس میں ملک کے جید علما اور مقررین کو دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں آخری سالانہ جلسہ ہوا۔ اس میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے ''اسلام اور دیگر مذاہب'' کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ گیانی جی اس تقریر میں موجود تھے۔ تقریر کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا: ''یہ مولانا صاحب کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے بہت اچھی تقریر کی ہے، میں ان کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ان کو مولانا ندوی سے ملایا اور انھوں نے مولانا کی تقریر کی تعریف کی اور کہا کہ اگر سب لوگ

Marfat.com

اپنے اپنے مذہب کے بارے میں آپ کے نقطہ نظر کو اپنا لیں تو ہر طرف امن ہی امن ہو جائے۔

۱۹۴۷ء کے اگست میں جب ملکی حالات بہت زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گئے اور راولپنڈی وغیرہ کے علاقوں سے اروڑے سکھ ہماری ریاست میں آنا شروع ہو گئے تو گیانی ذیل سنگھ، بھائی دیال سنگھ اور ایک ہندو دوست نے جس کا نام رام لال یا رام داس تھا اور بہت مخلص اور ہمدرد آدمی تھا، رازداری کے انداز میں جھجکتے اور ڈرتے ڈرتے مجھے اور قاضی عبید اللہ سے کہا کہ فرقہ وارانہ صورت حال بدلتی جا رہی ہے، آپ دہلی جا کر مولانا ابوالکلام آزاد سے ملیں اور ریاست فرید کوٹ کے مسلمانوں کے بارے میں ان سے بات کریں۔ اتفاق سے مہاراجا فرید کوٹ ہراندر سنگھ ان دنوں دہلی میں تھے اور یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ وہ اپنی ریاست کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے مختلف رہنماؤں سے گفتگو کر رہے ہیں۔ پھر انہی دنوں منظر عالم صاحب نے جو گوالیار کے رہنے والے اور ریاستوں کی مسلم لیگ کے صدر تھے، دہلی کے عربک کالج میں ۱۱۔اگست کو ریاستی مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا تھا، جس میں مجھے اور قاضی عبید اللہ کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی۔

یہ وہی منظر عالم ہیں جو پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، پھر ایک زمانے میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر بنا لیے گئے تھے۔

بہرحال میں اور قاضی عبید اللہ دہلی پہنچے اور ریاستی مسلم لیگ کے جلسے میں شامل ہوئے۔ وہیں فرید کوٹ کے ایک دوست عبدالرشید سے ملاقات ہوئی جو مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے اور اس اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے۔ ریاست پٹیالہ کی پرجا منڈل کے صدر عبدالرب اور نابھہ کی پرجا منڈل کے رہنما عبدالرشید بھی وہاں موجود تھے۔ اس اجلاس میں پورے ملک کی ریاستوں کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں نہ کوئی فیصلہ ہو سکتا تھا، نہ ہوا، مختلف قسم کی باتیں کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ریاست حیدر آباد کے بعض مسلم لیگیوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم سب کو بلا تاخیر اپنے مکانوں پر ''ترنگا جھنڈا'' لہرا دینا چاہیے۔ یعنی کانگرس کے جھنڈے تلے آ جانا چاہیے۔ یہ مضحکہ خیز تجویز سن کر مجھے ان لوگوں کی فہم و فراست اور سیاسی سوجھ بوجھ پر رحم بھی آیا اور افسوس بھی ہوا کہ کل یہ لوگ کچھ اور کہہ رہے تھے، آج کچھ اور کہہ رہے ہیں۔

۱۳۔اگست ۱۹۴۷ء کو میں اور قاضی عبید اللہ، مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ ان دنوں ۲۲/ پرتھوی روڈ نئی دہلی میں رہتے تھے۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے (جون ۱۹۴۷ء) میں بھی ہم ان سے اسی کوٹھی میں مل چکے تھے۔ مولانا سے ہم نے عرض کیا ریاست فرید کوٹ کے مسلمان اپنے آپ کو سخت خطرے میں گھرے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ آپ اس اہم مسئلے میں ذاتی دلچسپی لیں اور ان کو خطرات سے بچانے کی کوشش فرمائیں۔ مولانا نے فرمایا کل ۱۲۔اگست کو راجا فرید کوٹ میرے پاس آئے تھے، وہ یہیں ہیں، میں ان

Marfat.com

سے بات کرتا ہوں۔ چناں چہ انھوں نے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ پیدا کیا اور فرمایا کہ ریاست فرید کوٹ کے چند مسلمان میرے پاس آئے ہیں اور اس وقت یہاں موجود ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کی ریاست فرقہ واریت کے خطرناک موڑ میں داخل ہو رہی ہے اور کسی وقت بھی فسادات تک نوبت پہنچ سکتی ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو آپ کی ریاست میں کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ مہاراجا نے ان کو جواب دیا کہ میرا ریاست کے اہل کاروں سے رابطہ قائم ہے۔ میں آج واپس فرید کوٹ جا رہا ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کو میری ریاست سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جو لوگ آپ کے پاس آئے ہیں، وہ اگر میرے ساتھ فرید کوٹ جانا چاہتے ہیں تو میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔ مولانا نے ہم سے پوچھا، ہم نے عرض کیا، ہم ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔ ہمیں خطرہ ہے وہ ہمیں راستے میں پریشان کریں گے۔ مولانا نے فرمایا: ایسی کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتے تو آپ کی مرضی۔

اس زمانے میں مسلم لیگ اور کانگرس کی مشترکہ حکومت تھی، جسے انٹیرم گورنمنٹ یا عارضی حکومت کہا جاتا تھا۔ سکھ اسے ''ڈنگ ٹپاؤ راج'' کہا کرتے تھے اور عارضی حکومت کا یہ صحیح ترین ترجمہ تھا۔ ریاستوں کی وزارت سردار ولبھ بھائی پٹیل کے سپرد تھی اور مشترکہ حکومت کے یہ آخری دن تھے۔ ہم پٹیل کے پاس گئے، انھوں نے کہا کہ آج رات کو میں رام لیلا گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام میں تقریر کروں گا جس میں ریاستوں کے بارے کانگرس کی آئندہ پالیسی کی وضاحت کی جائے گی۔ انھوں نے اپنی بات زوردار الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم ان رجواڑوں اور نوابوں کو ختم کر دیں گے۔'' پچاس برس بعد پٹیل کے یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

پھر ہم سردار عبدالرب نشتر کے ہاں گئے جو عارضی حکومت کے ایک رکن تھے، انھوں نے فرمایا: ''میں بہت مصروف ہوں اور کراچی جا رہا ہوں، آپ گھبرائیں نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر اسباب پیدا کرے گا۔''

وہ ہماری بات زیادہ توجہ سے سن بھی نہیں سکتے تھے اس لیے کہ کراچی کے لیے تیاری کر رہے تھے اور ان کا کراچی پہنچنا بہر حال ضروری تھا۔ یہاں آ کر انھوں نے پاکستان کی وزارت کا حلف اٹھانا تھا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جس ریاست سے ہمارا تعلق تھا، اس سے ان کا تعلق نہ تھا۔

ہم ۱۴۔ اگست کی صبح کو بذریعہ ریل دہلی سے فرید کوٹ پہنچے تو وہاں واقعی کسی قسم کی گڑبڑ نہ تھی۔ مولانا آزاد کی دہلی میں راجا فرید کوٹ سے جو بات ہوئی تھی، واپس آ کر ہم نے گیانی ذیل سنگھ اور دوسرے لوگوں کو بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ امید ہے مہاراجا اس وعدے پر قائم رہے گا جو اس نے مولانا سے کیا ہے اور یہاں مسلمانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، چناں چہ ایسا ہی ہوا۔

Marfat.com

مشرقی پنجاب کی تمام سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کو بے پناہ جانی نقصان پہنچا اور مہاراجا پٹیالہ یا دوندر سنگھ نے تو مسلمانوں کے قتل و غارت کے لیے سکھوں کو خود بھڑکایا۔ لیکن فرید کوٹ کی حدود میں کسی مسلمان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور سب امن و امان کے ساتھ وہاں سے نکلے۔ صرف ایک آدمی جو بلوچ برادری سے تعلق رکھتا تھا، کوٹ کپورہ میں ''نائی والا کھوہ'' کے قریب ۹ یا ۱۰۔ اگست کو مارا گیا تھا اور اس کے بھی لوگ کئی سبب بیان کرتے تھے۔

البتہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں ''ارائیانوالہ'' میں تین مسلمان سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ان میں ایک بزرگ سردار عبدالعلیم کے والد تھے۔ آزادی کے بعد سردار عبدالعلیم ساہیوال آگئے تھے اور وہاں وکالت شروع کر دی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور میں وفاقی وزیر بنائے گئے تھے۔

مہاراجا کو ان افراد کے قتل کا بہت افسوس تھا، جس کا اظہار انھوں نے ان لوگوں سے کیا جو پاکستان سے ہندوستان گئے اور مہاراجا سے ملے۔ یہ حضرات اپنی غلطی سے قتل ہوئے، وہ اس طرح کہ سکھوں کا ایک قافلہ آرہا تھا۔ انھوں نے اس قافلے کو روکنے کی کوشش کی اور مارے گئے۔

بہر حال مہاراجا فرید کوٹ نے مولانا سے جو وعدہ کیا تھا، وہ اس پر قائم رہا۔ ریاست کی حد عبور کر کے مسلمانوں کا بہت بڑا قافلہ فیروز پور کے علاقے میں داخل ہوا تو اس پر سکھوں کے شدید حملے ہوئے، لیکن اس کا تعلق مہاراجا فرید کوٹ یا ریاست کے سکھوں سے نہ تھا۔ ریاست سے باہر کے لوگوں سے تھا اور یہ حملے ریاست کی حدود میں نہیں ہوئے تھے۔ ریاست کی حدود پار کرنے کے بعد فیروز پور کے علاقے میں ہوئے تھے۔

اب گیانی ذیل سنگھ سے میری آخری ملاقات کا حال سنیے۔

۲۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو کوٹ کپورے کی غلہ منڈی میں امن کمیٹی کا جلسہ گیانی ذیل سنگھ کے زیر صدارت ہوا۔ جلسے میں ہندو، مسلمان اور سکھ اچھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے، سب کے چہروں پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ مقررین میں میرا اور قاضی عبیداللہ کا نام بھی شامل تھا۔ میں تقریر کے لیے کھڑا ہوا تو ابتدا ہی میں لہجہ قدرے سخت ہو گیا۔ لیکن کسی طرف سے کوئی مخالفانہ آواز نہیں آئی۔ سب نے تحمل اور سکون سے میری باتیں سنیں۔ قاضی عبیداللہ نے نرم انداز میں تقریر کی۔ چند باتیں بھائی دیال سنگھ نے کیں۔ سب کے بعد صدر جلسہ گیانی ذیل سنگھ نے تقریر کرنا شروع کی۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کی خوشیوں کے ساتھ بہت سے غم بھی ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ معلوم نہیں ہمارا مستقبل کیا ہوگا اور ہم میں سے کون کس راستے پر اپنا آئندہ سفر شروع کرے گا اور پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہم سب نے متحد ہو کر ریاست فرید کوٹ میں آزادی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا تھا اور نہایت مشکل حالات میں آہستہ آہستہ قدم اٹھانا اور آگے بڑھانا شروع کیے تھے۔ آج

Marfat.com

ہم اس میں کامیاب ہوئے ہیں تو بہت سی مشکلات گھٹا باندھ کر آ گئی ہیں۔ ریاست فرید کوٹ کی تحریک آزادی کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں محمد اسحاق اور عبیداللہ کے نام ضرور لکھے جائیں گے۔ گیانی ذیل سنگھ نے اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں کیں اور تفصیل سے کیں۔ جب وہ تقریر کر رہے تھے، ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

رات کے گیارہ بجے جلسہ ختم ہوا تو میں نے گیانی ذیل سنگھ اور دوسرے دوستوں سے کہا کہ میں کل صبح قصور جا رہا ہوں، معلوم نہیں آئندہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ بھائی دیال سنگھ جو اس وقت ۶۵ سال کے لگ بھگ ہوں گے، مجھ سے چمٹ گئے اور بچوں کی طرح رونے لگے۔ یہ بہت مخلص اور شریف آدمی تھے۔ گیانی ذیل سنگھ بھی غم میں ڈوب گئے اور بغل گیر ہوئے۔ سب کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ گیانی جی اور بھائی دیال سنگھ نے کہا ہم بہت عرصے سے اکٹھے رہ رہے ہیں اور ایک دوسرے کو خوب جانتے ہیں۔ بھائیوں کی طرح پیار سے زندگی گزاری ہے۔ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہیں۔ ہم نے ممکن حد تک کوشش کی ہے کہ اپنے قول اور عمل سے کسی دوست کا دل نہ دکھایا جائے۔ اگر کسی موقعے پر ہماری طرف سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو ہم اس پر شرمندہ ہیں اور آپ سے معافی چاہتے ہیں۔

یہ میری ان سے آخری گفتگو اور آخری ملاقات تھی۔ دوسرے دن ۲۱۔ اگست ۱۹۴۷ء کو میں چھوٹے بڑے ایک سو تیں افراد کے ساتھ اپنے آبائی گھر سے صبح پانچ بجے بذریعہ ٹرک روانہ ہوا اور شام کے بعد آٹھ بجے قصور پہنچا۔ پینتالیس میل کا یہ سفر ہم نے ٹرک کے ذریعے پندرہ گھنٹے میں طے کیا۔ فرید کوٹ کی بیس میل کی حد تو ہم نے آسانی سے ایک گھنٹے میں طے کر لی۔ اس سے آگے ضلع فیروز پور کا پچیس میل کا علاقہ عبور کرنے میں چودہ گھنٹے صرف ہوئے۔ میرے والد اور دوسرے بہت سے رشتے دار وہیں رہ گئے تھے۔ وہ اپنے گھروں سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ عارضی سا ہنگامہ ہے۔ چند روز تک حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ تمام حضرات بہت بڑے قافلے کے ساتھ ہم سے ٹھیک ایک ماہ کے بعد ۲۰۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کوٹ کپورہ سے روانہ ہوئے۔ پہلے یہ مکتسر کی طرف گئے تاکہ فاضل کا سے ہوتے ہوئے ہیڈ سلیمان کی سے گزر کر پاکستان میں داخل ہوں، لیکن ابھی انھوں نے کوٹ کپورہ سے آٹھ میل کا سفر کر کے ریاست کی حدود سے آگے قدم رکھا ہی تھا کہ ایک گاؤں ''سراواں'' میں جو ضلع فیروز پور میں تھا، ان پر سکھوں نے حملہ کر دیا اور شدید قتل و غارت ہوا۔ پھر انھیں ملٹری کے ذریعے واپس کوٹ کپورے لے جایا گیا۔ وہاں سے یہ لوگ فرید کوٹ اور فیروز پور سے ہوتے ہوئے ہیڈ حسینی والا سے دریائے ستلج عبور کر کے ۳۰۔ ستمبر کو گنڈا سنگھ والا (پاکستان) پہنچے۔

یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب کوٹ کپورہ سے یہ قافلہ روانہ ہوا تو راجا فرید کوٹ خود وہاں آیا۔

Marfat.com

مختلف لوگوں سے ملا اور ان سے باتیں کیں، بعض افراد سے یہ بھی کہا کہ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ میں بالکل بے بس ہو گیا ہوں اور مجھے آپ لوگوں کے یہاں سے جانے کا افسوس ہے۔ لیکن اس اثنا میں ناگہاں اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو سفید گھوڑے پر سوار تھا اور اِدھر اُدھر گھومتا ہوا قافلے کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے پوچھا: ''یہ کون شخص ہے؟'' اسے بتایا گیا: ''یہ قاضی عبید اللہ ہے۔'' اس نے اپنے آدمی بھیج کر قاضی عبید اللہ کو بلایا اور گریبان سے پکڑ کر گھوڑے سے نیچے اتارا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اس مار پیٹ میں خود راجا فرید کوٹ نے حصہ لیا اور قاضی صاحب بالکل بے ہوش ہو گئے۔ ایک مظلوم اور بے بس آدمی کے ساتھ جو ہمیشہ کے لیے اس کا علاقہ چھوڑ کر جا رہا تھا، ریاست کے ایک حکمران کا یہ سلوک اس کی انتہائی کمینگی اور بزدلی پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ واقعہ بھی لائق تذکرہ ہے کہ جو قاضی عبید اللہ نے مجھے بتایا کہ جب قافلہ روانگی کے لیے تیار ہو رہا تھا تو گیانی ذیل سنگھ آئے اور قاضی عبید اللہ سے ملے۔ ازراہ اخلاص کاغذ پر گورمکھی زبان میں کچھ لکھ کر ان کو دیا۔ قاضی صاحب نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

جواب دیا: ''خدانخواستہ راستے میں سکھ آپ لوگوں پر حملہ کریں تو انھیں یہ دکھا دینا، شاید آپ محفوظ رہیں.....'' قاضی صاحب نے کاغذ جیب میں رکھ لیا اور پھر یہ ضائع ہو گیا۔

آزادی کے کچھ عرصہ بعد تک جب کہ پاسپورٹ اور ویزے کا سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا، پاکستان اور بھارت کے لوگ خط وکتابت کے ذریعے ملاقات کی تاریخ اور وقت مقرر کر لیتے تھے اور پھر وقت مقررہ پر دریائے ستلج کے کنارے ہیڈ حسینی والا پر پہنچ جاتے تھے۔ اسی طرح گیانی ذیل سنگھ اور بعض دیگر دوستوں نے ایک مرتبہ ہمارے ساتھ بھی تاریخ اور وقت کا تعین کر لیا۔ میں، قاضی عبید اللہ اور مولوی محمد سلیمان وقت مقررہ پر وہاں پہنچے تو بھائی دیال سنگھ، لہنا سنگھ، چنن سنگھ اور رام لال (یا رام داس) پہلے سے موجود تھے۔ گیانی ذیل سنگھ کسی وجہ سے نہیں آسکے تھے۔ لیکن ان کا خلوص بھرا سلام پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد ان میں سے کسی کے ساتھ کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری نہ رہا۔

میرے بہت سے عزیز اور دوست ایک یا ایک سے زائد مرتبہ ہندوستان گئے، لیکن میں آج تک وہاں نہیں جا سکا، حالاں کہ قیام پاکستان کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے جو قلمی کام کرنے اور حقیری تصنیفی و تحقیقی خدمات کا موقع عطا فرمایا ہے اس کی وجہ سے ہندستان کے متعدد شہروں اور علمی و تصنیفی اور تدریسی اداروں کے اصحاب علم اور اہل قلم سے میرے غائبانہ تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ بعض قابل احترام حضرات پاکستان تشریف لاتے ہیں، تو ازراہ کرم مجھے بھی یاد فرماتے اور ملاقات کا شرف بخشتے ہیں۔ بہت سے اصحاب سے میری علمی نوعیت کی

Marfat.com

خط وکتابت بھی ہے، پھر دو تین مرتبہ مجھے ہندوستان آنے کی دعوت بھی ملی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے مختلف اوقات میں دو مرتبہ بعض علمی تقریبات میں شامل ہونے اور مقالہ پڑھنے کی دعوت موصول ہوئی...... اپریل ۱۹۸۴ء میں ایک خط ہندوستان کے صدر گیانی ذیل سنگھ نے مجھے بھیجا تو اس میں بھی لکھا تھا کہ ''آپ ہندوستان آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔'' لیکن میں پچاس برس میں ایک مرتبہ بھی وہاں نہیں جا سکا۔

پرجامنڈل کی تحریک سے متعلق میری معلومات کے مطابق مشرقی پنجاب میں اب تک چار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

ان کتابوں میں میرا، قاضی عبیداللہ کا اور ان بہت سے حضرات کا ذکر ہے جو پرجامنڈل کی تحریک میں قید ہوئے۔ یہ کتابیں بعض دوستوں کی وساطت سے مجھے پہنچ گئی تھیں۔ لیکن ان میں سے اب کوئی کتاب میرے پاس نہیں ہے۔ جس نے جو کتاب پڑھنے کو لی، اللہ کے فضل سے واپس نہیں کی۔ اس نے مجھ سے زیادہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھا۔

آزادی کے بعد میرا رابطہ تو گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں سے ٹوٹ گیا اور ہماری راہیں ایک دوسرے سے مختلف ہوگئیں، لیکن امریک سنگھ باجوہ نے پرجامنڈل کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گیانی جی اور ان کے ہم نواؤں کو آزادی کے بعد فرید کوٹ کے حکمران سے پھر پنجہ آزما ہونا پڑا۔ مہاراجا ان وعدوں سے مکر گیا تھا جو اس نے آزادی سے قبل پرجامنڈل کے رہنماؤں سے کیے تھے اور حکمرانی کا نشہ اس کے دماغ سے نہیں نکلا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل تک جو لوگ اس کی رعیت تھے اور محکوم کی حیثیت سے مؤدب ہو کر اس کے سامنے کھڑے ہوتے تھے، ان سے برابر کی سطح پر بات کرے اور حکومت میں انھیں حصے دار بنائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گیانی ذیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے ریاست کے بعض بڑے افسروں، پولیس اہل کاروں اور فوجیوں کی مدد سے یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو ریاست میں علم بغاوت بلند کر دیا اور متوازی حکومت قائم کر لی۔ اس وقت مہاراجا وہاں موجود نہیں تھا، وہ نواب افتخار علی خاں کے جشن تخت نشینی میں شرکت کے لیے مالیر کوٹلے گیا تھا جو اپنے والد نواب احمد علی خاں کی وفات کے بعد ریاست مالیر کوٹلہ کے گدی نشین ہوئے تھے۔ مہاراجا کو بغاوت کی اطلاع وہاں ملی تو سب پروگرام ختم کر کے فوری طور پر فرید کوٹ پہنچا۔ اس نے بغاوت کرنے والوں کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا اور ان پر انتہائی سختی کی گئی۔ عوام پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ مہاراجا کے خلاف زوردار تحریک چلی اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ اس سے وہ سخت پریشانی میں گھر گیا۔ اب معاملہ دہلی تک پہنچا اور مرکزی حکومت درمیان میں پڑی تو کہیں جا کر حالات ٹھیک ہوئے۔

اس زمانے میں یہ بات بھی بعض لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی تھی کہ مہاراجا فرید کوٹ پورے مشرقی پنجاب پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور مہاراجا پٹیالہ کو جسے وہ اپنا اصل حریف سمجھتا تھا، قوت کے زور سے پیچھے ہٹا دینے

Marfat.com

کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے لیے اس نے بہت سا اسلحہ بھی جمع کر لیا اور خاصی فوج بھی تیار کر لی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اس نے ایک موقعے پر نواب مالیر کوٹلہ (افتخار علی خاں) سے بھی کہا کہ عنقریب ہم آپ کو ایک بڑے منصب پر فائز کرنے والے ہیں۔ مہاراجا فرید کوٹ قتل وغارت کے ذریعے اسی تاریخ کو دہرانا چاہتا تھا جس کا آغاز سو سال پہلے سکھوں کی مختلف مسلوں نے پنجاب میں کیا تھا۔ لیکن یہ راز فاش ہو گیا اور اس کا مشرقی پنجاب پر قبضہ اور حکومت کرنے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

اب گیانی ذیل سنگھ کے لیے ترقی کے دروازے کھلتے ہیں اور وہ منزل بمنزل آگے بڑھتے ہوئے ہندوستان کے منصب صدارت تک جا پہنچتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ آزادی کے کچھ عرصہ بعد حکومت ہند نے ریاستوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ مشرقی پنجاب کی ریاستوں میں مالیر کوٹلہ کے سوا باقی تمام ریاستوں کے حکمران سکھ تھے۔ ریاست مالیر کوٹلے کا حکمران مسلمان تھا اور پٹھان خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ بعض تاریخی وجوہ سے (جنھیں یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں، تاریخ دان حضرات ان کی صحت یا عدم صحت سے آگاہ ہیں) سکھ اس ریاست کے نواب کی بہت عزت کرتے تھے اور وہاں کے مسلمان باشندوں کو بھی لائق احترام گردانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پنجاب کے قتل وغارت کے زمانے میں مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو لوگ اس کے اردگرد کے علاقوں (پٹیالہ، سنگرور، لدھیانہ اور جالندھر وغیرہ) سے بھاگ کر مالیر کوٹلہ کی حدود میں (جو ایک سو باسٹھ مربع میل علاقہ اور ایک سو دس قصبات ودیہات پر مشتمل تھی) داخل ہو جاتے تو انھیں کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔ اب بھی وہاں پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان آباد ہیں جو کل آبادی کا پچھتر فی صد (۷۵%) حصہ ہیں، وہ امن کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مہاراجا فرید کوٹ کا تعلق براڑ بنسی خاندان سے تھا۔ سترھویں صدی کے وسط میں اس خاندان میں ایک شخص چودھری کپور پیدا ہوا، جس نے ۱۷۱۰ء میں وفات پائی۔ اس نے فرید کوٹ کے حکمران خاندان کی بنا ڈالی۔ موجودہ شہر کوٹ کپورہ اسی کے نام سے مشہور ہوا اور اس کا دارالحکومت یہی شہر تھا۔ کپورا کا پوتا ہمیر سنگھ تھا۔ اس خاندان میں بھی سکھوں کے باقی خاندانوں کی طرح باہمی قتل وغارت کا سلسلہ چلا۔ انھوں نے اپنے کمزور ہمسایوں کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے نام پر فرید کوٹ شہر تعمیر کر کے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے بھی اس علاقے پر حملہ کیا تھا اور وہ اس پر قابض بھی ہو گیا تھا۔ اس خاندان کے ایک حکمران پہاڑ سنگھ نے ''مدکی'' کی لڑائی میں سکھوں کے بجائے انگریزوں کی حمایت کی تھیں۔ اس خاندان کے دو ایک حکمرانوں کو چھوڑ کر باقی سب حکمران عادل ومنصف اور رعایا کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔ مسلمانوں کو اس ریاست میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا گیا اور متعدد مسلمان

Marfat.com

ریاست کے اہم عہدوں پر فائز رہے۔ مشہور ہے کہ اس خاندان کا ایک حکمران مسلمان ہو گیا تھا۔

مہاراجا پٹیالہ ''پھلکیاں'' خاندان (یا پھلکیاں مسل) سے تعلق رکھتا تھا۔ پھلکیاں کہلانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے بڑوں میں سے ایک شخص کا نام پھول تھا۔ اس کے نام سے ریاست پٹیالہ میں بٹھنڈے سے چند میل کے فاصلے پر ایک قصبے کا نام ''پھول'' ہے۔ اسے ''رام پورہ پھول'' بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ دونوں الگ الگ مقامات ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ اس زمانے میں رام پورہ ریاست نابھہ میں تھا اور پھول ریاست پٹیالہ میں! پٹیالہ، نابھہ اور جیند کے حکمران پھول کی اولاد سے تھے۔ اسی وجہ سے یہ تینوں ریاستیں ''ریاست ہائے پھلکیاں'' کہلاتی تھیں۔ فریدکوٹ اور پٹیالہ کے حکمران خاندانوں کی آپس میں رشتے داریاں تو تھیں، لیکن خاندان مختلف تھے اور کچھ باہمی رنجشیں اور رقابتیں بھی تھیں۔

آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں مشرقی پنجاب کی ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنی ایک یونین بنانے کا فیصلہ کیا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں ان کی ایک یونین قائم ہوئی، لیکن مہاراجا پٹیالہ اور مہاراجا فریدکوٹ کے باہمی اختلاف کی وجہ سے اس کے نام کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو سکا۔ بالآخر ۲۰۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو اس کا نام ''پیپسو'' رکھا گیا، یعنی ''پٹیالہ اینڈ ایسٹ پنجاب سٹیٹس یونین۔'' اس یونین میں پٹیالہ، فریدکوٹ، نابھہ، سنگرور، مالیرکوٹلہ، کپورتھلہ، کلسیہ اور نالاگڑھ کی ریاستیں شامل تھیں۔ اس کے نام کے اجزا میں لفظ ''پٹیالہ'' کو اس لیے داخل کیا گیا کہ آبادی اور رقبے کے اعتبار سے پٹیالہ مشرقی پنجاب کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس زمانے میں اس کی آبادی بیس لاکھ افراد پر مشتمل تھی، جب کہ باقی تمام ریاستوں کی آبادی پندرہ لاکھ تھی۔

مہاراجا کپورتھلہ خاندانی اعتبار سے ''کلال'' تھا اور سکھوں کی ''اہلووالیہ مسل'' سے تعلق رکھتا تھا۔ مہاراجا پٹیالہ کا نام یادوندر سنگھ تھا۔ ایک بڑی ریاست حکمران ہونے کی بنا پر اس کو پیپسو کا راج پرمکھ یعنی صدر اور مہاراجہ کپورتھلہ کو نائب صدر بنایا گیا تھا۔ پیپسو کا دارالحکومت پٹیالہ تھا۔ جو لوگ پیپسو کی وزارت میں شامل کیے گئے، ان میں ایک گیانی ذیل سنگھ تھے۔ گیانی ذیل سنگھ کو پہلے وزیر زراعت اور پھر وزیر مال بنایا گیا تھا۔ اس طرح وہ ریاست فریدکوٹ کے ایک غیر معروف گاؤں سے نکل کر پہلی مرتبہ کسی وزارت میں شامل ہوئے اور ان کی شہرت نے اپنے علاقے سے باہر قدم رکھا۔

یہاں یہ عجیب سی بات بھی عرض کر دیں کہ ریاست پٹیالہ کا بانی اور پہلا حکمران آلا سنگھ تھا اور آخری یادوندر سنگھ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اس ریاست کے حکمران حرف الف سے چلے اور ی پر ختم ہو گئے۔ آخری حکمران یادوندر سنگھ کو میں نے دیکھا ہے اور موگا کے ایک جلسہ عام میں اس کی تقریر سنی ہے۔ وہ اپنے بڑوں کے برعکس مسلمانوں کا شدید مخالف تھا اور ان کے متعلق سخت تعصب کا اظہار کرتا تھا۔

Marfat.com

یہاں یہ باور رہے کہ پیپسو کی یہ حکومت ریاستوں کے بارے میں حکومت ہند کا کوئی آخری فیصلہ ہونے تک کے لیے عارضی حکومت (انیٹرم گورنمنٹ) تھی لیکن اس کے باوجود اس کی حیثیت اپنی جگہ ایک مستقل وحدت (یونٹ) کی تھی۔ ۱۹۵۲ء تک چار سال یہ حکومت کام کرتی رہی۔ اسی سال ہندوستان میں عام انتخابات کرائے گئے تو پیپسو میں بھی انتخابات ہوئے۔ ریاستوں کی تاریخ میں یہ پہلے انتخابات تھے اور ریاستی باشندوں کو پہلی مرتبہ حق رائے دہی کا موقع ملا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے گیانی ذیل سنگھ نے ان انتخابات میں بطور امیدوار حصہ نہیں لیا تھا، چناں چہ انتخابات کے بعد پیپسو کی جو حکومت معرض قیام میں آئی، اس میں گیانی جی شامل نہیں تھے۔ البتہ برش بھان اس کے ایک وزیر تھے جو ریاست نابھ کے ایک قصبے ''جیتو'' کے رہنے والے تھے اور میرے ملنے والوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ وہ لاہور بھی آئے تھے اور میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔

۱۹۵۶ء میں پیپسو کو ختم کر دیا گیا اور ریاستوں کو ضلعوں میں بدل دیا گیا تھا۔ ہماری ریاست فرید کوٹ کو ضلع بٹھنڈہ میں شامل کر دیا گیا تھا جو کہ سابق ریاست پٹیالہ کی ایک تحصیل اور برصغیر میں ریلوے کا بہت بڑا اور مشہور جنکشن تھا۔

۱۹۵۷ء میں سنا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی سفارش پر تین آدمیوں کو راجیہ سبھا (کونسل آف سٹیٹ) کے رکن نامزد کیا گیا۔ آسام سے فخرالدین علی احمد کو جو بعد میں ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے اور صدر ہی کی حیثیت سے سفر آخرت اختیار کیا۔ بنگال سے پروفیسر ہمایوں کبیر کو جو پہلے مولانا آزاد کے سیکرٹری تھے۔ پھر مرکزی وزارت تعلیم کے سیکرٹری مقرر ہوئے، ہندوستان کے مرکزی وزیر بھی رہے۔ مشرقی پنجاب سے گیانی ذیل سنگھ کو......! اس طرح گیانی جی کے سیاسی قدم اور آگے بڑھے اور ان کے ہاتھ دہلی تک دراز ہو گئے۔

اسی دور میں معلوم ہوا تھا کہ گیانی ذیل سنگھ نے اپنے گاؤں سندھواں میں ایک شان دار کوٹھی بنائی ہے اور کچے گھر کو ایک بڑے محل میں بدل دیا ہے۔ لیکن دہلی کے ایک ماہانہ رسالے ''آستانہ'' کے ستمبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں مرقوم ہے کہ گیانی جی کے آبائی گاؤں میں ان کے آباواجداد کا مکان آج بھی بوسیدہ اور کہنہ ہے۔

یہ بھی پتا چلا کہ انھوں نے اپنی صاحب زادی کی شادی کی تو اس میں ہندوستان کے بہت سے لیڈروں اور وزیروں نے شرکت کی۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ علاقہ فرید کوٹ کے لوگوں کی انھوں نے بہت خدمت کی ہے اور متعدد سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی کوششوں سے وہاں ایک میڈیکل کالج بھی قائم ہو گیا ہے اور وہاں کے لوگ ان سے بہت خوش ہیں۔

مشرقی پنجاب کے ایک سکھ کانگرسی لیڈر پرتاپ سنگھ کیروں تھے۔ آزادی سے قبل جب مولانا سید محمد داؤد غزنوی پنجاب کانگریس کے صدر تھے تو پرتاپ سنگھ کیروں اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ وہ مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی رہے اور عرصے تک اپنے صوبے کی کانگریس کمیٹی کے عہدہ صدارت پر بھی متمکن رہے۔ وہ قتل کر

Marfat.com

ذبح کیے گئے تھے اور کئی قسم کی خبریں ان کے قتل کے سلسلے میں اخبارات میں آتی رہیں۔ ان کے بعد دربارا سنگھ کو پنجاب کانگریس کا صدر بنایا گیا۔ بعدازاں حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ گیانی ذیل سنگھ کو پنجاب کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اب وہ پنجاب کی کھلی سیاسی فضا میں آئے۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں وہ پنجاب کانگریس کے صدر تھے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد جب ہندوستان کے عام انتخابات ہوئے تو انھوں نے ضلع روپڑ کے حلقہ انند پور صاحب سے کانگریس کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ یہ وہی انند پور صاحب ہے جو مشرقی پنجاب میں سکھوں کا مشہور مرکز ہے اور جہاں اپنے مذہبی و سیاسی مطالبات سے متعلق سکھوں نے ایک ایسا ریزولیشن منظور کیا تھا جو ''انند پور صاحب ریزولیشن'' کے نام سے مشہور ہوا اور ہندوستان کے اخبارات اور سیاسی حلقوں میں موضوع بحث بنا۔

۱۹۷۲ء میں گیانی جی مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے۔ جنگ کے بعد جب ہندوستان کی قید سے رہائی پا کر ہمارے فوجی پاکستان آتے تھے تو بعض اوقات گیانی جی بھی مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے واہگہ سرحد پر آتے اور قیدیوں کو پاکستانی حکام کے سپرد کرتے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے اخبار نویس جو وہاں موجود ہوتے، اکثر بتایا کرتے تھے کہ قیدیوں کی حوالگی کا منظر نہایت جذباتی ہوتا تھا اور کئی دفعہ فریقین میں تلخ کلامی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ لیکن مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ اپنی نرم کلامی اور دھیمے پن سے معاملہ آگے نہ بڑھنے دیتے اور پیار کے لہجے میں سخت سے سخت بات کو بھی وہیں دبا دیتے۔

اس زمانے میں میری اور گیانی جی کی جدائی پر چوبیس برس گزر چکے تھے اور انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ ایک دفعہ مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) سے کفایت اللہ صاحب پاکستان تشریف لائے۔ وہ کچھ کتابیں یہاں سے اپنے وطن لے جانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ ہمارے دفتر بھی آئے۔ انھیں کہیں سے معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے صوبے کے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ سے میرے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ وہ مجھ سے ملے اور تعارف کے بعد پہلا سوال یہی کیا: ''آپ ہمارے وزیر اعلیٰ گیانی ذیل سنگھ کے دوست ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''یہ ایک دور کی بات تھی...... وہ دور ختم ہو گیا تو وہ بات بھی ختم ہو گئی۔ معلوم نہیں گیانی ذیل سنگھ کے ذہن میں اب میرا نام ہے بھی یا نہیں ہے۔ البتہ کچھ پرانی یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ انسان زندگی میں کئی منزلوں سے گزرتا ہے، ایک منزل وہ بھی تھی جو مدت ہوئی طے ہو چکی۔''

کفایت اللہ صاحب نے بتایا کہ وہ بھی گیانی جی کے دوست ہیں، لیکن سیاسیات میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ گیانی جی کا تعلق کانگریس سے ہے اور وہ جنتا پارٹی سے منسلک ہیں۔

Marfat.com

اس کے بعد کفایت اللہ صاحب واپس ہندوستان چلے گئے۔ کچھ عرصہ گزرا تھا کہ وہ پھر لاہور آئے اور مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ گیانی جی مالیر کوٹلے تشریف لائے تھے۔ میں ان سے ملا تو آپ کا ذکر بھی ہوا۔ انھوں نے پوچھا: ''وہ کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں؟'' میں نے ان سے آپ کے کام کی تفصیل بیان کی تو سن کر فضا میں آنکھیں گاڑ لیں اور تین چار منٹ چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچتے رہے، پھر بولے: ''وہ بھی عجیب دور تھا، جب ہم ایک ہی جگہ رہتے تھے۔ معلوم نہیں ان پرانے دوستوں سے بھی ملاقات کا موقع ملے گا یا نہیں ملے گا۔ میری دعا ہے وہ جہاں ہیں اللہ انھیں خوش رکھے۔'' یہ کہہ کر رومال سے آنکھیں پونچھیں اور بات ختم ہو گئی۔

۱۹۷۶ء میں گیانی جی مشرقی پنجاب کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے لاہور آئے۔ وہ سرکاری مہمان تھے اور ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں انھیں ٹھہرایا گیا تھا۔ تین چار دن وہ یہاں رہے، لیکن میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک دن نو بجے کے قریب پولیس کے ایک بڑے افسر کا جو میرے بے تکلف دوست ہیں، ٹیلی فون آیا۔ انھیں معلوم تھا کہ آزادی سے پہلے گیانی ذیل سنگھ سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ انھوں نے پوچھا: ''آپ کے پرانے دوست گیانی ذیل سنگھ یہاں آئے ہیں اور آپ کے دفتر کے پڑوس میں ان کا قیام ہے۔ ان سے ملاقات ہوئی؟''

میں نے جواب دیا: ''نہیں''

کہا: ''ان سے ملنا چاہتے ہو؟''

عرض کیا: ''اگر کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ضرور ملوں گا۔''

بولے: ''میں ایک پولیس افسر کو بھیج رہا ہوں، وہ آپ کو ان سے ملا دیں گے، دفتر میں ان کا انتظار کریں۔''

اب میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا پولیس افسر کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئیں گے اور مجھے پورے اعزاز کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ میں اپنے دوست سے ملوں گا جسے میں چھبیس برس پہلے غربت کی حالت میں چھوڑا تھا اور اب وہ ایک صوبے کا وزیراعلیٰ ہے۔ میں قلم رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ ان سے یہ باتیں کروں گا اور یہ کروں گا۔ ٹھیک پون گھنٹے کے بعد وہ صاحب تشریف لائے اور کہا: ''مجھے ٹیلی فون پر حکم دیا گیا تھا کہ آپ کو گیانی جی سے ملا دوں، لیکن ٹیلی فون اس وقت آیا جب وہ اپنی قیام گاہ سے نکل کر ہوائی اڈے پر جا رہے تھے، اس وقت ان سے ملانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اب وہ دہلی کو پرواز کر چکے ہیں اور میں ہوائی اڈے سے سیدھا یہیں آ رہا ہوں، اگر پہلے اطلاع ہو جاتی تو ضرور ملاقات کا انتظام کر دیتا، اب معذرت خواہ ہوں۔''

میں نے روایتی شیخ چلی کی طرح جو باتیں سوچ رکھی تھیں، وہ وہیں کی وہیں رہیں، تاہم ان کا شکریہ ادا کیا

Marfat.com

اور اصرار کر کے چائے کی پیالی پیش کی۔

آزادی سے کئی سال بعد حکومت ہند نے اپنی انتظامی یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر مشرقی پنجاب کے تین صوبے بنا دیتے تھے۔ ایک صوبے کا نام ہریانہ، ایک کا ہماچل پردیش اور ایک کا پنجاب رکھا گیا۔ پنجاب گیارہ ضلعوں پر مشتمل تھا، جن میں پنجاب کی ریاستیں بھی شامل تھیں جو ضلعوں میں بدل دی گئی تھیں۔ پہلے ریاست فرید کوٹ کو ضلع بھٹنڈہ میں شامل کیا گیا تھا، لیکن جب گیانی ذیل سنگھ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو انھوں نے فرید کوٹ کو الگ ضلع بنا دیا اور اس میں ضلع فیروز پور کی جو بہت بڑا ضلع تھا، دو تحصیلیں موگا اور مکتسر شامل کر دیں۔ اس طرح گیانی جی کے زمانہ وزارت علیا میں صوبہ پنجاب گیارہ کے بجائے بارہ ضلعوں پر محیط ہو گیا۔

اسی زمانے میں سنا تھا کہ گیانی جی کے گاؤں کو ریلوے سٹیشن بنا دیا گیا ہے۔ یہ بھی سنا تھا کہ گیانی جی فرید کوٹ جیل کی جس کوٹھڑی میں ساڑھے تین سال بند رہے تھے، اس کوٹھڑی کے دروازے پر ان کے نام اور مدت قید کی تختی نصب کی گئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ باتیں صحیح ہیں یا غلط۔

اردو زبان پڑھنے کے بعد گیانی جی کو اس سے ہمیشہ تعلق بلکہ پیار رہا۔ وہ اس زمانے میں اردو لکھنا نہیں جانتے تھے مگر پڑھتے اچھی طرح تھے۔ بعض قدیم اور جدید شعرا کے اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ علامہ اقبالؒ کے بھی متعدد اشعار یاد تھے جنھیں وہ اپنی تقریروں اور عام گفتگو میں مناسب مواقع پر پڑھتے تھے اور صحیح پڑھتے تھے۔ سنا ہے اس کے بعد بھی یہی صورت حال رہی، جب تک وہ مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے، اپنے صوبے کی اردو مجلسوں اور انجمنوں سے برابر تعلق رکھا۔ پنجاب کے اردو مشاعروں کی صدارت بھی بسا اوقات وہ کرتے تھے۔ شنید ہے کہ اردو میں دلچسپی رکھنے والے مشرقی پنجاب کے مسلمان، سکھ اور ہندو ان کو بالخصوص احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ غالباً ۱۹۷۸ء تک وہ مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔

۱۹۸۰ء کے انتخابات میں انھوں نے کانگریس کے ٹکٹ پر ہندوستان کی پارلیمنٹ (لوک سبھا) کا انتخاب ہوشیار پور سے لڑا اور کامیاب ہوئے۔ اس طرح وہ پنجاب کی صوبائی سیاست سے نکل کر مرکز کی ملک گیر سیاست میں داخل ہوئے اور ہندوستان کے وزیر داخلہ بنائے گئے۔ ان دنوں ہندوستانی اخبارات نے یہ خبر نمایاں طور سے شائع کی تھی کہ گیانی ذیل سنگھ نے وزارت کا حلف اردو میں اٹھایا، پارلیمنٹ کی رکنیت کا حلف بھی انھوں نے اردو میں اٹھایا تھا۔ اس پر ہندوستان کے بعض اردو اخبارات و رسائل نے اداراتی شذرات بھی لکھے تھے، جن میں گیانی جی کے اس عمل پر اظہار مسرت کیا گیا تھا اور ہندوستان میں اردو کے بہتر مستقبل کی توقع کی گئی تھی۔ ہندوستان سے آنے والے بعض لوگوں سے اس زمانے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ گیانی جی اپنے فرائض کی انجام دہی میں بہت تیز ہیں۔

Marfat.com

۱۹۸۲ء کے اپریل میں مرحوم عطاء اللہ حنیف دہلی گئے۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے مجھے فرمایا کہ میں دہلی میں تمھارے یار سے بھی ملوں گا۔

میں نے عرض کیا: ''کس یار سے؟''

فرمایا: ''ذیل سنگھ سے!''

اس وقت وہ ہندوستان کے وزیر داخلہ تھے۔ میں نے کہا: ''ضرور ملیے۔''

فرمایا: ''ان سے تمھارا سلام کہوں؟''

عرض کیا: ''نہیں۔ میرا سلام اس وقت تک نہ کہیے گا، جب تک وہ خود میرے بارے میں نہ پوچھیں۔''

فرمایا: ''اگر وہ نہ پوچھیں تو کیوں نہ سلام کہوں؟''

میں نے کہا: میں آپ کی اس ''کیوں'' کے جواب میں وہی بات کہوں گا جو سہتی نے رانجھے کو اس وقت کہی تھی، جب وہ جوگی بن کر ہیر سے ملنے رنگ پور کھیڑیاں گیا تھا۔ وارث شاہ کی زبان میں سہتی نے اسے کہا تھا:

باجھ پچھیاں سخن نہ مول کریے دانش منددا ایہہ معمول ہے جی

ہاں اگر وہ پوچھیں تو ضرور میرا سلام کہیے گا اور اگر یاد رہے تو میرے حوالے سے وارث شاہ کا یہ مصرع بھی سنا دیجیے گا۔

میں نے مولانا عطاء اللہ صاحب سے یہ بھی عرض کیا کہ ہندوستان میں بے شمار قومیں ہیں اور بے شمار ان کے مسائل ہیں جن کو سلجھانے یا الجھانے کا اصل کردار وزیر داخلہ ادا کرتا ہے۔ ممکن ہے وہ دہلی میں نہ ہوں، کسی علاقے میں دورے پر گئے ہوں اور آپ کی ان سے ملاقات نہ ہو سکے۔

سات آٹھ دن کے بعد مولانا کا ٹیلی فون آیا کہ وہ ہندوستان سے واپس آگئے ہیں۔ گیانی ذیل سنگھ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے تمھیں سلام کہا اور وہ تمھیں بہت یاد کرتے تھے۔

میں نے مولانا سے کہا کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں، آپ سے ملوں گا تو باتیں ہوں گی۔ میں گیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ دہلی کے اردو بازار میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے دفتر اہل حدیث منزل میں ٹھہرے تھے۔ اس کے جنرل سیکرٹری حکیم اجمل خاں شکراوی کی معرفت گیانی جی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ دہلی سے باہر ہیں، دو دن کے بعد آئیں گے۔ تیسرے دن پھر پتا کیا تو وہ آچکے تھے...... گوجراں والا کے ایک دوست ضیاء اللہ کھوکھر بھی مولانا کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ یہ دونوں گیانی جی سے ان کی کوٹھی پر ملے اور وہ بہت محبت سے پیش آئے۔ چائے پلائی اور دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مولوی محمد سلیمان، قاضی عبیداللہ اور میرے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے گیانی جی کو بتایا کہ مولوی محمد

Marfat.com

سلیمان کئی سال ہوئے وفات پا چکے ہیں۔ قاضی عبیداللہ اس وقت زندہ تھے اور ضلع فیصل آباد کے ایک گاؤں میں مقیم تھے، ان کا بتایا۔ میرے متعلق بتایا کہ وہ لاہور میں ہے اور تصنیف وتالیف کا کام کرتا ہے، اس کا ترجمہ بھی کر دیا کہ کتابیں لکھتا ہے۔ ایک ماہانہ رسالے کا ایڈیٹر بھی ہے۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے بتایا کہ ان سے پوچھ کر گیانی جی نے میرا ڈاک کا پتا بھی اپنی ڈائری میں لکھا اور یہ بھی کہا:

''ساڈے یار بھٹی نوں میرا بہت بہت سلام کہنا، میرا انھوں ملن نوں بہت جی چاہندا اے۔''

مولانا عطاء اللہ صاحب نے فرمایا کہ گیانی جی اسی طرح نرمی اور انکسار سے ملے جس طرح آزادی سے پہلے ملتے تھے۔ وزارت کے منصب کی آکڑ پھاکڑ ان میں بالکل نہ تھی۔

مولانا سے انھوں نے کہا: ''ہندوستان میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایے۔'' انھوں نے کہا: ''ہم آپ کے پاس محض ملاقات کے لیے آئے تھے، مگر یہاں ایک کام بھی پڑ گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کا ویزا صرف دہلی کا تھا، لیکن جب لاہور سے چلنے لگے تو دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مہتمم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ندوۃ العلما میں ایک تقریب منعقد ہو رہی ہے، اس میں آپ ضرور شرکت کریں۔ اتفاق سے اس تقریب کی تاریخیں یہی ہیں، اگر آپ کی کوشش سے لکھنؤ جانے کی اجازت مل جائے تو اس تقریب میں شریک ہو جاؤں۔''

یہ کام وزارت خارجہ سے متعلق تھا اور اس محکمے کے افسر اعلیٰ ہندوستان کے مشہور مسلمان رہنما محمد احمد کاظمی مرحوم کے بیٹے (یا کوئی قریبی عزیز) تھے۔ گیانی جی نے ان کو ٹیلی فون کیا۔ مولانا ان کے دفتر پہنچے، متعلقہ کلرک سکھ تھا جو آزادی سے قبل گوجراں والا سے تعلق تھا، وہ نہایت احترام سے پیش آیا اور چائے پلائی، لکھنؤ جانے کی اجازت بھی مل گئی، مگر مولانا کسی وجہ سے لکھنؤ نہیں جا سکے۔ یہ تمام واقعہ خاصی تفصیل سے مولانا عطاء اللہ صاحب نے بھی سنایا اور ضیاء اللہ کھوکھر صاحب نے بھی بیان کیا جو ان کے ساتھ تھے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد گیانی ذیل سنگھ ہندوستان کی مسند صدارت پر فائز ہو گئے۔ اس اثنا میں دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے چیئرمین ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لاہور تشریف لائے۔ وہ لاہور آئیں تو ازراہ کرم مجھے ضرور یاد فرماتے ہیں۔ انھیں کہیں سے معلوم ہو گیا کہ ان کے ملک کے صدر گیانی ذیل سنگھ میرے پرانے وطنی اور دوست ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

''دورِ غربت میں ہم دونوں ہم وطن بھی تھے اور دوست بھی، اب نہ میرا ان سے کوئی تعلق ہے، نہ ان کا مجھ سے۔ ان کا وطن اور ہے، میرا اور۔ وہ دنیا کے دوسرے بڑے ملک کے صدر ہیں، میں قلم کا مزدور۔ اب میرا

Marfat.com

ان سے کیا واسطہ؟''

فروری ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر صاحب کا دہلی سے خط آیا کہ چند روز پیشتر ہماری یونیورسٹی کی ایک تقریب میں صدر گیانی ذیل سنگھ تشریف لائے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں لاہور گیا تھا اور محمد اسحاق بھٹی سے ملا تھا۔ وہ آپ کو یاد کرتے اور سلام کہتے تھے۔ گیانی جی نے یہ الفاظ سنے تو بہت خوش ہوئے، میرے کام کاج کے بارے میں پوچھا اور خیر خیریت دریافت کی۔ پھر ڈاکٹر فاروقی سے کہا، میں انھیں خط لکھوں گا، آپ بھی انھیں خط لکھیں تو میرا اسلام پہنچائیں اور یہ بھی لکھیں کہ وہ مجھے ضرور خط بھیجیں۔ میرا ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اس خط کے بعد میں نے بھی گیانی جی کو خط لکھے، انھوں نے بھی جواب میں خط لکھے۔

ستمبر ۱۹۸۴ء میں مجھے اخبارات سے معلوم ہوا کہ گیانی جی کے داماد ڈاکٹر لال سنگھ چندی گڑھ میں وفات پاگئے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان کے لیے بہت بڑا حادثہ اور بہت بڑا صدمہ تھا۔ مجھے بھی اس کا بہت افسوس ہوا۔ میں نے ان کو تعزیت کا خط لکھا اور میرا یہ اخلاقی فرض تھا کہ ایک دوست کے غم میں اظہار افسوس کروں۔ گیانی جی نے میرے اس خط کا جواب دیا اور تعزیت پر شکریہ ادا کیا۔

اب سوچتا ہوں تو مسرت انگیز حیرانی ہوتی ہے کہ میرے پرانے دوست گیانی ذیل سنگھ نے منزل بمنزل اپنا یہ سیاسی سفر طے کیا۔ غریب گھر میں پیدا ہوئے، غربت کی حالت میں تربیت پائی اور ہندوستان کے سربراہ مملکت بنے۔ کچے گھر میں پلے بڑھے، پسماندہ ماحول میں جوان ہوئے اور قصر صدارت تک پہنچے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ایک ڈرامائی سا قصہ ہے جو ان کی پچاس برس پہلے کی زندگی سے واقف ہیں۔

دنیا کے تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان کہاں سے چلتا ہے اور کہاں جا پہنچتا ہے۔ اسے بسا اوقات وہم و گمان بھی نہیں ہوتا کہ جس راستے پر وہ گامزن ہے، اس کی آخری منزل کہاں جا کر ختم ہوگی۔ لیکن جمہوری ملکوں میں یہ بہت زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ وہاں انسان کی پہچان کا معیار محض سونے چاندی کے ڈھیر اور میلوں تک پھیلی ہوئی زمینیں ہی نہیں ہوتیں، اس کی دوسری خوبیوں کو بھی دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔

گیانی ذیل سنگھ نے جو ہندوستان کے ساتویں صدر تھے ایک سنگین حادثے کے نتیجے میں ۲۵۔ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اس دنیائے فانی سے کوچ کیا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

اکتوبر ۱۹۶۵ء کو میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا تو اہل علم کے ایک نئے حلقے سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ اس حلقے کے ایک رکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری تھے، لیکن اس وقت یہ ڈاکٹر نہیں تھے، ''محمد ایوب قادری ایم۔ اے'' تھے۔

ایک مرتبہ وہ رئیس احمد جعفری مرحوم کے پاس ادارے آئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ میانہ قد، متوسط جسم، گندمی سا رنگ، گول چہرہ، نظر کی عینک لگائے ہوئے، داڑھی صاف، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، سر پر انگریزی بال، انداز گفتگو نہایت مودبانہ...... پتا چلا کہ یہ کراچی رہتے ہیں اور وہاں اردو کالج میں پڑھاتے ہیں۔

رئیس احمد جعفری نے ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو وفات پائی تھی اور میں اس سے تین سال قبل ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارے سے وابستہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد ایوب قادری سے میری پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۶۵ء سے اکتوبر ۱۹۶۸ء تک کے تین سالوں کے دوران کسی وقت ہوئی۔

ایوب قادری شریف النفس اور میل جول کے آدمی تھے۔ کسی سے کسی قسم کا تکلف نہیں تھا۔ پہلی ہی ملاقات کے چند تعارفی الفاظ کے بعد ان سے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔

ایک مرتبہ لاہور کے معروف ناشر کتب مرحوم شیخ محمد اشرف میرے پاس ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بیٹھے تھے کہ ایوب قادری صاحب تشریف لے آئے۔ میں نے ان سے شیخ صاحب کا تعارف کرایا تو فوراً قلم ہاتھ میں پکڑا اور بیگ سے کاپی نکالی۔ شیخ صاحب سے مخاطب ہو کر بولے: آپ سے ملاقات کا انتہائی اشتیاق تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج بھٹی صاحب کے یہاں آپ سے ملاقات ہوگئی۔ اب آپ اپنے حالات بتایے، میں لکھنا چاہتا ہوں۔

شیخ صاحب نے دو چار باتیں بتائیں۔ پھر کہا: اس موضوع پر آئندہ ملاقات میں بات ہوگی۔ اب میں جلدی میں ہوں۔

قادری صاحب تاریخ کے آدمی تھے اور یہی ان کا اصل موضوع تھا۔ رجال و شخصیات اسی موضوع کا حصہ ہے، چناں چہ وہ اس سلسلے میں خوب لکھتے تھے۔ شیخ محمد اشرف صاحب پر بھی وہ لکھنے کے خواہاں تھے، لیکن موقع نہ ملا۔ بلاشبہ شیخ صاحب نے بہت کام کیا اور بے شمار اردو، انگریزی کتابیں چھاپیں۔ ان کے بارے میں لکھنا

Marfat.com

اور ان کی خدمات کو نمایاں کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان سطور کا راقم ان شاء اللہ یہ فریضہ سر انجام دے گا۔ مجھ سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے اور میں چاہتا ہوں کہ ان تعلقات کی روشنی میں ان سے متعلق چند باتیں معرض کتابت میں لاؤں، لیکن اس وقت بات ایوب قادری صاحب کے بارے میں ہو رہی ہے اور آئندہ سطور میں انہی سے متعلق کچھ گزارشات پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

وہ جب لاہور آتے ادارہ ثقافت اسلامیہ ضرور تشریف لاتے اور ارکان ادارہ سے ملتے۔ ہمارے کام کے بارے میں پوچھتے اور اپنے کام کے متعلق بتاتے۔ وہ پیار اور محبت کے آدمی تھے اور میٹھے لہجے سے بات کرتے تھے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی یادیں تازہ کریں اور ان کی خدمات علمی کو موضوع گفتگو بنائیں۔ تو آیے چند لمحے ان کی رفاقت میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان کے والد کا نام مولوی مشیت اللہ قادری تھا۔ وہ ۱۸۸۹ء کو آنولہ (ضلع بریلی، یوپی) میں پیدا ہوئے۔ عربی، اردو، فارسی اور ہندی زبانوں کے وہ اچھے عالم تھے۔ ادب و تاریخ سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور اپنے علاقے میں اسلام کی تبلیغ اور غیر مسلموں سے مناظروں اور مباحثوں میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں آبائی وطن کی سکونت ترک کر کے صوبہ سندھ کے شہر ''دادو'' میں آ کر اقامت گزیں ہوئے اور وہیں ستر برس عمر پا کر ۱۹۵۹ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

ان کے بیٹے محمد ایوب قادری کی ولادت ۲۸۔ جولائی ۱۹۲۶ء کو بدھ کے روز موضع آنولہ (ضلع بریلی، صوبہ یوپی، ہندوستان) میں ہوئی۔ چراغ علم سے تاریخ نکالی گئی جو آگے چل کر صحیح ثابت ہوئی۔

ایوب قادری کچھ بڑے ہوئے تو خاندانی اور اسلامی روایت کے مطابق سب سے پہلے انھیں قرآن مجید پڑھایا گیا، پھر دینیات کی تعلیم دی گئی۔ بعد ازاں سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں پرائمری پاس کی۔ ۱۹۴۲ء میں اردو مڈل کا امتحان دیا اور کامیاب ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں ہندی زبان میں مڈل پاس کیا۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک کے امتحان میں بیٹھے اور درجہ اول میں کامیابی حاصل کی۔ اردو اور ریاضی میں بالخصوص دلچسپی تھی۔ ان دونوں مضامین میں ہمیشہ ممتاز رہے۔

سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر میں بھی حصول علم کا سلسلہ جاری رہا۔ اپنے والد مکرم مولوی مشیت اللہ قادری اور ایک دوسرے عالم مولوی اسد علی خاں سے فارسی کی بعض کتابیں پڑھیں۔ مولوی عبدالغفور سے عربی اور فارسی کی صرف ونحو کے چند ابتدائی رسالے پڑھے۔

ان کے نانا حاجی وہاب الدین قادری تھے جو بدایوں رہتے تھے۔ دینداری اور تقوے کی نعمت بھی اللہ نے ان کو عطا فرمائی تھی اور مال و دولت سے بھی نوازا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ اپنے اس نواسے کو

Marfat.com

۱۹۴۸ء میں آنولہ سے بدایوں لے گئے تھے اور وہاں کے اسلامیہ کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے اس کالج سے ایف اے پاس کیا۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں یہ خاندان ہندوستان سے پاکستان آیا اور صوبہ سندھ میں بمقام دادو اقامت اختیار کی۔ اسی سال ستمبر کے مہینے میں ایوب قادری دادو سے کراچی جا کر محکمہ رسد و ترقیات میں ملازم ہو گئے۔ دوران ملازمت میں حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۵۶ء میں اردو کالج سے بی اے پاس کیا۔ پھر ۱۹۶۲ء کو کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو کا امتحان دیا اور درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ اس طرح انھوں نے منزل بمنزل اپنا تعلیمی سفر طے کیا اور ہر منزل میں اللہ نے کامیابی عطا فرمائی۔

ایم اے کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۶۲ء میں اردو کالج میں انھیں جز وقتی استاد مقرر کر لیا گیا۔ مارچ ۱۹۶۳ء میں وہ اسی کالج میں شعبہ اردو کے مستقل لیکچرار مقرر کر دیے گئے اور پھر تادم زندگی اس منصب پر متعین رہے۔

وہ نہایت محنتی اور باہمت اہل علم تھے۔ تعلیم و تدریس میں ان کی حیثیت بہت نمایاں تھی، یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۵ء میں ان کو اردو کالج کی طرف سے ''تمغہ ہلال اردو'' عطا کیا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں وہ کالج ٹیچرز ایسوی ایشن کی جانب سے ''اکیڈمک ایوارڈ میڈل'' کے مستحق قرار پائے اور قائداعظم کی صد سالہ تقریبات کے موقعے پر اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ نے انھیں ''تمغہ قائداعظم'' سے سرفراز کیا۔ ان کی تدریسی خدمات کے اعتراف میں یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جس سے وہ مفتخر ہوئے۔

اب ان کی تصنیفی تگ و تاز کی طرف آیے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں انھوں نے ۱۹۵۷ء میں قدم رکھا اور پھر تا نفس واپسیں قلم ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور وہ برابر صفحات قرطاس پر دوڑتا رہا۔ سطور ذیل میں ان کی تصانیف و تراجم کا مختصر الفاظ میں تعارف کرایا جاتا ہے۔

۱۔ مولانا فیض احمد بدیوانی: یہ ان کی پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مولانا فیض احمد بدایوانی کے حالات و سوانح معرض تحریر میں لائے گئے ہیں۔

۲۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: یہ کتاب مشہور بزرگ سید جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت کے زریں کارناموں اور احوال زندگی پر محیط ہے۔

۳۔ مولانا محمد احسن نانوتوی: اس میں ممتاز عالم و مصنف مولانا محمد احسن نانوتوی کے حالات اور ان کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

۴۔ ارباب فیض و کمال بریلی: یہ کتاب صوبہ یوپی کے شہر بریلی سے تعلق رکھنے والے علما و فضلا کے کوائف حیات کا معلوماتی مجموعہ ہے۔

Marfat.com

۵۔ تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ: اس میں تبلیغی جماعت کے بارے میں کچھ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۶۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء (واقعات و شخصیات): جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے پس منظر اور اس سے متعلق ضروری واقعات تحریر میں لائے گئے ہیں، نیز ان شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے، جنھوں نے اس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ اس موضوع کی ایک ضخیم کتاب ہے۔

۷۔ کاروان رفتہ: اس میں بعض اہم شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ شخصیتوں کے اس مجموعے میں حسرت موہانی، نواب بہادر یار جنگ، اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، احسن مارہروی، فانی بدایونی، غلام رسول مہر، ابن انشا، مولوی شمس الدین اور حفیظ اللہ پھلواروی وغیرہ چھبیس شخصیتیں شامل ہیں۔

۸۔ غالب اور عصر غالب: کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا چیزیں مندرج ہوں گی۔

۹۔ اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ: یہ ان کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی نگرانی میں کراچی یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۷۸ء میں لکھا اور ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے مندرجہ ذیل فارسی کتابیں اردو زبان میں منتقل کیں اور ان میں حواشی وتعلیقات کا اضافہ کیا، جس سے علمی اور تحقیقی اعتبار سے کتابوں کی افادیت بہت بڑھ گئی۔

۱۔ وقائع عبدالقادر خانی: اس پر حواشی لکھے اور علم و عمل کے نام سے ترتیب دیا۔ یہ کتاب بہت سے تاریخی واقعات وحوادث کا ماخذ ہے، جس سے اہل علم مستفید ہوتے ہیں۔

۲۔ تذکرہ علمائے ہند (اردو ترجمہ): برصغیر کے علما و مشائخ کے سلسلے کی یہ ایک اہم کتاب ہے جو مولوی رحمان علی نے فارسی میں تصنیف کی۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اس کا اردو ترجمہ کیا، اس پر مقدمہ لکھا اور حواشی تحریر کیے۔

۳۔ مجموعہ وصایا اربعہ: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس رسالے کو اردو کا جامہ پہنایا۔

۴۔ مـاثر الامرا: صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کی یہ فارسی کتاب تین ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے اور متعدد تاریخی واقعات پر مشتمل ہے...... قادری صاحب نے اسے مرتب کیا اور اسے اردو کے قالب میں ڈھالا۔

۵۔ سیر العارفین: یہ عہد سکندر لودھی کے ممتاز عالم اور مشہور شاعر جلال الدین جمالی کی تصنیف ہے، جس میں بہت سے مشائخ وعلما کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ایوب قادری نے اس کا اردو ترجمہ کیا۔

۶۔ فرحت الناظرین: محمد اسلم انصاری پسروری نے ۱۱۸۴ھ میں فرحت الناظرین کے نام سے فارسی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اس کے ایک حصے میں دو مغل حکمرانوں...... شاہ جہان اور اورنگ زیب عالم گیر...... کے زمانے کے علما وصوفیا اور اصحاب مشیخت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایوب قادری

Marfat.com

نے فرحت الناظرین (شخصیات) کے نام سے اس حصے کو اردو میں منتقل کیا۔

۷۔ طبقات اکبری: نظام الدین احمد بخشی کی فارسی کتاب طبقات اکبری مغل حکومت کے دورِ عروج کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے، جسے ایوب قادری نے خلعت اردو پہنایا۔

علاوہ ازیں انھوں نے کئی قدیم تاریخی، سیاسی اور ثقافتی نوعیت کی کتابیں مرتب کیں اور ان پر حواشی تحریر کیے۔ مختلف جرائد ورسائل میں بے شمار مضامین لکھے اور اس طرح تاریخ وادب کی بڑی خدمت کی۔

سطور بالا میں بتایا گیا ہے کہ ان کی تصنیفات میں ایک کتاب اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ ہے جس پر انھیں کراچی یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی سند عطا ہوئی۔ یہ کتاب آٹھ ابواب پر محتوی ہے۔ اس میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے شمالی ہند میں کن کن علمائے کرام اور صوفیائے عظام نے کون کون سی کتابیں اردو نثر میں لکھیں، کس موضوع پر لکھیں، کس کی تحریک و تجویز سے لکھیں اور کس جذبہ وعاطفہ کے تحت لکھیں۔ نیز اس دور میں کن کتابوں کا کن بزرگوں نے کس زبان سے اردو میں ترجمہ کیا اور کن محرکات ووجوہ سے کیا۔

کتاب میں اس بات کی صراحت بھی کی گئی ہے کہ شمالی ہند کے کن کن علاقوں میں اردو زبان نے کس دور میں نشو ونما پائی اور کون سی تحریکیں اس کے ارتقا کا باعث بنیں۔ مثلاً سلاطین دہلی کے عہد میں اردو نے کس طرح کروٹ لی، دکن میں اردو کن ابتدائی منازل سے گزری، بھگتی تحریک نے اس پر کیا اثرات مرتب کیے، مغل دور میں اس نے کس انداز سے ارتقائی مرحلے طے کیے، اور پھر کس طرح آگے بڑھی۔ شمالی ہند میں انگریزوں کو غلبہ واستیلا حاصل ہوا تو اردو زبان کس شکل میں عروج وترقی سے ہم کنار ہوئی۔ پھر تحریک ولی اللہی، تحریک وہابیت اور تحریک مجاہدین نے اردو زبان وادب کو کس نہج سے آگے بڑھایا۔ مختلف فقہی مسالک کے اختلافی مسائل اور مناظرانہ مباحث سے اردو نے کس نہج سے ترقی کی۔

اپنی نوعیت کی یہ اولین کتاب ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ علمائے کرام کی جماعت اردو زبان وادب کی سب سے بڑی محسن ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے پہلے پہل اس زبان کو بال وپر عطا کیے، تحریر وکتابت کے منصب بلند سے نوازا، اسے اظہار وتبلیغ کا ذریعہ بنایا، اس میں مذہبی اور دینی مسائل بیان کیے اور اسے نئے افکار، نئے لہجے اور نئے اسلوب سے روشناس کرایا۔

علمائے دین نے اس وقت اس زبان میں تصنیف وتالیف کی طرح ڈالی جب کہ نہ اس کے قواعد وضوابط مرتب ہوئے تھے اور نہ اس کی گرامر عالم وجود میں آئی تھی۔ اس زمانے میں اس زبان میں کتابیں لکھنا، اسے مافی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور عربی وفارسی کی ترقی یافتہ زبانوں میں مرقوم مسائل کو اس نوزائیدہ زبان میں منتقل کرنا انتہائی مشکل تھا۔ لیکن علمائے کرام کی ہمت اور فکری استعداد ملاحظہ ہو کہ وہ اردو کی ترویج

Marfat.com

واشاعت کے لیے اس نہج سے کوشاں ہوئے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اسے نئے محاورات، نئے اسالیب اور الفاظ کے نئے ذخیرے سے مالامال کر دیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کا شمار اب دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ کروڑوں انسانوں کی زبان ہے، ہر ملک میں اس کے بولنے والے موجود ہیں اور ہر موضوع کا لٹریچر اس میں منتقل ہو گیا ہے اور روز بروز ہو رہا ہے۔ کسی حد تک اسے بین الاقوامی زبان بھی کہا جا سکتا ہے۔

علمائے کرام کی اردو نثر کی بعض تصانیف میں اختلافی ونزاعی مسائل بھی بیان ہوئے ہیں اور انداز بیان میں کسی قدر شدت بھی ابھر آئی ہے، لیکن اس میں اردو کی خدمت کا یہ پہلو نمایاں ہے کہ ان اختلافی اور نزاعی مسائل کا جواب بھی اردو ہی میں دیا گیا ہے اور پھر جواب الجواب کے لیے بھی اسی زبان کو منتخب کیا گیا۔ اس طرح متنازعہ اور مختلف فیہ مسائل کا بیان بھی بہر حال اردو کی نشوونما اور ارتقا کا ذریعہ ثابت ہوا۔

اس کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اس میں شمالی ہند کے اسی (۸۰) علمائے کرام کی ایک سو باون (۱۵۲) تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں تئیس (۲۳) کتابیں غیر مطبوعہ ہیں جو برصغیر پاک وہند کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ یا انفرادی طور پر بعض اہل علم کے پاس موجود ہیں۔ باقی مطبوعہ ہیں۔ ان قدیم مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی مدد سے ایوب قادری نے اردو کی کہانی خود اردو کی زبانی انتہائی سلیقے سے صفحات قرطاس پر رقم کر دی ہے۔

یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے جون ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت کا قصہ یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء میں ایوب قادری لاہور آئے اور اس طویل مقالے کے چند اوراق مجھے دے گئے۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ مقالہ اس انداز کا ہے۔ اگر ادارہ اسے شائع کرنا چاہے تو وہ پورا مسودہ دے دیں گے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد وہ پھر آئے اور بغیر طلب کے مسودہ مجھے دے گئے۔ اس وقت ادارے کے اکیڈمک ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ تھے جو ہر وقت مصروف مطالعہ رہتے تھے۔

مئی ۱۹۸۴ء میں سراج منیر (مرحوم) کو اس منصب پر فائز کر دیا گیا۔ ایک دن ان سے اس مسودے کے بارے میں گفتگو ہوئی اور میں نے مشورہ دیا کہ اسے چھاپ دینا چاہیے، لیکن اس سے چھ مہینے پہلے قادری صاحب وفات پا چکے تھے۔

مرحوم سراج منیر نے مسودہ اِدھر اُدھر سے دیکھا اور پھر میرے حوالے کر دیا کہ میں اسے ایڈٹ کر دوں۔ چناں چہ میں نے کام شروع کر دیا۔ کتاب میں ہر مصنف کی کتاب کے اقتباسات دیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ دو ڈھائی سو سال پہلے اس ملک کی اردو زبان اس قسم کی تھی۔ بعض دینی ومذہبی کتابوں کے شدید اختلافی نوعیت کے اقتباسات بھی تھے، اگرچہ یہ تاریخی بات تھی جو اپنے تمام نزاعی معاملات کے ساتھ گزر گئی، مگر ہم نے

Marfat.com

ایڈٹ کرتے وقت اس قسم کے مباحث کو کتاب سے نکال دیا اور صرف نمونہ زبان کے لیے چند سطور رہنے دیں۔ غیر نزاعی طویل اقتباسات و مندرجات بھی قلم زد کر دیے۔ اس کے باوجود کتاب کی ضخامت ۶۸۰ صفحات تک پہنچ گئی۔

نہایت افسوس ہے وہ اپنی یہ اہم کتاب دیکھ نہ سکے۔

مرحوم کسی نہ کسی معاملے میں مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ میں بھی انھیں خط لکھتا تھا۔ ماہنامہ المعارف کے لیے (جس کی ادارت میرے سپرد ہے) وہ عام طور سے مضامین بھیجتے تھے۔ اس سلسلے میں بھی ان سے خط وکتابت رہتی تھی۔ ان کے بعض خط ضائع ہو گئے، سات خط البتہ محفوظ ہیں، جو ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط سے ان کی طبعی شرافت اور علم و تحقیق سے دلچسپی کا پتا چلتا ہے۔

(۱)

۷۸۶

A/174/N

نارتھ ناظم آباد

کراچی نمبر ۳۳

حضرت مخدومی بھٹی صاحب! سلام مسنون

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

میں نے ایک مضمون مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے متعلق ارسال خدمت کیا تھا، ملا ہوگا۔ مجھے ایک مقدمہ لکھنے کے سلسلے میں اس کی نقل کی ضرورت ہے۔ اگر اس کی نقل بھجوا سکیں تو شکریہ۔ یا فوٹو اسٹیٹ کر کے بھجوا دیں۔ شاید اشاعت میں دیر لگے۔ اور اگر کتابت ہوگئی اور قریب الاشاعت ہو تو اصل بھجوا دیں۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں گا۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری

۳۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

(۲)

اس خط میں شیخ صاحب سے مراد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اس وقت کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ مراد ہیں۔ خط میں نزھتہ الخواطر کے بل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد اس کی آٹھویں جلد ہے جو کراچی سے چھپی ہے۔ ہم نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے یہ جلد قادری صاحب کی وساطت سے منگوائی

Marfat.com

تھی۔ پہلی سات جلدیں ہمارے پاس موجود تھیں۔

۱۶۔اپریل ۱۹۸۰ء

۷۸۶

محترمی مولانا بھٹی صاحب! دام مجدکم

السلام علیم ورحمۃ اللہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

میں نے شیخ صاحب کو علیحدہ لفافہ ارسال کیا ہے، آپ کو بھی عریضہ لکھ رہا ہوں۔

۱۔ نزھۃ الخواطر کا بل بھجوایا ہے، چیک بھجوا دیجیے۔

۲۔ مضمون اسلام اور تجارت ارسال خدمت ہے۔

۳۔ آپ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ پچھلے ماہ کراچی یونیورسٹی نے مجھے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری مرحمت کی ہے۔ میری تحقیق کا موضوع تھا، اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ۔ (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) اگر مناسب ہو تو اس سے متعلق چند سطریں رسالے میں لکھ دیں۔ میں نے اپنے متعلق دو صفحے لکھ کر شیخ صاحب کے لفافے میں رکھ دیے ہیں۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری

A/174/N

نارتھ ناظم آباد

کراچی

(۳)

۴۔اگست ۱۹۸۰ء

A/174/N

نارتھ ناظم آباد، کراچی نمبر ۳۳

محترمی مولانا بھٹی صاحب! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

Marfat.com

لاہور کی قیامت خیز بارش کی خبریں اخبارات اور ریڈیو سے مل رہی ہیں۔ خدا کرے آپ مامون ومحفوظ ہوں۔

آپ کے سامنے دو چیک تیار تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک دو روز میں بھیج دوں گا۔ وہ ابھی تک نہیں ملے۔ آپ مہربانی فرما کر ان سے لے کر بھجوا دیجیے۔ ایک میرے نام کا تھا، دوسرا سعید حسن کے نام کا تھا۔ اس تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

فقط والسلام

خادم وخاکسار

محمد ایوب قادری

(۴)

A/174/N

نارتھ ناظم آباد کراچی

مخدوم ومحترم مولانا بھٹی صاحب! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

۱۔ سید محمد شاعر پر مضمون طبع ہو گیا۔ شکریہ۔ صاحب مضمون کو پرچہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ آپ پانچ نسخے حسب معمول بھجوا دیجیے۔ سردست میں نے اپنا پرچہ دے دیا ہے۔ ان کا پتا مندرجہ ذیل ہے۔

سید تقی رضا بلگرامی۔ 37/7 مسلم لیگ کوارٹرس۔ ناظم آباد کراچی نمبر ۱۸۔

۲۔ آپ نے المعارف کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں جامعہ دہلی کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جو شمس بدایوانی نے سر محفوظ علی کے متعلق نئی معلومات کے عنوان سے لکھا ہے۔ اگر آپ اس کی فوٹو اسٹیٹ بھجوادیں تو شکر گزار ہوں گا۔

۳۔ اپنی کتاب بھی بھجوایے، فوراً تبصرہ کروں گا۔ تھوڑا سا شرم سار ہوں۔

۴۔ علامہ سلیمان ندوی مرحوم پر ایک مضمون بھیج رہا ہوں۔ میرے فاضل دوست پروفیسر ابراہیم خلیل نے لکھا ہے۔ قریب ترین اشاعت میں شائع کر کے شکریے کا موقع دیجیے۔ اس نوع کی بات کبھی میں اپنے مضمون کے لیے نہیں لکھتا ہوں۔

۵۔ شیخ صاحب سے مودبانہ سلام عرض کر دیجیے۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۸۳ء

Marfat.com

فقط والسلام

خاکسار

محمد ایوب قادری

(۵)

انھوں نے اپنی ایک کتاب مجھے المعارف میں تبصرے کے لیے بھیجی تھی۔ اس کے بعض مندرجات سے مجھے اختلاف تھا۔ ایک خط میں اس کا تذکرہ کیا تو اس کے جواب میں یہ مکتوب تحریر کیا۔

۸۔ مئی ۱۹۸۳ء

محترمی مولانا بھٹی صاحب! زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گرامی نامہ ملا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔

میرے خیال سے سبحانی اکیڈمی سے رسالے لے لیجیے۔ زیادہ دن گزرنے کے بعد کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ اگر مجھے اس بات کا اندازہ ہوتا تو میں خود پہنچانے کا حتمی انتظام کر دیتا۔ بہر حال کتابیں ان شاء اللہ آجائیں گی۔ آپ جیسے مخلص مسلمان دوست اور عالم سے خفگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہر شخص کی تحریر اس کے اخلاق کا آئینہ ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے یہاں ہمیشہ وقار اور شرافت محسوس کی ہے۔

آپ کے گرامی نامے کا آخری پیراگراف میں نے دو مرتبہ پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ عقیدت، عقیدت ہے، تاریخ، تاریخ ہے۔ اختلاف رائے کا احترام بھی ضروری ہے۔ لکھیے اور ضرور لکھیے، ان شاء اللہ مجھے بھی اس سے روشنی ملے گی۔

جلد اول پر میں جلد ہی تبصرہ کروں گا۔

خادم وخاکسار

محمد ایوب قادری

(۶)

ایوب قادری صاحب کے چھوٹے بھائی ابو معاویہ نعمت اللہ تھے۔ وہ بھی انہی کی طرح کراچی میں ایک حادثے میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے بیٹے لاہور آئے تو قادری صاحب نے ان کو میرے نام رقعہ دیا اور سلسلہ فقہائے ہند کی ایک جلد بھی منگوائی۔ اس سے قبل کچھ رسالے وہ میرے لیے اردو بازار میں نذیر احمد سبحانی (سبحانی اکیڈمی) کو دے گئے تھے۔ یہ خط اسی سلسلے کا ہے۔ اس پر تاریخ مرقوم نہیں۔

Marfat.com

جناب محترم بھٹی صاحب! سلام مسنون

حامل رقعہ ہذا مرحوم بھائی کا بڑا بچہ حافظ معاویہ ہے۔ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ توجہ وسرپرستی فرمایے...... میں نے رسالے سجانی اکیڈیمی میں دے دیے تھے۔ آپ نے لے لیے ہوں گے۔

اگر آپ اس کو کتاب دیں گے تو مل جائے گی۔ فقط

محمد ایوب قادری

(۷)

اس خط پر تاریخ نہیں لکھی گئی۔

A/174/N

نارتھ ناظم آباد

کراچی نمبر۳۳

جناب محترم مولانا بھٹی صاحب!

سلام مسنون

المعارف کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ میرا مضمون شامل تھا، اس کا مزید شکریہ۔ پانچ پرچے بھی ملے۔ یہ پرچے کالج کے پتے پر بھیج دیے تھے۔ گھر کا پتا ٹھیک ہے، وہیں بھیجا کریں۔ کالج میں اِدھر اُدھر ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔

میں نے ایک مضمون مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی پر بھیجا ہے، ملا ہوگا۔

آئندہ اسلام اور صنعت پر مضمون بھیجنے کا خیال ہے۔ آپ نے شیعہ (تعزیرات وحدود) اور کتب اربعہ پر مضمون لکھنے کو کہا تھا، میں نے مولانا محمد طاسین صاحب مجلس علمی کراچی سے ذکر کیا تھا، انھوں نے ہامی بھر لی تھی۔ معلوم نہیں انھوں نے آپ کو لکھا یا نہیں۔ آپ انھیں یاد دہانی فرما دیں۔

پتا: مولانا محمد طاسین۔ ناظم مجلس علمی۔ میری ویدر ٹاور کراچی۔

احباب کو سلام۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

فقط والسلام

محمد ایوب قادری

پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری خلوص ومحبت کا پیکر اور درویش منش اہل علم تھے۔ نارتھ ناظم آباد این بلاک

Marfat.com

کراچی میں سکونت گزیں تھے۔ ۲۵۔نومبر ۱۹۸۳ء کو جمعے کے دن ساڑھے چار بجے شام اپنے گھر کے قریب ہی ایک تیز رفتار ویگن کی زد میں آئے اور آناً فاناً اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون.

اس عالم آب وگل میں ہر وقت موت وحیات کا کھیل جاری رہتا ہے۔ روزانہ بے شمار لوگ رخت سفر باندھتے ہیں اور بے شمار اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ منهم من قضىٰ نجبه ومنهم من ينتظر

ایوب قادری مرحوم نے ستاون برس چار مہینے عمر پائی۔ اپنی تصانیف وتراجم میں انھوں نے ہزاروں علما و مشائخ اور زعما وفضلا کے حالات لکھے اور بہت سے اصحاب علم اور ارباب تحقیق سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ مختلف رسائل وجرائد میں بھی انھوں نے متعدد حضرات کے بارے میں لکھا، لیکن وقت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ خود ان کی وفات پر کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ صرف کراچی کے ایک اخبار نے دو یا تین سطر کی خبر شائع کی، وہ بھی ایک کونے میں بالکل غیر نمایاں طور پر، تاکہ کوئی پڑھ نہ سکے۔

ہمارے دوست پروفیسر شیر محمد گریوال (شعبہ تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور) کی تجویز وتحریک سے عجائب گھر کے ڈاکٹر انجم رحمانی کے کمرے میں چند دوست بیٹھے، مرحوم کے لیے دعاے مغفرت کی اور لاہور کے اخبارات کو ان کی وفات پر قرارداد تعزیت بھیجی۔

میں نے المعارف میں ان پر تعزیتی شذرہ لکھا۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

سحر گل خاں

جنوری ۱۹۷۲ء کی بات ہے، میں پندرہ دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں چک ۵۳ گ ب منصور پور گیا جو جڑاں والا سے تین میل آگے فیصل آباد جانے والی سڑک سے دو فرلانگ پر بائیں جانب واقع ہے۔ اس دوران میں ایک دن میرے بچپن کے دوست محمد طفیل فوجی جو اسی گاؤں میں مقیم ہیں، میرے پاس آئے اور کہا: ''چلو تمھیں آج ایک ایسے شخص سے ملائیں جو کسی زمانے میں انقلابیوں کے ساتھ رہا ہے اور اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ متحدہ ہندوستان کی انگریزی حکومت کے خلافت بغاوت کے نتیجے میں ملک کی مختلف جیلوں میں گزرا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''وہ کون صاحب ہیں اور کہاں رہتے ہیں؟''

طفیل نے جواب دیا: ''ان کا نام سحر گل خاں ہے اور جڑاں والا سے دو میل کے فاصلے پر چک ۲۳۸ گ ب میں اقامت گزیں ہیں۔''

طفیل نے یہ بھی بتایا کہ وہ بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں سے ہیں۔

سحر گل خاں کا نام میں نے پہلی دفعہ سنا تھا اور جیسے جیسے طفیل ان کے بارے میں سلسلہ واقعات کو آگے بڑھاتا جاتا تھا، میرے دل میں ان سے ملنے کا جذبہ شوق تیز تر ہوتا جاتا تھا۔

دن کے دس بجے ہوں گے کہ ہم دونوں اپنے گاؤں سے سائیکلوں پر سوار ہوئے اور جڑاں والا جا کر اس شخص کی دکان پر پہنچے، جہاں سحر گل خاں کا آنا جانا تھا، لیکن وہ وہاں نہیں آئے تھے۔ اب ہم ان کے گاؤں چک ۲۳۸ گ ب کو روانہ ہوئے جو جڑاں والا سے جنوب مشرق میں دو میل کے فاصلے پر ہے۔ چند منٹ بعد ہم اس گاؤں کے چوک میں پہنچے تو طفیل نے مجھے ایک مکان کے سامنے جا کھڑا کیا اور کہا: ''یہ ہے سحر گل خاں کا مکان!''

میں نے باہر سے اس مکان کو غور سے دیکھا۔ کہیں پکی اینٹیں تھیں، کہیں کچی۔ مکان کے اندر جانے کا دروازہ کچی اینٹوں کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دائیں جانب پکی اینٹوں کی بیٹھک تھی جس کا ایک دروازہ باہر کو کھلتا تھا۔

طفیل نے بتایا، یہ چھوٹی سی بیٹھک بھگت سنگھ اور اس کے بعض ساتھیوں کا مرکز رہی ہے اور وہ چند افراد اس بیٹھک میں یہ مشورے کرتے رہے ہیں کہ برصغیر میں کس طرح انقلاب برپا کیا جائے اور اس خطے کو اس غیر ملکی حکمران گروہ کے پنجہ استبداد سے کیسے نجات دلائی جائے جس کے دائرۂ حکمرانی کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ اس میں کہیں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔

Marfat.com

کچی پکی اینٹوں کا پرانی ساخت کا یہ مکان دیکھ کر ذہن نے جو پیچھے کو زقند لگائی تو بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں جا پہنچا اور بہت سے ان دیکھے واقعات عملی شکل اختیار کر کے تیزی کے ساتھ چشم تصور میں گھومنے لگے۔ خیال آیا کہ اس دروازے سے آزادی خواہ طبقے کے بہت سے کارواں گزرے ہیں اور یہ خاموش دیواریں اور چپ چاپ بوسیدہ چھتیں بے شمار بھیدوں اور رازوں کی امین ہیں، ایسی امین کہ ٹوٹ پھوٹ جائیں مگر کسی پر کوئی راز ظاہر نہ کریں۔

ہم دو تین منٹ وہاں کھڑے اس مکان کے بیرونی حصے کو دیکھتے رہے۔ اتنے میں ایک نوجوان باہر نکلا۔ وہ سحر گل خاں کا بیٹا تھا۔ طفیل نے اس سے پوچھا: ''خاں صاحب کہاں ہیں؟''

نوجوان بولا: ''مربعے گئے ہیں، وہاں بیلنا لگایا ہے اور گڑ بنا رہے ہیں۔''

طفیل کے پوچھنے پر اس نے مربعے جانے کا راستہ بتایا۔

ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بیلوں کی جوڑی بیلنے میں جتی ہوئی ہے، چار پانچ آدمی گڑ تیار کر رہے ہیں اور ایک صاحب موٹے بان کی چوکھڑا بنی ہوئی چارپائی پر بیٹھے کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی نظر ہم پر پڑی تو اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور سلام کے لیے آگے بڑھے۔ ہم نے سائیکل ایک طرف کھڑے کر دیے اور میں نے نہایت ادب کے ساتھ اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دیے۔

طفیل نے ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ لاہور سے آئے ہیں اور آپ سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے عرض کیا: ''سحر گل خاں آپ کا اسم گرامی ہے؟''

بولے: ''آپ جس سحر گل خاں سے ملنا چاہتے ہیں وہ تو ۱۹۴۷ء میں مر گیا تھا، میں اس کا ہم نام آپ کے سامنے حاضر ہوں۔''

میں ان کے اس انتہائی مختصر متن کی تشریح جو اپنے دامن میں بہت سی تفصیلات کو گھیرے ہوئے تھی، فوراً سمجھ گیا تھا۔ عرض کیا: ''ہم اس ''مرحوم'' کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آئے ہیں، اگر آپ ان کے ہم نام کی حیثیت سے اس کارِ خیر میں شریک ہو جائیں تو زہے عز و شرف۔''

اس پر وہ اس انداز سے مسکرائے جیسے میری ''قوتِ فہم'' کی داد دے رہے ہوں، اور بغل گیر ہونے کے لیے بانہیں پھیلا دیں۔ پھر چارپائی قدرے کھلی جگہ میں کھینچتے ہوئے کہا: ''تشریف رکھیے، ہم دیہاتی لوگ ہیں، کھیتوں میں چارپائی صوفے اور کرسی کا کام بھی دیتی ہے اور پلنگ کا بھی۔''

میں نے کہا: ''میں بھی دیہاتی ہوں اور گاؤں سے آیا ہوں۔''

Marfat.com

وہ خود پائنتی میں بیٹھے اور ہمیں اصرار کر کے سرہانے کی طرف بٹھایا۔ پھر بولے: ''پہلے یہ بتایئے، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ گنے کا تازہ رس پینے کو اور گرم گرم گڑ کھانے کو حاضر ہے۔ لسی بھی موجود ہے، مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

ہم نے ان کی اس پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ نہ مانے تو ہم نے گنے کے رس کا ایک ایک گلاس پیا اور تھوڑا سا گڑ کھایا۔ یعنی ان کا نمک کھانے سے اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ کسی کا نمک کھانے کے بعد ایک شریف آدمی بہت سی مجبوریوں میں جکڑا جاتا ہے۔

بولے: ''اب فرمایئے، کیا ارشاد ہے؟''

وہ صاف ستھرے لہجے میں خالص پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ طرزِ کلام تعلّی اور تکبر سے پاک۔ ہر بات میں انکسار کا غلبہ اور مخاطب کا احترام ملحوظِ خاطر۔ میں نے سر سے پاؤں تک انھیں بار بار دیکھا۔ گورا رنگ، خشخشی سفید داڑھی، چڑھی ہوئی مونچھیں، سر پر خاکی سے رنگ کی قراقلی ٹوپی، سفید کھدر کی شلوار قمیص، ہلکے آسمانی رنگ کی گرم چادر، براؤن پشاوری چپل، موٹی موٹی چمک دار آنکھیں، جوان کی ذہانت کی عکاس تھیں۔ پورا قد، متناسب جسم، بات چیت کا اسلوب دھیما اور میٹھا۔ کوئی پینسٹھ سال کے لگ بھگ عمر، صحت بہت اچھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کبھی بیمار نہیں ہوئے، ہمیشہ سے صحت مند اور توانا ہیں۔ بلاجھجک بات کرتے تھے، حالاں کہ اس سے پہلے کوئی تعارف نہ تھا۔

میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے ان سے پوچھا: ''خاں صاحب! آپ کا آبائی تعلق ضلع لائل پور (حال فیصل آباد) سے ہے یا کسی اور علاقے سے؟ یعنی آپ آبادکار ہیں یا آزادی کے بعد پناہ گزیں کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں؟''

اس سوال کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے مجھ سے سوال کیا: ''آپ کسی اخبار سے منسلک ہیں؟''

میرے خیال میں یہ سوال بڑا معقول اور برمحل تھا، اس لیے کہ اخبار نویس کے سوال کا جواب اور انداز سے دیا جاتا ہے اور عام آدمی سے گفتگو میں اور اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میرے پاس بعض اخباروں والے آتے ہیں مگر میں کسی سے بات نہیں کرتا۔

میں نے کہا: ''کچھ عرصہ پیشتر میں ایک ہفت روزہ اخبار سے منسلک تھا۔ پندرہ سال اس کا ایڈیٹر رہا۔ اب میرا کسی اخبار سے تو تعلق نہیں ہے تاہم کام لکھنے پڑھنے ہی کا کرتا ہوں۔ البتہ ایک ایسے ماہانہ رسالے کی ادارت میرے سپرد ہے جو خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کا ہے...... سیاسی معاملات و مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے......'' اس کے بعد میں نے ان کو اپنے کام کی نوعیت بتائی اور کہا کہ ''آپ سے صرف اپنی ذاتی

Marfat.com

معلومات کے لیے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، مجھے اس موضوع سے دلچسپی ہے۔ شاید یہ باتیں کبھی ضبط تحریر میں آجائیں اور ممکن ہے کہیں چھپ بھی جائیں۔''

انھوں نے بتایا کہ وہ اصلاً صوبہ سرحد کے قبیلہ خٹک سے تعلق رکھتے ہیں اور علاقہ تیرہ کے موضع الگڑی میٹھا خیل کے رہنے والے ہیں جو ضلع اور تحصیل کاکڑ میں واقع ہے۔ ان کے والد کا نام احمد خاں اور دادا کا اسم گرامی نور محمد خاں تھا۔ نور محمد خاں، انگریزی فوج میں صوبیدار میجر تھے اور فوجی کی حیثیت سے قابل قدر خدمات انجام دینے پر انھیں جڑاں والا کے قریب چک ۲۳۸ گ ب میں جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، حکومت کی طرف سے دو مربعے زمین دی گئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اب میں اس زمین میں کاشت کاری کرتا ہوں اور پھر ایک باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ باغ بھی اسی زمین میں ہے اور باغ بانی میرا محبوب مشغلہ ہے۔

میں نے پوچھا: ''آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی؟''

جواب دیا: ''والد نے جڑاں والا کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرایا تھا۔ باقاعدہ صرف مڈل پاس کر سکا، لیکن اردو اچھی طرح پڑھ لیتا اور مشکل سے مشکل الفاظ آسانی سے سمجھ لیتا ہوں۔'' اس کی تشریح کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی اردو بھی روانی سے پڑھتا اور خوب سمجھتا ہوں۔ پشتو بھی جانتا ہوں، فارسی زبان سے بھی کچھ رابطہ اور انگریزی بھی ٹٹول لیتا ہوں۔ اس کے علاوہ تصوف سے بھی دلچسپی ہے اور سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت ہوں۔

میں نے سوال کیا: ''سنا ہے آپ کا تعلق ہندوستان کے انقلابیوں سے رہا ہے۔ کیا آپ یہ بتانا مناسب سمجھیں گے کہ وادی سیاست میں کب قدم رکھا، کیوں رکھا اور کن کن لوگوں سے مراسم رہے؟''

جواب ملا: ''بیس اکیس سال کی عمر میں میری شادی ہوئی اور اس سے کوئی دو سال بعد بھگت سنگھ اور اس دور کے انقلابیوں سے تعلق پیدا ہو گیا۔ مختلف مقامات پر ہماری خفیہ میٹنگیں ہونے لگیں، کبھی کھیتوں میں اور کبھی کسی کے گھر میں۔ عام طور پر ہم رات کو جمع ہوتے تھے اور اس مسئلے پر غور کرتے تھے کہ انگریزی حکومت کے خلاف کیا اقدام کیا جائے اور کس طریقے سے کیا جائے۔ بارہا یہ مشورے میرے گھر میں ہوئے۔ میری چھوٹی سی بیٹھک ہم چند آدمیوں کی جلسہ گاہ تھی۔ انگریز کے خلاف ہم زیادہ نرم سیاست کے حامی نہ تھے، قدرے گرم سیاست کو اپنانا ہمارا نقطہ نظر تھا۔ اسی لیے انگریزی حکومت ہمیں بدنام کرنے کے لیے دہشت پسند قرار دیتی تھی جس کا دوسرا نام تخریب کار ہے، حالاں کہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ نہ ہم دہشت پسند تھے، نہ تخریب کار۔ ہم محض انقلابی تھے اور ملک میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور انقلاب کی بات یا کوشش کرنا قانونی طور سے نہ اس وقت کوئی جرم تھا، نہ اب جرم ہے۔ ہماری یہ کوشش تھی کہ ملک کے عام لوگوں سے کسی نہ کسی طرح رابطہ پیدا کر کے

Marfat.com

انھیں انگریز کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے اور جس طرح ممکن ہو، ان کو اپنا ہم نوا بنانے کی سعی کی جائے۔''

خاں صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: اپنے علاقے کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے میرے ساتھیوں نے مجھے کسی مسجد کو مرکز بنانے اور اس میں امامت وخطابت کی ذمے داریاں سنبھالنے کا مشورہ دیا۔ چناں چہ میں نے قرآن مجید جو پہلے ہی پڑھا تھا، اب دوبارہ اچھی طرح پڑھا۔ چند چھوٹی بڑی سورتیں یاد کیں، کچھ ترجمہ پڑھا اور اردو کی بعض تفسیروں کا مطالعہ کیا اور داڑھی بڑھالی۔ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے کسی نہ کسی اسلامی موضوع پر تقریر بھی کرتا تھا۔ جب میں نے اور میرے ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ میں کسی حد تک امامت وخطابت کے فرائض انجام دینے کے قابل ہو گیا ہوں تو مولویوں کا سا لباس پہن کر اور وہی وضع قطع بنا کر چپکے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

خاں صاحب نے بتایا کہ اس وقت میں ڈیڑھ سال کے بچے کا باپ تھا۔ لیکن کسی قسم کا پیار اور محبت میری راہ میں حائل نہ ہوئے اور کسی چیز نے میرا راستہ نہ روکا۔ وطن کے کروڑوں لوگوں کے پیار نے گھر کے انفرادی پیار پر پوری طرح غلبہ پا لیا تھا اور اپنا ذاتی مفاد اجتماعی مفاد پر قربان کر دیا تھا۔ میں نہایت ہنسی خوشی سے مستقبل کے پروگرام بناتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور اپنے گاؤں سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر ایک زمیندار کی ''ڈھاری'' میں جا پہنچا۔ سخت بھوک لگ رہی تھی، زمیندار نے مجھے کھانا کھلایا اور پوچھا:

''مولوی ہو۔''

جواب دیا: ''جی ہاں! مولوی ہوں۔''

بولا: ''کہاں سے آئے ہو اور کیا پتا ٹھکانا ہے؟''

عرض کیا: ''کسی مصیبت زدہ آدمی کا کیا پتا ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ بال بچوں والا ہوں اور بے روزگار ہوں۔ کسی چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش میں ہوں۔ آٹھ جماعتیں سرکاری سکول میں پاس کی ہیں۔''

زمیندار نے مجھ پر ترس اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''بچوں کو قرآن شریف پڑھاؤ گے اور جمعہ وجماعت کرا سکو گے؟ ہم دو وقت کا کھانا اور ربیع اور خریف کی فصلوں کے موقعے پر کچھ غلہ دے دیا کریں گے۔ اگر یہ منظور ہو تو ہمارے گاؤں کی مسجد میں کام شروع کر دو۔ قیام کے لیے مسجد کا حجرہ موجود ہے۔''

زمیندار نے مزید کہا: ''صبح شام کی روٹی مسجد میں پہنچانے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ اگر کوئی تکلیف ہو تو مجھے بتانا، میں گاؤں کا نمبردار ہوں۔''

خاں صاحب نے بتایا: ''میں نے زمیندار کی یہ پیش کش اس کے شکریے کے ساتھ فوراً قبول کر لی، کیوں کہ میں اسی مقصد کے لیے گھر سے نکلا تھا اور یہی میرا مشن تھا۔ یہ ''جانگلیوں'' کا گاؤں تھا، وہاں کے لوگ

Marfat.com

بہت بااخلاق تھے اور میری عزت کرتے تھے۔ اس گاؤں میں مجھے ''میاں جی'' کہا جاتا تھا کہ مسجد کے امام کے لیے دیہات میں یہی لفظ استعمال ہوتا تھا۔''

سحر گل خاں نے گاؤں میں بچوں کو قرآن شریف پڑھانا شروع کر دیا۔ بڑی عمر کے لوگوں کو قرآن مجید کے ساتھ اردو بھی پڑھانے لگے۔ نماز فجر کے بعد درس قرآن کا آغاز بھی کر دیا اور جمعہ و جماعت میں خاصی حاضری ہونے لگی۔ اس علاقے میں یہ اس زمانے میں پہلا انداز تعلیم تھا، جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے اور بڑے چھوٹے پابندی سے مسجد میں آنے لگے، لیکن یہ سلسلہ دو مہینے سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خاں صاحب جوش جوانی میں آکر جلد ہی دل کی بات زبان پر لے آئے اور انگریزی حکومت کی مخالفت اور آزادیِ وطن کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ یہ باتیں وہاں کے لوگوں نے کبھی نہ سنی تھیں۔ ایک دن وہی شخص جس نے ان کو مسجد کا امام و خطیب مقرر کیا تھا، انھیں باہر اپنی ''ڈھاری'' میں لے گیا اور پیار کے لہجے میں ان سے کہا:

''میاں جی! آپ انگریزوں کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو اس ملک سے نکال دینا چاہیے، یہ نہ ہونے والی بات ہے۔ آپ ان کو کیسے نکالیں گے۔ ان کے پاس بارعب پولیس ہے، بہت بڑی فوج ہے، ہر تحصیل میں بڑے بڑے تھانے ہیں، ضلعوں میں انگریز ڈپٹی کمشنر ہیں، گورے پولیس کپتان ہیں، ہم ان کے ماتحت ہیں۔ یہ بہت بڑی طاقت کے مالک ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، ان کے رعب اور دبدبے سے لوگوں کے ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ریلیں چلائی ہیں، سڑکیں بنائی ہیں، دریاؤں پر پل تعمیر کیے ہیں، نہریں جاری کی ہیں، علاقوں کے علاقے آباد اور سیراب کیے ہیں، چک بندی کر کے لوگوں کو بسایا ہے، بڑے بڑے جیل خانے بنائے ہیں، اگر چاہیں تو سب کو پکڑ کر جیلوں میں بند کر دیں، کوئی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں، سیدھے سادے نماز روزے کے مسئلے بیان کیا کریں، جن کی لوگوں کو ضرورت ہے۔ اگر آپ کی باتوں کا پولیس والوں کو پتا چل گیا تو آپ کو پکڑ لیں گے اور ہمیں بھی تنگ کریں گے۔ آپ ماشاءاللہ خوب صورت جوان ہیں، اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالیں۔''

خاں صاحب کے بقول زمیندار کا انداز کلام ہمدردانہ بھی تھا اور رازدارانہ بھی۔

خاں صاحب نے بتایا کہ زمیندار کی یہ باتیں سن کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں عجلت سے کام لیا ہے۔ ابھی ان کے کان اس قسم کی باتوں سے آشنا نہ ہوئے تھے اور ذہن ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کے بعد انھوں نے وہاں رہنا مناسب نہیں سمجھا اور کسی کو بتائے بغیر خاموشی سے گاؤں سے نکلے اور لاہور آ گئے۔ لاہور میں ان کے کئی مسلمان، ہندو اور سکھ ساتھی موجود تھے، جنھیں انقلابی کہا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ان کا اصل ٹھکانا ڈی اے وی کالج (یعنی دیانند اینگلو آریہ ویدک کالج) کا ہوسٹل

Marfat.com

تھا۔ یہ وہی کالج ہے جسے اب اسلامیہ کالج (سول لائن) کہا جاتا ہے۔ کالج کے عقب میں اس کا ہوسٹل ہے جس کا دروازہ کورٹ سٹریٹ کی طرف ہے۔

ہوسٹل میں مقیم ان انقلابیوں پر پولیس چھاپے مارتی تھی تو یہ اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے، بعض دفعہ کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کرلیا جاتا تھا۔ پوچھ گچھ یا تھوڑی بہت سختی کے بعد چھوڑ دیا جاتا تھا یا جیل میں بند کر دیا جاتا۔

ان کے کھانے پینے کا کوئی خاص انتظام نہ تھا، کچھ لوگ ان کی مدد کرتے اور کھانا وغیرہ بھجواتے رہتے تھے۔ انقلابیوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ وہ بھی جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اور وہ بھی جو نسبتاً غریب اور تنگ دست تھے۔ حصول آزادی کے پرخلوص جذبے نے سب کو ایک جگہ اکٹھا کر رکھا تھا۔ روکھی سوکھی جو مل جاتی، کھا لیتے۔ کبھی گوشت کھانے کو جی چاہتا تو چار پانچ آنے اکٹھے کر کے پولیس کی آنکھوں سے بچتے بچاتے علی ہجویری کے دربار پہنچ جاتے اور وہاں جا کر بڑا گوشت کھا لیتے۔ ہندو اور سکھ اس سے کوئی پرہیز نہ کرتے تھے۔ سبھی ایک ہی جگہ رہتے، ایک جیسی چیزیں کھاتے اور ایک ساتھ کھاتے۔

حالات نے ان کو شکی مزاج بنا دیا تھا، کسی کے پاس ایک دو روپے پائے جاتے تو ساتھیوں کے نزدیک اس کو مشکوک سمجھا جاتا اور سختی سے پوچھا جاتا کہ اتنے پیسے کہاں سے آئے؟ کیا اس کا رابطہ پولیس یا سی آئی ڈی سے تو نہیں کہ اس نے یہ پیسے دیے ہوں؟ اس سے باقاعدہ جواب طلبی کی جاتی۔ اگر تسلی بخش جواب نہ دے پاتا تو اس کی شامت آجاتی۔

اس قسم کا خود اپنا ایک واقعہ سحر گل خاں نے سنایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ وہ والدہ سے ملاقات کی غرض سے گھر کو روانہ ہوئے۔ اس کا سب کو علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ مالی اعتبار سے ان کے گھریلو حالات اچھے ہیں۔ ضلع لائل پور میں ان کو گرفتاری کا خطرہ تھا۔ فقیروں کا سا بھیس بنایا، ہاتھ میں کشکول پکڑا۔ گلے میں کئی رنگوں کے بڑے بڑے منکوں کی مالا ڈالی اور رات کے دس بجے ہوں گے کہ اپنے گاؤں چک ۲۳۸ گ ب پہنچے۔ ان کا بڑا لڑکا اس وقت چار برس کا ہو چکا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا، دروازے پر کھڑے تھے کہ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آرہی تھی، آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا تو گھر کا پالتو کتا بھونکنے لگا۔ ماں کی ممتا نے سرگوشی کی کہ باہر اس کا بیٹا ہے۔ اس نے اندر سے آواز دیے بغیر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ باہر فقیری لباس میں بیٹا کھڑا ہے۔ بوڑھی ماں بیٹے کو کھینچ کر اندر لے گئی اور جوش محبت میں اس سے لپٹ گئی۔ جوان وخوبرو بیٹے کا یہ حلیہ دیکھا تو اس کی آنکھوں کے دریا سے آنسوؤں کی لہریں اچھل کر کناروں سے باہر آگئیں۔ ادھر سحر گل خاں کا چھوٹا سا معصوم بیٹا فقیر کو دیکھ کر سہم گیا۔ ان کا یہ سب سے بڑا بیٹا تھا جو عین عالم شباب میں وفات پا گیا تھا۔

ایک دن اور دو راتیں وہ گاؤں میں رہے، لیکن گھر سے باہر نہیں نکلے۔ دوسری رات نماز فجر سے پہلے

Marfat.com

اٹھے، وہی لباس فقیری پہنا اور واپس لاہور کو چل پڑے۔ آتے وقت ماں نے ریل کے کرایہ وغیرہ کے علاوہ پانچ روپے دیے جو اس زمانے میں اچھی خاصی رقم تھی۔ لاہور آکر وہ اپنے بعض رفقا کے ساتھ بھاٹی دروازے گئے اور ان کو مٹھائی اور گوشت کھلایا۔ اس پر ان کا ڈیڑھ روپیہ خرچ ہوا۔ اب ساڑھے تین روپے ان کے پاس تھے۔ جن ساتھیوں نے مٹھائی اور گوشت کھایا اور پھر ساڑھے تین روپے بھی ان کے پاس دیکھے، وہ سخت حیران تھے کہ اتنی بڑی رقم ان کے پاس کہاں سے آئی۔ ساتھیوں میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا اور شبہ کیا گیا کہ اس شخص نے پولیس سے تعلق پیدا کر لیا ہے اور اسی نے اتنی بڑی رقم اس کو دی ہے، اب یہ ہمارے کام کا نہیں رہا۔ یہاں رہا تو پولیس کو ہماری ڈائری پہنچایا کرے گا اور ہمیں گرفتار کرائے گا۔

یہ مسئلہ سب کے لیے ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ سحر گل خاں کے لیے بھی اور ان کے ساتھیوں کے لیے بھی۔ آخری بڑی مشکل سے ان کو اطمینان دلایا گیا اور گواہ پیش کیے گئے کہ یہ اپنے گاؤں گئے تھے اور گھر سے آسودہ حال ہیں اور یہ رقم ان کو والدہ نے دی تھی۔

سحر گل خاں نے انقلابیوں کے بارے میں بعض تعجب انگیز اور لرزہ خیز انکشافات کیے۔ انھوں نے بتایا کہ جو شخص ان سے منسلک ہو جاتا تھا، وہ گھر بار، بیوی، بچوں اور رشتے داروں کو بالکل بھول جاتا تھا، اور ان کی زندگی اور موت کی اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ بعض انقلابیوں نے خود ہی بیوی بچوں کو مار ڈالا تاکہ ان کی سرگرمیوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے اور وہ ہر طرف سے بے فکر ہو کر اپنی جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

اس کی ایک مثال دیتے ہوئے انھوں نے ضلع جالندھر کے ایک ہندو انقلابی کا انتہائی الم انگیز اور حیرت ناک واقعہ سنایا۔ انھوں نے بتایا کہ جب وہ گھر سے لاہور آیا اور انقلابیوں سے ملا تو گھر میں تین افراد کو چھوڑ کر آیا تھا۔ بوڑھی ماں، جوان بیوی اور سات آٹھ سال کی بیٹی۔ اس نے اپنے گھر اور گاؤں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ لاہور کے ایک علاقہ گوالمنڈی میں رہتا ہے اور وہاں تھوڑا بہت کام کاج کرتا ہے۔

پانچ سال کے بعد وہ گاؤں گیا تو ماں سخت بیماری کی حالت میں بے ہوش پڑی تھی۔ بیٹے نے اس کو بلانے اور پرنام کرنے کی کوشش کی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ بیٹے کے سر پر کانپتا ہوا پیار سے ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے دن وہ مر گئی۔ بیٹے نے اِدھر اُدھر سے کچھ ادھار پیسے لیے اور ضروری مذہبی رسوم ادا کیں۔ تیسرے دن بیوی نے کہا، ساس جو ہماری نگہبان تھی، وفات پا گئی ہے۔ بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ ہمارا ماں بیٹی کا تنہا رہنا مناسب نہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ لاہور لے چلو، تھوڑا بہت جو کماؤ گے اس سے گزر اوقات ہوتی جائے گی۔ شوہر نے بیوی کی بات غور سے سنی اور کہا: ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ تین دن مزید انتظار کرو، پھر یہاں سے چلے جائیں گے۔''

Marfat.com

دو دن میں اس نے مکان بیچا اور گھر کا سامان فروخت کیا۔ ماں کی موت پر جن لوگوں سے ادھار روپے لیے تھے، کچھ ان کو دیے اور کچھ جیب میں ڈالے اور تیسرے دن سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے بیوی اور بیٹی سے کہا:

''چلو تیار ہو جاؤ۔''

بیوی نے کہا: ''کل چلیں گے، اب شام ہو رہی ہے، رات کہاں رہیں گے؟''

بولا: ''دن کو یہاں سے نکلنا مناسب نہیں، ابھی چلنا چاہیے۔''

دونوں کو لے کر دریائے بیاس کے کنارے آیا۔ اب رات کی تاریکی چھا چکی تھی۔ بیوی نے کہا: ''یہاں نہ کوئی سڑک ہے، نہ موٹر، نہ تانگہ، نہ راستہ، نہ گاؤں، نہ ریلوے سٹیشن، کہاں لے آئے ہو؟''

کہا: ''یہی جگہ ٹھیک رہے گی۔''

ان کو ایک پتھر پر بٹھایا، پانی پلایا اور چند منٹ بعد ''ڈب'' سے پستول نکالا۔ ایک گولی بیوی کے اور ایک بیٹی کے سینے میں پیوست کر دی اور لاشیں دریا میں پھینک دیں۔ پستول بھی گہرے پانی میں پھینک دیا۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ جب دیکھا کہ لاشیں دریا کی تیز لہروں سے ہم آغوش ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں تو منہ ہاتھ دھویا اور پانی پیا۔ پھر ایک قریبی گاؤں میں جا کر رات بسر کی۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ دوسرے دن لاہور آ کر اس نے بچی ہوئی رقم ساتھیوں کے سامنے ڈھیر کر دی اور یہ تمام واقعہ بیان کیا۔ ساتھیوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا تو اس نے بتایا کہ میں بیوی اور بیٹی کی لاشوں کو دریا کی لہروں کے سپرد کرتے ہوئے رات کے سناٹے کی اندھیری فضا میں انگریزی حکومت کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''لو اب میری یہ آخری پریشانی بھی ختم ہوئی، اب پورے اطمینان سے آزادی کی جنگ لڑوں گا اور ملک میں انقلاب لانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔''

بھگت سنگھ سے سحر گل خاں کا گہرا رابطہ تھا۔ اس کا تعلق بھی ضلع فیصل آباد کی تحصیل جڑاں والا سے تھا۔ بھگت سنگھ کے والد کا نام کشن سنگھ اور دادا کا ارجن سنگھ تھا۔ اس خاندان کا تعلق دراصل ضلع جالندھر کی تحصیل نواں شہر کے ایک گاؤں کھٹکر کلاں سے تھا جو کسی زمانے میں آبادکار کی حیثیت سے تحصیل جڑاں والا میں آبسا تھا۔ جس گاؤں میں یہ لوگ آباد ہوئے، اس کا نام چک نمبر ۱۰۵ گ ب بنگے ہے جو فیصل آباد روڈ پر جڑاں والا سے تقریباً دس میل آگے ''سائیں دی کھوئی'' سے بائیں جانب کچھ فاصلے پر واقع ہے۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ بھگت سنگھ جڑاں والا کے اردگرد کے دیہات اور کھیتوں میں اکثر گھومتا رہتا تھا اور جڑاں والا کی مقامی پولیس اسے گرفتار نہیں کرتی تھی حالاں کہ ضلعی انتظامیہ نے اس کے وارنٹ گرفتاری

Marfat.com

جاری کر رکھے تھے۔ مقامی پولیس کو عام طور پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کی کیا سرگرمیاں ہیں، لیکن اس کے باوجود پولیس کے دیسی اہل کار اسے گرفتار کرنے سے گریز کرتے تھے۔ وہ اگر کہیں بیٹھا ہوتا اور کوئی مرد یا عورت یا بچے کھیتوں میں کام کرنے والوں کے لیے روٹی اور لسی پانی وغیرہ لے جاتے ہوئے اس کے قریب سے گزرتے تو وہ بے تکلفی سے روٹی پانی ان سے مانگ کر کھا پی لیتا۔ اس بات کی کوئی پروا نہ کرتا کہ جس سے وہ روٹی یا پانی مانگ رہا ہے، وہ مسلمان ہے یا سکھ یا کسی اور مذہب کا فرد!

بھگت سنگھ کی گرفتاری کے سلسلے میں ایک حیران کن بات سحر گل خاں نے بھی بتائی اور بعض اور لوگوں نے بھی سنائی۔ وہ یہ کہ جڑاں والا کے قریب چک نمبر ۱۱۹ گ ب کے ایک سکھ نمبردار (یا ذیلدار) نے لائل پور کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے شکایت کی کہ بھگت سنگھ یہیں گھومتا پھرتا ہے اور مقامی پولیس کو اس کا علم ہے، مگر وہ اس کو پکڑنے سے گریز کرتی ہے۔ اگر پولیس کو واقعۃً اس کا علم نہیں ہے تو میں اس کو گرفتار کرا سکتا ہوں۔ چناں چہ اس نے بھگت سنگھ کی مخبری کی اور ضلعے کی انتظامیہ سے مل کر اسے گرفتار کرا دیا۔ اس پر تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ اس سکھ مخبر کو کوڑھ کی موذی بیماری لاحق ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا ایک لڑکا بھی کوڑھی ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ تمام گھرانا اس ہولناک مرض کی لپیٹ میں آگیا۔ قیام پاکستان کے زمانے میں جب یہ لوگ یہاں سے ہندوستان گئے تو ان کا خاندان ''کوڑھیاں داٹبر'' (یعنی کوڑھیوں کا خاندان) مشہور تھا اور ان کی دوسری پشت کوڑھ میں مبتلا تھی...... خدا جانے یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے، لیکن میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے۔

سحر گل خاں نے بتایا کہ ۱۳۔ اپریل ۱۹۳۱ء کو جب بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی، میں اس زمانے میں سنٹرل جیل لاہور میں قید تھا۔ بقول ان کے آزادی سے قبل یہ معمول رہا کہ بھگت سنگھ کی پھانسی تاریخ (۱۳۔ اپریل) کو ہر سال بہت سے لوگ اس کے گاؤں چک نمبر ۱۰۵ گ ب بنگے میں جمع ہوتے اور اس کی برسی مناتے تھے۔ مختلف حضرات اس موقعے پر تقریریں کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ بھگت سنگھ کی آخری برسی ۱۳۔ اپریل ۱۹۴۸ء کو منائی گئی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔

سحر گل نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ میرے مکان پر بھگت سنگھ اور اس کے بعض ساتھی انگریزی حکومت سے چھپ چھپا کر آتے تھے۔ میری چھوٹی سی بیٹھک میں ہماری مجلس جمتی تھی اور کئی قسم کے مشورے ہوتے تھے۔ بعض دفعہ کئی کئی دن یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ خاں صاحب نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کم و بیش پندرہ سال پنجاب کی مختلف جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ ان کی قید کا زیادہ عرصہ جو تقریباً دس سال پر محیط ہے، سنٹرل جیل لاہور میں گزرا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے جیل کو اپنا مستقل گھر قرار دے لیا تھا اور کئی قسم کی سبزیاں اپنی بارکوں کے اردگرد کاشت کرلی تھیں۔ باقاعدہ کیاریاں بنا کر انھیں سیراب

Marfat.com

کیا جاتا تھا پھر مختلف اقسام کے پھولوں کے بیج منگوا کر خوب صورت پھولوں کے پودے لگا لیے جاتے تھے۔

سحر گل خاں سے میں نے دوران گفتگو پوچھا کہ انگریز کے زمانے میں پولیس والے آپ لوگوں کا بہت تعاقب کرتے ہوں گے اور ایک ایک انقلابی کی ٹوہ لگانے میں کئی کئی پولیس والے مقرر ہوں گے۔ کہیں خفیہ پولیس ہوگی، کہیں باوردی پولیس اور کہیں پولیس کے ٹاؤٹ......! اب تو ملک آزاد ہو چکا ہے اور حکومت اپنی ہے۔ اب تو پولیس والے آپ کا پیچھا نہیں کرتے ہوں گے بلکہ آپ نے ملک کی آزادی کے لیے جو بے پناہ قربانیاں دی ہیں، اس کی وجہ سے پولیس والے اور دیگر اہل کار آپ کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں گے۔

انھوں نے جواب دیا: یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں، یہ البتہ حقیقت ہے کہ خفیہ پولیس والے باقاعدہ میرا اتا پتا رکھتے ہیں کہ اس کی سرگرمیاں کیا ہیں، یہ کہاں جاتا ہے اور کون کون لوگ اس کے پاس آتے ہیں اور کیوں آتے ہیں۔ حالاں کہ اب نہ میرا سیاست سے کوئی تعلق ہے اور نہ میں سیاسی لوگوں سے میل جول رکھتا ہو۔ محض ایک کاشت کار کی زندگی بسر کرتا ہوں۔

سحر گل خاں نے اپنی زمین میں بیلنا لگا رکھا تھا اور وہ گڑ بنا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا: ''خاں صاحب! آپ اپنے کماد سے گڑ بنا رہے ہیں، جب کہ جڑاں والا میں شوگر مل قائم ہے اور مل کے قرب وجوار کے چند میل کے علاقے میں جس میں آپ کا گاؤں بھی شامل ہے، گڑ بنانا ممنوع ہے۔ قانون کی رو سے آپ کو کماد شوگر مل میں بھیجنا چاہیے۔ کیا آپ کو بیلنا لگانے اور گڑ بنانے سے روکا نہیں گیا؟''

اس سوال پر وہ ہنسے اور جواب دیا: ''متعلقہ محکمے کے اہل کار کئی دفعہ میرے پاس آئے اور مجھے گڑ نہ بنانے اور کماد شوگر مل میں بھیجنے کے لیے کہا، مگر میں نہیں مانا۔ میں نے ہر دفعہ ان سے یہی کہا کہ زمین میری ہے، کماد میں نے لگایا ہے، اس کا مالیہ، آبیانہ میں ادا کرتا ہوں، کماد میرا ہے، اس میں کھاد میں ڈالتا ہوں، پانی میں دیتا ہوں، زمین میں کام کرنے والوں کو معاوضہ میں ادا کرتا ہوں۔ میں اس کو جس طرح جی چاہے استعمال میں لاؤں۔ کوئی شخص میرے کام میں دخل دینے کا مجاز نہیں۔ میں کسی مل کو کماد نہیں دوں گا، خود گڑ بناؤں گا اگر میری یہ بات ناجائز اور ملکی قانون کے خلاف ہے تو مجھ پر مقدمہ قائم کر کے مجھے عدالت میں لے جاؤ۔''

خاں صاحب نے کہا: ''اب انھوں نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور میں گڑ بنا رہا ہوں۔''

پھر ہنستے ہوئے کہا: ''آپ بھی اگر چاہیں تو تازہ گڑ لے جا سکتے ہیں، آپ کو مفت میں دیا جائے گا۔''

اس وقت غالباً ان کے دو بیٹے کھیتوں میں کام کر رہے تھے، میں نے پوچھا: ''آپ نے اپنے بیٹوں کو کہاں تک تعلیم دلائی ہے؟ ان میں سے کوئی سرکاری ملازم بھی ہے؟''

ایک بیٹے کی طرف اشارہ کر کے کہا: ''یہ میرا بڑا بیٹا ہے، اس نے ایف اے پاس کیا تھا کہ میں نے

Marfat.com

اسے آگے پڑھنے سے روک دیا۔ میں اپنی زندگی میں اپنی اولاد میں سے کسی کو سرکاری ملازمت نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے ان کو کھیتی باڑی پر لگا رکھا ہے اور میرے نزدیک ہمارے لیے یہی اصلی کام ہے۔''

ہم تقریباً گیارہ بجے ان کے پاس پہنچے تھے، دو گھنٹے وہاں رہے۔ ایک بجے یہ کہہ کر واپس آ گئے کہ کبھی پھر ملاقات ہوگی لیکن میری ان سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

واپس آکر میں نے جڑاں والا میں بعض حضرات کو بتایا کہ میں سحر گل خاں سے مل کر آیا ہوں جو کسی زمانے میں برصغیر کے انقلابیوں کے ساتھ رہے ہیں اور جنھوں نے زندگی کا طویل عرصہ جیل میں گزارا ہے، لیکن اس سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک دو نے صرف یہ کہا: ''ہاں ایک شخص سحر گل خاں چک نمبر ۲۴۸ میں رہتا ہے۔''

بعض نے ان پر تنقید کرنا شروع کر دی اور ان کی سیاست کو بیچ میں لے آئے۔ حالاں کہ سیاسیات میں نقد و جرح کی کوئی بات نہیں ہوتی۔

سیاسی جماعتوں اور طبقوں کے بارے میں گفتگو کرتے وقت یہ حقیقت ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ آزادی کی روشنی کسی ایک ہی دروازے سے صحنِ ملک میں داخل نہیں ہوتی۔ مختلف دروازوں سے داخل ہوتی ہے۔ اکثر اوقات جن جماعتوں کی ساخت ایک دوسرے سے متضاد کیفیات کی مظہر ہوتی ہے، وہ بھی حصولِ آزادی کے میدان میں ہم قدم ہو کر چلتی ہیں۔ حصولِ آزادی کا ایک طویل سفر اور طویل پس منظر ہوتا ہے، جو اپنے اندر ایک خاص تسلسل رکھتا ہے۔ جس جماعت اور جس گروہ نے کسی انداز سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کی ہو، اسے مستحق مبارک باد قرار دینا چاہیے، انھی سرفروشوں کی سرگرمیوں اور کوششوں سے آزادی کی شمع روشن ہوتی اور ملک کے وسیع و عریض آنگن کو منور کرتی ہے۔

برصغیر کے انقلابیوں کے متعلق دو لفظوں میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان کا تعلق کسی معروف سیاسی جماعت سے نہ تھا۔ ان کا سب سے الگ طرزِ عمل اور الگ طریق کار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان کا معاملہ تو خیر بالکل ہی دوسرا تھا، ہندوستان میں بھی ان کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور ان کی بے پناہ قربانیوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ پھر خود ان کا نقطہ نظر بھی وہاں کے حکمرانوں سے ہم آہنگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی جو ذہنی کیفیت آزادی سے پہلے تھی، قریب قریب وہی بعد میں رہی۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا، بات ہو رہی تھی سحر گل خاں کی......! جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ۲ء۱۹۷ کی جنوری کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ تو شاید مجھے بھول گئے ہوں گے، لیکن میرے دل میں وہ اور ان کی باتیں محفوظ رہیں۔ ان کے بیٹوں سے اس وقت بطور تعارف علیک سلیک نہیں ہو سکی تھی۔ ظاہر ہے وہ بھی مجھے نہیں جانتے ہوں گے۔ پھر وہ ہمارے پاس آئے بھی نہیں تھے۔ ہم سے قدرے دور اپنے کام میں مصروف رہے۔

Marfat.com

اس واقعہ سے پانچ سال بعد ۱۹۷۷ء میں، میں نے جڑاں والا کی غلہ منڈی میں کسی جگہ ایک چھوٹا سا اشتہار چسپاں دیکھا جس پر سحر گل خاں کی تصویر تھی اور لکھا تھا کہ یہ صوبائی آسمبلی کا انتخاب لڑ رہے ہیں اور عوام کے ووٹ کے حق دار ہیں۔ بائیسکل ان کا انتخابی نشان تھا۔

۱۹۷۹ء کو انھوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس سے ایک سال بعد ۲۰۔ ستمبر ۱۹۸۰ء کو ۷۶ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کی خبر معلوم نہیں کسی اخبار میں چھپی یا نہیں چھپی، اگر چھپی ہے تو میری نظر سے بہرحال نہیں گزری۔

سحر گل خاں ایک عرصے سے اپنے چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھے گم نامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مرنے کے بعد بھی گم نام رہے۔ ان کے بارے میں یہ چند سطور پہلی مرتبہ معرض اشاعت میں آ رہی ہیں اور وہ بھی ایک غیر سیاسی اور گوشہ گیر شخص کے قلم سے......!

اپنے دور کے انقلابیوں کے کارواں کا یہ آخری مسافر تھا جس نے اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی اور آسودۂ لحد ہوا......!

سحر گل خاں! تو نے ملک کی آزادی کے لیے مصیبتیں جھیلیں اور قیدیں کاٹیں۔ تیرا اس میں کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔ تو ملک کے کروڑوں انسانوں کو غیروں کی غلامی سے نجات دلانے کا خواہاں تھا اور اس میں کامیاب ہوا۔ بارگاہ الٰہی میں ہماری عاجزانہ دعا ہے کہ

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

☆☆..........☆☆..........☆☆

Marfat.com

مولوی شمس الدین

۱۹۶۰ء میں مسجد مبارک (لاہور) کی خطابت کا فریضہ حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ حنیف انجام دیتے تھے اور میں بالعموم وہیں نماز جمعہ ادا کرتا تھا۔ اسی سال کی سردیوں کے دن تھے ایک مرتبہ جمعے کے بعد ہم دونوں مسجد مبارک سے چلے اور لوہاری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے نیچے مولوی شمس الدین کی دکان پر پہنچے۔ وہ نہایت احترام سے پیش آئے اور بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔

اس وقت حافظ ریاض احمد اشرفی بھی وہاں موجود تھے جو چینیاں والی مسجد کے قریب کہیں سکونت پذیر تھے اور راولپنڈی کے روزنامہ جسنگ میں کام کرتے تھے۔ تیز فکر، خوب رو اور ذہین آدمی تھے۔ اللہ بخشے جوانی کے عالم میں وفات پا گئے تھے۔ عام طور پر وہ جمعرات کی شام کو لاہور آجاتے تھے، جمعے کے بعد مولوی شمس الدین کی دکان پر حاضری دیتے اور شام تک وہاں بیٹھتے۔

مولوی شمس الدین کون تھے؟

آیئے آپ کو ان سے ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جسم کی ساخت بالکل متناسب، نہ فربہی کا شائبہ نہ کمزوری کے آثار۔ کشیدہ قامت، کشادہ پیشانی، کھلا ہاتھ، دل کے سخی، زبان کے نرم، دوستوں کے ہمدرد، ملنے والوں کے خیر خواہ، چمکدار آنکھوں پر نظر کی عینک، گندمی سا رنگ، ہنس مکھ، چھوٹی چھوٹی داڑھی، شلوار قمیص میں ملبوس اور سردیوں میں اس پر شیروانی کا اضافہ!

ان کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ پونچھ کی تحصیل حویلی کے ایک گاؤں روڑی میں ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ والدین چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ رشتے داروں نے جائداد ہتھیانے کے لیے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کسی ذریعے سے اس منصوبے کا انھیں پتا چلا تو گاؤں سے بھاگے اور وزیر آباد آ گئے۔ وہاں میاں شیر محمد شرق پوری کے ایک ارادت مند شاہ قمر الدین رہتے تھے اور ان کا درس و تدریس کا محدود سا سلسلہ جاری تھا، اس میں شامل ہو گئے۔ کچھ مدت وہاں رہے۔ الفاظ و حروف کی دنیا سے تھوڑی سی شناسائی ہوئی تو لاہور کا عزم کیا۔ یہاں کچھ عرصہ محنت مزدوری کرتے رہے، بعد ازاں مسجد مائی موراں میں آ گئے۔ یہ مسجد کسی زمانے میں ''موراں'' نامی ایک خاتون کی کوشش سے بنی تھی۔ شاہ عالم دروازہ اور لوہاری دروازے کے درمیان ایک بازار ''نواں بازار'' کے نام سے موسوم ہے، اس سے گزر کر پاپڑ منڈی میں داخل ہوں اور وہاں سے دائیں ہاتھ شاہ عالم

Marfat.com

بازار کی طرف گھومیں تو یہ مسجد بائیں جانب دکھائی دے گی۔ مولوی شمس الدین کئی سال اس مسجد میں خادم اور امام کی حیثیت سے رہے اس دور میں وہاں ایک بزرگ خلیفہ نصیر الدین اقامت فرماتے تھے جو طلبا کو عربی اور فارسی کی کتابیں پڑھاتے تھے۔ مولوی شمس الدین نے بھی ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ وہ زیادہ علم تو حاصل نہ کر سکے لیکن اس کے شوق میں کافی آگے بڑھ گئے۔ کتابوں سے بھی تعلق پیدا ہو گیا اور کچھ کتابیں محنت مزدوری کر کے خرید بھی لیں۔ اس اثنا میں مطالعے کی حدود بھی کچھ بڑھ گئیں اور اہل علم سے روابط بھی قائم ہو گئے۔ ان دنوں چوہدری محمد حسین سے ان کے مراسم پیدا ہو گئے تھے جو علامہ اقبال کے دوست تھے اور حکومت پنجاب کے محکمہ اطلاعات سے تعلق رکھتے تھے۔ چوہدری صاحب نے دیکھا کہ ان کو کتابوں سے اتنی محبت ہے تو یہی کاروبار کرنے کا مشورہ دیا۔ اس وقت یہ مسجد موراں ہی میں اقامت گزیں تھے۔ مسجد اوپر ہے اور نیچے اس کا ایک کمرہ ہے جسے حجرہ کہنا چاہیے۔ مولوی صاحب نے حجرے میں کتابیں رکھیں اور ان کی خرید وفروخت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا انھیں مدرسی علم تو زیادہ نہ تھا، لیکن کتابوں کے بارے میں بہت معلومات رکھتے تھے۔ نئی، پرانی اور نایاب کتابوں کے وہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ پھر مختلف موضوعات کی قلمی کتابوں سے متعلق ان کو حیران کن طور پر آگاہی حاصل تھی۔ جب وہ کتابوں کے نام لیتے اور خاص تسلسل کے ساتھ ان کے سن کتابت وطباعت اور مصنفین کا ذکر کرتے تو تعجب ہوتا کہ ان بے پناہ معلومات تک انھیں کیوں کر رسائی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر کوئی غیبی طاقت چھپی بیٹھی ہے جو یہ باتیں ان کے ذہن میں ڈال رہی ہے اور وہ ان باتوں کو زبان کے ذریعے لوگوں تک پہنچا رہے ہیں۔

چوہدری بشیر احمد خاں صاحب نے بتایا کہ قلمی کتابوں کے بارے میں ان کی معلومات اور رسائی فہم کا یہ عالم تھا کہ کتاب دیکھتے ہی بتا دیتے تھے کہ کاغذ کس قسم کا ہے، کس دور کا ہے، کتابت کس عہد کی ہے اور کاتب کس علاقے کا رہنے والا ہے۔

وہ سستا اور صاف ستھرا زمانہ تھا۔ لوگوں کے ضمیر زندہ تھے اور وہ ایک دوسرے سے محبت اور الفت کا برتاؤ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جونہی کسی کے چہرے پر غربت وناداری کی جھلک دکھائی دی، اس کی امداد کو اپنا فرض قرار دے لیا۔ مولوی شمس الدین کے ساتھ بھی یہی ہوا، کئی بزرگوں نے ان کی طرف امداد کا ہاتھ بڑھایا اور ان کی دل افسردگی اور چہرے کی پژمردگی دور کرنے کی کوشش کی۔ بعض دفعہ تنہائی کی ملاقات میں وہ اپنے ماضی کی طرف اشارہ کرتے اور عہد گزشتہ کی کوئی تہہ کھولتے تو تعجب ہوتا کہ یہ شخص کن کن الم ناکیوں کے سیلاب سے گزر کر ساحل مراد تک پہنچا ہے۔

اگر آئینہ قلب صاف اور نیت زنگ آلود نہ ہو چکی ہو تو قدم خود بخود کامرانی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور مستقبل کی راہ بہت جلد متعین ہو جاتی ہے۔ مولوی شمس الدین نے خلوص کی دولت کے سہارے اللہ کا نام لے

Marfat.com

کر محدود پیمانے پر کام شروع کیا اور بہت جلد شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ وہ قول کے سچے اور کردار کے سچے تھے۔ ایسا تو ہوا کہ خود دھوکے میں آ گئے مگر دوسرے کو کبھی دھوکے میں نہیں لائے۔ یہ ان کے خلوص کی علامت اور سچائی کی دلیل تھی۔

ان کی دکان کی رونق میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ دوپہر کو تین بجے کے بعد تو کہنا چاہیے کہ میلا بھر جاتا تھا، لیکن آنے جانے والے اکثر لوگوں میں کوئی گاہک اور کتابوں کا خریدار نہیں ہوتا تھا۔ بعض لوگ وقت گزارنے کے لیے دکان پر آتے اور مختلف مسائل پر بحث کر کے گھر کی راہ لیتے۔ لوگوں کی آمد کے وقت مولوی شمس الدین دکان کے دروازے پر بیٹھ جاتے اور سگریٹ سے دل بہلانے لگتے۔ وہ کیپٹن کا سگریٹ پیتے تھے۔ سگریٹ کی ڈبیہ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر ڈبیہ سمیت ماچس کے اس میز پر رکھ دی، جس کے اردگرد کرسیوں پر مہمانان گرامی تشریف فرما ہیں تاکہ ان حضرات میں سے جو صاحب سگریٹ کے شوقین ہیں، وہ نوش فرمالیں۔ ساتھ ساتھ چائے کا دور بھی چلتا رہتا۔ وہ خود دکان کی دہلیز سے ذرا آگے سڑک کی طرف رخ کر کے ''اکڑوں'' بیٹھ جاتے اور سگریٹ کے کش لگاتے رہتے۔ یعنی تلووں کے بل اس طرح زمین پر بیٹھتے کہ گھٹنے پیٹ سے ملے رہتے اور پنڈلیاں رانوں سے متصل رہتیں۔ پنجابی میں بیٹھنے کی اس کیفیت کو ''پیراں بھار بیٹھنا'' کہا جاتا ہے۔

سرکلر روڈ کی طرف سے مسلم مسجد کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے بائیں جانب ایک دکان چھوڑ کر دوسری دکان ان کی تھی۔ اس کے سامنے سڑک کی دوسری جانب ''کشمیرٹی سٹال'' تھا جس کی چائے کی بڑی شہرت تھی۔ عام چائے خانوں کی نسبت کشمیرٹی سٹال والے پیالی کے کچھ زیادہ پیسے وصول کرتے تھے۔ مثلاً جب عام چائے خانوں سے دو آنے کی پیالی ملتی تھی، کشمیرٹی سٹال والے ڈھائی آنے کی دیتے تھے۔ مولوی صاحب کی دکان پر وہاں سے چائے مسلسل آتی رہتی تھی۔ ایک سیٹ، دو سیٹ، آدھا سیٹ۔ یہ سلسلہ صبح سے شام تک جاری رہتا تھا۔

مولوی صاحب کی دکان پر ہر قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ کوئی کسی کتاب کی بات کر رہا ہے۔ کسی نے سیاست پر بحث چھیڑ دی ہے۔ کوئی کسی اہل علم کی تنقیص کر رہا ہے۔ کوئی صاحب کسی کتاب پر تنقید فرما رہے ہیں اور کسی نے کسی کی تعریف شروع کر دی ہے، پھر جو اس کا ناقد ہے درمیان میں بول پڑا ہے اور نوبت گرما گرمی تک پہنچ گئی ہے۔ مولوی صاحب کسی سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ ان کی ڈیوٹی ان کے لیے چائے منگوانا اور پیالیوں میں ڈال کر نہایت احترام کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔ اور شام کے بعد چائے کا حساب کر کے بل ادا کرنا ان کا فریضہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ان کی دکان کیا تھی، ہر موضوع پر گفتگو کرنے والوں کا اڈا تھا۔ جس طرح جنرل سٹور پر ہر قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں اسی طرح ان کی دکان وہ جنرل سٹور تھا جہاں ہر قسم کی باتیں

Marfat.com

کہی اور سنی جاتی تھیں۔ کتابوں سے دلچسپی رکھنے والے نہ صرف لاہور یا پاکستان کے لوگ ان سے متعارف تھے بلکہ ہندوستان کے لوگ بھی ان کے نام سے باخبر تھے اور اس باب میں ان کی فراوانی معلومات کا انھیں علم تھا، بلکہ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے بعض مستشرق بھی لاہور آتے تو لوگوں کے بتانے پر ان کی دکان پر حاضری دیتے تھے۔

پورے برصغیر میں کتابوں کی شاید دو تین دکانیں ہی ہوں گی جہاں پڑھے لکھے مقامی اور غیر مقامی لوگ روزانہ بالالتزام اتنی تعداد میں آتے تھے۔ ایک دکان دہلی میں تھی جو حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے بیٹے مولوی سمیع اللہ کی تھی، وہاں بھی بہت لوگ آتے تھے۔

ان سطور کا راقم پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۴۲ء میں دہلی گیا تھا، تقریباً دو مہینے وہاں رہا۔ پھر آگرے چلا گیا اور متھرا، فتح پور سیکری، کان پور، میرٹھ وغیرہ شہروں میں گھومتا رہا۔ اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی عمر ہوگی۔ بعدازاں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند کی دعوت پر حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے ساتھ دہلی گیا اور سات آٹھ دن وہاں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس اثنا میں مولانا مرحوم کتابوں کی بہت سی دکانوں پر گئے۔ میں ان کے ساتھ ہی جاتا تھا۔ ایک دن ہم نے جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد ایک دکان پر گئے۔ دکان پر جو بڑا سا بورڈ نصب تھا، اس پر لکھا تھا ”کتب خانہ عزیزیہ“ دکان کے مالک نے مولانا عطاء اللہ صاحب کو دیکھا تو تعجب سے کہا! ارے مولوی عطاء اللہ آپ کہاں؟ پھر خود ہی جواب دیا: جمعیت کی میٹنگ میں آئے ہوں گے!

چھ سات آدمی وہاں بیٹھے تھے، ان سے تعارف کرایا: یہ ہیں مولوی عطاء اللہ حنیف، پنجاب کے رہنے والے، کئی سال یہاں طالب علم کی حیثیت سے رہے ہیں۔ ہم سے کتابیں خریدا کرتے تھے۔

بعد میں مولانا صاحب نے بتایا کہ یہ مولوی سمیع اللہ ہیں۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے فرزند گرامی! پھر ایک اور دکان پر گئے۔ وہ غالباً انجمن ترقی اردو والوں کی تھی۔ وہ بھی مولانا سے اچھی طرح ملے۔ وہاں بھی چند آدمی بیٹھے تھے۔

اس کے بعد میں جون ۱۹۴۷ء میں دہلی گیا۔ کتب خانہ عزیزیہ کے سامنے سے گزرا۔ اس وقت بھی لوگ وہاں بیٹھے تھے۔ آخری مرتبہ اگست ۱۹۴۷ء میں دہلی جانا ہوا، لیکن ان دنوں ادھر نہیں جا سکا۔ صرف تین دن وہاں رہا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ پورے برصغیر پاک و ہند میں دو تین کتب فروش ہی تھے جن کے ہاں پڑھے لکھے لوگ کثرت سے آتے اور بیٹھتے تھے، جن میں ایک لاہور کے مولوی شمس الدین تھے اور میرا خیال ہے کہ اس نہایت مختصر فہرست میں اول نمبر انہی کا تھا۔

وہ وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ بے حد منکسر اور نرم طبع۔ جو شخص ان کی دکان پر پہنچا اور ان سے ملا، اس سے اس طرح اپنائیت کا اظہار کیا کہ ان کے اصلی مراسم اسی سے ہیں اور اسی کے انتظار میں بیٹھے ہیں

Marfat.com

کہ وہ آئے تو اس سے دل کی باتیں کریں۔

ان کی دکان پر آنے والے تمام حضرات کے اسمائے گرامی کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، بس یہ سمجھ لیجیے کہ لاہور اور بیرون لاہور کا ہر وہ شخص جو علم سے کچھ علاقہ رکھتا اور کتابوں میں دلچسپی لیتا تھا، ان کی دکان کا ضرور چکر لگاتا۔ ان حضرات میں سے بہت سے نام اس وقت ذہن میں ہیں، اور یہ وہ نام ہیں، جن کی معلومات اور علم وادراک کا خاص شہرہ تھا اور جو اچھے خاصے کتب خانوں کے مالک تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مختلف شعبوں کے سربراہ تھے۔ وہ بھی تھے جو عربی ودینی مدارس کے مدرس، صدر مدرس اور مہتم تھے۔ ان کے علاوہ تصنیفی وتحقیقی اداروں کے محققین وناظمین کی آمدورفت کا سلسلہ بھی وہاں جاری رہتا تھا۔ مساجد کے خطیب اور عام واعظین ومقررین بھی اپنے ذوق ومطلب کی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کے لیے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ اخبار نویس اور مقالہ نگار بھی ان کے دروازے پر حاضری دیتے تھے۔ اگر ان سب بزرگوں کے نام لکھنا شروع کر دیں تو کئی صفحے ناموں ہی سے بھر جائیں۔ بس مختصر الفاظ میں یوں کہیے کہ

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

مولوی شمس الدین کے پاس میرے خیال میں زیادہ آمدورفت رکھنے والوں میں ایک چوہدری بشیر احمد خاں تھے۔ چوہدری صاحب ممدوح کو تقریباً ان تمام لوگوں کا علم ہے جو ان کی دکان پر تشریف لاتے اور محو گفتگو ہوتے تھے۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ کن بزرگوں کا کام محض باتیں کرنا تھا، کن کا فریضہ فقط کتابیں دیکھنے تک محدود تھا اور کون حضرات کتابیں خریدتے تھے۔ پھر کس کا ادھار کھاتا تھا اور کون نقد پیسے دیتے تھے۔ کن لوگوں کے مولوی صاحب مقروض تھے اور کن سے کچھ لینا تھا۔ چوہدری صاحب ان کے رازدان بھی تھے اور رازدار بھی!

اس طویل وعریض فہرست کے اکثر بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ بھی عمر کی آخری منزل کو پہنچ گئے ہیں اور موت کے انتظار میں ہیں۔ جی چاہتا ہے تھوڑے سے تعارف کے ساتھ ان میں سے چند بزرگوں کا ذکر کر دیا جائے تاکہ زمانہ حال کے لوگ دور ماضی کے ان اصحاب علم کی ایک جھلک دیکھ سکیں جو مولوی صاحب مرحوم کی دکان کی رونق کا باعث بنتے تھے۔

۱۔ مولانا عبدالعزیز میمن: عربی لغت وادب کے مایہ ناز فاضل، گورے چٹے اور طویل قامت۔ ادبیات عربی کی تمام کتابوں اور ان کے مصنفوں کے نام ان کے ذہن میں محفوظ۔ ادیب، انشا پرداز اور محقق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے سابق صدر۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو جمعے کے روز کراچی میں اچانک وفات پائی۔

۲۔ سید حسام الدین راشدی: خاندان سادات کے مشہور اہل علم، بہت بڑے کتب خانے کے مالک جو گوناگوں موضوعات کی کتابوں پر مشتمل تھا۔ کراچی کے رہنے والے، کراچی میں فوت ہوئے۔

Marfat.com

۳۔ مولانا عطاء اللہ حنیف: یوں تو انھیں ہر موضوع کی کتابوں سے دلچسپی تھی، لیکن تفسیر، حدیث اور فقہیات سے بالخصوص تعلق تھا، لاہور میں شیش محل روڈ پر بہت بڑا کتب خانہ ان کی یادگار ہے جو انھوں نے زندگی ہی میں استفادہ کرنے والوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سادہ مزاج، سادہ لباس اور نہایت متواضع۔ ۲۔اکتوبر ۱۹۸۷ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

۴۔ مولانا غلام رسول مہر: ممتاز صحافی، مشہور مصنف ومترجم۔ اپنے موضوع کی بہترین کتابیں جمع کیں، جن کا بہت بڑا حصہ لاہور عجائب گھر کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ۱۵ اور ۱۶۔ نومبر ۱۹۷۱ء کی درمیانی شب کو لاہور میں دفعۃً سفرِ آخرت اختیار کیا۔

۵۔ مولوی ظفر اقبال: یونیورسٹی اورینٹل کالج کے شعبہ عربی کے سابق پروفیسر۔ صاحب نظر عالم، عربی کے مخارج حروف کے ماہر، بات چیت میں نہایت محتاط، قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر گہری نگاہ رکھنے والے، اسلامیہ پارک لاہور میں وفات پائی۔

۶۔ شیخ محمد اکرام: سول سروس کے آدمی، برصغیر کی اسلامی تاریخ کے شناور، اردو انگریزی کی متعدد کتابوں کے مصنف، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر، کئی مرتبہ مجھے ساتھ لے کر مولوی صاحب کی دکان پر آئے اور کتابیں خریدیں۔ تاریخ وفات ۱۶۔ جنوری ۱۹۷۳ء۔

۷۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری: ۲۸۔ جولائی ۱۹۲۶ء کو آنولہ (ضلع بریلی، یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اپریل ۱۹۵۰ء میں ترک وطن کر کے کراچی آئے۔ دس کتابوں کے مصنف اور فارسی کی سات کتابوں کے مترجم۔ علاوہ ازیں مختلف جرائد ورسائل میں بہت سے مضامین ومقالات سپرد قلم کیے۔ ستاون برس چار مہینے عمر پا کر ۲۵۔ نومبر ۱۹۸۳ء کو تیز رفتار ویگن کی زد میں آکر راہیٔ ملک بقا ہوئے۔

۸۔ سید رئیس احمد جعفری: تصنیف وتالیف، ادب وصحافت اور تراجم وتلخیصات کا دائرہ اس قدر وسعت پذیر کہ خود بھی اس کی صحیح تعداد سے آگاہ نہ تھے۔ اس میدان میں بہت نام پایا اور بڑی شہرت کو پہنچے۔ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی شام کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے آناً فاناً دنیائے فانی سے منہ موڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے۔

۹۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی: مسجد شاہ چراغ کے خطیب بھی تھے اور پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے استاد بھی۔ پھر اسی شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور کئی سال اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ بہت ملنسار اہل علم تھے۔ لاہور میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

۱۰۔ سید ابوبکر غزنوی: خاندان غزنویہ کے لائق رکن اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے فرزند گرامی۔

Marfat.com

پہلے اسلامیہ کالج سول لائن میں عربی اور اسلامیات کے استاد تھے۔ بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی میں اسی شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ پھر اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینے لگے۔ اسلامی تبلیغی سلسلے میں ایک سرکاری وفد کے ساتھ لندن گئے۔ وہیں رات کے وقت سڑک پار کرتے ہوئے ۱۶۔اپریل ۱۹۷۶ء کو ایک موٹر کار کی زد میں آئے اور ہسپتال پہنچا دیے گئے۔ ۲۰۔اپریل کو میت لاہور لائی گئی اور اسی رات میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیے گئے۔

۱۱۔ مولانا محمد حنیف ندوی: دنیائے علم کی عظیم شخصیت، بہت سی اہم کتابوں کے مصنف۔ بیان وکلام کی روانی اور تحریر وانشا کی پختگی میں منفرد حیثیت کے حامل۔ اپنے مطلب وموضوع کی کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو مولوی شمس الدین کی دکان پر پہنچتے۔ ایسے موقعے پر یہ فقیر ان کے ہم رکاب ہوتا تھا۔ ۱۲۔جولائی ۱۹۸۷ء کو جنت کی راہ لی۔

۱۲۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی: نہایت نستعلیق عالم دین، کثیر العلم وکثیر المطالعہ، نفاست ونظافت کا حسین پیکر، بارہا خاکسار کو ساتھ لے کر مولوی صاحب مرحوم کی دکان پر تشریف لے گئے اور نئی کتابوں کے بارے میں پوچھا اور کتابیں خریدیں۔ ۱۶۔دسمبر ۱۹۶۳ء کو اس عالم فانی سے کوچ کیا اور عازم فردوس ہوئے۔

۱۳۔ شورش کاشمیری: بہت بڑے مقرر اور انشا پرداز۔ مولوی صاحب کی دکان کا رخ کرتے تو اپنے دبنگ لہجے سے سب شرکائے محفل کو اپنی طرف ملتفت کر لیتے۔

۱۴۔ علامہ حسین میر کاشمیری: وضع قطع میں انفرادیت نمایاں۔ طرز تخاطب میں سب سے منفرد۔ لوگوں کی جانچ پرکھ کے لیے انھوں نے اپنا ایک پیمانہ بنا رکھا تھا۔ کئی اخباروں میں کام کیا۔ خوب لکھا اور خوب پڑھا۔ ۱۶۔جنوری ۱۹۶۲ء کو وفات پائی۔

۱۵۔ حافظ محمد یوسف سدیدی: یہ اس بزم کے شرکائے نامدار کے جوزمرہ مرحومین میں داخل ہو چکے ہیں، بعض وجوہ سے بہت ہی اہم رکن تھے۔ میانے قد کے خوب صورت جوان۔ تیکھے نقش ونگار، گورے چہرے پر سیاہ داڑھی۔ کسی قدر لاغر اندام۔ متین اور کم گو۔ فن خطاطی میں مہارت کا یہ عالم کہ جہاں قلم رکھ دیا، گلستاں لہلہانے لگا۔ نسخ ونستعلیق دونوں پر ان کے نوک قلم کی حکمرانی تھی۔ جہاں تک ہم گناہ گاروں کی معلومات کا تعلق ہے، نیکی وتدین کی نعمت سے بھی بہرہ اندوز تھے اور حلم وانکسار کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ ان کے حصے میں آئی تھی، حضرت پیر سدید الدین (مرولہ، ضلع سرگودھا) کے حلقہ ارادت سے وابستہ تھے۔ اس لیے سدیدی کہلاتے تھے۔ علامہ اقبال کے مرقد پر جو عبارات مرقوم ہیں، وہ انہی کے رقم فرمودہ ہیں۔ اس کے لیے مولوی شمس الدین کی معرفت چوہدری محمد حسین نے ان سے بات کی اور انھوں نے نہایت مسرت کے ساتھ یہ خدمت سرانجام دی۔

۱۶۔ مولانا محمد اسحاق رحمانی: کئی سال مسجد چینیاں والی کے منصب خطابت پر فائز رہے۔ جی دار عالم دین

Marfat.com

تھے۔ بہت اچھے مقرر، دوستوں کے دوست اور ہر شخص کے بہی خواہ۔ کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے شائق۔ یہی چیز انھیں مولوی شمس الدین سے رابطہ رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

۱۷۔ احسان دانش: نامور شاعر دنیوی اعتبار سے پستی سے بلندیوں تک پہنچے اور بڑی عزت پائی۔ انارکلی میں رہائش تھی۔ مولوی صاحب مرحوم کی دکان پر ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔

۱۸۔ حفیظ جالندھری: شعروشاعری میں منفرد حیثیت کے مالک۔ پڑھتے تو سماں بندھ جاتا۔ پاکستان کا قومی ترانہ انہی کا لکھا ہوا ہے۔

۱۹۔ ڈاکٹر سید عبداللہ: عالم اور صاحب مطالعہ بزرگ۔ بہت سال اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے سربراہ رہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے جو ان کی نگرانی میں اختتام کو پہنچا۔ ۵۔اپریل ۱۹۰۶ء کو پیدا ہوئے اور ۱۴۔اگست ۱۹۸۶ء کو وفات پائی۔

۲۰۔ ممتاز حسن: بنیادی طور پر سول سروس سے تعلق تھا۔ اس شعبے میں بڑی ترقی پائی۔ علم وادب کی وادیوں میں ہمیشہ قدم زن رہے۔ مولوی صاحب کے ہاں آتے اور ان سے نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔

۲۱۔ مولانا کوثر نیازی: نوجوانی کے ابتدائی دور میں میانوالی کے ایک گاؤں سے لاہور آئے۔ پھر آہستہ آہستہ پاکستان کی وزارت تک پہنچے۔ لکھنا پڑھنا ہر حال میں ان کے مشاغل کا ضروری حصہ رہا۔ مولوی شمس الدین کے پاس کئی مرتبہ آئے اور کتابوں کے بارے میں دریافت کیا۔ ۱۹۔مارچ ۱۹۹۴ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

۲۲۔ خواجہ صلاح الدین: پنجاب یونیورسٹی کی مشہور شخصیت تھے۔ نوع بنوع مضامین کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ دن رات کا زیادہ تر وقت مطالعہ کتب میں گزرتا تھا۔ فیکلٹی آف فارمیسی کے چیئرمین تھے۔ گھر کے علاوہ یونیورسٹی میں بھی اپنے شعبے میں ان کی بہت سی کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ جونہی کام سے فرصت ملی، مطالعے میں مصروف ہوگئے۔ ذیابیطس کے مریض تھے، لیکن اس کی پروانہ کرتے تھے۔ ان سے جب ملاقات ہوئی، کسی نہ کسی موضوع کی کتاب کی بات کی۔ مولوی شمس الدین کی وفات کے بعد ان کے کتب خانے کی بھی کچھ کتابیں خواجہ صاحب نے خرید لی تھیں۔ معلوم نہیں ان کی وفات کے بعد ان کے کتب خانے کا کیا بنا۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ تمام عمر تجرد میں گزری۔

۲۳۔ مولانا ابوالخیر مودودی: بڑے خوددار صاحب علم تھے۔ عربی کی متعدد ضخیم کتابوں کے ترجمے کیے جو برصغیر کے بعض معروف اداروں کی طرف سے اشاعت پذیر ہوئے۔ تاریخ سے بالخصوص دلچسپی تھی۔ حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ دنیا کی طلب اور شہرت سے ہمیشہ اجتناب اختیار کیے رکھا۔ قانع قسم کے آدمی تھے، بلکہ قناعت ہی ان کی اصلی دولت تھی۔ کبھی کسی کے آگے دامن طلب دراز نہیں کیا، جس سے ملے

Marfat.com

بے نیازی سے ملے۔ان کی موت علم وادب کے وقار کی موت تھی اور آبروئے فضل ودانش کا سانحہ۔

۲۴۔ عبدالرحمٰن طاہر سورتی: عربی ادب ولغت کے ممتاز عالم حضرت مولانا محمد سورتی کے صاحب زادے اور ایک دوسرے استادِعربی علامہ خلیل عرب کے داماد تھے۔خود بھی عربی لغت میں بڑا نام پایا۔اسلام آباد کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے منسلک تھے۔مشہور ہے کہ لغات القرآن کے نام سے جو کتاب کئی جلدوں پر محیط ہے اور جسے غلام احمد پرویز نے اپنی تصنیف ظاہر کیا ہے وہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی کی تحریر کردہ ہے۔ یہ ان کی بے کاری اور پریشان حالی کا زمانہ تھا،جس سے مجبور ہو کر اپنا کام دوسرے کے سپرد کر دیا۔ادارہ تحقیقات اسلامی سے انسلاک کے بعد مالی حالت سنبھل گئی تھی...... اسلام آباد سے لاہور تشریف لاتے تو مولوی شمس الدین کی دکان کا ضرور چکر لگاتے۔

۲۵۔ مولانا عبدالخالق قدوسی: طویل عرصے تک خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔مطالعہ کتب کے بے حد شائق۔بعض رسائل وجرائد میں تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھے جو قارئین نے نہایت دلچسپی سے پڑھے۔ کتابیں خریدنا اور ان سے مستفید ہونا ان کا بنیادی مشغلہ تھا۔جب دیکھو کسی کتاب کے مطالعے میں مستغرق۔اردو بازار لاہور میں مکتبہ قدوسیہ کے نام سے کام شروع کیا،جس میں اللہ نے بڑی برکت پیدا کی۔بعض نایاب کتابیں شائع کیں جو اہل علم کے لیے اضافہ معلومات کا باعث بنیں۔۲۳۔مارچ ۱۹۸۷ء کو قلعہ لچھمن سنگھ (لاہور) میں بم کے دھماکے سے جام شہادت نوش کیا۔ان کا جاری کردہ مکتبہ قدوسیہ ان کے صاحب زادے عزیزالقدر ابوبکر اور عمر فاروق بڑی محنت اور ہنرمندی سے چلا رہے ہیں۔اللہ ان کے کاروبار میں برکت پیدا کرے۔

۲۶۔ مولانا ابویحیٰی امام خاں نوشہروی: مشہور مصنف ومترجم،اسلوب تحریر اور انداز گفتگو میں اختصار بھی اور جامعیت بھی۔تراجم وتصانیف کے علاوہ برصغیر کے بہت سے رسالوں اور اخباروں میں متنوع عنوانات پر مضامین سپرد قلم کیے۔اپنی طرز کے دلچسپ مصنف تھے۔ان کا اصلی وطن سوہدرہ تھا،وہیں ۱۶۔جنوری ۱۹۶۶ء (۲۴۔رمضان ۱۳۸۵ھ) کو فوت ہوئے اور اسی قصبے کی خاک میں دفن کیے گئے۔

۲۷۔ مولانا محمد بخش مسلم: کسی زمانے میں ان کے وعظ وتقریر کی بڑی شہرت تھی۔مسلم مسجد (بیرون لوہاری دروازے) کے خطیب تھے۔مولوی شمس الدین کی دکان پر آتے اور پرانے دور کی باتیں سناتے تو وہ دور سامنے آجاتا۔

۲۸۔ سجاد: پیسہ اخبار سٹریٹ میں رہتے تھے اور ریلوے میں ملازم تھے۔دھیمے انداز کے خوب صورت جوان تھے۔سجاد پبلشرز کی طرف سے چند کتابیں شائع کیں۔مولوی صاحب کے ہاں اکثر آنا جانا تھا۔بڑے میل جول کے آدمی تھے۔اہل علم سے رابطہ رکھتے تھے۔

یہ تھے مولوی شمس الدین کی دکان پر تشریف لانے والے ان بہت سے حضرات میں سے چند بزرگان

Marfat.com

کرام جو یکے بعد دیگرے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے...... ان کا ذکر کرنا اور تعارف کرانا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ کسی زمانے میں وہ ہمارے ساتھی تھے۔ ان کے ساتھ ہم نے بہت سی باتیں کی ہیں اور بعض کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانے پینے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ان کو بھول جانا تقاضائے اخلاق کے منافی ہے۔ ان حضرات کا تعارف بہت مختصر الفاظ میں کرایا گیا ہے۔ افسوس ہے ان سطور میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

اب حلقہ شمسیہ کے چند زندہ لوگوں کا تذکرہ بھی ہو جانا چاہیے کہ یہ بھی ہمارے فرائض کا حصہ ہے۔ اس گوشہ نشین فقیر کے سوا شاید کوئی صاحب اس طرف عنان توجہ مبذول نہیں فرمائیں گے۔ جب ہر شخص اپنے آپ کو دوسرے سے زیادہ پڑھا لکھا سمجھے تو اپنے سے کم تر کا کیوں نام لے۔ احساس برتری کے مہلک جراثیم ذہن سے نکلیں تو کسی کی طرف دھیان جائے۔ نبی ﷺ کا تو ارشاد ہے کہ اپنے سے چھوٹے کو دیکھو، لیکن ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بڑے کو دیکھو اور بڑے ان کے نزدیک یہ خود ہی ہیں۔ بس انھیں دیکھتے رہو اور ان کے تذکرے میں اپنے آپ کو مشغول رکھو۔ اگر یہ کر لیا تو سمجھو کہ بیڑا پار ہوا اور فرض تحریر تکمیل کو پہنچا۔

بہر حال خانقاہ مولوی شمس الدین کی یہ ایک جماعت تھی۔ قرآن کے الفاظ میں

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ﴾ (الاحزاب: ۲۳)

"مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ" میں سے بعض کا تذکرہ ہو چکا۔ اب "مَّنْ يَّنْتَظِرُ" کی طرف آیئے......!

یہ قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔ اس موقع پر ان کے استعمال سے کوئی صاحب خفا نہ ہوں۔ یہ وقوع پذیر ہونے والی حقیقت ہے۔ اپنی اپنی باری سے سب کو رخصت ہو جانا ہے، اور ہم روزانہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو رخصت ہوتے دیکھتے ہیں۔ وارث شاہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔

جمیا مرجاسی، گھڑیا بھج جاسی تے واہن سب وہنگے وے

تو آیئے جماعت "مَّنْ يَّنْتَظِرُ" یعنی زندوں کی طرف!

۱۔ شیخ شمس الحق: یہ کسی بنک میں ملازم تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ سنت نگر میں مقیم ہیں۔ کتابوں کے بارے میں بڑی معلومات رکھتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے، مولوی شمس الدین سے قریبی مراسم رکھتے تھے۔

۲۔ مولانا محمد عبدہ: لاہور میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے قائم کردہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں مدرس تھے۔ کچھ عرصہ سجاد مرحوم کے ہاں پیسہ اخبار سٹریٹ میں بھی قیام رہا۔ اس زمانے میں امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن کا اردو ترجمہ کرتے تھے۔ یہ کتاب شیخ محمد اشرف نے چھاپی۔ مولوی شمس الدین کی دکان پر عصر کے بعد (تقریباً روزانہ) آجاتے تھے۔ آج کل فیصل آباد میں سکونت پذیر ہیں۔

۳۔ سید انور حسین (نفیس رقم): ممتاز و معروف خطاط، پیر طریقت، متحمل مزاج اور انتہائی نرم کلام۔ کریم

Marfat.com

پارک میں جامعہ مدنیہ کے قریب مقیم ہیں۔ ان کا کتب خانہ بہت سے موضوعات کی ہزاروں کتابوں پر مشتمل ہے۔ اللہ ان کو صحت و عافیت سے رکھے۔ نفیس رقم تو ہیں ہی، نفیس طبع، نفیس اعمال اور نفیس خصائل بھی ہیں۔ مولوی شمس الدین کے ہاں ان کی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

۴۔ نبی بخش بلوچ: سول سروس سے تعلق ہے اور سندھی ہیں۔ پڑھنے لکھنے میں منہمک رہنے والے اور کئی علمی اداروں کے رکن۔ مطالعہ بہت وسیع۔ لاہور آتے تو مولوی صاحب سے ضرور رابطہ پیدا کرتے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں تندرست رکھے اور وہ خدمت علم کو اپنا شعار بنائے رکھیں۔

۵۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری: ماشاء اللہ بڑے باہمت اور محنتی شخص ہیں۔ معلومات کے دائرے میں بڑا پھیلاؤ ہے۔ جو شخص ان سے علمی مدد لینا چاہے، اس کی مدد کرنا اپنے آپ پر ضروری قرار دے لیتے ہیں۔ اس قسم کے مخلص اصحاب علم آئندہ کہاں ملیں گے۔ علماے بریلی سے متاثر اور اسی حلقے کے کسی بزرگ سے بیعت ہیں۔ اپنی کئی ہزار ذاتی کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی نذر کر دیں۔ یہ بہت بڑا ایثار ہے۔ جو حکیم صاحب موصوف نے کیا۔ مولوی شمس الدین سے ان کا رابطہ رہتا تھا۔

۶۔ محمد عالم مختارِ حق: سلیم الطبع اور پیکر خلوص صاحب علم، بہت سے اوصاف سے متصف۔ رجال اور کتابوں کے بارے میں مستند معلومات کے حامل۔ صاف ستھرا نہج تحریر اور جچا تلا طرز کلام۔ اللہ خوش رکھے، یہ لوگ علم کی آبرو اور قدیم اصحاب تحقیق کی لائق اعتماد نشانیاں ہیں۔

۷۔ ڈاکٹر وحید قریشی: ﴿بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ﴾ (البقرہ: ۲۴۷) دبنگ اور کرارے لہجے میں بات کرنے کے عادی۔ ملک کے متعدد علمی اداروں کی رکنیت کے اعزاز سے متصف۔ اقبال اکیڈمی کے منصب نظامت پر فائز۔ ذاتی کتب خانہ ہزاروں نئی پرانی کتابوں اور رسائل وجرائد پر محیط۔

۸۔ عبدالمجید قریشی: علم و علما کے قدردان۔ صاحب فکر و دانش، اسلوب تحریر فصاحت و بلاغت کا آئینہ دار، اپنے قاری کو معلومات بھی دیتے ہیں اور زبان کی چاشنی سے بھی بہرہ ور کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں بسلسلہ ملازمت لاہور میں اقامت گزیں تھے اور شنید ہے کہ مولوی شمس الدین کی دکان پر آمدورفت رکھتے تھے۔ اب ملتان میں مقیم ہیں جو ان کا اصلی وطن ہے۔

۹۔ مولانا عبدالحلیم چشتی: مشہور عالم اور معروف مصنف و مقالہ نگار۔ فن کتب خانہ کے ماہر اور اسی پیشہ سے منسلک۔ بالفاظ دیگر کتابوں سے شب و روز کا تعلق۔ لاہور آتے تو مولوی شمس الدین کی دکان پر ضرور تشریف لاتے۔ میں نے ان کو پہلی دفعہ وہیں مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔

۱۰۔ میر سید زاہد حسین: صادق آباد (ضلع رحیم یار خاں) کے رہنے والے ہیں۔ شائقین کتب کی فہرست میں

Marfat.com

ان کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جہاں کوئی کتاب دیکھی اور کسی رسالے پر نظر پڑی، اسے اپنا موروثی مال سمجھ کر قبضے میں کر لیا۔ میں مارچ ۱۹۸۸ء میں صادق آباد گیا تھا، ان کے مکان پر پہنچا مگر افسوس ملاقات نہ ہو سکی۔

۱۱۔ اقبال مجددی: چھوٹی عمر ہی میں تحقیق و کاوش کی راہوں پر گامزن ہو گئے تھے۔ اب بھی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ مولوی شمس الدین سے مستقل طور پر رابطہ رکھنے والوں میں یہ سب سے کم سن تھے۔ لاہور کے کسی کالج میں خدمت تدریس انجام دیتے ہیں۔

۱۲۔ چوہدری بشیر احمد خاں: دراصل مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ (کی تحصیل جگراؤں) کے موضع ''تلونڈی رائے'' کے رہنے والے ہیں اور وہاں کی راجپوت برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ افراد و رجال اور جماعتوں اور کتابوں کے بارے میں انھیں خزینہ معلومات کہنا چاہیے۔ آج کل ماہنامہ ترجمان القرآن میں خدمت انجام دیتے ہیں۔ مولوی شمس الدین کی دکان پر ان کا روزانہ کا پھیرا تھا، اور ان کا شمار ان حضرات میں ہوتا تھا، جن پر مولوی صاحب بہت اعتماد کرتے تھے اور اکثر معاملات میں جن کو انھوں نے اپنا بھیدی بنا رکھا تھا۔

اس بات کا شاید بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ مولوی شمس الدین لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے۔ وہ صرف دستخط کر سکتے تھے، اس سے آگے ان کا فن کتابت ختم تھا۔ ان کے بل اور رسیدیں وغیرہ بالعموم چوہدری بشیر احمد خاں بناتے تھے۔ کتابوں کی فہرست بھی یہی تیار کرتے تھے۔

ایک مرتبہ عجیب معاملہ ہوا۔ علامہ علاء الدین صدیقی پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے صدر تھے۔ وہ حافظ یار محمد (سابق پروفیسر شعبہ اسلامیات) کو ساتھ لے کر مولوی صاحب کی دکان پر آئے اور اپنے شعبے کی لائبریری کے لیے کچھ کتابیں خرید کر لے گئے۔ جیسا کہ سرکاری اداروں میں اصول ہے، مولوی صاحب سے کہہ گئے کہ ان کتابوں کا بل بھیج دینا۔ کئی دن گزر گئے، لیکن مولوی صاحب نے بل نہیں بھیجا۔ وہ انتظار کر رہے ہیں کہ بل آئے تو رقم ادا کی جائے۔ اس کے بعد وہ خود بھی آئے، اپنا آدمی بھی بھیجا، غالباً حافظ یار محمد نے بھی دکان کا چکر لگایا اور مولوی صاحب سے بل کے لیے کہا، لیکن انھوں نے بل نہیں بھیجا...... کیوں نہیں بھیجا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ چوہدری بشیر احمد اپنے گھر فیصل آباد گئے تھے اور انھیں کسی گھریلو کام کے سلسلے میں کئی دن وہاں رہنا پڑا...... مولوی صاحب کہتے تھے کہ چوہدری صاحب آئیں گے تو بل بنائیں گے۔ چناں چہ وہ آئے تو بل بنایا گیا اور پھر رقم وصول پائی۔

یہ تو ایک مثال تھی، اس قسم کی کئی مثالیں ہیں۔

نئی کتابیں آتی تھیں تو رجسٹر پر کتابوں کے نام، مصنفین کے نام اور قیمت وغیرہ کا اندراج اکثر چوہدری بشیر احمد خاں کرتے تھے۔

۱۳۔ اب زندوں میں تیرھویں نمبر پر اتفاق سے میں بھی موجود ہوں، لیکن اس میں لکھنے کی کوئی بات نہیں ہے،

Marfat.com

بجز اس کے کہ میں جاتا تھا اور چائے پی کر آجاتا تھا۔ البتہ ہندوستان سے آئی ہوئی چند کتابیں خرید لی تھیں جو میرے پاس محفوظ ہیں۔ تصنیف وتالیف کے سلسلے میں ان کتابوں سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

مولوی صاحب کی وفات کے بعد شاید یہ لوگ آج تک کبھی مل کر نہیں بیٹھے ہوں گے۔ اس موقعے پر ایک پنجابی لوک گیت یاد آیا۔

اسیں چڑیاں دا چمبا، بابل اسیں اڈ جاواں گے

مولوی صاحب کھلے دل کے آدمی تھے، جس نے جو کتاب مانگی دے دی۔ قیمت کا کوئی مطالبہ نہیں کیا، اس نے جو جی چاہا دے دیا، اور مولوی صاحب نے لے لیا۔ قیمت کے لیے جھگڑنا یا اِدھر اُدھر کی بات کرنا یا فوری طور پر مانگنا اور تاخیر پر ناراض ہونا وہ جانتے ہی نہ تھے۔

اپنے ہمسائے دکان داروں کے ساتھ وہ نہایت عزت کا برتاؤ کرتے تھے۔ صبح دکان پر آتے تو دکان کھول کر دائیں بائیں جانب کی تمام دکانوں پر جاتے اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے سلام ومصافحہ کرتے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔

وہ سنت نگر رہتے تھے۔ ایک تانگے والے سے معاملہ طے کر رکھا تھا، وہی انھیں صبح کے وقت گھر سے دکان پر لاتا اور وہی غروب آفتاب سے کچھ دیر بعد دکان سے گھر لے جاتا تھا۔

جس گھر میں وہ رہتے تھے، وہ ان کا اپنا گھر نہ تھا، ان کی بیوی کا تھا۔ انھوں نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی تھی، جس کا پہلے شوہر سے ایک بیٹا بھی تھا۔ وہ حیوانات کا ڈاکٹر تھا اور محمد شفیق اس کا نام تھا۔ ان کی وفات کے وقت وہ میانوالی میں ملازمت کرتا تھا۔ ان کے ملنے والے اکثر لوگوں کو اس کا علم ان کی وفات کے بعد ہوا۔ خود ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی وفات کے بعد محمد شفیق کافی عرصہ لاہور رہا۔ وہ روزانہ دکان پر آتا اور سب سے نہایت اچھی طرح ملتا تھا۔

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ چائے کا دوران کے ہاں ہر وقت چلتا تھا۔ صبح سے شام تک کتنی چائے آتی ہوگی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک دن میں رات کو ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ان کی دکان پر گیا۔ سردیوں کا موسم تھا اور وہ تنہا بیٹھے تھے۔ حسب عادت کھڑے ہو کر ملے اور اسی لمحے چائے کا آرڈر دینے کشمیری سٹال کی طرف چل پڑے۔ میں نے روکنے کی کوشش کی، لیکن نہیں رکے۔ چائے کے دو کپ آئے اور ہم نے پینا شروع کیے۔

پوچھا: صبح سے اب تک کتنی چائے آچکی ہے؟

کہا: یہ اٹھائیسویں مرتبہ آئی ہے۔ اس سے قبل ستائیس سیٹ آچکے ہیں۔

تعجب ہوا کہ اتنی چائے؟

مسکراتے ہوئے کہا: کل کی نسبت آج کم آئی ہے۔

Marfat.com

اس زمانے میں غالباً بارہ آنے کا سیٹ تھا اور ایک پیالی تین آنے میں ملتی تھی۔ اگر پچیس سیٹ روزانہ کی اوسط ہو تو اس سستے زمانے میں تقریباً بیس روپے کی صرف چائے ہوئی۔ سگریٹ کا خرچ اس سے الگ، جو وہ خود بھی پیتے تھے اور مہمانوں کو بھی پیش کرتے تھے۔

وہ عام طور سے مقروض رہتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ چوہدری بشیر احمد خاں نے بیان کیا اور ایک صاحب کا نام لے کر بتایا کہ ان سے انھوں نے کچھ روپے قرض حسنہ کے طور پر لیے۔ آج کل وہ صاحب فیصل آباد میں مقیم ہیں۔ یہ قرض ان کی وفات کے بعد ادا کیا گیا۔

ایک مرتبہ وہ کراچی گئے اور سولہ سترہ روز کے بعد واپس آئے۔

پوچھا: اتنے دن وہاں کیا کرتے رہے؟

جواب دیا: کئی ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک ایسی چیز صوبہ سرحد کے ایک شخص سے مل گئی جو برٹش میوزیم والوں کو مطلوب تھی۔ اس کے لیے کراچی جانا اور وہاں رکنا پڑا۔ اس کی فروخت کے بعد کافی حد تک قرض سے سبک دوش ہو گیا ہوں۔

ان میں یہ خوبی تھی کہ دوسرے کی علمی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں برصغیر پاک وہند میں علم فقہ کے موضوع پر کام شروع کیا تو انھیں پتا چلا۔ کام کی نوعیت دریافت کرنے کے بعد کہا، کسی دن میرے ساتھ گھر چلیے، خیال ہے کہ آپ کے مطلب کی کچھ چیزیں مل جائیں گی......لیکن اس کے جلد ہی بعد ان کا انتقال ہو گیا اور میں ان کی مخلصانہ پیش کش سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

مولوی شمس الدین نے ۱۱۔ جنوری ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ وفات کے بعد ان کی دکان اور کتابوں کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ بعض حضرات کے وہ مقروض بھی تھے۔ ان کا کوئی رشتے دار بھی نہ تھا۔ وہ تنہا لاہور آئے تھے۔ اب تمام ذمے داری ان کے دوستوں پر آ پڑی تھی۔ چناں چہ باہم مشورہ کر کے دکان پر جناب نذیر احمد سبحانی صاحب کو بٹھایا گیا جو تقریباً چار سال یہ خدمت انجام دیتے رہے...... یہ وہی نذیر احمد سبحانی ہیں جو آج کل اردو بازار لاہور میں سبحانی اکیڈمی کے نام سے کتابوں کی تجارت کرتے ہیں اور ہمارے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔

ان کے ذاتی کتب خانے اور دکان کی پرانی اور نایاب کتابوں کے لیے مختلف اداروں کے سربراہوں سے رابطہ پیدا کیا گیا۔ کچھ کتابیں کراچی کے بعض اداروں نے اور کچھ محکمہ اوقاف کی علما اکیڈمی نے خریدیں اور اس کی لائبریری کی زینت بنیں۔

بعض کتابیں خواجہ صلاح الدین مرحوم نے منتخب کیں، بعض کچھ اور دوست لے گئے۔ اس طرح ان کا نہایت محنت اور تکلیف آمیز شوق سے عمر بھر کا جمع کیا ہوا سرمایہ علمی مختلف مقامات میں بکھر گیا۔

آیئے! اس خادم علم اور سراپا خلوص دوست کے لیے بارگاہ الٰہی میں عاجزی کے ساتھ دعائے مغفرت کریں۔

Marfat.com

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحبؒ کی تصنیفات

برصغیر میں علم فقہ
برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش
فقہائے ہند پہلی صدی ہجری سے تیرھویں صدی ہجری تک (دس جلدیں)
لسان القرآن (جلد سوم)
چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں
ارمغان حنیف
میاں فضل حق اور ان کی خدمات
قصوری خاندان
اسلام کی بیٹیاں
صوفی محمد عبداللہؒ (حالات۔خدمات۔آثار)
تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ
میاں عبدالعزیز مالواڈہ
کاروانِ سلف
بزم ارجمنداں
نقوش عظمت رفتہ
قافلہ حدیث
ہفت اقلیم
برصغیر میں اہل حدیث کی آمد
برصغیر میں اہل حدیث خدام قرآن
دبستانِ حدیث
گلستان حدیث
چمنستانِ حدیث
برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات
برصغیر میں اہل حدیث کی تدریسی وتنظیمی سرگزشت
صدارتی اور استقبالیہ خطبات
ارمغانِ حدیث
مولانا احمد دین گکھڑوی
تذکرہ مولانا غلام رسول قلعویؒ
روپڑی علمائے حدیث
تذکرہ مولانا محی الدین لکھویؒ
گزر گئی گزران (آپ بیتی)
استادگرامی مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانیؒ
محفلِ دانش منداں

عربی سے اردو

ریاض الصالحین/ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی
الفہرست/ابن ندیم
حضرت ابوبکر صدیقؓ/محمد حسین ہیکل
لشکر اسامہؓ کی روانگی/ڈاکٹر فضل الٰہی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
20S13 جناح سٹریٹ، اسلامیہ کالونی سانده، لاہور
فون: 0301-4768918, 042-37143677

Marfat.com

نقوشِ عظمتِ رفتہ

محمد اسحاق بھٹی

محمد اسحاق بھٹی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

Marfat.com